درس بخاری

شیخ الحدیث والتفسیر استاذ العلماء علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

ضبط و تحریر

مولانا عبدالوحید صدیقی فتحپوری

تعدیل و تصحیح و تہذیب

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی

ناشر

ایچ ایم سعید کمپنی

ادب منزل پاکستان چوک کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

۲

تم کتاب العلم بحمد اللہ وبہ تم المجلد الاول من درس البخاری

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین برحمتک

یا ارحم الراحمین ؞

درسِ بخاری

شیخ الحدیث والتفسیر استاذ العلماء علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

ضبط و تحریر

مولانا عبد الوحید صدیقی فتحپوری

تعدیل و تصحیح و تہذیب

محدّث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی مد ظلہ

ناشر

مکتبہ عارفین

ناشران و تاجران کتب، رقیہ بلڈنگ پاکستان چوک کراچی

مطبوعہ

ایجوکیشنل پریس
پاکستان چوک، کراچی ۵

تاریخ طبع

جنوری ۱۹۸۳ء

مطابق

ربیع الثانی ۱۴۰۳ھ

قیمت

قیمت ایک سو پچیس روپے

کلماتِ تشکّر و امتنان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل سملک ۔ گجرات (جنوبی ہند) کی وہ قدیم اور مشہور دینی درسگاہ ہے جسے بجا طور پر یہ فخر ہے کہ یہاں ان نادرہ روزگار علمی و دینی شخصیتوں نے مسند تدریس و منصب مشیخت حدیث کو رونق بخشی ہے جنکی نظیر علمائے متقدمین میں بھی خال خال ہی نظر آتی ہے ۔ اس جامعہ کی بنیاد ۱۳۲۶ھ میں سملک کی مسجد میں مکتب کی شکل میں رکھی گئی تھی ۔ کچھ دنوں تک مکتبی پیمانہ پر یہاں دین کی خدمت انجام دیجاتی رہی پھر اسی مکتب نے مدرسہ کی شکل اختیار کی اور مسجد سے منتقل ہو کر اپنی مستقل عمارت میں آگیا اور متوسطات تک کی تعلیم کا یہاں نظم کیا گیا ۔ لیکن حالات زمانہ اور ماحول کیوجہ سے مدرسہ کی ترقی کی رفتار بہت سست تھی ۔ نہ طلبہ کی کثرت تھی نہ عمارت کا یہ سلسلہ ، نہ کوئی قابل ذکر کتبخانہ ، نہ انتظام و انصرام کا کوئی معقول نظم ——— تاآنکہ اس صدی کے نصف اول میں اللہ نے اپنا پھر فضل فرمایا اور علماء اور مشائخ دار العلوم کی جماعت کا ایک عظیم قافلہ بالکل غیبی طریقہ پر ڈابھیل کی اس دور دراز بستی میں اپنے فیوض و برکات کیساتھ آپہنچا ۔ آنیوالوں میں امام العصر مولانا العلام حضرت سید انور شاہ کشمیری اور حضرت العلامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی (نور اللہ مرقدہما) جیسی نابغہ روزگار اور عبقری شخصیتیں بھی تھیں ۔ ان اساطین علم و فضل کی آمد نے اس چھوٹے سے مدرسہ کو ایک عظیم دینی جامعہ کی شکل میں کردیا اور یہاں کے طلبہ میں حضرت مولانا سید یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا سید حمید الدین صاحب سابق شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ کلکتہ ، جیسے لوگ نظر آنے لگے ۔ اور اسکی شہرت کا آوازہ ہند سے تاشقند و بخارا اور کاشغر و چین تک گونجا ۔ اور گجرات کی فضا پھر ایکبار قال اللہ و قال الرسول کے نغمہ جاں افروز سے گونجنے لگی ۔

اور یہی دور جامعہ اسلامیہ کی تاریخ کا سب سے زیادہ درخشندہ اور تابناک دور ہے ۔ حضرت علامہ کشمیریؒ نے اس جامعہ میں پانچ سال تک بخاری کا درس دیا ۔ اور یہیں انکے شاگرد رشید اور ہمارے استاذ حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ نے انکے امالی درس بخاری کو فیض الباری کی صورت میں مرتب کیا جو چار جلدوں میں چھپ چکی ہے ۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے بعد حضرت علامہ عثمانی علیہ الرحمۃ نے اس منصب کو زینت بخشی ۔ اور ایک لمبی مدت تک جامعہ میں بخاری کا درس دیا اور علم و تحقیق کے موتی لٹائے ۔ حضرت علامہ عثمانیؒ سے جو واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ اللہ نے انکے اندر کیسی جامعیت کی شان رکھی تھی اور علوم دینیہ میں انکا مقام معاصر علماء میں کتنا بلند تھا ۔ تفسیر و حدیث میں انکی حذاقت فن اور براعت شان پر شاہد ان کا حاشیہ قرآن اور جامع مسلم کی شرح میں انکی شاہکار تصنیف فتح الملہم ہے ۔ حضرت علامہ ممدوح کی خواہش تھی کہ وہ فتح الملہم ہی کی طرز پر بخاری کی شرح بھی اردو میں لکھیں اور جہانتک مجھے معلوم ہے کہ علامہؒ نے اسکے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا بھی شروع کردیا تھا لیکن شاید یہ بات مقدر نہ تھی اور ان کے قلم سے یہ کام نہ ہوسکا ۔

البتہ ان کے درس بخاری کے امالی کو ان کے بعض شاگردوں نے دوران درس ضبط کیا تھا ۔ اور انھیں میں سے ہمارے محب مکرم جناب مولانا عبد الوحید صاحب صدیقی بھی ہیں جن کو حضرت علامہ سے خصوصی تلمذ کا شرف حاصل ہے اور وہ اسی جامعہ کے فارغ ہیں ۔ جن حضرات کو علامہ کے درس بخاری میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا ہے (اور انھیں میں یہ بندہ ناچیز بھی ہے) انھیں اندازہ ہے کہ علامہ کا یہ درس کس شان کا

ہوتا تھا۔ حدیث اور متعلقات حدیث پر کیسی جامع، مفصل اور محقق آپ کی گفتگو ہوتی تھی۔ معلوم ایسا ہوتا تھا علم و تحقیق کا دریائے ساکن بہتا چلا جارہا ہے اور ایک محدث وقت اپنی پوری شان محدثیت کے ساتھ مسند حدیث پر بیٹھا اس منصب کا پورا حق ادا کر رہا ہے۔ بے نظیر استحضار کے ساتھ ساتھ متقدمین و متاخرین کے علوم پر علامہ کی گہری نظر تھی۔ پھر اللہ نے قوت بیان وہ عطا فرمائی تھی کہ ہر بات طلبہ کے دل میں اترتی چلی جاتی تھی۔ حضرت علامہ کے یہ امالی درس جس کے ضبط کرنے کا مولانا عبدالوحید صاحب نے خصوصی اہتمام کیا تھا۔ ان کے پاس محفوظ تھے جس کی اطلاع مجھے مولانا منظور صاحب نعمانی مدظلہ نے دی۔ اور مناسب معلوم ہوا کہ تحقیقات و نوادر کے اس علمی خزانہ کو محفوظ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے شایع کردیا جائے۔ چنانچہ جامعہ کی طرف سے اسکی طباعت کی بابت سوچا جانے لگا۔

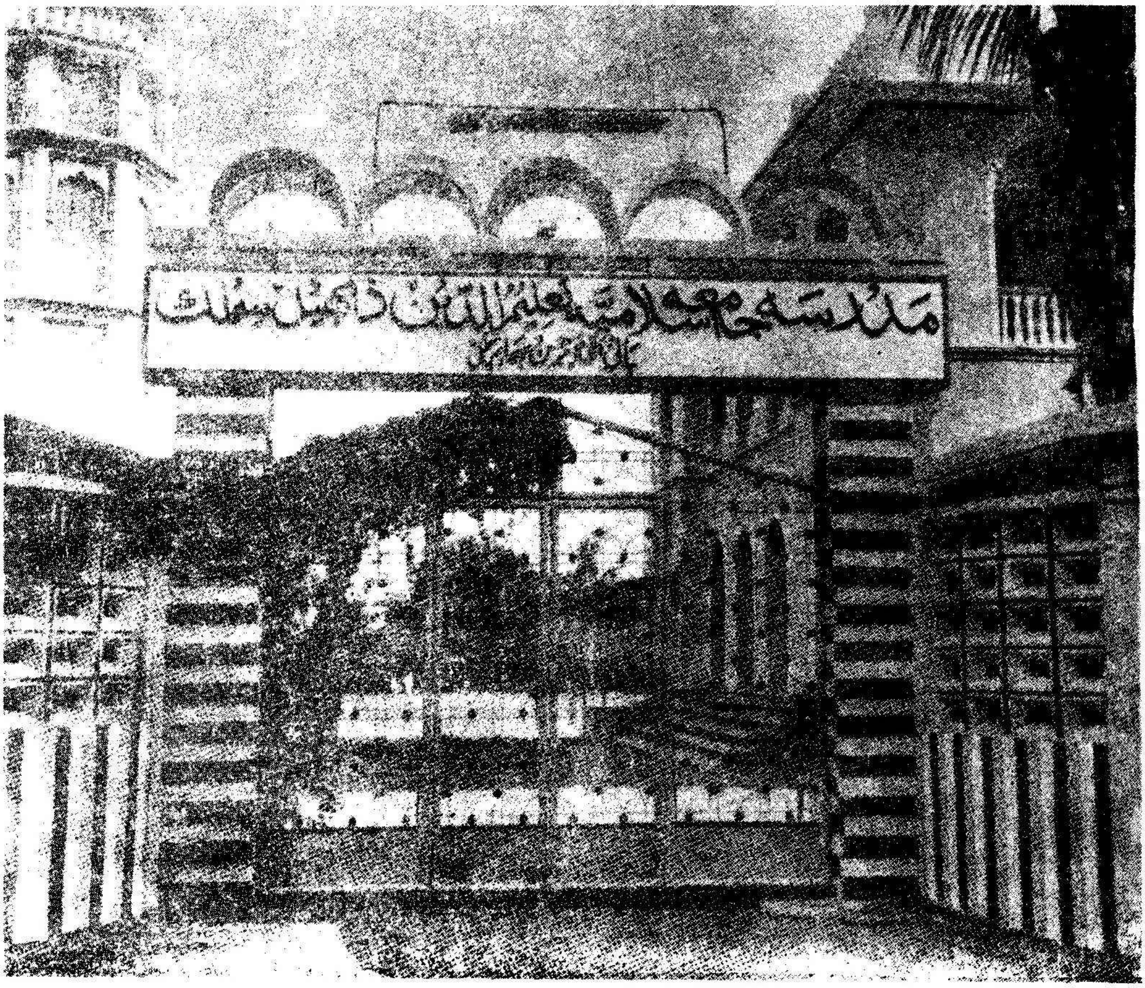
لیکن چونکہ اس تحریر کی حیثیت درس تقریر کی تھی اور دوران درس میں اس کا اہتمام بہت مشکل ہے کہ کہنے والے کی ہر بات بلا کم و کاست جوں کی توں ضبط کی جاسکے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ یہ تحریر کسی صاحب نظر اور محقق عالم کی نظر سے گزر جائے چنانچہ اس کے لئے ہم سب کی نگاہ محدث وقت حضرت علامہ حبیب الرحمن صاحب اعظمی مدظلہ پر پڑی جن کو حضرت علامہ عثمانیؒ سے شرف تلمذ بھی حاصل ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ جاننے والے جانتے ہیں کہ موصوف اس وقت حدیث و رجال کی معرفت میں دنیائے اسلام کی منفرد شخصیت ہیں۔ ہم نے مولانا سے اس بات کیلئے درخواست کی اور موصوف نے باوجود اپنی شدید مصروفیتوں اور پیرانہ سالی کے ہماری درخواست کو شرف قبول بخشا اور کتاب کی پہلی جلد پر نظر ثانی فرما کر اس لائق کردیا کہ اب ہم اسے اطمینان و اعتماد کے ساتھ پریس کے حوالہ کرسکیں۔ جس کے لئے ہم مولانا کے ممنون و شکرگزار ہیں اور ہمیں امید ہے کہ کتاب کی دوسری جلد بھی جلد ہی حضرت مولانا کی نظر ثانی کے بعد ہدیہ ناظرین ہوگی۔

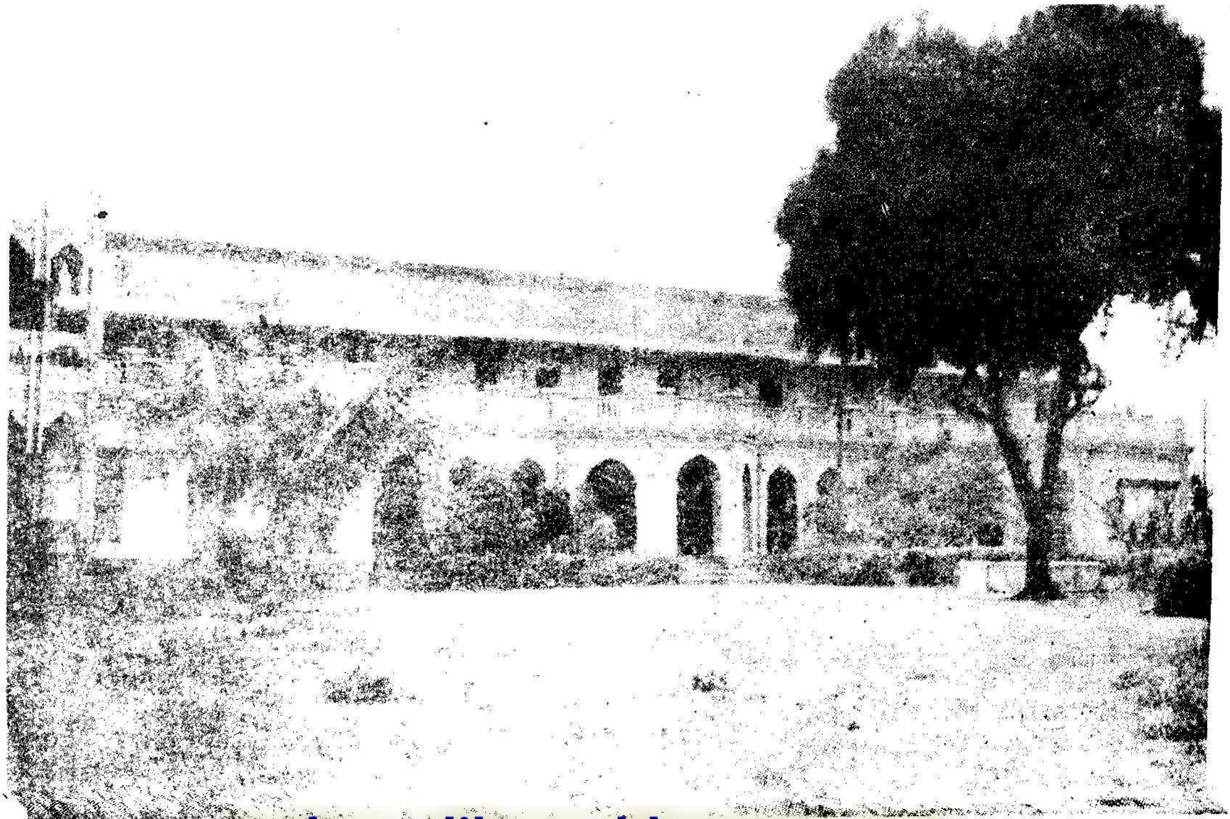
اس موقع پر ہم ان سبھی معاونین کے شکرگزار ہیں جنھوں نے علم و تحقیق کے اس عظیم ذخیرہ کو منصہ شہود پر لانے میں اپنے مالی و اخلاقی تعاون سے ہماری ہمت افزائی فرمائی۔ اور ہمیں اس لائق بنایا کہ ہم اس کتاب کو ناظرین کی خدمت میں پیش کرسکیں۔ میں ان سب کا نام لے کر اپنے اس دلی تشکر کو رسمی واسمی نہیں بنانا چاہتا۔ دعا ہے کہ اللہ ان سب کو اسکا بہتر بدلہ دے اور اپنی توفیق خاص سے انکی مساعدت کرے

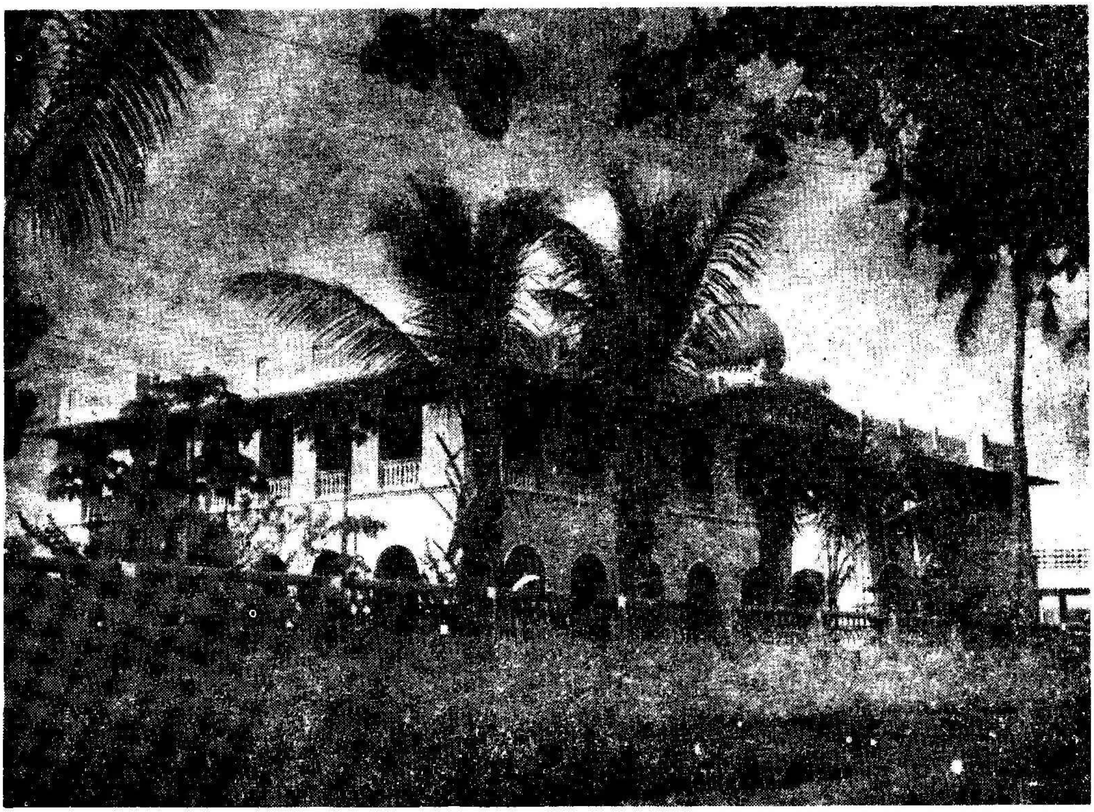
اخیر میں میں عزیز گرامی مولانا رشید احمد صاحب مفتاحی الاعظمی صاحبزادہ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی مدظلہ کا بطور خاص شکرگزار ہوں جن کی مساعدت سے تعدیل و تصحیح کا کام انجام پایا اور انکی توجہ اور دلچسپی سے کتاب کا مسودہ کتابت اور طباعت کے مراحل سے گزر کر منصہ شہود پر آسکا۔ والسلام

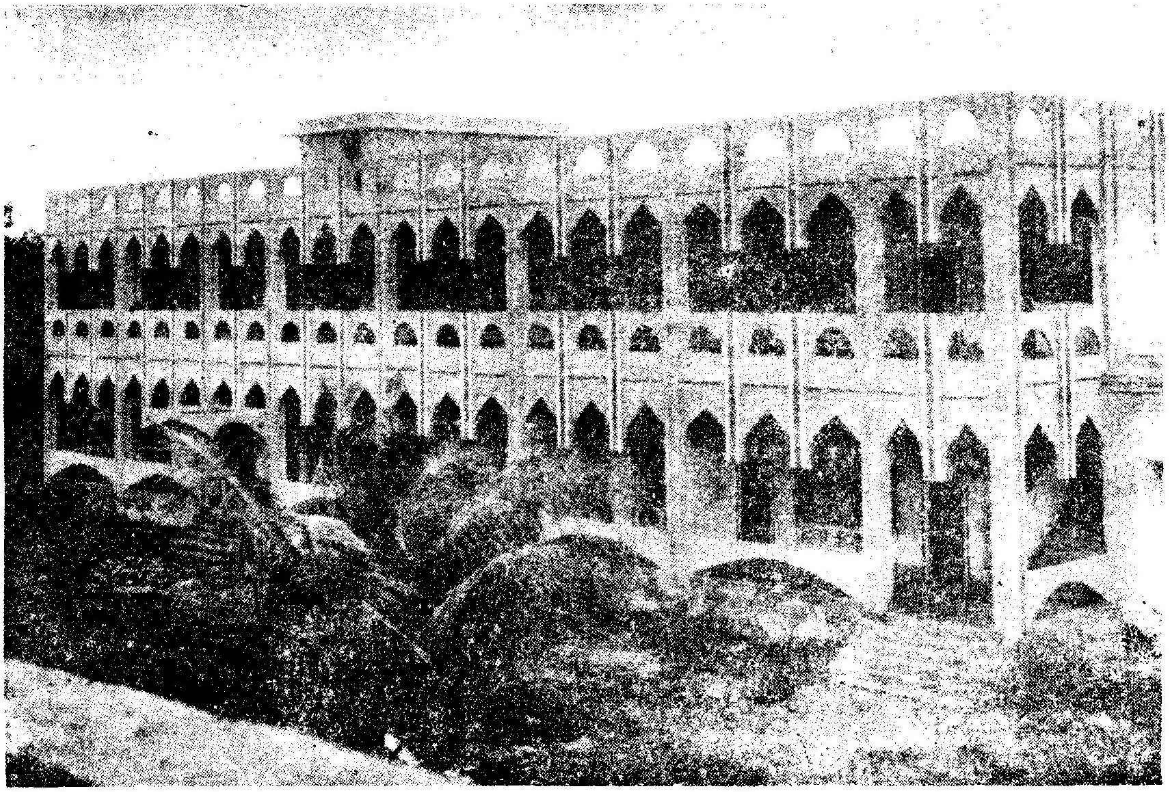
۷؍ ذیقعدہ ۱۳۹۹ھ

خادم۔ محمد سعید بزرگ۔
مہتمم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سملک


مدرسہ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل سملک







پیش لفظ

از مخدومی و محترمی حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ العالی

حامداً و مصلیاً و مسلماً

اب سے ۶-۷ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ یہ عاجز "رابطۂ عالم اسلامی" کے اجلاس میں شرکت کے لئے مکہ معظمہ گیا ہوا تھا۔ اجلاس سے فارغ ہو کر حسب معمول مدینہ طیبہ بھی حاضری ہوئی۔ اس سفر میں پاکستان کے ایک عالم دین جناب مولانا قاضی عبدالرحمن صاحب (کراچی) سے ملاقات ہوئی، موصوف نے تبلایا کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اردو زبان میں بخاری شریف کی شرح لکھی تھی لیکن وہ مولانا کی حیات میں چھپ نہیں سکی تھی اس کا مسودہ اُنکے وارثوں کے پاس محفوظ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ انعام فرمایا کہ اُن لوگوں کو اُن کی مرضی کے مطابق معاوضہ ادا کر کے میں اسکے حاصل کر لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اب میں آفسٹ سے چھپوانے کے لئے اُس کی جلد اول کی کتابت کرا رہا ہوں، اسکے کچھ اجزاء یہاں بھی میرے پاس ہیں، وہ میں آپ کو بھی دکھلانا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ میں ضرور دیکھوں گا، لیکن مجھے اس میں شبہ ہے کہ حضرت مولانا عثمانی رحمہ نے بخاری شریف کی کوئی شرح لکھی تھی۔ میں نے قاضی صاحب سے دریافت کیا کہ کیا آپ بتا سکیں گے کہ حضرتؒ نے یہ شرح کس زمانہ میں لکھی تھی، آیا ہندوستان کے قیام کے زمانے میں یا پاکستان کے قیام کے دوران میں؟ انہوں نے بتلایا کہ حضرت مولانا نے یہ اُس زمانے میں لکھی تھی جب حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رح کی وفات کے بعد "جامعہ اسلامیہ ڈابھیل" میں وہ بخاری شریف کا درس دیتے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ پھر تو میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس معاملہ میں کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میں نے مزید کہا کہ میرے یقین کی بنیاد یہ ہے (کہ "جامعہ اسلامیہ ڈابھیل" میں حضرت مولانا کے قیام اور وہاں بخاری شریف پڑھانے کے کم از کم ۱۲ سال کے بعد) سنہ ۱۹۴۵ء کی ایک ملاقات میں حضرت مولانا نے اس عاجز سے براہِ راست ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا تھا کہ میرا ارادہ اردو زبان میں بخاری شریف کی ایک مختصر شرح لکھنے کا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا حضرت یہ کام شروع فرما چکے ہیں؟ فرمایا ابھی شروع کیا تو نہیں ہے لیکن جلدی ہی شروع کر دینے کا ارادہ ہے اور امید یہ ہے کہ ان شاء اللہ اس میں زیادہ مدت نہیں لگے گی (یہ گفتگو دیوبند میں حضرت کے دولت کدہ پر ۴۵ء کی ایک ملاقات میں ہوئی تھی) اسکے بعد چند ہی دنوں کے

بعد حضرت مولانا نے "جمعیۃ علماء اسلام" کی صدارت قبول فرمائی اور مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کی حمایت میں سرگرم ہوگئے اور پھر قیامِ پاکستان اور وہاں منتقل ہو جانے کے بعد بھی سیاسی مصروفیات نے اُن کو بالکل اس کی مہلت نہیں دی کہ وہ کوئی علمی اور تصنیفی کام کرسکتے۔ اسلئے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت مولانا نے بخاری شریف کی اردو شرح لکھنے کا ارادہ تو کیا تھا لیکن آخری عمر کی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے یہ ارادہ عمل میں نہیں آسکا۔

مولانا قاضی عبدالرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ میں نے صحیح بخاری کی شرح کا جو مسودہ حضرت مولانا عثمانی کے وارثوں سے حاصل کیا ہے اس کا کچھ حصہ میرے پاس یہاں بھی موجود ہے، آپ اس کو دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے کہا میں اُس کو ضرور دیکھنا چاہتا ہوں شاید اُس سے کچھ پتہ چلے اور یہ معمہ حل ہوسکے۔ قاضی صاحب نے دوسرے وقت اُس مسودہ کے کچھ اوراق دکھلائے اور اور ساتھ ہی شرح کے کچھ کتابت شدہ صفحات بھی دکھلائے۔

مسودہ کے اوراق دیکھ کر پتہ چل گیا کہ یہ دراصل حضرت مولانا عثمانی رح کے درس بخاری کی تقریر ہے جو اُن کے کسی لائق اور ذی استعداد شاگرد نے (دارالعلوم دیوبند وغیرہ بڑے مدارس کے رواج کے مطابق) درس کے ساتھ قلمبند کی ہے اور بعد میں حضرت مولانا رح نے اُسے ملاحظہ بھی فرمایا ہے اور کہیں کہیں اپنے قلم سے کسی غلطی کی اصلاح یا کوئی ترمیم بھی فرمائی ہے اور کسی کسی جگہ حاشیہ پر کسی حوالہ کی عبارت اصل کتاب سے نقل فرمائی ہے یا مضمون میں کوئی اضافہ اپنے قلم سے فرمایا ہے۔

میں چونکہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا خط پہچانتا تھا اسلئے معاملہ کو صحیح طور پر سمجھ لینا میرے لئے آسان ہوا۔ علاوہ ازیں مسودہ میں ہر سبق کی تاریخ بھی درج ہے جس سے میرے اس خیال کی پوری توثیق ہوگئی کہ یہ حضرت رح کی تصنیف نہیں ہے بلکہ کسی شاگرد کی لکھی ہوئی درسی تقریر ہے جو سنہ ۱۳۵۲ھ کے درس بخاری میں قلمبند کی گئی ہے۔ اِن حقائق کے سامنے آجانے کے بعد قاضی صاحب نے بھی تسلیم کر لیا کہ واقعہ یہی معلوم ہوتا ہے۔ قاضی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ہم اس مسودہ کو بجنسہٖ طبع نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس میں بہت کچھ اضافہ کر کے عصر حاضر کی ضرورت کے مطابق صحیح بخاری کی ایک مکمل شرح کی شکل میں اس کو شائع کر رہے ہیں، اس کا نام "فضل الباری" تجویز ہوا ہے۔ اسکے جو کتابت شدہ صفحات قاضی صاحب کے ساتھ تھے میں نے ان کو بھی دیکھا اندازہ ہوا کہ اچھی صلاحیت اور بڑی محنت سے کام کیا گیا ہے اور اردو میں بخاری شریف کی ایک بہت اچھی شرح تیار کی جا رہی ہے، کتابت بھی بہت اعلیٰ معیار کی تھی اس سے بھی مسرت ہوئی۔

مولانا قاضی عبدالرحمٰن صاحب کی اس ملاقات کے ٹھیک ایک سال کے بعد "رابطۂ عالم اسلامی" کے اجلاس ہی کی شرکت کے لئے یہ عاجز مکہ مکرمہ حاضر ہوا تو اتفاق سے اُس وقت بھی قاضی صاحب وہاں تشریف لائے ہوئے تھے اور ان کی تیار کردہ شرح بخاری "فضل الباری" کی پہلی جلد شائع ہو چکی تھی۔ قاضی صاحب نے وہیں اس کا ایک نسخہ بھی عنایت فرمایا۔

الحمدللہ بڑی دیدہ زیب اور بڑی حسین و جمیل شکل میں شائع ہوئی ہے۔ جس حد تک مطالعہ کیا جاسکا اس سے اندازہ

ہوا کہ عصر حاضر کی ضرورت کے مطابق خاص کر اردو داں طبقہ کے لئے اور اہل علم کے لئے بھی بخاری شریف کی بہت اچھی اور مکمل شرح ہے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور ناظرین کے لئے نافع بنائے ۔ لیکن اس میں حضرت علامہ عثمانی رحہ کی تقریر پر بہت اضافہ کیا گیا ہے جو غالباً اصل تقریر سے کئی گنا زیادہ ہوگا، پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ کوئی مطالعہ کرنے والا کسی علامت سے یہ سمجھ سکے کہ اسمیں کتنا مضمون حضرت علامہ عثمانی کا ہے اور کتنا اور کون مضمون دوسرے حضرات کا اضافہ کیا ہوا ہے ۔ ایسی صورت میں اِس پوری کتاب کی نسبت حضرت علامہ رحہ کی طرف اس عاجز کے نزدیک محل نظر اور خاص کر فن حدیث کے اصول و روایات کے خلاف ہے ۔ محترم قاضی صاحب اور ان کے رفقاء کو اس پر غور فرمانا چاہئیے ۔

حرمین شریفین کے اس سفر سے میری واپسی کے چند روز بعد اتفاق سے ہماری جماعت اور ہمارے اس دور کے مشہور صاحبِ قلب و صاحبِ علم و قلم جناب مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہی (جو شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم کے خلفاء میں سے ہیں) لکھنؤ تشریف لائے ۔ میں نے حرمین پاک کے اس سفر کے واقعات مولانا سے بیان کرتے ہوئے مولانا قاضی عبدالرحمٰن صاحب کی ملاقات کا اور بخاری شریف کی شرح کے مذکورہ بالا معاملہ کا بھی تذکرہ کیا ۔ مولانا موصوف نے فرمایا کہ مجھے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحہ کی بخاری شریف کی "اس درسی تقریر" کی پوری تاریخ معلوم ہے ۔ انھوں نے بتلایا کہ میں جس زمانہ میں دارالعلوم دیوبند میں پڑھتا تھا وہ دورہ تھا جب حضرت مولانا عثمانی رحہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم تھے ۔ مولانا نے اپنے درسِ بخاری کی ایک قلمی مکتوب تقریر کی چند ایسے طلبہ سے نقل کرائی تھی جنکا خط صاف تھا ان کو اسکی معقول اجرت بھی مرحمت فرمائی تھی ۔ نقل کرنے والے ان طلبہ میں ایک میں بھی تھا ، یہ تقریر جسکی نقل ہم لوگوں نے کی تھی ، مولانا عبدالوحید صاحب فتحپوری کی لکھی ہوئی تھی ۔ انھوں نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حضرت مولانا عثمانی سے بخاری شریف پڑھی تھی اور بڑے اہتمام اور بڑی لیاقت سے مولانا کی درسی تقریر قلمبند کی تھی حضرت مولانا رحہ نے اُسے دیکھ کر کہیں کہیں اصلاح و ترمیم بھی فرمائی تھی اور اپنے لئے اُس پوری تقریر کی ایک نقل تیار کرائی تھی ۔ وہی نقل حضرت مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے وارثوں کے پاس رہی ہوگی ۔

حسنِ اتفاق کہ مولانا فریدی کی اس ملاقات کے چند ہی روز بعد ایک دن مولانا عبدالوحید صاحب لکھنؤ تشریف لائے ۔ میں نے ان سے مولانا فریدی کی گفتگو کے حوالہ سے "تقریر" کے بارے میں دریافت کیا ۔ انھوں نے دورۂ حدیث پڑھنے کے لئے شوال ۱۳۵۱ھ میں اپنے "جامعہ اسلامیہ ڈابھیل" جانے اور وہاں حضرت مولانا عثمانی رحہ سے بخاری شریف پڑھنے اور خاص اہتمام سے درسی تقریر قلمبند کرنے کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا اور بتلایا کہ حضرت مولانا نے میری لکھی ہوئی تقریر کو بہت پسند فرمایا تھا اور وہ عاریتہً مجھ سے لے لی تھی ، اُسکے بعد کئی سال تک وہ حضرت مولانا ہی کے پاس رہی اور حضرت نے کہیں کہیں اسمیں اصلاح و ترمیم بھی فرمائی ۔ اسکے بعد وہ میرے پاس واپس آئی ۔ میں نے مولانا عبدالوحید صاحب سے اسکے دیکھنے کی خواہش

ظاہر کی تو انھوں نے وہ تقریر میرے پاس بھیجدی ۔ میں نے اسکو دیکھا تو محسوس کیا کہ یہ مکتوب تقریر حضرت علامہ عثمانی رحؒ کے درس بخاری شریف کی بہت مستند اور نافع تقریر ہے اور ان کی خاص علمی تحقیقات اور مخصوص خداداد اسلوبِ خطاب وبیان اس میں قریب قریب جوں کے توں محفوظ ہیں ۔

اسکے بعد جب مولانا عبدالوحید صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے اپنا یہ احساس و تأثر بیان کیا اور کہا کہ اس کا تو یہ حق تھا کہ اس کو بالکل اسی طرح چھپوا دیا جاتا ، انھوں نے کہا کہ اسکی آرزو اور خواہش تو رہی لیکن اپنے میں استطاعت نہ تھی اور کسی دوسرے سے کہنا اچھا نہ معلوم ہوا ۔ میں نے کہا کہ اگر آپ خود اسکو چھپوا نہیں سکتے تو پھر اسکی اشاعت کا انتظام " جامعہ اسلامیہ ڈابھیل " کی طرف سے ہونا چاہیئے ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کر دیا اب یہ " جامعہ اسلامیہ ڈابھیل " ہی کی طرف سے شائع ہو رہی ہے ۔ ازراہ احتیاط یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ فن حدیث کے کوئی ماہر اور صحیح بخاری شریف کے کوئی باکمال استاذ اسکو ملاحظہ فرمالیں تاکہ اگر کہیں کوئی سہو قلم محسوس ہو یا کوئی بات وضاحت طلب ہو تو اسکی اصلاح یا توضیح کر دیجائے اسکے لئے محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ العالی سے عرض کیا گیا اور حضرت ممدوح نے قبول فرمالیا ۔ اب یہ حضرت ممدوح مدظلہ العالی کی نظر سے گذرنے کے بعد شائع کیجا رہی ہے ۔

راقم سطور کا خیال ہے کہ جن اہل علم اور طالبان حدیث نے حضرت مولانا کو نہیں پایا وہ اسکے ذریعہ گویا حضرت کا درس بخاری سن سکتے ہیں ۔ اور ان کے خاص علوم و تحقیقات سے مستفیض ہو سکتے ہیں ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگِ گل ہر کہ ذوق دید دارد در سخن بیند مرا

اللہ تعالیٰ حدیث نبوی اور اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح بخاری شریف کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور نافع بنائے اور صاحب تقریر حضرت علامہ عثمانی رحؒ اور اسکے قلمبند کرنے والے مولانا عبدالوحید صاحب فتحپوری اور اسکی اشاعت کا اہتمام کرنیوالے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے مہتمم مولانا محمد سعید صاحب بزرگ اور اس پر نظر ثانی فرمانے والے مخدومی حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی مدظلہ العالی کے لئے اور سب اصحاب خیر کے لئے جنھوں نے اسکی اشاعت میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی مدد کی وسیلۂ سعادت و ذخیرۂ آخرت بنائے ۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔

لکھنؤ

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۲۳ ؍ رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ ۸ ؍ ستمبر ۱۹۷۷ء یوم پنجشنبہ

تعارف و تقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا سید الکائنات وعلیٰ آلہ وصحبہ وحزبہ سادات الموجودات

راقم الحروف محمد عبد الوحید صدیقی ابن محمد عبد العزیز صدیقی محرم ۱۳۲۶ھ (مطابق فروری ۱۹۰۸ء) بمقام فتحپور۔ یوپی۔ پیدا ہوا۔ والد صاحب مرحوم و مغفور نے پیدائش ہی کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حافظ و عالم ہونے کی درخواست پیش کی۔ اور بالکل ابتدائی زندگی سے دینی تربیت فرمائی، سات سال کی عمر میں حفظ شروع کرایا اور پورے اہتمام سے نگرانی فرمائی دس سال پانچ ماہ کی عمر میں الحمد للہ حفظ پورا ہو گیا تو خود اسکے دور کا کام اپنے ذمہ لیا اور ایسا انہماک ہوا کہ پندرہ پندرہ پارے یومیہ سنکر رمضان المبارک سے پہلے پہلے خوب پختہ کرا دیا۔ حضرت مولانا سید محمد ظہور الاسلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی مدرسہ اسلامیہ فتحپور وخلیفہ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ نے تراویح میں پورا کلام پاک سنا اور خوش ہو کر عالم ہونے کی دعا دی۔ والد مرحوم اور سب حاضرین نے آمین کہی۔ پھر خود ہی فارسی شروع کرائی۔ کچھ دن پڑھانے کے بعد فرمایا۔ اب تم عربی شروع کرو تم سے کچھ اور کام لینا ہے، اور خود ہی عربی شروع کرائی اور پابندی کیساتھ اسباق پڑھاتے رہے اور انتہائی شفقت سے پڑھاتے رہے۔ فروری ۱۹۲۱ء میں بیمار ہوئے مگر میرا سبق برابر ہوتا رہا، حتیٰ کہ بیماری بڑھی اور ۲ رمارچ ۲۱ء تک سبق ہوا تھا کہ مرض بہت بڑھ گیا اور ۳ رمارچ کو اپنے ماموں زاد بھائی مولوی حکیم سید عبد الحمید صاحب ڈلموی سے فرمایا کہ آج اس کا سبق تم پڑھا دو ناغہ نہ ہو۔ تعمیل حکم میں انھوں نے اس دن پڑھا دیا، ۴ رمارچ ۲۱ء یوم جمعہ کی صبح کو انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ، اور میرا سبق بند ہو گیا۔ پھر چند دنوں بعد مدرسہ اسلامیہ فتحپور میں داخلہ ہو گیا۔ قدوری تک تعلیم پہونچی تھی کہ والد صاحب مرحوم نے استاذ محترم ماسٹر حاجی ریاض الدین صاحب کے ذریعہ سے جو اُس وقت گورنمنٹ ہائی اسکول علیگڈھ میں ملازم تھے مجھے مدرسہ عربیہ حافظیہ سعیدیہ ریاست دادون ضلع علیگڈھ میں داخل کر دیا۔ یہ مدرسہ ضلع علیگڈھ کی ایک ریاست دادون کے رئیس نواب محمد ابو بکر خانصاحب مرحوم نے صرف اپنی ذاتی آمدنی سے قائم کیا تھا اور اس کے مصارف کے لئے اپنی جائداد کا ایک حصہ وقف کر دیا تھا، وہاں میری خوش قسمتی سے ایک بہت ہی شفیق استاذ و مربی حضرت مولانا مولوی حافظ وجیہ الدین احمد خانصاحب مدظلہٗ بعہدہ صدر مدرسی فائز تھے (بعد میں وہ مدرسہ عالیہ رام پور کے پرنسپل ہو گئے اور اب وہاں سے پنشن پا کر اپنا دینی مدرسہ رام پور ہی میں چلا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سایہ کو دائم وقائم

رکھے آمین) انھوں نے میرے ساتھ خاص عنایت و سرپرستی کا معاملہ فرمایا۔ مولانا ممدوح مدرسہ عالیہ رام پور کے ممتاز فاضل اور حدیث میں حضرت العلامہ سید محمد انور شاہ کشمیری و حضرت العلامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہما کے شاگرد رشید تھے۔ انھوں نے مجھے انتہائی شفقت سے پڑھایا اور صحیح معنی میں میری علمی تربیت فرمائی۔ مطالعہ کرنے کا ذوق پیدا فرمایا اور مطالعہ کرنے کے آداب تلقین فرمائے جس سے ساری عمر مجھے فائدہ پہونچتا رہا اور ابتک پہونچ رہا ہے ۱۹۳۰ء تک میں اس مدرسہ میں رہا اور جلالین، ہدایہ مدارک، میرزاہد رسالہ، حمداللہ وغیرہ تک کتابیں پڑھیں ۱۹۳۰ء میں وہاں سے رام پور ریاست میں آکر "مدرسہ عالیہ" میں داخلہ لیا۔ درجہ سوم میں داخلہ ہوا، جسمیں ہدایہ ثالث، حمداللہ، شرح ہدایۃ الحکمۃ وغیرہ کتب تھیں۔ سالانہ امتحان میں اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کی طرح درجہ میں اول کامیاب کیا جسکی بنا پر انعامی وظیفہ کا مستحق ہوا۔ اگلے سال درجہ دوم میں بیضاوی شریف۔ ہدایہ رابع۔ قاضی مبارک۔ صدرا وغیرہ پڑھیں۔ امسال بھی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے امتحان سالانہ میں اول کامیاب ہوا اور انعامی وظیفہ حاصل کیا۔ اس کے بعد درجہ اول میں (جو یہاں کا آخری اور انتہائی درجہ تھا) شمس بازغہ۔ میرزاہد، امور عامہ۔ مقامات بدیع۔ طحاوی شریف وغیرہ پڑھیں۔ یہ درجہ امام الحکمۃ حضرت مولانا فضل حق صاحب رامپوری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھا جو اس وقت مدرسہ عالیہ رامپور کے پرنسپل (صدرالمدرسین) تھے اور مولانا عبدالحق صاحب خیرآبادی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور فن حکمت کے امام تھے میرزاہد امور عامہ پر انکا ایک علمی حاشیہ ہے جو طبع ہو چکا ہے۔ یہ سال چونکہ سند فراغ ملنے کا تھا اس لئے پچھلے سالوں سے بھی زیادہ محنت کی اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے مدرسہ عالیہ رامپور کی تاریخ میں پہلی بار یو۔ پی کے ایک طالب علم کو اول ڈویژن اور اول نمبر کی کامیابی حاصل ہوئی فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

دورانِ سال ہی میں اپنے استاذ شیخ الجامعہ کے توسط اور سفارش کے ساتھ حضرت العلامہ سید محمد انور شاہ کشمیری شیخ الجامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں درخواست ارسال کی کہ اگلے سال جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حدیث پاک پڑھنے کے لئے داخلہ منظور فرمالیا جائے۔ حضرت شاہ صاحب اور حضرت العلامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہما سے حدیث شریف پڑھنے کی ترغیب بھی استاذ محترم حضرت مولانا حافظ وجیہ الدین احمد خانصاحب رامپوری مدظلہ العالی نے دی تھی اس غریب طالب علم پر حضرت مولانا کا یہ خاص الخاص احسان تھا کہ حدیث پاک کی تعلیم کے لئے ان بزرگوں کے پاس حاضری کی ترغیب ہی نہیں بلکہ حکم دیا ورنہ رام پوری مکتبۂ فکر کا عام ذہن یہ تھا کہ مسائل تو سب فقہ میں آجاتے ہیں حدیث تو بس تبرک کے طور پر پڑھ لینی چاہیئے یہی مجھ سے بھی کہا گیا مگر اللہ تعالیٰ دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے حضرت مولانا وجیہ الدین صاحب کو جنھوں نے ان بزرگوں کے قدموں تک پہونچا دیا۔ درخواست کی منظوری ابھی نہیں آئی تھی کہ ایک شب میں نے خواب میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا اس سے پہلے کبھی حضرت کی زیارت نہیں کی تھی۔ خواب ہی میں عرض کیا کہ میں ڈابھیل آکر حدیث پاک پڑھنا چاہتا ہوں آپ اجازت دے دیں ہنس کر فرمایا اجازت ہے آجاؤ انشاء اللہ ضرور پڑھاؤنگا۔ صبح کو مدرسہ پہونچکر اپنے بعض ساتھیوں سے خواب بیان کیا تو ایک ساتھی مولوی عزیز الرحمن صاحب پشاوری نے کہا حلیہ بتاؤ کیا تھا، میں نے بتایا قد دراز۔ ڈاڑھی بھری ہوئی بدن

سڈول - سفید عمامہ باندھے ہوئے، نگاہیں جھکی ہوئی - کہنے لگے میں نے حضرت مولانا کو دیکھا ہے بالکل یہی حلیہ ہے، تم نے صحیح دیکھا، جاؤ مبارک ہو میں بہت خوش ہوا اور اسے فال نیک سمجھا چند دنوں بعد منظوری بھی آگئی - بعد رمضان میں نے شوال ۱۳۵۱ھ کے ابتدائی عشرہ میں اپنے ایک آٹھ سالہ رفیق درس مولوی سید مسعود علی صاحب علیگڈھی کے ساتھ ڈابھیل پہونچ گیا۔ اس وقت اساتذہ میں سے حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی پہونچ چکے تھے۔ جلد ہی داخلہ کے امتحان کا اعلان ہوا اور دورہ کے طلبہ کا امتحان حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد ہوا۔ میں نے تازہ پڑھی ہوئی درسی کتب، قاضی مبارک - صدرا - حماسہ اور طحاوی شریف میں امتحان دیا اور ضابطہ کے مطابق داخلہ کے امتحان کے بعد الحمدللہ دورۂ حدیث میں داخلہ منظور ہوگیا - اسباق کی تقسیم کا اعلان اس طرح کیا گیا کہ بخاری شریف حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اور ترمذی شریف حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے پاس اور ابوداؤد شریف اور مسلم شریف حضرت مولانا سراج احمد صاحب رشیدی کے پاس - پہلے حضرت مولانا سراج احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اسباق شروع ہوئے۔ پہلے ہی دن فرمایا جبکہ ابوداؤد شریف شروع کرائی کہ کتاب مجھ سے حل کرو - اور تقریر حضرت شاہ صاحب اور مولوی شبیر احمد صاحب کی سننا - حقیقت یہ ہے کہ کتاب کا حق ادا فرماتے اور اس خوبی سے مسلک حنفی کے ساتھ احادیث کی تطبیق فرماتے کہ ذرا بھی اشکال باقی نہ رہتا تقریر طویل نہ ہوتی مگر مسئلہ پوری طرح منقح ہو جاتا - چند ہی دن گذرے تھے کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب دیوبند سے تشریف لے آئے اور ساتھ ہی یہ خبر لائے کہ حضرت شاہ صاحب کی طبیعت ناساز ہے ابھی نہ آسکیں گے - آنے کے بعد ہی ترمذی شریف کا سبق شروع ہوا - پہلے ہی دن کے سبق کا قلب پر یہ اثر پڑا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑا ہی فضل فرمایا کہ اس مبارک درسگاہ تک اور ان بلند پایہ اساتذہ تک پہونچا دیا - اس پر جسقدر بھی اس کا شکر ادا کیا جائے کم ہے - اس وقت میرا حافظہ بہت اچھا تھا پوری تقریر محفوظ ہوگئی لیکن معاً یہ خیال آیا کہ اس حافظہ کا اعتبار نہیں کچھ دنوں بعد یہ تقریریں اور یہ خاص علمی مباحث ذہن میں نہ رہیں گے اور پھر ان سے استفادہ ممکن نہ رہے گا اسلئے یہ تقریریں اسی تفصیل کے ساتھ لکھ لینا چاہیئے اسی دن سے درسگاہ میں درس کے ساتھ ہی لکھنا شروع کر دیا - اور اللہ ہی کا فضل شاملِ حال رہا کہ اس نے لکھنا آسان کر دیا - کوشش یہ کی کہ تقریر حتی الوسع حضرت ہی کے الفاظ میں ضبط کیجائے حضرت اپنے وقت کے مسلّم صاحب لسان وصاحب بیان تھے - تقریر کا طرز بہت ہی پروقار اور دلنشین تھا مشکل حقائق ومضامین کو سہل الفہم کر کے بیان کر دینا آپکا خاص کمال تھا - رک رک کر تقریر فرماتے مگر روانی میں فرق نہ آتا - لکھنے والا اگر متوسط رفتار سے لکھتا رہے تو پوری تقریر لکھ سکتا تھا میں نے یہی کوشش کی اور الحمدللہ اسی کے کرم سے پوری تقریر لکھی جاتی رہی - ادھر یہ اسباق - ترمذی شریف - ابوداؤد شریف - مسلم شریف جاری تھے ادھر تمام طلبہ کو شاہ صاحب کا بے چینی سے انتظار تھا لیکن اطلاعات مایوس کن آنے لگیں تو دل ٹوٹنے لگے دورۂ حدیث کی اس جماعت میں متعدد طلبہ وہ تھے جو بعض مدارس کے اچھے اساتذہ تھے اور صرف شاہ صاحب سے استفادہ کی خاطر آئے تھے مگر العبد یدبر واللہ یقدر

ماہ صفر میں ان کے وصال کی اطلاع نے سب کو غمزدہ۔ افسردہ و پژمردہ کردیا اور اس فیض و شرف سے ہم سب محروم ہو گئے۔ مدرسہ میں ایصالِ ثواب کے لئے قرآن خوانی ہوئی اور جلسۂ تعزیت ہوا۔ اس میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے فرمایا تم کو تو افسوس ہونا ہی چاہئیے کہ تم شاہ صاحب کے فیوض کی تمنا میں طویل سفر کرکے یہاں آئے تھے لیکن تمہاری تسلی کا سامان تو پھر بھی فراہم ہو ہی جائے گا روتے ہم ہیں کہ ہمارے سروں پر ان کا سایہ نہ رہا۔ مشکل سے مشکل سے مقام جو ہفتوں کی کتب بینی اور تلاش سے حل نہ ہوسکتا تھا شاہ صاحب کے پاس پہونچتے ہی منٹوں میں ایسا حل ہوجاتا تھا کہ گویا کچھ تھا ہی نہیں پھر شاہ صاحب کے وسعت علمی اور قوت حافظہ کے متعدد واقعات بیان فرمائے۔ ان میں سے ایک ناظرین کرام بھی ملاحظہ فرمالیں۔ فرمایا پارہ ۲۳ سورۂ "ص" میں سیدنا داؤد علیہ السلام کے ایک امتحان کا ذکر ہے کہ اچانک چھت سے کود کر دو آدمی ان کی خلوت گاہ میں جہاں وہ مصروف عبادت تھے پہونچے اور کہا کہ ہم دو فریق ہیں جھگڑا ہے آپ اسے طے کردیں اور ابھی طے کریں حضرت داؤد علیہ السلام ان کے اس طرح خلل انداز ہونے سے مکدر اور پریشان ہوئے اور ان کی خلوت مع اللہ اور عبادت میں خلل پڑگیا۔ اور فیصلہ کرنے لگے یہ مجمل واقعہ ہے۔ اسرائیلیات میں بہت بھونڈے طور پر حضرت داؤد علیہ السلام پر رکیک اخلاقی الزامات لگائے گئے ہیں۔ اہل حق مفسرین نے متفقہ طور پر حضرت داؤد علیہ السلام کی برارت کا اعلان کیا ہے اور صاف صاف کہا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نبی تھے اور انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں ان سے صغیرہ کا صدور بھی نہیں ہوتا نہ کہ کبیرہ کا اس لئے یہ اہل کتاب کا بہتان ہے۔ یہ تو اہل حق کی متفق علیہ بات تھی جس سے ایک معصوم نبی کی فحش سے برارت ہوگئی۔ مگر یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ فی الحقیقت وہ واقعہ کیا تھا جس کو قرآن نے "فَتَنَّاہُ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

حضرت العلامہ عثمانی نے فرمایا کہ میں نے فوائد القرآن لکھنے کے سلسلے میں اس واقعہ کی تحقیق میں تمام کتب متداولہ چھان ڈالیں جہاں جہاں اس کی تفصیل ملنے کا امکان تھا سب کچھ دیکھ لیا مگر مشکل حل نہ ہوئی ہفتہ بھر کی چھان بین کے بعد مجبوراً شاہ صاحب کے پاس اسوقت حاضر ہوا جبکہ وہ قیلولہ فرمانے کو لیٹ گئے تھے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھے اور فرمایا اسوقت کیسے تکلیف کی۔ میں نے سارا ماجرا کہہ سنایا اور یہ بھی کہہ دیا کہ تمام متداول کتابیں چھان چکا ہوں کہیں کوئی تشفی بخش بات نہیں ملی۔ آپ کے ذہن میں کوئی چیز ہو تو بیان فرمائیں۔ فرمانے لگے ایک چیز ذہن میں ہے آپ کو دکھاتا ہوں شاید آپ کا کام نکل سکے یہ فرماکر اٹھے اور الماری سے مستدرک حاکم نکال لائے اور بالکل غیر متعلق جگہ سے ایک روایت سامنے کردی کہ اسے پڑھئے۔ بس اسے پڑھنا تھا کہ سب گرہیں کھل گئیں اور پورا مسئلہ حل ہوگیا۔ شاہ صاحب کی اس وسعت علمی اور قوت حافظہ پر ششدر رہ گیا جو مسئلہ ہفتوں کی چھان بین سے حل نہ ہوسکا تھا شاہ صاحب نے منٹوں میں اس طرح حل کردیا گویا کہ وہ اسکے لئے ابھی تیاری کرکے بیٹھے تھے۔ پھر فرمایا یہ تھے شاہ صاحب۔ اللہ تعالیٰ کی ہزارہا ہزار رحمتیں شاہ صاحب پر جو ہم کو یتیم کرکے اللہ کے قرب میں پہونچ گئے۔

(نوٹ) واقعہ طویل ہے یہاں بیان کرنے کی گنجائش نہیں حضرت الاستاذ علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے فوائد القرآن سورۂ "ص"، آپ پڑھ لیں اس سانحہ کے بعد بخاری شریف کا سبق حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد ہوا اور ترمذی شریف جو اس وقت تک باب مَاجَاءَ فی الترجیع فی الاذان کے ختم تک ہو چکی تھی حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آگئی جس کا پہلا سبق ۱۳ رصفر ۵۲ھ یوم چہارشنبہ کو باب فی افراد الاقامۃ سے شروع ہوا حضرت علامہ عثمانی کے ہاں ۱۳ رصفر ۵۲ھ یوم چہارشنبہ بوقت ساڑھے آٹھ بجے صبح بخاری شریف کا سبق شروع ہوا۔ میں چونکہ ترمذی شریف کے درس میں حضرت الاستاذ علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی وسعت علم ونظر سے بہت زیادہ متأثر اور طرز تقریر سے مانوس ہو چکا تھا اسلئے اہتمام کے ساتھ بخاری شریف کی تقریر بھی لکھنی شروع کر دی کچھ دنوں بعد ایک شب جب میں حضرت کی خدمت میں کچھ پوچھنے کے لئے بعد نماز عشار حاضر ہوا تو دریافت فرمایا تم جو درس میں لکھتے ہو یہ صرف نوٹ ہوتے ہیں یا پوری تقریر بخاری کی لکھ رہے ہو میں نے عرض کیا حضرت کی پوری تقریر لکھتا ہوں فرمایا جو کچھ اب تک لکھ چکے ہو مجھکو دکھلانا اگلے دن میں نے لکھے ہوئے اجزار حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب صدیقی خادم خاص حضرت مولانا کے ذریعہ حضرت تک پہنچا دیئے۔ چند دنوں بعد وہ اجزار واپس فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ میں نے میں نے یہ کل اجزار دیکھ لئے ہیں تم ڈھنگ سے لکھ رہے ہو اسی طرح لکھتے رہو اور جہاں کچھ رہ جائے یا کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو یہاں آکر پوچھ لیا کرنا۔ موقعہ پاکر میں نے اپنا وہ خواب بیان کر دیا جو رام پور میں پچھلے سال دیکھا تھا تو بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ تعبیر تو سامنے آگئی کہ تم نے خواب میں دیکھا تھا کہ میں نے وعدہ کیا ہے اب اللہ نے تمہارا خواب سچا کر دکھایا اور میرا خواب کا وعدہ پورا کرا رہا ہے پھر جب کوئی بات قابل دریافت ہوتی تو میں بعد نماز عشار حاضر ہو جاتا اور پیر دبانے لگتا پھر اپنی بات عرض کرتا حضرت پورے انبساط کے ساتھ مسئلہ کی تقریر فرماتے کبھی کبھی جاڑے کی راتوں کے گیارہ بج جاتے مگر تقریر پوری فرما دیتے۔ اس طرح حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے برابر فیض حاصل ہوتا رہا میری بڑی خوش قسمتی تھی کہ اس تعلیمی سلسلے میں مجھے حضرت کی خاص نظر عنایت وشفقت نصیب رہی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حضرت مولانا کسی سوال پر مکدر ہوئے ہوں۔ ہمیشہ مسرت دبشاشت کا اظہار فرماتے اور پوری شفقت کے ساتھ جواب عنایت فرماتے جس سے پورا انشراح واطمینان حاصل ہو جاتا۔

چونکہ بخاری شریف تاخیر سے شروع ہوئی تھی اسلئے اس سال حضرت نے بڑی محنت فرمائی حتیٰ کہ وہ فضلار اور اساتذہ جو حضرت شاہ صاحب ہی سے استفادہ کی غرض سے آئے ہوئے تھے اور برسوں پڑھا کر آئے تھے وہ بھی بہت ہی خوش اور مطمئن رہے۔ کچھ ہی دنوں بعد عصر کے بعد بھی سبق ہونے لگا۔ اس محنت شاقہ کا اچھا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۳ ررجب ۱۳۵۲ھ کو بخاری شریف ختم ہوگئی۔ پورے سال اللہ تعالیٰ کا معاملہ میرے ساتھ بڑے ہی لطف وکرم کا رہا بحمداللہ ایک سبق بھی ناغہ نہیں ہوا

میں نے اپنی اس لکھی ہوئی تقریر میں اس کا التزام اول دن ہی سے رکھا کہ تاریخ درس مسلسل لکھتا رہا۔ جہاں سے سبق شروع ہوتا حاشیہ پر تاریخ لکھ دیتا۔

امتحان سالانہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے انتہائی کرم فرمایا اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی تاریخ میں پہلی بار دورۂ حدیث میں یو۔پی کا طالب علم (جنکو وہاں ہندوستانی کہا جاتا تھا) اول نمبر پر کامیاب ہوا یہ محض اللہ کا فضل وکرم تھا ورنہ اُس سال دورۂ حدیث میں وہاں بڑے ذہین وذی استعداد طلبہ اور بعض وہ حضرات بھی شریک تھے جو برسوں پڑھا چکے تھے۔

بعد امتحان جلسۂ دستار بندی ہوا۔ جس میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحب رحمۃ اللہ علیہما تشریف لائے تھے۔ بہت کامیاب جلسہ ہوا۔ تقریروں کے بعد تقسیم اسناد اور دستار بندی کی گئی۔ مدرسہ میں تعطیل کا اعلان ہوا اور طلبہ اپنے اپنے وطن جانے کے لئے رخت سفر باندھنے لگے۔ میں نے بھی تیاری کی اساتذہ سے ملنے کے بعد آخر میں حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بہت خوش ہوئے۔ اول پاس ہونے پر مسرت کا اظہار کیا اور فرمایا تمہاری منطق تمہارے کام آگئی اور تم کو اول نمبر کی کامیابی حاصل ہوئی۔ معانقہ کے ساتھ رخصت فرمایا اور حکم دیا کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب سے تعلق قائم رکھنا۔ وہاں سے حضرت مولانا عثمانی کی خدمت میں آخری سلام کیلئے حاضر ہوا تو حضرت نے کامیابی پر مبارک باد دی اور بہت سی دعائیں دیں اور فرمایا کہ اپنی لکھی ہوئی تقریر مجھے دے دو۔ میں دیکھ کر واپس کر دوں گا۔ مجھے اس سے بڑی مسرت ہوئی کہ حضرت خود ملاحظہ فرمالیں گے تو انشاء اللہ جو غلطیاں اس میں ہوئی ہوں گی ان کی اصلاح ہوجائے گی اور تقریر مستند ہوجائے گی۔ میں نے پوری تقریر جو خاصی ضخیم تھی پیش کردی۔ حضرت نے مولانا محمد یحیٰی صاحب کو حوالہ کرتے ہوئے فرمایا اسے احتیاط سے بکس میں رکھ دینا میں حضرت سے رخصت ہوکر وطن چلا آیا۔ اواخر شعبان ۵۲ھ ہی میں گھر سے حضرت والا کے پاس دیوبند عریضہ ارسال کیا اور اس میں درخواست کی کہ مدرسہ کی سند تو مل گئی مگر تمنا ہے کہ حضرت والا اپنے قلم سے چند الفاظ تحریر فرمادیں تو وہ میرے لئے اصل سند وباعث صد افتخار ہوں گے۔ حضرت والا نے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا وہ حضرت ہی کے الفاظ میں پڑھ لیں۔

از بندہ شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ بمطالعہ برادر عزیز سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام مسنون آنکہ خط پہونچا الحمد للہ بندہ خیریت سے ہے۔ نزلہ وغیرہ میں کمی ہے۔ البتہ عزیزم مولوی محمد یحییٰ سلمہ بیس بائیس روز سے چوتھیا بخار میں مبتلا ہیں۔ مسہل بھی ہوئے لیکن بخار نہیں رکا۔ دعا کرتے رہیں۔ اپنے والد ماجد کی خدمت میں میرا سلام عرض کردیں۔ انشاء اللہ چند روز میں کوئی تحریر بطور سند لکھ کر تمہارے پاس روانہ کردونگا۔ دس پانچ روز میں مجھے ذرا یاد دلا دینا۔ بندہ تم کو ان طلبہ میں سمجھتا ہے جن پر مدرسہ فخر کرسکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت سے امیدوار ہے کہ آئندہ تم کو بہت کچھ ترقی نصیب کرے گا۔ والسلام

از دیوبند ۴ / رمضان المبارک ۵۲ھ

بہت دن اسکے بعد گزر گئے ۔ پھر حضرت والا نے ۸ رشوال ۱۳۵۵ھ کو ایک والا نامہ تحریر فرمایا جو اجازت پر مشتمل تھا اور حضرت والا کے دست اقدس سے سند حدیث اور اس کے درس کی اجازت تھی ۔ حضرت ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

بعد حمد و صلوٰۃ گزارش آنکہ برادر عزیز مولوی حافظ عبدالوحید صدیقی فتحپوری ریاست رام پور وغیرہ میں فنون کی تکمیل کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت میں بغرض تحصیل علم حدیث ۱۳۵۲ھ میں داخل ہوئے اوسی سال حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی (جو اپنے زمانہ میں باعتبار علم وفضل و جامعیت کمالات نظیر نہیں رکھتے تھے) وفات ہوئی تھی لہذا برادر مذکور مع اپنے رفقاء کے اس عاجز ہیچمدان کے پاس تحصیل بعض کتب حدیث میں مشتغل ہو گئے (صحیح بخاری ابتدا سے انتہا تک اور جامع ترمذی کا ایک حصہ اور دوسری کتب حدیث جامعہ اسلامیہ کے دوسرے اساتذہ کے ہاں ختم کیں، عزیز مذکور کی نجابت وسعادۃ ۔ خوش اخلاقی ۔ تہذیب ۔ حق شناسی اور تحصیل علم میں انتہائی کاوش کو دیکھتے ہوئے سب اساتذہ اور منتظمین جامعہ ان سے خوش رہے ۔ اور میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ میری عمر میں بہت تھوڑے طالب علم ایسے آئے ہیں جنمیں باوجود نوعمر ہونے کے صلاح ورشد ۔ ذکاوت وفطانۃ ۔ علمی استعداد اور ذوق صحیح اس طرح جمع ہوئے ہوں ۔ مجھے اللہ کے فضل سے ان کی نسبت بہت اچھی توقعات ہیں اسلئے ان کو اجازت دیتا ہوں کہ کتب حدیث کے درس میں بشروطہ المعتبرہ مشتغل رہیں اور علم دین کی خدمات ممکنہ انجام دیتے رہیں ۔ اللہ تعالیٰ ہمارا سب کا خاتمہ اپنی خوشنودی میں فرمائے وھو الھادی الی سواء السبیل

شبیر احمد عثمانی دیوبندی عفا اللہ عنہ ۸ رشوال ۱۳۵۵ھ

(نوٹ) بوقت تحریر بالا حضرت دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم تھے ۔

میری لکھی ہوئی تقریر حضرت ہی کے پاس تھی کہ حضرت نے اگلے سال ۶ رصفر ۱۳۵۶ھ میں والا نامہ تحریر فرمایا ،

از بندہ شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ بمطالعہ برادر عزیز سلمہ اللہ تعالیٰ ۔ بعد سلام مسنون آنکہ تمہارے کئی خط پہونچے ۔ میں پہلے تو مشغول رہا پھر تکلیف دانتوں میں ہوگئی اونکے نکلوانے میں کئی روز سے مبتلا ہوں ۔ اب نیچے کے سب نکل گئے اوپر کے پانچ باقی ہیں وہ بھی ہفتہ عشرہ مین نکل جائیں گے اوسکے تین مہینہ بعد مصنوعی دانت لگوانے کا خیال ہے ۔ کھانے پینے کی بہت دقت ہے اور بولنے میں بھی قدرے تکلف ہوتا ہے ۔ کئی روز سے سبق بھی نہیں پڑھایا ۔ آپ سے کسی طرح کی ناراضی نہیں بلکہ تمہاری محبت اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں ۔ اور برابر خیال ہے کہ کسی مناسب موقع پر تمہیں کام میں لگا دیا جائے ۔ اپنے پاس یا کسی اور جگہ تم کچھ فکر مت کرو انشاء اللہ کوئی مناسب صورت نکل آئے گی ۔ ربیع الاول کے آخر میں قصد حیدر آباد جانے کا ہے وہاں کوئی موقع ہوا تو خیال رکھا جائے گا بہر حال میں تمہاری خیر خواہی سے غافل نہیں ۔ تمہاری لکھی ہوئی تقریر سے مجھے اسال

بہت سہولت ہوگئی۔ لیکن اوسکو ذرا مرتب و مہذب کرنے کا خیال ہے۔ اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہا کرو۔ اپنے والد صاحب اور جملہ اعزہ واقارب سے بندہ کا سلام کہدیں اور میری صحت کے لئے دعا کرتے رہیں۔ از ڈابھیل ۶ر صفر ۱۳۵۳ھ

چونکہ اس خط کی روشنائی بہت ہلکی ہوگئی ہے اس لئے عکس صاف نہیں ہیں نے اسی غرض سے اپنے قلم سے اس تحریر کا نقل کردیا ہے کہ اب تحریر کا پڑھنا انشاء اللہ آسان ہوجائے گا۔

مجھ کو اس جملہ سے کہ "تمہاری لکھی ہوئی تقریر سے مجھے امسال بہت سہولت ہوگئی" جسقدر خوشی ہوئی اس کا اندازہ بھی ہر ایک کو نہیں ہوسکتا۔ پھر اس کا اظہار کہ اس کو مرتب و مہذب کرنے کا خیال ہے کیسا خوش کن اور حوصلہ افزا ہے۔ اسکے بعد یہ تقریر برسوں حضرت ہی کے پاس رہی۔ حضرت والا نے حرف حرف اسے پڑھا کہیں کہیں اس پر حاشیے بھی تحریر فرمائے۔ جا بجا تصحیح بھی فرمائی۔ کہیں کتب کا حوالہ بھی دیا کہ وہاں دیکھو۔ غرض پوری تقریر من اولہ الی آخرہ حضرت علامہ کی نگاہ سے گذر گئی۔ ۴ر صفر ۱۳۵۷ھ کے ایک دار الاقامہ میں کچھ اجزاء واپس فرماتے ہوئے تحریر فرمایا

از بندہ شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ بمطالعہ برادر عزیز سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام مسنون آنکہ۔ عدیم الفرصت بہت ہوں اس لئے جواب خطوط میں تاخیر ہوجاتی ہے۔ کچھ اور خیال نہ کریں۔ وہ تو میں سمجھتا ہوں کہ تم یہاں آنے سے معذور رہے۔ عذر واضح ہے مجھے اس پر ملال کیوں ہوتا۔ آپ مطمئن رہیں۔ الخیر فیما وقع۔ بقیہ اجزاء تقریر کے عنقریب روانہ کردیئے جایں گے۔ اپنے والد۔ چچا۔ ماموں صاحبان کو اور سب گھر والوں کو سلام مسنون کہدیجئے۔ عزیزم مولوی محمد یحییٰ سلمہ کی طرف سے سلام مسنون۔ از ڈابھیل ضلع سورت ۴ر صفر ۵۷ھ

یہ سنہ ستاون یعنی پانچ سال بعد کا دار الاقامہ ہے واقعہ یہ تھا کہ حضرت والا میری لکھی تقریر کی نقل کرا رہے تھے۔ جتنی نقل ہوجاتی واپس فرمادیتے اور صفر ۵۷ھ تک جو اجزاء باقی رہ گئے تھے وہ وہی تھے جنکی نقل نہ ہوسکی تھی۔ اسکے بعد یہ اجزاء بھی نقل ہونے کے بعد حضرت والا نے واپس فرمادئے۔ الحمدللہ وہ پوری تقریر کتابی شکل میں میرے پاس محفوظ ہے۔

میں قریب قریب ہر سال رمضان المبارک میں حضرت کی خدمت میں حاضری دیتا رہتا۔ اس درمیان میں حضرت نے متعدد بار فرمایا اور تحریر بھی فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ تم میرے پاس رہو مگر میں اپنی والدہ مرحومہ کی پیرانہ سالی کیوجہ سے نہ جاسکا۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی صدارتِ تدریس کے زمانہ میں حضرت نے دوبارہ جامعہ میں تدریس کی خدمت کے لئے طلب فرمایا۔ پھر دار العلوم دیوبند کی صدارتِ اہتمام کے دور میں دار العلوم کے تکمیل معقولات کے درجہ کے لئے انتخاب فرمایا اور طلب فرمایا مگر یہ ناچیز اپنی مجبوریوں کی وجہ سے تعمیل کی سعادت حاصل نہ کرسکا۔ یا یوں سمجھ لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے "مدرسہ اسلامیہ فتحپور" ہی کی خدمت مقدر ہوچکی تھی اسلئے قدم کہیں نہ نکل سکے۔ حتیٰ کہ قریب تر جگہ لکھنؤ دار العلوم ندوۃ العلماء کے لئے مخدومی حضرت مولانا محمد منظور نعمانی اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہما العالی نے متعدد بار طلب فرمایا مگر وہاں بھی حاضری نہ ہوسکی۔ تب میں سمجھا کہ بانی مدرسہ اسلامیہ فتحپور حضرت مولانا شاہ سید

محمد ظہور الاسلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے عربی شروع کراتے وقت جو جملہ فرمایا تھا کہ تم عربی شروع کرو تم سے کچھ اور کام لینا ہے دراصل یہی مدرسہ اسلامیہ کا کام لینا تھا۔ چونکہ وہ ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے اگر انھیں یہ کشف ہوا تو تعجب نہیں۔ یفعل ما یشاء ویحکم ما یرید۔

فراغت کے بعد جب سے فتحپور میں قیام ہوا تھا اسی وقت سے حضرت مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے بار بار امر فرمایا کہ محلہ کی مسجد میں درس قرآن شروع کر دو۔ اس سے تم کو بھی فائدہ ہوگا اور سامعین کو بھی مگر خالصاً لوجہ اللہ اور احتساباً کرنا معاوضہ کا خیال بھی نہ کرنا۔ ساتھ ہی مدینہ پریس بجنور کا شائع کردہ اپنے "فوائد القرآن" والا قرآن پاک ہدیۃً مرحمت فرمایا پھر والا نامہ آیا تو تاکید فرمائی اور جب میں نے تعمیل ارشاد میں درس قرآن شروع کر کے اطلاع دی تو بہت خوش ہوئے اور چند تفسیروں کے نام تحریر فرمائے کہ ان کو خاص طور سے مطالعہ میں رکھو۔ اللہ کا احسان ہے کہ اس سلسلے سے مجھ کو خود فائدہ پہونچا۔ اور قرآن پاک سے خصوصی لگاؤ پیدا ہو گیا۔ الحمد للہ ولہ الشکر والمنۃ کہ آج تک یہ سلسلہ جاری ہے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور میرے لئے وسیلۂ نجات بنائے۔ اور رہبری فرمانے والے حضرت الاستاذ رحمہ اللہ تعالیٰ کے مراتب قرب میں ترقی و ازدیاد نصیب فرمائے۔ آمین

میری دلی آرزو تھی کہ الاستاذ العلامہ حضرت مولانا عثمانی کی صحیح بخاری شریف کی یہ درسی تقریر (جس پر حضرت کی اصلاحی نظر بھی پڑ چکی تھی اور جس پر حضرت نے حواشی کی شکل میں اضافے بھی فرمائے تھے) کسی طرح چھپ جاتی مگر خود اپنے میں اس کی استطاعت نہ تھی اور کسی سے کہنے سے حیا مانع رہی تقریباً نصف صدی کی مدت اس طرح گزر گئی اور کوئی سبیل نہ رہی کہ اللہ تعالیٰ کی شان ھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمتہ کا ظہور ہوا اسطرح کہ مخدومی و محترمی حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ العالی کو مولانا نسیم احمد صاحب فریدی (امروہی) کے ذریعہ اس کا علم ہوا۔ اور حضرت مولانا کو یہ بھی انھیں مولانا نسیم احمد صاحب سے معلوم ہوا کہ حضرت العلامہ مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو اس تقریر سے خاص دلچسپی تھی اور حضرت ممدوح نے اپنے لئے اسکی ایک نقل دار العلوم دیوبند کے چند خاص طلبہ سے اجرت دیکر کرائی تھی جن میں ایک خود مولانا فریدی بھی تھے۔ ایک دفعہ اتفاق سے میرا جانا لکھنؤ ہوا تو حضرت مولانا نعمانی نے تقریر کے بارے میں دریافت فرمایا۔ میں نے پورا واقعہ عرض کر دیا۔ حضرت مولانا نے تقریر طلب فرمائی میں نے بھیجدی۔ مولانا نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ یہ حضرت مولانا عثمانی کی خاص یادگار اور ان کی علمی خصوصیات کی حامل ہے اسکو اسی طرح اور اسی حال میں چھپ جانا چاہیئے۔ یہ بھی فرمایا کہ اس کو آپ خود چھپوائیے یا پھر "جامعہ اسلامیہ ڈابھیل" کا حق ہے کہ وہ اس کو چھپوائے۔ چنانچہ جامعہ کے موجودہ مہتمم حضرت مولانا محمد سعید احمد بزرگ دامت فیوضہم سے اس سلسلہ میں خط و کتابت کی گئی اور بالآخر یہی طے ہو گیا کہ "جامعہ اسلامیہ" کی طرف سے اس کو چھپوایا جائے۔ مزید احتیاط و اطمینان کے لئے یہ بھی مناسب سمجھا گیا کہ اس پر ایک اصلاحی نظر محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ العالی کی پڑ جائے، تاکہ اگر کہیں مجھ سے بھول چوک ہوئی ہو یا عام ناظرین کو غلط فہمی سے بچانے کے لئے کسی مقام پر

وضاحت کی ضرورت محسوس ہو تو اصلاح یا توضیح کردیجائے۔ اسکے لئے حضرت ممدوح مدظلہ العالی سے درخواست کی گئی اور میری اور کتاب کی انتہائی خوش قسمتی کہ حضرت ممدوح نے شدید ضعف کے باوجود حضرت علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خصوصی تلمذ کے تعلق کی بنا پر اسکو منظور فرمالیا اور تقریر کا مسودہ بامعان نظر ملاحظہ فرمایا اور ضروری اصطلاحات و توضیحات فرمائیں

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کو اس کا بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے آمین،

پھر حضرت مولانا ہی سے اس پر مقدمہ لکھنے کی بھی درخواست کی گئی، حضرت ممدوح نے اس کو بھی بطیب خاطر منظور فرمایا، فالحمد للہ علی احسانہ، ناظرین کرام میری ان گذارشات کے بعد حضرت ممدوح کا مقدمہ بھی ملاحظہ فرمائینگے۔

سب سے آخر میں کتابت اور طباعت کا مرحلہ تھا، اس ہفت خواں کو طے کرنے کی مجھ میں بالکل صلاحیت نہ تھی، نہ میں اس کا کوئی انتظام ہی کرسکتا تھا، حضرت مولانا نعمانی نے حضرت مولانا اعظمی مدظلہ العالی کے فرزند اکبر مولانا رشید احمد اعظمی کو کسی نہ کسی طرح آمادہ کرلیا کہ وہ اس کی ذمہ داری قبول کرلیں۔ الحمد للہ کہ وہ آمادہ ہو گئے اور بتوفیقہ تعالیٰ ان کی توجہ اور محنت سے اتنا کام ہوگیا کہ کتاب کی پہلی جلد جو کتاب الایمان اور کتاب العلم پر مشتمل ہے، اور جو کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے شائع ہو رہی ہے۔

"یہ جلد اول" اس طرح شائع کی جارہی ہے کہ اوپر صفحہ کی پیشانی پر بخاری شریف کا اصل متن ہے پھر اس کا ترجمہ دیا گیا ہے۔ جو حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کا قدیم مستند ترجمہ ہے (اور حضرۃ الاستاذ العلامۃ رحمۃ اللہ علیہ بحیثیت ترجمہ اسکی تعریف و تحسین فرماتے تھے) اس ترجمہ کے بعد حضرۃ الاستاذ العلامہ کی تشریحی تقریر ہے،

اندازہ ہے کہ اس جلد کے بعد دو تین جلدیں اور ہوں گی اور تین یا چار جلدوں میں کتاب مکمل ہوجائے گی، اللہ تعالیٰ ان کی بھی اشاعت کا اسی طرح انتظام فرمادے، آمین،

میں صمیم قلب سے حضرت محدث جلیل مولانا الاعظمی مدظلہ العالی، حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ العالی حضرت مولانا محمد سعید احمد بزرگ (مہتمم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل) اور مولانا رشید احمد صاحب مفتاحی الاعظمی سب کا شکر گذار ہوں، اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو دنیا و آخرت میں اپنے فضل و کرم سے نوازے، اس کتاب کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، حدیث نبوی کے اساتذہ اور طلبہ کے لئے نافع بنائے، آمین!

کاش عالم برزخ کے ارواح میں صاحب تقریر حضرت الاستاذ العلامہ عثمانی رحمۃ اللہ کی روح کو اس کا علم ہوجائے اور خوشی ہو، وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ، وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

عَاصِیْ وَخَاطِیْ
محمد عبد الوحید فتحپوری

رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ مطابق ستمبر ۱۹۷۷ء

مختصر تذکرہ

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

[اس تذکرہ کے مندرجات زیادہ تر مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کے ایک مقالہ سے ماخوذ ہیں]

ولادت

مولانا کی ولادت ۱۰ محرم ۱۳۰۴ھ (مطابق ۱۸۸۵ء) کو ہوئی۔ ان دنوں ان کے والد ماجد مولانا فضل الرحمٰن عثمانی بریلی کے علاقہ میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے وہیں مولانا کی پیدائش ہوئی۔ والد صاحب نے نام "فضل اللہ" رکھا، لیکن دوسرا نام (غالباً عشرۂ محرم میں پیدائش کی مناسبت سے) "شبیر احمد" رکھا گیا اور اسی سے مشہور ہوئے

ابتدائی تعلیم

۱۳۱۲ھ میں دارالعلوم دیوبند کے درجہ قرآن کے استاذ حافظ محمد عظیم صاحب کے سامنے "بسم اللہ" کی تقریب ہوئی۔ اور قرآن مجید ہی کے ساتھ اردو کی کچھ کتابیں بھی پڑھیں۔ ۱۳۱۴ھ میں دارالعلوم ہی میں حساب کے مشہور استاذ منشی منظور احمد صاحب سے حساب اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اور فارسی کی اوپر کی کتابیں استاذ الکل مولانا محمد یٰسین صاحب (والد ماجد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب) سے پڑھیں۔

عربی تعلیم اور فراغت

۱۳۱۹ھ میں دارالعلوم میں عربی کی تعلیم شروع کی اور ۱۳۲۵ھ (مطابق ۱۹۰۸ء) میں دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے اور امتحان میں سب سے اعلیٰ نمبر کا امتیاز حاصل کیا۔

تدریس

فراغت کے بعد چند مہینے دارالعلوم میں درس دیا۔ پھر مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی میں صدر مدرس ہو کر تشریف لے گئے۔ قریباً دو ہی سال بعد ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ (اپریل ۱۹۱۰ء) میں دارالعلوم کا وہ تاریخی جلسہ دستار بندی ہوا جس سے دارالعلوم کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا، اس جلسہ میں مولانا نے وہ پہلی تقریر فرمائی جس سے اُن کے جوہر نمایاں ہوئے، اسی سال شوال میں مولانا کا استاذ کی حیثیت سے دارالعلوم میں باضابطہ تقرر ہوا شروع میں مختلف علوم و فنون کے اونچے درجے کے اسباق متعلق رہے۔ ۱۳۳۵ھ (مطابق ۱۹۱۵ء) میں جب حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے مجاہدانہ منصوبہ کے مطابق حجاز مقدس کا سفر فرمایا تو اسکے بعد سے خصوصیت سے مسلم شریف مولانا کے زیر درس رہی۔ مطالعہ بھی وسیع تھا غیر معمولی ذہانت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حسنِ بیان اور خطابت کا کمال بھی عطا فرمایا تھا اس لئے مولانا کا صحیح مسلم کا درس اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بے مثال ہوتا تھا۔ ان کے درس صحیح مسلم کی نوعیت کا کچھ اندازہ ان کی لکھی ہوئی صحیح مسلم کی شرح "فتح الملہم" سے کیا جاسکتا ہے، جسکی تالیف کا کام اسی زمانے میں شروع ہوا تھا۔ دارالعلوم میں

مولانا کا صحیح مسلم کا یہ درس تسلسل کے ساتھ ۱۳۴۴ھ تک جاری رہا۔

۱۳۴۴ھ کی مکہ مکرمہ کی مؤتمر عالم اسلامی میں شرکت

۱۳۴۴ھ کے حج کے موقعے پر والئ نجد و حجاز سلطان عبدالعزیز بن سعود نے (جن کا حجاز مقدس پر قریباً ایک ہی سال پہلے تسلط و اقتدار قائم ہوا تھا) مکہ معظمہ میں عالم اسلامی کی ایک اہم مؤتمر بلائی جس میں ہندوستان سے جمعیۃ علماء ہند کو بھی اپنا نمائندہ وفد بھیجنے کی دعوت دی گئی تھی۔ مولانا اس دور میں جمعیۃ کے ممتاز ترین ارکان میں سے تھے۔ جمعیۃ کی طرف سے جو وفد اس مؤتمر میں شرکت کے لئے گیا، اس میں آپ بھی تھے۔ اگرچہ عربی میں تقریر و خطابت کی مولانا کو عادت نہ تھی لیکن اس مؤتمر میں انھوں نے جو فاضلانہ تقریریں کیں اور جس طرح اپنا نقطۂ نظر پیش کیا اس کی وجہ سے جمعیۃ کے وفد کو اس مؤتمر میں خاص امتیاز حاصل رہا ـــــــ یہ سفر ۱۳۴۴ھ کے اواخر میں ہوا تھا۔ واپسی پر کچھ عرصہ تک صحت خراب رہی اور غالباً اسی سال آنکھ کا آپریشن بھی ہوا۔

ان حالات کی وجہ سے اُس تعلیمی سال (۴۵-۱۳۴۴ھ) میں صحیح مسلم کا درس مولانا نہیں دے سکے۔ جسکو دارالعلوم کے اس سال کے دورۂ حدیث کے طلبہ نے اپنا بڑا خسارہ محسوس کیا۔

دیوبند سے ڈابھیل اور وہاں تدریس۔

اسکے اگلے سال اللہ تعالیٰ کی تکوینی مشیت اور قضاء و قدر کے فیصلوں کے نتیجہ میں دارالعلوم میں وہ حالات پیدا ہوگئے جن کی وجہ سے مولانا ممدوح اور اس وقت کے صدر المدرسین حضرت مولینا محمد انور شاہؒ اور ان کے ساتھ متعدد دوسرے اساتذہ نے دارالعلوم سے قطع تعلق کا فیصلہ کر لیا۔ اور پھر ڈابھیل (گجرات) کے "جامعہ اسلامیہ" کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہوگیا۔

غنی روز سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن   کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

ڈابھیل کے جامعہ اسلامیہ میں مولانا نے چند سال تک ترمذی شریف کا درس دیا پھر ۱۳۵۲ھ میں حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد بخاری شریف کا درس آپ ہی نے دیا۔ اسی سال (۱۳۵۲ھ میں) جامعہ اسلامیہ کی دورۂ حدیث کی جماعت میں مولانا محمد عبدالوحید صاحب فتحپوری بھی شریک تھے۔ انھوں نے مولانا کی درسِ بخاری کی تقریر قلمبند کرنے کا خاص اہتمام کیا تھا وہی تقریر اس کتاب کی شکل میں آپکے سامنے ہے۔

حسن بیان اور خطابت

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو حسن بیان اور دلکش و دلنشیں خطابت کے کمال سے بھرپور نوازا تھا۔ جنھوں نے مولانا کی تقریر نہیں سنی ان کو اب کسی طرح اس کا اندازہ نہیں کرایا جا سکتا کاش اُس زمانہ میں ریکارڈنگ کا وہ انتظام ہوتا جو آج میسر ہے۔

تصنیف و تالیف

درس و خطابت کے علاوہ مولانا نے قلم کے ذریعہ بھی دین اور علم دین کی وہ خدمات انجام دیں جن سے امت اور خاص کر اسکے اہل علم ان شاء اللہ صدیوں تک استفادہ کریں گے۔ "الاسلام"، "العقل والنقل"، الدار الآخرہ

اعجاز القرآن، "الشہاب"، "تحقیق خطبۂ جمعہ"، "سجود الشمس"، "حجاب شرعی"، "خوارق عادات"، "الروح فی القرآن" مولانا کے یہ وہ رسائل اور مقالات ہیں جن میں سے ہر ایک اُن کی غیر معمولی ذہانت، دقت نظر، جدید ذہن سے واقفیت اور مشکل مسائل کی تفہیم پر غیر معمولی قدرت کا آئینہ دار ہے۔

تفسیری فوائد قرآن

مولانا کا سب سے عظیم تصنیفی کارنامہ حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن پر بطور حاشیہ لکھے ہوئے تفسیری فوائد ہیں جو فی الحقیقت قرآن حکیم کی مکمل تفسیر ہیں۔ جو صاحب علم قدیم تفاسیر کا ذخیرہ سامنے رکھکر ان کا مطالعہ کرے گا اس کو محسوس ہوگا کہ کتب تفسیر کا عطر کھینچ کر شستہ اردو میں قلمبند کر دیا گیا ہے۔ مختصر عبارتوں اور جملوں میں اہل زیغ و ضلال کی تاویلوں اور تحریفوں کی اطمینان بخش تردید بھی کر دی گئی ہے — حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرضِ وفات میں مولانا جب عیادت اور زیارت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت نے فرمایا "میں نے اپنا تمام کتبخانہ وقف کر دیا ہے صرف دو چیزیں جو مجھے زیادہ محبوب ہیں اپنے پاس رکھ لی ہیں ایک آپ کے حواشی والا قرآن مجید اور دوسری کتاب "جمع الفوائد"۔"

فتح الملہم

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے جس زمانہ میں مولانا دارالعلوم دیوبند میں مسلم شریف کا درس دیتے تھے اسی زمانہ میں اس کی یہ شرح لکھنی شروع کی تھی۔ بعض موانع کی وجہ سے یہ کام تسلسل کے ساتھ جاری نہیں رہ سکا۔ طباعت کا مرحلہ بھی مشکل اور وسائل طلب تھا پھر اللہ تعالیٰ نے اُس وقت کی ریاست حیدرآباد کو اس کا وسیلہ بنا دیا۔ یہ شرح صرف کتاب النکاح تک لکھی جا سکی ہے جو تین ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کی زبان عربی ہے یہ کتاب مولانا کے علمی امتیاز و کمال اور خاص کر فن حدیث اور تفقہ فی الدین میں ان کے بلند مقام کا پورا آئینہ ہے۔ کاش یہ پوری ہو جاتی۔

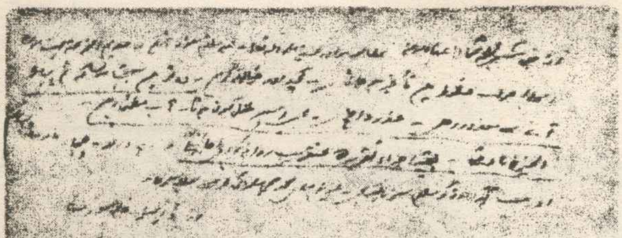
سیاسی بصیرت و ملّی خدمات

سیاسی بصیرت کے لحاظ سے بھی اپنے طبقہ میں مولانا کا خاص مقام تھا۔ پہلی جنگ عظیم (۱۴ تا ۱۸ھ) کے بعد تحریک خلافت کے آغاز میں جب حضرت شیخ الہندؒ اسارتِ مالٹا سے رہا ہو کر تشریف لائے تو ان کے آخری لمحۂ حیات تک مولانا عثمانی ہی ان کی زبان اور ان کا قلم رہے۔ "جامعۂ اسلامیہ" کے تاسیسی اجلاسِ علیگڈھ اور "جمعیۃ علماء ہند" کے اجلاس دہلی وغیرہ میں حضرت شیخ الہند کے جو خطبے اور پیغامات پڑھے گئے (حضرت شیخ الہندؒ کی شدید علالت اور غیر معمولی ضعف و نقاہت کی وجہ سے اُن کے حکم سے) وہ مولانا ہی کے قلم سے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ اور مولانا ہی ان کے پڑھنے والے ہوتے تھے — اسکے بعد سے برابر جمعیۃ علماء ہند کے صفِ اول کے ارکان بلکہ رہنماؤں میں رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زمانۂ دراز تک جمعیۃ کا پلیٹ فارم ان کی تقریروں سے گرم اور پُر رونق رہا — لیکن ملک کی تقسیم سے چند سال قبل جمعیۃ کے طریق کار سے ان کو اختلاف پیدا ہو گیا تھا ان کی شدت اور مضبوطی کے ساتھ یہ رائے ہو گئی تھی کہ اب جبکہ ملک کی آزادی سامنے ہے ہمیں کانگریس کے واسطہ سے اس ملک کی اکثریت سے باضابطہ معاہدہ کرنا چاہیئے۔ اس سے پہلے اس مرحلہ پر کانگریس

کی غیر مشروط حمایت کی پالیسی سے ان کو اختلاف تھا۔ اس موضوع پر تبادلۂ خیالات اور مکالمات بھی ہوئے لیکن افسوس ہے کہ خیالات میں اختلاف و بعد رفتہ رفتہ بڑھتا ہی گیا اور ایک قابلِ فخر ہستی کو جمیعۃ علماء ہند کے اُس کے نظام سے بے تعلق ہونا پڑا اور اس کا آخری انجام یہ ہوا کہ انھوں نے مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کی حمایت کا فیصلہ کرلیا۔ پھر ملک تقسیم ہوا اور مولانا نے پاکستان کو شرعی نصب العین کے مطابق "اسلامی مملکت" بنوانے کے لئے وہیں جانے کا فیصلہ کرلیا اور ہم اس خزانۂ علم و دانش سے محروم ہو گئے۔

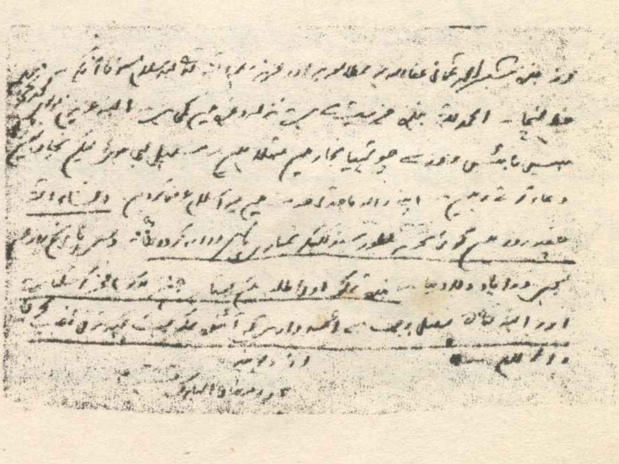
وفات

۸ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو بھاولپور کے وزیر اعظم کی درخواست پر "جامعہ اسلامیہ" کے افتتاح کے لئے تشریف لے گئے ۱۲ر دسمبر کی شب میں بخار ہوا، صبح طبیعت بہتر ہوگئی، ۹ بجے پھر سینہ میں تکلیف محسوس ہوئی سانس میں رکاوٹ ہونے لگی۔ ۱۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء مطابق ۲۱ر صفر ۱۳۶۹ھ شنبہ کے روز ۱۱ بجکر ۴۰ منٹ پر یہ آفتاب علم وفضل غروب ہوگیا۔ بوقت وفات ۶۴ سال ایک ماہ ۱۲ یوم کی عمر تھی رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔



عکس تحریر

حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رح



بسم اللہ الرحمن الرحیم

مختصر سوانح امام بخاریؒ

[الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین سیدنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین](۱)

اما بعد:- چونکہ اساتذہ کی عادت ہے کہ پہلے مصنف کا کچھ ذکر کرتے ہیں، اس لئے تیمناً کچھ ان کا (امام بخاریؒ کا) ذکر کیا جاتا ہے۔

سوانح امام بخاری

ان کا نام محمدؒ ہے، نسب یہ ہے محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ۔ بردزبہ کے متعلق یہ تصریح ہے کہ مسلمان نہیں ہوئے یہ مجوسی تھے، امام بخاری کے اجداد میں سب سے پہلے مغیرہ نے اسلام قبول کیا، جو بیٹے ہیں بردزبہ کے، وہ یمان جعفی کے ہاتھ پر جو والی بخارا تھا مسلمان ہوئے، اسی سے جعفی کہلاتے ہیں، نسب کے اعتبار سے نہیں ولار کے اعتبار سے۔

مغیرہ کے بیٹے ابراہیم کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا،

اسمٰعیل کا ذکر ابن حبان نے (کتاب الثقات میں) کیا ہے، اچھے علماء میں سے تھے، ذہبی کی تاریخ الاسلام [بلکہ خود تاریخ بخاری] میں ہے کہ ان کو ابن مبارک کی صحبت رہی ہے، حماد بن زید وغیرہ سے روایت کرتے ہیں، اتقیا ر میں سے تھے، جب ان کا انتقال ہونے لگا تو بعض محدثین موجود تھے، ان کے سامنے فرمایا کہ اس مال میں جو میں نے چھوڑا ہے ایک درہم بھی ایسا نہیں ہے جس میں حرام کا شبہ بھی ہو، کہنے کو یہ معمولی بات ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت بڑی چیز ہے کہ کوئی درہم مشتبہہ بھی نہ ہو حرام تو درکنار، اس مال سے پرورش ہوئی تھی امام بخاری کی، والدین کی نیت تقویٰ و اخلاص کا اثر ضرور اولاد پر ہوتا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۱۹۴؁ھ میں ہوئی اور ۲۵۶؁ھ میں انتقال فرمایا، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ صغرسن (بچپن) میں بینائی جاتی رہی تھی، والدۂ محترمہ بہت رو رو کر ان کے لئے دعائیں کرتی تھیں، خواب میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا کہ فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ نے تیری کثرت دعا کی وجہ سے تیرے بچے کی آنکھیں واپس فرمادی ہیں"

۳

(۱) دو مربع خطوط کے درمیان جو عبارت جہاں بھی ہے، مرتب تقریر کی طرف سے اضافہ ہے ۱۲ مرتب

صبح کو دیکھا تو آنکھیں درست تھیں، بینائی واپس آگئی تھی، یہاں تک مورخین کا بیان تھا، آگے خود ان کا بیان سنئے :-

ابوجعفر وراق نے امام بخاری سے سوال کیا کیف کان بدء امرك، جواب میں فرمایا کہ جب میں مکتب جاتا تھا اسی وقت مجھے حفظ حدیث کا الہام کیا گیا اسوقت میری عمر دس سال یا کچھ کم تھی، مکتب سے نکلنے کے بعد میں داخلی وغیرہ کے پاس جایا کرتا تھا، ایک بار انھوں نے فرمایا [سفیان] عن ابی الزبیر عن ابراهیم، میں نے ٹوکا کہ ابوالزبیر ابراہیم سے روایت نہیں کرتے فانتھرنی تو انھوں نے مجھے جھڑک دیا، میں نے پھر عرض کیا کہ آپ اپنی یادداشت دیکھ لیں پھر فرمائیں، تو اٹھ کر گھر تشریف لے گئے، یادداشت دیکھی۔ واپس تشریف لائے تو فرمایا کیف هو یا غلام! میں نے عرض کیا هو الزبیر (بن عدی) [عن ابراهیم] یعنی ابوالزبیر کے بجائے زبیر بن عدی صحیح ہے یہ سن کر استاذ نے میرا ہی قلم لے کر اسے درست فرمالیا، اسوقت میری عمر گیارہ سال کی تھی۔

سولہ سال کی عمر میں ابن مبارک، وکیع اور اصحاب الرائے کی کتابیں یاد کرلیں، اٹھارہ سال کی عمر میں کتاب قضایا الصحابة والتابعین لکھی، تاریخ کبیر بھی اسی عمر میں لکھی ہے، اس تاریخ کبیر کے بارے میں محدثین فرماتے ہیں کہ اگر ہزاروں کتابیں دیکھ لے تب بھی تاریخ کبیر سے استغناء نہیں ہوسکتا، ایک ہزار اسی ۱۰۸۰ اساتذہ سے علم حاصل کیا ہے، انمیں کوئی ایسا نہیں ہے جو محدث نہ ہو، آگے خود کھولتے ہیں کہ جس کا یہ مذہب نہ ہو کہ الایمان قول وعمل یزید وینقص، جن حضرات کا یہ مسلک نہیں میں نے ان سے علم نہیں لیا، چھ لاکھ احادیث وآثار محفوظ تھے، جن سے یہ جامع (بخاری) تیار کی ہے، چھ لاکھ کی تنقید کرتے کرتے مرفوعات ۹۰۸۲ باقی رہیں، مع مکررات (قسطلانی) موقوفات ومکررات اس کے علاوہ ہیں، موقوف قول صحابی کو کہتے ہیں، اور مقطوع قول تابعی کو، منقطع وہ ہے جس میں واسطہ چھوٹ جائے، مکرر ومعلق سب ملاکر ۹۰۸۲ ہیں، پھر یہی نہیں کہ صرف یاد ہوں، بلکہ تفقہ ومعرفت رجال اور تنقید [متون کا] ملکہ بھی حاصل تھا، امتیاز بین السقم والصحة ان کی خاص چیز ہے، حافظہ کا یہ حال تھا کہ خود کہتے ہیں کہ رفقاء وہم جماعت دیکھتے کہ میں کچھ لکھتا نہیں، ایک مدت کے بعد ایک ساتھی نے کہا تم لکھتے نہیں ہو یاد کیسے رکھوگے، میں نے کہا تمہارے پاس کتنی حدیثیں ہیں، یادداشتیں لے کر بیٹھ جاؤ، وہ بیٹھ گئے میں نے سب حدیثیں بالترتیب سنادیں، تب وہ سمجھے کہ اللہ نے حفظ کا یہ کمال نصیب فرمایا ہے کہ ترتیب تک نہ بدلی اور سب کی سب سنادیں، ہمارے اس دور میں بخاری رحمہ اللہ کا نمونہ حضرت انور کشمیری رحمہ اللہ تھے۔

امام بخاری کے قوی الحافظہ ہونے کی خبر بہت عام ہوچکی تھی، جب وہ بغداد پہونچے تو وہاں کے محدثین نے ان کا امتحان کرنا چاہا، حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے مقدمہ میں اس واقعہ کو اس طرح تحریر فرمایا ہے کہ محدثین

نے سو حدیثیں چھانٹیں اور انھیں الٹ پلٹ کر اس طرح کر دیا کہ ایک حدیث کا متن لیا اور دوسری حدیث کی سند اس کے ساتھ جوڑ دی، دوسری حدیث کی سند لی تیسری حدیث کے متن سے اسے جوڑ دیا، اس طرح ان سو حدیثوں میں ردوبدل کر دیا کہ جب امام بخاری تشریف لائیں گے تو ان سے پوچھیں گے، انھوں نے دس آدمیوں کا انتخاب کیا اور ہر ایک کو دس دس حدیثیں دیں اور یہ سمجھا دیا کہ اسی ردوبدل کے ساتھ امام بخاری کو ایک ایک کر کے سنانا اور ان سے جواب لینا ہے وہ تیار ہو گئے، اور اب امام سے مجلس [منعقد کرنے] کی درخواست کی گئی، امام نے اس کو قبول فرمالیا، جب مجلس منعقد ہوئی تو عوام و خواص کا بڑا مجمع ہو گیا ان میں بہت سے اہل خراسان، اور بہت سے اہل بغداد، علماء و محدثین وغیرہ سب ہی تھے، جب مجلس جم گئی تو کہی بدی بات کے مطابق ان دس میں سے ایک کھڑا ہوا اور ایک حدیث بدلی ہوئی حدیثوں میں سے پڑھی پڑھ کر جواب کا انتظار کیا، امام نے سن کر فرمایا لا اعرفہ میں اسے نہیں جانتا، اس نے فوراً دوسری پڑھی، امام نے اسکو سن کر بھی "لا اعرفہ" فرمایا، اس نے تیسری، چوتھی، دسویں تک ایک ایک حدیث پیش کر دی، امام نے ہر ایک کے جواب میں صرف لا اعرفہ فرمایا، اور [اس سے زیادہ] کچھ نہ کہا، پھر دوسرے صاحب کھڑے ہوئے انھوں نے بھی ایک ایک کر کے دسوں حدیثیں سنا ڈالیں، امام نے بھی ہر ہر حدیث پر وہی جملہ لا اعرفہ دہرایا، اور دہراتے رہے، پھر تیسرے، چوتھے سے دسویں صاحب تک اسی طرح دس دس حدیثیں پیش کرتے رہے اور ان سب کے جواب میں امام بخاری وہی جملہ دہراتے رہے، اہل علم تو شروع ہی میں سمجھ گئے کہ یہ شخص واقعی اونچے درجہ کا ہے، کسی کے دھوکے میں نہ آئے گا، مگر عوام سمجھے کہ یوں ہی شہرت تھی، ایک ڈھونگ تھا، حقیقت کچھ نہ تھی، جب وہ سب اپنے ترکش خالی کر چکے اور ان کی بنائی ہوئی ساری حدیثیں ختم ہو گئیں، تب امام نے سب سے پہلے شخص کو مخاطب کر کے فرمایا، تم نے پہلی حدیث یوں پڑھی، اور اُسی طرح پڑھ کر سنایا جس طرح اُس نے پڑھی تھی، پھر فرمایا یہ حدیث اس طرح نہیں بلکہ اس طرح ہے، یہ کہکر اسے صحیح طرح پڑھ کر درست فرما دیا، اور جو سند جس متن کے ساتھ تھی اس کو اسی کے ساتھ ذکر کیا، اسی طرح اس کی دسوں حدیثیں اسی ترتیب کے ساتھ جس ترتیب سے اس نے سنائی تھی ایک ایک کر کے سناتے اور اس کی غلطی ہر ہر حدیث میں بتا بتا کر ساری حدیثیں صحیح سند اور صحیح متن کے ساتھ جوڑ جوڑ کر سنا دیں، پھر دوسرے شخص کی طرف متوجہ ہوئے اس کی بھی دس حدیثیں تھیں، امام نے اسی ترتیب کے ساتھ اسکی حدیثیں سنائیں اور ہر ایک کی غلطی بتاتے ہوئے سب کی صحیح سندیں صحیح متون سے جوڑ جوڑ کر سنا دیں، پھر تیسرے پھر چوتھے یہاں تک کہ دسویں صاحب تک سب کے ساتھ یہی کیا کہ پہلے اسی کی ترتیب سے سنائی ہوئی حدیث اسی شان سے پڑھتے جس شان سے اس نے پڑھی تھی، پھر اس کی غلطی بتاتے پھر اس کی تصحیح فرما کر بتاتے کہ یہ سند اس متن حدیث کی ہے اور یہ متن حدیث اس سند کا ہے، سب علماء محدثین اور مشائخ دنگ رہ گئے

اور سب امام کا فضل ماننے پر مجبور ہوگئے۔

حافظ نے یہ واقعہ نقل کر کے فرمایا کہ امام کا بڑا کارنامہ یہاں صرف یہی نہیں ہے کہ انھوں نے بدلی ہوئی صحیح کردیں، وہ حافظ حدیث تھے کر سکتے تھے، ان کا یہاں بڑا کارنامہ یہ ہے کہ صرف ایک بار سُن کر ان کی بدلی ہوئی سندوں کو اسی ترتیب سے یاد رکھا جس ترتیب سے ان دس آدمیوں نے سو حدیثیں بدل بدل کر سنائی تھیں، یہ امام کا کمال تھا کہ سو حدیثیں ایک ہی مجلس میں صرف ایک بار سن کر ایسی محفوظ کرلیں کہ نہ سندوں اور متنوں میں فرق آیا، نہ ترتیب میں، ذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

اور یہ امام کی وہ عمر تھی جب آپ کی ڈاڑھی کا ایک بال بھی سفید نہ تھا، مگر بڑے بڑے پایہ کے لوگ زانوئے ادب تہ کرتے تھے، جب امام بصرہ پہونچے تو اعلان عام ہوگیا کہ حدیث کا املاء ہوگا جس کا جی چاہے سُنے، بڑا مجمع ہوگیا، جب ممبر پر بیٹھے تو فرمایا اَنَا رَجُلٌ شَابٌّ (میں ایک جوان آدمی ہوں) اور آپ لوگ بزرگ ہیں آپ کے سامنے کیا کہوں، مگر آپ کا اصرار ہے تو میں صرف وہ احادیث سناؤں گا جو ہیں تو بصرہ ہی کی، مگر آپ کے پاس نہیں ہیں، پھر ایک حدیث سنائی اور فرمایا یہ حدیث تمہارے پاس اس سند سے ہے، اور وہ سند سنادی اور پھر فرمایا مجھے اس سند سے پہونچی ہے۔ پوری مجلس میں ساری حدیثیں اسی قسم کی سنائیں، لوگ حیران تھے کہ اللہ نے کیا نعمت عطا فرمائی ہے، یہ تو حافظہ اور علم کا حال تھا، اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اور ورع کے اونچے درجہ سے بھی نوازا تھا، ان کے ورع کا ایک واقعہ سنو، امام کا حال یہ تھا کہ کچھ اپنے پاس رکھتے نہ تھے، جو کچھ آتا اسے فوراً علیحدہ کردیتے، اور وہ رقم کسی اچھے مصرف میں صرف فرمادیتے، تاجر تاک میں رہتے کہ کچھ امام کے پاس پہونچے تو جلد پہونچ کر کم سے کم پر معاملہ کرلیں پھر نفع کمائیں، اتفاق سے ایک مرتبہ کہیں سے کچھ قیمتی سامان آیا، تاجروں کو بھنک مل گئی، ایک تاجر سبقت کر کے پہونچ گیا اور امام سے عرض کیا کہ یہ مال اس قیمت کا ہے، میں اس پر پانچ ہزار درم نفع آپ کو دوں گا، مجھے دیدیجئے، جواب میں فرمایا، کل پھر آنا تب آخری بات ہوگی، اس کے جانے کے بعد دوسرے تاجر پہونچے، اور عرض کیا کہ میں دس ہزار نفع دوں گا مجھے دیدیجئے، امام نے فرمایا کہ پہلے صاحب نے جب بات کی تھی اور پانچ ہزار کی پیشکش کی تو میں نے زبان سے تو کہہ دیا تھا کہ کل آنا تب آخری بات ہوگی، مگر میں نے دل میں نیت کرلی تھی کہ انھیں کو یہ مال دیدونگا اب میں مزید نفع کی خاطر اپنی نیت نہ بدلوں گا، اور مال پہلے تاجر ہی کو دوں گا، غور کرو شرعاً وہ اس کے پابند نہ تھے۔ مگر میں نے جو کہا کہ اللہ نے ان کو ورع و تقویٰ سے نوازا تھا، تو یہ دقائق تقویٰ میں سے ہے کہ صرف نیت کی تھی تو اسے بھی نہیں بدلا، اور کم پر قناعت فرمائی، پھر عمل کا حال یہ تھا کہ رمضان مبارک میں دن کو روزانہ ایک ختم پڑھتے اور سحر کے وقت دس بارہ پارے پڑھتے تھے، اس طرح ہر تیسری رات کو ایک ختم کرتے تھے، اور تراویح کی ہر رکعت میں بیس آیتیں پڑھتے تھے، اپنی اس کتاب کے لکھنے میں ان کا یہ معمول تھا کہ ہر باب پر دو رکعت نماز پڑھتے تھے پھر لکھتے تھے، حقیقت

یہ ہے کہ اللہ نے جس مقام پر امام کو کھڑا کرنا چاہا تھا، اس کے اسباب بھی پیدا فرما دیئے تھے اور امام کو ان پر عمل کرنا آسان بنا دیا تھا، بخاری ہی میں کسی کا مقولہ ہے کہ "تقوی اسہل شئی (بڑی آسان چیز ہے) کیونکہ دع ما یریبك الی ما لا یریبك۔ ایک ہی جملہ تو ہے، تو ان پر کیا مشکل ہے، امام بخاری کے لئے اللہ نے واقعی اسے اسہل شئی بنا دیا تھا، ابوداؤد (محدث مشہور) کے بارے میں آیا ہے۔

لان الحدیث وعلمه بکماله   لامام اهلیه ابی داؤد

مثل الذی لان الحدید وسکبه   لنبی اهل زمانه داؤد

[یہ محمد بن اسحاق صنعانی اور ابراہیم حربی کا قول ہے۔ جس کو کسی نے منظوم کر دیا ہے۔ مرتب]

یہ ابوداؤد کے بارے میں ہے، تو بخاری کا درجہ تو ابوداؤد سے بہت ارفع ہے، [اور ان دونوں میں] ایسا ہی فرق ہے جیسا کہ صوفیہ کے ہاں ابوالحال اور ابن الحال کا فرق ہے، ابوالحال وہ ہے جس پر حال کا غلبہ نہ ہو بلکہ حال مغلوب ہو اور یہ اس پر غالب ہو، اور ابن الحال وہ ہے کہ جس پر حال غالب ہو اور یہ اس سے مغلوب ہو۔ فن کے اعتبار سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری ابوالفن ہیں، اور ابوداؤد بلکہ مسلم بھی ابن الفن ہیں، ابوالفن ہونے کی ایک مثال سنو، امام بخاری جو فن کے امام ہیں علل کے بھی امام ہیں، ایک مرتبہ امام مسلم نے ان کی پیشانی کا بوسہ دیکر اجازت چاہی کہ اے استاذ الاساتذہ، اے سید المحدثین، اے طبیب الحدیث فی علله، مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کے دونوں پیروں کو بوسہ دوں، پھر حدیث کفارۂ مجلس سنائی، ابن جریج حدثنی موسی بن عقبة عن سهیل عن ابیه عن ابی هریرة ان النبی صلی اللہ علیه وسلم قال: کفارة المجلس ان یقول اذا قام من مجلسه: سبحانك اللهم ربنا وبحمدك اور اسے سنا کر ایک روایت کے مطابق پوچھا کہ اس سند کے ساتھ دنیا میں اور کوئی حدیث بھی ہے؟ تو امام بخاری نے امام مسلم کی اس طرح تصویب فرمائی کہ هذا حدیث ملیح ولا اعلم بهذا الاسناد فی الدنیا حدیثا غیر هذا الا انه معلول، امام مسلم یہ سن کر کہ یہ حدیث معلول ہے کانپ گئے اور لا الہ الا اللہ کہا، کیونکہ اپنی سمجھ سے ایک نادر چیز پیش کی تھی اور وہ امام کے ہاں معلول قرار پائی تو امام حیران رہ گئے۔ اور عرض کیا کہ آپ وہ علت بیان فرمائیں، جواب میں فرمایا اس پر پردہ ہی پڑا رہنے دو، یہ حدیث بڑی جلیل القدر ہے ——— اسے بہت سے لوگوں نے حجاج بن محمد عن ابن جریج کے واسطے سے بیان کیا ہے، مگر امام مسلم نہ مانے پیچھے لگ گئے۔ امام کے سر کا بوسہ دیا، اور قریب رونے کے ہوگئے تب امام نے فرمایا، اچھا بھئی تو لکھو اگر ضروری سمجھتے ہو۔ لکھو حدثنا موسی بن اسمٰعیل حدثنا وهیب حدثنا موسی ابن عقبة عن عون بن عبد اللہ قوله اور فرمایا کہ موسیٰ بن عقبہ کا سہیل سے کسی سند کا روایت کرنا مذکور نہیں ہے [۱]

---

[۱] مقدمہ فتح الباری صفحہ ۴۸۵ طبع مصر

امام مسلم بولے بس آپ سے تو صرف حاسد ہی بغض رکھے گا یہ واقعہ اس لئے سنایا کہ تمھیں معلوم ہو جائے کہ بخاری ابو الفن ہیں، اور مسلم جیسا اونچے درجہ کا محدث ابن الفن، اور سنو، جب امام نیشاپور کی طرف چلے اور امام کے استاذ محمد بن یحییٰ ذہلی کو اس کا علم ہوا، تو آپ نے اعلان کر دیا کہ بخاری آرہے ہیں ان کے استقبال کو چلو، [میں بھی ان کا استقبال کرونگا،] چنانچہ انھوں نے اور اکثر علمائے نیشاپور نے دو یا تین منزل آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا، لکھا ہے کہ نہ صرف مرد بلکہ عورتیں اور بچے بھی نکل پڑے، جب شیخ ذہلی نے یہ شان دیکھی تو فرمایا لوگو! ان سے استفادہ کرو مگر کلامی مسئلہ نہ چھیڑنا، (اشارہ تھا خلق قرآن کی طرف، جس کا ان دنوں بہت چرچا تھا) ورنہ ممکن ہے آپس میں ناچاقی ہو جائے، مشہور مقولہ ہے الانسان حریص علی ما منع روکنے کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے خواہ مخواہ سوال کر ہی دیا کہ ما قولك فی اللفظ بالقرآن، امام نے تین بار اعراض کیا، جب لوگ نہ مانے تو چوتھی بار یہ جملہ فرمایا [القرآن کلام اللہ غیر مخلوق] وافعال العباد مخلوقة [والامتحان بدعة] قرآن اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے اور بندوں کے افعال مخلوق ہیں، [اور امتحان بدعت ہے] معترض نے یہ سن کر شور وشغب برپا کر دیا کہ بخاری نے لفظی بالقرآن مخلوق کہا ہے، حالانکہ بخاری نے صراحۃً اس کی تردید کی، سند صحیح کے ساتھ بخاری سے منقول ہے کہ جھوٹا ہے وہ شخص جو یہ کہتا ہے کہ میں نے لفظی بالقرآن مخلوق کہا ہے جب استاذِ بخاری شیخ ذہلی کو یہ بات پہونچی کہ بخاری نے یہ جملہ کہا ہے تو انھوں نے اعلان کر دیا کہ بخاری کے پاس کوئی استفادہ کیلئے نہ جائے یہ اعلان سن کر سب لوگوں نے امام بخاری کے پاس جانا بند کر دیا، صرف امام مسلم اور احمد بن سلمہ نے امام کے پاس جانا نہیں چھوڑا [پھر امام ذہلی نے یہ اعلان کیا کہ جو شخص مسئلہ لفظ کا قائل ہو اس کے لئے ہماری مجلس میں حاضر ہونا حلال نہیں ہے یہ سن کر امام مسلم ذہلی کی مجلس سے برملا اٹھ کھڑے ہوئے اور ذہلی سے جتنی حدیثیں سنی تھیں ان کو ایک حمال کی پشت پر رکھ کر ذہلی کے پاس بھیجدیا اور اپنی مشہور کتاب صحیح مسلم میں ان سے ایک روایت بھی نہیں لی[۵]، یہ تھا مسلم کا رویہ امام بخاری کے ساتھ، امام بخاری نے شیخ ذہلی کی حدیثیں لی ہیں، لیکن کہیں حدثنا محمد اور کہیں محمد بن خالد کہا ہے، صراحت نہیں کی کچھ ابہام رکھا ہے، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ذہلی امام بخاری پر جارح ہیں واضح طور پر ان کا نام لیکر روایت کرنے سے ان کی تعدیل ہوگی، اور بادی النظر میں اس تعدیل سے اُس جرح کی جو انھوں نے بخاری پر کی ہے توثیق ہوگی اس لئے انھوں نے ان کی حدیث تو لی مگر صاف نام نہیں لیا یہ امام بخاری کا کمالِ فطانت ہے۔

یہ میں نے بہت مختصر سوانح حیات امام بخاری کے بتائے، تفصیلاً تم بعد میں معلوم کرنا، اب مختصراً ہی تم ان کی وفات کا حال بھی سن لو۔ امام نے آخر عمر میں وطن میں رہنے کا فیصلہ فرمالیا تھا، جب اہل وطن کو علم ہوا کہ امام آرہے ہیں تو کئی فرسخ آگے سے لوگوں نے ان کے استقبال کا انتظام کیا، بخارا سے تین میل آگے قبے (خیمے) نصب کئے اور سارا شہر استقبال کو نکل کھڑا ہوا

---

۵ جیسا کہ امام بخاری کی روایت سے بھی صحیح مسلم میں انھوں نے کوئی حدیث ذکر نہیں کی ۱۲ مرتب

جب امام تشریف لائے تو لوگوں نے ان پر اشرفیاں نچھاور کیں۔

پھر امام نے وطن پہونچکر درس دینا شروع کیا، نوے ہزار ان کے تلامذہ کی تعداد پہونچ گئی، قدرت کا عجب نظام ہے کوئی سمجھ نہیں پاتا، امام کو ایک ابتلاء پیش آیا، وہ ثابت قدم رہے، مگر وطن چھوڑنا پڑا، ہوا یہ کہ سلطنت عباسیہ کی طرف سے وہاں کا والی خالد بن احمد ذہلی تھا، اس نے امام سے درخواست کی کہ میرے بچوں کو قصر سلطانی میں آکر [اپنی تاریخ اور جامع] پڑھا جایا کیجئے، امام نے اس کو منظور نہیں کیا اور فرمایا کہ میں کسی جماعت کے ساتھ سماع کو مخصوص نہیں کر سکتا، دوسری روایت میں بچوں کے بجائے خود امیر کا ذکر ہے اور جواب میں یہ بھی ہے کہ امیر کو ضرورت ہو تو میری مسجد میں یا میرے گھر آجائیں اور اگر یہ پسند نہ ہو تو آپ حاکم ہیں، مجھ کو مجلس سے روک دیں تاکہ خدا کے پاس میرا عذر قائم ہوجائے اور یہ کہ میں نے خود کتمان علم نہیں کیا، یہ بات حاکم کو ناگوار ہوتی اور باہم منافرتِ وحشت پیدا ہوگئی، حاکم نے حریث بن ابی الورقا وغیرہ سے مدد لی، ان لوگوں نے امام کے مذہب کے بارے میں کلام کیا اور حاکم نے امام کو شہر چھوڑنے کا حکم دے دیا، امام بخاری نے حاکم و حریث وغیرہ کے حق میں بدعا کی، نتیجہ یہ ہوا کہ امام کے ترک وطن پر ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ حکومت کا عتاب والی پر ہوا، اور حکم ہوا کہ خالد کو گدھے پر سوار کر کے تشہیر کی جائے، اور شہر بدر کیا جائے، یوں اللہ نے اس کو فوری سزا دے دی، اور دوسروں کو بھی وہ برے دن دیکھنے پڑے کہ اللہ کی پناہ! (من عادی لی ولیا فقد آذنتہ بالحرب کا نمونہ سامنے آگیا) امام بخارا سے روانہ ہوکر خرتنگ پہونچے وہاں ان کے کچھ عزیز واقربار تھے اس لئے وہیں رک گئے۔

—— اور دعا کی، اے اللہ اب زمین باوجود کشادگی کے مجھ پر تنگ ہوگئی ہے اب مجھے اٹھالے، اس کے بعد سمرقند سے ایک قاصد آیا کہ وہاں کے لوگ آپ کی تشریف آوری کے خواہشمند ہیں، آپ تیار ہوگئے، کپڑے پہنے، عمامہ باندھا اور چل دئے، چند قدم چلے تھے کہ فرمایا مجھ پر ضعف طاری ہے مجھے چھوڑ دو، یہ کہہ کر لیٹ گئے تو پسینہ آنا شروع ہوا اور بکثرت آیا، مورخین نے لکھا ہے کہ بے انتہا پسینہ آیا اور اسی میں عالمِ جاودانی کی طرف رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، ابن کثیر نے تمنی موت پر بحث کی ہے، فلینظر ھناك،

ایک محدث نے خواب میں دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مع صحابہ کرام کے کھڑے ہیں انھوں نے سلام کیا، آپ نے سلام کا جواب دیا انھوں نے عرض کیا حضرت! یہاں کیوں کھڑے ہیں، فرمایا محمد بن اسماعیل کا انتظار کر رہا ہوں۔ پھر چند دنوں کے بعد ان کو خبر ملی کہ امام بخاری کا انتقال ہوگیا اور انتقال کا جو وقت بتایا گیا تھا غور کیا تو وہ وہی وقت تھا جس وقت انھوں نے خواب دیکھا تھا (مقدمہ)

لکھا ہے کہ قبر سے کئی دنوں تک مشک کی خوشبو آتی رہی، اور کیوں نہ ہو وہ اس ذات قدسی صفات کی حدیثوں کے حامل تھے جکے پسینے میں (مشک سے بڑھ کر) خوشبو آتی تھی، فرحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

یہ امام کا مختصر تذکرہ ہوا جو تیمناً کر دیا گیا، اب کتاب کے متعلق بھی کچھ عرض کر دوں۔

ابتدائے تدوین حدیث سے صحیح بخاری کی تصنیف تک

تدوین حدیث ۹۹ھ میں شروع ہوئی اب تک علم سینہ بسینہ چلا آرہا تھا، سب سے پہلی کتاب جو امت کو ملی وہ ابن شہاب زہری کی تھی، مگر یہ مطلق ابتدائے کتابت حدیث کا ذکر نہیں ہے کیونکہ داغ بیل کتابت حدیث کی تو عہد نبوی ہی میں پڑ چکی تھی، حجۃ الوداع میں ابو شاہ کے لئے [حدیث] لکھ کر دینے کا ذکر [تو بخاری ہی میں] موجود ہے، فرمایا تھا اُکتبوا لابی شاہ [بخاری و] ترمذی میں ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھ سے زیادہ کسی کے پاس حدیثیں نہیں ہیں سوائے [عبد اللہ بن] عمرو بن عاص کے اسلئے کہ وہ لکھتے تھے، اور میں لکھتا نہ تھا، اس کا واقعہ طبقات ابن سعد میں یوں لکھا ہے کہ [عبد اللہ بن] عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ جو اقوال آپ سے سنوں انھیں لکھتا جاؤں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دیدی اور انھوں نے لکھنا شروع کر دیا، مگر بعض لوگوں نے ان سے کہا کہ حضور جو کچھ نشاط میں فرمایا کریں اسے تو لکھ لیا کرو اور جو غصہ کی حالت میں فرمائیں اسے مت لکھا کرو، یہ بات جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی تو اپنے لبوں کی طرف اشارہ فرما کر فرمایا کہ اِن سے حق کے خلاف کوئی بات [کسی حال میں] نہیں نکلتی، چنانچہ وہ ہر بات جو حضور سے سنتے تھے لکھ لیا کرتے تھے، اس طرح انھوں نے اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر لیا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ سے زیادہ حدیثیں [عبد اللہ بن] عمرو بن العاص کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ہیں، اور اس کی وجہ بھی خود ہی بتاتے ہیں (فانہ کان یکتب ولا اکتب) وہ لکھتے جاتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا، اندازہ کر لیا جائے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پانچ ہزار سے زیادہ احادیث مروی ہیں تو حسب بیان ابو ہریرہ، [عبد اللہ بن] عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی احادیث پانچ ہزار سے بھی زیادہ ہوں گی، انھوں نے اس مجموعہ کا صادقہ نام بھی رکھا تھا، گویا ایک مستقل کتاب تھی جس کا نام بھی تجویز ہوا تھا، حافظ ابن حجر (اس کتاب کی) وجہ تسمیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے پاس ایک صحیفہ اور بھی تھا جس کا نام یرموکیہ تھا جسے انھوں نے غزوۂ یرموک میں از قبیل اسرائیلیات جمع کیا تھا[1]، اس میں چونکہ ہر قسم کی سچی جھوٹی روایات تھیں، اور اس میں اقوال رسول علیہ السلام تھے اس لئے اس کا نام صادقہ رکھا۔

(اقول) اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بالمشافہ سنا تھا اس میں کسی قسم کے کذب کا احتمال مطلقاً نہ تھا، اس لئے صادقہ نام رکھا گیا، عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے جو جو حدیثیں کتابوں میں مروی ہیں وہ درحقیقت اسی صحیفہ کی ہوتی ہیں، اس سلسلۂ اسناد میں بعض محدثین کو چونکہ انقطاع معلوم ہوتا ہے اس لئے اس پر

---

[1] صحیح یہ ہے کہ اہل کتاب کے لکھے ہوئے صحائف ان کو اس جنگ میں دستیاب ہوئے تھے، اور وہ دو گٹھے تھے جن کو مدلین کہتے تھے (مرتب)

کلام کرتے ہیں، اور کل روایات کے قبول میں انھیں تردد ہوتا ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بھی کچھ روایات لکھ کر محفوظ کی تھیں، غرض ابتدا تو پہلے ہو چکی تھی مگر اس وقت تک باقاعدہ تدوین وتبویب نہیں ہوئی تھی، اس کی طرف سب سے پہلے سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے توجہ فرمائی، انھوں نے سنہ ۹۹ھ میں، اکناف واطراف میں احکام بھیجدیئے کہ جس کے پاس جو ذخیرہ حدیث کا موجود ومحفوظ ہو اسے کتاب کی صورت میں جمع کرلے اس حکم کی تعمیل شروع ہوگئی، اور لوگوں نے تدوین کتب شروع کردی، سب سے پہلے قوم کے ہاتھ میں جو کتاب پہونچی وہ ابن شہاب زہری[۱] کی تھی، اس کے بعد امام مالک نے مؤطا لکھی، لیکن اس میں انھوں نے آثار صحابہ واقوال تابعین بھی لے لئے، نیز مراسیل اور منقطعات بھی اس میں آگئیں اس لئے لوگوں نے مسانید لکھنا شروع کیا جن میں صرف احادیث نبویہ کو جو مسند ہوں بیان کرنے کی کوشش کی گئی، سب سے بڑا مسند [جو عام طور پر دستیاب ہوتا ہے] امام احمد بن حنبل کا ہے، جس کے متعلق خود امام احمد کا قول ہے کہ جو حدیث مسند میں نہیں وہ حجت ہی نہیں، گو علماء نے یہ دعوی تسلیم نہیں کیا، تاہم ذخیرہ احادیث کے وفور میں شک نہیں کیا جاسکتا [اسطرح بقدر امکان استیعاب کے ساتھ خالص مرفوع احادیث کی تدوین جس کی ضرورت موطا کے بعد بھی محسوس کی جارہی تھی پوری ہوگئی، مگر ایک ضروری کام اب بھی باقی تھا وہ یہ کہ ہر صنف کی حدیثوں کو مختلف کتب اور ابواب کے تحت سندوں کے ساتھ اکٹھا استیفا کے ساتھ کیا جاتے۔ اس ضرورت کا احساس امام احمد ہی کے عہد میں امام عبدالرزاق اور امام ابن ابی شیبہ نے کیا اور دونوں نے مصنف کے نام سے ایک ایک کتاب لکھی۔ اور اسی عہد میں سعید بن منصور نے سنن لکھی، لیکن ان حضرات نے بھی مرفوع ومسند حدیثوں پر اکتفا نہیں بلکہ آثار صحابہ وتابعین بھی ذکر کردیئے اور تساہل کی راہ اختیار کرکے ضعیف حدیثوں کو بھی اپنی کتابوں میں جگہ دے دی] ایسے وقت میں ضرورت تھی کہ کوئی خدا کا بندہ اٹھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح اور کھری احادیث کو مصنفات وسنن کے نہج پر جمع کرے، اس کے لئے اللہ تعالی نے امام بخاری کو منتخب کر رکھا تھا، چنانچہ وہ اٹھے اور بخاری شریف لکھی، اور ایسی لکھی کہ کتاب اللہ کے بعد صحت واستناد میں اسی کا مرتبہ علماء فحول نے تسلیم کیا، دنیائے اسلام کو بجا طور پر فخر ہے کہ اپنے نبی کی تعلیمات اور ان کے اخلاق وکردار کو اس درجہ احتیاط اور التزام صحت کے ساتھ محفوظ رکھنے کی خدمت جیسی مسلمانوں نے انجام دی ویسی دوسری کسی قوم نے انجام نہیں دی۔

تدوین حدیث کی تکمیل تک تین دور گذرے ہیں، دور اول بالکل ابتدائی تھا، اس دور میں متعدد حضرات نے اپنے اپنے طور پر حدیثیں لکھیں، جنھیں فنی حیثیت حاصل نہ تھی اس قسم کی کتابت حدیث سنہ ۹۹ھ سے شروع ہوئی جسمیں باقاعدہ کتابیں لکھی گئیں مگر شان یہی کہ

---

[۱] ان کا نام ونسب یوں ہے، محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن شہاب الزہری المدنی، (مقدمہ فتح الملہم ص ۹۲)

آثار صحابہ و اقوال تابعین سب ہی ان میں شامل تھے، جیسے موطا امام مالک و جامع سفیان ثوری، اس ضمن میں یہ بحث بھی سامنے آئی کہ مراسیل مقبول ہیں یا نہیں، ابن جریر وغیرہ نے مرسل کے قبول کرنے پر سلف کا اجماع نقل کیا ہے، مگر حافظ نے دعوی اجماع پر کلام کیا ہے اور ایک دو نام ایسے لوگوں کے پیش کئے ہیں جو کہتے تھے کہ مرسل حجت نہیں۔ بہرحال اجماع نہیں تو قریب باجماع ضرور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہ و مالک وغیرہما جو مقدم ہیں مرسل کو قبول کرتے ہیں، اور امام شافعی نے اس میں بہت کلام کیا ہے۔

دوسرا دور اس وقت شروع ہوا، جب مسانید لکھی گئیں، ان میں آثار صحابہ و اقوال تابعین نہیں صرف احادیث نبوی ہیں، ان مسانید میں صحت کا التزام نہیں کیا گیا، اس وقت ہمارے ہاتھ میں سب سے بڑا مسند امام احمد بن حنبل کا ہے، لیکن انھوں نے بھی صحیح و سقیم سب ہی لے لئے ہیں، صرف صحاح کو جمع کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔

امت میں تشنگی باقی رہی تو تیسرا دور آیا، دوسری صدی ہجری ختم ہو رہی تھی، اور یہ وقت وہ تھا جس کا تقاضا تھا کہ کھری اور پکی حدیثوں کے مجموعے سامنے آئیں، جن کی اسانید و متون بیداغ ہوں، کوئی کتاب اس وقت تک اس شان کی موجود نہ تھی، اسلئے پوری امت کو انتظار تھا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے امام بخاری کو کھڑا کر دیا، اور انھوں نے ایسی کتاب لکھی کہ وہی اس شان کی اول اور وہی آخر کتاب ثابت ہوئی، اس میں اقوال صحابہ جہاں آئے ہیں وہ ترجمہ میں ہیں، ابواب کے تحت آثار نہیں ہیں، اس کتاب کو ایسا اونچا مرتبہ ملا کہ امت نے تلقی بالقبول کر لیا، یہ دور تکمیل کا دور تھا، پہلی صدی کے آخر سے یہ کام شروع ہوا اور دوسری صدی کے ختم ہوتے ہوتے مکمل ہو گیا، بعد میں آنے والے انھیں کی اتباع کرتے رہے، مگر یہ درجہ کسی کو نہ مل سکا، امام مسلم نے امام کا اتباع کیا ہے اور حسن وضع و ایراد احادیث بیشک امام مسلم کا امام بخاری سے بڑھا ہوا ہے، لیکن صحت میں درجہ بخاری کا اونچا ہے، حافظ عبدالرحمٰن یمنی شافعی کے سامنے یہ مسئلہ رکھا گیا کہ جمہور کی رائے ہے کہ بخاری کا درجہ مسلم سے اعلیٰ و افضل ہے، اور وہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درجہ رکھتی ہے، مگر مغاربہ اور ابوعلی نیشاپوری کی رائے میں مسلم کا درجہ بلند ہے تو انھوں نے ایک محاکمہ کیا، اور وہ یہ ہے کہتے ہیں

تنازع قوم فی البخاری ومسلم — لدیّ فقالوا ای ذین یقدم

فقلت لقد فاق البخاری صحۃً — کما فاق فی حسن الصناعۃ مسلم

حقیقت یہ ہے کہ امام مسلم نے ہر باب کی تمام احادیث کو اس خوش اسلوبی سے یکجا جمع کر دیا ہے کہ بیک نظر اس کے متعلق تمام احادیث پر اطلاع ہو جاتی ہے، بخاری کے ہاں ایسا نہیں ہے، بلکہ بسا اوقات ایک دو حدیث کے لئے تمام کتاب چھاننی پڑتی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے یہ التزام نہیں کیا ہے کہ ایک باب میں اس باب کی تمام احادیث بیان کر دیں، اس لئے حافظ عبدالرحمٰن کا یہ فیصلہ بالکل صحیح اور درست ہے۔

مناسب ہے کہ تمھیں باقی صحاح کا حال بھی مختصراً بتا دیا جائے، سنو، صحیحین کے بعد اکثر علماء کے نزدیک ابوداؤد کا مرتبہ ہے،

مگر بہتر یہ ہے کہ نسائی کو ابوداؤد پر مقدم رکھا جائے، کیونکہ نقد رجال میں بعضوں کے نزدیک نسائی کا مرتبہ مسلم سے بھی بڑھ کر ہے، حتیٰ کہ بعضوں نے تو یہانتک لکھدیا کہ جو روایات نسائی میں ہیں ان کی تنقید کی ضرورت نہیں، خود نسائی کا قول ہے، کہ میں نے المجتبیٰ (نسائی شریف کا نام) میں صحیح احادیث ہی لکھی ہیں، برخلاف اس کے ابوداؤد وھن کر جاتے ہیں [تسامح سے کام لیتے ہیں] اور ضعیف بھی قبول کر لیتے ہیں، خود ان کا بیان ہے کہ وھن شدید کو میں ظاہر کردوں گا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وھن خفیف کو بیان نہیں کریں گے، نیز وہ کہتے ہیں جہاں میں سکوت کروں گا وہ صالح ہوگی، اب نہیں معلوم کہ صالح کا کیا مطلب ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صالح للاحتجاج ہوگی، یہ بھی ممکن ہے کہ صالح للعمل یا صالح للاستشہاد ہوگی، اگر صالح للعمل یا للاستشہاد ہوگی تو اس کا صحیح ہونا ضروری نہیں، کیونکہ عمل و استشہاد کے لئے ضعیف بھی کافی ہوجایا کرتی ہے، اور اگر للاحتجاج مراد ہو تو اس کے لئے کم از کم حسن ہونا چاہیئے، حالانکہ سکوت حسن پر نہیں ہوتا، بلکہ اس پر ہوتا ہے جو متکلم فیہ ہو، بہرحال ابوداود، نسائی کے مقابلہ مرجوح ہے، تو چوتھا درجہ ابوداؤد کا رہے گا، پانچواں درجہ ترمذی کا ہے، مگر ایک دوسری حیثیت سے ترمذی کا مرتبہ مقدم ہے اور وہ افضل ہے، وہ یہ کہ ترمذی اول تو ہر ہر حدیث پر حکم لگاتے ہیں کہ یہ حسن ہے، یہ صحیح ہے، یہ ضعیف ہے، دوسرے بیان مذاہب فقہاء کا التزام کرتے ہیں، تیسرے راوی کے عادل یا مجروح ہونے پر بھی تنبیہ کرتے ہیں، یہی وجوہ ایسے ہیں جن کی وجہ سے یہ کتاب مقبول عام ہوگئی، نیز درس میں اسکی طرف خاص توجہ بھی اسی وجہ سے ہے، رہا ابن ماجہ سو متقدمین نے تو اس کو صحاح میں داخل ہی نہیں کیا بلکہ انھیں پانچوں کو اصول خمسہ کہتے تھے، سب سے پہلے ابوطاہر مقدسی نے اسے صحاح میں داخل کرکے صحاح ستہ نام رکھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ اسے صحاح میں داخل نہ کرنا چاہیئے، ابن کثیر نے بھی اسے صحاح میں داخل نہیں کیا، بلکہ موطا امام مالک کو اسکے قائم مقام رکھا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ بعض ناقدین نے ابن ماجہ کی بائیس[۲۲] احادیث پر وضع کا حکم لگایا ہے حافظ ابوالحجاج مزی کہتے ہیں جس روایت میں ابن ماجہ منفرد ہے وہ صحیح نہیں ہے، حافظ ابن حجر نے گو اس کلیہ کو تسلیم نہیں کیا مگر اس سے اتنا ضرور معلوم ہوگیا کہ اس میں بہت سی احادیث غیر صحیح ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے تھے کہ ابن ماجہ کے بجائے صحاح میں موطا امام مالک یا سنن دارمی ہونا چاہیئے، کیونکہ موطا کے متعلق امام شافعی کا قول ہے کہ وہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے (لیکن امام شافعی کا یہ فرمانا بخاری کی تصنیف سے پہلے ہے) بہرحال ابن ماجہ صحاح میں داخل کرنے کے قابل نہیں ہے، اور نہ اسے صحاح میں شمار کرنا چاہیئے۔

(تنبیہ) کتب حدیث متعدد انواع کی ہیں، جوامع، مسانید، سنن، اجزاء، افراد، غرائب وغیرہ، جامع وہ ہے جس میں یہ آٹھ چیزیں موجود ہیں ؎

سیر آداب وتفسیر وعقائد
فتن، احکام واشراط ومناقب

مسند وہ ہے کہ جس میں (ایک ایک صحابی کی حدیثیں صحابہ کے مراتب کا لحاظ کرتے ہوئے یکجا کی گئی ہوں، مثلاً پہلے

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی، پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی، وھلمّ جرّا۔ [مگر مسند کے لئے یہ لازمی شرط نہیں ہے]

سنن وہ ہیں جن میں فقہی ابواب کی ترتیب پر احادیث احکام کو جمع کیا گیا ہو، [مگر اکثر سنن میں دوسری انواع کی حدیثیں بھی ذکر کردی جاتی ہیں، جیسے تفسیر، فتن اور ابواب القیامۃ وغیرہ کی حدیثیں]

اجزاء وہ ہیں جن میں کسی خاص مسئلہ کی احادیث ہوں، جیسے جزء القراءۃ للبخاری۔

افراد وہ ہیں [جن کو روایت کرنے میں کوئی ایک شخص یا صرف کسی ایک شہر کے لوگ متفرد ہوں [۱]

غرائب، جن میں اپنے شیخ کے متفردات منقول ہوں، کوئی دوسرا اس کا راوی نہ ہو۔

معجم، کسی محدّث نے اپنے تمام شیوخ کی ایک ایک دو دو حدیثیں ان کے ناموں کی ترتیب پر جمع کی ہوں —— بخاری، مسلم صحیحین ہیں، باقی سنن، نیز بخاری و ترمذی جامع بھی ہیں، مگر ترمذی کو تغلیباً سنن میں شمار کرلیتے ہیں، مسلم کے جامع ہونے میں بعض لوگوں نے کلام کیا ہے، کیونکہ اس میں تفسیر کم ہے، مگر یہ فیصلہ درست نہیں اس لئے کہ تفسیر اس میں موجود تو ہے کم سہی، پھر کیوں اسے جامع نہ کہا جائے۔ اب رہا تفسیر کا کم ہونا، سو اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاً تو مسلم نے یہ التزام کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسند و مرفوع حدیثیں بیان کریں گے، آثارِ صحابہ و اقوال تابعین سے احتراز کریں گے، دوسرے یہ کہ مکررات سے بچیں گے، یہی وجہ ہے کہ مسلم میں مکررات صرف دو ہی چار پائے جاتے ہیں، اور تفسیر میں احادیث مرفوعہ مسندہ کم ملتی ہیں، اور جو ملتی بھی ہیں ان کو مسلم دوسرے ابواب میں پھیلا چکے ہیں، اور عدم تکرار کا التزام ہے، پھر بیچارے زیادہ کہاں سے لاتے، بخاری نے ان دونوں باتوں کا التزام نہیں کیا، وہ آثار صحابہ و اقوال تابعین اور ائمہ لغت کی تصریحات بھی نقل کردیتے ہیں، اور ایک ایک حدیث کو کئی کئی باب میں بھی لے آتے ہیں، اسی لئے ان کی کتاب التفسیر بہت طویل ہے، اور مسلم کے سخت شرائط کی وجہ سے ان کی کتاب التفسیر بہت مختصر رہی، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جامع نہ رہی اس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ مجدالدین فیروز آبادی نے (جو لغت میں حافظ ابن حجر کے استاذ تھے) جب مسلم ختم کی تو کہا ؎

ختمت بحمد اللہ جامع مسلم

اس سے بھی معلوم ہوا کہ مسلم جامع ہے، اور اُسے جوامع سے خارج کرنا درست نہیں، تو اب صحاح ستہ میں تین جامع رہیں، اور تین سنن، البتہ ترمذی کو تغلیباً سنن بھی کہہ دیتے ہیں۔

بخاری میں مکررات :۔ اس میں کلام ہوا ہے کہ بخاری میں مکررات ہیں یا نہیں، بعض نے اثبات کیا ہے، بعض نے انکار، جو مکررات مانتے ہیں، ان کی بات تو ظاہر کے مطابق معلوم ہوتی ہے، مگر جو مکررات کے منکر ہیں وہ توجیہ کرتے ہیں، جیسا کہ حافظ ابن حجر نے باب کفران العشیر میں لکھا ہے، کہ عدم تکرار کے معنی یہ ہیں کہ ایک لفظ ایک سند ایک سیاق کے ساتھ

[۱] تدریب الراوی ص۸۷

نہ لائیں گے، بلکہ یا تو سندیں متعدد ہونگی یا اگر سندیں متعدد نہ ہوں گی، تو متن میں اختصار کر دیں گے یا سند میں تعلیق کر دیں گے [او غیر ذلک] خلاصہ یہ ہے کہ دوبارہ لائی ہوئی حدیث ہر لحاظ سے پہلی جیسی نہ ہو گی، یہی وجہ ہے کہ طالب حدیث کو بخاری میں کسی حدیث کا تلاش کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ اور مسلم میں اس قسم کی دشواری نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ سہل و آسان ہے۔

مشہور ہے فقہ البخاری فی تراجمہ یعنی اپنا مذہب فقہی ترجمہ میں ظاہر کرتے ہیں۔ مگر لطیف معنی یہ ہیں کہ ان کی شانِ تفقہ ترجمہ سے ظاہر ہوتی ہے، اسی کو دیکھ کر بعضوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ بخاری احمد بن حنبل سے افقہ ہیں۔ واللہ اعلم۔

استاذ رحمہ اللہ (حضرت شیخ الہند) فرماتے تھے کہ امام بخاری کبھی ترجمہ میں کوئی قید لگا دیتے ہیں، مگر اصل میں وہ جملہ (قید) نہیں ہوتا تو دراصل بخاری دم لیتے تھے۔ اور کسی پر کچھ خفگی ہوتی ہے تو ترجمہ میں اسے ظاہر کر دیتے ہیں۔ حدیث میں کچھ سامان نہیں ہوتا تو تراجم میں جو کہنا ہوتا ہے وہ سب کہہ لیتے ہیں، اسی لئے کہا گیا ہے فقہ البخاری فی الترجمۃ۔ خود بخاری نے کہا ہے کہ میرے پاس کوئی قول صحابہ یا تابعین کا ایسا نہیں ہے جس کی اصل قرآن یا سنت سے نہ ہو۔ پس اپنے اس علم کا اظہار وہ ترجمہ میں کرتے ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دو تین اصول بیان کر دئے جائیں، تاکہ طالب کو بصیرت حاصل ہو، ان کا بیان کر دینا اس لئے بھی مناسب بلکہ ضروری ہے کہ علماء نے جو تحقیق فرمائی ہے اس سے کچھ شفا نہیں ہوئی، پہلی بات معنعن کے بارے میں کہنی ہے، اور دوسری بات جمہور و بعض اصولیین کے اس اختلاف کے متعلق کہنی ہے کہ بخاری و مسلم کی روایات مفید یقین ہیں یا نہیں۔

معنعن کے اتصال کی شرط | یہ تو معلوم ہی ہے کہ تمام ائمہ کی کچھ نہ کچھ شروط ہیں قبول حدیث میں، حازمی نے ایک رسالہ ائمہ خمسہ کی شروط میں لکھا ہے، بخاری و مسلم اتنی بات میں تو متفق ہیں کہ رواۃ ثقات ہوں، عادل و ضابط و متقن ہوں، متن، شذوذ و علت سے پاک ہو ——— مگر اس میں اختلاف ہے کہ بخاری ایسے اشخاص کی روایت لیتے ہیں جو کثیر الملازمۃ ہوں، مسلم کے ہاں یہ شرط نہیں، وہ محض عدل و ضبط وغیرہ کا لحاظ کرتے ہیں، بشرطیکہ کوئی جرح موثر نہ ہوئی ہو، اس میں اختلاف ہے کہ اگر عنعنہ ہے تو کن حالات میں مقبول ہے۔ یہ تو مسلّم ہے کہ مدلّس کا عنعنہ غیر مقبول ہے، لیکن غیر مدلّس کا عنعنہ بخاری کے نزدیک اس وقت مقبول ہو گا جب تمام عمر میں کم از کم ایک مرتبہ لقاء ثابت ہو، اگر ایک بار بھی راوی و مروی عنہ کی باہم ملاقات ثابت نہ ہو تو راوی کا عنعنہ عند البخاری صحیح نہیں، (یعنی اتصال پر محمول نہ ہو گا)

مسلم کہتے ہیں کہ اگر معاصرت ثابت ہے اور امکانِ لقاء موجود ہے، تو غیر مدلّس کے عنعنہ کی صحت کیلئے اتنا ہی کافی

ہے، حسن ظن کی بنا پر اسے متصل ہی کہیں گے، کیونکہ جب امکان لقاء موجود ہے تو بلا وجہ انقطاع پر کیوں حمل کریں، حاصل یہ کہ صرف معاصرت عند البخاری کافی نہیں ہے، اور مسلم کے نزدیک کافی ہے، مسلم نے مقدمہ میں شد و مد سے پہلے مسلک کا رد کیا ہے اور تحدی کے ساتھ لکھا ہے کہ کسی اہل علم کا سلف میں سے یہ قول نہیں ہے جو بخاری کا ہے، نام بخاری کا نہیں لیا ہے، بلکہ بعض منتحلی الحدیث کا عنوان اختیار کیا ہے، مگر بظاہر بخاری ہی مراد ہیں، کیونکہ قائلین میں صرف دو شخصوں کے نام لئے جاتے ہیں، ایک بخاری کا، دوسرے علی بن المدینی کا، مسلم کا کہنا ہے کہ قبول عنعنہ کے لئے یہ شرط لگانا محدَث و مخترع و بدعت ہے، اجماع سلف اس کے خلاف ہے اس قول کے ساقط ہونے کی ایک دلیل تو اجماع کی ہوئی، دوسری دلیل انھوں نے یہ دی کہ اگر بخاری کے قول کو تسلیم کر لیا جائے، اور صحت کے لئے یہ شرط تسلیم کر لی جائے تو ایک بڑا ذخیرہ صحیح روایتوں کا معطل و بیکار ہو جائے گا، کیوں کہ بخاری کہتے ہیں کہ اگر لقاء کا ثبوت نہیں ہے، تو ممکن ہے کہ معاصر معاصر سے بطریق ارسال روایت کرتا ہو، اور ارسال سے وہن و ضعف پیدا ہو جائے گا [اور وہ ان لوگوں کے نزدیک قابل قبول نہ ہوگی جو مرسل کو قبول نہیں کرتے] مسلم جواب میں کہتے ہیں کہ اگر ایک بار سماع ثابت بھی ہو گیا تو یہ کیا ضرور ہے کہ سب روایات سنی ہوئی ہوں، لہٰذا باقی روایات میں پھر احتمال ارسال موجود رہیگا تو جبتک ہر حدیث میں تصریح سماع نہ ہو اسوقت تک یہ احتمال مندفع نہ ہوگا اور شبہہ ارسال کی وجہ سے وہن و ضعف پایا جائے گا، مثلاً امام مالک کوئی روایت زہری سے عن سے کریں، تو باوجود لقاء کے اس خاص حدیث میں صراحت سماع ہونی چاہیئے، ورنہ احتمال ارسال ہوگا، تو اس شرط کی بنا پر بہت بڑا ذخیرہ حدیث کا صحیح قرار نہ پائے گا، کیونکہ ہر حدیث میں امکانِ ارسال ہے جب تک تحدیث کی صراحت نہ ہو، امام مسلم نے اسی دلیل پر بہت زور دیا ہے، تیسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ بہت سی حدیثیں معنعن ہیں اور راوی کا مروی عنہ سے ان خاص احادیث میں سماع ثابت نہیں، حالانکہ بخاری بھی ان کو صحیح مانتے ہیں اور بخاری میں درج بھی ہیں، یہ الزامی جواب ہے کہ خود بخاری نے اپنی اس شرط کے خلاف کیا ہے تو پھر کس طرح دوسرے کو پابند بنانا چاہتے ہیں، شارحینِ مسلم اور شارحینِ بخاری نے بھی بخاری ہی کی بات کو صحیح کہا ہے اور مسلم کی بات کو گرایا ہے کوئی مسلم کے قول کو ترجیح نہیں دیتا لیکن ان شراح نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جو کوئی خاص وزن پیدا کرے،

سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ تمام احادیث کا ذخیرہ ہاتھ سے جاتا رہے گا، اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ثبوت لقاء کے بعد عنعنہ میں انقطاع کا شبہہ جس احتمال کی بنا پر کیا جائیگا وہ تدلیس کا احتمال ہوگا نہ کہ ارسال کا، اور کلام مدلس کے بارے میں نہیں ہے تو جس کا سماع و لقاء ثابت ہو اور وہ عن سے روایت کرے اس کو متصل ماننا چاہیئے تدلیس کا احتمال پیدا کر کے اس کو منقطع نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ راوی مدلس نہیں ہے، ابن حجر، نووی وغیرہ سب نے یہی لکھا ہے، مدتوں غور کیا کہ کوئی قول بخاری کے خلاف ملے، مگر نہیں ملا، اپنی سمجھ میں جو آیا وہ بیان کرتا ہوں، مگر پہلے ارسال اور تدلیس کا فرق سمجھ لو، نیز یہ سمجھ لو کہ ارسال ایک جلی ہے، ایک خفی، یہ تین چیزیں ہوئیں، یوں سمجھو کہ راوی اور مروی عنہ کے درمیان تین صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ان میں معاصرت نہیں ہے اس صورت میں اگر راوی صیغہ موہمہ للسماع سے روایت کرے تو یہ ارسال

جلی ہے اجماعًا، اگر صراحتِ سماع کرتا ہے اور فی الواقع سماع نہیں ہے تو کذبِ صریح ہے، اور وہ کذاب ہے، صیغہ موہمہ ہونا چاہئیے تاکہ ارسال کہا جاسکے اور کذب صریح نہ کہا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں میں معاصرت بھی ہے اور سماع ولقاء بھی ثابت ہے اس کے بعد راوی ایک روایت کرتا ہے اور یہ خاص حدیث سنی ہوئی نہیں ہے، اور صیغہ موہمہ ہے جیسے عن وغیرہ، تو یہ بالاتفاق تدلیس ہے اسے تدلیس اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں تلبیس ہے اور تدلیس مذموم ہے اور ارسال عیب نہیں، گو واسطہ دونوں جگہ حذف ہوتا ہے مگر دونوں میں فرق ہے، اور وہ یہ کہ جس نے زمانہ نہیں پایا، مثلاً میں کہوں کہ غزالی فرماتے تھے تو کسی کو وہم بھی نہیں ہوسکتا کہ میں نے خود سنا ہوگا ہر شخص جانتا ہے کہ ملاقات ممکن نہیں ہے، تو چونکہ ارسال میں لقاء ممکن نہیں اور محدثین کو معلوم ہے کہ اسے لقاء نہیں تو محدثین کو دھوکا نہیں لگتا گو صیغہ موہمہ ہی کیوں نہ ہو، اور مدلّس کے قول سے دھوکا ہوتا ہے، مثلاً ہم اپنے استاذ سے روایت کریں اور ایک ایسی چیز نقل کر جائیں جو سنی نہیں ہے اور بصیغہ موہمہ بیان کریں، تو اب وہم ہوگا، گویا عدم سماع پر مدلّس پردہ ڈال رہا ہے، اس لئے یہ چیز مذموم ہے اور اس میں شائبہ کذب پایا جاتا ہے، تیسری صورت اور ہے جس میں اختلاف بین المحدثین ہوا ہے، وہ یہ کہ معاصرت تو ثابت ہو لیکن لقاء وسماع ثابت نہ ہو، اگر ایسا راوی ایسے مروی عنہ سے بصیغہ موہمہ روایت کرے، تو آیا یہ تدلیس ہے یا ارسال؟ ایک حیثیت سے تو یہ صورت تدلیس کہلانے کی مستحق ہے، کیونکہ معاصرت پائی جاتی ہے، اور دوسری حیثیت سے ارسال کہلانے کی مستحق ہے کیونکہ سماع ثابت نہیں، مگر ارسال جلی نہیں، کیونکہ معاصرت ثابت ہے اور تدلیس بھی نہیں کیونکہ سماع ولقاء ثابت نہیں، پھر بھی اسکو بعض نے تدلیس کہا اور بعض نے ارسال، حافظ ابن حجر نے اس کا نام ارسال خفی رکھا ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ کچھ تھوڑا سا تدلیس میں داخل کرو، اور تھوڑا سا ارسال میں، اگر صرف معاصرت ہے سماع ولقاء ثابت نہ ہو۔ بلکہ عدم کا ثبوت ہو جائے تو اب یہ مرسل ہے کیونکہ دھوکا نہیں، اور اگر معاصرت ثابت ہو اور سماع ثابت نہ ہو اور سماع کی نفی بھی ثابت نہ ہو تو معاملہ بالکل مبہم ہے اس کو تدلیس کی قسم میں داخل ہونا چاہئیے، کیونکہ اب دھوکا لگتا ہے، اور یہی فرق ہے، تدلیس وارسال میں، صورت معاصرت میں دو صورتیں نکل آئیں، ایک عدم ثبوت سماع، جس میں امکان سماع ہے، دوسری ثبوت عدم سماع، جس میں سماع کا امکان نہیں تو ابہام تک تدلیس ہے اور بعد رفع ابہام ارسال (کذا فی الکفایۃ فی اصول الحدیث، للخطیب البغدادی) سخاوی نے اسکو فتح المغیث میں ــــــ نقل کیا ہے[1] اور کہا ہے کہ اصلی فرق یہی کہ جہاں ابہام ہو تو تدلیس اور جہاں ابہام نہ ہو تو ارسال ہے، (ثبوت عدم اور عدم ثبوت دو چیزیں الگ الگ ہیں، اول میں عدم کے ثبوت کا دعوی ہے اور دوسرے میں امکان ہے ثبوت کا جو ثبوت ہوا نہ ہو) مثلاً میں کہوں کہ لندن کا فلاں آدمی یوں کہتا ہے اور معلوم ہے کہ نہ میں وہاں گیا نہ وہ یہاں آیا تو چونکہ اس صورت میں ابہام نہیں، لہذا یہ صورت ارسال کی ہے،

جب یہ ثابت ہو گیا تو اب میں کہتا ہوں کہ مسلم کا اعتراض درست ہے کیونکہ بخاری کہتے ہیں کہ بلا سماع ولقاء احتمال ارسال

---

[1] فتح المغیث طبع ہند ص۷۴ کی طرف رجوع کیا جائے ۱۲ مرتب

ہے اور مسلم نے کہا کہ ایک بار لقاء وسماع کے بعد بھی یہی احتمال ہے، اور اس کا جواب کہ اب جو احتمال ہے تدلیس کا ہے نہ ارسال کا، ایسا ہے کہ بعینہٖ یہی جواب مسلم دے سکتے ہیں، کہ ثبوت معاصرت کے بعد عدم ثبوت لقاء کی صورت میں عن کہنے سے جس بات کا احتمال پیدا ہوتا ہے وہ بھی تدلیس ہی کا ہے نہ کہ ارسال کا اس لئے کہ یہ بھی ابہام ہی کی صورت میں عنعنہ ہے، خواہ تم اس کا نام ارسال خفی رکھو یا اور کچھ، کیوں کہ ارسال میں ابہام بالکل نہیں ہوتا لہٰذا بخاری کا دعوی کہ اس صورت میں احتمال ارسال کا ہوگا صحیح نہیں، بلکہ اس صورت میں بھی احتمال تدلیس ہی کا ہوگا، والمسألۃ مفروضۃ فی غیر المدلس لہٰذا اب ایک بار لقاء اور امکانِ لقاء دونوں مساوی ہیں، اور جب دونوں مساوی ہیں تو جس طرح ایک بار لقاء کے بعد کی صورت محمول علی الاتصال ہے اسی طرح امکان لقاء کی صورت بھی خارج از مبحث ہونی چاہئیے، بلکہ ابن عبدالبر نے کہا کہ یہ صورت اشنع ہے[۱]، کیونکہ احتمال لقاء وسماع دونوں کا ہے۔ اسلئے ابہام زائد ہوگا، اور لقاء کے بعد ابہام صرف سماع میں ہے لہٰذا یہاں ابہام کم ہوگا۔

اب رہا دعوی اجماع کا تو اس کے توڑ کے لئے مخالفین نے دوسرے اجماع کا دعوی کردیا اور کہہ دیا کہ بخاری کے قول پر اجماع ہے، مگر مسلم کے قول کے مقابل میں متاخرین کا قول کون سن سکتا ہے۔ ہاں اگر مسلم سے قبل کا اجماع یا خلاف نقل کیا جاوے تو بیشک قابل توجہ ہوسکتا ہے، مگر اس کا وجود نہیں، اگر کوئی اس کا مدعی ہو تو اسے پیش کرنا چاہئیے، رہیں روایات مخضرمین کی، کہ وہ بالاتفاق مرسل ہیں، کما قالہ الحافظ، حالانکہ قاعدے سے مدلس کہنا چاہئیے کیونکہ یہاں معاصرت ثابت ہے اور لقاء ممکن ہے اور جب امکان لقاء ہے تو ابہام موجود ہے مگر کوئی ان کو مدلس نہیں کہتا تو اس کا جواب مُلّا علی قاری نے شرح نخبہ کی شرح میں یہ دیا ہے کہ تمہارے نزدیک مخضرم وہ ہے کہ زمانہ پایا ہو اور معاصرت ثابت ہونے کے ساتھ عدم لقاء متحقق و متیقن ہو لہٰذا تحقق عدم لقاء کی وجہ سے ان کو بالاتفاق مرسل ہی کہا جائے گا۔ پس حافظ کا اعتراض صحیح نہیں، استاذ رحمہ اللہ کا خیال تھا کہ یہ شرط بخاری کے نزدیک بھی نفس صحتِ حدیث کے لئے نہیں تھی، بلکہ صحیح بخاری کے لئے یہ شرط لگائی ہے، یعنی انھوں نے اپنی صحیح میں التزام کیا ہے کہ انھیں راویوں کا عنعنہ قبول کریں گے، جن کا سماع مروی عنہ سے کم از کم ایک بار ثابت ہو، اس کی نظیر مسلم میں بھی موجود ہے، کہ جب شاگرد نے کہا کہ زیادۃ سلیمان تیمی فاذا قرأ فانصتوا کیسی ہے؟ تو کہا اترید احفظ من سلیمان، وہ سوال کرتا ہے کہ ابو ہریرہ کی روایت (جو ابوداؤد میں ہے) کیسی ہے؟ تو کہا صحیح ہے، سوال کیا لِمَ لم تضعہ ھاھنا، جواب دیا انما وضعت ھاھنا ما اجمعوا علیہ[۲]، اجماع سے مراد ان چار اشخاص کا اجماع ہے جو شیوخ مسلم میں ہیں، یعنی یحییٰ بن معین، امام احمد بن حنبل، ابوزرعہ رازی اور ابوحاتم رازی[۳]۔

---

[۱] فتح المغیث ص ۴۲، ۵، ۶، دیکھو [۲] فتح الملہم ص ۴۴/۲ [۳] جامع تقریر نے اخیر کے دو ناموں کے بجائے عثمان بن ابی شیبہ اور سعید بن منصور کا نام لکھا ہے۔ مگر یہ سہو ہے، فتح الملہم میں استاذ الاستاذ مرحوم نے وہی نام لکھے ہیں جو ہم نے درج کئے ہیں ۱۲ رشید احمد الاعظمی

اس سے معلوم ہوا کہ صحیح مسلم میں ہر ہر صحیح کا اندراج ضروری نہیں، نہ انھوں نے اس کا التزام کیا ہے۔ کیونکہ کتاب کیلئے کچھ مخصوص شرائط ہیں تو اگر بخاری نے بھی اپنی کتاب کے لئے یہ شرط لگائی ہو تو کوئی مانع نہیں، اور جمہور کے خلاف بھی نہیں استاذ نے اس بات کو درسِ ترمذی میں کہا تھا لیکن اس کی نقل کہیں نہیں ملی تھی، اب تدریب الراوی للسیوطی میں دیکھی، قیل کرکے نقل کیا ہے، مقدمہ مسلم میں میں نے مبسوط بحث کی ہے۔ فانظر هناك۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ آیا صحیحین کی حدیثیں مفید قطع ہیں یا نہیں، یہ معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ جمہور جن کے علم بردار، عزالدین بن عبدالسلام و امام نووی ہیں، فرماتے ہیں کہ مفید قطع نہیں بلکہ مفید ظن ہیں الا یہ کہ متواتر ہوں، نووی نے اسی کو محققین کا قول بتایا ہے۔ اور ابن الصلاح بھی پہلے اسی کے قائل تھے وہ فرماتے ہیں کہ میں پہلے اسی طرف مائل تھا اور اسی کو قوی سمجھتا تھا پھر مجھ پر ظاہر ہوا کہ صحیح یہ ہے کہ یہ اخبار مفید قطع ہیں[1] حافظ ابن حجر نے فرمایا کہ نووی نے اکثر علماء کی طرف اس قول کی جو نسبت کی ہے وہ تو مسلم ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ محققین صرف اسی کے قائل ہیں، یہ مسلم نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے قول یعنی مفید قطع ہونے کے قائل اور ابن الصلاح کے موید بھی محققین ہیں۔

تدریب الراوی میں ابن الصلاح کے موید محققین کے جو نام دیئے ہیں ان میں شمس الائمہ سرخسی کا احناف میں اور ان میں ابویعلی و ابن الزاغوانی وابوالخطاب کے نام حنابلہ میں، اور قاضی عبدالوہاب کا مالکیہ میں، اور شوافع میں بہت سے محققین کے نام مذکور ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ان دونوں کتابوں کی امت نے تلقی بالقبول کرلی ہے، اور اہل علم وائمہ کا اجماع ہوگیا ہے کہ کتب حدیثیہ میں، یہ سب سے اصح ہیں، تو جب یہ اجماع ہوگیا اور امت محمدیہ نے ان کی تلقی بالقبول کرلی، تو اب وہ یقیناً ظنیت سے نکل کر قطعیت تک پہونچ گئیں، خبر واحد جب محفوف بالقرائن ہو تو وہ قطعی ہو جاتی ہے، مثلاً کوئی کہے کہ فلاں کا انتقال ہوگیا تو وہ گو خبر واحد ہے مگر جب اس کی صحت کے قرائن موجود ہوں تو یہ خبر قطعی ہو جاتی ہے اور ظنیت سے خارج ہو جاتی ہے، (اصول فقہ و حدیث میں یوں ہی لکھتے ہیں) نظیر اس کی حدیث تحویل قبلہ ہے کہ صرف ایک شخص کی خبر پر تحویل قبلہ کرلی گئی، حالانکہ بیت المقدس کا قبلہ ہونا یقینی [اور قطعی تھا]، اور [تحویل کی] خبر واحد تھی، مگر چونکہ [محفوف بالقرائن] تھی اسلئے اس پر یقین ہوگیا [اور وہ مفید قطع ہوگئی] [حافظ] ابن حجر نے [فریقین میں] مصالحت کی کوشش کی ہے چنانچہ نخبہ میں بھی ہے اور سخاوی نے بھی فتح المغیث میں حافظ کے قول کو نقل کیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ جو مفید قطع کہتا ہے وہ علم کو نظری کے ساتھ مفید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اخبار جس علم قطعی کو مفید ہیں وہ استدلال و نظر سے حاصل ہوتا ہے، اور جو مفید ظن کہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس قطعیت کی مفید نہیں ہیں جو بداہتہ سے حاصل ہوتی ہے، مثلاً بغداد کے وجود کا علم قطعی بدیہی ہے، لیکن العالم حادث (عالم حادث ہے) کا علم گو قطعی ہے، مگر نظری اور استدلال سے حاصل ہے، پس جو شخص صحیحین کے مراتب کو جانتا ہو بشرطیکہ وہ حذاق میں سے ہے اور اجماع کا بھی اسے علم ہے، اور اس کو معلوم ہے کہ امت نے تلقی بالقبول کرلی ہے،

[1] ابن الصلاح ص ۱۲

توان نظریات سے وہ یقین کرے گا کہ یہ قطعی ہے، مگر یہ علم نظری ہوگا، جیسے العالم حادث کا، مگر ایسا قطع ویقین نہیں ہوگا جیسا متواتر کا قطع ہوتا ہے، میں نے مقدمہ مسلم میں لکھا کہ ان اخبار کو مفید یقین کہنا ایک دقیق خطا ہے۔ اور دلائل کا سب کا جواب دیا ہے مثلاً اصحیت پر اجماع کی بنا پر مفید یقین کہا گیا ہے تو، میں کہتا ہوں کہ مطلق خبر واحد مع قطع النظر عن الصحیحین، جن میں شروطِ صحت جمع ہوں، وہ باتفاق وباجماع مقبول ہے، توکیا یہ بھی قطعی ہوجائے گی اگر ایسا اجماع مفید یقین ہے تو ہر صحیح خبر واحد مفید یقین ہوگی، لیکن جب اجماع مطلق خبر واحد پر دلیل قطع نہیں تو پھر معین اخبار پر اجماع کیونکر مفید قطع ہوجائے گا، ہر خبر واحد پر بعینہ یہی اجماع ہے، فرق اتنا ہے کہ وہ مطلق پر اجماع ہے اور یہ مقید پر اجماع ہے، دوسرے یہ کہ اجماع اصح ہونے پر جو ہے وہ جملہ کا جملہ سے اصح ہونے پر ہے، یعنی مجموعی حیثیت سے بخاری اصح وافضل ہے، اس کی بحث وہاں ہے جہاں بخاری کے مقابلہ میں مسلم کو مرجوح کہا گیا ہے، وہاں یہ تصریح موجود ہے، اور شیخ بدرالدین زرکشی نے تصریح کی ہے کہ ہر حدیث بخاری کی ہر حدیث مسلم سے اصح نہیں ہے، بلکہ مجموعی حیثیت سے بخاری اصح ہے مسلم سے، اور یہی مراد ہے وہاں بھی جہاں کہا گیا ہے کہ صحیحین اصح ہیں بقیہ کتب سے کسی خاص حدیث کو لے کر اجماع کا دعویٰ صحیح نہیں ہے، ہر حدیث میں یہ احتمال ہے کہ اس جملہ میں سے یہ نہ ہو تو پھر تمام احادیث صحیحین کی مفید قطع کس طرح ہوجائیں گی، فلیتدبر،

یہ دونوں بحثیں طالب حدیث کے لئے بڑی اہم تھیں، اس لئے اصل کتاب کو شروع کرنے سے پہلے ان کا ذکر کیا گیا،

ابتدا میں صرف بسملہ پر اکتفا کرنے کی توجیہ

امام بخاری نے بعد بسملہ کتاب شروع کردی، حمدلہ نہیں لکھی، ایسا ہی ترمذی نے کیا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے کل امر ذی بال لم یبدأ فیہ ببسم اللہ فھو ابتر، نیز قرآن میں ہے اقرأ باسم ربك ان دونوں جملوں سے معلوم ہوا کہ ابتدا بسم اللہ سے ہونی چاہئے، اب رہا حمدلہ کا ذکر نہ کرنا، تو اس کے مختلف جوابات دئے گئے ہیں، حافظ ابن حجر نے تو سرے سے حدیث ہی کو ضعیف قرار دے دیا، اور جب ضعیف ہے تو پھر اگر عمل نہ کیا گیا تو کیا مضایقہ ہے (اس حدیث کے متعلق تاج الدین سبکی نے طبقات شافعیہ میں مبسوط بحث کی ہے، اور آخر میں فیصلہ کیا ہے کہ یہ حدیث مرتبۂ حسن میں ہے، ومن شاء فلیرجع الیہا) مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ جواب کچھ بھتا نہیں، کیونکہ بخاری جیسا کتاب کی قبولیت کا متمنی حدیث برکت پر عمل نہ کرے، بعید از قیاس ہے، اس کی تو حالت یہ تھی کہ بخاری لکھنے کی مدت مدید میں ہر حدیث پر غسل و وضو کرتا اور برابر روزہ رکھتا تھا اور یہ امور تو کسی ضعیف کیا کسی موضوع حدیث سے بھی ثابت نہیں

مگر صرف اس بنا پر یہ سب کرتے تھے کہ ممکن ہے اسی سے درجہ قبولیت حاصل ہو جائے ابتدا ء بالحمد کی حدیث ضعیف بھی سہی بہر حال حدیث تو ہے اور فضائل اعمال میں ضعیف معتبر بھی ہوتی ہے پھر بخاری نے اس کو کیونکر ترک کر دیا، بہر حال بخاری کے حمدلہ چھوڑنے کی یہ توجیہ رکیک اور بیکار ہے، ہاں دوسرا جواب ابن حجر کا بیشک قابل قبول ہے اور وہ یہ ہے کہ حمدلہ کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کو لکھا ہی جائے، ممکن ہے ابتداء کتاب کے وقت دل میں پڑھ لی گئی ہو، اور محدثین کا یہی معمول رہا ہو، اس کی تائید یوں ہوتی ہے کہ امام احمد بن حنبل نقل حدیث کے وقت صلی اللہ علیہ وسلم زبان سے کہتے تھے لکھتے نہ تھے، کیونکہ اسراع مقصود ہوتا تھا، یہ تو حافظ ابن حجر کا جواب تھا،

امام نووی کہتے ہیں کہ بسم اللہ سے مراد مطلق ذکر ہے مسند احمد کی روایت (بذکر اللہ) اس کی مؤید ہے، جب ذکر مطلق مراد ہے تو پھر بسم اللہ و الحمد للہ دونوں اس کے فرد ہوئے ایک کے کہنے سے حدیث پر عمل ہو گیا، اگر ان دو لفظوں کے علاوہ کوئی تیسرا لفظ جو مشعر ذکر رب ہو کہہ دیا جاوے تو بھی عمل بالحدیث ہو جائے گا، مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب مطلق ذکر مراد ہے تو پھر ہمیشہ ابتداء بہ بسم اللہ کیوں ہوتی ہے کہیں تو پہلے حمدلہ ہوتا اور صرف حمدلہ پر اکتفا کیا گیا ہوتا، مگر واقعہ اس کے خلاف ہے، لہذا یہ جوابات دل کو لگتے نہیں نہ چسپاں ہوتے ہیں، ہاں ایک جواب علامہ زرقانی نے شرح موطا میں ذکر کیا ہے، وہ دل کو لگتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دو چیزیں منقول ہیں (یعنی عادت مستمرہ آپ کی بطور استقراء یوں رہی ہے کہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تو خطبے دئے ہیں، وہ منقول ہیں، دوسرے حضور نے خطوط لکھوائے ہیں وہ بھی منقول ہیں، ان دونوں میں ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل دیکھنا چاہئیے، جو طرز عمل آپ کا ثابت ہو وہی سنت ہو گا، جب ہم اس طرح مسئلہ پر غور کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے ہمیشہ کتب (خطوط) میں بسم اللہ پر اکتفا فرمائی ہے، یہی آپ کی عادت مستمرہ ملتی ہے، مثلاً بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ من محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) الی ھرقل الخ، اور مثلاً بسم اللہ الرحمن الرحیم هذا ما قاضی علیہ محمد رسول اللہ، وغیرہما، اور جب خطبہ فرمایا تو وہاں عادت مستمرہ یہ رہی کہ حمدلہ پر اکتفا فرمایا، مثلاً الحمد للہ نحمدہ الخ وغیرہ، ان دونوں طریقوں سے معلوم ہوا کہ کتب میں بسم اللہ، اور خطب میں الحمد للہ ہونا چاہیئے، اسی سنت نبوی پر نظر رکھتے ہوئے محدثین نے کتب میں بسم اللہ پر اکتفا فرمائی اور حمدلہ نہیں لکھی، اب رہا امام مسلم کا حمدلہ کو ذکر کرنا، سو اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے پہلے مقدمہ لکھا ہے اور یہ بمنزلہ خطبہ کے ہے اس لئے حمدلہ لکھی، اور یہی مناسب بھی تھا، اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ دستور یعنی بسم اللہ کا مخصوص بالکتب ہونا قدیم سے چلا آتا ہے، کوئی نئی بات نہیں ہے، مثلاً خود قرآن میں ہے کہ جب بلقیس ملکہ سبا کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط لکھا تو یوں لکھا (اِنَّهٗ مِنۡ سُلَيۡمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ اَلَّا تَعۡلُوۡا عَلَىَّ وَاۡتُوۡنِىۡ مُسۡلِمِيۡنَ) اس سے تائید ہوتی ہے محدثین اور مکتفین بالبسملہ کی، الحمد للہ، اس طرح یہ مسئلہ صاف

ہوگیا۔ اور کوئی کھٹک باقی نہیں رہی، نہ اس کی ضرورت باقی رہی کہ اس مقام پر ابتدا رحقیقی واضافی کا جھگڑا چھیڑا جائے، کیونکہ ابتدا رحقیقی ایک آنی چیز ہے جس میں امتداد نہیں اور یہاں بسم اللہ میں بہر حال امتداد ہے، اور جب امتداد ہے تو یہ بسم اللہ وہی ہوگی جسے عرفی ابتدا کہا جاتا ہے اس لئے حدیث میں اس کی تشقیق بیکار ہے۔

(فائدہ نمبر ۱) دنیا میں ایسا مختصر اور پر معنی مکتوب کسی کو نہیں لکھا گیا جیسا کہ سلیمان علیہ السلام کا یہ خط جو قرآن میں مذکور ہے، نہایت ہی مختصر اور نہایت ہی بلیغ اور پر معنی ہے، ہاں ایک اور خط امت محمدیہ کے ایک فرد خلیفہ ہارون رشید کا ضرور ملتا ہے جو اسی طرح مختصر اور جامع ہے، واقعہ یہ پیش آیا کہ روم کے ایک حصہ پر ایک عورت حکمراں تھی اور وہ سالانہ جزیہ مملکت اسلامی کو ادا کیا کرتی تھی — کیونکہ حکومت اسلامی کے زیر نگیں تھی، جب اس کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا اس کے قائم مقام ہوا جب یہ تخت پر بیٹھا تو اس کو جزیہ دینا ناگوار ہوا اس نے بند کر دیا اور خلیفہ کو خط لکھا کہ میری ماں ایک عورت تھی وہ جزیہ دیا کرتی تھی اب میں تخت نشیں ہوں اور مرد ہوں میں ہرگز جزیہ نہ دوں گا، بلکہ جو رقوم ادا کی گئی ہیں وہ واپس لوں گا، جب یہ خط ہارون رشید کو ملا تو اس کے بدن میں آگ لگ گئی اور فوراً جواب لکھ کر روانہ کر دیا اور ساتھ ہی لشکر روانہ کر دیا، لشکر نے اسے شکست دی اور اس نے خراج دینا منظور کر کے صلح کر لی، اس وقت تاریخ بیان کرنی مقصود نہیں صرف اس خط کا ذکر کرنا تھا، واقعہ ضمناً آگیا، خلیفہ کا خط یہ ہے۔ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ من هارون امير المومنين الى نقفور كلب الروم قد قرأت كتابك يا ابن الكافرة والجواب ماتراه لا ماتسمعه[۱]

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس قدر مختصر اور پر معنی خط لکھا گیا ہے اور مطالب کو کس وضاحت کے ساتھ اس مختصر خط میں بھر دیا گیا ہے، بس اس کے علاوہ اور کوئی تیسرا خط ہمارے علم میں روئے زمین پر ایسا نہیں دیکھا گیا جو انتہائی اختصار کے باوجود ایسا جامع اور پر از معانی و مطالب ہو۔

فائدہ نمبر ۲ حافظ حدیث اس کو کہتے ہیں جو تحقیق و تدقیق میں اپنے شیوخ اور شیوخ الشیوخ سے بڑھ جائے اور اس کے فنی معلومات اس کے مجہولات سے زیادہ ہوں، مُلّا علی قاری نے ایک لاکھ حدیث مع الاسناد کی تعداد نقل کی ہے اور اگر تین لاکھ احادیث مع الاسانید محفوظ ہوں تو ایسے کو حجۃ کہیں گے، اور اگر تمام احادیث بتمامہا و کما لہا مع الاسانید و مع حالات الرجال محفوظ ہوں تو ایسے کو حاکم کہیں گے، جو شخص مشغول فی الحدیث روایۃً و درایۃً ہو اُسے محدّث کہتے ہیں، محدّث کا مرتبہ حافظ سے کم ہے، ابن ہمام محدث ہیں، حافظ نہیں، شیخ بدرالدین عینی کو بمشکل حافظ کہا گیا ہے۔

فائدہ نمبر ۳ جب کوئی خبر کسی کو دی جائے اور اس کا تعلق کسی تیسرے سے ہو تو ضروری ہوگا کہ جن واسطوں سے

---

[۱] تاریخ الخلفاء

وہ خبر پہونچی ہے ان کو ذکر کیا جائے، وہاں تک جہاں سے خبر چلی ہے، لہذا جب ہم یہ کہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان عالی ہے تو ہم پر یہ بھی ضروری ہے کہ ہم تبلائیں کہ یہ فرمان نبوی ہم تک کیونکر پہونچا، کیونکہ ہم نے بالمشافہہ تو سنا نہیں دوسرے اشخاص کے ذریعہ سے سنا ہے لہذا ہمیں ان وسائط کا ذکر کرنا حضور تک ضروری ہے، اسی کا نام سند یا اسناد ہے، گو اب تدوین کتب کے بعد اس درجہ میں اس کی ضرورت نہ ہو، تاہم یہ اسلام کا ایک خاص امتیاز ہے جس سے دنیا کے تمام مذاہب محروم ہیں اس لئے اس کا باقی رکھنا بہت ضروری ہے، اسی لئے تبرکاً اس کا ذکر ضروری ہے، جب اسناد کا ضروری ہونا معلوم ہوگیا تو یہ بتانا ضروری ہوگیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک ہمارا یہ سلسلۂ سند کس طرح پہونچا ہے، یوں تو سلسلہ ایک ہی ہے مگر سمجھانے کے لئے اسے تین حصوں میں تقسیم کرکے بیان کیا جاتا ہے، ایک حصہ ہم سے حضرت شاہ ولی اللہ تک، دوسرا شاہ ولی اللہ سے صاحب کتاب تک تیسرا صاحب کتاب سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک۔ بطور مقدمہ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ تحمل حدیث کے چند طریقے ہوتے ہیں، اور ان کو ظاہر کرنے کے لئے مخصوص الفاظ ہیں، اگر ہم نے پڑھا، اور شیخ نے سنا، تو اسے قراءۃ علی الشیخ کہیں گے، اور عرض علی المحدث بھی، اور اگر شیخ نے پڑھا اور ہم نے سنا تو اسے سماع عن الشیخ، اگر نہ ہم نے پڑھا نہ شیخ نے، بلکہ ہمارے ساتھیوں میں سے کسی نے شیخ کے سامنے پڑھا اور ہم نے سنا، تو قرئ علی الشیخ وانا اسمع کہیں گے، اب سنو کہ ہم نے تینوں طریقوں سے شیخ الہند سے حدیثیں حاصل کی ہیں، اور انھوں نے ہم کو اجازت دی ہے، اور انھوں نے مولانا محمد قاسم نانوتوی سے پڑھا اور اجازت لی، انھوں نے شاہ عبد الغنی مجددی دہلوی ثم مدنی کے پاس پڑھا اور اجازت لی، شاہ عبد الغنی کو شاہ محمد اسحٰق دہلوی سے اجازت تھی اور ان کو شاہ عبد العزیز دہلوی سے اور ان کو اپنے پدر بزرگوار حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے اجازت حاصل تھی۔ دوسرا حصہ شاہ ولی اللہ صاحب سے صاحب کتاب تک اسکو صحاح ستہ کے اوائل یا یا مقدمات میں محشیوں نے لکھدئے ہیں، اور صاحب کتاب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر ہر حدیث کا سلسلہ لکھدیا ہے، اس طرح الحمدللہ ہماری سنائی ہوئی ہر ہر حدیث کا سلسلہ سند کے ساتھ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچتا ہے، اور ہمیں اجازت ہے تمھیں اجازت دینے کی، اس لئے ہم بھی تم کو اجازت دیتے ہیں،

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کتابُ الوحی

بَابٌ کَیْفَ کَانَ بَدْءُ الْوَحْیِ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

سرورِ کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کی ابتداء کیوں کر ہوئی۔

بَابٌ بالتنوین بھی ہے اَیْ ھٰذَا بَابٌ، اور بالاضافۃ بھی، یہ شبہ ہوتا ہے کہ اضافت جملہ کی طرف صحیح نہیں بجز آٹھ الفاظ کے، اور یہ ان میں سے نہیں، جواب یہ ہے کہ اگر لفظ مراد ہوں تو جائز ہے ورنہ نہیں، اور تقدیر یہ ہے جواب جواب کیف کان الخ یعنی اگر کوئی سوال کرے کیف کان الخ تو ہم یہ جواب دیں گے تو مراد اس جملہ سے لفظ ہیں نہ معنی، اور الفاظ میں جائز ہے، اور معنی میں ناجائز، اس کے بعد سنو کہ باب کے بعد حد ثنا سے پہلے جو عبارت ہے اسے ترجمۃ الباب کہتے ہیں، بخاری کے تراجم ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتے ہیں، اور بخاری کے تفقہ کا کمال ان کے تراجم سے ظاہر ہوتا ہے، بخاری بہت بڑے فقیہ اور مستقل مجتہد ہیں کسی کے مقلد نہیں، وہ بجائے اس کے کہ کوئی کتاب فقہ میں لکھتے انھوں نے تراجم میں اپنی فقہ بیان کر دی ہے، جہاں انشراح نہیں ہوتا وہاں ایسے لفظ لائے ہیں جن سے رجحان کا پتہ نہیں چلتا، مثلاً استفہام وغیرہ کا عنوان اختیار کرتے ہیں، خلاصہ یہ کہ تراجم بخاری کے بہت اہم ہیں، استاذ فرماتے تھے اور بہت تواضع سے فرماتے تھے کہ میں ڈرتے ڈرتے کہتا ہوں کہ ابن خلدون (بہ تخفیف اللام، اور ابن خلّکان بتشدید اللام و بکسر اللام) نے اپنے مقدمہ میں جہاں بخاری کا ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ بخاری کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں ہیں، لیکن ابھی تک امت پر اس کا دین باقی ہے حق ادا نہیں ہوا، شمس الدین سخاوی نے جو حافظ ابن حجر عسقلانی کے خاص تلامذہ میں سے ہیں، اور فنافی الشیخ کا مرتبہ رکھتے ہیں، کتاب الضوء اللامع فی اعیان القران التاسع لکھی ہے، اس میں لکھا ہے کہ ابن خلدون نے ایسا لکھا ہے مگر میرے استاذ نے یہ دین اتار دیا، انھوں نے فتح الباری لکھ امت کی طرف سے بخاری کا حق ادا کر دیا،

وَقَوْلُ اللّٰهِ تَعَالٰی عَزَّوَجَلَّ اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ

سخاوی نے ٹھیک ہی کہا، کیونکہ ابتک نہ کوئی ایسی شرح لکھی گئی نہ آئندہ کوئی توقع ہے، عینی نے گو مبسوط شرح لکھی مگر انصاف یہ ہے کہ کوئی شرح خواہ کسی کی ہو فتح الباری کے مقابلہ کی نہیں [حتی کہ بعض زاویوں سے وہ عینی کی شرح سے بھی فائق ہے اور اسکو تقدم کا شرف بھی حاصل ہے] جہاں تک شرح کا تعلق ہے، سخاوی ٹھیک کہتے ہیں، مگر تھوڑا دین اب بھی ذمہ میں ہے۔ یعنی حدیث کا دین تو اُتر گیا، لیکن تراجم کا دین ابھی باقی ہے، یہ دین کسی سے نہیں اترا، حضرت شاہ ولی اللہ نے تراجم بخاری پر ایک رسالہ لکھا ہے (جو دائرۃ المعارف حیدرآباد میں چھپ بھی گیا ہے) شاہ صاحب اپنے زمانہ کے امام مسلّم ہیں، لیکن استاذ فرماتے تھے کہ دین اب بھی باقی ہے۔ مالٹا کے زمانۂ قیام میں استاذ [شیخ الہند رح] نے ایک خدمت ترجمہ قرآن کی کی، دوسری خدمت شرح تراجم بخاری کی تھی جس کو شروع کیا، مگر تمام نہ کر سکے۔ (حضرت استاذ نے پینتیس ۳۵ بار بخاری پڑھائی تھی) یہ اس لئے ذکر کر دیا کہ تراجم میں جگہ جگہ کلام کرنا پڑے گا۔

محدثین نے اصول قائم کئے ہیں کہ بخاری نے کن کن چیزوں کا التزام کیا ہے، اس ترجمہ پر بحث سے قبل یہ سمجھو کہ عادت محدثین کی یہ رہی ہے کہ کوئی کتاب الایمان سے شروع کرتا ہے اور کوئی کتاب الطہارۃ سے اور کوئی اعتصام بالسنۃ سے، مگر بخاری نے جو صورت اختیار کی ہے وہ سب سے علیحدہ ہے، اصل تو ایمان ہے اور اس کی اصل توحید ہے، ان سب کو چھوڑ کر بدء الوحی کو مقدم رکھا، اس میں کیا حکمت اور کیا غرض ہے؟ استاذ فرماتے تھے، کہ یہی ایک چیز ہے اگر بخاری کی یہ غرض معلوم ہو جائے تو بہت سی مشکلات سہل ہو جائیں،

یہاں بدء الوحی کو مقدم کرنے کی غرض یہ ہے کہ جو چیز بھی منقول ہے خواہ صلوٰۃ کی ہے یا نکاح و طلاق کی، یا ایمان و توحید کی وہ اس وقت تک معتبر و مستند نہیں جب تک منسوب الی الوحی نہ ہو اور وحی الٰہی سے ثابت نہ ہو، رائے۔ قیاس، اجتہاد، کشف وغیرہ جس کا استناد وحی کی طرف نہ ہو، ہرگز مستند نہیں، اگر مستند ہے تو صرف وحی الٰہی ہے اور کوئی چیز مستند نہیں، جب سب کا مدار وحی پر ہوا تو پہلے وحی کی عظمت اور اسکی عصمت، اور صداقت و بزرگی کو تسلیم کرنا ہے، جب اس کو تسلیم کرلیں گے تو پھر وہ سب چیزیں جو وحی کی طرف منسوب ہوں گی ان سب کو ماننا پڑے گا، گویا یہ ساری کتاب کا مقدمہ ہے، تو اصل کتاب تو کتاب الایمان سے ہے، مگر بطور مقدمہ اسے پہلے بیان کر دیا، کہ میری کتاب مستند الی الوحی ہے خواہ متلو ہو یا غیر متلو، پھر وحی کے احوال و مبادی بیان کئے کہ احوال و مبادی کے بیان سے وحی کی عظمت و عصمت کا سکّہ بیٹھ جائے گا تو ساری کتاب قابل تسلیم ہوگی،

ترجمۃ الباب کا مفہوم اور اس کا مقصد، پھر جو آیت ترجمہ میں لائے ہیں اس کو انتخاب کرنے اور اس کو لانے کی غرض اور چھ حدیثیں جو باب کے تحت مذکور ہیں ترجمۃ الباب سے ان کی مناسبت یہ سب سخت مشکل مباحث ہیں ان پر غور کرنا ضروری ہے، بخاری کی غرض معلوم ہونے کے بعد انشاء اللہ سب آسان ہو جائیں گے، بظاہر چند احادیث کی مناسبت باب سے نہیں معلوم ہوتی مگر تشریح کے بعد انشاء اللہ سب کی مناسبت معلوم ہو جائے گی،

اشکال یہ ہے کہ ترجمہ کا ظاہر تو یہ ہے کہ بدء الوحی کی کیفیت بیان کریں گے، کہ ابتداء وحی کی کس طرح سے ہوئی، لیکن احادیث ایسی ہیں کہ بعض میں تو وحی کا ذکر بھی نہیں، اور بعض میں ذکر ہے تو ابتدا کی کیفیت نہیں، ایک آدہ حدیث مثلاً حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا اول ما بدئ بہ تو بدایت کو بتلاتی ہے، بقیہ میں خاص ابتدار کا قصہ ہی نہیں معلوم ہوتا اور پہلی حدیث اِنَّمَا الاعمالُ بالنیاتِ اس میں وحی کا ذکر ہی نہیں، دوسری میں وحی کا ذکر ہے تو ابتدا کا ذکر نہیں، حالانکہ حدیث کو باب کے مناسب ہونا چاہیئے، یہ ہوا اشکال۔

جواب سننے سے پہلے چند اصطلاحیں سمجھ لو، ایک اصطلاح تو یہ ہے کہ لفظ باب کے بعد اور حدثنا سے پہلے تک ترجمۃ الباب کہا جاتا ہے، اور اسی کو مترجم بہ بھی کہتے ہیں، اور حدثنا کے بعد جو چیز ہے اس کو مترجم لہ کہتے ہیں، تو دو لفظ ہوئے ایک مترجم بہ دوسرے مترجم لہٗ، یعنی جس بات کے لئے ترجمہ رکھا گیا، لہذا دونوں میں مناسبت ہونی چاہیئے، اور یہاں مناسبت نہیں، اور یہ اشکال بخاری کے اکثر ابواب میں پیش آئے گا، ہرقل والی حدیث میں بھی بدء الوحی کا ذکر نہیں، بلکہ آپ کے اخلاق و اوصاف بیان کئے گئے ہیں، یہی چیز قابل توجہ ہے، شراح نے جوابات بہت سے دیئے ہیں، مگر اکثر غیر شافی ہیں، اس لئے ان کے نقل کی ضرورت نہیں، استاذ رحمہ اللہ نے بڑی عمدہ تقریر کی ہے، مگر شاہ ولی اللہ صاحب نے جو ارشاد فرمایا ہے پہلے اسے بیان کرتا ہوں، شاہ صاحب کہتے ہیں کہ یہاں وحی سے عام مراد ہے متلو ہو یا غیر متلو، خاص قرآن مراد نہیں، گو متبادر قرآن کی وحی ہے لیکن مراد عموم ہے اور وجہ عموم یہ ہے کہ مقصد بخاری اس باب سے یہ ہے کہ جو کچھ میں درج کروں گا وہ مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہے۔ لہذا ان پر عمل اور ان سے تمسک کرنا وغیرہ وغیرہ سب اس پر موقوف ہیں کہ وہ وحی ہو، چونکہ اصل تمام تعلیمات کی وحی ہے، اس لئے جو چیز اس کی طرف مستند نہ ہو وہ حجت نہیں، حتی کہ نبی کی ذاتی رائے کا یہی حکم ہے جب تک وحی سے اس کی تقریر نہ ہو، چنانچہ تابیر نخل کی حدیث اس کی شاہد عدل ہے، اسمیں آپنے فرمایا کہ میں بشر ہوں جو وحی سے کہوں وہ لے لو اور جو اپنی رائے سے کہوں فانتم اعلم بامور دنیاکم، معلوم ہوا کہ سند و حجت صرف وحی ہے دوسری کوئی چیز حجت نہیں، مثلاً طب کے متعلق جو اقوال وارد ہوئے ہیں انکے بارے میں

علماء نے لکھا ہے کہ وہ تجربات کی بنا پر فرمائے گئے ہیں، وہ حجت شرعیہ نہیں، تو بخاری نے بتلایا کہ کوئی خلق، کوئی عمل، اور کوئی چیز مستند نہیں جب تک اس کا انتساب نہ ہو وحی الٰہی کی طرف، جب یہ مقصود ہے تو پھر وحی کو خاص کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ عام ہے خواہ متلو ہو خواہ غیر متلو، اور جب وحی ہونا ثابت ہو گیا تو وہ صدق وحق ہے اس میں شائبۂ کذب نہیں، اسلئے وہ اب حجت شرعیہ ہے خواہ متلو ہو یا غیر متلو، یہ حاصل ہے شاہ ولی اللہ کے کلام کا، اور بالکل درست ہے بلکہ کچھ عجب نہیں کہ زائد تر مقصود بخاری کا وحی غیر متلو ہو، کیونکہ توثیق یہاں احادیث نبویہ کی مقصود ہے، تفسیر تو نہیں کر رہے،

حضرت استاذ [شیخ الہند] فرماتے ہیں کہ مثل لفظ وحی کے لفظ بدء بھی عام ہے، بدء کئی طرح کا ہے، کبھی بدء زمانی پر اطلاق ہوتا ہے مثلاً کوئی یوں کہے کہ فلاں چیز کی ابتداء کب ہوئی، تو جواب دیا جائے گا کہ فلاں سال یا مہینہ میں یا اتنے زمانہ پہلے، اور کبھی مبدأ مکان کے اعتبار سے کبھی اسباب کے اعتبار سے کبھی احوال کے اعتبار سے بیان کیا جاتا ہے، بدء کے معنی شروع ہونے کے ہیں، تو کبھی زمانہ کے اعتبار سے، مثلاً کوئی کہے کہ وحی کی ابتداء چالیس سال کی عمر میں ہوئی، اور اگر یہ کہے کہ غار حرا سے شروع ہوئی، تو یہ مکان کے اعتبار سے ہوگی، اور اگر یہ کہے کہ ابتداء خدیجہ و ابوبکر سے ہوئی، (رضی اللہ عنہما) اس وقت کوئی دوسرا ماننے والا نہ تھا تو یہ بھی ابتدائے وحی ہے مگر باعتبار قبول کے، اور اگر میں کہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہلے غار میں جاکر عبادت کرتے تھے، اور آپ میں ایسے اخلاق، ایسی عادتیں، ایسی بے رغبتی دنیا سے، اور ایسا زہد تھا، اس وقت وحی آئی تو یہ بھی ابتداء ہی ہے، لیکن احوال بتاکر کہ ترتب وحی ابتداءً ان چیزوں پر ہوا، اور لغت میں بھی اس کا اطلاق یوں ہی ہوتا ہے، چنانچہ کہتے ہیں کہ خشب مبدأ ہے سریر کا، یہاں متکون ہونے کی وجہ سے مبدأ کہتے ہیں، یہاں مادہ کو مبدأ کہہ دیا، تخم کو مبدأ شجرہ کہتے ہیں، حالانکہ یہ نہ زمان ہے نہ مکان، نہ صفت ہے نہ حال، بلکہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وجود شجرہ کا اس سے ہوا، تو بیج منشأ وجود ہوا، پس زمان، مکان، سبب، علت و معدات سب مبدأ کہلاتی ہیں، امام بخاری کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وحی کے مبادی خواہ وہ کسی اعتبار سے ہوں اس کو بیان کرنا چاہتے ہیں مبداء زمانًا ہو یا مکانًا او غیرہما، اب بہت وسعت ہوگئی، اصل مقصود صرف زمانہ یا مکان بیان کرنا نہیں بلکہ مقصود اصلی ان حالات و اسباب کا بیان کرنا ہے جس کا تعلق ابتدائے وحی سے ہے، غور کرو کہ وحی کے چند اطراف ہیں، ایک مُوحِی - ایک مُوحیٰ الیہ - ایک واسطۂ ایحاء - وحی لانے والے کو بھی موحی کہتے ہیں، اور وحی بھیجنے والے کو بھی موحی کہتے ہیں، موحی کا بتلانا اور اس کا ذکر بھی بدء سے متعلق ہے، کیوں کہ سرچشمہ بیان ہے، لانے والے کا ذکر بھی بدء الوحی کا ذکر ہے، اور اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کس قسم کے احوال طاری ہوتے تھے ان کا بیان بھی بدء الوحی ہے، موحیٰ الیہ کے عادات و اخلاق و اسباب وغیرہا کا بیان بھی بدء الوحی ہے، یہ سب مبادی وحی ہی تو ہیں؟

اس تقریر سے ممکن ہے کہ کوئی نبوت کو کسبی سمجھنے لگے، جیسا کہ معتزلہ کو یہ دھوکا لگ چکا ہے، معتزلہ کہتے ہیں کہ جس طرح ولایت کسبی ہے، ایسے ہی نبوت کسبی ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ نبوت موہبت ہے، کسبی چیز نہیں ہے خواہ عبادت کتنی ہی کی جائے، سمجھانے کے لئے میں اس کی تعبیر یوں کرتا ہوں کہ نبوت ورسالت ڈگری نہیں ہے بلکہ عہدہ ہے امتحان کے پاس کرنے پر ڈگری تو مل جاتی ہے مگر کوئی امتحان کے بعد کلکٹر نہیں بن جاتا، بلکہ جب یہ عہدہ ملتا ہے تب کلکٹر بنتا ہے۔ ولایت حقیقۃً ڈگری ہے اور نبوت عہدہ، اور یہ کام یعنی اعطاء نبوت اور عہدہ دینا یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے، مبادی وحی میں اخلاق حسنہ وعادات کریمہ کا ہونا بیشک ضروری ہے، مگر نبوت ملتی ہے اللہ کی طرف سے، البتہ اس کے ظہور کیلئے چند اشیاء کی ضرورت ہے جس سے معلوم ہو جائے کہ یہ اس لائق ہیں کہ یہ جلیل الشان عہدہ انھیں سپرد کر دیا جائے، تو ان کے اندر کمالات ہونے چاہئیں، یہاں دو چیزیں ہیں دونوں کو خوب سمجھ لو، ایک یہ کہ نبوت موہوب ہے اسکی دلیل اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ یعنی اللہ جانتا ہے کہ کسے اپنا رسول بنائے، انتخاب اللہ فرمائے گا، کوئی شخص چاہے کہ عبادات سے نبوت حاصل کرلے تو حاصل نہیں کرسکتا، دوسرے مقام پر فرمایا اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ یعنی اللہ تعالیٰ انسانوں اور ملائکہ سے اصطفا (انتخاب) فرماتا ہے، نیز فرمایا اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ کَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْ بَعْدِہٖ [الیٰ قولہ تعالیٰ] لٰکِنِ اللّٰہُ یَشْہَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَیْکَ اَنْزَلَہٗ بِعِلْمِہٖ (سورۂ نساء آیت ۱۶۶) بعلمہ کی تفسیر بعض نے یہ کی کہ جو چیز نازل کی گئی وہ اللہ کے علم پر مشتمل ہے، یعنی اللہ نے ایک مخصوص علم اس میں رکھا ہے، بعض نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے علم سے اور جان کر اتارا ہے، وہ جانتا ہے کہ کس میں استعداد ہے اس کے اٹھانے کی اور کس میں نہیں، تو یہ دوسری تفسیر اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ کے موافق ہوئی۔

دوسری چیز یہ ہے کہ موہوب ہونے باوجود کچھ اسباب ظہور کے لئے ہوتے ہیں، اس کے لئے آیۃ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَاسْتَوٰٓی اٰتَیْنٰہُ حُکْمًا وَّعِلْمًا وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ (۱) پر غور کرو یہ آیت الگ الگ [تھوڑے سے فرق سے] موسیٰ علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام دونوں کے لئے آئی ہے حُکْمًا وَّعِلْمًا سے نبوت مراد ہے، اِسْتَوٰی سے معلوم ہوا کہ پہلے ہموار کیا جاتا ہے، آگے فرمایا وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ، یعنی ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں محسنین کو، معلوم ہوا کہ عطاء بھی انھیں کو ہوتا ہے جو اس کے اہل ہوتے ہیں، اشارہ فرمایا کہ ملتی ہے نبوت ہمارے دینے سے، مگر ترتب ان اوصاف و

(۱) سورۃ القصص: ۱۴

. . . .

استعدادات پر ہوتا ہے جو ان میں ہوتے ہیں، دونوں چیزیں ثابت ہوگئیں اول وہب، دوم مبادی [یعنی صلاحیت واستعداد] کا ہونا، بخاری بیان کرنا چاہتے ہیں کہ وہ مبادی کیا تھے جن پر ترتب [موہبتِ نبوت کا] ہوا، بس ان اسباب کا بیان کرنا مقصود ہے اب موحی اور موحیٰ الیہ کا ذکر بھی بدء میں داخل ہے، مقصود اصلی بخاری کا وحی کی عظمت وعصمت کا سکہ بٹھانا ہے اور یہی انسب ہے، بعض نسخوں میں بدو (بالواو) لکھا ہے، حافظ نے کہا کہ ہمارے نسخوں میں بدء (بالہمزۃ) ہے، اس کی تائید یعنی بالہمزہ کی تائید اس نسخہ سے ہوتی ہے جسمیں لفظ "ابتداء" ہے۔

قولہ کیف، کیف سے جو سوال ہوتا ہے اس سے کبھی مقصود اس کی تاریخ کا معلوم کرنا ہوتا ہے اور کبھی اسکی تفخیم مقصود ہوتی ہے، جیسے :- الم ترکیف فعل ربک باصحاب الفیل، اور حق تعالیٰ کا قول وتبین لکم کیف فعلنا بھم کہ یہاں ان آیات میں سوال مقصود نہیں، بلکہ مقصود تعظیم وتفخیم ہے، کوئی شاہ صاحب کی نسبت سوال کرے کہ ان کی ابتدائی حالت کیا تھی؟ اور یہ سوال ایک مورّخ کا ہو تو ایک صورت سوال کی یہ ہے اور ایک صورت یہ ہے کہ کہا جائے، کہ سمجھتے ہو ان کی ٹھاٹھ کیسی تھی، تو اب اس وقت تاریخ مقصود نہیں بلکہ تعظیم مقصود ہے، بالکل اسی طرح یہاں بھی ہے کہ تعظیم وتفخیم کا بیان مقصود ہے اور احوال وصور کو ذکر کرنے کا ارادہ ہے، اور موحی کا تذکرہ اور اس کی عظمت کو تبلانا ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ ایک نوع ترجمہ کا مدلول مطابقی ہوتا ہے اور ایک التزامی، تو بسا اوقات بخاری ایک عبارت کہتے ہیں مگر غرض مدلول مطابقی نہیں ہوتا بلکہ التزامی مدلول مراد ہوتا ہے، جیسے یہاں مدلول التزامی یہ ہے کہ اس کی عظمت وعصمت کا تبلانا مقصود ہے، تو یہاں مدلول مطابقی سے مناسبت مت دیکھو بلکہ مقصود اصلی کے اعتبار سے مناسبت دیکھو، یہاں مقصود مدلول التزامی ہے نہ کہ مدلول مطابقی، اور غرض بیان تفخیم ہے جو مدلول التزامی ہے، اب تمام مراحل صاف ہوئے، یہ خاص مولانا کی بات ہے اور کہیں نہیں ملے گی۔

اس کے بعد وحی کے معنی سمجھو، وحی کے معنی لغت میں اعلام فی خفی یا اعلام فی خفیۃ ہیں عام لغویین یہی معنی لکھتے ہیں، راغب مفردات میں لکھتے ہیں وحی کے معنی الاشارۃ السریعۃ فی خفیۃ[۵۱]، بجائے اعلام کے انھوں نے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں، یعنی جھپک کے ساتھ اشارہ کا نام وحی ہے، اس تعبیر نے لغت کو ایک فلسفہ بنادیا کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ وحی میں لغۃً تین باتیں ہونی چاہیئے، ایک اشارہ یعنی ایک لمبی چیز کو مختصر طور پر ادا کر دینا، گویا راغب کہتے ہیں کہ جیسے رموز

---

[۵۱] مفردات راغب میں فی خفیۃ نہیں ہے ۱۲ مرتب

. . . .

ہوتے ہیں مثلاً ھب بیہقی فی شعب الایمان کے لئے، یا عب مصنف عبدالرزاق کے لئے، اور رمز میں لمبی عبارت کو مختصر عبارت میں بیان کرتے ہیں [اسی طرح وحی میں ہوتا ہے] پھر اشارہ کبھی زبان سے ہوتا ہے، مثلاً کسی کی امداد کرنی ہے تو امیر یوں نہیں کہے گا کہ اسے دے دو، بلکہ صرف "ہونہہ" کہدیتا ہے، مزاج شناس صرف اسی سے سمجھ لیتا ہے، کبھی صرف انگلی کا اشارہ کافی ہوتا ہے، میں حیدرآباد میں تقریر کررہا تھا، نظام بھی تھے، مغرب کا وقت قریب تھا انھوں نے اشارہ کیا انگلی سے، میں سمجھا کہ مجھے روکنا چاہتے ہیں، مگر مجھے فوراً معلوم ہوگیا کہ اشارہ بتیوں کے جلانے کا تھا، جسے مزاج شناس نے فوراً سمجھ لیا، یہ اشارہ ہوا، تو کبھی صوت اور کبھی کوئی حرکت اور کبھی رمز سے اشارہ ہوتا ہے، گویا وحی اشارہ کو کہتے ہیں، اور گو وہ مختصر ہوتی ہے لیکن اس میں بسط بہت ہوتا ہے، اور پیغمبروں کے دماغ اس قدر اعلیٰ ہوتے ہیں کہ فوراً اس کی گہرائی تک پہونچ جاتے ہیں، ایک واقعہ ہے کہ شیر شاہ سوری نے یک بیک ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے زمین پر ایک لکیر کھینچ دی، اس وقت سفراء بھی موجود تھے، بظاہر یہ ایک مہمل اشارہ تھا، سفراء یہی سمجھے کہ یہ کیا بچوں کی سی حرکت کرتا ہے، مگر مزاج شناس وزیر نے فوراً کہا جہاں پناہ ایسا ہی ہوگا، تب سفراء نے سمجھا مہمل بات نہیں تھی، پھر یہ بڑی سڑک بنوادی، یہ تھا اشارہ جسے وزیر نے سمجھ لیا، اسی طرح اللہ کے مقربین اشارات کو سمجھ لیتے ہیں، راغب کی تعریف کا یہ پہلا جزو تھا،

دوسرا جزو ہے السریعۃ، یعنی بہت جلدی سے اس کا نزول ہونا چاہیئے[عہ]، اور یہ جھپک سب مضامین پر مشتمل ہوتی ہے، بلکہ شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ جس وقت وحی آتی ہے اسی وقت سمجھ بھی لیتے ہیں، افہام وتفہیم تمام مضامین کا بیک وقت ہوتا ہے اس سے لغت عرب کی وسعت کا اندازہ ہوگا، کسی زبان میں وحی کے مرادف لفظ مل نہیں سکتا،

تیسری چیز ہے فی خفیۃ، یعنی اشارہ بالکل مخفی ہو، کسی کو بھی خبر نہ ہو، یہ تینوں چیزیں لفظ وحی میں موجود ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی دنیا میں صرف ایک ہی زبان اس قابل تھی کہ قرآن اس میں نازل ہو، مگر یہ کام راغب ہی کا ہے کہ وہ تہ تک پہونچکر موتی نکال لاتا ہے، تھوڑے سے تصرف سے کیا کیا مضامین اس کے اندر پیدا ہوگئے، یہ تحقیق لغوی تھی لفظ وحی کی۔ شیخ اکبر کہتے ہیں کہ نبوت وہ مقام ہے کہ بڑے سے بڑا ولی بھی اسے نہیں سمجھ سکتا، یہ وہی سمجھ سکتا ہے جس پر گذرتی ہے، ہماری بساط نہیں کہ کچھ بیان کریں، مگر شیخ اکبر کے کچھ اقوال جو قرآن وسنت کے موافق ہیں، بیان کرتے ہیں، کیونکہ

عہ بجلی کی چمک سے زیادہ سرعت ہوتی ہے نزول وحی میں،

. . . .

ہمارے لئے یہی اقوال قابلِ استناد ہیں، اور جو ہمارے خیال میں قرآن وسنت کے خلاف معلوم ہوتے ہیں، ان کا بیان ہمیں زیب نہیں دیتا، اس لئے ہم وہ بیان نہیں کریں گے۔

امام حجۃ الاسلام غزالی نے المضنون به علی اهله یا علی غیر اهله وغیرہ میں فرمایا ہے کہ الہام بھی ایک قسم کی وحی ہے، وہ بھی ایک اشارۂ مخفیہ ہوتا ہے، یہ وحیِ اولیاء ہے، اور جہاں وحی نبوت و وحی ولایت کا فرق بیان کیا ہے، وہاں لکھا ہے کہ نبی کی وحی میں واسطہ ملک ہوتا ہے اور ولی کی وحی میں واسطہ نہیں ہوتا، مگر شیخ اکبر نے فتوحات میں رد کیا ہے، اور کہا ہے کہ غزالی کے قصورِ نظر پر یہ کلام دال ہے، وہ یہاں تک نہیں پہونچے اور ہم اس کا مزہ چکھ چکے ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ مُلہَم کو بھی بواسطہ ملک الہام ہوتا ہے، ہاں تجربہ سے معلوم ہوا کہ جب ملک الہام کے ساتھ آتا ہے تو وہ نظر نہیں آتا، ولی سمجھتا ہے کہ فرشتہ دل میں ڈال رہا ہے، مگر رویت نہیں ہوتی، ویسے دوسرے اوقات میں ملک کو دیکھ سکتا ہے، جیسے عمران بن حصین رضی اللہ عنہ صحابیِ رسول کو ملک سلام کرتے تھے، مگر ولی بوقت الہام ملک کو نہیں دیکھتا، بوقت القاء شہود رویت ولی کے لئے ناممکن ہے، یہ صرف نبی کا خاصہ ہے[1]، مثلاً کسی کی آواز سے کوئی واقف ہو تو وہ سمجھ لیتا ہے، کہ یہ فلاں کی آواز ہے، مگر سامنے آکر اگر کوئی بولے تو اس میں زیادہ یقین ہوتا ہے اور پس پردہ کی آواز میں التباس ممکن ہے، یہ مشاہدہ ہے کہ آدمی جانور کی آواز نکالتا ہے اور وہ بالکل غیر ممتاز ہوتی ہے، میں نے خود سنا ہے ایک شخص بکری کی آواز سے بولتا تھا اور بالکل امتیاز نہ ہوتا تھا کہ انسان بول رہا ہے یا جانور، تو جب جانوروں کی صوت میں [اور آدمیوں کی صوت میں] انسان امتیاز نہیں کرسکتا تو ملک کی صوت [اور انسان کی صوت میں] کیونکر امتیاز ہوگا، تو شیخ اکبر کا قول (اگر ان پر گذری ہے جیسا کہ انھوں نے فرمایا ہے) فارق ہوگیا نبی اور ولی کی وحی میں، نبی کی وحی میں کسی قسم کا التباس نہیں ہوتا بخلاف وحی ولی کے کہ وہاں التباس باقی رہتا ہے، (اسی لئے نبی کی وحی حجت ہے تمام امت پر اور ولی کی وحی کسی پر حجت نہیں، [1]) تو شیخ اکبر نے کہا کہ غزالی اپنے مرتبہ کے اعتبار سے کہہ رہے ہیں، ورنہ تحقیق وہی ہے جو ہم نے بیان کی، اور یہ ہمارا اور تمام اولیاء کا بالاتفاق تجربہ ہے، دوسری چیز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب مصطفیٰ اور مقبول ہیں، مگر بظاہر شیخ اکبر کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی نبی کو بلا واسطہ بھی القاء ہوتا اور ہوسکتا ہے، اور کبھی کبھی اللہ کا کلام بلا واسطہ ملک حجاب سے سنتے ہیں، جیسے موسیٰ علیہ السلام نے من وراء حجاب کلام سنا، کلام مع رویتِ الٰہی نبی کے لئے بھی نہیں فردًا فردًا

---

[1] اگر ولی کو ملک نظر آئے تو یہ ولایت نہیں بلکہ نبوت ہے (منہ) یعنی ملک اسی ولی کو نظر آوے گا جو نبی بھی ہے (جامع)

. . . .

دونوں (یعنی کلام بھی اور رویت الٰہی) جائز ہیں، یہ جمع کلام و رویت آخرت میں ہوگا اس دنیا میں نہیں، وحی کی تقسیم قرآن کی اس آیت میں ہے، مَاكَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ، اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ، یعنی کسی بشر میں یہ قابلیت نہیں کہ وہ اپنے قوی عنصری میں رہ کر اللہ سے کلام کرے الا وحیًا وہی اشارہ، او من وراء حجاب جیسے موسیٰ علیہ السّلام کو طور پر، یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ المعراج میں، او یرسل الخ یعنی اللہ قاصد بھیجتا ہے اور وہ اللہ کے اذن سے وہ چیز پہونچاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا کلام تین طریقوں سے ہوتا ہے، تکلیم حق انھیں تین میں منحصر ہے، انہ علیٌّ حکیم، علی ہونے کی وجہ سے کوئی بشر طاقت نہیں رکھتا کہ غایت علو کی وجہ سے اس سے کلام کرسکے، اور چونکہ حکیم ہے اس لئے یہ تین صورتیں مقرر کردیں اب اِنَّا اَوْحَيْنَا آتا ہے، بخاری کہیں لقول اللہ کہتے ہیں، اور کبھی و قولہ تعالیٰ عطف کے ساتھ کہتے ہیں لقول اللہ صریح دلیل ہوتی ہے اور یہاں استفہام تھا، اور استفہام کے لئے دلیل نہیں ہوتی تو لقول اللہ نہیں کہہ سکتے تھے، اس لئے وقول اللہ کہا یعنی بدء الوحی، اور قول اللہ، انا اوحینا کے متعلق بیان کریں گے، بخاری نے تمام قرآن میں سے صرف ایک آیۃ چھانٹی اور نہایت بہترین انتخاب کیا، یہ ان کے کمال علم وذکاوت پر دال ہے، استاذ فرماتے تھے کہ اتنا مبسوط اور مشرح بیان قرآن کی کسی آیۃ میں نہیں، پورا رکوع بلکہ پہلا رکوع بھی انبیاء علیہم السّلام کے ذکر میں ہے اور درحقیقت اہل کتاب کے سوال کا جواب ہے، پہلے رکوع میں سوال تھا اور دوسرے میں جواب دیا، یسئلك اهل الكتاب سے بتلادیا کہ ان کی حالت ایسی ہے، پھر توبیخ فرمائی، پھر جواب دیا، انا اوحینا الخ یعنی یہ ہماری ایک سنت ہے اور وہ وحی تشریعی آج سے نہیں نوح (علیہ السلام) کے وقت سے ہوتی چلی آرہی ہے، اور پھر ہم نے وحی بھیجی ہے، اب کسی کا حق نہیں کہ کہے ایک بار کتاب کیوں نہ اتاردی یہ نہ سمجھا کہ صرف ایک جملہ سے استشہاد کر رہے ہیں، بلکہ پورے رکوع سے استشہاد کر رہے ہیں، بعلمہ[۵۱] کی تفسیر کوئی سی بھی لے لو، ہر تفسیر بدء الوحی کے مناسب ہے، چونکہ اتنا مبسوط و مشرح بیان تھا اس لئے اتنی وضاحت کرنا پڑی، اتنا اور اضافہ کرلو کہ یہاں وحی کا ذکر ہے۔ اور بدء کا حال بیان کر رہے ہیں تو اس کی اصلی ابتداء بتلاتے ہیں کہ یہ سلسلہ ماسبق سے چلا آرہا ہے، کوئی نئی بات نہیں ہے، اس آیت نے بتلادیا کہ اس ابتداء سے پہلے وحی کی ابتداء کیونکر ہوئی، بدء کے بھی مناسب آیۃ ہے اس لئے اس کو انتخاب کیا، اور اس لئے بھی کہ ایسا بیان قرآن میں اور کہیں نہیں ہے، آخری آیۃ بھی مؤید ہے،

---

۵۱ انا اوحینا کے بعد چوتھی آیت میں ہے لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَا اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ (نساء)

. . . .

یہاں یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ نوح علیہ السلام سے کیوں شروع کیا، ان کی تخصیص کیوں کی، آدم، شیث، ادریس علیہم السلام کے پاس بھی تو وحی آئی تھی، تو آدم علیہ السلام کا نام کیوں نہیں لیا، مفسرین و محدثین نے اس کے جوابات دیئے ہیں مگر پہلے رسول و نبی کا فرق معلوم کرنے کی ضرورت ہے، پھر یہ کہ نوح علیہ السلام اور ان سے پہلے اور بعد کے انبیاء علیہم السّلام کی وحی میں کچھ فرق تھا یا یکسانیت تھی؟ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی وحی اشبہ بوحی النوح تھی یا نہیں؟ اصل یہ ہے کہ دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مدرسہ بنائے تو پہلا کام معمولی طور پر ہوتا ہے، کھانے پینے کا بھی انتظام معمولی طور پر ہوتا ہے، کچھ تھوڑا تھوڑا تعلیم کا سلسلہ بھی ہوتا ہے، جوں جوں ترقی ہوتی جاتی ہے اسی قدر سارے انتظامات ہوتے جاتے ہیں اور انتظام تعلیم بھی عمدہ ہوتا جاتا ہے، یا مثلاً بچہ کو ماں باپ تعلیم دیتے ہیں، لباس وغسل کا طریقہ بتلاتے ہیں، مگر یہ تعلیم باپ کی تربیت کا جزو ہے، اسے کوئی نہیں کہتا کہ تعلیم شروع ہوگئی، عرفاً تعلیم شروع اس وقت ہوتی ہے جب بچہ مدرسہ جاکر استاذ کے سامنے کتاب رکھدے، اسی طرح جب آدم علیہ السلام تشریف لائے اور اولاد ہوئی تو تھوڑے سے آدمی تھے، ابھی کھانے پینے کا پورا انتظام بھی نہ ہوا تھا، جنت میں بے فکر تھے، سرکاری مکان، سرکاری راشن، سرکاری لباس، سب کچھ وہیں سے تھا، خود کچھ کرنا نہیں تھا، اس لئے کسی قسم کی فکر نہ تھی، اب یہاں سب کچھ خود کرنا تھا، اس لئے معاشرت کی تعلیم دی، اکثر حصہ اسی کا تھا، لباس، غذا کے متعلق تعلیم دی، زندگی گذارنے کے پسندیدہ طریقے بتائے، ساتھ ہی ساتھ کچھ چیزیں جن کی اہمیت اور ضرورت تھی، روحانیت کی بھی تعلیم دی گئیں، جیسے بچہ کو اسی طرح معاشرتی و دینی تربیت دیجاتی ہے بس آدم علیہ السّلام سے نوح علیہ السلام تک کا زمانہ عند المحققین عالم کی طفولیت کا زمانہ تھا، جو وحی انکے پاس آئی وہ زیادہ تر ان کے بود و باش اور طرز معاشرت کے متعلق تھی، ساتھ ہی کچھ روحانیت کی بنیادی باتیں بھی تھیں، نوح علیہ السلام سے اب باقاعدہ انتظام شروع ہوا، نوح علیہ السلام کے زمانہ میں سزا کا نفاذ ہوا، انھیں کے زمانہ میں احکام کا نزول ہوا، نیز تزکیہ نفس کی تعلیم دی گئی، اب دیکھو کہ وحی نبوی وحی آدم سے اشبہ ہے یا وحی نوح سے؟ تو معلوم ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی نوح علیہ السلام کی وحی سے اشبہ ہے، تو نوح علیہ السلام کے دور سے مدرسہ چلا اور بتدریج ترقی ہوتی رہی، مدرسہ سے کالج، کالج سے یونیورسٹی بن گیا، حتیٰ کہ تکمیل جناب خاتم النبیین کے دور میں ہوئی (الیوم اکملت لکم الخ ——) حاصل یہ ہوا کہ آپ کی طرف جو وحی آئی وہ اس نوعیت[عہ] کی تھی، جو نوح علیہ السلام کے پاس آئی تھی، ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں

عہ یعنی لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ابتدا غار سے ہوئی، اللہ تعالیٰ اشارہ فرماتا ہے کہ اس ابتدا کی بھی اور ایک اور ابتداء ہے جیساکہ فرمایا، قل ما کنت بدعا من الرسل، تو ابتدا یہاں بلا شبہ غار سے ہوئی لیکن یہ ابتداء شخصی تھی، ابتداء نوعی نوح علیہ السلام سے ہوئی۔

جو کفار کی تبلیغ کے لئے بھیجے گئے، اس لئے بخاری نے ان کا ذکر کیا، اس آیت کے بعد عـه موسیٰ علیہ السلام سے کلام کرنے کو علیحدہ بیان کیا اور مفعول مطلق لائے، (وکلم اللہ موسیٰ تکلیما) جس سے معلوم ہوا کہ ان کے لئے کوئی ممتاز شئی تھی، اور وہ یہ تھی کہ انہوں نے اس کا کلام من وراء حجاب سنا، اس لئے درخواست کی (ارنی انظر الیك) (جواب ملا) کہ یہ نہیں ہوسکتا، قال لن ترانی، مفسرین لکھتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے کلام سنا تو ایک بات عرض کی، کہ اے میرے پروردگار جو کلام میں سنتا ہوں یہ تیری آواز ہے اور تیرا کلام ہے یا [درمیان میں] کوئی واسطہ ہے، ارشاد ہوا بلا واسطہ ہم کلام کر رہے ہیں، اور علامت یہ بتلائی کہ چونکہ ہم مقید نہیں ہیں اس لئے اے موسیٰ تم ہر جہت سے سنوگے، مفسرین کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام ہر طرف سے اور بال بال سے اللہ کا کلام سنتے تھے، یہ مفسرین کا بیان ہے، واللہ اعلم،

عزیزا حکیما تک دیگر انبیاء کی وحی کا ذکر کیا، بعد میں فرمایا لکن اللہ یشھد بما انزل الیك انزلہ بعلمہ یعنی اپنے علم سے یہ وحی آپ پر اتاری ہے،

چونکہ نیچریت و دہریت کا شور ہے اس لئے وحی کے متعلق چند جملے کہنا چاہتا ہوں، تاکہ معلوم ہو جائے کہ معصوم عن الخطاء دنیا کا کوئی کلام اگر ہوسکتا ہے تو وہ وحی اور صرف وحی ہے، نہ کوئی دوسرا کلام، دنیا میں [علم و ادراک کے] اسباب و ذرائع میں سے ایک تو حواس ہیں دوسری چیز عقل ہے لیکن حواس اور عقل سب کے ادراکات میں احتمال غلطی کا ہے اس کی سب سے بہتر مثال یہ ہے کہ زمین متحرک ہے مگر حواس اسے محسوس نہیں کر پاتے، اور بادل میں چاند بھاگتا معلوم ہوتا ہے، حالانکہ بادل بھاگ رہا ہے یا ثابت ہوا آنکھ خلاف واقعہ دیکھتی ہے [اسی طرح] کشتی میں بیٹھ کر ساحل کے درخت چلتے نظر آتے ہیں، اور یہ جب ہے کہ آنکھ سالم ہو اور اس میں کوئی روگ نہ ہو، پھر اگر آنکھ ہی خراب ہو تو اس وقت کیا حال ہوگا، ہم رنگون گئے وہاں ایک پھل دُرِیاں ہوتا ہے، کمرہ میں لاکر رکھا گیا، پھر جلد ہی اٹھا لیا گیا، مگر کمرہ میں ایسی بدبو پھیل گئی کہ اس مکان میں داخل ہونے کو جی نہیں چاہتا تھا، ہمارا تو یہ حال تھا، لیکن وہاں کے لوگ اس کو شوق سے کھاتے تھے، معلوم ہوا کہ حواس میں بھی فرق ہوتا ہے، اسی طرح عقل بھی غلطی کرتی ہے۔ ورنہ عقلاء میں اختلاف کیوں ہوتا، کشف میں غلطی ہوتی ہے، غزالی کی تردید شیخ اکبر کرتے ہیں اور شیخ اکبر کی مجدد الف ثانی، حتیٰ کہ صحابہ کرام میں بھی اختلاف ہے، وہ بھی ایک دوسرے کا تخطئہ کرتے ہیں، معلوم ہوا کہ سب میں احتمال غلطی کا ہے، صرف ایک وحی ایسی چیز ہے جس میں غلطی کا مطلق احتمال نہیں، یہی وجہ ہے کہ کوئی نبی کسی نبی کی غلطی نہیں بیان کرتے، بلکہ ہمیشہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں، اور تصدیق کرتے چلے آئے ہیں، رہا احکام

عـه إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا ۝ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ۝ رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ لَّٰكِنِ اللَّهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنزَلَ إِلَيْكَ ۖ أَنزَلَهُ بِعِلْمِهِ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ يَشْهَدُونَ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ۝

. . . .

کا اختلاف تو ہم اس میں کسی حکم کو غلط نہیں کہتے، بلکہ ہم اسے اس وقت کے لئے بالکل صحیح و درست کہتے ہیں، جب وہ نازل ہوئے تھے ہمیں اس کا یقین ہے کہ اس وقت وہی صحیح تھے، اگر کوئی یوں کہے معاذاللہ کہ موسیٰ علیہ السلام جو احکام لائے تھے۔ وہ یا ان میں سے کچھ غلط تھے، تو ہم اسے کافر کہتے ہیں، تو دنیا کی کسی بات میں بھی اتفاق نہیں ہو سکتا، اگر اتفاق ہو سکتا ہے تو صرف وحی الٰہی میں، اب سنو کہ بخاری نے ایک حجت قائم کی آیت پیش کر کے، کہ ایک نبی نے جو کہا وہی دوسرے نے کہا، وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتے آئے کبھی کسی نے کسی کی تغلیط نہیں کی تو بس یہی (وحی) قابل قبول چیز ہوئی، (قرآن کی ایک سے زیادہ آیات اس کی تائید کرتی ہیں، مثلاً تیسرے پارے کا آخری رکوع پڑھئے، واذ اخذ اللہ میثاق النبیین لما آتیتکم من کتاب وحکمۃ ثم جاء کم رسول مصدق لما معکم لتؤمنن بہ ولتنصرنہ الخ۔[1]

[ہمارے اس بیان سے][2] جب یہ ثابت ہو گیا کہ مقصود صرف عظمت وحی کا بیان کرنا ہے تو اب اتنا اور سمجھ لو کہ بخاری ایک اور ترجمہ لائیں گے اس کے الفاظ یہ ہیں باب کیف نزل الوحی واول ما نزل، یہ دونوں ترجمے الفاظ کے اعتبار سے متقارب ہیں، وہاں بھی اولیت ہے نزول کا ذکر بھی ہے وحی کا ذکر بھی، اور یہاں بھی، فرق یہ ہے کہ یہاں بدء کا لفظ ہے اور وہاں بجائے بدء کے اول ما نزل ہے، ان دونوں میں فرق بیّن ہے، کیونکہ میں کہہ چکا ہوں کہ ایک مترجَم بہ ہے کہ اور ایک مقصود بالترجمہ، یہاں مقصود تعظیم وتفخیم ہے، اور آگے فضائل القرآن میں صرف قرآن کے فضائل بیان کرنا مقصود ہے، وہاں (فضائل قرآن میں) وحی عام نہیں ہے اور یہاں عام ہے بلکہ زائد تر مقصود وحی غیر متلو ہے، یہاں موحی الیہ کے احوال کا بیان کرنا بھی مقصود ہے وہاں نہیں، اسی لئے وہاں الی رسول اللہ نہیں ہے، کیونکہ وہاں یہ مقصود نہیں، بلکہ وہاں تاریخ نزول وکیفیات واولیت زمانیہ مراد ہے اور یہاں عموم ہے، احوال واسباب ومبادی وغیرہ سب کو شامل ہے، ابن حجر وغیرہ کا ذہن بھی اس نکتہ کی طرف نہیں گیا، اور بہت کم شراح نے دونوں ترجموں میں فرق بیان کیا ہے، بعض احادیث مشترک ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ من وجہٍ اس کا تعلق یہاں سے بھی ہے اور من وجہٍ وہاں سے بھی، مگر پھر بھی دونوں میں فرق ہے کہ وہاں موحیٰ الیہ سے تعرض نہیں اور یہاں تعرض کیا ہے، وہاں خاص قرآن مراد ہے اور یہاں عام، بس یہ یاد رکھو، شیخ الہند کا جملہ کہ ایک مقصود بالترجمہ ہے، ایک مترجم بہ، اور یہ دونوں ایک نہیں ہیں،

---

[1] اضافہ از جامع تقریر

۱۔ حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ الْأَنْصَارِيُّ قَالَ أَخْبَرَنِي مُحَمَّدُ بْنُ

ہم سے بیان کیا حمیدی نے کہا ہم سے بیان کیا سفیان نے کہا ہم سے بیان کیا یحییٰ بن سعید انصاری نے، کہا مجھ کو خبر دی محمد بن

إِبْرَاهِيمَ التَّيْمِيُّ أَنَّهُ سَمِعَ عَلْقَمَةَ بْنَ وَقَّاصٍ اللَّيْثِيَّ يَقُولُ سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَلَى الْمِنْبَرِ

ابراہیم تیمی نے، انھوں نے سنا علقمہ بن وقاص لیثی سے، وہ کہتے تھے میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ممبر پر سنا،

قولہ الحمیدی، ایک حمیدی متاخر ہیں جنھوں نے کتاب "الجمع بین الصحیحین" لکھی ہے [ان کا نام محمد بن ابی نصر بن عبداللہ بن حمید ہے وہ ابن حزم اور خطیب بغدادی وغیرہ کے شاگرد ہیں ان کی وفات ۴۸۸ھ میں ہوئی ہے] وہ یہاں مراد نہیں، اور یہ حمیدی [جو بخاری کے شیخ ہیں متقدم ہیں ان کا نام عبداللہ بن الزبیر الاسدی المکی ہے جن کی مسند الحمیدی ہے یہ سفیان کے پاس] امام شافعی [کے گویا ہم سبق] اور طلب علم [وتحصیل سماع] میں ان کے رفیق تھے۔

سفیان [سے] ابن عیینہ مراد ہیں نہ ثوری، کیونکہ یحییٰ، ابن عیینہ کے استاذ ہیں، نہ ثوری کے، بعض نے اس حدیث کے تواتر کا دعویٰ کیا ہے، مگر یہ صحیح نہیں، اس میں چار طبقوں میں تفرد ہے پھر تواتر کیسے ہو سکتا ہے، علقمہ متفرد ہیں عمر بن الخطاب سے، محمد بن ابراہیم متفرد ہیں علقمہ سے، یحییٰ بن سعید متفرد ہیں محمد [بن ابراہیم] سے، نیز عمر بن الخطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے میں متفرد ہیں کیونکہ اس مضمون کی کوئی حدیث اس سیاق کے ساتھ بسند صحیح کسی دوسرے صحابی سے مروی نہیں ہے، ہاں یحییٰ سے متواتر ہے، یحییٰ سے روایت کرنے والے بکثرت ہیں، حتیٰ کہ بعضوں نے دوسو اور بعضوں نے سات سو تک گنا ہے، ابن حجر لکھتے ہیں کہ طالب علمی سے اب تک میں برابر جستجو میں رہا مگر مجھے سو راوی نہ مل سکے، بہر حال یحییٰ سے راوی ہیں بہت، مگر عجیب بات ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث ممبر پر بیان کی، تو وہاں [سامعین کم از کم سیکڑوں کی تعداد میں] ہوں گے، لیکن باسناد صحیح علقمہ کے سوا کوئی دوسرا روایت کرنے والا نظر نہیں آتا، بہر حال چونکہ یہ روایت صحیحین میں ہے اس لئے اس کی صحت میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا، بخاری میں یہ حدیث تقریباً سات جگہ باختلاف یسیر آئی ہے، آخری دفعہ اس کو ترکِ حیل میں لائے ہیں وہاں الفاظ یہ ہیں، فرمایا یا ایہا الناس انما الاعمال الخ یہ خطاب مشعر ہے کہ رسول علیہ السلام نے بھی خطبہ ہی میں یہ فرمایا تھا کیونکہ یہ انداز خطاب عموماً خطبہ ہی میں ہوتا تھا۔ اس کو تصریح تو نہیں کہہ سکتے مگر اشارہ ضرور ہے، ایسا ہے تو مخاطب بھی بکثرت ہوں گے، مگر تعجب ہے کہ حضرت عمر کی روایت کے سوا کوئی دوسری روایت کسی اور صحابی سے نہیں ملتی، اصولیین (اصول فقہ) کے نزدیک اسے مشہور کہیں گے۔

کیونکہ اگر طبقہ اول میں راوی ایک ہو، اور بعد کے طبقات میں کثرت ہو جائے خواہ تابعین کے طبقہ میں یا تبع تابعین کے، تو اصول فقہ والے اسے مشہور کہتے ہیں، اصول حدیث کے اعتبار سے مشہور بھی نہیں، کیونکہ ان کے ہاں ہر طبقہ میں کم از کم دو راوی ہونے چاہئیں

يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِامْرِئٍ

وہ کہتے تھے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فرماتے تھے جتنے (ثواب کے) کام ہیں وہ . سے ٹھیک ہوتے ہیں اور ہر آدمی کو

یہ تو تواتر و عدم تواتر کے متعلق بات تھی، نفس حدیث کے بارے میں غور کرو کہ یہاں تین جملے فرمائے، (۱) انما الاعمال الخ، (۲) انما لامرئ الخ (۳) فمن کانت هجرته الخ مراد حدیث بیان کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ اس حدیث کو ترجمۃ الباب سے کیا مناسبت ہے، بعضوں نے لکھا ہے کہ اس کو ترجمۃ الباب سے کوئی مناسبت نہیں ہے، امام بخاری اس حدیث کو ابتدائے کتاب میں تصحیح نیت کے لئے لائے ہیں، تاکہ لکھنے والا اور پڑھنے والا اپنی نیت صحیح و درست کرلے، کہ سوا ابتغاء وجہ اللہ کے اور کوئی نیت نہ ہو، مگر اس پر شبہ یہ ہے کہ اگر غرض یہ ہوتی تو باب سے قبل لاتے تاکہ ساری کتاب سے پہلے نیت درست کرنے کا ذریعہ قرار پاتی جیساکہ مشکوٰۃ میں کیا گیا ہے، اس کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ ترجمہ خود ان کی اپنی عبارت ہے اور عبادت آگے حدیث کے ذکر سے شروع ہوتی ہے لہذا اب بھی حدیث سے قبل رہی، بعض نے کہا کہ امام بخاری نے کیف کان بدء الوحی میں اس آیت کا ذکر کرکے گویا ابتدائے نوعی بیان کردی، پھر اس کے مناسب یہ حدیث لائے کہ سارے انبیاء کے پاس یہ وحی آئی ہے اور سب کو نیت سکھلائی گئی ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ وَمَآ اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ، تو چونکہ یہ چیز تمام کو دی گئی ہے، اور سب کو اخلاص نیت کا حکم دیا گیا ہے، لہذا اس مناسبت سے بیان کردیا گیا، مگر اس کی حاجت نہیں، استاذ فرماتے ہیں کہ حدیث اس لئے لائے ہیں کہ نبی میں جہاں اور اخلاق فاضلہ اور عادات صالحہ ہونی چاہئیں وہاں پہلی چیز یہ ہے کہ صدق و عزیمت و اخلاص نیت ہو، پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس درجہ پر اس کا اخلاص اور کس مرتبہ پر اس کی نیت ہے، اللہ جانتا ہے کہ اس کی نیت کیسی ہے اور وہ کس طور پر ہمارے احکام لوگوں کو پہونچائے گا، گویا بخاری نے متنبہ کیا کہ سب سے پہلے موحی الیہ کی نیت دیکھی جاتی ہے، نیت کا حال اس کے احوال سے معلوم ہوتا ہے، ہم نے دیکھ لیا کہ تمسک بالتوحید کرنے والا دنیا میں کوئی نہیں تھا، شرک و بت پرستی رائج تھی، جہل و ظلم عام تھا، ایک بندہ اللہ کا اٹھتا ہے اور کفر و شرک، نیز جہل و ظلم کی فوجوں کو تہ و بالا کردیتا ہے تو کیا یہ اس کی نیت کا ثمرہ نہیں، لڑکے کی عمدہ تربیت کو والدین کے حسن نیت پر محمول کرتے ہیں، حضور کا تعلیم کے ذریعہ دنیا کی کایا پلٹ دینا عزم و نیت سے ہو سکتا تھا، خود بیان فرمادیا، جیسی نیت ہوگی ویسے ہی ثمرات ملیں گے، تو نیت کا اخلاص سب سے بڑا مبدء ہے، قرآن میں ہے کذلک فتنا بعضهم ببعض ليقولوا أهؤلاء منّ الله عليهم من بيننا (اسی طرح ہم نے بعض کو بعض کے ذریعہ آزمائش میں ڈالا تو کہتے ہیں کیا یہی ہیں جن پر اللہ نے احسان کیا ہمارے درمیان میں) اللہ تعالیٰ ان کا یہ اعتراض نقل کرنے کے بعد جواب دیتا ہے، الیس اللہ با علم بالشاکرین، اعتراض تھا اللہ نے انھیں کیوں مخصوص فرمایا

مَا نوی، فمن کانت ھجرتہٗ الی دنیا یصیبھا او الی امرأۃٍ ینکحھا فھجرتہٗ الی ما ھاجر الیہ
وہی ملے گا جو نیت کرے، پھر جس نے دنیا کمانے یا کوئی عورت بیاہنے کے لئے ہجرت کی (دیس چھوڑا) اس کی ہجرت اسی کام کیلئے ہوگی

جواب دیا، الیس اللہ الخ، یعنی کیا اللہ سب سے زیادہ جاننے والا نہیں ہے شکر گذاروں کو، یعنی یہ دولت اسی کو ملتی ہے جس کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ یہ شکر کرے گا، اور ہر طرح ہمارا مطیع رہے گا، یہ مضمون اور اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ، اور لکن اللہ یشھد بما انزل الیک انزلہ بعلمہ، اور موسیٰ و یوسف علیہما السلام کے لئے وکذلک نجزی المحسنین سب کا ایک ہی مضمون ہے، اور احسان انتہائی اخلاص کا نام ہے کہ گویا بندہ خدا کو دیکھ رہا ہے، تو معلوم ہوا کہ یہ نعمت مخلص کامل کو ملتی ہے، تو مبادی وحی میں سب سے بڑی چیز یہی ہے [اسی کو بیان کرنے کے لئے یہ حدیث لائے] ہاں ممکن ہے ثانوی مقصد یہ بھی ہو کہ پڑھنے والوں کو متنبہ کریں کہ نیت درست کرلو۔ اور اپنی نسبت بھی اشارہ کرجائیں کہ اس کام کو شروع کرتے وقت یہ حدیث ہمارے پیش نظر ہے، مگر مقصود اول وہی ہے، اور کلام میں گو مقصود ایک ہی ہوتا ہے مگر اشارہ دوسری طرف بھی ہوسکتا ہے، اور ہوتا ہے، تو الحمدللہ اب کچھ خرخشہ نہیں رہا، ——— اب کچھ منصب نبوت کے بارے میں بھی سن لو:-

منصب نبوت بلا تشبیہ فرض کرو، اگر حکومت کسی کو وائسرائے بلکہ ادنیٰ درجہ کا ملازم بھی مقرر کرے، تو اس میں دو باتیں دیکھے گی، ایک وفاداری، دوم لیاقت، پہلے یہ اندازہ کرے گی کہ کس قسم کا خاندان ہے، کس قسم کے جذبات ہیں، کتنا وفادار ہے، دوم لیاقت، یعنی علم و فہم، سیاست و تدبیر وغیرہ میں کیسا ہے، مگر مقدم وفاداری ہے، دنیا کی کوئی حکومت کسی باغی کو وائسرائے بنائے گی؟ ہرگز نہیں، یہی دو چیزیں منصب نبوت عطا کئے جانے میں بھی دیکھی جاتی ہے، پہلی چیز زیادہ مطلوب ہے کہ جسکو نبی بنانا ہے وہ مرضیات الٰہی میں فنا ہو، کیونکہ مقصود یہ ہے کہ بندوں سے اللہ کی پرستش کرائیں، نہ یہ کہ وہ جاکر اپنی بندگی کرانے لگیں، اسی کو فرمایا ہے مَاکان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ ولکن کونوا ربانیین، یہ ناممکن ہے کہ اللہ کی جانب سے کسی باغی کو بھیجدیا جائے، یہی وجہ ہے کہ ہر نبی اپنے زمانے کا سب سے بڑا وفادار اللہ کا ہوتا ہے، مگر فرق یہ ہے کہ دنیاوی حکومت کو مَاکان وَمَا یکونُ کا قطعی علم نہیں ہوتا۔ اس لئے امکان رہتا ہے کہ منتخب شخص باغی بن جائے، لیکن انبیاء علیہم السلام کے باب میں یہ صورت ناممکن ہے، کیونکہ اللہ کا علم ماکان وما یکونُ کو محیط ہوتا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ خلاف حکم کرہی نہیں سکتے، اور اللہ کا علم غلط نہیں ہوسکتا، لہذا نبی معصوم ہی ہوگا، وہ دغابازی سے، دھوکہ دہی سے، اور عصیان سے، معصوم ہوگا، زلّت اور چیز ہے، وہ عصمت کے خلاف نہیں، اس لئے کہ لغزش جس سے سرزد ہوتی ہے وہ یہ سمجھ کر کرتا ہے کہ یہ بات مرضی الٰہی کے خلاف نہیں، رب کی نافرمانی

سمجھتے ہوئے ہرگز نہیں کرسکتا،

دوسری چیز فہم ولیاقت ہے کہ اس کے ملکات علمیہ ارفع واعلیٰ ہوں، اخلاق بہترین ہوں، کردار بہت بلند ہو، یہ دو باتیں نبی میں نمایاں ہوتی ہیں، اور پہلے ان دونوں باتوں کے شواہد کا ظہور ہوتا ہے، تاکہ پیغام الٰہی کی پوری وقعت دلوں میں اتر جائے اور نبی کی عظمت وعصمت کا یقین ہو جائے، تو قبول کرنا آسان ہوگا،

امام بخاری نے بہترین صورت اختیار کی اور بتلایا کہ نبی کے سب سے بڑی چیز اخلاص ہے، اور نیت کا صحیح ہونا اور اس کا حسن ہونا ضروری ہے، رہا اس اخلاص اور نیت کا ظہور، وہ احوال سے ہوتا ہے، نبی کے کارنامے اور بلند اخلاق بتلاتے ہیں کہ نیت میں بھرپور اخلاص کارفرما ہے، فتح الباری میں ہے کہ آپ ابتدا ہی سے اوثان کو مبغوض رکھتے تھے، اور ارادہ رکھتے تھے کہ ان کا استیصال کیا جائے، متفرق طور پر شراح نے بھی ان باتوں کو بیان کیا ہے، مگر یہ استاد کی جامع تقریر ہے جو نبوت کا منصب واضح کردیتی ہے،

انما الاعمال میں بہت کلام کیا گیا ہے، اور تعین مراد میں بہت گفتگو کی گئی ہے، اور مسائل خلافیہ بھی بیان کئے گئے ہیں، عینی نے سو۱۰۰ صفحے لکھے ہیں، کسی نے کہا کہ صحۃ مقدر ہے، کسی نے کہا کہ ثواب، کسی نے کمال مقدر مانا، کسی نے اعتبار وغیرہ مگر ہر ایک نے اپنے مقصود کو پیش نظر رکھا، کیونکہ ہر ایک کو اپنے اپنے اصول کا لحاظ ہوتا ہے، اسی کے موافق توجیہ کرتے ہیں، احناف وضو میں نیت کو شرط نہیں کہتے، اور شوافع شرط مانتے ہیں، دلیل میں اس حدیث کو پیش کرتے ہیں اور صحۃ کو مقدر مانتے ہیں، اور اعمال کو عام قرار دیتے ہیں، خواہ مقاصد ہوں یا وسائل، اس کے برخلاف حنفیہ کمال کو مقدر مانتے ہیں، مگر مذہب کی رعایت سے قطع نظر کرتے ہوئے، انصاف کی بات یہ ہے کہ قائل کی غرض اور ماسیق لہ الکلام کو دیکھا جائے اور اسی کے مناسب محذوف کی تقدیر مانی جائے، سلطان العلماء شیخ عزالدین بن عبدالسلام اور حافظ عمادالدین ابن کثیر کی تحقیق میں کلام کی تقدیر یہ ہے، انما الاعمال تعتبر بالنیات، یعنی اعمال نیت سے معتبر ہوتے ہیں، جیسی نیت ہوگی ویسا ہی ثمرہ ہوگا، میرے نزدیک انشاء اللہ یہی حق اور اقرب الی مراد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

عمل کا محمود و مذموم ہونا یا مثمر برکات ہونا یا محبط سیئات ہونا نیت کے اعتبار سے ہے، نیت اچھی ہے تو عمل محمود ہے، نیت خراب ہے تو اللہ کے نزدیک مذموم ہے، گو اعمال بظاہر کیسے ہی اچھے کیوں نہ ہوں، ان دونوں کی مثال حدیث ہی سے پیش کرتا ہوں، قرآن وحدیث میں مسجد ضرار کا ذکر ہے، اور مسجد بنانے کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔ مَنْ بَنیٰ لِلّٰہِ مَسْجِدًا بَنَی اللّٰہُ لَہٗ بَیْتًا فِی الْجَنَّۃِ، اس حدیث کی رو سے مسجد کا بنانا بڑا اچھا کام تھا، مگر مسجد ضرار بنانے کی

نیت وغرض کیا تھی اسے قرآن نے بیان فرمایا، والذین اتخذوا مسجداً ضراراً وکفراً وتفریقاً بین المومنین وارصاداً لمن حارب اللہ ورسولہ، الآیۃ، یعنی مقصد ضرر پہونچانا اور تفرقہ بین المومنین اور ارصاد یعنی جو محارب تھا اسکو گھات میں بٹھانا تھا،

واقعہ یہ ہے کہ ابو عامر فاسق کی پہلے مدینہ میں بڑی عزت تھی اور راہب کہلاتا تھا، جب سرکارؐ مدینہ تشریف لائے تو اس کو اپنا وقار گرتا نظر آیا، اس لئے اس نے پہلے تو انصار مدینہ کو مسلمان ہونے سے روکنا چاہا مگر وہ ایسے عاشق ہو چکے تھے کہ اس کی کچھ نہ چلی تو یہ دشمن ہوگیا اور جب مدینہ میں دال نہ گلی تو شام چلاگیا، اور روم وغیرہ کے عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف ابھارتا رہا، منافقین مدینہ کو اس کے پیغامات پہونچتے رہتے تھے، جب وہ واپس آیا تو منافقین نے یہ مسجد اس لئے بنائی کہ یہاں بیٹھ کر مشورے کریں گے، گویا ایک بڑا اڈہ بنایا گیا۔ مدینہ سے ہٹ کر قبا میں تاکہ فاصلہ ہونے کی وجہ سے اچانک چھاپہ ماری سے محفوظ رہیں، بہانہ نماز کا اور اصل مقصد تفریق بین المسلمین، یہ کہ کچھ لوگ یہاں بھی آکر نماز پڑھیں گے تو ہم انھیں توڑیں گے تو بظاہر یہ تو بڑی اچھی بات تھی مگر اللہ نے قرآن میں اعلان فرمایا واللہ یشھد انھم لکٰذبون، انھوں نے قسم کھا کر اپنا مدعا ظاہر کیا، ولیحلفن ان اردنا الا الحسنیٰ اللہ نے اس کی تردید واللہ یشھد فرما کر، کی، پھر حکم ہوا لاتقم فیہ ابداً ! جس کام کے کرنے پر جنت میں مکان بنتا تھا نیت کی خرابی کی وجہ سے ساتویں آسمان کے اوپر سے حکم آتا ہے لاتقم فیہ ابدا ! کیونکہ انکی حالت اور انکی نیت درست نہیں تھی ۔ اسکے مقابلہ میں مسجد قبا کا ذکر کیا لمسجد اسس علی التقویٰ من اول یوم …… المطھرین، یعنی انکی نیت بہتر تھی۔ تو وہ باعث رفع مراتب بن گئی، اور ان کی خرابی نیت ان کے لئے وبال بن گئی۔ جیسے کہ فرمایا رسول علیہ السلام نے والقرآن حجۃ لک او علیک، یعنی جیسی نیت ہوگی ویسا ہی اثر ہوگا۔

دوسری نظیر وہ واقعہ ہے جس میں بظاہر عمل خراب ہے لیکن حسن نیت کی وجہ سے ایک درجہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا لحاظ فرمایا ہے، یہ واقعہ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ بدری صحابی کا تھا، جہاں عمل بہت خراب تھا مگر ان کی نیت کے حسن نے انھیں عتاب سے بچالیا، حضرت حاطب رضی اللہ عنہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آگئے تھے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کرنے کا ارادہ فرمالیا تو تیاری کا حکم دے دیا، لیکن انتہائی راز میں رکھا تاکہ خونریزی نہ ہو اور مکہ فتح ہو جائے، حضرت حاطب نے ایک عورت کو ایک پرچہ لکھ کر دے دیا جو سردار قریش کے نام سے تھا جس میں لکھا تھا کہ اللہ کے نبی علیہ السلام جہاد کی تیاری فرمارہے ہیں، میرا گمان ہے کہ مکہ کا رخ ہوگا، تم اپنے بچاؤ کی

فکر کرو، عورت خط لیکر روانہ ہوگئی، وحی نے حضور علیہ السلام کو واقعہ بتادیا، آپ نے دو آدمی جن میں سے ایک حضرت علی رضؓ تھے، یہ کہہ کر بھیجدیا کہ فلاں مقام پر اس طرح کی ایک عورت ملے گی، اس کے پاس ایک خط ہے لے آؤ، یہ حضرات روانہ ہوئے اور ٹھیک اسی مقام پر جہاں کی نشان دہی نبی علیہ السلام نے فرمائی تھی، اس عورت کو پالیا، اور اس سے خط مانگا اس نے انکار کیا، تو اس کے سامان کی تلاشی لی، مگر نہ ملا، سیدنا علی مرتضیٰ نے تلوار سونت کر کہا کہ خط دے ورنہ تلوار سے گردن اڑادوں گا، ان کو یقین تھا کہ خط اس نے کہیں چھپا دیا ہے، اللہ کے نبی کی بات غلط نہیں ہوسکتی، جب جان کا خطرہ دیکھا تو عورت نے سر کے جوڑے سے چھپا ہوا خط نکال کر دے دیا، وہ خط لے کر دربار میں پہونچے تو معلوم ہوا کہ یہ خط حاطب کا ہے، معاملہ نہایت سنگین تھا، اور خط لکھنے والا سخت سزا کا مستحق تھا، صحابہ میں عام بے چینی پھیل گئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، حضور اس منافق کی گردن ماردی جائے مگر حضور نے جلدی نہیں کی، بلکہ پہلے انھیں بلاکر ان سے دریافت فرمایا، انھوں نے جواب میں عرض کیا یارسول اللہ جو مہاجرین یہاں ہیں ان کے مکہ میں کُنبے قبیلے کے لوگ ہیں جو ان کی حمایت وحفاظت کریں گے، انھیں اہلِ مکہ سے کوئی خطرہ نہیں ہے، لیکن میرا کوئی قبیلہ نہیں جو میرا حامی ہو، میں مکہ میں اجنبی ہوں میرے پسماندگان کے لئے پورا خطرہ ہے اسلئے کہ کسی سے حمایت کی توقع نہیں، اسی خیال سے میں نے تھوڑا سا تعلق ان سردارانِ مکہ سے پیدا کرنا چاہا تاکہ یہ میرے اہل و عیال کو نہ ستائیں، اور خدا کی قسم نہ میں اسلام سے پھرا اور نہ کفر کو دوست رکھا اور مجھے یقین تھا کہ آپ کی فتح ہوکر رہیگی چاہے میں کچھ کروں، میں نے اپنی بات عرض کردی اب آپ میرے بارے میں جو چاہیں حکم دیں، حضرت عمر کو پھر غصہ آیا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی وامی) نے فرمایا لاتقولوا الاخیرًا، کیونکہ اللہ نے اہل بدر کے بارے میں فرمادیا ہے اعملوا ماشئتم فقد غفرت لکم، پھر آپ نے انھیں کوئی سزا نہیں دی، اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ نیت کا بھی ایک درجہ میں اعتبار ہے، کتنا سخت واقعہ تھا، قرآن میں آیا ہے یاایھا الذین اٰمنوا لاتتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء تلقون الیھم بالمودۃ الآیہ پورے رکوع میں تنبیہ فرمائی گئی مگر ان کی نیت کا اعتبار کرتے ہوئے انھیں معاف کردیا گیا، معاملہ چونکہ سنگین تھا اس لئے تنبیہ کی گئی اور پوری تنبیہ کی گئی مگر نیت کی اچھائی کا یہ فائدہ بھی ضرور ہوا، کہ سزا سے بچ گئے،

ان دونوں مثالوں سے معلوم ہوگیا کہ روح عمل نیت ہے، نیت صحیح ہے تو عمل محمود ہے، اور نیت فاسد ہے تو عمل مذموم، ہاں بعض عمل جو خراب ہیں انھیں خراب ہی کہیں گے، ہاں نیت سے فی الجملہ اس کا ضرر باقی نہیں رہتا بلکہ کچھ حسن بھی آجاتا ہے،

اب میں چند آیات قرآنی پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے واضح ہوگا کہ یہ ضابطہ انما الاعمال بالنیات کا قرآنی آیات سے بنا ہے۔

قرآن میں تیسرے پارے سورۃ البقرہ کے رکوع ۳۶ میں فرمایا گیا ہے کالذی ینفق ماله رئاء الناس ولا یؤمن باللہ والیوم الآخر، فمثله کمثل صفوان علیه تراب فاصابه وابل فترکه صلدا، لایقدرون علیٰ شئ مما کسبوا، یعنی جو ریاء اور دکھاوے کے لئے مال خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ایسی سمجھو کہ چکنے پتھر پر مٹی پڑ گئی ہو، جونہی ایک تیز بانی کا چھینٹا پڑا وہ مٹی صاف ہوگئی، اور پتھر ہی رہ گیا، اسی طرح ریاکار کا خرچ کرنا بیکار جاتا ہے کچھ فائدہ نہیں پہونچاتا، آگے فرمایا، ومثل الذین ینفقون اموالھم ابتغاء مرضات اللہ وتثبیتا من انفسھم کمثل جنة بربوة اصابھا وابل فآتت اکلھا ضعفین، فان لم یصبھا وابل فطلّ، یعنی جو دل میں جماؤ سے اللہ کی مرضیات کے لئے خرچ کرتا ہے تو اس کی حالت ایسی ہے جیسے ایک باغ ہو ربوہ میں (ربوہ ایسی زمین جہاں نمو بہت جلدی ہوتا ہے) کہ اگر بارش ہوئی تو خوب پھل دونا چوگنا آیا، اور اگر زیادہ بارش نہ ہوئی تو تھوڑی ہی سہی (طل کے معنی تھوڑی بارش، جسے پھوار کہا جاتا ہے) وہ بھی کافی ہوجاتی ہے یعنی نیت کا پھل ہے کہ تھوڑی سی چیز بڑی ہوجاتی ہے،

دوسری آیت میں فرمایا گیا، افمن اسس بنیانه علی تقوی من اللہ ورضوان خیرٌ اَمّن اسس بنیانه علی شفا جرف ھار فانھار به فی نار جھنم، یعنی جسنے اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے کیا وہ بہتر ہے، یا وہ جس نے بنیاد ڈالی. کھائی کے کنارے پر جو قائم نہیں رہ سکتی، فانھار به یعنی ایک دھکے میں جہنم میں جا رہی، یعنی نیت کی خرابی نے جہنم میں پہونچا دیا،

تیسری آیت مسجد ضرار کی ہے، چوتھی آیت اہل قبا کی مسجد کے بارے میں ہے لمسجد اسس علی التقوی الخ
پانچویں آیت ومن یخرج من بیته مهاجرًا الی اللہ ورسوله ثم یدرکه الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ، ابھی نکلا نہیں شہر سے، رہے شہر ہی میں، مگر نیت اس کی اچھی تھی اس لئے موت سے اس کا اجر ثابت ہوگیا، چھٹی آیت من کان یرید الحیوة الدنیا وزینتھا نوف الیھم اعمالھم فیھا وھم فیھا لایبخسون جو دنیا کی زندگی کا اور اسی کی زینت کا ارادہ کرتا ہے ہم اس کو اسی دنیا میں پوری پوری جزا دیں گے اور یہیں بھگتان کر دیں گے، اور اس میں کچھ کمی نہ کیجائے گی، مگر آخرت میں کیا ہے، فرمایا اولئك الذین لیس لھم فی الآخرة الا النار، وحبط ما صنعوا فیھا

وباطل ما کانوا یعملون (یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں صرف آگ ہے اور ان کے سارے کارنامے برباد، اور ان کے سارے اعمال باطل ہو جائیں گے) یعنی وہاں کچھ نہ ملے گا، جیسی نیت ویسا ہی ثمرہ، ۱

ساتویں آیت، من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیہا مانشاء لمن نرید ثم جعلنا لہ جہنم یصلٰہا مذموما مدحورًا، جو آدمی عاجلہ (دنیا) کا طالب ہوگا، تو ہم جتنا چاہیں گے اور جسکو چاہیں گے جلدی اسی دنیا میں دے دیں گے، مگر آخرت میں انتہائی ذلت کے ساتھ وہ جہنم میں جھونک دئے جائیں گے، یعنی طالب دنیا کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس کو بالکل اسی کے مرضی کے مطابق مل ہی جائے، اور جسکو ملے بھی، تو جتنی وہ چاہے اتنی ہی مل جائے، بلکہ ان طالبین دنیا میں سے دنیا میں بھی جسکو ہم چاہیں گے، دیں گے، اور جسکو نہ چاہیں گے نہ دیں گے، کسی کا زور نہیں ہے کہ زبردستی لے ہی لے، پھر جسکو دیں گے بھی تو جتنا ہم چاہیں گے اتنا ہی ملے گا، کسی کا دم نہیں کہ وہ ہماری چاہت سے زیادہ لے لے، یہ تو رہا معاملہ دنیا کا، اب رہی آخرت، تو وہاں کچھ نہ ملے گا، بس وہاں تو صرف جہنم ہی ہے جس میں وہ ذلت وخواری کے ساتھ ڈھکیل دیا جائے گا، پھر دنیا کا مال ومتاع وہاں کچھ کام نہ آئے گا، اس کے بالمقابل آخرت کی نیت رکھنے والوں کا آگے ذکر فرمایا، ومن اراد الاٰخرۃ وسعیٰ لہا سعیہا وھو مومن، فاولٰئک کان سعیہم مشکورا، یعنی جس کے دل میں ایمان ویقین موجود ہو اور وہ نیک نیتی سے خدا کی خوشنودی اور ثواب اخروی کی خاطر پیغمبر علیہ السلام کے بتلائے ہوئے راستہ پر عملی دوڑ دھوپ کرے، تو اس کی کوشش ہرگز ضائع ہونے والی نہیں، یقیناً بارگاہِ احدیت میں حسن قبول سے سرفراز ہوگی، آگے فرمایا، کلا نمد ھٰؤلاء وھٰؤلاء من عطاء ربک، وما کان عطاء ربک محظورا، یعنی حق تعالیٰ اپنی حکمت ومصلحت کے موافق بعض طالبین دنیا کو دنیا اور تمام طالبین آخرت کو آخرت عطا فرماتا ہے، اس کی عطاء میں کوئی مانع اور مزاحم نہیں ہو سکتا، معلوم ہوا کہ دار ومدار نیت وارادہ پر ہے (سورۂ بنی اسرائیل رکوع ۲)

آٹھویں آیت من کان یرید حرث الاٰخرۃ نزد لہ فی حرثہ، ومن کان یرید حرث الدنیا نؤتہ منہا وما لہ فی الاٰخرۃ من نصیب، جو کوئی چاہتا ہو آخرت کی کھیتی زیادہ کریں ہم اس کے لئے اس کی کھیتی، یعنی ایک کا دس گنا سات سو گنا اور اس سے زیادہ، اور دنیا میں ایمان وعمل صالح کی برکت سے جو فراخی وبرکت ہوتی ہے وہ الگ رہی، اور جو کوئی چاہتا ہو دنیا کی کھیتی اس کو دیں ہم کچھ اس میں سے، یعنی جو دنیا کے لئے محنت کرے موافق قسمت کے ملے، مگر آخرت میں اس کی محنت کا کچھ فائدہ نہیں، (سورۂ شوریٰ رکوع ۳) معلوم ہوا کہ مدار نیت پر ہے،

نویں آیت میں فرمایا، حتی اذا فشلتم وتنازعتم فی الامر وعصیتم من بعد ما اراکم ما تحبون منکم من یرید الدنیا ومنکم من یرید الآخرۃ، یہاں تک کہ جب تم خود ہی رائے میں کمزور پڑ گئے (اسطرح کہ جو تجویز رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمائی تھی کہ مورچہ پر ایک افسر اور پچاس آدمی برابر بیٹھے رہیں، بعضوں نے غلط فہمی سے یہ رائے دی کہ اب ہم کو بھی کفار کا تعاقب کرنا چاہیئے) اور تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے پر نہ چلے بعد اس کے کہ تمکو تمھاری دلخواہ بات آنکھوں سے دکھلادی تھی، یعنی مسلمانوں کا غلبہ دکھلا دیا تھا اور تمھاری اس وقت یہ حالت تھی کہ تم میں سے بعضے تو وہ شخص تھے جو دنیا لینا چاہتے تھے، یعنی کفار کا تعاقب کر کے مال غنیمت جمع کرنا چاہتے تھے، اور بعضے تم میں وہ تھے، جو صرف آخرت کے طلبگار رہتے، دونوں جماعتیں الگ الگ نیت رکھتی تھیں، تو نیتوں کے فرق سے نتیجہ میں فرق ہوگیا،

(سورۂ آل عمران رکوع ۱۶)

دسویں آیت، ان یریدا اصلاحًا یوفق اللہ بینھما، یعنی اگر نیت اصلاح ہے تو اللہ تعالیٰ توفیق فرمادیگا

(سورۂ نسا، آیت ۳۵)

گیارہویں آیت، تلک الدار الآخرۃ نجعلھا للذین لا یریدون علوًا فی الارض ولا فسادا (سورۂ قصص رکوع ۹) یعنی یہ عالم آخرت تو ہم انھیں لوگوں کے لئے خاص کر دیتے ہیں جو زمین میں نہ بڑا بننے کا ارادہ ونیت رکھتے ہیں نہ فساد کرنے کی، معلوم ہوا جو بڑا بننے اور فساد کی نیت رکھتے ہیں ان کے لئے دار آخرت میں کچھ نہیں، ہاں جن کی نیت اچھی ہے اور وہ تکبر اور فساد کی نیت نہیں رکھتے، دار آخرت انھیں کے لئے ہے،

بارہویں آیت، والذین صبروا ابتغاء وجہ ربھم الخ (سورۂ رعد رکوع ۳) یعنی نیت مرضی الٰہی اور اللہ کی خوشنودی کی ہے،

تیرہویں آیت، وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین، (سورۂ لم یکن رکوع) یعنی انھیں صرف یہ حکم دیا گیا تھا، کہ خلوص نیت کے ساتھ اللہ کی بندگی کریں،

چودہویں آیت، وما لاحد عندہ من نعمۃ تجزیٰ، الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ ولسوف یرضیٰ (سورۂ واللیل رکوع ۱) یہ آیت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ ان پر کسی کا احسان نہیں کہ اس کا بدلہ دیں لیکن صرف اللہ کی رضا جوئی کی نیت سے وہ مال صرف کرتے ہیں، اس پر تفریع کی ولسوف یرضیٰ اور عنقریب وہ

. . . .

راضی ہو جائے گا یعنی اللہ کی طرف سے اس نیک نیتی پر اسے راضی کیا جائے گا، ان آیات سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم سے اخذ فرمایا اور ہمارا عقیدہ بھی یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو فرماتے ہیں اس کا ماخذ قرآن ہے، ہاں الفاظ کا اتحاد ضروری نہیں، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی دعوی کیا ہے کہ حضور جو فرماتے ہیں اس کا ماخذ قرآن ہے، گو ہم نہ سمجھ پائیں امام شاطبی نے موافقات میں کہا ہے کہ عموم کبھی صیغہ سے ثابت ہوتا ہے اور کبھی جزئیات ہوتی ہیں ان کو دیکھ کر ایک عام ضابطہ نکل آتا ہے، ان جزئیات میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے اس سے ضابطہ بن جاتا ہے، اللہ رحم فرمائے شاطبی پر کہ انھوں نے بہت بڑی چیز کی طرف متنبہ فرمادیا، ان تمام آیات سے معلوم ہوا کہ نیت پر معاملہ ہوتا ہے اور انھیں نصوص سے ایک ضابطہ نکل آیا جسکی تعبیر انما الاعمال بالنیات سے فرمائی گئی اسکی مثال یوں سمجھو کہ ایک تواتر معنوی ہے ایک لفظی [اسی طرح سمجھو کہ ایک عموم لفظی ہوتا ہے ایک معنوی] معنوی کا مطلب یہ ہے کہ لفظ کوئی ایسا نہیں جس سے ضابطہ بن سکے، مگر جزئیات کثیرہ سے ایک قدر مشترک نکل آئے جس سے ضابطہ بن جائے، اسی طرح حاتم کی سخاوت متواتر ہے مگر اس کے جود وسخا کا کوئی خاص واقعہ متواتر نہیں ہے مگر جب کسی کا حال یہ ہو کہ جب اس کے پاس کوئی پہونچے تو اس کو کچھ دے دے، پھر دوسرا پہونچے تو اسکو بھی دے، پھر جو جو پہونچے کچھ کچھ ضرور دے، اور ان میں سے ہر ایک یوں نقل کرے کہ اس نے ہمیں یہ دیا، دوسرا کہے کہ ہمیں یہ دیا اور سب یوں ہی کہیں تو ان سب کا قدر مشترک متواتر ہوا اور وہ اس کی سخاوت ہے بہر حال یہ ایک قدر مشترک کی بنا پر کہنا ہوگا، اسے تواتر معنوی کہیں گے، تو ضابطہ کے لئے عام لفظ کی ضرورت نہیں بلکہ بہت سی جزئیات کو دیکھکر ضابطہ بن جاتا ہے بس یہاں انما الاعمال بالنیات کا ضابطہ ان جزئیات (آیات) کی بنا پر بن گیا، جن کا ذکر اوپر کیا گیا،

نیت کے معنی میں سخت اختلاط ہو گیا ہے، لغت عرب میں لفظ نیت بمعنی قصد آتا ہے، مگر قصد میں صرف ارادہ ہوتا ہے اور نیت میں ارادہ کسی غایت پر پہونچنے کا ہوتا ہے، نیز نیت میں تمیز مقصود ہوتی ہے، مگر کہیں تمیز ایک عمل کی دوسرے عمل سے ہوتی ہے، مثلاً کہیں کہ ظہر کی نیت کرو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عصر کی نہیں، نفل کی نہیں، تو یہ عمل کی تمیز ہوئی دوسرے عمل سے، کبھی تمیز عبادت کی عادت سے ہوتی ہے، مثلاً روزہ رکھا مگر نیت نہیں کی تو عبادت نہیں ہوئی، یا ہفتہ میں ایک دن نہ کھانے کی عادت کرلی، اور نہ کھایا تو یہ عبادت نہ ہوئی، ہاں نیت کرلی روزہ کی، یعنی نیت کی کہ اللہ کے حکم سے ایسا کرتا ہوں، تو اب یہی نہ کھانا عبادت بن گیا، تو نیت سے عبادت اور عادت میں تمیز ہو جاتی ہے، تو اب ایک عبادت کو دوسری عبادت سے اور عبادت کو عادت سے تمیز دینے کا نام نیت ہوگا، اور فقہاء میں اسی معنی کے

اعتبار سے اختلاف ہے

کبھی دوسرے معنی بھی نیت کے آتے ہیں، وہاں معمول لہ کی دوسرے معمول لہ سے تمیز مقصود ہوتی ہے اور معبود کی معبود سے تمیز مقصود ہوتی ہے، یعنی جس کے لئے عمل کیا گیا ہے، وہ اس سے ممتاز ہوجائے جس کے لئے عمل نہیں کیا گیا، مثال کے لئے مسجد ضرار کا واقعہ لے لو، یہ مسجد اللہ کی عبادت کی نیت سے نہیں بنائی گئی تھی، تو اس کا حکم مسجد کا نہ رہ گیا اگر کہا جائے نیت ٹھیک کرو، یعنی یہ کہ اللہ کے لئے کرتے ہو یا کسی اور کے لئے، تو یہاں معمولی لہ کو غیر معمول لہ سے تمیز مقصود ہوگی، اس کی نظیر مشکوٰۃ کی وہ حدیث ہے جسمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کوئی مال وجاہ کے لئے کوئی ریا اور دکھاوے کے لئے کوئی حمایت کے لئے لڑتا ہے تو ان میں سے مجاہد کون ہے، فرمایا مجاہد صرف وہ ہے جو صرف اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے لڑے، من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا، تو یہاں معمول لہ کا اعتبار ہے کہ عمل کس کے لئے ہو رہا ہے، قرآن کریم کی تمام آیات میں یہی ثانی معنی مراد ہیں، اور یہی معنی حدیث کے بھی ہیں، یعنی جس چیز کے لئے نیت ہوگی وہی ملے گی، چنانچہ فمن کانت ھجرتہ الی اللہ الخ سے تفصیل فرمادی، فاء تفریعیہ قرینہ ہے کہ حدیث کے معنی ثانی معتبر ہیں نہ اول، کیونکہ تبلا دیا کہ اگر اللہ کے لئے کام ہے تو اس کا ثمرہ مرتب ہوگا اور وہ عمل مقبول عند اللہ ہوجائے گا، لیکن اگر معمول لہ کوئی دوسرا ہے تو اس کا ثمرہ دوسرا مرتب ہوگا، اللہ کے یہاں اس کو درجۂ قبول نہ ملے گا، پس حدیث میں یہی معنیٰ معتبر ہوں گے کہ جس کے لئے کام کروگے وہی ملے گا، وہی حاصل ہوگا، اور یہ معنی متفق علیہ ہیں، اختلاف معنی اول میں ہے تو اب حدیث سے اس مسئلہ مختلف فیہا کا کوئی تعلق نہیں رہا، بلکہ وہ الگ چیز ہے، اور اگر اسی سے بحث ہے تو میں کہتا ہوں کہ مقصود بالذات امور میں نیت بالاتفاق ضروری ہے،

وسائل میں اختلاف ہے، چنانچہ ہمارے ہاں وضو میں شرط نہیں، مگر بایں معنی کہ مفتاح صلوۃ ہو، اگر اسے عبادت بنانا ہے تو بلاشبہ بغیر نیت کے عبادت نہیں بنے گا، اس کے بارے میں میں کہتا ہوں کہ اگر عمل کی صحت کیلئے نیت ضروری قرار دیجائیگی تو یہ کلیہ صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ تب تطہیر بدن وثیاب میں بھی نیت کو شرط ماننا پڑے گا، حالانکہ تم بھی اس کے قائل نہیں، لیکن عموم مانتے ہو تو یہاں بھی ماننا پڑے گا، اور اگر فارق نکالو گے تو ہم بھی کوئی فارق نکالیں گے، کپڑے میں ازالہ نجاست کا ہے اور یہاں ازالہ حدث کا ہے، پانی بالطبع مطہر ہے اس لئے بلانیت طہارت ہوجائے گی۔ ازالہ نجاست وازالہ حدث میں کوئی فرق نہیں ہے، ہاں تیمم میں نیت ضروری ہوگی، کیونکہ زمین بالطبع مطہر نہیں، اور

اسی وجہ سے جہاں طہوریت ناقصہ ہے وہاں بھی نیت ضروری ہے جیسے وضو بالنبیذ یا ماء مشکوک، اور پانی چونکہ بالطبع مطہر ہے جیسا کہ قرآن میں ہے:۔ وانزلنا من السماء ماءً طھورًا، اور فرمایا وینزل علیکم من السماء ماءً لیطھرکم بہ، اس لئے نیت شرط نہیں، تو جب [illegible] کرتے ہو تو ہم بھی اگر تخصیص کریں تو کیا حرج ہے؟

قولہ لامرئٍ مانوی، اس میں اور پہلے جملہ میں بظاہر فرق نہیں معلوم ہوتا، مگر دونوں میں فرق ہے اور وہ یہ کہ ایک تو عمل کا محمود و مذموم ہونا ہے اس کے لئے پہلا جملہ ہے، اور ایک عاملین کے لئے ثمرہ کا حصول ہے، اسے بتلایا جملہ ثانیہ سے، یعنی ایک تو فی نفسہ عمل کا حسن و قبیح ہونا ہے وہ بھی نیت سے ہے، اور ایک عامل کو ثمرہ کا ملنا ہے، یہ بھی نیت ہی سے ہے اس میں آخرت کی تخصیص نہیں، دنیا میں بھی اس کا ثمرہ ملتا ہے، اسے ملے یا اس کی اولاد کو، فرمایا، من کان یرید حرث الدنیا نؤتہ منھا وما لہ فی الاٰخرۃ من نصیب، جو دنیا کی نیت کرتا ہے اس کو بھی دیتے ہیں، تو کفار کی نیت بھی ضائع نہیں جاتی، رہے ایمان والے سو ان کو ثمرہ ملتا ہی ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ملے گا، تو ان دونوں جملوں کا الگ الگ فائدہ ہے۔

قولہ فمن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او الی امرأۃ ینکحھا الخ

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ یہ حدیث یہاں پوری مذکور نہیں ہے، پوری حدیث یوں ہے، فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا الخ پہلا فقرہ بخاری نے حذف کر دیا، حالانکہ اس کا تعلق نیت حسنہ کے ساتھ ہے، اس سوال کا یہ جواب کہ بخاری کو یوں ہی پہونچی ہوگی صحیح نہیں ہے، کیونکہ دیگر مواقع میں بخاری ہی میں وہ فقرہ بھی موجود ہے، بعضوں نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ حمیدی کی روایت میں یہ جملہ نہ ہوگا، مگر یہ وجہ صحیح نہیں، اس لئے کہ حمیدی نے اپنی مسند میں پوری حدیث درج کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمدًا اختصار کیا گیا ہے، کیوں کہ حذف و اختصار کے بعد بھی غرض پوری ہو جاتی ہے، تقابل سے مفہوم مخالف خود بخود سمجھ میں آگیا، اس لئے ضرورت نہیں سمجھی، مگر یہ رکیک توجیہ ہے کیونکہ پھر دیگر مواقع پر کیوں لائے، اور پھر دوسری احادیث میں بھی یہی کرتے، حالانکہ ایسا نہیں کیا، آخر میں شراح نے لکھا ہے کہ بخاری نے تواضعًا ایسا کیا، یعنی اگر یہ جملہ ذکر کرتے [تو اس میں اشعار ہوتا کہ ہم نے صحیح نیت اور محض ابتغاء وجہ اللہ کے لئے یہ کام کیا ہے] اور اس میں ایک قسم کا دعوی اور شیخی پائی جاتی، اس لئے اس جملہ ہی کو حذف کر دیا، اور تواضعًا صرف دوسرا فقرہ

. . . .

ذکر کرکے اشارہ کر دیا کہ ہم حسن نیت و اخلاص کا دعوی کیا کر سکتے ہیں، مگر اس سے بھی تشفی نہ ہوئی کیونکہ بخاری تو حدیث نقل کر رہے ہیں اس میں تزکیہ کیا تھا، بہر حال کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، ہاں ایک یہ خیال ہوتا ہے کہ حذف سے ممکن ہے یہ غرض ہو کہ جس قدر ضرورت نیت کے صالح بنانے کی ہے، اس سے زائد ضرورت نیت فاسدہ سے بچنے کی ہے، بعض اعمال ایسے ہوتے ہیں کہ جو بری نیت سے نہیں کئے جاتے اور نہ اس میں ابتغاء وجہ اللہ ہوتا ہے مگر ان سے بھی قربت حاصل ہوتی ہے لیکن جس عمل میں بدنیتی ہو وہ مطلقا مفید نہیں بلکہ مضر ہیں تو یہ شرط ہر عمل میں ضروری ہے کہ بدنیتی نہ ہو، مثلاً تلاوت قرآن پاک میں ریا ہے تو وہ مفید نہیں، اور اگر نیت کچھ بھی نہیں تو بھی ثواب حاصل ہوگا، پس نیت فاسد سے بچنے کی ہر وقت ضرورت ہے تو ممکن ہے کہ حذف سے اس کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہو کہ حصول نفع کیلئے نیت حسن کا اشتراط تو کبھی ساقط بھی ہو جاتا ہے مگر نیت فاسد سے اجتناب و احتراز ہر حال میں اور ہر وقت ضروری ہے، اجتناب کی اس شرط کا سقوط کبھی نہیں ہوتا، چنانچہ حموی نے شیخ الاسلام زکریا انصاری سے نقل کیا ہے کہ یہاں تین چیزیں ہیں۔ ایک طاعات، ایک قربات، ایک عبادات طاعات میں نہ معرفت مطاع کی شرط ہے نہ نیت مشروط، جیسے کوئی دلائل میں غور و فکر کرے تاکہ موصل الی الایمان ہو، یہ ایک فعل ہے جس میں نہ نیت شرط ہے، کیونکہ کافر کی نیت غیر معتبر ہے اور نہ معرفت شرط ہے، کیونکہ اسی کی معرفت کے لئے تو نظر کر رہا ہے، تو طاعات میں نہ معرفت شرط ہے نہ نیت مشروط۔

دوسرے قربات ہیں، اس میں معرفت مطاع شرط ہے، گو نیت غیر مشروط ہو، جیسے تلاوت قرآن، کہ یہ معرفت معبود سے ہے لہذا ثواب ملے گا، عتق، ذکر، مراقبہ، صدقات، سب قربات ہیں۔

تیسرے عبادات ہیں، یہاں معرفت معبود بھی مشروط ہے، اور نیت عبادت بھی ضروری ہے، حدیث کا پڑھنا قربات میں آسکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ نیت فاسد نہ ہو، ہم کو یہ توجیہ بہتر معلوم ہوتی ہے، گویا بخاری نے پہلے فقرہ کو حذف کرکے بتلا دیا کہ اس وقت ہمارے پیش نظر زیادہ تر وہی فقرہ ہے جسکو ہم ذکر کر رہے ہیں، جس میں بری نیت کا مذموم و مضر ہونا مذکور ہے اور جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسی نیت سے اجتناب لازم ہے، ہمارے نزدیک یہ جواب اور جوابوں سے بہتر ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ او الی امرأۃ الخ

یہاں اس حدیث میں عورت کا ذکر تعمیم کے بعد کسی چیز کا بالتخصیص ذکر خاص طور پر اس لئے کیا گیا کہ افتتان عورت

کے ساتھ زیادہ ہے، جس طرح اہتمام شان کے لئے ذکر کر دیا کرتے ہیں، بعض نے اس حدیث کے متعلق یہ لکھا ہے کہ یہ واقعہ ام قیس کے بارے میں وارد ہوئی ہے اس لئے کہ اس نے نکاح کے لئے ہجرت کی شرط کی تھی، چنانچہ اس شخص کا نام ہی مہاجر ام قیس پڑ گیا، اس مرد کا نام کسی کو معلوم نہیں، ہاں یہ معلوم ہے کہ عورت کا نام قیلہ تھا، گو اس کی صحت کا ثبوت نہیں، مگر نفس واقعہ کا ثبوت ضرور ہے، لیکن اس واقعہ ہی میں اس حدیث کے وارد ہونے کا ثبوت نہیں بہر حال تخصیص بالذکر سے یہ ضرور معلوم ہوا کہ افتتان عورت سے زیادہ ہے، یہی وجہ تخصیص تھی، ورنہ دنیا کے ذکر میں اس کا بھی ذکر آ چکا تھا،

کما قال اللہ تعالیٰ :- زین للناس حب الشہوات من النساء والبنین الخ

ایک صورت یہ بھی ہے کہ نیت کچھ دنیا کی ہو، اور کچھ آخرت کی، ایسے وقت میں حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کہتے ہیں، جدھر غلبہ ہوگا، اسی کا اعتبار ہوگا۔

عمل کے متعلق ایک بات یہ بھی عرض کر دوں کہ ابن جریر طبری نے اجماع سلف نقل کیا ہے کہ اگر کسی کی نیت ابتداءً اچھی ہو، بعد میں کچھ عوارض اس نیت کے خلاف طاری ہو جاتیں تو وہ مضر نہیں، اور ثواب اسے ملے گا، لیکن اگر آخر تک نیت اچھی رہے تو اور زیادہ افضل ہے اور ثواب بھی زائد ملے گا۔

۲- حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ: اَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْهِ

عبداللہ بن یوسف نے ہم سے بیان کیا کہ امام مالکؒ نے ہشام بن عروہ سے یہ روایت بیان کی انھوں نے عروہ سے

عَنْ عَائِشَةَ اُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهَا اَنَّ الْحَارِثَ بْنَ هِشَامٍ سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ

بطریق ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ بیان کیا کہ حارث بن ہشام نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! كَيْفَ يَاْتِيْكَ الْوَحْىُ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

فرمایا یا رسول اللہ آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے ....؟ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَحْيَانًا يَاْتِيْنِىْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ اَشَدُّهٗ عَلَىَّ

نے فرمایا کبھی تو میرے پاس گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے، اور یہ انداز وحی میرے اوپر سب سے زیادہ شاق

(حدیث ۲) ام المومنین کا لفظ قرآن سے مقتبس ہے، فرمایا وازواجہ امہاتھم، نبی علیہ السلام کی بیویاں امت کی مائیں ہیں، احترام و توقیر اور عدم جواز نکاح ہیں، نہ کہ تمام احکام میں، اس لئے کوئی یہ نہ کہے کہ پردہ بھی نہ کرنا چاہیئے۔

حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ ابوجہل کے بھائی ہیں، فضلائے صحابہ میں ہیں۔

انھوں نے اتیانِ وحی کی کیفیت پوچھی، اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو بات مخصوص ہے اس کی نسبت بھی سوال جائز ہے، غرض رسول یہ ہے کہ وحی ایک امر عجیب ہے، اس کا تجربہ سوائے نبی کے اور کسی کو نہیں، اس لئے کمال اشتیاق سے سوال کیا، جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کمال اشتیاق میں "رَبِّ اَرِنِیْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى" کہا تھا، اسی طرح کمالِ اشتیاق میں یہ سوال بھی تھا، اس کا آپ نے جواب دیا، جس کا حاصل یہ ہے کہ اتیانِ وحی کی دو صورتیں ہیں، (اس حدیث میں دو ہی بیان کی گئی ہیں) اول مثل صلصلۃ الجرس، یعنی ٹالی کی سی آواز، یا گھنٹی کی سی آواز، جو گاڑی وغیرہ میں لگا دیتے ہیں۔ صلصلہ اس آواز کو کہتے ہیں جو متصل ہو اور متدارک، جیسا کہ ٹالی کی گنگناہٹ ہوتی ہے، چونکہ اور کوئی چیز مشابہ نہ تھی، جس سے سمجھایا جا سکے، اس لئے سمجھانے کے لئے یہ فرمایا، پھر اس میں کلام ہے کہ یہ صوت وحی کی تھی، یا اجنحہ ملائک کی آواز تھی، علماء کے دونوں قول ہیں ہمارے نزدیک ظاہر یہ ہے واللہ اعلم کہ غالباً یہ صوت وحی کی ہوتی تھی، اور یہ بیان مشابہ ہے اس کے جو دوسری حدیث میں آیا ہے، کہ جب اللہ کوئی حکم بھیجتے ہیں تو ملک ایک ایسی آواز سنتے ہیں جو صاف پتھر پر کوئی زنجیر کھینچنے سے پیدا ہوتی ہے، فرشتے یہ آواز سن کر سجدہ میں گر جاتے ہیں، اور اپنے بازو مارتے ہیں، اور رعب

. . . .

چھا جاتا ہے، بعد افاقہ نیچے والے فرشتے اوپر والے فرشتوں سے پوچھتے ہیں ماذا قال ربکم ؟ جواب ملتا ہے الحق،
قرآن میں ہے حتی اذا فزع عن قلوبھم قالوا ماذا قال ربکم، قالوا الحق وھو العلی الکبیر[1] یعنی جب
گھبراہٹ دور کردی جاتی ہے تو یہ سوال وجواب ہوتے ہیں، وہ علی وکبیر ہے اس کے علو اور کمال عظمت سے مرعوب
ہو جاتے ہیں، تو یہاں صلصلۃ الجرس اور وہاں کسلسلۃ علی صفوان ہے اور یہ دونوں متقارب ہیں، اور
میرے خیال میں یہ اشارہ بساطۃ کی طرف ہے، تشبیہ ایسی دی کہ فی الجملہ اس میں بساطت ہو اور ترکیب نہ ہو،
سلسلۃ علی صفوان بھی گو محدث ہے مگر من وجہٍ وہ ترکیب سے بعید ہے، اگر تار وغیرہ اس زمانہ میں ہوتے تو ممکن تھا
حضور اسی سے تشبیہ دیتے، کیونکہ یہاں ایک آواز منفصل متدارک ہوتی ہے جہاں تار لگا ہوتا ہے وہاں گھنٹی بھی
ہوتی ہے جس سے وہ مطلع ہوتا ہے، بہرحال تشبیہ کا مقصود ان شاء اللہ اشارہ بساطۃ کی طرف ہے مگر حال کیا ہوتا ہے
فرماتے ہیں کہ وہ آتی ہے پھر منقطع ہو جاتی ہے۔ مگر میں وہ سب کچھ محفوظ کر لیتا ہوں جو ملک لاتا ہے۔ ادھر آواز ختم ہوئی
ادھر سب سینہ میں محفوظ ہو گیا، القاء، تفہیم، حفظ، سب معاً ہے اتنا اور سمجھ لو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مشبہ محمود ہوتا ہے، اور
اور مشبہ بہٖ محمود نہیں ہوتا، بلکہ مذموم ہوتا ہے، صلصلۃ الجرس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اور فرمایا ہے کہ
جس قافلہ میں جرس ہوگا اس قافلہ میں فرشتے رحمت کے نہیں ہوتے، تو یہ چیز مذموم تھی مگر تشبیہ دے دی وحی کو اس سے
جو محمود ہے مگر چونکہ غرض واضح ہے [اور مقصد تشبیہ کا صرف ایضاح ہے] اس لئے کچھ حرج نہیں، اگر کوئی کہے کہ فلاں شیر
کی طرح ہے تو کیا تمام باتوں میں تشبیہ ہے ؟ نہیں بلکہ تشبیہ ایک خاص وصف میں ہے، یعنی شجاعت میں، ایسے ہی یہاں
وجہ شبہ کا اعتبار ہے تشبیہ سے مقصود مشبہ کو واضح کرنا ہوتا ہے، اس لئے اسے اختیار کیا جاتا ہے، اور یہ نبی ہی کی شان
ہے کہ ایسی بلیغ تشبیہ دی کہ اس سے بہتر تشبیہ ہو نہیں سکتی، براہین قاطعہ مولانا خلیل احمد رحمہ اللہ میں ہے کہ مروجہ مجلس میلاد
ایسی ہے جیسے کنہیا کا جنم، اس پر مولانا کی تکفیر کر دی گئی، کیونکہ مجلس میلاد کو ایسی چیز سے تشبیہ دے دیا جو ارذل ہے اور
مذموم، اور کہا گیا کہ اس سے توہین ہو گئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی، حالانکہ توہین کا نہ کوئی شائبہ ہے، اور نہ مقصود تنقیص نبی
ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو جہالات جاری کر رکھی ہیں وہ بالکل اس کے مشابہ ہیں، اگر یہ تشبیہ جو حدیث میں ہے کوئی دیوبندی
دیتا تو تکفیر کر دی جاتی، مگر چونکہ آ گئی حدیث میں تو اب کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، صحیح مسلم میں ہے ان الایمان لیأرز الی المدینۃ
کما تارز الحیۃ الی جحرھا یعنی اسلام لوٹے گا مدینہ کی طرف جیسا کہ سانپ اپنی بمی کی طرف لوٹتا ہے، اگر کوئی دیوبندی

(۱) سبا: ۲۳

ایسی تشبیہہ دیتا تو کافر کہا جاتا کہ ایمان جیسی مبارک شئی کو سانپ سے جس کا حرم میں بھی مار ڈالنا جائز ہے، تشبیہہ دے دی، مگر غرض واضح ہے کیونکہ سانپ کہیں پھرتا پھرے مگر لوٹ کر اپنی بل ہی کی طرف آتا ہے، اسی طرح اسلام وقت فتنہ وفساد میں اپنے مستقر (مدینہ) میں پناہ لے گا، بخاری میں آگے آئے گا کہ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ جب کفار کی ہجو کرتے تھے تو حضور علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ اے حسان جتنی شاخیں قریش کی ہیں سب میں میرا نسب ملا ہوا ہے ایسا نہ ہو کہ ایسی ہجو کرو جو مجھ تک پہونچ جائے، لہٰذا ابوبکر سے نسب کی تحقیق کرلیا کرنا، جواب میں حضرت حسان عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ میں آپ کو ایسا نکال لوں گا کما تسل الشعرۃ من العجین (بخاری ص۵۰۰) تو کس کو کس سے تشبیہ دی، مگر کوئی انھیں کافر نہیں کہہ سکتا، اسی قسم کی بات دیوبندی کہتا تو کافر کہا جاتا، سِیَر کی کتابوں میں ہے کہ جب حدیبیہ میں آپکی (صلی اللہ علیہ وسلم) اونٹنی بیٹھ گئی، تو آپ نے فرمایا حبسہا حابس الفیل میری اونٹنی اسی نے روک دی جس نے فیل کو روک دیا تھا، گویا حبس ناقہ حبس فیل ہوگیا، حالانکہ وہ استیصال وتخریب کے لئے آیا تھا، اور آپ نیت خیر لے کر گئے تھے، مگر مقصد صرف مشیت ایزدی کا بتلانا تھا، غرض یہ کہ ہمیشہ غرض تشبیہ کو دیکھا جاتا ہے، تو یہاں حدیث میں غرض بساطت وانصال و تدارک کو بتلانا تھا اس لئے ایسا فرمایا گیا۔

بَابُ بدءُ الخلق میں تصریح ہے کہ یاتینی الملک مثل صلصلۃ الجرس، معلوم ہوا کہ دونوں صورتوں میں فرشتہ آتا تھا، مگر فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں فرشتہ قلب پر نزول کرتا ہے، دیکھنے کی تصریح نہیں (مگر شیخ اکبر نے تصریح کی ہے کہ رویت ضروری ہے) اور وہ بھاری ہوتی ہے نبی پر اس لئے کہ اس میں نبی کے قویٰ کو سمیٹ کر ملاءِ اعلیٰ کی طرف متوجہ کرتے ہیں، تجرد وروحانیت کا غلبہ ہوتا ہے اور بشریت مغلوب ہوتی ہے۔ اسی بنا پر ھواشدُّہٗ علیّ فرمایا گیا، اور دوسری صورت میں یعنی صوت میں نبی اپنے حال پر رہتا ہے، ملک اپنی شکل بدل کر آتا ہے، مختصر یوں سمجھو کہ ایک قائل ہے یعنی فرشتہ، ایک سامع ہے یعنی نبی، تو کبھی قائل سامع کی صفت اختیار کرتا ہے، اور کبھی سامع پر قائل کی صفت کو غالب کیا جاتا ہے، جب فرشتہ متمثل ہو کر آیا، تو اس نے تشبہ کیا نبی سے، اور پہلی صورت بہت سخت ہوتی تھی، اور اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت مشقت ہوتی تھی، کیونکہ یہاں نبی کی حالت میں تغیر ہوتا تھا، اور ملک کے اوصاف غالب کرنے پڑتے تھے، اور ممکن ہے جبریل علیہ السلام پر دوسری صورت مشقت کا باعث ہوتی ہو۔ یہ پہلے گذر چکا ہے کہ وحی الہامی اور وحی نبوی میں فرق ہے، وحی نبوی میں رویت ہے ملک کی اور وہاں رویت ناممکن۔ نیز شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ وحی الہامی

. . . .

میں ولی کو امر ونہی نہیں ہوتا، امر ونہی کا خطاب صرف نبی کو ہوتا ہے، ولی کیلئے تعریفات وتفہیمات ہوتی ہیں یعنی کھول کر بتلا دینا، شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ جو دعویٰ کرے امر ونہی کا وہ کذاب ہے یا وہ مجنون ہے، اور قصداً کہتا ہے تو قتل کا مستحق ہے، یہ اسلئے کہا گیا کہ مرزا قادیانی نے اربعین میں لکھا ہے کہ میری وحی میں امر ونہی بھی ہے اور یہ شیخ اکبر کا بہت معتقد اور ان کے قول کو جابجا نقل کرتا ہے، اسلئے اسکے اور اسکے متبعین کیلئے یہ قول باعث تنبیہ ہوگا تو دو فرق ہوئے وحی نبی اور وحی ولی میں، ایک رویت ملک و عدم رویت کا، دوم یہ کہ وحی نبی میں امر ونہی ہے، وحی ولی میں نہیں بلکہ اس کا مدعی کاذب ہے۔

آیت قرآنی ماکان لبشر (الآیۃ) میں تین صورتیں بیان کیں اور یہاں دو صورتیں ہیں، تیسری بیان نہیں کی، یہ دو صورتیں بھی ایک ہی قسم کی ہیں یا علٰحدہ علٰحدہ، نیز بقیہ کیوں بیان نہیں کیں؟ اس کے سمجھنے سے پہلے آیت کا مطلب سمجھ لو۔

کوئی بشر اپنی عنصری ساخت اور موجودہ قویٰ کے اعتبار سے یہ طاقت نہیں رکھتا کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں اسکے سامنے ہو کر مشافہۃً کلام فرمائے اور بشر اسکا تحمل کر سکے، اسلئے کسی بشر سے اسکے ہمکلام ہونے کی تین صورتیں ہیں (۱) وحی یعنی اشارۂ خفیہ، (۲) من وراء حجاب (۳) فرشتہ متجسد ہو کر سامنے آجائے (او یرسل رسولا الخ) پہلی صورت میں فرشتہ آتا ہے یا نہیں؟ قرآن میں تصریح نہیں، کیونکہ اسمیں اشارہ خفیہ ہوتا ہے چاہے بتوسط ملک ہو یا بلا توسط، خواہ ولی کے حق میں ہو یا نبی کے حق میں۔ ابن تیمیہ اور ابن قیم نے تصریح کی ہے کہ اس پہلی قسم میں سب شامل ہیں نبی اور ولی، اور نفث فی الروع (القلب) بھی اسی میں داخل ہے، منام بھی اسی وحی میں داخل ہے، بظاہر سب کو شامل ہے مگر آگے جو قسم ہے او یرسل رسولا اسکے تقابل سے یہ کہنا پڑے گا کہ وہاں بلا توسطِ ملک وحی ہوگی ورنہ تقسیم نہ رہے گا۔ تو وحی سے خاص مراد ہے یعنی بلا توسط، خواہ ولی کے قلب پر ہو یا نبی کے، منام میں ہو یا بیداری میں۔

دوسری قسم من وراء حجاب کی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کانوں سے سنے اور آنکھ سے متکلم کو نہ دیکھے تو اس کا تعلق کان سے ہے، اور وحی یعنی قسم اول کا تعلق قلب سے ہے، نہ کان سے سنتا ہے نہ آنکھ سے دیکھتا ہے، من وراء حجاب کی دو نظیریں ہیں، اول موسیٰ علیہ السلام کیلئے کوہِ طور پر، دوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے معراج میں، محققین کہتے ہیں کہ من وراء حجاب بلا توسط ملک ہوا تھا، پہلی صورت میں حواس کا تعلق نہ تھا اور یہاں حواس کا تعلق ہے، چونکہ حجاب ہے اسلئے آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

تیسری صورت ارسال رُسل کی ہے اور یہ رُسل فرشتے ہوتے ہیں، فرشتہ آکر بحکم الٰہی ایماء کرتا ہے، اب

. . . .

فرشتے کے آنے کی دو صورتیں ہیں، ایک نزول علی القلب، دوسرے تمثل، تو حدیث کی دونوں صورتیں آیت کی تیسری صورت میں داخل ہیں، اور آیت کی دو صورتیں اس کے علاوہ ہیں، اول وحی کی، دوم من وراء حجاب کی، ان کا بیان حدیث مذکور میں نہیں ہے، اب سوال ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کو ترک کیوں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی صورت مختص بالنبی نہیں اور سوال وحی مختص بالنبی کا تھا، القاء کی صورت اولیاء کو بھی پیش آتی ہے اور من وراء حجاب کی صورت عام نہ تھی نادر تھی موسیٰ علیہ السلام کو طور پر اور نبی علیہ السلام کو معراج میں حاصل ہوئی اس لئے اس کا بھی سوال نہ تھا بلکہ سوال اس صورت کا تھا جس صورت سے بکثرت وحی آتی ہے کہ اس کی کیا کیفیت تھی، کیف یأتی استمرار پر دال ہے، لہٰذا آپ نے سوال کے مطابق جواب دیا، اور یہی صورت عام بھی ہے، بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وحی آتی تھی دوی النحل کی سی آواز آتی تھی، یعنی جیسے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور گونج پیدا ہوتی ہے، اسی قسم کی آواز معلوم ہوتی تھی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے کہا دونوں صورتیں ایک ہی ہیں مگر نبی علیہ السلام کو صلصلۃ الجرس کی سی اور دیگر سامعین کو دوی النحل کی سی معلوم ہوتی تھی، چنانچہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی روایت میں یسمع دوی النحل ہے، خلاصہ یہ کہ قرآن کی تین صورتوں میں سے صرف تیسری صورت کا ذکر حدیث میں ہے۔

کوئی سوال کر سکتا ہے کہ وحی رویا کی شکل میں بھی ہوتی ہے اسے کیوں نہیں بیان کیا؟ اس کا جواب بھی یہی ہے کہ رویا مختص بالنبی نہیں ہے اور سوال اس کا تھا جو مختص ہے، بخاری نے کتاب التوحید میں جس طرح اللہ کے لئے ید اور وجہ وغیرہ کو ثابت کیا ہے اسی طرح صوت کو بھی ثابت کیا ہے مگر ایسی صوت جس کی کیفیت نامعلوم ہے، اب اگر کوئی کہے کہ کلام الٰہی کی صوت تھی تو ہمیں انکار کی ضرورت نہیں، اور یہاں مراد بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کی صوت تھی، شراح اس صوت کو مقدمات وحی سے شمار کرتے ہیں جیسے تار کے لئے گھنٹی، یعنی وہ صوت وحی نہ تھی بلکہ نبی کی ساری قوتوں کو مجتمع کرنے اور متنبہ کرنے کے لئے ایسا ہوتا تھا، مگر راجح وہی ہے جو ہم نے بیان کیا۔

فَيَفْصِمُ عَنِّي وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَاقَالَ وَاَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ الْمَلَكُ رَجُلًا
اور جب یہ کیفیت ختم ہوجاتی ہے تو میں اسے محفوظ کرچکا ہوتا ہوں، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فرشتہ انسان کی شکل میں

فَيُكَلِّمُنِي فَاَعِي مَايَقُولُ قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ
مجھ سے گفتگو کرتا ہے تو میں اس کے کلمات محفوظ کرلیتا ہوں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نے آپؐ کو سخت سردی کے دن اس حال

يَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيْدِ الْبَرْدِ فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَاِنَّ
میں دیکھا کہ آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی، اور جب یہ کیفیت ختم ہوتی تھی تو آپؐ کی پیشانی مبارک سے اس طرح

جَبِيْنَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا .
پسینہ جاری ہوتا تھا کہ فصد لگائی گئی ہو،

قولہ وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ الخ یعنی سخت جاڑے کے موسم میں بھی جب وحی آچکتی تھی تو آپ کی پیشانی سے پسینہ ٹپکتا تھا، پسینہ کیوں ٹپکتا تھا؟ اس کے باب میں شیخ اکبر نے فتوحات میں اور شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں کچھ بیان کیا ہے، شیخ اکبر کہتے ہیں کہ نبی ایک نور ہے اور ملک بھی نور ہے اور جب نور کا نور سے لقا ہو تو حدت کا پیدا ہونا ضروری ہوا، اور جب حرارت ہوئی تو طبیعت دفع کرے گی، وہی پسینہ ہے اور پسینہ آنے کے بعد جو ہوا لگتی تھی تو ٹھنڈک معلوم ہوتی تھی اسی لئے فرمایا زملونی زملونی، حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب وحی آتی تھی تو آپ پہ کساء وغیرہ ڈال دی جاتی تھی، چونکہ تصادم ہوتا ہے قوی ملکیہ اور طبائع بشریہ میں اور بوقت وحی نبی کو طبائع بشریہ کو چھوڑنا پڑتا تھا اس لئے شدت ہوتی تھی، اور یہ فقط انبیاء ہی کے قلوب ہوتے ہیں جو اس کو برداشت کرلیتے ہیں، ورنہ فرمایا گیا ہے لو انزلنا ھٰذا القراٰن علیٰ جبل لرأیتہ خاشعامتصدعًامن خشیۃ اللہ، اور فرمایا گیا: اناسنلقی علیک قولاثقیلا حتی کہ وہ اونٹنی جس پر سوار ہوتے جب وحی آتی تو اس کی قوت برداشت جواب دے جاتی، سوائے آپ کی ناقہ قصواء کے، حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم میری ران پر سر رکھے آرام فرمارہے تھے کہ وحی کا نزول ہوا اور حضرت غیر اولی الضرر نازل ہوا تھا مگر معلوم ہوتا تھا کہ میری ران چور چور ہوجائیگی۔

بخاری کی غرض اس حدیث سے عظمت وحی کا بتلانا ہے کہ یہ ایسی چیز ہے جو خارق عادت ہے کوئی معمولی چیز نہیں، میرا گمان ہے واللہ اعلم کہ قرآن کا نزول بکثرت اغلب احوال میں پہلی صورت سے ہوتا تھا، کبھی کبھی تمثل بھی ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ کہا گیا نزل بہ الروح الامین علیٰ قلبك الخ ہاں القائے احکام واحادیث وغیرہ میں ملک آتا تھا، تمثل کی صورت اہون ہوتی تھی، چنانچہ صحیح ابی عوانہ میں تصریح ہے وھواھونہ علی پھر تمثل کی کئی صورتیں تھیں، کبھی ملک اپنی اصلی صورت میں آتا تھا، اور دعویٰ کیا گیا ہے کہ صرف

دوبار ایسا ہوا ہے، ایک ابتدائے بعثت میں اور دوبارہ لیلۃ الاسراء میں جیساکہ فرمایا گیا ؛ **ولقد راٰہ نزلۃ اخرٰی (النجم)** بشرطیکہ ضمیر جبریل علیہ السلام کی طرف راجع کی جائے (دو بار میں حصر غالباً مبالغۃً کیا گیا ورنہ ایک بار حراء میں، دوسری بار اجیاد (محلہ مکہ) میں اور تیسری بار اسراء میں اپنی اصلی صورت میں نظر آئے) اور کبھی ملک بشر کی شکل میں آتا تھا اور اس وقت اکثر حضرت دحیہ کلبیؓ کی شکل میں آتا جو بہت خوبصورت تھے، اس سے معلوم ہوا کہ ملک اگر جامۂ انسانی پہنے گا تو جو احسن صورت ہو گی اس میں متشکل ہو گا، اور کبھی کسی اعرابی کی صورت میں ملک کا نزول ہوتا جیساکہ حدیث جبریل سے معلوم ہوتا ہے۔

قولہ:- وقد وعیت — پہلی صورت میں ماضی کا صیغہ ہے اور ثانی میں مضارع ہے، یہ فرق اس لئے ہے کہ پہلی صورت میں بیان فرماتے ہیں کہ جس وقت فرشتہ وحی ختم کرکے جدا ہوتا تھا تو وحی مجھے یاد اور محفوظ ہوتی تھی، جملہ حالیہ لائے، اور دوسری صورت میں بشر آکر کلام کرتا تھا تو جو جو وہ بولتا تھا، جیسے جیسے بولتا تھا آپ اس کو تجدداً سمجھتے جاتے تھے تو چونکہ مثل رجل کے مکالمہ ہوتا تھا اس لئے فاعی فرمایا اور پہلی صورت میں بسیط چیز ہے اس لئے خاتمہ پر محفوظ ملتی تھی لہذا وعیت ماضی کا صیغہ استعمال فرمایا۔

۳۔ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ اَخْبَرَنَا اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ

ہم سے یحییٰ بن بکیر نے حدیث بیان کی کہ لیث نے عقیل (ابن خالد) سے اور انھوں نے ابن شہاب زہری سے

عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عَائِشَةَ اُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا اَنَّهَا قَالَتْ اَوَّلُ

بروایت عروہ بن زبیر۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت نقل کی کہ انھوں نے یہ فرمایا کہ پہلی چیز

مَا بُدِئَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ فِي النَّوْمِ

جس سے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا ہوئی، رویار صالحہ تھے، جنھیں آپ خواب میں دیکھتے تھے

فَكَانَ لَا يَرٰى رُؤْيَا اِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ ثُمَّ حُبِّبَ اِلَيْهِ الْخَلَاءُ وَكَانَ يَخْلُوْ

چنانچہ جو خواب بھی دیکھتے وہ سپیدۂ صبح کی طرح سامنے آتا، پھر خلوت گزینی آپ کے نزدیک محبوب

بِغَارِ حِرَاءٍ فَيَتَحَنَّثُ فِيْهِ وَهُوَ التَّعَبُّدُ اللَّيَالِيَ ذَوَاتِ الْعَدَدِ قَبْلَ اَنْ يَّنْزِعَ اِلٰى اَهْلِهٖ

کردی گئی، اور غار حرا میں خلوت گزینی فرماتے اور اپنے اہل کی طرف اشتیاق سے پہلے کئی رات تک اس میں عبادت فرماتے

قولہ اول مابدئ ، یعنی اقسام وحی میں سب سے پہلی قسم رویا صالحہ کی تھی، چھ ماہ قبل نبوت سے یہ صورت پیدا ہوئی تھی، بعد چھ مہینے کے فرشتہ آیا، مسلم کی بعض روایات میں ہے کہ کچھ روشنیاں بھی معلوم ہوتی تھیں اور کبھی آواز آتی تھی مگر متکلم نظر نہ آتا تھا اور کبھی شجر و حجر سلام کرتے تھے، اس کے بعد یہ قصہ ہوا جسے آپ بیان فرما رہے ہیں۔

قولہ فلق الصبح ، یہ تشبیہ وضوح میں ہے، یعنی اس کی تعبیر بھی آپ کو فوراً معلوم ہوجاتی تھی، ابن ابی جمرہ نے اس تشبیہ میں خاص سر بیان کیا ہے کہ رویا مبادی وحی سے ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء علیہم السلام میں مثل شمس کے ہیں، اور شمس کے مبادی میں سے فلق الصبح ہے، شمس نبوت کے طلوع ہونے کے مناسب یہ تھا کہ اس کا مبدا یعنی فلق الصبح ہو، جس طرح طلوع شمس سے پہلے کچھ روشنی ہوتی ہے اسی طرح طلوع شمس نبوت سے قبل بھی کچھ روشنیاں ہونی چاہیئے تھیں جن کا بیان فلق الصبح سے کیا گیا۔

قولہ ثم حبب ، یعنی اس کے بعد خلوت کا اختیار کرنا (یہاں مراد مصدر ہے یعنی فعل خلاء، مکان مراد نہیں) آپ کے قلب میں محبوب کردیا گیا، فرماتے ہیں کہ اس کام کے لیے ہیں نے غار حرا، تجویز کیا تھا (حراء کو اب جبل النور کہتے ہیں، مکہ سے تین میل کے قریب منیٰ جاتے ہوئے بائیں ہاتھ پر پڑتا ہے)

اہل سیر کہتے ہیں کہ عبدالمطلب اس غار میں کبھی کبھی اعتکاف کرتے تھے چونکہ آپ ان کے وارث تھے اس لیے

وَيَتَزَوَّدُ لِذٰلِكَ ثُمَّ يَرْجِعُ اِلٰى خَدِيْجَةَ فَيَتَزَوَّدُ لِمِثْلِهَا حَتّٰى جَاءَهُ الْحَقُّ
اور اس کے لئے سامان خورد و نوش ساتھ لیجاتے، پھر حضرت خدیجہ کے پاس واپس تشریف لاتے اور اتنی ہی راتوں کیلئے پھر سامان مہیا فرماتے یہاں تک کہ حق آگیا

آپ نے اسے پسند فرمایا مگر جس نے وہ مقام دیکھا ہے وہ فیصلہ کرے گا کہ اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہ ملے گی، وہاں قدرت نے ایک حجرہ سا بنا دیا ہے جو مثلث سا ہے، ایک آدمی فراغت سے اور دو وقت سے گذر کر سکتے ہیں اور راستہ صرف ایک ہے اور وہ بھی ایسا تنگ ہے کہ کروٹ بدل کر نکلنا ہوتا ہے تو وہ جگہ ہی ایسی تھی خواہ عبد المطلب پسند کرتے یا نہ کرتے، ممکن ہے وجہ وہ بھی ہو لیکن اصل وجہ جگہ کی خوبی تھی۔

قولہ فیتحنث فیه وهو التعبد، یہ تفسیر مدرج ہے، عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول نہیں ہے، تحنث نازیبا اور ناشائستہ حرکت کے ترک کو کہتے ہیں، کنایۃً عبادت مراد لی گئی ہے۔

(اللیالی حدیث کا لفظ ذوات العدد اس کی تاکید ہے، اس میں کلام ہوا ہے کہ یہ عبادت کس طریق کے موافق تھی، اس کی تصریح کسی صحیح حدیث میں نہیں، اہل سیر اور علماء کے اقوال ہیں، کسی نے کہا کہ یہ عبادت دین ابراہیمی کے مطابق تھی، کسی نے موسیٰ کسی نے عیسیٰ علیہما السلام کے مطابق کہا، کسی نے کہا الہام کے مطابق عبادت تھی کیونکہ قبل نبوت بھی آپ ولی تھے، جیسا کہ یہ مسلم بھی ہے کہ نبی قبل نبوت بھی ولی ضرور ہوتا ہے، کسی نے کہا غور و فکر تھا، یہی عبادت تھی، بعضوں نے کہا کہ فقراء کو کھانا کھلاتے تھے، یہ عبادت تھی، بہتر اور قوی یہی ہے کہ دین ابراہیم کے بقایا پر جو متوارث تھا عمل کرتے تھے، چنانچہ بعض روایات میں یتحنف ہے (سیرۃ ابن ہشام) یعنی ملت ابراہیمی کی اتباع کرتے تھے کیونکہ تحنف کے معنی یہی ہیں، حافظ نے کہا کہ بعض نے دعویٰ کیا ہے کہ فاء کو ثاء سے بدل دیا گیا ہے، اور یہ یعنی بدل دینا کلام عرب میں بکثرت رائج ہے اگر تبدیلی نہ بھی ہو تب بھی قرینہ یہی ہے کہ یتحنف ہی مراد ہو یتحنث سے۔

ینزع کے معنی یشتاق کے ہیں اور مراد رجوع ہے

ویتزود یعنی توشہ تیار کراتے تھے پھر لیکر آپ چلے جاتے تھے، سیرت کی کتابوں میں ہے کہ ایک ایک ماہ گذارتے تھے خصوصیت کے ساتھ رمضان کا، تصریح بھی آئی ہے مگر بایں طور کہ آتے جاتے رہتے تھے، تزود سے معلوم ہوا کہ زاد کا ساتھ رکھنا توکل کے منافی نہیں۔

حتی جاءہ الحق، (یعنی الوحی)

قولہ اقرأ فقلت ما انا بقارئ یعنی جیسے کسی کو پڑھنے کا حکم دیا جائے اور وہ اپنے کو عاجز سمجھ کر کہدے ما انا بقارئ پھر بار بار فرشتہ زور سے دباتا تھا حتی بلغ منی الجهد، یہاں تک کہ اس کا دبانا میری تمام طاقت کو ختم کر دیتا تھا، یعنی اس کے تحمل میں میں اپنی ساری طاقت صرف کر دیتا تھا۔ بعض روایت میں جُهد کا لفظ جیم اور دال کے پیش کیساتھ آیا ہے یعنی فرشتہ کے دبانے سے مجھے بڑی مشقت معلوم ہوتی تھی، تیسری بار فرشتہ نے کہا اقرأ باسم ربك الذی خلق ..... مالم یعلم تک پانچ آیتیں پڑھائیں، باقی سورت مدت کے بعد نازل ہوئی، حقیقت یہ ہے کہ جو واقعات گذرے انھیں کوئی بتا نہیں سکتا۔

وَهُوَ فِي غَارِ حِرَاءٍ فَجَاءَهُ الْمَلَكُ فَقَالَ اقْرَأْ فَقَالَ فَقُلْتُ مَا اَنَا بِقَارِئٍ

جب کہ آپ غار حرا میں تھے چنانچہ فرشتہ پہونچا اور اس نے کہا اِقْرَأْ (پڑھئے) آپ نے فرمایا کہ میں نے فرشتے سے کہا کہ میں

فَاَخَذَنِي فَغَطَّنِي حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدُ ثُمَّ اَرْسَلَنِي فَقَالَ اقْرَأْ فَقُلْتُ

پڑھا ہوا نہیں ہوں، آپ نے فرمایا کہ فرشتے نے مجھے پکڑا اور دبایا یہاں تک کہ اس کا دباؤ میری طاقت کی انتہا کو پہونچ گیا، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا

مَا اَنَا بِقَارِئٍ فَاَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّانِيَةَ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدُ ثُمَّ اَرْسَلَنِي فَقَالَ

اور کہا اِقْرَأْ (پڑھئے) پھر میں نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، پھر اس نے مجھے پکڑا اور دوسری مرتبہ دبوچا یہاں تک کہ اس کا دبوچنا میری

اقْرَأْ فَقُلْتُ مَا اَنَا بِقَارِئٍ فَاَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّالِثَةَ ثُمَّ اَرْسَلَنِي فَقَالَ اقْرَأْ بِاسْمِ

طاقت کی انتہا کو پہونچ گیا پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا اِقْرَأْ (پڑھئے) میں نے اس سے کہا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، پھر اس نے مجھے

رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَأْ وَ

پکڑا اور تیسری مرتبہ دبوچا پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا: اقرأ باسم ربك الذی خلق، خلق الانسان من علق، اقرأ و ربك الاکرم

وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ.

اپنے پروردگار کے نام سے پڑھئے جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، پڑھئے آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے۔

گمر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جبریل جس وقت اقرأ کا حکم کر رہے تھے اس وقت کوئی کتاب نہ تھی ورنہ بچہ کی تعلیم کا سا واقعہ ہو جائے گا، حضور تو اعلیٰ خاندان کے عرب تھے اور الفاظ بھی عربی ہی کے تھے پھر بھی آپ نے انکار کیا، معلوم ہوا کہ کوئی چیز شدت و ثقل کی تھی جس کی برداشت مشکل معلوم ہو رہی تھی اور غط جبریل کو اللہ نے اس کی سہولت کا سبب بنا دیا تھا، اس وقت آپ پڑھنے لگے جب آپ لوٹ کر آئے تو باوجود بدن پر لرزہ کے الفاظ زبان پر جاری تھے، شبلی نعمانی وغیرہ نے اس کا مذاق اڑایا ہے کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جبریل آپ کو دبائیں اور آپ محسوس فرمائیں اور اس سے سہولت ہو جائے اور آپ پڑھنے لگیں، ہم کہتے ہیں کہ اس سلسلہ کی شروع سے آخر تک سمجھ میں آنے کی ہے کون سی بات؟ سب ہی باتیں ہماری عقول سے باہر ہیں تو سب کا انکار کر دینا چاہئے، صحیح کیفیت تو بیان نہیں کی جا سکتی مگر مجھ پر ایک واقعہ خود گذرا ہے اسے بیان کرتا ہوں، حیدر آباد کے شفاخانہ میں میں گیا تو بجلی سے علاج کے بہت سے کرشمے دکھلائے، پھر کہا کہو تو تمھارے بدن میں بجلی داخل کر دیں، پہلے تو میں گھبرایا مگر اس کے اطمینان دلانے پر راضی ہو گیا تو انھوں نے ایک کرسی پیش کی، میں

. . . .

اس پر بیٹھ گیا، انھوں نے ایک پیتل کا ڈنڈا مجھے پکڑا دیا اور مشین چلادی، کچھ دیر بعد کہا کہ ہم آپ کے بدن میں اس قدر بجلی پہونچا چکے، مجھے پتہ بھی نہ چلا اور تعجب ہوا تو انھوں نے مولوی یحییٰ سے کہا کہ ذرا انھیں ہاتھ لگاؤ، انھوں نے اپنا ہاتھ قریب کر کے ایک انگلی بڑھائی ہی تھی کہ میں نے دیکھا کہ ان کی انگلی سے ایک شعلہ نکلا، وہ سمجھے کہ انگلی کٹ گئی اور مجھے بھی تکلیف ہوئی، معلوم ہوا کہ کوئی اجنبی چیز بدن میں ہے، پھر انھوں نے مولوی یحییٰ سے کہا ایک دم زور سے پکڑلو، انھوں نے زور سے پکڑ لیا تو اب کچھ اثر نہ تھا، وہ اسی طرح پکڑے ہوئے تھے کہ انھوں نے تیسرے آدمی سے کہا کہ تم پکڑو، اس کا ہاتھ قریب آنا تھا کہ وہی کیفیت پیدا ہوئی جو پہلے مولوی یحییٰ کے ساتھ ہو چکی تھی، پھر اس سے بھی کہا کہ زور سے پکڑلو، جب اس نے بھی زور سے پکڑ لیا تو اس کی بھی وہ کیفیت جاتی رہی، یہ عجیب کرشمہ دیکھ کر جب وہاں سے اٹھا تو میں نے کہا کہ آج ایک بڑا مسئلہ حل ہو گیا، وہ یہ کہ کبھی زور سے پکڑنے سے بھی آسانی ہو جاتی ہے، بس اسی طرح بلا تشبیہ جبریل کے ملنے پر جب نور کا نور سے اتصال ہوا تو اولاً تو شروع میں تکلیف اور شدت ہوئی مگر جب زور سے دبایا تو اب وہ ثقل جاتا رہا اور آسانی ہو گئی، فی الجملہ شدت تو پھر بھی باقی رہی جس کو پسینہ آجانا جاڑوں میں بتاتا ہے مگر اس وقت جو زیادہ شدت تھی وہ غطِ جبریل سے جاتی رہی۔

غطّ کے بارے میں بہت اختلاف ہوا ہے، بعض شراح نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ استاد کو چاہیے کہ شاگرد کو ذرا دبوچے، وغیرہ، مگر یہ بالکل رکیک بات ہے، بہتر مطلب وہی ہے جو ہم نے بیان کیا، یہاں جبریل تو واسطہ ہیں مگر ایک مزید سبب غط جبریل کو بنا دیا واللہ اعلم بالصواب۔

تین مرتبہ غط کے بعد آیت پڑھی اقرأ، جواب میں آپ نے فرمایا ما انا بقارئ، اس کا ترجمہ یہ کیا گیا "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" یہ ترجمہ گو صحیح ہے مگر اس سے اچھا ترجمہ یہ ہے کہ "میں پڑھ نہیں سکتا"۔ چونکہ زبان پر ثقل تھا اس لئے عجز ظاہر کیا، جبریل نے عرض کیا کہ آپ تو بیشک قادر نہیں ہیں مگر اپنے رب کا نام لیکر پڑھنا شروع کیجئے وہی پڑھا دے گا۔

اقرأ باسم ربك با، یا تو استعانت کیلئے ہے یا مصاحبت کیلئے، حاصل دونوں صورتوں کا یہ ہے کہ تم میں تو قدرت نہیں مگر اللہ کی مدد سے پڑھو، بجائے اللہ کے اسم ربك کہا، بظاہر اس میں یاد دلایا گیا کہ جس نے چالیس سال تک عجیب وغریب طور پر تربیت کی ہے وہی پڑھا رہا ہے، امام راغب کہتے ہیں کہ تربیت اس کو کہتے ہیں کہ کسی کو اس کی حد کمال تک بتدریج شیئاً فشیئاً پہونچا دینا، تو رب اس شان سے پہونچا دینے والے کو کہیں گے، اب مطلب یہ ہوا کہ جس نے بتدریج آپ کی تربیت کی وہ پڑھا رہا ہے، آپ کی تربیت عجیب عجیب طرح سے ہوئی، ماں باپ دادا کا سایہ اٹھا لیا پھر عجیب وغریب خوارق ظاہر کئے، برکات ظاہر کئے، حلیمہ کے گھر میں عجیب عجیب خوارق ظاہر کئے، ان سب کی طرف اشارہ کر کے بتلایا کہ تم اب اس کے نام سے پڑھو۔

الذی خلق، یہاں **خلقك** نہیں کہا، بلکہ یہ کہا کہ جس نے سارا عالم پیدا کر دیا (اشارہ ہے کہ وہ خالق اعراض وجواہر اور لطافت کا ہے) وہ آپ کے اندر کیا صفت قرأت نہیں پیدا کر سکتا؟ اس سے کچھ بعید نہیں، لہٰذا مت کہو ما انا بقاری بلکہ اسی کی مدد سے پڑھو۔

خلق الانسان من علق : اور تاکید کی جا رہی ہے کہ جب وہ خالق تمام اشیاء کا ہے تو یہ بھی پیدا کر سکتا ہے، پھر کہتا ہے کہ جس نے جمے ہوئے خون سے انسان کو پیدا کیا اس کے نام سے پڑھو، یہ اشارہ اصل انسان کی طرف ہے کہ اس میں کسی چیز کا بالکل ادراک نہیں تھا، جماد لایعقل، اللہ نے اس پر روح فائض کر کے عاقل و دانا و فہیم بنا دیا، ایک قطرۂ آب کو ایسی استعداد عطا کر دی کہ اس میں کمالات انسانیہ پیدا ہو گئے، تو جو جماد لایعقل کو عاقل بنا دے کیا وہ عاقل کو عارف اور اُمی کو قاری نہیں بنا سکتا؟ بے شک اس کے لئے کچھ مشکل نہیں۔ ان آیات میں اللہ نے اپنی قدرت کاملہ کا اظہار کر کے اپنے محبوب کو تسلی دی ہے کہ بالکل مت گھبراؤ، ہم نے جب سب چیزوں کو پیدا کر دیا تو کیا تم میں صفت قرأت نہیں پیدا کر سکتے؟ ضرور کر سکتے ہیں، یہاں تک امکان کا بیان تھا، آگے فعلیت کا ذکر ہے۔

اقرأ وربك الاکرم الخ میں وقوع کی دلیل بیان فرمائی، رب کے لفظ کو یاد کرو اور سوچو کہ جس کی تربیت زیر نگرانی رب اس طرح ہو اس میں یقیناً استعداد کامل ہوگی، اس لئے فیض بھی کامل ہوگا، کیونکہ فیض کا عدم دو طرح ہوتا ہے ایک یہ کہ مستفیض میں اخذ کی استعداد نہ ہو، دوسرے یہ کہ مفیض اس لائق نہیں اور اگر ہے تو بخل کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ چالیس سالہ تربیت عجیبہ تم میں کمالِ استعداد کا ثبوت ہے اور ہم فیض پہونچانے میں کامل ہیں اور بخل کا احتمال نہیں ہے کیونکہ ہم اکرم ہیں، کسی قسم کی کمی کرم میں نہیں، تو اب مانع عن الفیض کیا چیز رہی؟ تو یہ وقوع کی دلیل ہوئی کہ وہ آپ کی اس استعداد کو یوں ہی ضائع نہیں کرے گا۔

آگے فرمایا: **علّمَ بالقلم** : یعنی قلم کی مدد سے سکھلایا، ظاہر ہے کہ جمیع علوم میں قلم واسطہ بنتا ہے، مطلب یہ ہے کہ جو اللہ ایک لکڑی اور ایک کاہ یعنی سیاہی کے ذریعہ انسان کو سکھلانے پر قادر ہے، وہ اللہ کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جبریل (علیہ السلام) کے ذریعہ علم عطا نہیں کر سکتا؟ اس میں ایک بڑے شبہہ کا جواب بھی ہوگیا جو مشہور ہے کہ جبریل ایک طرح کے استاد ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور حضور ان کے تلمیذ ہوئے، تو بظاہر جبریل کی افضلیت معلوم ہوتی ہے، اس کا جواب لفظ قلم سے ہوا، بخاری کا علم ہم تک قلم کے ذریعہ پہونچا لیکن قلم ہم سے افضل نہیں، ہاں بخاری ہم سے افضل ہیں کیونکہ قلم کو کچھ نہیں معلوم، حرکت کاتب دے رہا ہے، فرشتے بارگاہ الٰہی میں ویسے ہی ہیں جیسے قلم کاتب کے ہاتھ میں، جس طرح قلم کو مجالِ سرتابی نہیں اسی طرح فرشتوں کو مجال نہیں کہ سرتابی کر سکیں، پس جبریل کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کاتب و مکتوب کے درمیان قلم ہے، چنانچہ کہتے ہیں کہ ملائکہ ایسے ہیں جیسے ہمارے جوارح، بلکہ جیسے قلم، جس طرح یہ چیزیں خود کچھ نہیں کر سکتیں اسی طرح ملائکہ کچھ نہیں کر سکتے، اضافت جو کبھی ہو جاتی ہے واسطہ کی طرف وہ مجازاً ہوتی ہے جیسے فرمادیا

. . . .

علّمہ شدید القویٰ ' یہاں مجاز ہے کہ جبریل واسطہ ہیں اور واسطہ کا افضل ہونا ضروری نہیں ' معلّم ضرور افضل ہوتا ہے جو یہاں اللہ تعالیٰ ہے ' اس کی ایک نظیر جدید سائنس سے دیدوں .

یورپ والوں کی تحقیق ہے کہ سورج سے جو نور اور گرمی ہم تک پہونچتی ہے اس کی حقیقت کیا ہے ؟ یہ مسئلہ قدیم حکمار سے چلا آرہا ہے ' مگر جدید تحقیق یہ ہے کہ نور اور حرارت کوئی علٰحدہ مادی چیزیں نہیں ہیں بلکہ کواکب میں ایک حرکت ہوتی ہے (یعنی اجسام مستنیرہ میں) اور ان میں اہتزاز ہوتا ہے ' اس حرکت حراریہ یا ضوئیہ سے اثیر (ایتھر یعنی ذرات صغار جو تقسیم خارجی کو قبول کرسکیں ' جن سے انکے زعم میں تمام عالم بنا ہے اور وہ ذرات صغار خلار میں پھیلے ہوئے ہیں) میں ایک کیفیت پیدا ہوجاتی ہے ' کوئی خارجی چیز نہیں ہوتی بلکہ ایتھر میں تموج پیدا ہوتا ہے اور اس کے آثار ہیں روشنی اور حرارت کی صورت میں معلوم ہوتے ہیں گویا اسی تموج کا اثر روشنی اور حرارت ہے ' یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حکمار نے لون کے متعلق کہا ہے کہ وہ کوئی چیز نہیں مگر ہمیں دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا ہے ہم کہتے ہیں کچھ سہی ' اس دھوپ کا انکار تو نہیں ہوسکتا اور نہ اس کا کہ جہاں آتی ہے اسی کی شکل اختیار کرلیتی ہے ' آثار مختلفہ پیدا ہوجاتے ہیں ' اسی طرح حق تعالیٰ جب ارادہ کرتا ہے کہ وحی نازل فرمائے تو حرکت ارادی اور اہتزاز پیدا ہوتا ہے ' وہی وحی ہے جو ملائک نبی تک پہونچا دیتے ہیں ' تو جبریل ایسے ہیں جیسے ایتھر تمھارے نزدیک ' چنانچہ لکھا ہے کہ اگر ایتھر نہ ہو تو روشنی کا پہونچنا ناممکن ہے ' لیکن پھر خود کہتے ہیں کہ ایتھر ہم سے افضل نہیں گو ذریعہ ہے ' تو جس طرح ایتھر ہے واسطہ کہ وہ خود متکیف ہوتا ہے اور ہم تک روشنی پہونچاتا ہے اسی طرح جبریل پہلے خود متکیف ہوتے ہیں وحی الٰہی سے ' پھر پہونچاتے ہیں حضور کی طرف ' تو اس سے جبریل کی افضلیت ثابت نہیں ہوتی اور قلم کا لفظ بول کر اشارہ کردیا کہ جبریل بالکل قلم کی طرح ہیں .

قولہٗ علّمَ الانسانَ مَالم یعلم : یہ ایک اور دلیل ہے ' یعنی بچہ ماں کے پیٹ سے کچھ لے کر نہیں آیا تھا اللہ نے اسے علوم عطا فرمائے ' تو جو ایک بچہ کو عاقل و عالم بنا سکتا ہے وہ کیا بڑے کو نہیں دے سکتا ؟ اللہ نے یہ دلائل اس لئے بیان کردئے کہ نبی علیہ السلام کو کسی قسم کی رکاوٹ و استبعاد نہ رہے ' چنانچہ حضور علیہ السلام پھر فر فر پڑھنے لگے اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آنے کے بعد پڑھتے رہے ' اب پھر شروع سے چلو کہ اللہ کے نام سے پڑھو جس نے تمھیں پیدا کیا ' جس نے تمھاری تربیت کی ' کیا وہ اس تربیت کو ضائع کردے گا ' جب تربیت کی ہے اور ضائع کرنا مقصود نہیں ہے تو کمالات نبوّت بھی عطا فرمائے گا ' عدم عطا کی کیا وجہ ہوسکتی ہے ؟ ہم ہی تمھیں بذریعہ جبریل تعلیم دے رہے ہیں اور جس طرح انسان کو علوم سے فائز کرسکتا ہے اسی طرح تم پر وحی نازل کرسکتا ہے اور تمام علوم سے فائز فرما سکتا ہے ' تم گھبراؤ مت ' تمثیل سائنس سے یہ مسئلہ حل ہوجائیگا کہ کلام الٰہی اصلاً بسیط ہے لیکن یہاں آکر اصوات و حروف کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے جیسے اجسام مستنیرہ کا نور ادّہ تو بسیط ہے لیکن یہاں آکر مختلف شکلیں اختیار کرلیتا ہے کہیں مربع کہیں مثلث کہیں مستدیر اسیطرح بلا تشبیہ کلام الٰہی اوپر بسیط ہے یہاں آکر حروف و اصوات کی صورت اختیار کرلیتا ہے .

فَرَجَعَ بِهَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْجُفُ فُؤَادُهُ ، فَدَخَلَ

یہ آیات لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہوئے اور آپ کا دل کانپ رہا تھا، چنانچہ آپ حضرت خدیجہ بنت خویلد

عَلٰى خَدِيجَةَ بِنْتِ خُوَيْلِدٍ فَقَالَ زَمِّلُونِي زَمِّلُونِي ، فَزَمَّلُوهُ حَتّٰى

کے پاس تشریف لائے اور فرمایا مجھے کمبل اڑھا دو، لوگوں نے آپ کو کمبل اڑھا دیا، یہاں تک کہ آپ کا خوف

ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ فَقَالَ لِخَدِيجَةَ وَاَخْبَرَهَا الْخَبَرَ لَقَدْ خَشِيتُ عَلٰى

ختم ہوگیا، پھر آپ نے یہ کیفیت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے بیان فرمائی اور پورے واقعہ کی اطلاع دی اور فرمایا

نَفْسِي ، فَقَالَتْ خَدِيجَةُ كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيكَ اللّٰهُ اَبَدًا ، اِنَّكَ لَتَصِلُ

مجھے اپنی جان کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا، حضرت خدیجہ رض نے فرمایا کہ ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا، خدا کی قسم خداوند قدوس کبھی آپ کو رسوا نہیں

الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِينُ

کرے گا، بلاشبہ آپ صلہ رحمی فرماتے ہیں اور ناتواں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، آپ ناداروں کے لئے کماتے ہیں، آپ مہمان نوازی کرتے ہیں اور آپ

عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ ، فَانْطَلَقَتْ بِهٖ خَدِيجَةُ

لوگوں کی ان حوادث پر مدد کرتے ہیں جو حق ہوتے ہیں، پھر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رض آپ کو ساتھ لیکر چلیں

قولہ یرجف فؤادہ : اصلی وجہ یہ تھی کہ پہلی بار فرشتہ کو اس کی اصلی شکل میں دیکھا تھا، اس کا رعب سا چھا گیا، اور میں کہتا ہوں کہ تحمل کرلینا بھی آپ ہی کا کام تھا، کوئی دوسرا برداشت بھی نہیں کرسکتا تھا، اس بنا پر یہ اثر اس لئے ہرگز نہ تھا کہ آپ کو نبوت میں یا فرشتہ کے آنے میں کچھ شبہہ تھا، جانتے آپ سب کچھ تھے، محض رویت ملک کا اثر ہوگیا، دیکھو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پاس جب فرشتے انسانی شکل میں آئے اور آپ نے ان کی ضیافت میں بچھڑا ذبح کرکے پکا کر رکھ دیا اور فرشتوں کے ہاتھ کھانے کے لئے نہ بڑھے تو ابراہیم علیہ السلام دل میں ڈرے، تب فرشتوں نے کہا ڈرو مت ہم فرشتے ہیں، ابراہیم علیہ السلام نے انھیں پہچانا نہ تھا، قرآن پڑھو : ولقد جاءت رسلنا ابراهيم بالبشرىٰ قالوا سلامًا قال سلام فما لبث ان جاء بعجل حنيذ فلما رأى ايديهم لا تصل اليه نكرهم واوجس منهم خيفة قالوا لا تخف انا ارسلنا الى قوم لوط (یعنی) اور یقیناً ہمارے قاصد ابراہیم علیہ السلام کے پاس بشارت لے کر پہونچے تو سلام کیا، ابراہیم علیہ السلام نے سلام کا جواب دیا اور ان کے لئے ایک تلا ہوا بچھڑا لے کر آئے اور ان کے سامنے رکھ دیا، انھیں مسافر انسان سمجھا مگر جب فرشتوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے تو ابراہیم علیہ السلام اپنے جی میں ڈرے، تب فرشتوں نے کہا ہم آپ کے رب کے قاصد (فرشتے) ہیں، ہم کھاتے نہیں، پھر انھوں نے حضرت سارہ کو بیٹے کی بشارت دی، آگے قرآن کہتا ہے : فلما ذهب

. . . .

عن ابراھیم الروع الخ جب حضرت ابراھیم کی گھبراہٹ جاتی رہی تو ہم سے قوم لوط کے بارے میں جھگڑنے لگے، لفظ روع یہاں بھی ہے، تو ظاہر ہے کہ ابراھیم علیہ السلام کو یہ ڈر کسی شبہہ کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس طرز سے ڈرے اور جب وہ اثر جاتا رہا تو قوم لوط کے بارے میں اللہ سے عرض معروض کرنے لگے، یہی لفظ روع حضور کے واقعہ میں بھی ہے تو یہ بھی کسی شبہہ کی وجہ سے نہیں بلکہ پہلی بار اصلی شکل میں دیکھنے سے بمقتضائے بشریت طبعاً آپ پر روع طاری ہوگیا، پوری تلاش پر صرف دو لفظ اس سلسلہ میں ملتے ہیں، ایک لفظ رعب، دوسرا لفظ روع، نہ روع شبہہ کی بنا پر تھا نہ رعب، بلکہ تقاضائے طبع سے تھا، اصحاب کہف کے قصہ میں قرآن کہتا ہے: لواطلعت علیھم لولیت منھم فراراً ولملئت منھم رعبًا یعنی اگر آپ انھیں جھانک کر دیکھتے تو پیٹھ پھیر کر بھاگتے اور آپ پر رعب چھا جاتا، تو کیا یہاں رعب کسی شبہہ کی بنا پر ہوتا؟ ہرگز نہیں صرف طبعی تقاضا ہوتا، اسی طرح وحی کے آنے اور جبریل کے دیکھنے سے ہوا، میں دعوے سے کہتا ہوں کوئی لفظ ایسا نہیں جو شبہہ کو بتاتا ہو، رہا رعب وہ منافی معرفت نہیں، جب عادت ہوگئی اور انس ہوگیا تو یہ بات جاتی رہی، اس کی مثال ایسی سمجھو جیسے کورے گھڑے میں پانی بھرو تو ایک سنسناہٹ پیدا ہوگی، پھر وہ بات جاتی رہے گی، اسی طرح پہلے یہ کیفیت تھی پھر وہ جاتی رہی

قولہ ودخل علیٰ خدیجۃ الخ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہونچ کر فرمایا زملونی زملونی مجھے اڑھاؤ سردی محسوس ہورہی ہے، انھوں نے اڑھا دیا پھر جب یہ کیفیت جاتی رہی حتیٰ ذھب کی تفریع تزمیل پر کی، ابھی حضرت خدیجہؓ سے گفتگو نہیں ہوئی، بعد ذہاب روع گفتگو ہوئی، پھر آپ نے حضرت خدیجہ کو قصہ سنایا، علامہ شبلی کہتے ہیں کہ آپ متردد تھے، حالانکہ تردد کا کوئی ثبوت نہیں۔

قولہ لقد خشیتُ الخ عام طور پر اس کا ترجمہ کرتے ہیں "مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہے کہ کہیں موت نہ آجائے" اگر یہ معنی لئے گئے تو پھر ڈر کس بات کا تھا جب کہ آپ کو نبوت کا یقین تھا، ملک کا یقین تھا، اس میں حافظ نے بارہ[۱۲] قول نقل کئے ہیں، کسی نے کہا جنون نہ ہو جائے، کسی نے کہا مرض نہ ہوجائے، کسی نے کہا کہ قتل کا خوف ہوا حالانکہ یہ سب احتمال غلط ہیں، غور کرو یہاں صیغہ ماضی کا ہے، مضارع کا نہیں، یہ در اصل ان واقعات کا جزو ہے جو غار میں گذرے تھے، آپ فرمارہے ہیں خدیجہ! کیا پوچھتی ہو، وہ واقعہ اس قدر سخت تھا کہ قریب تھا کہ میری جان نکل جائے، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ اب گھبرارہے ہیں کہ میں کیا کروں گا۔

شیخ ابوالحسن سندی نے حاشیہ بخاری میں اسے کھول کر بیان کیا ہے، سندی کا حاشیہ گو مختصر ہے مگر جہاں ہے بادن تولہ پاؤ رتی ہے، خود اس کے بعد کہا ہے کہ تمام تقاریر سے یہ اقرب و اسہل ہے، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ یہ اقرب ہے۔

نووی نے بھی کچھ اشارہ کیا ہے، کھول کر نہیں بیان کیا، اور اگر یہی معنی لئے جائیں کہ "مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہے کہ

کہیں موت نہ آجائے " تو بھی کیا اشکال ہے، حضورؐ فرماتے ہیں کہ وہ واقعہ یاد کر کے موت کا خوف ہوتا ہے کیونکہ نبوت کا بار تو مجھ پر آہی پڑا ہے اسی طرح ہر بار سختی ہوگی، اگر دو چار بار ایسی ہی سختی ہوئی تو مجھے اندیشہ ہے کہ موت نہ آجائے، یعنی یہ سختی بہت زیادہ ہے، اس کی برداشت مشکل ہے مگر یہ بات دوسرے درجہ میں ہے، بہتر معنی وہی ہیں جو سندی نے بیان کئے۔ بخاری تعلیقاً کتاب التفسیر میں لائے ہیں کہ ایک بار وحی آنے کے بعد فترۃ ہوئی، زمانہ فترۃ سیرت کی بعض کتابوں میں چھ ماہ اور بعض کتابوں میں ڈھائی سال ہے، اس فترۃ کا اثر حضورؐ پر بہت تھا، بعض وقت شدت حزن سے پہاڑ پر چڑھ کر اپنے کو ہلاک کر لینے کا ارادہ کر لیتے مگر ایسے وقت میں جبریل علیہ السلام سامنے آکر کہتے تھے کہ انك لرسول الله حقا یہ سن کر وہ کیفیت شدت حزن کی جاتی رہتی، متعدد بار ایسا ہی واقعہ پیش آیا ہر بار جبریل علیہ السلام آکر کہتے انك لرسول الله حقا اس کو لوگوں نے یوں کہا کہ اگر آپ کو نبوت کا یقین تھا تو پھر خودکشی کا ارادہ کیوں فرماتے تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو تردد تھا، مگر یہ غلط ہے، کوئی لفظ دال علی التردد نہیں بلکہ اس کے برعکس یقین پر دال ہے، حدیث میں حزن کا لفظ ہے اور حزن کہتے ہیں غم کو، تو آپ کو اس کا غم تھا کہ جو نعمت ایک بار حاصل ہو چکی تھی اس کا اعادہ نہ ہو رہا تھا، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی محبوب چھوٹ جائے تو قدرۃً اسے حزن ہوگا، اسی طرح یہاں ہے کہ انتہائی اشتیاق تھا اسی میں ہلاک کر ڈالنے کا خیال ہوتا تھا، یہ تو کمال یقین کی دلیل ہے، اور اللہ چونکہ حفاظت کا متکفل ہے اس لئے جبریل کو حفاظت کے لئے بھیجتا تھا، وہ آکر تسکین دیتے کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں، ضرور ہے کہ اس پہلی کیفیت کی تکمیل ہو، اس سے تردد کب ثابت ہوا، روع، خوف، اضطراب، لرزہ وغیرہ کا پایا جانا منافی یقین نہیں۔

خدیجہ کہتی ہیں کلا، سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی ذہانت کا کمال اس جواب سے معلوم ہوتا ہے، فرماتی ہیں، آپ ہرگز ضائع نہ ہوں گے آپ کے اندر اللہ نے وہ ملکات رکھے ہیں کہ آئندہ بڑے بڑے کام آپ سے لے گا۔

واللهِ مَا يخزيك اللّٰه ابدًا، خدا کی قسم اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا۔

انك لتصل الرحم، یعنی قرابت داروں سے صلہ رحمی کرتے ہیں۔

وتكسبُ المعدوم تکسب بالفتح مشہور ہے اور بالضم بھی پڑھا گیا ہے، یعنی آپ معدوم کو کماتے ہیں، یعنی جو چیزیں آپ کے پاس نہیں ہیں ان کے حاصل کرنے کا کمال اللہ نے آپ کو دیا تھا، مشہور تھا کہ آپ تجارت میں بڑے صاحب نصیب تھے، (کان محظوظًا فی التجارۃ) اور چونکہ صرف کما لینا کمال نہیں ہے بلکہ کما کر دوسروں پر صرف کر ڈالنا یہ کمال ہے اور یہ صفت بھی بدرجۂ اتم آپ میں تھی، اس لئے طاہرہ خدیجہ اس صفت کو ان الفاظ سے ادا کرتی ہیں وتقری الضيف۔

بعض نے تُکسِبُ پڑھا ہے یعنی کماتے ہیں معدوم کو، دوسرا مفعول محذوف ہے یعنی فقیر، مطلب یہ کہ فقراء کو مال کما دیتے ہیں۔

حَتّٰی اَتَتْ بِهٖ وَرَقَةَ بْنَ نَوْفَلِ بْنِ اَسَدِ بْنِ عَبْدِ الْعُزّٰی اِبْنِ عَمِّ

اور ورقہ ابن نوفل کے پاس پہونچیں جو اسد بن عبد العزیٰ کے بیٹے اور خدیجۃ الکبریٰ کے چچازاد بھائی تھے، اور یہ

خَدِیْجَةَ، وَکَانَ امْرَأً تَنَصَّرَ فِی الْجَاهِلِیَّةِ وَکَانَ یَکْتُبُ الْکِتَابَ

ورقہ ایسے آدمی تھے جو جاہلیت کے زمانہ میں دین نصرانیت اختیار کرچکے تھے اور وہ عبرانی خط کے کاتب تھے، وہ انجیل میں سے عبرانی زبان

الْعِبْرَانِیَّ فَیَکْتُبُ مِنَ الْاِنْجِیْلِ بِالْعِبْرَانِیَّةِ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ یَکْتُبَ

میں جو خدا کو منظور ہوتا لکھا کرتے تھے، وہ بہت عمر رسیدہ آدمی تھے جن کی بصارت بھی جاتی رہی تھی، ان سے حضرت خدیجہ

وَکَانَ شَیْخًا کَبِیْرًا قَدْ عَمِیَ فَقَالَتْ لَهٗ خَدِیْجَةُ یَا ابْنَ عَمِّ اسْمَعْ مِنَ

نے فرمایا: اے میرے چچا کے بیٹے! اپنے بھتیجے کی بات سنو، چنانچہ ورقہ نے آپ سے کہا: میرے بھتیجے تم کیا دیکھتے ہو!

ابْنِ اَخِیْكَ فَقَالَ لَهٗ وَرَقَةُ یَا ابْنَ اَخِیْ! مَاذَا تَرٰی؟ فَاَخْبَرَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ

پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو وہ تمام واقعات سنا دیئے جن کا مشاہدہ فرمایا تھا، ورقہ نے کہا:

صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَبَرَ مَا رَاٰی فَقَالَ لَهٗ وَرَقَةُ هٰذَا النَّامُوْسُ

یہ تو وہی رازداں ہیں جو خداوند قدوس کی جانب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی لاتے تھے،

الَّذِیْ نَزَّلَ اللّٰهُ عَلٰی مُوْسٰی یَا لَیْتَنِیْ فِیْهَا جَذَعًا.

کاش میں تمہاری پیغمبری کے زمانہ میں نوجوان اور طاقت ور ہوتا،

وتعین علیٰ نوائب الحق، نوائب جمع نائبۃ کی، حادثہ کو کہتے ہیں، لفظ حق کا اضافہ کرکے بتلادیا کہ آپ حق کا ساتھ دیتے ہیں، خیر کے کام میں مددگار ہوتے ہیں، نوائب شر سے آپ الگ رہتے ہیں، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ نے کسی شک اور تردد کا اظہار نہیں کیا، انھوں نے واقعۃً آپ کی تسلی کے لئے آپ کے اوصاف کا ذکر کیا تاکہ آپ کا یقین قوی ہو، یہاں بخاری کا مقصد زیادہ تر انھیں اوصاف واخلاق کا بیان کرنا ہے۔

فانطلقت به خدیجة الخ یعنی حضرت خدیجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر ورقہ بن نوفل بن عبد العزیٰ کے پاس گئیں، یہ ورقہ حضرت خدیجہ کے چچیرے بھائی تھے، ان کو حق کی طلب تھی اس لئے یہ اور زید بن عمرو بن نفیل تلاش حق میں نکل کر شام پہونچے، ورقہ کو کوئی راہب مل گیا جو صحیح دین نصرانیت پر تھا تو یہ نصرانی بن گئے، یعنی اصل دین عیسیٰ علیہ السلام پر قائم ہوگئے، عام طور پر تحریف ہوچکی تھی مگر کوئی کوئی اصل دین پر تھا، پہاڑ اور بن وغیرہ میں رہتے تھے، ورقہ عیسائی ہونے کے بعد کتابت انجیل کرتے تھے، کیونکہ انجیل کے

. . . .

حفظ کا معمول نہ تھا، جس طرح ہمارے یہاں حفظ قرآن کا معمول ہے، بعض روایات میں ہے کہ عربی میں لکھتے تھے، شارحین لکھتے ہیں کہ دونوں میں لکھتے ہوں گے کیونکہ عبرانی اور عربی قریب قریب ہیں، عبرانی زبان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان ہے جو اللہ نے انھیں عراق سے شام جاتے ہوئے سکھائی تھی، توریت وغیرہ عبرانی میں تھیں، لیکن انجیل کی زبان میں اختلاف ہے۔

قولہ شیخاً کبیراً، وہ عمر رسیدہ آدمی تھے اور آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے، یہ شبہہ کہ کتابت کیسے کرتے تھے، جواب یہ ہے کہ بالکل نابینا نہیں ہوئے تھے یا یہ کہ نابینا ہونے سے قبل لکھتے تھے، اسے بیان کیا گیا۔

قولہ یا ابن عمّ! یعنی اے میرے چچا کے بیٹے! جس روایت میں عم آیا ہے اس میں ان کو احتراماً چچا کہدیا گیا ہے، خدیجہؓ نے ورقہ سے کہا: اسمع من ابن اخیك، ورقہ نے پوچھا ماذا تری؟ یعنی تمھیں کیا نظر آتا ہے، حضورؐ نے نہ خود خدیجہؓ سے کہا اور نہ ورقہ سے، ہاں ورقہ کے سوال پر جو گذرا تھا بیان فرمادیا، ورقہ نے سن کر فرمایا ھذا الناموس الاکبر، ناموس رازدار کو کہتے ہیں اور فرشتے اللہ کے رازدار ہوتے ہیں، ایک جاسوس ہوتا ہے وہ شر کا رازدار ہوتا ہے اور ناموس خیر کے رازدار کو کہتے ہیں۔

انھوں نے یعنی ورقہ نے فرشتے کے آنے کی تصدیق کر دی اور صرف تصدیق ہی نہیں کی بلکہ کہا یالیتنی فیھا جذعاً یعنی شاباً، ورقہ بہت خوش ہوئے، انھیں یقین ہوگیا کہ یہ واقعی نبی ہیں، اسلئے کہا: کاش میں نوجوان ہوتا تو آپ کی موثر مدد کرتا، اس پر بھی آپ نے کچھ نہیں فرمایا، اتنا بھی نہیں فرمایا کہ مجھے تسلی ہوگئی، اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو تردد نہ تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس موقع پر ورقہ نے عیسیٰ علیہ السلام کا نام کیوں نہیں لیا، موسیٰ علیہ السلام کا کیوں لیا؟ اسکے بہت سے جواب دئے گئے ہیں، بہتر جواب کا حاصل یہ ہے کہ یہ اشارہ اس طرف ہے کہ وحی موسوی میں احکام کا کثیر مجموعہ تھا، عیسیٰ علیہ السلام کی نوبت میں بہت جزئی فرق ہوا ہے، درحقیقت شریعت عیسوی شریعت موسوی ہی تھی، چنانچہ قرآن میں ہے: ومصدقاً لما بین یدیّ من التوراۃ ولاحل لکم بعض الذی حرّم علیکم، یعنی بعض حرام شدہ کا اب حلال ہونا بتلا دوں، تو تورات چونکہ جامع تھی اس لئے اس سے تشبیہ دی کیونکہ قرآن بھی جامع ہے کما قال تعالیٰ: ومھیمناً علیہ، یعنی قرآن تمام شرائع کے اوپر نگہبان ہے اور سب کا جامع ہے، قرآن سے پہلے توراۃ سے زیادہ جامع کوئی کتاب نہ تھی، تو اس سے ورقہ نے اشارہ کیا کہ تمھاری شریعت جامع ہے، جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی شریعت تھی، یہ بات انجیل میں نہ تھی، انجیل میں زیادہ تر قصص ونصائح ہیں، قرآن میں اسی بنا پر کہا گیا: قل فاتوا بکتاب من عند اللہ ھو اھدیٰ منھما اتبعہ یعنی ایسی کوئی کتاب لاؤ جو توریت اور قرآن سے زیادہ ہدایت والی ہو، دوسرے مقام پر فرمایا: انا ارسلنا الیکم رسولاً شاھداً علیکم کما ارسلنا الیٰ فرعون رسولاً۔ یہاں بھی تشبیہ موسیٰ علیہ السلام کی رسالت سے

. . . .

دی ـــــ دوسری مناسبت آپ میں اور موسیٰ علیہ السلام میں یہ ہے کہ جیسے موسیٰ علیہ السلام کا فرعون ہلاک ہوا اسی طرح آپ کی امت کا فرعون یعنی ابوجہل ہلاک ہوگا ، فرمایا : فعصیٰ فرعون الرسول فاخذناہ اخذاً وبیلا ، یہ اشارہ ہے کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کرنے والا ہلاک ہوا آپ کی تکذیب کرنے والا بھی ہلاک ہوگا ، ورقہ نے آثار دیکھ کر یہ قول کیا ۔

حافظ نے ایک روایت لکھی ہے جو ابونعیم نے دلائل النبوۃ میں ذکر کی ہے اور اس کی سند بقول حافظ حسن ہے ، اسمیں موسیٰ علیہ السلام کے بجائے عیسیٰ علیہ السلام کا نام ہے ، تو اب بظاہر یہ نکتہ بیکار ہوگیا ، مگر اب شروع سے سوال ہی متوجہ نہیں ہوتا ، لیکن ایک دوسرا سوال کھڑا ہوگیا اور وہ یہ ہے کہ جب قصہ ایک ، گفتگو ایک تو پھر کہیں یہ نام اور کہیں وہ نام کیوں مذکور ہے ؟ گفتگو ایک ہی ہے تو کوئی ایک ہی نام لیا گیا ہوگا ، تو وہ کون سا لفظ تھا ، صحاح میں تو موسیٰ کا ذکر ہے ، حافظ نے خوب جواب دیا ہے ، کہتے ہیں کہ سیاق ابونعیم میں یہ نہیں ہے کہ حضور سے خطاب کرکے ورقہ نے کہا بلکہ اسمیں ہے کہ پہلے خدیجہ تنہا گئیں اور قصہ بیان کیا تو ورقہ نے خدیجہ سے کہا کہ اگر تیرا بیان صحیح ہے تو میں یقین کرتا ہوں کہ وہ فرشتہ وہ ہے جو عیسیٰ (علیہ السلام) پر آتا تھا ، حافظ کہتے ہیں کہ جب خدیجہ سے گفتگو کی تو عیسیٰ کا ذکر کیا کیونکہ قرب تھا عیسیٰ علیہ السلام سے اور یہ انھیں کے دین پر تھے بھی اور اس وقت انھیں اطمینان دلانا تھا خدیجہ کو کہ یہ بہت بڑی بشارت ہے ، اور جب حضور سے گفتگو ہوئی تو موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ یہ بہت بڑی چیز ہے ۔

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ایدناہ بروح القدس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے پاس جو جبریل آتے تھے تو ان کا تعلق حضرت مسیح سے دیگر انبیاء علیہم السلام کا سا نہ تھا ، خود وہ کلام نہیں کرتے تھے بلکہ حضرت مسیح کی زبان سے خود فرشتہ بولتے تھے ، تمھیں سمجھانے کے لئے کہتا ہوں کہ جس طرح تم دیکھتے ہو جس پر جن آتا ہے تو دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ یہ شخص بول رہا ہے ، حالانکہ بولنے والا وہ جن ہے اور اب تو مسمریزم کے ذریعہ جو بولتا معلوم ہوتا ہے وہ نہیں ہوتا بلکہ کوئی دوسری روح بولتی ہے ، بلاتشبیہ ایسا ہی معاملہ تھا عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کہ جبریل عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے بولتے تھے ، یہی خصوصی معاملہ تھا ان کا حضرت مسیح سے ، برخلاف دیگر انبیاء کے کہ جبریل بات کہہ دیتے اب وہ انبیاء خود بولتے اور یہ خصوصیت حضرت عیسیٰ کی جبریل سے اس لئے تھی کہ وہ جبریل ہی کے نفخہ سے پیدا ہوئے تھے ۔

اس سے کہیں افضلیت کا دھوکا نہ ہو کیونکہ یہ مسلم ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام میں ملکی خصائل کا غلبہ تھا مگر اس سے افضلیت ثابت نہیں ہوتی ، ورنہ پھر آدم علیہ السلام کو مسجود کیوں بنایا گیا ؟ آخر کچھ تو شرف تھا ، وہ شرف درحقیقت کمالات آدمیت کے اعتبار سے ہے گو اس کا ایک جز ملکیت بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھائے جانے کیلئے جبریل ہی کو منتخب کیا گیا کیونکہ خاص خصوصیت تھی ، پھر آدم کو باوجود افضل ہونے کے زمین پر رکھا منہا خلقناکم وفیہا نعیدکم الخ اور فرشتے آسمان پر رہے تو کیا اس سے فرشتوں کی

. . . .

افضلیت ثابت ہوتی ہے، باوجود افضلیت آدم کے تو فرمایا، یہ شاہ صاحب کا قول ہے مگر میرے پاس کوئی ماخذ نہیں حدیث سے ان کے پاس توریت یا انجیل کا کوئی ماخذ ہوگا کیونکہ وہ حضرات درس پڑھتے تھے، ممکن ہے وہاں انھوں نے دیکھا ہو مگر ہمیں قرآن و حدیث میں کچھ نہیں ملا

قولہٗ جَذَعًا جذع اصل میں اونٹنی کے اس بچہ کو کہتے ہیں جو قریب بشباب ہو، یہاں مطلب یہ ہے کہ کاش میں ان ایام میں جب کہ آپ کو وہ چیزیں پیش آئیں گی جو انبیاء علیہم السلام کو پیش آتی ہیں میں جوان رہتا اور زندہ رہ کر تمہاری مدد کرتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ورقہ کو نبوت کا یقین ہوگیا تھا اور انھوں نے تہیہ کرلیا تھا کہ حضور کو نبی تسلیم کرلیں گے اور ایمان لے آئیں گے، اب وہ مومن ہیں یا نہیں؟ تو مشہور ہے کہ سب سے پہلے مومن مردوں میں ابوبکر اور عورتوں میں خدیجہ اور لڑکوں میں علی ہیں اور موالی میں زید و بلال وغیرہ، ورقہ کو کسی نے اول مومن نہیں کہا، اگر وہ مومن تھے تو ان کو اول مومن کیوں نہیں شمار کیا؟ اور اگر نہیں تھے تو اس وقت ان کی تصدیق اور وعدۂ نصرت کیوں اور کیا تھا؟ اس سے تو ایمان معلوم ہوتا ہے، جواب مفصلاً آگے آئے گا اس وقت مجملاً یہ سمجھ لو کہ صرف تصدیق و معرفت ایمان کیلئے کافی نہیں بلکہ اسکے لئے دوسرے دینوں سے تبری اور دین محمدی کا التزام اور قبول کرنا ضروری ہے، اور یہ ورقہ سے ثابت نہیں، تصدیق و وعدہ وتمنی ضرور ہے مگر کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے قبول کا علم ہو، اب چند آیات پیش کرتا ہوں جن سے معلوم ہوگا کہ معرفت یا تصدیق یا علم سے ایمان معتبر نہیں ہوتا بلکہ التزام ضروری ہے، کما قال تعالیٰ: یعرفونه کما یعرفون ابناءهم یعنی جس طرح باپ کو بیٹے کا علم ہوتا ہے اور اسے اچھی طرح پہچانتا ہے اسی طرح یہ اہل کتاب رسول علیہ السلام کو اللہ کا نبی جانتے اور پہچانتے تھے مگر انھیں کے لئے فرماتے ہیں: وان فریقا منهم لیکتمون الحق وهم یعلمون (پارہ سیقول سورہ بقرہ) معلوم ہوا کہ تنہا معرفت و علم کافی نہیں، نیز فرمایا: وجحدوا بها واستیقنتها انفسهم، انھوں نے انکار کیا دراں حالیکہ انھیں یقین تھا، یہاں انکار ہے باوجودیکہ یقین تھا اور انکار ظلم، تکبر، سرکشی اور تمرد کی بنا پر تھا تو نفس استیقان ہی کافی نہ ہوا، التزام ضروری ہوا، خود فرعون کو مخاطب کرکے موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں: لقد علمت ما انزل هؤلاء الا رب السموات والارض بصائر وانی لاظنك یا فرعون مثبورا یعنی باوجود علم کے ہلاکت میں پڑنا چاہتا ہے، یہاں بھی علم ہے مگر غیر معتبر اور ایمان کے لئے ناکافی، ہاں کہا جاسکتا ہے کہ ان تمام آیات میں انکار و جحود ہے اور ورقہ نے جحود نہیں کیا تو میں کہتا ہوں کہ ورقہ کے قول میں اقرار بھی نہیں جو اس کے ایمان پر دلالت کرے، ممکن ہے وہ مومن ہوں اس کا ثبوت ہوجائے تو ہمیں انکار نہیں ہے، لیکن ان الفاظ سے حکم ایمان نہیں کرسکتے، ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اس کا علم نہیں کہ وہ مومن تھے یا نہیں، خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انھیں سفید کپڑے پہنے ہوئے دیکھنا اور تعبیر مغفرت سے دینا بیشک ایمان کو بتلاتا ہے لیکن اس حدیث سے ثبوت نہیں ہوتا۔

ابوطالب کا قصہ ان سے زیادہ صریح ہے کیونکہ ابوطالب کو یقین تھا بلکہ زبان سے اعلان کرتے تھے اور مدد کا وعدہ بھی، بلکہ

يَالَيْتَنِي اَكُوْنُ حَيًّا اِذْ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ . فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ
کاش کہ میں اس وقت تک زندہ رہتا جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی، رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ وہ (میری قوم کے)

وَسَلَّمَ اَوَ مُخْرِجِيَّ هُمْ قَالَ نَعَمْ . لَمْ يَأْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَاجِئْتَ بِهٖ اِلَّا
لوگ مجھ کو نکال دیں گے؟ ورقہ نے کہا ہاں! کبھی کوئی شخص اس قسم کی دعوت لے کر نہیں آیا جس طرح کی تم لائے ہو مگر یہ کہ

عُوْدِيَ وَاِنْ يُّدْرِكْنِيْ يَوْمُكَ اَنْصُرْكَ نَصْرًا مُؤَزَّرًا . ثُمَّ لَمْ يَنْشَبْ وَرَقَةُ
لوگوں نے اس کے ساتھ دشمنی کا برتاؤ کیا، اور اگر میں ان دنوں تک زندہ رہا تو آپ کی مضبوط مدد کروں گا، پھر تھوڑے ہی زمانہ کے بعد

اَنْ تُوُفِّيَ وَفَتَرَ الْوَحْيُ
ورقہ کا انتقال ہوگیا اور وحی بھی موقوف ہوگئی۔

جس وقت تمام عالم مخالف تھا اس وقت اپنی آبرو اور جان و مال قربان بھی کردیا، ان کے اشعار بھی ہیں، مثلاً ؎

واللّٰہ لن یصلوا الیک بجمعھم ❊ حتی اوسد فی التراب دفینا

اظہار بھی ہے، اقرار بھی ہے اور پھر یہ حمایت بھی ہے (۲) ـــ دوسرے قصیدہ میں ہے:

کذبتم وبیت اللّٰہ یبزی محمد ❊ ولما نقاتل حولہ ونناضل

یعنی جب تک ہم زندہ ہیں تم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، تو ایسی حمایت تھی مگر چونکہ التزام و قبول نہ تھا اس لئے انھیں مومن نہیں کہہ سکتے، اسی طرح چونکہ ورقہ سے التزام و قبول ثابت نہیں اس لئے سکوت کریں گے، اب اگر ایمان ثابت ہو جائے تو اول مومنین میں شمار نہ کرنا دوسری وجہ سے ہوگا۔

شیخ اکبر کہتے ہیں کہ نبوت و رسالت میں فرق ہے، نبی صرف وحی آجانے سے ہو جاتا ہے اور وحی اس کی ذات تک محدود ہوتی ہے، اور جب تبلیغ کا حکم ہوا تو وہ رسول ہوگیا (دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام تعلیم کرتے ہیں لیکن وہ مامور نہ تھے اور رسل مامور تھے) شیخ فتوحات میں لکھتے ہیں کہ اقرأ صرف آپ کے لئے محدود تھا، پھر وحی رکی رہی، جب یہ زمانہ فترت کا ختم ہوا جو تین سال کا تھا (تاریخ امام احمد) یا ڈھائی سال یا چھ ماہ بروایت دیگر تو حکم ہوا یا ایھا المدثر قم الخ اب خطاب ہے کہ تبلیغ کرو اور لوگوں کو ڈراؤ۔ اب آپ رسول ہوگئے، تین سال تک خوب تثبت و استقرار کردیا گیا تو حکم تبلیغ ہوا اور رسالت میں دعوت ہوتی ہے اور اب منکر کافر ہوگا اور جب تک تبلیغ نہیں اس وقت کا منکر کافر نہیں، تو ورقہ کا ایمان زمانہ فترت کا ہے، اس وقت دعوت نہ تھی اور دعوت کے بعد سب سے پہلے ایمان لانے والے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں، اس لئے انھیں اول المومنین کہا جاتا ہے۔

. . . .

قولہ اذ یخرجك قومك ' ایسے مواقع پر اکثر اذا لاتے ہیں مگر اذ بھی آتا ہے اور نحاۃ نے تصریح کی ہے کہ اذ بھی استقبال کیلئے آتا ہے۔

فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أو مخرجیّ ھم ' یعنی کیا یہ مجھے نکال دیں گے؟ آپ کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ آئی کہ جس کی یہ شان ہو، یہ امانت ہو، یہ صدق وحسن معاملات ہو، وہ اخلاق ہوں جن کا بیان حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کیا، کیا ایسے بلند پایہ انسان کو یہ قریش مکہ سے نکال دیں گے؟ اس لئے آپ نے انتہائی تعجب سے فرمایا: أو مخرجیّ ھم؟ یہ، یہ، یہ مجھے نکال دیں گے؟ تو ورقہ نے سیرت انبیاء سے جو سمجھا اور پڑھا تھا اس پر قیاس کرکے اپنے تخمینہ سے کہا: نعم لم یأت رجل قط بمثل ما جئت بہ الا عودی ہاں ایسا ہی ہوگا، جو کچھ آپ لائے ہیں یہ جو بھی لایا اس کے ساتھ یہی معاملہ ہوا، تو آپ کے ساتھ بھی ہوگا اور لوگ عداوت کریں گے، عراق سے ابراہیم علیہ السلام کو شام آنا پڑا، موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے، لوط علیہ السلام کو سدوم چھوڑنا پڑا، تو ظاہر ہے کہ تمہارے ساتھ بھی یہی پیش آئے گا۔

آگے کہتے ہیں کہ اگر میں زندہ رہا تو نصر موزر کروں گا، ازر کے معنی شدت وقوت کے ہیں، سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے عرض کیا واشدد بہ ازری یعنی اور ہارون (علیہ السلام) کے ذریعہ میرا ہاتھ مضبوط کر، قوت میں اضافہ فرما۔

ثم لم ینشب ای لم یلبث یعنی زیادہ زندہ نہ رہے، وفات میں زیادہ دیر نہ لگی اور مدد کا موقع نہ مل سکا۔ بعض کتب سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بلال رضی اللہ عنہ کو ستایا جاتا تھا تو یہ دیکھ کر رحم کھاتے تھے یعنی اس ابتدائی دور میں زندہ تھے جس وقت قریش کی سختیاں بڑھیں اس وقت یہ انتقال فرما چکے تھے۔

أو مخرجیّ ھم کا قصہ بعینہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بھی پیش آیا کہ جب اہل مکہ آپ کے قرآن پڑھنے سے مانع ہوئے یہ کہہ کر کہ اس کی ہمارے نوجوان اور عورتیں متاثر ہوتی ہیں اس لئے ہم پڑھنے نہ دیں گے تو آپ نے ترک وطن کا فیصلہ کرلیا اور ہجرت کے خیال سے نکل پڑے راستہ میں ابن الدغنہ مل گیا، پوچھا ابوبکر کہاں چلے؟ فرمایا اہل مکہ مجھے رہنے نہیں دیتے تو ابن الدغنہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لئے بعینہ وہ تمام الفاظ کہے جو سیدہ طاہرہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کہے تھے اور کہا تم میری ضمان میں کہ واپس چلو میں تم کو مکہ چھوڑ کر نہ جانے دوں گا، مجبوراً حضرت صدیق واپس ہوئے، یہ ابن الدغنہ ساتھ ساتھ تھا، اس نے آکر اعلان کردیا کہ یہ ابوبکر میرے امان میں ہیں، اگر کوئی ان سے کچھ کہے گا تو میں اس سے بدلہ لینے پر مجبور ہوں گا، صدیق اکبر مکہ تو گئے مگر ان سے پھر صبر نہ ہوسکا اور پھر قرآن پاک کی تلاوت شروع کردی، لوگوں نے ابن الدغنہ سے شکایت کی تو حضرت صدیق نے اعلان کردیا کہ میں ابن الدغنہ کی امان سے نکل کر اللہ کی امان میں آگیا۔

قَالَ ابْنُ شِهَابٍ وَاَخْبَرَنِی اَبُوْسَلَمَةَ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اَنَّ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ

ابن شہاب نے کہا کہ مجھے ابو سلمہ بن عبد الرحمن نے خبر دی کہ حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہ وحی کے موقوف ہوجانے کے ایام کی حدیث بیان فرمارہے تھے

الْاَنْصَارِیَّ قَالَ وَھُوَ یُحَدِّثُ عَنْ فَتْرَةِ الْوَحْیِ فَقَالَ فِیْ حَدِیْثِهٖ بَیْنَا اَنَا اَمْشِیْ

کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حدیث بیان فرماتے سنا کہ میں ایک مرتبہ جارہا تھا کہ اچانک میں نے آسمان میں ایک آواز سنی، سو نے اپنی نگاہ اٹھا کر

اِذْ سَمِعْتُ صَوْتًا مِّنَ السَّمَآءِ فَرَفَعْتُ بَصَرِیْ فَاِذَا الْمَلَكُ الَّذِیْ جَآءَنِیْ بِحِرَآءٍ جَالِسٌ

دیکھا تو اچانک وہی فرشتہ جو میرے پاس حرا میں آیا تھا آسمان و زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھا ہے، میں اس سے خوف زدہ ہوکر واپس ہوا اور

عَلٰی کُرْسِیٍّ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ فَرُعِبْتُ مِنْهُ فَرَجَعْتُ فَقُلْتُ زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ فَاَنْزَلَ

میں نے کہا مجھے کمبل اوڑھادو، پھر باری تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی یاایھا المدثر قم فانذر وربك فکبر وثیابك فطھر والرجز فاھجر

اللّٰهُ تَعَالٰی یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ،

(اے کملی والے! کھڑے ہو جائیے اور لوگوں کو خوف دلائیے، اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کیجئے اور اپنے کپڑوں کو پاک کیجئے اور بتوں سے علٰحدہ رہئے جیسا کہ اب تک علٰحدہ رہے ہو)

اس سے معلوم ہوا کہ جس میں مکارم اخلاق ہوں لوگ اسے نکالا نہیں کرتے، اسی بنا پر اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو اچنبھا ہوا کہ مجھ جیسے آدمی کو یہ نکال دیں گے مگر آئندہ کے واقعات نے ثابت کردیا کہ ورقہ نے صحیح اندازہ لگایا تھا، حالات نے اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت پر مجبور کردیا اور آپ نے مدینہ کو ہجرت فرمادی۔

قولہ قال ابن شھاب، یعنی ابن شہاب کچھ زیادہ بیان کرتے ہیں، دوسری سند سے، نیچے کی سند ایک ہے، ابن شہاب کے آگے وہاں عروہ عن عائشة ہے اور یہاں ابو سلمہ عن جابر ہے، اس میں یہ بھی بیان کیا جابرؓ نے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں چلا جارہا تھا کہ اچانک میں نے ایک آواز سنی کہ کوئی یا محمدؐ کہہ کر مجھے پکار رہا ہے، میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو میں نے اسی ملک کو دیکھا جو حرا میں اقرأ لے کر اترا تھا، اس میں یہ تصریح نہیں کہ کس صورت اور کس حالت میں دیکھا، اللہ تعالیٰ نبی کے دل میں ڈال دیتا ہے کہ یہ فرشتہ ہے۔

فرعبت یعنی میں مرعوب ہوگیا اور گھر لوٹ کر زملونی زملونی کہا، بخاری کی کتاب التفسیر میں بروایت یونس دثرونی ہے اسکا حوالہ اس غرض سے دیا کہ یہ لفظ آیت یاایھا المدثر کے موافق ہے، گو مراد دونوں کی ایک ہی ہے۔

فانزل اللہ تعالیٰ یاایھا المدثر قم فانذر وربك فکبر اے بدن چھپانے والے اٹھو اور اللہ کا نام لے کر کھڑے ہوجاؤ اور ہدایت کرو دنیا کو، یا محمدؐ نہیں کہا مدثر کہا، اس میں اشارہ ہے کہ تمہارا یہ کام نہیں کہ لپٹے رہو، تمہارے لئے بڑا میدان

. . . .

ہے بڑا کام ہے جسے تمھیں انجام دینا ہے' اس ادا کو پسند بھی فرمایا کر خطاب اسی سے کیا مگر متنبہ بھی کر دیا کہ تمھارا کام آرام کرنا نہیں ہے' دوسرا کام ہے'
انذار ہر تخویف کو نہیں کہتے بلکہ آئندہ ہونے والے خطرات پر متنبہ کرنے کو کہتے ہیں' یعنی انھیں اللہ کے عذاب سے جو مستقبل میں آنے والا
ہے اور دوزخ سے ڈراؤ .

وربك فكبر ای **فعظّم** یعنی اپنے رب کی تعظیم کرو قولاً و فعلاً و دعوۃً یعنی ہر طرح اپنے مالک کی تعظیم کرو . کَبّر میں دو
چیزیں ہیں (۱) خود تعظیم کرو (۲) دوسروں کو تعظیم کا سبق دو' چونکہ یہاں مفعول مذکور ہے اس لئے لغوی معنی ہی مناسب ہیں ' نہ قول اللہ اکبر
کہ وہ لازم ہے' یہی معنی اکثر سلف سے مروی ہیں' بعض نے تکبیر تحریمہ مراد لی ہے' میں کہتا ہوں کہ وہ بھی ایک فرد ہے' معنی عام بہتر ہے کیونکہ یہی
معنی انذار کے موافق ہے' ڈرے گا وہی جس کے دل میں عظمت رب ہو .

وثيابك فطهّر' یعنی اپنے کپڑوں کو پاک رکھو' پاک کرو ترجمہ مناسب نہیں' یہ آئندہ کے لئے تنبیہ ہے' رسول علیہ السلام
نجس کپڑے نہیں پہنتے تھے کہ پاک کرنے کا حکم مل رہا ہو' کپڑے تو پاک ہی تھے مگر آئندہ کے واسطے ہدایت فرمائی جارہی ہے کہ مزید اہتمام کیا جائے
موسیٰ علیہ السلام جب شرف ہمکلامی سے نوازے جارہے تھے تو غیر مدبوغ جلد کے جوتے پہنتے تھے اس لئے حکم ہوا **فاخلع نعليك** جوتے اتار
دیجئے' اس سے اندازہ ہوا کہ وحی الٰہی نجس کپڑے والوں کے پاس نہیں آتی .

بعض نے ثیاب سے نفس مراد لیا ہے کہ نفس کو رذائل سے پاک رکھئے' ممکن یہ معنی بھی ہیں لیکن ظاہر پہلے معنی ہیں' پہلے انذار کا پھر
تعظیم کا حکم دیا' پھر ظاہری و باطنی پاکیزگی کا حکم دیا کیونکہ طاہر ہی کے پاس اللہ کی رحمت آتی ہے' اس کی نظیر یہ ہے کہ فرمایا: **نظفوا افنيتكم** .
اپنے گھروں کی فنا (کمپونڈ) کو صاف رکھو' فنا' گھر کے آگے جو صحن یا چبوترہ ہوتا ہے اس کو کہتے ہیں' مدینہ کے یہودی کاشت کرتے تھے' دروازہ
کے باہر کھاد وغیرہ' کوڑا کرکٹ ڈھیر رکھتے تھے اس سے دروازے گندے رہتے تھے' مسلمان کاشتکاروں کی تنبیہ کے لئے فرمایا تم اپنے گھروں کا
باہری صحن صاف رکھو' فقہاء نے لکھا ہے کہ جب فنا' کا صاف رکھنا ضروری ہے تو گھر کی صفائی بطریق اولیٰ مطلوب ہوگی' اسی طرح جب کپڑوں
کے پاک رکھنے کا حکم دیا تو باطن کی صفائی کا حکم بطریق اولیٰ ہوگا' یعنی ثیاب کا مدلول نفس نہیں' البتہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ جب کپڑے کی طہارت کا
حکم ہے تو نفس کی طہارت کا بطریق اولیٰ ہوگا .

قولہٗ **والرجز فاهجر**' بخاری حدیث لائیں گے کہ رجز سے مراد اوثان ہیں' یعنی بتوں کو چھوڑے رکھئے" بت پرستی حضور صلی اللہ
علیہ وسلم سے کبھی ثابت نہیں اسلئے " چھوڑ دیجئے " ترجمہ بالکل صحیح نہیں' مگر ہمارے نزدیک یہ تفسیر مرجوح ہے' راجح دوسری تفسیر ہے' رُجز بمعنی
رِجز (عذاب) کے ہے' یعنی کوئی کام ایسا نہ کیجئے جو باعثِ عذاب الٰہی ہو' یا رِجس کے معنی میں ہو' یعنی ہر چیز کو پاک رکھئے' حاصل یہ کہ

فَحَمِیَ الْوَحْیُ وَتَتَابَعَ ، تَابَعَہٗ عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ یُوْسُفَ وَاَبُوْصَالِحٍ وَتَابَعَہٗ

اس کے بعد وحی پے در پے آنے لگی ، امام بخاری نے فرمایا کہ عبد اللہ بن یوسف و ابو صالح نے یحیٰی بن بکیر کی متابعت کی ہے اور عقیل کی متابعت

ھِلَالُ بْنُ رُدَّادٍ عَنِ الزُّھْرِیِّ وَقَالَ یُوْنُسُ وَمَعْمَرٌ بَوَادِرُہٗ "

ہلال بن رداد نے زہری سے کی ہے اور یونس و معمر کی روایت میں **یرجف فؤادہ** کی جگہ **یرجف بوادرہ** آیا ہے۔

انذار کا حکم ہوتا ہے مگر وہ جب موثر ہوگا جب سے اس کی تعظیم دل میں ہوگی۔

امام غزالی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی کہے کہ اسے مت کھانا اس میں زہر ہے اور خود اس سے کھانے لگے تو نصیحت کون قبول کرے گا ایسی ہی حالت منذر کی ہے کہ انذار جب ہوگا جب اس کا دل عظمت الٰہی سے لبریز ہو اور میل کچیل سے صاف ہو، کیسا عمدہ نسق ہے اور کس قدر بہتر نظم ہے۔

قولہ **فحمی الوحی** ، وحی گرم ہوگئی یعنی بکثرت آنے لگی ، جب کوئی چیز بکثرت آنے لگے اور پوری شدت سے آئے تو کہتے ہیں گرم ہوگئی ، یہی اصل ترجمہ ہے اور یہ مقابل ہے **فتر الوحی** کے ، فتور کے مقابلہ میں حمی بولے۔

قولہ **تتابع** یعنی پے در پے آنے لگی ، یعنی بلا انقطاع متعدد بہ آنے لگی ، مسلم میں جابر کی حدیث علٰحدہ کرکے لائے ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے مدثر کا نزول ہوا مگر اس روایت نے شبہہ دور کر دیا اور دونوں میں تطبیق ہوگئی ، صدیقہ رضی اللہ عنہا کا فرمانا بھی صحیح کہ **اقرأ** پہلے نازل ہوئی اور جابر رضی اللہ عنہ کا فرمانا بھی صحیح کہ مدثر پہلے نازل ہوئی ، یعنی بعد فترۃ پہلے وہی نازل ہوئی ایک مرسل حدیث فتح الباری میں ہے کہ سب سے پہلے نزول فاتحہ کا ہوا ، اور میرے نزدیک اس کا مضمون دل کو لگتا ہے اور گمان یہ ہوتا ہے کہ جس مجلس میں **اِقرأ** نازل ہوئی شاید اسی مجلس میں سورۂ فاتحہ بھی آئی کیونکہ مرسل میں **ماذا أقرأ** بھی ہے ، معلوم ہوا کہ پہلے **اقرأ** کہا گیا ہوگا ، تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے **اِقرأ** کی پانچ آیتیں اتریں پھر آپ نے پوچھا **ماذا اقرأ** تو فرشتے نے کہا : قل **بسم اللہ الرحمن الرحیم ، الحمد للہ رب العلمین** الخ یعنی اول نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اول مجلس جس میں اِقرأ اتری تھی اسی میں فاتحہ بھی اتری ، اب اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اسلام میں کوئی وقت بغیر فاتحہ کے نہیں تھا اور نماز کسی وقت فاتحہ سے خالی نہ تھی ، درایت بھی اسی کو ترجیح دیتی ہے کیونکہ اسے ام الکتاب کہا گیا ہے یعنی یہ اصل ہے جیسے تخم اور سارا قرآن اس کی فرع ہے جیسے درخت ، فاتحہ میں اجمال ہے اور سارا قرآن اس کی تفصیل ہے ، ترتیب طبعی بھی اسی کی مقتضی ہے کہ پہلے بیج ہو اور بعد کو شجرہ ، لہٰذا اگر مرسل کو تسلیم کریں تو کچھ بعید نہیں۔

تابعہ ، ضمیر کو مقام دیکھ کر راجع کیا جاتا ہے ، مرجع کو طبقہ دیکھ کر نکالتے ہیں ، عبد اللہ ابن یوسف اور ابو صالح یحیٰی کے

۴ ۔ حَدَّثَنَا مُوسَی بْنُ اِسْمَاعِیْلَ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْعَوَانَةَ قَالَ حَدَّثَنَا مُوسَی بْنُ

ہم سے بیان کیا موسیٰ بن اسماعیل نے، کہا ہم سے بیان کیا ابو عوانہ نے، کہا ہم سے بیان کیا موسیٰ ابن ابی عائشہ نے

اَبِی عَائِشَةَ قَالَ حَدَّثَنَا سَعِیْدُ بْنُ جُبَیْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا

کہا ہم سے بیان کیا سعید ابن جبیر نے، انھوں نے سنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں (اے پیغمبر) جلدی سے

فِیْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ

وحی کو یاد کر لینے کے لئے اپنی زبان کو نہ ہلایا کرو، ابن عباس نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن اترنے سے (بہت) سختی

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُعَالِجُ مِنَ التَّنْزِیْلِ شِدَّةً وَكَانَ مِمَّا یُحَرِّكُ

ہوتی تھی اور آپ اکثر اپنے ہونٹ ہلاتے تھے (یاد کرنے کے لئے) ابن عباس نے (سعید سے) کہا میں تجھ کو بتاتا ہوں ہونٹ

شَفَتَیْهِ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا فَاَنَا اُحَرِّكُھُمَا لَكَ كَمَا كَانَ

ہلا کر جیسے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ان کو ہلاتے تھے۔ اور سعید نے (موسیٰ سے) کہا میں تجھ کو بتاتا

رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُحَرِّكُھُمَا وَقَالَ سَعِیْدٌ اَنَا اُحَرِّكُھُمَا

ہوں ہونٹ ہلا کر جیسے میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ہلاتے دیکھا، پھر

كَمَا رَاَیْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا یُحَرِّكُھُمَا فَحَرَّكَ شَفَتَیْهِ

سعید نے اپنے دونوں ہونٹ ہلائے

طبقہ کے ہیں یعنی لیث ابن سعد (امام مصر) سے یہ دونوں روایت کرتے ہیں۔

قولہ تابعہ ھلال عن الزھری، بتایا کہ یہ عقیل کے متابع ہیں، یونس اور معمر دو اور متابع بیان کر دئے تو اب چار تلمیذ زہری کے ہوگئے، فرق یہ ہے کہ عقیل و ہلال ایک طرح روایت کرتے ہیں مگر یونس اور معمر نے بجائے فؤادہ کے بوادرہ کہا، یہ جمع بادرۃ کی ہے اور بادرہ اس گوشت کو کہتے ہیں جو منکب اور عنق کے درمیان ہوتا ہے، خوف سے یہ لحمہ کانپنے لگتا ہے، اسے بتلا رہے ہیں۔

قولہ حدثنا موسی ابن اسماعیل، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما شان نزول بیان کرتے ہیں کہ تنزیل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تکلیف و شدت لیتے تھے (معالجہ: کسی چیز کا مشقت کے ساتھ لینا) یعنی حضور سختی و مشقت محسوس کرتے تھے، یہ شدت نزول وحی کی تھی۔ وکان ممّا یحرّک میں ممّا بمعنی ربّما ہے اور کثرت سے ایسا آتا ہے یعنی کثیرًا مّا

فَاَنْزَلَ اللّٰہُ تَعَالٰی لَاتُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ط اِنَّ

ابن عباس نے کہا تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری، وحی کو یاد کرنے کے لئے اپنی زبان نہ ہلایا کرو، قرآن کا تجھکو

عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ، قَالَ جَمْعُهٗ لَهٗ فِیْ صَدْرِكَ وَتَقْرَأَهٗ ،

یادکرا دینا اور پڑھا دینا ہمارا کام ہے، ابن عباس نے کہا یعنی تیرے دل میں جما دینا اور پڑھا دینا (پھر

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ، قَالَ فَاسْتَمِعْ لَهٗ وَاَنْصِتْ ، ثُمَّ

جو اللہ نے فرمایا) جب ہم پڑھ چکیں اس وقت تو ہمارے پڑھنے کی پیروی کر ابن عباس نے کہا اس کا مطلب

اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ ، ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا اَنْ تَقْرَأَهٗ ، فَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی

یہ ہے کہ خاموشی کے ساتھ سنا کرو (پھر یہ جو فرمایا) ہمارا کام ہے اس کا بیان کر دینا یعنی تجھ کو پڑھا دینا، پھر ان آیتوں کے اترنے کے

اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ ذٰلِكَ اِذَا اَتَاهُ جِبْرِیْلُ اسْتَمَعَ فَاِذَا انْطَلَقَ جِبْرِیْلُ

بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کرتے (کہ)، جب جبریل آپ کے پاس آکر قرآن سناتے تو آپ (چپکے) سنتے رہتے، جب وہ چلے جاتے

قَرَأَهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَمَا قَرَأَهٗ ،

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح قرآن پڑھ دیتے جیسے حضرت جبریل نے پڑھا تھا۔

یُحَرِّكُ، بعض روایات میں ہے كان یحرك لسانه وشفتیه، مراد یہ ہے کہ آپ بمقتضائے بشریت جبریل کے ساتھ ساتھ پڑھتے تھے تاکہ بھول نہ جائیں، تو محفوظ کرنے کے لئے ایسا کرتے تھے، اس سے اور بھی شدت پیدا ہوتی تھی، اول شدت وحی کی، دوم مشقت یاد کرنے اور تحریک لسان کی، اس پر اللہ نے تیسیر فرمائی اور فرمایا لا تحرك به لسانك لتعجل به الخ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے ہونٹ ہلا کر دکھلائے کہ ایسے حرکت دیتے تھے، سعید ابن جبیر جو ابن عباس کے شاگرد ہیں وہ بھی تحریک کرتے تھے اتنا یاد رکھو کہ ابن عباس اس واقعہ کے وقت غالباً پیدا بھی نہ ہوئے تھے، کیونکہ ان کی پیدائش ہجرت سے تین سال پہلے تو اسے یہ کیونکر ضبط کرتے، تو یہ حدیث مراسیل صحابہ سے ہے، نیز صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث بھی مرسل ہے مگر مراسیل صحابہ باتفاق جمہور اہل سنت مقبول ہیں لان الصحابة كلهم عدول، صحابی کا تابعی سے روایت کرنا نادر ہے اور ایسے مقام پر راوی نام ظاہر کر دیتا ہے اب یہ بھی احتمال ہے کہ ابن عباس نے کسی صحابی سے سنا ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی ان کے سامنے یہ قصہ بیان فرمایا ہو، حافظ نے مسند ابی داؤد طیالسی سے ایک روایت نقل کی ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ خود حضورؐ نے ابن عباس سے واقعہ بیان کیا ہے، اب یہ متصل ہوگئی۔

لاتحرك ' یعنی بالکل ساکت رہ کر سنو لتعجل بہ ' اس غرض سے کہ جلدی یاد کر لو زبان مت ہلاؤ ' آگے فرمایا کہ تمھارے زبان ہلانے کی ضرورت نہیں' ہمارے ذمہ اس وحی کا تمھارے سینے میں جمع کرنا ہے' یہ ابن عباس کی تفسیر کے مطابق ہے ۔ صدرك فاعل ہے یعنی ہمارے ذمہ ہے کہ آپ کا سینہ جمع کرلے وحی کو' بعض میں فی صدرك ہے اور یہ واضح ہے ۔

وتقرأه ' یعنی یہ بھی ہمارے ذمہ ہے' تم اس وقت مت پڑھو ۔

فاذاقرأناه میں نسبت قرأت کی اپنی طرف کی کیونکہ اصل موحی اللہ ہے ۔

فاتبع قرآنه ' قرآن بمعنی قراءۃ ہے' یعنی آپ زبان نہ ہلائیں اور خاموش رہیں اور کان لگائیں' انصات بمعنی مطلق سکوت ہے عند الجمہور' مگر محققین کے نزدیک انصات' سکوت للاستماع کو کہتے ہیں' کہا جاتا ہے انصت یعنی سکت سکوت مستمع ۔ مفصل بحث ان شاء اللہ قراءۃ خلف الامام کے موقع پر آئے گی ۔

ابن عباس کی اس تفسیر سے ہمارے لئے بڑی حجت نکلی ہے' کیونکہ فرمایا اتباع کرو' اس سے معلوم ہوا کہ اتباع ساتھ ساتھ پڑھنا نہیں' بلکہ انصات واستماع اتباع ہے' شریعت کا محاورہ اتباع میں یہی ہے ۔

ثم ان علینا بیانه ' ای ثم ان علینا ان تقرأه ' یہ ان تقرأه تفسیر ہے یعنی اس کا پڑھنا ہمارے ذمہ ہے' مطلب یہ کہ آپ اسے پڑھیں یہ ہمارے ذمہ ہے ۔ شراح کہتے ہیں کہ یہاں راوی سے کچھ تقدیم وتاخیر ہوگئی ہے' یہ تفسیر بیانه کی نہیں قرآنه کی ہے' بیانه سے یہاں مراد اس کا کشف و ایضاح ہے' یعنی اس کا وضوح اور تبیین بھی ہمارے ہی ذمہ ہے' بعض نے کہا کہ بیانه سے مراد ہے آپ کا لوگوں سے قرآن کا بیان کرنا اور تبلیغ بھی ہمارے ذمہ ہے' میرے نزدیک معنی ثانی زیادہ مناسب ہے اور آیت لتبين للناس مانزل اليهم کے مناسب ہے اور قرآن کی تفسیر میں ایک آیت کا نظم دوسری آیت سے جتنا قریب ہو اتنا ہی بہتر ہے' اب ان تقرأه میں تقدیم وتاخیر کا قول بھی نہ کرنا پڑے گا اور مطلب یہ ہوگا کہ ان تقرأه على الناس ہمارے ذمہ ہے' اس محذوف سے مراد ابن عباس معلوم ہوگئی' پہلے تقرأه سے حضور کا خود پڑھنا مراد ہے اور دوسرے سے قراۃ علی الناس اس آیت کے بعد آپ نے پڑھنا چھوڑ دیا اور اسی کے موافق ہے دوسری آیت ولا تعجل بالقرآن من قبل ان يقضى اليك وحيه وقل رب زدني علماً (سورہ طٰہٰ) جبریل کے آنے پر آپ صرف استماع فرماتے اور ان کے جانے کے بعد سب اسی طرح بعینہ پڑھنے لگتے جس طرح جبریل لائے تھے' یہ آپ کا ایک معجزہ تھا' کیونکہ اس وقت پڑھا نہیں صرف ایک بار سن کر محفوظ کرلیا اور اسی طرح سنا دیا' یہ محض اللہ کی طرف سے ہے ۔

حدیث تو ختم ہوگئی مگر ربط آیات میں اس قدر اشکال واختلاف ہے کہ شاید تمام قرآن میں ربط آیات میں اتنا اشکال کہیں نہیں' سورہ قیامہ کی آیت ہے مگر سورت سے کچھ تعلق نہیں معلوم ہوتا' لا اقسم سے آخر تک پڑھو ايحسب الانسان ان

. . . .

لَن نجمعَ عظامَہ ' کیا انسان سمجھتا ہے کہ ہم اس کے چورے اور ہڈیوں کو جمع نہ کریں گے ؟ بَلٰی ضرور کریں گے ! قادرین علےٰ اَن نسوّیَ بنانہ ' یعنی ہم تو اس پر بھی قادر ہیں کہ اس کے پور پور کو اسی طرح کھڑا کر دیں جیساکہ پہلے تھا ' چونکہ بنان کی رگیں بہت باریک ہوتی ہیں اور ان کی درستگی بظاہر مشکل معلوم ہوتی ہے اس لئے ان کا ذکر کیا کہ ہمارے لئے کچھ بھی مشکل نہیں ' بل یُرید الانسانُ لیفجرَ امامَہ ' یعنی دراصل گمان وان کچھ نہیں بلکہ انسان یہ چاہتا ہے کہ فسق وفجور کرتا چلا جائے اور آئندہ کا کچھ کھٹکا نہ رہے جزا وسزا کا —

یسئل ایان یوم القیامۃ ٹلانے کے لئے استہزاءً کہتا ہے کہاں ہے یوم قیامت ' مطلب یہ کہ یہ سب ڈھکوسلے ہیں ' واقعہ کچھ نہیں ' فاذا برق البصر پس جب آنکھیں چندھیا جائیں گی وخسف القمر اور چاند بے نور ہو جائے گا ' اِدھر اس کی نگاہ بے نور ہو گی اُدھر چاند بے نور ہوگا وجمع الشمس والقمر یعنی سب کرات ٹکرا دئے جائیں گے اور جمع کر دئے جائیں گے ' بعض نے کہا کہ بے نور ہونے میں دونوں (شمس وقمر) یکساں ہوں گے ' فرمایا اذا الشمسُ کوّرت ' تکویر عمامہ کے پیچ دینے کو کہتے ہیں اور جب لپیٹ دیا جائے گا ' تو نور ختم ہو جائے گا یقول الانسان یومئذٍ این المفرّ پناہ گاہ تلاش کرے گا مگر کہاں پائے گا کلّا لا وزرَ الیٰ ربّك یومئذ المستقرّ ' ہرگز جا نہیں سکتا ' کہیں ٹھکانہ نہیں ' حاضری تو رب ہی کے دربار میں دینی ہے ینبّؤُ الانسان یومئذٍ بما قدّمَ واخر جتنے اعمال واقوال وافعال کئے ہیں وہ سب تیرے سامنے لاکر رکھ دئے جائیں گے ' اگلے پچھلے سب موجود ہوں گے ' بل الانسان علی نفسہٖ بصیرۃ ولو القی معاذیرہ یعنی یہ تو ضابطہ ہے ورنہ ہر انسان کو ساری چیزیں خود ہی نظر آئیں گی ' بعض نے کہا کہ اب بھی یہ انسان اپنے اچھے برے کو سمجھتا ہے گو عذر کرتا رہے مگر کوئی عذر مقبول نہ ہوگا ' اب فرماتے ہیں لا تحرك بہ لسانك لتعجل بہ الخ اس سے کوئی جوڑ نہیں معلوم ہوتا ' آگے چل کر پھر قیامت کا ذکر ہے کلّا بل تحبّون الخ سے یعنی دنیا کو محبوب رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو ' آگے آخرت کا بیان ہے ' اس کی پہلی منزل یہاں سے شروع ہوتی ہے کلّا اذا بلغت التراقی یعنی جب سانس ہنسلی میں پہونچ جائے گی وقیل مَن راق اب کون جھاڑ پھونک کرنے والا ہے والتفت السّاق بالسّاق یعنی اپنی پنڈلی پنڈلی پر دے مارتا ہے جانکنی کی شدت سے الیٰ ربّك یومئذ المساق اب تجھے رب کی طرف جانا ہے ' یہ موت مقدمۂ آخرت ہے ' آگے آخرت پر متنبہ فرماتے ہیں فلا صدّق ولا صلّٰی ربط کے اعتبار سے یہ مشکل ترین مقام ہے حتیٰ کہ بعض روافض جو غالی ہیں اس آیت کو لے کر کہتے ہیں کہ اگر کلام الٰہی ہوتا تو ایسا بے ربط کیوں ہوتا ' معلوم ہوا کہ درمیانی چیزیں کچھ رہ گئی ہیں (روافض میں تین گروہ ہو گئے ہیں قرآن کے بارے میں ' ایک فریق جو بہت کم ہے کہتا ہے کہ کمی زیادتی کچھ نہیں ہوئی ' ایک کہتا ہے کہ کمی ہو گئی ہے اور جو ہے وہ قرآن ہی ہے ' جمہور کا قول یہی ہے ' تیسرا فریق زیادت کا بھی قائل ہے ' ہمارے یہاں کے اکثر وہ ہیں جنھیں وثوق نہیں ہے اسکے

قرآن ہونے پر اور اسے بیاض عثمانی کہتے ہیں، گو زبان سے تقیۃً اسے قرآن کہتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ امام غائب جو ان کے بارہویں امام ہیں وہ غار میں اصلی قرآن لئے بیٹھے ہیں) امام رازی نے اور دیگر مفسرین نے بحثیں کی ہیں مگر انصاف یہ ہے کہ شافی جواب اکثر کتابوں میں نہیں ملتا، حافظ نے فتح الباری میں بحث کی ہے اور رازی کے کلام کو پسند نہیں کیا ہے، علامہ ابن کثیر نے جو کلام نقل کیا ہے وہ میرے نزدیک اوروں سے بہتر ہے، حضرت شاہ صاحب کی بھی ایک تقریر ہے اسے بھی ان شاء اللہ بیان کروں گا۔

امام رازیؒ نے ایک قول قفال مروزی کا جو کبارِ شوافع میں ہیں نقل کیا ہے، انھوں نے شانِ نزول سے قطع نظر نظم قرآن پر منطبق کیا ہے، کہتے ہیں ینبؤ الانسان الخ میں بتلایا جا رہا ہے کہ قیامت کے دن انسان کو جب بتلائیں گے کہ تو نے یہ یہ کیا ہے تو اس کے ہاتھ میں کتاب دے دی جائے گی اور کہا جائے گا اقرأ کتابك الخ جب وہ پڑھے گا اپنی کتاب کو تو تلجلج ہوگا، زبان لڑکھڑائے گی تو تیز تیز پڑھنے لگے گا اور گھبراہٹ میں ایسا ہی ہوتا ہے، اس وقت یہ حکم ہوگا لا تحرك به الخ یعنی جلدی مت کر جو لکھا ہے وہ سب تو پڑھ لیگا اور اس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے، یہ توجیہ قفال نے کی ہے مگر یہ توجیہ بالکل خلاف ہے شانِ نزول کے بھی اور انطباقِ آیات کے بھی، رازی نے دعویٰ کیا ہے کہ جب یہ آیات سورۂ قیامہ کی نازل ہوئی ہوں گی تو حضور نے پڑھنے میں تعجیل کی ہوگی لہٰذا اسی وقت درمیان میں تنبیہ کر دی گئی جیسے تقریر میں میں تنبیہ کروں کہ بھائی یاد پھر کرنا اس وقت تو کان لگا کر سن لو، تو واقعۃً یہ تنبیہ ہے مگر دیکھنے والا کلام کا ٹکڑا سمجھ گیا، اسی طرح یہاں اصل مقصود اس کا بیان کرنا نہیں بلکہ درمیانی چیز جو کہہ دی گئی صرف تنبیہ کے لئے، رازی نے یہ احتمال نکالا ہے مگر اس کے لئے نقل کی ضرورت ہے اور اس صورت کا پیش آنا ثابت کرنا ہوگا، ان سب میں بہتر ابن کثیر کا جواب ہے کہ ہم نے قرآن کا تتبع کیا تو معلوم ہوا کہ قرآن کتاب کا لفظ بولتا ہے تو کبھی وہ کتاب مراد لیتا ہے جو محشر میں دی جائے گی اور کہا جائے گا اقرأ کتابك اور کبھی کتاب بول کر قرآن کو مراد لیتا ہے اور ثانی پر عمل کرنے یا نہ کرنے پر اول یعنی کتاب محشر مرتب ہے تو قرآن کی عادت یہ ہے کہ جب کبھی ایک کا ذکر کرتا ہے تو مناسبت سے دوسری کا بھی ذکر کرتا ہے، مثلاً سورۂ کہف میں ہے ووضع الکتٰب یعنی کتاب سامنے رکھ دی جائے گی اور تم مجرموں کو دیکھو گے کہ وہ ڈرتے ہوں گے تو کہیں گے افسوس یہ کیسی کتاب ہے کہ اس نے کوئی بڑی چھوٹی چیز چھوڑی ہی نہیں سب لے لی ووجدوا ما عملوا حاضرًا یعنی سب کیا ہوا سامنے ہوگا اور آپ کا رب کسی پر ظلم نہیں کرے گا، یہ کتاب کتاب اعمال ہے، اس کے بعد آدم علیہ السلام کا قصہ مناسبت سے ذکر کیا، اس کے بعد فرمایا ولقد صرّفنا للناس فی ھٰذا القراٰن من کل مثل کہ ہم نے انسانوں کے لئے ہر قسم کی مثالیں اس قرآن میں بیان کر دی ہیں مگر وہ بہت ہی مجادل ہے، یہ دوسری کتاب یعنی قرآن کا بیان ہوا، تو دیکھو یہاں دونوں کتابوں کا ذکر کیا، کیونکہ دونوں میں مناسبت ہے اس لئے کہ ترتب

. . . .

ا ے

کتاب محشر کا اسی کتاب قرآن پر ہے' اسی طرح سورۂ بنی اسرائیل میں ہے یوم ندعو کل اناس بامامھم فمن اوتی کتابہ بیمینہ الخ یہ کتاب اعمال کا ذکر تھا' درمیان میں کچھ دوسری چیزیں مناسبت سے ذکر فرمائیں' پھر فرمایا ولقد صرفنا۔الی۔من کل مثل ' اسی طرح طٰہٰ میں ہے یعلم مابین ایدیھم وماخلفھم — الی — وکذلک انزلناہ قرانا عربیا — الی — رب زدنی علما ۔ ان تینوں مقام پر دونوں کتابوں کا یعنی کتاب اعمال اور کتاب احکام کا ذکر ساتھ ساتھ ہے' خواہ بالکل متصلاً خواہ کچھ دور چل کر ، تو اسی طرح سورۂ قیامہ میں بھی یہی کیا ہے کہ پہلے کتاب اعمال کا ذکر کیا اور بعد کو کتاب احکام (قرآن) کا ابن کثیر کہتے ہیں کہ اتنی مناسبت تناسب آیات کیلئے کافی ہے' یہ تفسیر نسبتاً اچھی ہے ۔

سیدی انور شاہ صاحب کی تقریر کا حاصل سمجھنے سے پہلے ایک مقدمہ سمجھ لو کہ متکلم کی مرادیں کبھی دو ۲ ہوتی ہیں' اول ماسیق لہٗ الکلام ' ثانی وہ جو مع قطع النظر عن تسلسل الکلام سمجھی جاتی ہے' خواہ ماسیق لہٗ الکلام ہو یا نہ ہو' شاہ صاحب کہتے ہیں کہ ماسیق لہٗ الکلام ہی مراد اول ہے یعنی اولاً و بالقصد وہی مراد ہوتا ہے اور جو چیز تسلسل عبارت اور قصد متکلم سے قطع نظر کرکے خارج سے سمجھ میں آجائے وہ مراد ثانوی ہے ۔

اس مقدمہ کے بعد یوں سمجھو کہ یہاں بھی دو مرادیں ہیں' اول جو نظم قرآن کہتا ہے اور ثانوی جو حدیث سے سمجھ میں آتی ہے ثانوی مراد یہاں ظاہر ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے مگر جب تسلسل کلام دیکھیں تو وہاں کسی چیز کا ذکر نہیں' اس لئے مراد اول میرے نزدیک یہ ہے کہ جب معاند ایان یوم القیامۃ استہزاءً کہتا تھا اور عادت کفار تھی کہ آپ کو دق کرنے کے لئے سوال کیا کرتے تھے کہ کیوں جناب! کب آئے گی؟ کس دن آئے گی؟ چنانچہ قرآن نے جابجا ان کے اعتراضات کے جوابات دئے ہیں' حضور ﷺ نے فرمایا آئیگی تو ضرور مگر تعین وقت اللہ کا کام ہے' یہاں جب فرمایا کہ قیامت آئے گی تو انھوں نے پوچھا کب آئے گی ایان یوم القیامۃ ؟ تو اس کا کچھ جواب دیا اور علامات بتلائیں فاذا برق البصر — الی — بما قدم واخر تو ممکن تھا کہ جب جواب کھول کر نہیں دیا تو حضور کچھ تعجیل فرماتے اور جواب دینا چاہتے اس لئے فرمایا لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ الخ یعنی جتنا ہم نے بتلا دیا اتنا ہی کہدو' جتنا ہم مناسب سمجھیں گے نازل کریں گے ان علینا جمعہ وقرانہ ' قرآن کا پڑھنا' حفظ کرنا' جمع کرنا جیسا مناسب ہوگا ہم ویسا ہی کریں گے اور اسی قدر نازل کریں گے جس قدر مناسب ہوگا' تو یہ مراد اولی ہے کیونکہ تسلسل عبارت یہی بتلاتا ہے کہ انھیں اشیاء سے متعلق ہے مگر چونکہ حدیث میں آگیا تو یہ مراد ثانوی ہوگی' شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں ایسا فرق کرتا ہوں ۔ تلویح کے حاشیہ پر ایک مقام پر ایسا ہی کیا گیا (یعنی تقسیم کی گئی ہے مراد اولی اور ثانوی کی طرف) یہ اور توجیہات سے اقرب ہے ۔

. . . .

اب ایک چیز یہ اور پیش کرتا ہوں، میں نے کئی سال اس پر غور کیا تو ایک چیز مجھ پر کھلی، میں نے شاہ صاحب سے تذکرہ کیا تو شاہ صاحب نے اس کی تصویب فرمائی، وہ یہ کہ ربط دینے والے اکثر شان نزول کو ملحوظ رکھ کر قصے کو مرتبط کرنا چاہتے ہیں اسلئے تطبیق میں کبھی اشکال پیدا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ربط دینے کے لئے اس کی ضرورت نہیں بلکہ مضمون آیت کو مضمون آیت سے مرتبط ہونا چاہئے، اگر قصہ کو لحاظ میں رکھ کر مناسبت دیکھی جائے گی تو دقت پیش آئے گی اور اگر مضمون کا لحاظ رکھا جائے تو پھر دقت نہ ہوگی، قرآن سے مثال سن لو فرماتے ہیں فان تولوا فانی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم یعنی اگر نہ مانوگے تو تم پر عذاب کا اندیشہ ہے، آگے فرمایا الی اللہ مرجعکم وھو علی کل شیئ قدیر، اللہ کی طرف لوٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، پھر فرماتے ہیں الا انھم یثنون صدورھم الخ آگاہ ہو جاؤ، یہ لوگ اپنے سینوں کو دہرا کئے لیتے ہیں (یثنون دہرا کرتے ہیں) تاکہ اللہ سے چھپ جائیں، اس کا شان نزول یوں مذکور ہے کہ کچھ لوگوں پر حیا کا اس قدر غلبہ تھا کہ وہ خلوت میں بھی برہنگی کی حالت میں غلبۂ حیا سے جھکے جاتے تھے تاکہ ایک درجہ میں اللہ سے استخفار ہو جائے تو فرمایا: الا حین یستغشون ثیابھم الخ یعنی اس کے سامنے سب کچھ ہے، وہ کھلا چھپا سب جانتا ہے، وہ تو دلوں میں گذرنے والے خیال کو بھی جانتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ حیا نہ کریں بلکہ مطلب یہ ہے کہ غلو نہ کریں کیونکہ اس سے امت پر حرج واقع ہوگا اور یہ اسوہ بننے والے تھے اس لئے آگاہ کر دیا کہ غلو مت کرو، اب اس شان نزول کو اس جملے سے کیا تعلق ہے، وہاں عذاب کا ذکر تھا اور یہاں یہ شانِ نزول ہوا، اب اگر اس قصہ سے ربط تلاش کیا جائے تو سوائے تحیر کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا، لہٰذا شان نزول کو چھوڑ کر نفس آیت کے مطلب پر غور کرو، آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہر خفی و عیاں کو جانتا ہے، اور اس قصے کی مناسبت سمجھو کہ جب کسی قوم کو ڈرایا جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس سے باز آجاؤ ورنہ تمہیں سزا دی جائے گی اور سزا کے لئے تین باتوں کی ضرورت ہے اول یہ کہ مجرم حاکم کے قبضہ میں ہو، اگر بھاگ جائے تو کیسے سزا دے گا، دوم یہ کہ حاکم میں اجراء حکم کی قدرت ہو، اگر میں گورنر کے لئے حکم دوں کہ اسے قتل کر دو تو کیا میرا یہ حکم نافذ ہو جائے گا؟ تو معلوم ہوا کہ اجرائے حکم کی قدرت بھی ضروری ہے، تیسری ضروری چیز قدرت اور حضورِ مجرم کے باوجود یہ ہے کہ اس جرم کا ثبوت بھی ہو، اگر ثبوت نہیں پہونچا اور جرائم ثابت نہیں ہوئے تو سزا کیسے دی جائے گی، تو معلوم ہوا کہ حاکم کو علم بھی ضروری ہے تاکہ کہیں غیر واقعہ کو واقعہ نہ سمجھ لے، تو اس کی پوری مسل ہونی چاہئے اور یہ تینوں باتیں اس میں ضروری ہیں:

(۱) قدرت نفاذ حکم (۲) حضور مجرم (۳) ثبوت وعلم

ے سید انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ

. . . .

اب اس آیت پر غور کرو فان تولوا الخ کہ اگر تم باز نہ آئے تو عذاب آئے گا، کوئی کہہ سکتا ہے کہ ممکن ہے ہم بھاگ جائیں تو اس کا جواب الی اللہ مرجعکم سب کو آنا پڑے گا، بھاگ نہیں سکتے وھو علی کل شیئ قدیر میں دو باتوں کی طرف اشارہ کردیا، ایک یہ کہ تم بھاگ نہیں سکتے، دوسرے یہ کہ ہم کو سزا دینے کی پوری قدرت ہے، اب یہ احتمال تھا کہ شاید کچھ جرائم اس سے مخفی رہ جائیں مسل میں وہ نہ آسکے ہوں یا ان کی رپورٹ ہی نہ ہو تو اس کا جواب انھم یثنون صدورھم الخ کہ سب کھلے چھپے کا علم رکھتے ہیں، بلکہ نیتوں تک کا علم رکھتے ہیں، اب تینوں چیزیں پوری ہوگئیں: قدرت، حضور، احاطۂ علم۔ اب کیا کوئی مجرم بچ سکتا ہے ہاں معافی الگ شے ہے، خواہ شفاعت سے یا رحمت سے، دیکھا کتنی اچھی مناسبت ہے مگر اس قصہ سے مناسبت نہیں، تو اصل مقصود احاطۂ علم ہے اور وہ ظاہر ہے۔

تو یہ اصول ہے کہ جب ربط پر غور کرو تو نظر کو فقط قصہ پر مقصور مت رکھو بلکہ قصہ سے قطع نظر کرکے مضمون کو مضمون سے منطبق کرو، پھر ان شاء اللہ اشکال نہ ہوگا۔

اب آیت مبحوث عنہا پر غور کرو کہ مقصود سورت یہاں منکرین حشر کا رد ہے جس کو وہ مستبعد سمجھتے تھے کہ جب ہڈیاں چور چور ہو جائیں گی اور ان میں انتشار ہو جائے گا تو پھر کیسے انھیں جمع کیا جائے گا، ان کا قول قرآن میں یوں نقل ہوا: من یحیی العظام وھی رمیم تو اس کا جواب دیا کہ ہم قادر ہیں پور پور جمع کر دیں گے، تو حاصل استبعاد یہ تھا کہ متفرق چیزیں کیسے جمع ہو جائیں گی؟ اس کا جواب دیا کہ ہم قادر ہیں، ہمیں کچھ مشکل نہیں، پھر غرض انکار بتلائی کہ اپنے مزے میں رہنا چاہتا ہے، آگے کہتے ہیں کہ تم کیا چیز ہو ہم تو ان کرات کو جو کروڑوں درجہ زمین سے بڑے ہیں اور ان کے فاصلے بھی بہت زیادہ ہیں انھیں بھی جمع کر دیں گے (جمع کے دونوں معنی کل گذر چکے) یقول الانسان الخ [یعنی انسان] اس وقت کہے گا اب کہاں جاؤں کلا لا وزر الخ یعنی ہرگز نہیں، اب کہیں مفر نہیں پھر آگے فرمایا ینبؤ الانسان الخ یہاں بھی جمع مراد ہے گو لفظ نہیں، اس تھوڑی سی زندگی میں اپنی زبان سے جو کچھ کہا ہے کوئی اس کے معلوم کرنے پر قادر ہے؟ کوئی قادر نہیں، مگر اللہ بیشک قادر ہے اور وہ یقیناً سب کو جمع کر دے گا بلکہ تو خود دیکھ لے گا گو تو کتنے ہی عذر کرے مگر کوئی عذر چل نہ سکے گا، اس جمع میں کوئی چیز متروک نہ ہوگی کما قال تعالیٰ لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصٰھا اب تو کوئی چیز یاد نہیں رہتی مگر وہاں سب آنکھوں کے سامنے آجائیں گی، تو تین جمع آئے، دو جگہ لفظ جمع لائے اور تیسرے مقام پر گو لفظ جمع نہیں لائے مگر یہ جمع ان دونوں جمع سے بڑھ کر ہے کہ ایک ایک چیز معمولی سے معمولی بھی موجود ہوگی۔

اب اس کا ایک نمونہ یہاں ذکر کیا ہے کہ تجھے شاید اس پر استبعاد ہو گا کہ کیسے جمع ہو جائیں گے تو اس کا نمونہ بتلاتے ہیں

. . . .

لاتحرك به لسانك الخ یعنی زبان مت ہلاؤ اور سنتے رہو، اکثر رکوع کے رکوع نازل ہوتے تھے اور ایسے حال میں پہاڑ کا سا بوجھ حضور ﷺ پر ہوتا تھا عہ ایسی شدت وتعب کے وقت حکم ہوتا ہے کہ زبان نہ ہلاؤ، ہمارے ذمہ ہے اس کا اعادہ کرانا اور حفظ کرانا، تو کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اس کو تمہارے سینے میں جمع کر دیا، یہ چوتھا جمع نمونہ ہے ان جمعوں کا جو آخرت میں ہوں گے تو جو خدا اس جمع پر قادر ہے وہی خدا آخرت میں بھی جمع کر دے گا۔ اور صغیر و کبیر سب سامنے آجائے گا بعد انقضار کے جیسا کہ قرآن بعد انقضا و ذہاب جبریل آپ کے سینے میں محفوظ رہتا ہے، تو در حقیقت درمیان میں ایک نمونہ پیش کر دیا اور اس کے بعد وہی قصہ شروع کر دیا اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ فرمایا: سبحٰن الذی اسرٰی الخ یہ آیت سفر معراج کے سلسلہ کی ہے مگر آیت میں اصل معراج کا ذکر نہیں کیا صرف اسراء کا ذکر کیا، اسراء مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک کے سفر کو کہتے ہیں اور معراج بیت المقدس سے صعود الی السموات وغیرہ کو، دونوں میں یہ فرق ہے، تو یہاں یہ نہیں کہا کہ مکہ سے سدرۃ المنتہیٰ تک لے گیا، یہاں صرف اتنا ذکر ہے کہ مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے گیا، نکتہ اس میں یہ ہے کہ مکہ والوں کو بیت المقدس کا تجربہ تھا اس لئے کہا گیا کہ جب اس کی تصدیق کر لوگے تو آگے تصدیق کرنے میں کیا تردد رہ جائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور انھوں نے کہا کہ آسمان کا حال تو ہمیں معلوم نہیں مگر بیت المقدس ہم نے دیکھا ہے، بتاؤ اس میں کتنے طاقچے اور کتنے ستون ہیں، سوچو کیا نبی علیہ السلام بیت المقدس اس لئے گئے تھے کہ وہاں طاقچے اور ستون گنیں، مگر کفار کو دق کرنا منظور تھا اس لئے اس قسم کے لغو سوال کئے، صحیح مسلم میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے سخت کرب لاحق ہوا اور ایسا کرب کبھی لاحق نہیں ہوا تھا مگر اللہ نے مجھے حطیم میں کھڑا کر دیا اور بیت المقدس میرے سامنے منکشف فرما دیا اور میں نے ان کے سوالات کے جوابات دیکھ دیکھ کر دے دئے حتیٰ کہ ایک قافلہ کا واقعہ بیان فرما دیا کہ فلاں مقام پر سے وہاں براق نے ٹانگ مار کر ان کا پانی گرا دیا تھا، جب قافلہ پہونچا تو پوری پوری تصدیق کر دی، تو اب اس سے اکتفار علی الاسراء کی حکمت معلوم ہو گئی اور جب اسراء کو مان لیا تو پھر آگے تسلیم کر لینے میں کیا تامل رہ گیا؟ کیونکہ اس وقت ہوائی جہاز تو تھے نہیں، پھر ایک شب میں اتنا طویل سفر کر لینا بلا معجزہ کے کیونکر ہو سکتا ہے لہٰذا جب اسے تسلیم کر لیں گے تو آگے انکار کی گنجائش نہ ہو گی، تو کبھی بڑے واقعہ کو دلنشین کرنے کے لئے چھوٹا واقعہ دکھلا دیتے ہیں، اس دنیا میں قیامت کے معاملات نظر نہیں آسکتے مگر ایک چھوٹا سا واقعہ ہے کہ اللہ تمہارے سینے میں قرآن اس طرح جمع فرما دیتا ہے جو اس کی قدرت کاملہ کا نمونہ ہے تو وہی اللہ حشر میں جمع پر بھی قادر ہے، یہ اپنی سمجھ میں آتا ہے اور اس میں کچھ تصرف کرنا نہیں پڑتا اور حدیث بھی اپنی جگہ پر رہتی ہے مگر صرف یہ کرنا پڑتا ہے کہ قصہ سے ربط مت دو بلکہ مضمون کو مضمون سے ربط دو، واللہ اعلم بالصواب ۸

عہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا واقعہ یاد کرو، پیچھے گذر چکا ہے۔

۵ ـ حَدَّثَنَا عَبْدَانُ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ اللّٰهِ قَالَ اَخْبَرَنَا يُوْنُسُ عَنِ

ہم سے بیان کیا عبدان نے کہا ہم کو خبر دی عبد اللہ ابن مبارک نے کہا ہم کو خبر دی یونس نے

الزُّهْرِيِّ ح وَحَدَّثَنَا بِشْرُ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ اللّٰهِ قَالَ اَخْبَرَنَا يُوْنُسُ

انھوں نے زہری سے دوسری سند اور ہم سے بشر بن محمد نے بیان کیا کہا ہم کو خبر دی عبد اللہ ابن مبارک نے کہا ہم کو خبر دی یونس اور

وَمَعْمَرٌ نَحْوَهُ ، قَالَ عَنِ الزُّهْرِيِّ اَخْبَرَنِيْ عُبَيْدُ اللّٰهِ ابْنُ عَبْدِ اللّٰهِ عَنِ ابْنِ

معمر نے، ان دونوں نے زہری سے مانند اس کے، زہری نے کہا مجھ کو عبید اللہ ابن عبد اللہ نے خبر دی، انھوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما

عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَجْوَدَ

سے سنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے، اور رمضان میں تو جب جبریلؑ آپ سے

النَّاسِ وَكَانَ اَجْوَدُ مَا يَكُوْنُ فِيْ رَمَضَانَ حِيْنَ يَلْقَاهُ جِبْرِيْلُ وَكَانَ يَلْقَاهُ فِيْ

ملا کرتے بہت ہی سخی ہوتے، اور جبریلؑ رمضان کی ہر رات میں آپ سے ملا کرتے اور آپ کے ساتھ

كُلِّ لَيْلَةٍ مِّنْ رَمَضَانَ فَيُدَارِسُهُ الْقُرْاٰنَ فَلَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

قرآن کا دور کرتے، غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (لوگوں کو) بھلائی پہونچانے میں چلتی ہوا سے بھی

اَجْوَدُ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيْحِ الْمُرْسَلَةِ.

زیادہ سخی تھے.

قولہ عبدان، یہ تثنیہ ہے عبد کا اور علم ہے.

قولہ نحوہ، بظاہر مرجع مذکور نہیں، مگر اکثر ایسا ہوتا ہے.

کان اجود الناس، یعنی حضور بہت سخی تھے، جود کثرت مال کا نام نہیں بلکہ غنی قلب کا نام ہے اور اس میں چھوٹا آدمی بھی بڑے مالدار پر سبقت لے جا سکتا ہے چنانچہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ مشہور ہے کہ جب حضورؐ نے مال کا چندہ کیا تو عمر سمجھے کہ آج میں ابوبکر سے بڑھ جاؤں گا کیونکہ میرے پاس بہت مال ہے اور وہ خالی ہاتھ ہیں، آدھا مال لائے، حضور نے پوچھا کتنا لائے؟ عرض کیا نصف، ابوبکر بھی اپنا مال لائے ان سے پوچھا کتنا لائے؟ جواب دیا سب لے آیا، گھر میں اللہ و رسول کا نام چھوڑ آیا ہوں! عمر کہتے ہیں مجھے یقین ہوگیا کہ ابوبکر سے میں کبھی نہیں بڑھ سکتا، تو دراصل غنی کا تعلق قلب سے ہے، جود و سخا میں فرق ہے، سخا میں خرچ کرنے والے کو اپنا فائدہ بھی مد نظر ہوتا ہے خواہ اسی قدر ہو کہ میری شہرت ہوگی، لوگوں میں عزت ہوگی، میری بات چلے گی وغیرہ. اور

. . . .

جود اسے کہتے ہیں کہ اس میں اپنا کچھ حصہ نہ ہو، حظ نفس سے خالی ہو، یہ بات حضورؐ میں بطریق اکمل تھی، اسی کو فرماتے ہیں کہ حضورؐ اجود الناس تھے اور اس کا ظہور خاص طور پر رمضان میں ہوتا تھا، اس میں آپؐ اپنے جود میں اور اضافہ فرماتے تھے، چنانچہ آتا ہے کہ رمضان میں جو جس چیز کو مانگتا آپؐ دے دیتے تھے ___ جود کے معنی شریعت میں **اعطاء ماینبغی لمن ینبغی** ہیں تو اب صرف مال پر انحصار نہ رہا اور آپ کی جود اس پر منحصر نہ تھی بلکہ آپ کی جود وہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے جو علوم آپ کو ملے تھے وہ ہم تک پہونچانا اور ہدایت کرنا آگے کہتے ہیں کہ وجہ کیا تھی؟ وجہ یہ تھی کہ جبریل رمضان کی ہر رات میں آتے تھے اور قرآن کا دور کرتے تھے ___

(مُدَارَسَہ: دور کرنا) جبریلؑ کا یہ معمول بحکم الٰہی تھا، ملا علی قاری نے اس لفظ مدارسۃ سے ایک مسئلہ نکالا ہے، شرح نقایہ میں لکھتے ہیں کہ قرآن کا ایک ختم مسنون ہے، رمضان تک ہر سال جتنا قرآن اتر چکتا تھا اس کا دور کر لیا کرتے تھے، اور جب قرآن سب اتر چکا تو سب کا دور کیا اور آخری عمر میں دوؔ دور کئے اور اعتکاف میں بھی زیادتی کی، چنانچہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے آپ نے فرمایا بھی تھا کہ اب میں عنقریب رحلت کر جاؤں گا کیونکہ اس سال جبریل نے دوؔ دور کئے ___ مگر میں اس استدلال سے خوش نہیں ہوں کیونکہ تصریح ہے کہ ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک جس قدر اترتا تھا اس کا دور کرتے تھے، سارے قرآن کا دور ثابت نہیں ہاں صحابہ کے آثار بیشک ختم قرآن کے ہیں، مدارسۃ غالباً نماز میں تھی، کیونکہ جامع صغیر میں حدیثؐ ہے کہ نماز میں قرآن افضل ہے خارج سے، تو بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حضورؐ ہمیشہ مرجوح پر عمل کرتے اور افضل کو ترک کرتے رہے ہوں، وجہ جود فی رمضان نازل یعنی جبریل علیہ السلام بھی تھے اور منزول بہ (قرآن) بھی اور وقت نزول (رمضان) بھی، مدارسۃ و مذاکرہ بھی، یہ سارا مجموعہ جود کا سبب تھا (ہکذا قالہ ابن حجر)

نزول جبریل خود برکت ہے، رمضان و قرآن بھی سبب رحمت ہے تو اس مجموعہ سے جود کی زیادتی ہوتی تھی، اکثر علماء و فضلاء کا خیال ہے کہ کسی خاص جگہ یا زمان میں فضیلت نہیں بلکہ اس میں فعل سے عظمت و فضیلت ہوتی ہے جیسا کہ ماہ رمضان کہ خود اس میں فی نفسہٖ عظمت نہیں مگر چونکہ نزول قرآن اس میں ہے اس لئے وہ عظمت کی چیز ہے یا جیسے خانۂ کعبہ کی عظمت، مگر محققین کا خیال ہے کہ مکان و زمان میں فی نفسہ بھی عظمت و فضیلت ہے اور نزول قرآن و عبادت باعث زیادتی ہے، چنانچہ ابن قیم نے زاد المعاد کے شروع میں بہت عمدہ بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ فی نفسہ اس کے اندر فضیلت ہے گو نزول قرآن و عبادت سے زیادتی ہو جاتی ہے، آیت **وربّك**

ﷺ اور وہ بالکل گری ہوئی بھی نہیں ہے۔

۶ ـ حَدَّثَنَا اَبُوالْیَمَانِ الْحَکَمُ بْنُ نَافِعٍ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعَیْبٌ عَنِ الزُّهْرِیِّ

ہم سے بیان کیا ابوالیمان حکم بن نافع نے کہا ہم کو خبر دی شعیب نے انہوں نے زہری سے

قَالَ اَخْبَرَنِیْ عُبَیْدُاللّٰہِ ابْنُ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُتْبَۃَ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ عَبْدَاللّٰہِ بْنَ

کہا خبر دی مجھ کو عبیداللہ ابن عبداللہ ابن عتبہ ابن مسعود نے، ان سے عبداللہ ابن عباس نے بیان کیا،

عَبَّاسٍ اَخْبَرَہٗ اَنَّ اَبَا سُفْیَانَ بْنَ حَرْبٍ اَخْبَرَہٗ اَنَّ ھِرَقْلَ اَرْسَلَ اِلَیْہِ

ان سے ابوسفیان ابن حرب نے کہا کہ ہرقل (روم کے بادشاہ) نے ان کو قریش کے اور کئی سواروں کے ساتھ

یخلق مایشاء ویختار سے استدلال کیا ہے، یعنی پہلے پیدا کر دیتا ہے اور پھر وہ چھانٹ لیتا ہے اور وہ اسے جانتا ہے، تو کیا اختیار کرنا اور چھانٹنا بلا کسی حکمت کے ہے؟ اور لفظ یختار بتلاتا ہے کہ فی نفسہ فضیلت ہے، اس کے بعد جوش میں آکر لکھا ہے کہ کیا گلاب و بول اپنی ذات سے یکساں ہیں؟ صرف خوشبو اور بدبو کا فرق ہے؟؟ نہیں! ہرگز نہیں!! پس جس طرح بول اور گلاب میں فرق ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ فرعون و موسیٰ علیہ السلام میں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل میں فرق ہے، پھر فرماتے ہیں ھذہ اعظم جنایۃ جناھا المتکلمون علی الشریعۃ یعنی یہ کہ سب جگہیں اور سب زمانے برابر ہیں، اللہ نے چونکہ فلاں زمانہ میں یا فلاں مکان میں یہ کام کر دیا اسلئے اس میں فضیلت آگئی یہ بالکل غلط ہے، یہی تحقیق قبلہ نما میں مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے لکھی ہے اور یہ بہت بہتر ہے اور یہی حق ہے اور جس نے اس کے خلاف کہا وہ یقیناً درست نہیں، کیا لیلۃ القدر اور تمام راتیں برابر ہیں؟ ہرگز نہیں! تو کیا لیلۃ القدر میں فضیلت محض عبادت سے ہے؟ نہیں بلکہ عبادت اس میں اس لئے ہوئی کہ اسمیں خود فضیلت تھی، اسی طرح رمضان کی فضیلت صرف اس وجہ سے نہیں کہ اس میں نزول قرآن ہوا بلکہ نزول قرآن اس میں اس لئے ہوا کہ وہ فی نفسہ افضل تھا، ہاں نزول قرآن سے شرف میں اضافہ ہوگیا، ابن قیم نے چند آیات سے استدلال کیا ہے منجملہ ان کے آیت اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ (۱) ہے، اس کے علاوہ اور بھی ہیں مگر یہاں نقل کی گنجائش نہیں، میں نے مستقل طور پر اس فصل کا خلاصہ کیا ہے من شاء فلیطالع (۲)

تو یہ دلیل اِنّی ہے، لِمّی نہیں، یعنی نزول قرآن فی رمضان لِم نہیں ہے فضیلت رمضان کی، کہ رمضان میں فضیلت نزول قرآن سے آئی بلکہ نزول اِن ہے کہ نزول اسلئے ہوا کہ رمضان میں فضیلت تھی، اس کو یوں سمجھو کہ انسان پر جو روح فائض ہوئی وہ بیل کو کیوں نہیں دی گئی؟ اس لئے کہ اس کا نقشہ اسی کا مقتضی ہے ورنہ پھر حکمت کے کوئی معنی ہی نہ ہوں گے۔

---

(۱) انعام: ۱۲۴ (۲) زاد المعاد ص۶ تا ص۱۴ میں یہ مضمون ملے گا۔

. . . .

قولہ اجود من الریح المرسلۃ ' یعنی جس طرح ہوا سے تمام مخلوق کو فیض پہونچتا ہے اور بے روک ٹوک سب کو پہونچتا ہے ' اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ فیض ہوتا تھا حضور کا رمضان میں ۔

حدثنا ابو الیمان ' سیدنا ابو سفیان رضی اللہ عنہ مفصل قصہ بیان کر رہے ہیں اس وقت کا جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں کو دین کی دعوت دی تھی ' حاصل قصہ یہ ہے کہ ۶ھ میں جب صلح حدیبیہ ہوئی جس کا مفصل واقعہ ان شاء اللہ مغازی میں آئے گا ۔ تو معاہدہ ہوا کہ دس سال تک طرفین سے لڑائی بند رہے گی اور بھی بہت سی شرائط تھیں اور بظاہر اکثر شرطیں اہل اسلام کے خلاف تھیں منجملہ ان کے [ایک شرط یہ تھی] کہ اگر [کوئی کافر] مسلمان [ہو کر بھی] مدینہ جائے تو واپس کرنا پڑے گا اور اگر کوئی مسلمان مکہ چلا آئے] تو واپس نہ کیا جائے گا ' تو بظاہر اس میں مغلوبیت نظر آرہی ہے مگر اللہ نے اسے فتح مبین کہا ہے : انا فتحنا لک فتحا مبینا اسی میں نازل ہوئی ' حضرت عمر کو اس سے بہت تشویش تھی اس لئے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا اللہ اور اس کا رسول خوب جانتا ہے ' پھر جب نزول آیات ہوا تو حضور نے حضرت عمر کو بلا کر سنایا اس وقت بھی حضرت عمر نے وہی کہا کہ یا رسول اللہ یہی فتح مبین ہے ؟ آپ نے فرمایا ہاں یہی ہے ' درحقیقت یہ فتح تھی کیونکہ کفار اب تک مسلمانوں کی طاقت تسلیم نہ کرتے تھے اور اب [ان کی طاقت] تسلیم کر لی ' ایک فتح [تو یہی] ہے ' نیز اب اختلاط ہوا اہل اسلام اور اہل کفر میں ' صحبتوں سے ان کے اخلاق و تقویٰ وغیرہ کا حال معلوم ہوا تو کثرت سے مسلمان ہو گئے ' اور یہی معاہدہ سبب بنا فتح مکہ کا کہ دو سال بعد قریش نے نقض عہد کیا ' حضور نے چڑھائی کی اور ۸ھ میں مکہ فتح کر لیا ' تو ۶ھ میں صلح حدیبیہ ' ۷ھ میں عمرۃ القضاء ' ۸ھ میں فتح مکہ ' ۱۰ھ میں حجۃ الوداع ' معاہدہ گو دس سال کا تھا مگر چونکہ قریش نے نقض عہد کیا اس لئے حضور نے مکہ فتح فرما لیا ' ابو سفیان رضی اللہ عنہ ہمیشہ جنگ کرتے رہتے تھے ' بدر کی لڑائی انھیں کی وجہ سے ہوئی تھی کیونکہ یہ تجارت کے لئے شام گئے تھے تو یہی سبب بنے تھے ' احد میں بھی انھوں نے شرکت کی تھی اور کہا تھا کہ آج ہم نے بدر کا بدلہ لے لیا ' اسی طرح ہمیشہ جنگ کی تیاری کرتے رہتے تھے ' جب صلح ہو گئی تو ہر شخص مطمئن ہو گیا اور اب موقع ملا تجارت وغیرہ کا ' ابو سفیان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے شام کا ارادہ کیا اور ایک قافلہ لے کر چل دیا ' بعض روایات میں ہے کہ بیس آدمی اور تھے اور بعض روایات میں ہے کہ تیس آدمی اور تھے ، ادھر یہ روانہ ہوئے ادھر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ کا کام شروع کیا اور تمام سلاطین کے پاس قاصد روانہ فرمائے تاکہ حجت تمام ہو جائے چنانچہ مصر و بحرین وغیرہ بھی قاصد بھیجے ' سب سے بڑی اس وقت دو سلطنتیں تھیں ' ایک فارس [کی] دوسری روم [کی] اہل فارس مجوسی تھے اور اہل روم نصاریٰ ' لفظ روم اکثر نصاریٰ کے لئے اسی بنا پر آتا ہے ' مگر یہ حقیقت نہیں ' روم وہ قوم تھی جو ایشیائے کوچک سے اٹلی تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کا پایہ تخت رومۃ الکبریٰ تھا جو اب بھی ایطالیہ کا پایہ تخت ہے ' اہل عرب اسے رومیہ کہتے ہیں ' قسطنطنیہ تک

. . . .

پہلے ایک ہی ملک تھا، جب آپس میں اختلاف ہوا تو پھر قسطنطنیہ دار السلطنت بن گیا اس ملک کے حکمراں کا نام ہرقل ہے اور قیصر اس کا لقب ہے، اس کے پاس بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قاصد بھیجا اور ایران بھی مگر سلاطین کبار میں سے کسی نے دعوت قبول نہ کی ہاں ایک دو چھوٹے موٹے [والیان ملک] نے قبول کرلیا جیسے والی حبشہ شاہ نجاشی نے [دعوت] قبول کرلی [ہاں] ان بڑوں میں باہم اتنا فرق تھا کہ بعض نے نامۂ رسول کی توقیر کی اور بعض نے تذلیل کی، کسریٰ شاہ ایران نے آپ کے نامۂ مبارک کو چاک کردیا اور ہرقل نے بہت تعظیم کی اور اعتراف کیا کہ یہ وہی ہیں جن کا ذکر اور جن کی بشارتیں کتب سابقہ میں ہیں، مجھے یقین تھا کہ ایک نبی ظاہر ہونے والا ہے مگر میں یہ نہ سمجھتا تھا کہ وہ تم میں سے ہوگا۔ اور کہا وہ میرا ملک ضرور فتح کرلے گا، اس نے قوم کو دعوت دی مگر قوم نے قبول نہ کیا اور یہ خود ہوس ملک میں پھنس گیا۔

حافظ لکھتے ہیں کہ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک بہت تعظیم سے محفوظ رکھتے تھے اور یہی اولاد کو وصیت کرتے تھے کہ اسے محفوظ رکھنا، جب تک محفوظ رکھوگے تم محفوظ رہوگے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں اطلاعیں پہونچیں تو کسریٰ کے بارے میں فرمایا [جیسے اس نے میرا نامہ چاک کردیا اسی طرح] اس کا ملک چاک کردیا جائے گا[1] اور قیصر کیلئے فرمایا تھا واما ھولاء فستکون لھم بقیۃ۔ ملوک روم خوبصورت اور حسین لوگوں کے ہاتھ سے نامہ قبول کرتے تھے، کریہ المنظر اور بدصورت لوگوں کے ہاتھ سے قبول نہ کرتے تھے، حضرت دحیہ بہت خوبصورت تھے [اسی لئے ان کو نامہ بری کی خدمت سپرد فرمائی گئی] میں سمجھتا ہوں کہ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے اللہ کی طرف سے جو سفیر آیا کرتا تھا وہ دحیہ کی شکل میں آتا تھا، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تفاولاً حضرت دحیہ کو قاصد منتخب فرمایا تاکہ فی الجملہ مناسبت ہوجائے سفیر اللہ اور سفیر رسول اللہ میں قاعدہ یہ تھا کہ بڑے بادشاہ کوئی نامہ بلاواسطہ قبول نہ کرتے تھے، اس لئے [حضرت دحیہ] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک حارث ابن ابی الشمر [غسانی] کے پاس لے گئے، حارث کو عظیم بُصریٰ کہتے تھے (بصری ایک شہر ہے مدینہ اور دمشق کے درمیان) وہاں کا یہ رئیس تھا، اور اسی کو ملک غسان بھی کہتے ہیں حسن اتفاق سے قیصر اس وقت بیت المقدس آیا ہوا تھا اور آنے کی وجہ یہ تھی کہ فارس و روم میں لڑائی چھڑی تھی اور رومی مغلوب ہوگئے تھے، اس پر مکہ والوں کو خوشی ہوئی تھی کیونکہ ان کو قرب تھا مجوسیوں سے اور مسلمان رومیوں کی نصرت چاہتے تھے کیونکہ فی الجملہ یہ ان کے قریب تھے اسلئے کہ اہل روم بہرحال اہل کتاب تھے، اہل مکہ کی خوشی سے اہل اسلام کو رنج ہوا تو اللہ نے یہ آیات نازل فرمائیں غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ ..... وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۲) چنانچہ ایسا ہی ہوا، چند برسوں میں اللہ نے حالات بدلے اور رومیوں کو فتح حاصل ہوئی، مسلمانوں کو خوشی

---

[1] اما ھولاء فیمزقون ۱۲ الاموال لابی عبید و فتح الباری (۲) روم: ۱ تا ۶

فِیْ رَکْبٍ مِنْ قُرَیْشٍ وَکَانُوْا تُجَّارًا بِالشَّامِ فِی الْمُدَّۃِ الَّتِیْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی

بلا بھیجا اور یہ قریش کے لوگ اس وقت شام کے ملک میں سوداگری کے لئے گئے تھے اور یہ وہ زمانہ ہے جس میں آنحضرت

اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَادَّ فِیْھَا اَبَا سُفْیَانَ وَکُفَّارَ قُرَیْشٍ فَاَتَوْہُ وَھُمْ بِاِیْلِیَاءَ فَدَعَاھُمْ

صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان اور قریش کے کافروں کو (صلح کرکے) ایک مدت دی تھی، غرض یہ لوگ اس کے پاس پہونچے جب ہرقل اور اسکے

فِیْ مَجْلِسِہٖ وَحَوْلَہٗ عُظَمَاءُ الرُّوْمِ ثُمَّ دَعَاھُمْ وَدَعَا بِتَرْجُمَانِہٖ فَقَالَ اَیُّکُمْ اَقْرَبُ

ساتھی ایلیا میں تھے، ہرقل نے ان کو اپنے دربار میں بلایا اور اس کے گرداگرد روم کے رئیس بیٹھے تھے، پھر ان کو (پاس) بلایا اور اپنے مترجم کو بھی

نَسَبًا بِھٰذَا الرَّجُلِ الَّذِیْ یَزْعُمُ اَنَّہٗ نَبِیٌّ، قَالَ اَبُوْسُفْیَانَ فَقُلْتُ اَنَا اَقْرَبُھُمْ نَسَبًا

بلایا، وہ کہنے لگا (اے عرب کے لوگو!) تم سے کون شخص اس کا نزدیک کا رشتہ دار ہے جو اپنے تئیں پیغمبر کہتا ہے، ابوسفیان نے کہا میں اس شخص کا

فَقَالَ اَدْنُوْہُ مِنِّیْ وَقَرِّبُوْا اَصْحَابَہٗ فَاجْعَلُوْھُمْ عِنْدَ ظَھْرِہٖ، ثُمَّ قَالَ لِتَرْجُمَانِہٖ قُلْ لَھُمْ

قریب کا رشتہ دار ہوں، تب ہرقل نے کہا اچھا اس کو میرے پاس لاؤ اور اس کے ساتھیوں کو بھی (اس کے) نزدیک رکھو اس کے پیٹھ پر، پھر

اِنِّیْ سَائِلٌ ھٰذَا عَنْ ھٰذَا الرَّجُلِ فَاِنْ کَذَبَنِیْ فَکَذِّبُوْہُ فَوَاللّٰہِ لَوْلَا الْحَیَاءُ مِنْ اَنْ یَاْثِرُوْا

اپنے مترجم سے کہنے لگا ان لوگوں سے کہہ میں اس سے (ابوسفیان سے) اس شخص کا (پیغمبر صاحب کا) کچھ حال پوچھتا ہوں، اگر یہ مجھ سے جھوٹ بولے

عَلَیَّ کَذِبًا لَکَذَبْتُ عَنْہُ، ثُمَّ کَانَ اَوَّلَ مَا سَاَلَنِیْ عَنْہُ اَنْ قَالَ کَیْفَ نَسَبُہٗ فِیْکُمْ

تو تم کہہ دینا جھوٹا ہے، ابوسفیان نے کہا قسم خدا کی اگر مجھ کو یہ شرم نہ ہوتی کہ یہ لوگ مجھ کو جھوٹا کہیں گے تو میں آپ کے باب میں جھوٹ کہہ دیتا، خیر

پہلی بات جو اس نے مجھ سے پوچھی وہ یہ تھی کہ اس شخص کا تم میں خاندان کیسا ہے؟

ہوئی اور یہ خوشی دو بالا ہوگئی اس سے کہ اسی وقت بدر میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تھی۔

ایک تفسیر یہ ہے کہ روم کی فتح کی وجہ سے مسلمانوں کو خوشی ہوئی تو نصرت گو [جنگ] بدر [کے سال] میں ہو چکی تھی گر مکمل فتح نہیں ہوئی تھی، جنگ جاری تھی، ۶ھ ہجری میں کامل فتح ہوئی اور فتح کی عجیب صورت ہوئی کہ فارس کے سپہ سالار قیصر سے سازش کر لی اور مع فوج کے قیصر سے مل گیا، تو قیصر کو مکمل فتح ہوگئی، قیصر نے نذر مانی تھی کہ [اگر مجھ کو فارس پر فتح حاصل ہوئی تو] میں حمص[1] سے ایلیاء (بیت المقدس) تک پا پیادہ جاؤں گا، چنانچہ اسی نذر کو پورا کرنے کے لئے بیت المقدس گیا تھا، مورخین نے لکھا ہے کہ اس کی آمد پر راستہ میں

---

(۱) حمص، شام کا ایک بڑا شہر ہے۔

. . . .

فرش بچھائے گئے تھے اور پھول ڈالے گئے تھے تاکہ پاؤں میں چھالے نہ پڑیں، ادھر [قیصر ایلیا] پہونچا اور ادھر نامۂ مبارک اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا پہونچا اور اسی وقت حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ ایک قافلہ کے ہمراہ تجارت کے لئے [ملک شام پہونچے تھے اور غزہ میں ٹھہرے ہوئے تھے] یہ عجیب اتفاق تھا کہ سب کا اجتماع ہوگیا، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خط پہونچنے سے پہلے ہی [بعثت نبوی کی] کچھ خبریں [قیصر کو] پہونچ چکی تھیں، جب خط پہونچا تو اس نے کہا کہ کیا اس ملک میں کوئی ایسا ہے جو نسب میں حضور کا شریک ہو اور حضور کے حال سے خوب واقف ہو؟ پھر تلاش شروع ہوئی تو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ ملے جو اس وقت مسلمان نہ تھے بلکہ پورے مقابل [اور حریف] تھے، انھوں نے کہا کہ میں پوری طرح واقف ہوں، چنانچہ یہ مع قافلے کے چلے۔

رَکْبٌ، اسم جمع ہے۔

مَادَّ، مصالحت کی۔

فَاَتَوْهُ یعنی یہ لوگ ہرقل کے پاس گئے، ضمیر منصوب ہرقل کی طرف لوٹتی ہے، یہی بہتر ہے۔

وَهُمْ بِاِیْلِیَاءَ، ایل اللہ کو کہتے ہیں اور یا شہر کو، یعنی اللہ کا شہر جیسے ہم بیت اللہ کہتے ہیں۔ جب یہ پہونچے تو بڑے بڑے حکام جمع تھے، انھیں میں ان کو بھی بٹھلا دیا۔

ثُمَّ دَعَاهُمْ، پہلے اپنے دربار میں بلایا اور پھر اپنے قریب بلایا اور ترجمان کو بھی بلایا (ترجمان بضم تار اور بفتح تار دونوں ہیں اور دونوں صحیح ہیں) اور سب سے پہلے یہ سوال کیا کہ تم لوگوں میں کون ایسا ہے جو مرسل سے نسب میں زیادہ قریب ہو، یہ اس کے کمال عقل کی بات تھی کیونکہ گھر کا آدمی خوب واقف ہوتا ہے اور اس کا اعتقاد مشکل سے جمتا ہے اس لئے اس نے اقرب کی تلاش کی، ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اقرب ہوں، چوتھی پشت میں ان کا سلسلۂ نسب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے، ان کا نام صخر ہے نسب یہ ہے: صخر بن حرب ابن امیہ ابن عبد شمس ابن عبد مناف۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب ہے: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف۔

یہ سن کر ہرقل نے کہا کہ انھیں ہمارے اور قریب کر دو اور ان کے ساتھیوں کو بھی قریب کر دو مگر اس طرح کہ ان کی پیٹھ کے پیچھے بٹھاؤ، اور غرض اس سے اس کی یہ تھی کہ جھوٹ نہ بول سکیں، چنانچہ اسی روایت میں ہے کہ قیصر نے ان کے رفقاء سے کہا تھا کہ اگر یہ جھوٹ کہیں تو تم تکذیب کر دینا کیونکہ سامنے سے تکذیب میں ذرا حیا آتی ہے اور یہ اہل عرب میں بہت سخت تھا کہ جھوٹ بولیں، وہ جھوٹ نہیں بولتے تھے چاہے گردن کٹ جائے۔

قُلْتُ هُوَ فِيْنَا ذُوْ نَسَبٍ قَالَ فَهَلْ قَالَ هٰذَا الْقَوْلَ مِنْكُمْ اَحَدٌ قَطُّ قَبْلَهٗ قُلْتُ لَا،

میں نے کہا کہ اس کا خاندان تو ہم میں بڑا ہے، کہنے لگا کہ اچھا پھر یہ بات (کہ میں پیغمبر ہوں) اس سے پہلے تم لوگوں میں کسی نے کہی تھی؟ میں نے

قَالَ فَهَلْ كَانَ مِنْ اٰبَائِهٖ مِنْ مَلِكٍ، قُلْتُ لَا، قَالَ فَاَشْرَافُ النَّاسِ يَتَّبِعُوْنَهٗ اَمْ

کہا نہیں، کہنے لگا اچھا اس کے بزرگوں میں کوئی بادشاہ گذرا ہے؟ میں نے کہا نہیں، کہنے لگا اچھا بڑے آدمی (امیر لوگ) اس کی پیروی کر

ضُعَفَاءُهُمْ، فَقُلْتُ بَلْ ضُعَفَاءُهُمْ، قَالَ اَيَزِيْدُوْنَ اَمْ يَنْقُصُوْنَ، قُلْتُ بَلْ

رہے ہیں یا غریب لوگ؟ میں نے کہا نہیں غریب لوگ، کہنے لگا اس کے تابعدار لوگ (روز بروز) بڑھتے جاتے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟ میں نے

يَزِيْدُوْنَ، قَالَ فَهَلْ يَرْتَدُّ اَحَدٌ مِنْهُمْ سَخْطَةً لِدِيْنِهٖ بَعْدَ اَنْ يَدْخُلَ فِيْهِ،

کہا نہیں بڑھتے جاتے ہیں، کہنے لگا اچھا پھر کوئی ان میں سے ایمان لا کر اس دین کو برا سمجھ کر پھر جاتا ہے؟ میں نے کہا نہیں، کہنے لگا یہ بات

قُلْتُ لَا، قَالَ فَهَلْ كُنْتُمْ تَتَّهِمُوْنَهٗ بِالْكَذِبِ قَبْلَ اَنْ يَقُوْلَ مَا قَالَ، قُلْتُ لَا،

جو اس نے کہی (میں پیغمبر ہوں) اس سے پہلے کبھی تم نے اس کو جھوٹ بولتے دیکھا؟ میں نے کہا نہیں، کہنے لگا اچھا وہ عہد شکنی کرتا

قَالَ فَهَلْ يَغْدِرُ، قُلْتُ لَا، وَنَحْنُ مِنْهُ فِيْ مُدَّةٍ لَا نَدْرِيْ مَا هُوَ فَاعِلٌ

ہے؟ میں نے کہا نہیں، اب ہم سے اس سے (صلح کی) ایک مدت ٹھہری ہے، معلوم نہیں اس میں وہ کیا کرتا ہے، ابوسفیان نے

فِيْهَا شَيْئًا غَيْرَ هٰذِهِ الْكَلِمَةِ

کہا مجھ کو اور کوئی بات اس میں شریک کرنے کا موقع نہیں ملا بجز اس بات کے

اسی کو ابوسفیان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ فو اللہ لولا الحیاء من ان یاثروا علی کذبا لکذبت عنه یعنی یہاں تو کام چل جائے گا مگر مکہ پہونچ کر مجھے طعن و تشنیع کریں گے کہ یہ وہی تو ہے جو قیصر کے سامنے جھوٹ بولا تھا، ان کو یقین تھا کہ اگر میں یہاں جھوٹ بولوں گا تو یہ ہرگز یہاں میری تکذیب نہ کریں گے لیکن آئندہ ساری عمر کیلئے عرب میں جھوٹا مشہور ہو جاؤں گا اس لئے حیا جھوٹ بولنے سے مانع ہوئی، اس کے بعد قیصر نے سب سے پہلا سوال نسب کے بارے میں کیا، ابوسفیان نے جواب دیا هو فینا ذو نسب، وہ عالی نسب ہے، تنوین تعظیم کے لئے ہے، یعنی عرب میں ان سے بہتر کوئی نہیں (ابوسفیان اس اقرار پر مجبور تھے اگر تکذیب کرتے تو خود ان کے اوپر بھی حرف آتا اس لئے کہ وہ اوپر آپ سے اقرب نسب ہونے کا دعویٰ کر چکے ہیں)

پھر سوال کیا کہ کسی اور نے بھی ان سے پہلے ایسا دعویٰ کیا تھا؟ کہا نہیں! بعض روایات میں ہے کہ انھوں نے جواب میں یہ بھی کہا هو ساحر کذاب تو قیصر نے کہا کہ ہم نے تم کو اس لئے نہیں بلایا کہ سب و شتم کرو۔

قَالَ فَهَلْ قَاتَلْتُمُوْهُ، قُلْتُ نَعَمْ، قَالَ فَكَيْفَ كَانَ قِتَالُكُمْ اِيَّاهُ، قُلْتُ الْحَرْبُ بَيْنَنَا

کہنے لگا اچھا تم اس سے (کبھی) لڑے؟ میں نے کہا ہاں! کہنے لگا پھر تمہاری اس کی لڑائی کیسے ہوتی ہے؟ میں نے کہا ہم میں اور

وَبَيْنَهُ سِجَالٌ يَنَالُ مِنَّا وَنَنَالُ مِنْهُ، قَالَ مَاذَا يَأْمُرُكُمْ، قُلْتُ يَقُوْلُ اعْبُدُوا اللّٰهَ

اس میں لڑائی ڈولوں کی طرح ہے، وہ ہمارا نقصان کرتا ہے ہم اس کا نقصان کرتے ہیں، کہنے لگا اچھا وہ تم کو کیا حکم کرتا ہے؟ میں نے

وَحْدَهُ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهِ شَيْئًا وَاتْرُكُوْا مَا يَقُوْلُ اٰبَاءُكُمْ وَيَأْمُرُنَا بِالصَّلٰوةِ وَالصِّدْقِ

کہا وہ کہتا ہے بس اکیلے اللہ ہی کو پوجو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ اور اپنے باپ دادا کی (شرک کی) باتیں چھوڑ دو، اور

وَالْعَفَافِ وَالصِّلَةِ، فَقَالَ لِلتَّرْجُمَانِ قُلْ لَهُ سَأَلْتُكَ عَنْ نَسَبِهِ فَذَكَرْتَ

ہم کو نماز پڑھنے، سچ بولنے (حرام کاری) سے بچنے اور ناتا جوڑنے کا حکم دیتا ہے، تب ہرقل نے مترجم سے کہا اس شخص سے کہہ میں نے

اَنَّهُ فِيْكُمْ ذُوْنَسَبٍ، فَكَذٰلِكَ الرُّسُلُ تُبْعَثُ فِيْ نَسَبِ قَوْمِهَا،

تجھ سے اس کا خاندان پوچھا تو تو نے کہا وہ ہم میں عالی خاندان ہے اور پیغمبر (ہمیشہ) اپنی قوم میں عالی خاندان ہی بھیجے جاتے ہیں،

اسی طرح کے بہت سے سوالات کئے، اور یہ سوالات نہایت عقلمندی کے تھے، خود ہرقل بہت بڑا عالم تھا، کتب سابقہ سے بھی خوب واقف تھا۔

قولہ وَنَحْنُ مِنْهُ فِيْ مُدَّةٍ الخ یعنی ہمارا ان کا ایک عہد ہوا ہے، ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس میں ان کا طرز عمل کیا رہے گا؟ بخاری کے علاوہ اور دوسری روایتوں میں ہے کہ قیصر نے پوچھا کہ تمھیں یہ اندیشہ کیوں ہے کہ وہ غدر (عہد شکنی) کریں گے؟ ابو سفیان نے جواب دیا کہ میری قوم نے اپنے حلفاء کی مدد کی ہے ان کے حلفاء کے مقابلہ میں، تو قیصر نے یہ سن کر کہا اِنْ بَدَأْتُمْ فَاَنْتُمْ اَغْدَرُ کہ جب تم نے عہد شکنی کی ابتداء کی پھر تو تم ہی بد عہد ٹھہرے۔

قولہ سِجَالٌ یعنی ڈانواڈول ہے۔ یہ ٹھیٹھ ترجمہ ہے۔

قولہ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهِ شَيْئًا اس قید سے یہ بتلایا کہ کسی قسم کا شرک نہ ہو، نہ فی الذات، نہ فی الصفات، شرک سے مراد یہاں وہ فعل ہے جس کی وجہ سے اسلام سے خارج ہو جائے، سجدہ وغیرہ بشرطیکہ تعبدی نہ ہو اسلام سے خارج نہیں کرتا۔

اس شرک کے معنی میں جس سے خروج عن الاسلام ہو جائے سخت اختلاف ہے، شرک کے یہ معنی کہ ہر بات میں اللہ کے مساوی قرار دئے اگر کئے جائیں تو پھر کوئی بھی مشرک نہیں، کہ وہ لوگ کہتے تھے مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (۱)

---

(۱) سورہ زمر آیت ۳

. . . .

ہم انھیں صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ یہ ہم کو اللہ کا مقرب بنادیں گے، اس سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے بتوں کو خدا کے برابر نہیں سمجھتے تھے تو پھر مشرک کیسے کہے جائیں، اہل ہند بھی نرائن کا رحمٰن بڑا معبود اللہ ہی کو کہتے ہیں، یہود و نصاریٰ بھی مشرک ہیں مگران کا شرک اور طرح کا ہے، یہ بھی اللہ کے مساوی کسی اور کو نہیں قرار دیتے، ان سب شواہد سے ثابت ہوا کہ شرک کی وہ تفسیر صحیح نہیں جو اوپر مذکور ہوئی، در اصل شرک کے معنی منقح و بہتر یہی ہیں کہ کسی پر یہ عقیدہ رکھ کر (کہ کوئی چیز بھی ہو خواہ تشریع خواہ تکوین اس میں وہ مستقل اختیار رکھتا ہے) سر جھکائے اور تذلل ظاہر کرے میں اور واضح کرتا ہوں۔ اہل عرب اپنے تلبیہ میں کہتے تھے لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ إِلَّا شَرِيكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ ، ہم حاضر ہیں، ہم حاضر ہیں، تیرا کوئی شریک نہیں لیکن وہ ایک شریک جس کا تو مالک ہے اور وہ خود مستقل مالک نہیں۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بادشاہ ہے اور اس کے تابع کلکٹر وغیرہ کہ ہیں تو وہ سب محکوم لیکن بادشاہ ہی کے سونپے ہوئے اجمالی اختیارات کلکٹر کمشنر وغیرہما کو بھی ہیں اور ان اختیارات کے نفاذ میں وہ مستقل بھی ہیں گو نفس اختیارات کا حصول ان کا اپنا نہیں بلکہ گورنمنٹ سے انھیں حاصل ہوا ہے تو من وجہٍ وہ مستقل ہیں اور من وجہٍ غیر مستقل، اعتقاد مشرکین پر یہ مثال بالکل منطبق ہے، وہ جانتے ہیں کہ یہ بت مستقل نہیں ہیں بلکہ (ان کے اپنے اعتقاد کے مطابق) انھیں اختیارات اللہ سے ملتے ہیں اور ان کا نفاذ ان کے اختیار سے ہوتا ہے، اسی کو یہ لوگ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا سے تعبیر کرتے تھے، یعنی عبادت تو ان بتوں کی ہم ضرور کرتے ہیں مگر اسلئے کہ ہم بڑے خدا کے قریب ہوجائیں، ایک شرک تو یہ ہے اور ایک شرک وہ ہے جو حدیث عدی بن حاتم میں ہے (جو پہلے نصرانی تھے پھر اسلام قبول کرلیا تھا) کہ عدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں یا رسول اللہ! قرآن میں ہے: اِتَّخَذُوا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ [1] یعنی کافروں نے اپنے علماء اور زاہدوں اور مسیح ابن مریم کو اللہ کے سوا دوسرا خدا بنا رکھا ہے، حالانکہ ہم نے کبھی احبار و رہبان کو رب نہیں بنایا، پھر ارشاد ربانی کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں ہے کہ تم نے انھیں تحلیل و تحریم کا مالک بنادیا ہے؟ عرض کیا ہاں یہ ٹھیک ہے، ایسا ضرور کیا ہے، تو آپ نے فرمایا بس یہی شرک ہے، چنانچہ وہ لوگ کتابیں بدل دیتے تھے، احکام منسوخ کردیتے تھے، حالانکہ تشریع کا حق اللہ کے سوا کسی کو نہیں، تو یہ شرک فی التشریع ہے یعنی تشریعی یا تکوینی طور پر حلال و حرام جیسے شرعی احکام میں کسی کو کسی درجہ میں بھی مستقل با اختیار سمجھنا کہ جس کو وہ چاہے حرام قرار دے دے اور جس کو چاہے حلال ٹھہرادے، تو یہی شرک اسلام سے خارج کردیتا ہے۔

---

(۱) سورہ توبہ آیت ۳۱ ؁ ۵ زمکار

. . . .

اس کے علاوہ جس کا مسلک تعظیم کے لئے سجدہ وغیرہ کا ہے تو وہ مبتدع ہے، گمراہ ہے، مگر مشرک نہیں، نجدی علماء کہتے ہیں کہ سجدہ غیراللہ کا حرام ہے خواہ نیت ہو یا نہ ہو، تعظیماً ہو یا تعبداً بہر نوع شرک ہی ہوگا اور اس کا مرتکب مشرک، مباح الدم، واجب القتل ہو جائے گا، اس مسئلہ پر میرا اور ابن سعود والی حجاز ونجد کا مکالمہ بھی ہوا تھا جب میں سلطان کی دعوت پر ہندوستانی وفد کے ہمراہ حجاز گیا تھا تو ایک مجلس میں علمائے نجد وغیرہ کی موجودگی میں یہ مسئلہ ایک روز زیر بحث آیا تھا، میں نے کہا تھا کہ اگر ہر سجدہ عبادت ہو تو ہر ساجد عابد ہوگا اور جس کو سجدہ کیا ہے وہ مسجود لہٗ ہوگا اور جب یہ تسلیم ہے کہ ہر سجدہ عبادت ہے اور ہر ساجد عابد تو لازم آیا کہ ہر مسجود لہٗ معبود ہو، یہ ایک مقدمہ ہوا، دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ بنص قرآنی وحدیثی یہ ثابت ہے کہ ابتدائے عالم سے آج تک کسی مذہب وملت میں ایک آن کیلئے بھی شرک جلی کی اجازت نہیں دی گئی اور کسی کو ایک منٹ کے لئے بھی معبود نہیں بنایا گیا، خود قرآن فرماتا ہے: وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ (۲) (پوچھئے اپنے سے پہلے کے رسولوں سے کیا ہم نے کبھی رحمٰن کے سوا کوئی دوسرے معبود تجویز کئے ہیں جن کی عبادت کی جاتی ہے) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غیراللہ کو کبھی معبود نہیں بنایا گیا حالانکہ غیراللہ کو مسجود بنایا گیا ہے جیسا کہ حضرت آدم ویوسف علیہما السلام کو، اور خود یوسف علیہ السلام جیل میں کہہ چکے تھے: يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۳) مگر جب ماں باپ اور بھائیوں کے آنے پر تخت پر بیٹھے تو ماں باپ اور بھائیوں نے سجدہ کیا، اب اگر ہر سجدہ عبادت ہوتا کما قلتم تو پھر آدم ویوسف علیہما السلام معبود بنے حالانکہ یہ مقدمہ ثابت ہو چکا ہے کہ معبود غیراللہ کبھی نہیں ہوا، تو آپ کے قول کے مطابق لازم آتا ہے کہ خود اللہ نے ایک وقت شرک جلی کی اجازت دی تھی، نعوذ باللہ منہ

تاویل سے یہاں کام نہ چلے گا کیونکہ گفتگو یہاں قرآن وحدیث میں ہے، معلوم ہوا کہ سجدہ اور چیز ہے اور عبادت شے دیگر اور ان دونوں میں فرق ہے، حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ صاحب نے اس پر لکھا ہے مگر بہت مختصر، میں نے تقریباً اسے بیس بار دیکھ کر حل کیا ہے، اشکال اس لئے پیش آیا ہے کہ عبادت غایت تذلل کا نام ہے اور سجدہ میں یہ معنی بطریق اکمل پائے جاتے ہیں اور جب سجدہ عبادت ہے تو غیراللہ کیلئے ہرگز جائز نہیں، یہ معنی لغوی ہیں، ان سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا، شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ بیشک عبادت غایت تذلل کا نام ہے مگر غایت تذلل جب ہوگا جب قلب وقالب دونوں سے ہو اور یہاں سجدہ دونوں سے نہیں ہے بلکہ صرف قالب سے ہے لہٰذا غایت تذلل نہ ہوا اور چونکہ غایت تذلل نہیں اس وجہ سے سجدہ شرک بھی نہیں ہو سکتا۔

---

(۲) الزخرف: ۴۵ (۳) سورۂ یوسف: ۳۹

وَسَأَلْتُكَ هَلْ قَالَ أَحَدٌ مِنْكُمْ هٰذَا الْقَوْلَ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا، قُلْتُ لَوْ كَانَ أَحَدٌ قَالَ
اور میں نے تجھ سے پوچھا یہ بات تم لوگوں میں اس سے پہلے کسی نے کہی تھی؟ تو نے کہا نہیں، اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ اگر اس سے پہلے
هٰذَا الْقَوْلَ قَبْلَهُ لَقُلْتُ رَجُلٌ يَأْتَسِي بِقَوْلٍ قِيلَ قَبْلَهُ، وَسَأَلْتُكَ هَلْ كَانَ مِنْ
دوسرے نے بھی یہ بات کہی ہوتی (پیغمبری کا دعویٰ کیا ہوتا) تب میں یہ کہتا یہ شخص اگلی بات کی پیروی کرتا ہے، اور میں نے تجھ سے پوچھا اسکے
آبَائِهِ مِنْ مَلِكٍ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا، قُلْتُ فَلَوْ كَانَ مِنْ آبَائِهِ مِنْ مَلِكٍ قُلْتُ رَجُلٌ
بزرگوں میں کوئی بادشاہ گذرا ہے تو نے کہا نہیں، اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ اگر اس کے بزرگوں میں کوئی بادشاہ گذرا ہے تو یہ سمجھ لوں کہ وہ شخص
يَطْلُبُ مُلْكَ أَبِيهِ، وَسَأَلْتُكَ هَلْ كُنْتُمْ تَتَّهِمُونَهُ بِالْكَذِبِ قَبْلَ أَنْ يَقُولَ مَا قَالَ
(پیغمبری کا بہانہ کرکے) اپنے باپ کی بادشاہت لینا چاہتا ہے، اور میں نے تجھ سے یہ پوچھا کہ اس بات کے کہنے سے پہلے تم نے کبھی اس کو جھوٹ
فَذَكَرْتَ أَنْ لَا، فَقَدْ أَعْرِفُ أَنَّهُ لَمْ يَكُنْ لِيَذَرَ الْكَذِبَ عَلَى النَّاسِ وَيَكْذِبَ عَلَى اللهِ
بولتے دیکھا تو تو نے کہا نہیں، تو اب میں نے سمجھ لیا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ لوگوں پر تو جھوٹ باندھنے سے پرہیز کرے اور اللہ پر جھوٹ باندھے

میری اس تقریر پر ابن سعود کی مجلس میں ہر طرف سناٹا چھا گیا اور سلطان ابن سعود نے فرمایا کہ آپ ہمارے علماء سے گفتگو کیجئے، اگر وہ قبول کرلیں تو ہم بھی قبول کرلیں گے، کیونکہ ہم عالم نہیں ہیں ہمیں رد و قبول کا حق حاصل نہیں، یہ بھی فرمایا کہ آپ نے ہمیں بڑے دھوکے سے نکالا۔

قولہ وَاتْرُكُوا مَا يَقُولُ آبَاؤُكُمْ، یہ اس لئے کہا کہ ابو سفیان رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ یہ ایسی چیز کہتے ہیں جس سے ہمارے باپ دادا کی توہین ہوتی ہے تو کیسے قبول کرلیں اور ایک طرح یہ حجت ہے ہرقل کے مقابلہ میں کیونکہ یہ بھی اپنے آباء کے دین پر قائم تھا تو انھوں نے یہ کہنا چاہا کہ تم اپنے دین کو نہیں چھوڑ سکتے اسی طرح ہم معذور ہیں۔

قولہ وَيَأْمُرُنَا بِالصَّلٰوةِ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی درجہ میں یہ جانتے تھے کہ صلوٰۃ کی کچھ حقیقت ہے گو تفصیلاً انھیں علم نہ تھا

قولہ وَالصِّدْقِ، بعض روایات میں بِالصَّدَقَةِ ہے۔

فَقَالَ لِلتَّرْجُمَانِ، سوالات کے بعد اب ہرقل ان سوالات [کے جوابات] پر تبصرہ کرتا ہے کہ جب تم سے ان کے خاندان کی نسبت دریافت کیا گیا تو تم نے کہا کہ وہ ذو نسب ہے، بیشک انبیاء اپنی قوم کے عالی خاندان ہی سے ہوتے ہیں۔

بعض لوگوں نے یہاں پر کچھ تخصیص کی ہے اور یہ کہا ہے کہ جب لوط علیہ السلام کی قوم نے ان کا گھر گھیر لیا اور وہ فرشتوں کو (جو خوبصورت لڑکوں کی شکل میں انھیں تباہ کرنے آئے تھے) لوط علیہ السلام سے مانگ رہے تھے، لوط علیہ السلام بھی ان فرشتوں کو لڑکے ہی سمجھ رہے تھے،

وَسَأَلْتُكَ أَشْرَافُ النَّاسِ اتَّبَعُوهُ أَمْ ضُعَفَاءُهُمْ فَذَكَرْتَ أَنَّ ضُعَفَاءَهُمْ اتَّبَعُوهُ

اور میں نے تجھ سے پوچھا کیا بڑے (امیر) آدمیوں نے اس کی پیروی کی یا غریبوں نے؟ تو نے کہا کہ غریب لوگوں نے اس کی پیروی کی ہے، اور

وَهُمْ أَتْبَاعُ الرُّسُلِ، وَسَأَلْتُكَ أَيَزِيدُونَ أَمْ يَنْقُصُونَ فَذَكَرْتَ أَنَّهُمْ

پیغمبروں کے تابعدار (اکثر) غریب ہی ہوتے ہیں، اور میں نے تجھ سے پوچھا وہ بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں؟ تو نے کہا وہ بڑھ رہے

يَزِيدُونَ وَكَذٰلِكَ أَمْرُ الْإِيمَانِ

ہیں، اور ایمان کا یہی حال رہتا ہے۔

اور سمجھا رہے تھے کہ تم اپنے مطالبے سے باز آجاؤ اور وہ لوگ فرشتوں کو ان سے زبردستی چھین لینا چاہ رہے تھے، تب حضرت لوط علیہ السلام نے نہایت حسرت سے کہا تھا: لَوْ أَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةً أَوْ آوِي إِلَىٰ رُكْنٍ شَدِيدٍ (۱) کاش مجھ میں قوت ہوتی یا میرا کنبہ ہوتا جو میری مدد کرتا کیونکہ حضرت لوط علیہ السلام غیر قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے، اس کے بعد اللہ نے جو نبی بھیجا اس کی ہی قوم کی طرف بھیجا۔

مگر میرے نزدیک تخصیص کی کچھ حاجت نہیں کیونکہ ہرقل کا مطلب یہ نہیں، دراصل یہاں دو چیزیں الگ الگ ہیں، ایک تو یہ کہ نبی جن کے پاس بھیجا گیا وہ نبی کی ہم قوم ہو، دوسری یہ کہ خود نبی عالی نسب وحسب ہو، مبعوث خواہ کسی کی طرف ہو، لوط علیہ السلام کا خاندان بھی کوئی گھٹیا خاندان نہ تھا، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان سے تھے، ہم قوم نہ ہونا اور چیز ہے اور ہرقل یہ نہیں کہہ رہا بلکہ وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام ہمیشہ شریف نسب والے ہی ہوتے ہیں، کم ظرف وذلیل خاندان کے نہیں ہوتے تاکہ لوگ انھیں ذلیل سمجھ کر [ان کی اطاعت میں عار وننگ نہ محسوس کریں]

قیصر نے کہا کہ تم نے کہا ان کے گھرانے میں پہلے کوئی بادشاہ نہیں ہوا تو اب یہ خیال نہیں ہوسکتا کہ اس نے بھی گڑھ کر یہ بات اس لئے نکالی ہے کہ اس ڈھنگ سے وہ اپنی کھوئی ہوئی بادشاہت حاصل کرنا چاہتا ہے، پس یہ بھی ایک قرینہ ہے کہ منجانب اللہ کہتا ہے، اور کسی نے اس خاندان میں نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تو یہ بھی قرینہ ہے اس کی صداقت کا۔

تم نے کہا کہ وہ متہم بالکذب بھی نہیں ہے، جب وہ لوگوں پر جھوٹ نہیں بولتا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمیوں پر تو جھوٹ نہ بولے اور اللہ پر جھوٹ باندھنے لگے۔

تم نے کہا ضعفاء ان کے متبع ہیں تو [یہ بھی ان کے پیغمبر ہونے کی علامت ہے، اس لئے کہ] انبیاء کے متبعین اکثر ضعفاء ہی ہوتے ہیں

---

(۱) سورہ ہود: ۸۰

حَتّٰی یَتِمَّ ، وَسَأَلْتُكَ اَيَرْتَدُّ اَحَدٌ سَخْطَةً لِدِيْنِهٖ بَعْدَ اَنْ يَدْخُلَ فِيْهِ ،

جب تک وہ پورا نہ ہو' اور میں نے تجھ سے پوچھا کوئی اس کے دین میں آکر اس کو برا سمجھ کر اس سے پھر جاتا ہے ؟ تو نے کہا نہیں' اور ایمان کا

فَذَكَرْتَ اَنْ لَا ، وَكَذٰلِكَ الْاِيْمَانُ حِيْنَ تُخَالِطُ بَشَاشَتُهُ الْقُلُوْبَ ، وَسَأَلْتُكَ هَلْ

یہی حال ہے' جب اس کی خوشی دل میں سما جاتی ہے (تو پھر نہیں نکلتی) اور میں نے تجھ سے پوچھا وہ عہد شکنی کرتا ہے؟ تو نے کہا نہیں،

يَغْدِرُ ، فَذَكَرْتَ اَنْ لَا ، وَكَذٰلِكَ الرُّسُلُ لَا تَغْدِرُ ، وَسَأَلْتُكَ بِمَا يَأْمُرُكُمْ فَذَكَرْتَ

اور پیغمبر ایسے ہی ہوتے ہیں' وہ عہد نہیں توڑتے' اور میں نے تجھ سے پوچھا وہ تم کو کیا حکم دیتا ہے؛ تو نے کہا وہ تم کو یہ حکم

اَنَّهٗ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تَعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَيَنْهٰكُمْ عَنْ عِبَادَةِ الْاَوْثَانِ

دیتا ہے کہ اللہ کو پوجو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور بت پرستی سے تم کو منع کرتا ہے اور نماز اور سچائی کا اور

وَيَأْمُرُكُمْ بِالصَّلٰوةِ وَالصِّدْقِ وَالْعَفَافِ ، فَاِنْ كَانَ مَا تَقُوْلُ حَقًّا فَسَيَمْلِكُ مَوْضِعَ

حرام کاری سے بچے رہنے کا حکم دیتا ہے ، پھر تو جو تو کہتا ہے اگر سچ ہے تو وہ عنقریب اس جگہ کا مالک ہو جائے گا

قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ ، وَقَدْ كُنْتُ اَعْلَمُ اَنَّهٗ خَارِجٌ وَلَمْ اَكُنْ اَظُنُّ اَنَّهٗ مِنْكُمْ ، فَلَوْ

جہاں میرے یہ دونوں پاؤں ہیں (یعنی شام کے ملک کا) اور میں جانتا تھا کہ یہ پیغمبر آنے والا ہے لیکن میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ تم میں سے ہوگا' پھر

اَنِّیْ اَعْلَمُ اَنِّیْ اَخْلُصُ اِلَيْهِ لَتَجَشَّمْتُ لِقَاءَهٗ ،

اگر جانوں کہ میں اس تک پہونچ جاؤں گا تو اس سے ملنے کی ضرور کوشش کروں گا

کیونکہ [بڑے لوگوں کے لئے] نخوت و ثروت اور تکبر و غرور مانع عن القبول ہوتا ہے ۔

چنانچہ قرآن میں ہے کہ عیسےٰ علیہ السلام کی اس دعوت پر کہ : مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰهِ ، قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (۱) یعنی کون میرا مددگار ہے اللہ کی راہ میں ؟ حواریوں نے لبیک کہا' اور مشہور ہے کہ حواری لوگ دھوبیوں کی جماعت سے تھے ۔

بعضوں نے لکھا ہے کہ مسیح علیہ السلام جب ادھر سے گذرے جہاں یہ لوگ کپڑے دھو رہے تھے تو مسیحؑ نے ان سے کہا آؤ تمھیں دلوں کا دھونا بھی سکھا دوں' تو ان لوگوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی یہ دعوت قبول کرلی' پھر ان میں بڑے بڑے ولی ہوئے ۔

قیصر آگے کہتا ہے کہ تم نے کہا وہ بڑھ رہے ہیں' یعنی خواہ عدد کے اعتبار سے ہوں یا دین میں قوت و کیفیت کے اعتبار سے

---

(۱) سورہ صف : ۱۴

وَلَوْكُنْتُ عِنْدَهُ لَغَسَلْتُ عَنْ قَدَمَيْهِ، ثُمَّ دَعَا بِكِتَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ
اور اگر میں اس کے پاس (مدینہ میں) ہوتا تو اس کے پاؤں دھوتا (خدمت کرتا) پھر اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط منگوایا جو
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّذِيْ بَعَثَ بِهِ مَعَ دِحْيَةَ الْكَلْبِيِّ إِلَى عَظِيْمِ بُصْرٰى، فَدَفَعَهُ
آپ نے دحیہ کلبی کو دے کر (۶ھ میں) بُصریٰ کے حاکم کو بھیجا تھا، اس نے وہ خط ہرقل کے پاس بھیج دیا تھا، ہرقل نے اس کو
عَظِيْمُ بُصْرٰى إِلَى هِرَقْلَ فَقَرَأَهُ فَإِذَا فِيْهِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مِنْ مُحَمَّدٍ
پڑھا اس میں یہ لکھا تھا: شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان ہے رحم والا، محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی طرف سے
عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ إِلَى هِرَقْلَ عَظِيْمِ الرُّوْمِ سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى،
ہرقل روم کے رئیس کو معلوم ہو جو سیدھے رستے پر چلے اس کو سلام، اس کے بعد تجھ کو اسلام کے کلمہ (لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ) کی
أَمَّا بَعْدُ فَإِنِّيْ أَدْعُوْكَ بِدِعَايَةِ الْإِسْلَامِ أَسْلِمْ تَسْلَمْ يُؤْتِكَ اللّٰهُ أَجْرَكَ
طرف بلاتا ہوں، مسلمان ہو جا تو تو بچا رہے گا، اللہ تجھ کو دوہرا ثواب دے گا، پھر اگر تو یہ بات نہ مانے تو تیری رعایا کا (بھی) گناہ
مَرَّتَيْنِ، فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَإِنَّ عَلَيْكَ إِثْمَ الْأَرِيْسِيِّيْنَ،
تجھ ہی پر ہوگا (اور یہ آیت لکھی تھی:)

تو انبیا کا یہی معاملہ ہوتا ہے۔

[كذلك امر الايمان حتى يتم] تمام ہونے کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ احکام تمام ہو جائیں یا عدد میں زیادتی ہو جائے اس پر اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (۱) دلالت کرتا ہے، اور دوسرا اتمام وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۲) میں ہے پہلا احکام کا اتمام ہے اور دوسرا غلبہ و قوت کا۔

تم نے کہا کہ کوئی اس کے دین میں داخل ہو کر پھرتا نہیں، یعنی اس دین سے ناخوش ہو کر مرتد نہیں ہوتا، تو ایمان کی یہی شان ہوتی ہے کہ جب انشراح دلوں میں رچ جاتا ہے تو رگ و پے میں ایسا سما جاتا ہے کہ اب ممکن نہیں کہ وہ پھر جائے، بشاشة القلوب کی دو قراتیں ہیں ایک ہا کے ساتھ، دوسری بلا ہا کے۔

آگے کہتا ہے کہ تم نے کہا وہ غدر نہیں کرتے (غدر مقابل عہد ہے اور عہد طرفین سے ہوتا ہے اور وعدہ ایک طرف سے

---

(۱) سورہ مائدہ: ۳ (۲) سورہ صف: ۸

. . . .

ہوتا ہے) تو رسولوں کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ غدر نہیں کرتے — تبصرہ کے بعد قیصر کہتا ہے کہ بھائی ان کی نبوت میں کوئی شبہہ نہیں معلوم ہوتا، سارے قرائن تصدیق کرتے ہیں (گو دلائل یقینی نہ ہوں) اور اگر جو کچھ تم نے بیان کیا یہ سچ ہے تو یہ زمین جو میرے قدموں کے نیچے ہے انکے قبضہ میں آجائے گی۔ یعنی بیت المقدس بھی فتح کرلیں گے (چنانچہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں اسکا ظہور ہوا) اور یہ بات تو مجھے پہلے سے معلوم تھی کہ نبی ظاہر ہونیوالے ہیں لیکن میرے وہم و خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ تم میں سے (عرب) ہوں گے۔

قولہ انی اخلص الیہ یعنی اگر مجھے یقین ہوتا کہ میں ان کے پاس پہونچ سکوں گا تو ضرور پہونچنے کی کوشش کرتا اور کلفتیں اٹھاکر جاتا (یہ اس لئے کہاکہ وہ جانتا تھاکہ میری قوم اس وقت مجھ کو قتل کر دیگی) اور اگر پہونچ جاتا تو ان کے پیروں کو دھوکر پیتا۔

پھر کہا اب وہ نامۂ مبارک لاؤ، چنانچہ وہ تحریر لائی گئی تو ہرقل نے اس کو پڑھا جس کا یہ مضمون تھا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، من محمد عبداللہ ورسولہ الیٰ ھرقل عظیم الروم، سلامٌ علیٰ من اتبع الھدیٰ، اوّل بسم اللہ پھر اپنا نام، اس میں عبداللہ لکھ کر نصاریٰ کا رد فرمادیا کہ وہ جن کو مانتے ہیں وہ کیا خدا ہوں گے میں جو افضل الرسل ہوں اپنے کو خدا نہیں لکھتا اور نہ مجھے اپنے کو عبد کہنے میں کوئی عار ہے، اسی کو فرمایا: لن یستنکف المسیح ان یکون عبدًا للہ[1] الخ یعنی مسیح یا مقرب فرشتے ناک نہیں چڑھاتے کہ اپنے آپ کو اللہ کا عبد کہیں۔

عرب کا دستور یہی تھا کہ کاتب اپنا نام پہلے لکھتا اور مکتوب الیہ کا بعد کو، اور یہی طبعی ترتیب بھی ہے کیونکہ یہ فاعل کتابت ہے اور یہ مصدر ہے اور مکتوب الیہ کو بعد میں ملے گا، اور یہی معمول صحابہ تھا اور اس میں سادگی بھی ہے۔

القاب میں بجائے شہنشاہ یا سلطان کے عظیم الروم کہا کیونکہ اسلام کسی کافر کے حق میں غلو قبول نہیں کرتا، اس سے مسئلہ نکالا گیا کہ کسی کافر کا اکرام کسی حد تک جائز ہے بشرطیکہ مبالغہ نہ ہو۔

دوسرا جملہ ہے سَلامٌ علیٰ مَن اتبع الھُدیٰ، سَلامٌ علیکم نہیں کہا اس لئے کہ وہ اب تک کافر تھا، اسلئے لکھا: سلام اس پر جو ہدایت کی اتباع کرے۔

فانی ادعوک الخ دِعَایَۃٌ بروزن شکایۃ مصدر ہے، اس سے مراد اسلام کی طرف بلانا ہے، بعض نسخوں میں بداعیۃ الاسلام ہے اور وہ داعیہ کلمۂ شہادت ہے۔

---

(۱)

. . . .

اَسۡلِمۡ، اسلام لا ۔ تَسۡلَمۡ، صحیح وسالم رہے گا، اسلام پر سلامتی کو متفرع کیا، اصل سلامت عذاب اللہ سے بچنا ہے ۔ مگر ممکن ہے یہاں تبعًا یہ بھی مقصود ہو کہ تیرا ملک صحیح وسالم رہے گا، اور یہ کہ اسلام سبب ہے بقاء حکومت کا، پہلے یہاں اسلام کا لفظ آیا پھر بعد میں اَسۡلِمۡ کہا، اس کو بعد میں بیان کروں گا ۔

یؤتك الله اجرك مرتین ۔ یعنی صرف وقایت عن الغضب ہی نہیں بلکہ دوگنا اجر بھی ملے گا ۔ بعض لوگوں نے وجہ یہ بتائی کہ ایک اجر اتباعِ مسیح علیہ السلام کا اور دوسرا اتباع خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا جیساکہ حدیث میں ہے کہ اہل کتاب جب ایمان لاتے ہیں تو ان کو دوہرا اجر ملتا ہے اور قرآن میں ہے : اولئك یُؤتون اجرهم بما صبروا [1]

کتاب العلم یا کتاب الایمان میں وہ حدیث آنے والی ہے کہ اہل کتاب کو بشرط ایمان علی نبینا صلی اللہ علیہ وسلم دوہرا اجر ملے گا، اشکالات کا حل وہیں ہوگا، تو بعض لوگ اجرك مرتین کی یہ توجیہ کرتے ہیں اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ مراد نہیں بلکہ آگے دوسرے جملے میں جو اشارہ ہے اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ ایک [اجر تو اس کا کہ] اس نے خود اسلام قبول کیا اور دوسرا [اجر اس کا] کہ اس کے اسلام لانے کی وجہ سے اور بہت سے لوگ اسلام لائیں گے کیونکہ آن لوگوں کا سلطان ہے تو اس کا اسلام سبب ہوگا مخلوق الٰہی کے اسلام کا، لہٰذا ایک اجر خود اس کے اسلام کا دوسرا اجر تسبب کا، حدیث میں ہے الدال علی الخیر کفاعله

میرے نزدیک اس مقام پر دوسرے معنی ہی مناسب ہیں اور پہلے معنی کے متعلق آگے تحقیق کی جائے گی، وجہ مناسبت معنیٰ ثانی کی یہ ہے کہ آگے فرماتے ہیں :

فان تولیت فان علیك اثم الاریسیین ۔ اس میں چار لغت ہیں ایک یہ کہ یریسی یا اریسی کی جمع ہے، بعض نے کہا اریس یا یریس کی جمع ہے تو یریسیّین بیاءین اور یریسین بیاء واحد، اسی طرح اریسیین بیاءین اور اریسین بیاء واحد، یہ سب نسخے ہیں، اس کے معنی کاشتکار اور زراع کے ہیں، مطلب یہ کہ تیری رعایا جو تیرے انکار کی وجہ سے اسلام قبول نہ کرے گی تو ان سب کا گناہ تیرے اوپر ہوگا، یہ نہیں کہا کہ صرف تیرا ہی گناہ تجھ پر ہوگا، اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ جب صرف سبب بننے سے دوسرے کا گناہ اس کے سر ہوگا تو خود اس کا بطریق اولیٰ ہوگا، یہ ایسا ہی ہے جیساکہ قرآن میں فرمایا گیا : انی ارید ان تبوٓأ باثمی واثمك فتكون من اصحاب النار [2] چونکہ وہ بادشاہ تھا اور رعیت بادشاہ کا مذہب قبول کرتی ہے (بالخصوص اس دور میں) اس لئے اس کا اثر رعیت

---

(۱) سورۂ قصص : ۵۴ ۔ (۲) سورہ مائدہ : ۲۹

وَيٰاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ
کتاب والو! اس بات پر آجاؤ جو ہم میں تم میں یکساں ہے کہ اللہ کے سوا اور کسی کو نہ پوجیں اور اس کا شریک کسی کو نہ ٹھہرائیں اور اللہ کو
شَيْـــًٔـا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝
چھوڑ کر ہم میں سے کوئی دوسرے کو خدا نہ بنالے۔ پھر اگر وہ (اس بات کو) نہ مانیں تو (مسلمانو!) تم ان سے کہہ دو گواہ رہنا ہم تو (ایک خدا کے)
تابعدار ہیں

ضرور پڑے گا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عذاب سے آزاد ہو جائیں گے، عذاب ان پر بھی ہوگا مگر اس پر اپنا بھی ہوگا اور ان سب کا بھی جن کے عدم اسلام کا یہ سبب بنا ہے۔

قرآن میں ویا اهل الکتاب واو عطف کے ساتھ نہیں ہے، یہاں ادعوك بدعاية الاسلام پر عطف کرنے کے لئے لایا گیا ہے، حاصل آیت کریمہ کا یہ ہے کہ اے اہل کتاب اس ایک کلمہ کی طرف آجاؤ جو ہم میں تم میں مشترک ہے اور دونوں کے نزدیک یکساں ہے، برابر ہونے کا مطلب کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے کیونکہ یہود (۱) عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے اور نصاریٰ مسیح علیہ السلام کو، نیز اپنے احبار اور رہبان (۲) کو ارباب بنائے ہوئے تھے پھر ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ (۳) کیسے صحیح ہوگا اور کلمۃ سواء بیننا کیونکر درست ہوگا؟ —— جواب سے پہلے یہ سمجھ لو کہ دنیا کے تمام فرقوں پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ ہر فرقہ کسی نہ کسی درجہ میں اقرار کرتا ہے کہ خدا ایک ہے، توحید کا قطعی منکر ہو ایسا نہیں ہے، اہل ہند جو تینتیس ۳۳ کروڑ بت مانتے ہیں، درخت، پتھر، بجلی چاند، سورج سب کو معبود مانتے ہیں، مگر ان سے پوچھو کہ سب سے بڑا کون ہے جو سب کا مالک ہے، تو کہیں گے وہ پرمیشور ہے، پرمیشور اسے کہتے ہیں جسے ہم معبود کہتے ہیں۔ مجوس دو خدا مانتے ہیں، ایک خالق خیر (یزداں) دوسرا خالق شر (اہرمن) بظاہر یہ شرک فی الذات ہے گر جب ہم نے ان سے سوال کیا تو معلوم ہوا کہ اصل منبع ایک ہی ہے پھر دو شاخیں ہوگئی ہیں جس طرح ہم ابلیس کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے اسی طرح وہ لوگ اہرمن کو یزداں کے تابع کر دیتے تھے، اہل کہ بھی اللہ کو ایک درجہ میں واحد ہی مانتے تھے، قرآن نے فرمایا: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (۴) آگے فرمایا: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ

---

(۱) وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ (سورۂ توبہ: ۳۰)

(۲) اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ (سورۂ توبہ: ۳۱)

(۳) سورۂ آل عمران: ۶۴ (۴) سورۂ عنکبوت: ۶۱

مَنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ[1] دوسری جگہ فرمایا: قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ[2] اس کے بعد فرمایا: قُلْ مَنْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّهُوَ یُجِیْرُ وَ لَا یُجَارُ عَلَیْهِ[3] یہ سب آیات مشرکین مکہ کا عقیدہ بتارہی ہیں، مگر یہاں بحث یہود و نصاریٰ سے ہے، نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کو ثالث ثلثۃ کہتے تھے اور بعض ابن اللہ کہتے ہیں گویا مثلث تو ہے مگر غیر متساوی الاضلاع کیونکہ باپ سب سے بڑا ہے، بعض نے بجائے روح القدس کے مریم کو شامل کر دیا مگر ان سے جب سوال کرو کہ خدا کتنے ہیں تو یہی جواب دیں گے کہ ایک ہے، اس کا نام توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید ہے، یہ عقیدہ بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ حقیقتاً اس کا ایک بھی ہونا اور تین بھی ہونا ناممکن ہے اسلئے کہ یہ اجتماع نقیضین ہے، جب گفتگو میں اس مسئلہ کو سمجھا نہ سکے تو ان کے سب سے بڑے پادری فنڈر نے ایک کتاب میزان الحق لکھی اس کا اردو ترجمہ میں نے دیکھا ہے اس نے آخر میں لکھا ہے کہ یہ ایک سر ہے اور متشابہات میں سے ہے، عقل وہاں تک نہیں پہونچ سکتی اس لئے اس کا سمجھنا ریاضت پر موقوف ہے، مگر اس سے پوچھئے کہ پھر تو عیسائی بننے کے بعد (اور وہ بھی مکمل ریاضت کے بعد) یہ مسئلہ منکشف ہوگا حالانکہ یہ بات بطور عقیدہ سب سے پہلے قبول کرائی جاتی ہے اور اسی کو مدار عیسائیت قرار دیا گیا ہے، تو جب یہ مدار عقل میں آجائے تب ہی تو قبول کرے گا، اور اس کو متشابہات سے قرار دینا بھی دھوکہ ہے کیونکہ متشابہ اسے کہتے ہیں کہ عقل اس کا انکار نہ کرے بلکہ کہے کہ عقل انسانی سے بالاتر ہے جیسے اللہ کی صفات کہ سمع و بصر اور کلام سب مسلم ہیں مگر کیفیت ہمیں معلوم نہیں تو یہ متشابہات سے ہیں، اور اگر کوئی کہے کہ یہ دن ہے اور رات بھی ہے اور جب پوچھیں کہ یہ کیسے تو کہہ دے کہ یہ متشابہات سے ہے تو یہ باطل ہے کیونکہ یہ اجتماع نقیضین ہے اور جب اجتماع نقیضین وارتفاع جائز ہوا تو پھر دنیا میں محال کیا رہا، بہرحال متشابہ کے یہ معنی نہیں بلکہ متشابہ کے معنی وہی ہیں کہ عقل انکار نہ کرے بلکہ یہ ہے کہ کیفیت ہمیں معلوم نہیں، اور تمہارے عقیدے کو تو عقل ٹھکراتی ہے اور اسے محال قرار دیتی ہے تو یہ متشابہات میں سے کیسے ہوا؟ اور اگر متشابہات میں سے مان بھی لیں تو متشابہات کا ماننا اسلام کا بنیادی عقیدہ نہیں بلکہ بنیادی عقیدہ کلمۂ توحید ہے اور تمہارے مذہب کی بنیاد ہی اس پر ہے۔

مقصود یہاں یہ بتانا ہے کہ جو قوم تین مانتی ہے وہ بھی توحید کی منکر نہیں تو آخر کیا چیز انھیں ایک کہنے پر مجبور کرتی ہے سنو! اس کی وجہ یہ ہے کہ کتب سماویہ توحید کی تعلیم سے بھری ہوئی ہیں، بائبل کے صفحات مملو ہیں توحید کی تعلیم سے پھر کیسے انکار کر سکتے ہیں،

---

(۱) سورہ عنکبوت : ۶۳ (۲) سورہ مؤمنون: ۸۶، ۸۷ (۳) سورہ مؤمنون : ۸۸، ۸۹

. . . .

اس لئے ایسی صورت نکالی کہ توحید بھی رہے اور تثلیث بھی، تو توحید کو اس قدر مضبوطی سے پکڑا کہ اجتماع نقیضین کو بھی جائز قرار دے دیا جائے بتلاتا ہے کہ فطرتِ انسانی کا تقاضا یہ ہے کہ ایک ہی ہستی ہونی چاہئے جو سب سے ارفع و اعلیٰ ہو، اس لئے سب توحید کے قائل ہیں، یہود اپنے کو سب سے بڑا موحد کہتے ہیں حتی کہ مسلمانوں سے بھی زائد، عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ جمہور یہود نہیں کہتے بلکہ انکا ایک فرقہ تھا جس کے بارے میں فتح الباری میں لکھا ہے کہ وہ اب منقرض ہوگیا اور اب اس کا کوئی قائل نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ضرور تھے، ورنہ یہود اس کی تردید کرتے، مگر قرطبی وغیرہ نے لکھا ہے کہ اب ان میں سے کوئی عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ نہیں کہتا، میں اس پر ایک حکایت نقل کرتا ہوں، حاجی امیر شاہ خاں صاحب ایک بزرگ تھے، یہ عالم نہ تھے مگر صحبت بزرگوں کی اٹھائی تھی، ان کا حال یہ تھا کہ بڑے بڑے اساتذہ ان سے پوچھتے تھے کہ یہ مسئلہ کیسا ہے ؟ اور آپ نے کیا سنا ہے ؟ تو وہ ایسا جواب دیتے تھے کہ سننے والا سمجھتا تھا کہ بڑے عالم ہیں، تعبیر و تقریر نہایت عمدہ تھی، وہ مجھ سے بیان کرتے تھے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اب عزیرؑ کو ابن اللہ کہنے والا کوئی نہیں، تو مجھے اس کی فکر تھی اور جہاں جہاں مجھے یہود ملے میں نے سب سے پوچھا، سب نے انکار کیا اور کہا یہ نسبت ہماری طرف غلط ہے، حتی کہ جب میں بیت المقدس پہونچا تو ان کے علماء سے میں نے حلف دیکر پوچھا، سب نے انکار کیا مگر ایک بوڑھے شخص نے جو بہت مرتاض تھا کہا ہاں! اب بھی ایک فرقہ ہے جو عزیرؑ کو ابن اللہ کہتا ہے، اس فرقہ کا نام بھی عزیریہ ہے مگر اب وہ بہت کم ہیں اور ایک قریہ میں رہتے ہیں اور ذلت و مسکنت ان پر مسلط ہے، میں وہاں پہونچا اور دریافت کیا کہ تمھارا عقیدہ کیا ہے ؟ تو انھوں نے کہا کہ ہم کو عزیرؑ کے ابن اللہ ہونے کا ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ اللہ کا، یہ آدمی یعنی حاجی امیر شاہ خاں صاحب بہت ثقہ تھے، ہمارے بزرگ انھیں صادق القول کہتے تھے، میں نے شرح مسلم میں بھی اس کو نقل کیا ہے، بہرحال جمہور یہود اس کے قائل نہیں وہ توحید ہی کے قائل ہیں، اب رہا یہ کہ ان کی توحید میں کیا نقص ہے، اسے بعد میں بیان کروں گا، یہاں یہ مقصود ہے کہ ایک مرتبہ میں سبھی خدا کو ایک کہتے ہیں، یہ اساسی اور بنیادی عقیدہ ہے مگر آگے جاکر تصرف کرکے ایک کو تین کہدیا۔

اس کے بعد سنو کہ نبی علیہ السلام کی دعوت کا حاصل یہ ہے کہ میں اس چیز کی طرف دعوت دیتا ہوں جو ہم میں تم میں مشترک ہے اور جب تم بھی ایک کہتے ہو تو پھر تین کیسے کہنے لگے ؟ یہ تغیر کیوں کرتے ہو ؟ اور جب وہ ایک ہے تو عبادت بھی صرف اسی ایک کی ہونا چاہئے، ایک کہنے کا مقتضی یہی ہے کہ تنہا اسی کی عبادت کی جائے، اگر پھر بھی وہ نہ مانیں اور کسی دوسرے کو بھی پوجنے لگیں تو اس سے ثابت ہوگا کہ ایک بات پر قائم نہ رہے اور پھر گئے، اب اگر وہ ایسا کریں تو تم کہدو کہ اے لوگو تم شاہد رہو کہ ہم مسلم ہیں، ہم کسی طرح کا تغیر نہیں کرتے صرف اسی اللہ واحد کو معبود سمجھتے ہیں اور تم کہنے کو تو ایک کہتے ہو مگر اس پر قائم نہیں رہے بلکہ تم نے اپنا دعویٰ خود توڑ دیا، تو اگر تم پھر گئے تو ہم

. . . .

اس حکم الٰہی کے منقاد اور مسلّم ہیں ۔

اب یہ بھی سمجھ لو کہ شرک کی کئی قسمیں ہیں ، شرک فی الذات ، شرک فی الصفات ، شرک فی الالوہیت ، امت محمدیہ کے سوا دنیا کا کوئی فرقہ خالص توحید کا علمبردار نہیں ، کہتے سب ہیں کہ اللہ ایک ہے ، لیکن ان میں سے عیسائی اسی کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام جو آدمیوں ہی کی طرح سب کام کرتے تھے خدا ہیں ، تو جو بشر کو خدا بنا دے وہ ایک کہنے پر کب قائم رہا ، اور ان میں سے کسی نے خدا کو بشر بنا دیا جیسے یہود کہ انھوں نے خدا کو بشر بلکہ بشر سے بھی ادنیٰ درجہ پر پہونچا دیا ، اس میں ایسے صفات مانے کہ ادنیٰ آدمی میں بھی ایسے رذائل نہیں ہو سکتے ، توراۃ میں ہے کہ جب نوح علیہ السلام کے طوفان سے تمام خدائی بہہ گئی اور اللہ کو خبر ہوئی تو بڑا رنج ہوا اور روتے روتے اللہ کی آنکھیں سوج گئیں اور فرشتے عیادت کے لئے گئے ۔ ایک جگہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور یعقوب علیہ السلام کے درمیان کشتی ہوئی اور یعقوب علیہ السلام نے اللہ کو پچھاڑ دیا ، بعض نے توجیہ کی کہ یہ استعارے ہیں ، معاذ اللہ ، استغفر اللہ ، کیا اللہ کے لئے ایسے ہی استعارے رہ گئے تھے ؟ اور استعارے کیسے مانے جائیں ، انھیں یہود کا یہ قول بھی تو اللہ تعالیٰ نقل کرتا ہے : وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ [1] نیز یہود کا یہ قول بھی قرآن نے نقل فرمایا : اِنَّ اللّٰهَ فَقِيرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَاءُ [2] تو جو اللہ کے بارے میں ایسی بات کہتا ہو اس سے کیا بعید ہے کہ اللہ کے بارے میں اس نے یہ بھی کہدیا ہو کہ یعقوبؑ نے کشتی میں اللہ کو پچھاڑ دیا ۔ تو ایک نے بشر کو خدا کہا اور دوسرے نے خدا کو بشر بنا دیا ، اب رہے ہندو تو انھوں نے کروڑوں بت بنا ڈالے اور وہ اپنی گستاخی میں اس حد تک پہونچ گئے کہ ہر چیز کی پرستش کرنے لگے حتیٰ کہ انسان کے ان اعضا کی بھی پرستش کرنے لگے جن کا ذکر ہم مجلس میں نہیں کر سکتے ، تو جن کا حال یہ ہو وہ کیونکر مستقیم فی التوحید ہوں گے ۔

الحاصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسی فطرت کی طرف ہے جس پر انسان پیدا کیا گیا ہے ، یہ اصل اسلام کے عقیدے کی بات ہے ، اگر کوئی مسلمان اس کے خلاف کرے تو ہمیں اس سے کچھ سروکار نہیں ۔ ہم تو ایک ہی کو معبود کہتے ہیں ، ایک ہی کو خالق ، ایک ہی کو حلال و حرام کرنے والا ، ایک ہی کو نفع و نقصان پہونچانے والا ، غرض یہ کہ ایک ہی ایک ہے ، کسی چیز میں اس کا کوئی شریک نہیں ، کوئی ضد نہیں کوئی ند نہیں ، ــــــــ خط کا مضمون ختم ہوا ۔

کیا ہر دینِ برحق اسلام ہے

اب اسلام کے متعلق کچھ کہنا ہے ، اس مقام پر اسلام کا لفظ تین جگہ آیا ہے ، اس میں گفتگو ہے کہ اسلام خاص اسی دین محمدی کا نام ہے یا ادیان سماویہ حقہ میں سے ہر ایک کا نام اسلام ہو سکتا ہے ؟ اسی پر متفرع ہے یہ بات کہ مسلم صرف اسی کو کہیں گے جو دین محمدی کا ماننے والا ہے ، یا سب کو کہیں گے ؟

---

(۱) مائدہ : ۶۴ (۲) آل عمران : ۱۸۱

. . . .

زرقانی نے اس مسئلہ پر بہترین بحث کی ہے، اسی طرح امام سیوطی نے بھی اپنے رسالہ "اتمام النعمۃ" میں اچھی بحث کی ہے
زیادہ تر لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ اس کا اطلاق صرف دین محمدی پر ہے، مگر محققین علماء یہ کہتے ہیں کہ قرآن میں بہت سے مقامات میں دوسری امتوں پر بھی یہ لفظ بولا گیا ہے، چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: فَلَا تَمُوتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ (۱) یہاں اسلام کی نسبت اپنی امت کی طرف فرمائی، اسی طرح ان کے بیٹوں سے جب سوال کیا گیا: مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ (۲) میرے بعد کس کی پرستش کروگے؟ تو جواب دیا: نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۳) یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے سب بیٹے کہہ رہے ہیں کہ ہم مسلم ہیں۔ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جہاں خطاب کیا گیا وہاں فرمایا: اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۴) جب ابراہیمؑ سے ان کے رب نے کہا اَسْلِمْ (اسلام لاؤ) انھوں نے کہا اَسْلَمْتُ (میں اسلام لایا) اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کہتے ہیں: تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ (۵) (مجھے مسلم بنا کر وفات دے اور صالحین کے ساتھ شامل کردے)

بہرحال مسلم کا لفظ دوسری امتوں پر بولا تو ضرور گیا ہے مگر اس بارے میں امت محمدیہ کی کچھ خصوصیت ہے اور وہ یہ ہے کہ دوسری امتوں پر لغوی اعتبار سے اطلاق کیا گیا ہے اور لقب کے طور پر یہ صرف دین محمدی کے لئے ہے جیسے حافظ کا لفظ کہ حافظ سیکڑوں ہوئے مثلاً ابن قیم، ابن تیمیہ، تقی الدین، ابن دقیق العید وغیرہ سب حافظ ہیں مگر جب کہا جائے یا لکھا جائے کہ حافظ نے کہا یا حافظ نے لکھا تو یہی سمجھا جائے گا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے کہا یا لکھا، یعنی ان کا یہ لقب ٹھہر گیا اس لئے کسی دوسرے کا یہ لقب نہیں بنے گا اسی طرح گو دوسروں کے لئے اسلام اور مسلم کا اطلاق کیا گیا ہے انبیاء علیہم السلام پر بھی اور دوسری امتوں پر بھی مگر لقب خاص صرف اسی امت کے لئے ہے، اس کا نام ہی مسلم رکھ دیا گیا جیسا کہ دوسری امتوں میں سے کسی کا یہود، کسی کا نصاریٰ نام رکھ دیا گیا۔ تو اب جب اسلام بولیں گے تو یہی دین محمدی مراد ہوگا اور یہی متبادر ہوگا، اصل یہ ہے کہ اسلام کے لغوی معنی تسلیم و تفویض کے ہیں گو اس کے اور بھی کئی معنی ہیں مگر میری بحث اس وقت اس معنیٰ سے ہے، تو جتنے بھی انبیاء علیہم السلام تشریف لائے سب نے اسی اسلام کی تعلیم دی اور تمام انبیاء و رسل کی یہی دعوت تھی کہ اللہ کے احکام کے سامنے گردن ڈال دیں اور اس کے اوامر کی بجاآوری اور نواہی سے اجتناب کریں اور اپنے تمام امور کو اللہ کے سپرد کردیں، تواضع، خضوع خشوع، جھکنا، پستی، جس کا خلاصہ تفویض ہے سب اللہ کے لئے ہو چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو یہی لکھا تھا

---

(۱) آل عمران: ۱۰۲ (۲) بقرہ: ۱۳۳ (۳) بقرہ: ۱۳۳ (۴) بقرہ: ۱۳۱ (۵) یوسف: ۱۰۱

. . . .

وَأَتُونِي مُسْلِمِينَ (ای مطیعین)

یا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو کہا جارہا ہے اَسْلِمْ تو کیا [اس کا] یہ مطلب ہے کہ اب تک اسلام نہ تھا؟ نہیں بلکہ یہاں لغوی معنی مراد ہیں کہ خود کو ہمارے سپرد کردو، تو انھوں نے کہا کہ میں تو پہلے ہی اپنے کو آپ کے سپرد کرچکا ہوں، اور اس کا حل آیت فَلَمَّا اَسْلَمَا سے ہوا، یہاں اَسْلَمَا سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ مراد ہے کہ اب کلمہ پڑھا؟ نہیں! بلکہ یہ کہ باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے میں تامل نہ کیا حالانکہ [اس کو] بڑی بڑی تمناؤں سے پالا تھا مگر حکم ہونے پر اسے اللہ کے سپرد کردیا اور بیٹے نے بھی کہا: "باوا جان! جو حکم کیا گیا ہے کرگذریئے، کیوں تاخیر ہے؟ ہم تو [اپنے کو] سپرد کرچکے" دوسرے لفظوں میں کہو کہ "مسلمانی" حکم برداری کا نام ہے خواہ کوئی حکم ہو اور کسی وقت ہو اس اسلام کی دعوت تمام انبیاء نے دی اور حضورؐ نے بھی اسی کی دعوت دی، تو اسلام کے معنی یہ ہوئے کہ جس وقت جو حکم جس شخص کے ذریعہ بندے کی طرف پہونچے بس اسے فوراً قبول کرلے، جب اسلام کے یہ معنی ٹھہرے تو کیا منکر مسیح مسلم ہوسکتا ہے؟ اسی طرح جتنے بعد کو نبی آئے وہ پہلے کی تصدیق کرتے ہیں لہٰذا جب کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مان لیا تو گویا تمام انبیاء کو مان لیا، تو اسلام کا یہ فرد کامل کہ کوئی چیز اس سے خارج نہ ہو سوائے اہل اسلام کے اور کسی کے اندر نہیں پایا جاتا، اللہ کے کلام کی سب نے دعوت دی مگر آخری پیام اور آخری احکام چونکہ حضورؐ نے پہونچائے اس لئے یہ پیغام اکمل تر ہے، نیز یہ عالمگیر، ابدی اور جامع تر ہے، یہ اس کی خصوصیات ہیں، ان وجوہ مرتبہ کی وجہ سے اس کا نام اسلام ہوگیا۔

اب اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا یاد کرو: وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۱) رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام دعا مانگ رہے ہیں تو اس میں کہتے ہیں وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ یعنی ہم کو اپنا فرماں بردار بنائے رکھ، یہاں مراد وہی ہے کہ ایسا کامل وفادار اور ثابت قدم رکھ کہ کبھی ٹھوکر نہ کھائیں، آگے کہتے ہیں کہ ہماری اولاد سے امت مسلمہ بنادے، اس سے امت محمدیہ مراد ہے، قرینہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام دونوں مل کر دعا کررہے ہیں اور دونوں کی مل کر ذریت صرف امت محمدیہ ہے، دوسری امتیں (یہود و نصاریٰ) اسحاق علیہ السلام کی اولاد ہیں، سیکڑوں نبی آئے مگر اسمٰعیل علیہ السلام کی ذریت میں سوائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نبی نہیں آیا اور حضورؐ نے نبوت ختم کردی کعبہ کی تعمیر کے وقت دعا کرنا قرینہ ہے کہ جہاں دعا مانگی ہے وہیں سے قوم اٹھے گی، دوسرے مقام پر ہے: هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (۳) (اسی نے تمہارا نام (مسلمین) مسلمان رکھا۔ اکثر علماء نے اسم جلالۃ کو ھو کا مرجع قرار دیا ہے اور بعض نے کہا کہ ابراہیم مرجع ہیں، صحیح تو یہی ہے کہ اللہ ہی مرجع ہے

(۱) بقرہ: ۱۲۷ (۲) بقرہ: ۱۲۸ (۳) حج: ۷۸

قَالَ اَبُوسُفْيَانَ فَلَمَّا قَالَ مَا قَالَ وَفَرَغَ مِنْ قِرَاءَةِ الْكِتَابِ كَثُرَ عِنْدَهُ الصَّخَبُ

ابوسفیان نے کہا جب ہرقل کو جو کہنا تھا وہ کہہ چکا اور خط پڑھ چکا تو اس کے پاس بہت شور مچا اور آوازیں بلند ہوئیں اور ہم باہر نکال

وَارْتَفَعَتِ الْاَصْوَاتُ وَاُخْرِجْنَا فَقُلْتُ لِاَصْحَابِیْ حِیْنَ اُخْرِجْنَا لَقَدْ اَمِرَ اَمْرُ ابْنِ اَبِیْ کَبْشَۃَ

دیے گئے، میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا جب ہم باہر نکالے گئے : ابو کبشہ کے بیٹے کا تو بڑا درجہ ہوگیا' اس سے رومیوں کا

اِنَّہٗ یَخَافُہٗ مَلِکُ بَنِی الْاَصْفَرِ فَمَا زِلْتُ مُوْقِنًا اَنَّہٗ سَیَظْہَرُ حَتّٰی اَدْخَلَ اللہُ عَلَیَّ الْاِسْلَامَ

بادشاہ ڈرتا ہے (اس روز سے) مجھ کو برابر یقین رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غالب ہوں گے یہاں تک کہ اللہ نے مجھ کو مسلمان کر دیا۔

مگر میں یوں کہتا ہوں کہ جس نے ابراہیمؑ کی طرف نسبت کی اس نے واسطہ کی طرف نسبت کی اور جس نے اللہ کو مرجع کہا اس نے واسطہ کا ذکر نہیں کیا۔

الحمدللہ سیوطی رحمۃ اللہ کو ان کے اپنے رسالہ میں جو اشکال پیش آتے ہیں اب وہ باقی نہیں رہے۔

ان آیتوں میں اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللہِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْیًا بَیْنَھُمْ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاٰیٰتِ اللہِ فَاِنَّ اللہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (۱) ۝ فَاِنْ حَآجُّوْکَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْھِیَ لِلہِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ط وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ط فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اھْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ ط وَاللہُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ (۲) ۝ سوال یہ ہے کہ وہ جھگڑے کیا تھے جن کی طرف فَاِنْ حَآجُّوْکَ میں اشارہ کیا ہے ؟ دراصل وہ جھگڑے یہی تھے کہ اہل کتاب بھی اپنے آپ کو مسلم کہتے تھے چنانچہ قیصر نے بھی خود کو مسلم کہا تھا، تو حضورؐ نے فرمایا کذب وہ جھوٹا ہے' اسی طرح وفد نجران نے بھی اسی کا دعویٰ تھا اور حضورؐ نے اس کی بھی تردید کی تھی' حضور نے اس کے جواب میں فرمایا تھا : جب اللہ کا بیٹا بناتے ہو' سور کھاتے ہو' شراب پیتے ہو اس کے باوجود اسلام کا دعویٰ کرتے ہو تو یہ دعویٰ کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے ؟ یہی بات قیصر کے جواب میں بھی کہی تھی' اکثر مفسرین کا خیال یہی ہے کہ انھیں خیالات ونزاع کے دفعیہ کے لئے یہ آیت نازل ہوئی ہے' مگر میں اس کی تفسیر پھر کبھی بیان کروں گا۔

فَلَمَّا قَالَ مَا قَالَ یعنی جب وہ سب کچھ کہہ چکا اور گفتگو اس کی ختم ہوگئی تو

کَثُرَ عِنْدَہُ الصَّخَبُ یعنی شور وغل مچ گیا کیونکہ پادری اور پوپ سمجھے کہ یہ مسلمان ہوگیا اس لئے شور برپا ہوا۔

وَاُخْرِجْنَا ہم نکال دیے گئے۔

فَقُلْتُ لِاَصْحَابِیْ اس کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ابن ابی کبشہ کی بات بہت بڑھ گئی، یعنی ابوسفیان نے

---

(۱) آل عمران : ۱۹ (۲) آل عمران : ۲۰

وَكَانَ ابْنُ النَّاطُورِ صَاحِبُ إِيلِيَاءَ وَهِرَقْلَ سُقُفًّا عَلَى نَصَارَى الشَّامِ يُحَدِّثُ أَنَّ

(زہری نے کہا) ابن ناطور جو ایلیا کا حاکم اور ہرقل کا مصاحب اور شام کے نصاریٰ کا پیر پادری تھا وہ بیان کرتا تھا کہ ہرقل جب ایلیاء (بیت المقدس)

هِرَقْلَ حِينَ قَدِمَ إِيلِيَاءَ أَصْبَحَ يَوْمًا خَبِيثَ النَّفْسِ فَقَالَ بَعْضُ بَطَارِقَتِهِ قَدِ اسْتَنْكَرْنَا

میں آیا تو ایک روز صبح کو رنجیدہ اٹھا، اس کے بعضے مصاحب کہنے لگے (کیوں خیر تو ہے) ہم دیکھتے ہیں (آج) تیری صورت اتری ہوئی ہے

هَيْئَتَكَ قَالَ ابْنُ النَّاطُورِ وَكَانَ هِرَقْلُ حَزَّاءً يَنْظُرُ فِي النُّجُومِ فَقَالَ لَهُمْ حِينَ سَأَلُوهُ

ابن ناطور نے کہا ہرقل نجومی تھا اس کو ستاروں کا علم تھا، جب لوگوں نے اس سے پوچھا (تو کیوں رنجیدہ ہے) تو کہنے لگا میں نے

إِنِّي رَأَيْتُ اللَّيْلَةَ حِينَ نَظَرْتُ فِي النُّجُومِ مَلِكَ الْخِتَانِ قَدْ ظَهَرَ فَمَنْ يَخْتَتِنُ مِنْ هَذِهِ

آج کی رات ستاروں پر نظر کی (تو ایسا معلوم ہوا کہ) ختنہ کرنے والوں کا بادشاہ غالب ہوا تو اس زمانہ والوں میں کون لوگ ختنہ کرتے ہیں؟ اس کے

الْأُمَّةِ قَالُوا لَيْسَ يَخْتَتِنُ إِلَّا الْيَهُودُ فَلَا يُهِمَّنَّكَ شَأْنُهُمْ وَاكْتُبْ إِلَى مَدَائِنِ مُلْكِكَ

مصاحب کہنے لگے یہودیوں کے سوا کوئی ختنہ نہیں کرتا، تو ان کی کچھ فکر نہ کر اور اپنے علاقہ کے شہروں میں (وہاں کے حاکموں کو) لکھ بھیج جتنے

فَيَقْتُلُوا مَنْ فِيهِمْ مِنَ الْيَهُودِ فَبَيْنَاهُمْ عَلَى أَمْرِهِمْ أُتِيَ هِرَقْلُ بِرَجُلٍ أَرْسَلَ بِهِ مَلِكُ

یہودی وہاں ہیں ان کو مار ڈالیں، وہ لوگ یہ باتیں کر رہے تھے اتنے میں ہرقل کے سامنے ایک شخص کو لائے جس کو غسان کے بادشاہ (حارث ابن

غَسَّانَ يُخْبِرُ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ،

ابی شمر) نے بھجوایا تھا، وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا حال بیان کرتا تھا،

قیصر پر مکتوب کا جب یہ اثر دیکھا تو اپنے رفقاء سے کہا کہ جب یہ ڈر گیا تو اس کی بات بہت بلند ہوگئی اور بہت آگے جا چکی۔

ابن ابی کبشہ کہنے کی ایک توجیہ تو یہ کی گئی ہے کہ ابو کبشہ یا تو حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کے شوہر کا نام ہے یا ان کے آباء واجداد میں کسی کا نام ہے، اس بنا پر بعضوں کا یہ خیال ہے کہ اسی ادنی مناسبت کی وجہ سے یہ نسبت کردی، بعضوں نے یہ کہا ہے کہ بنی خزاعہ کے ایک شخص ابو کبشہ نامی نے بت پرستی چھوڑ کر "شعریٰ" ستارے کی پرستش شروع کردی تھی تو اسی مناسبت سے نسبت کردی کہ جس طرح اس نے اپنی قوم کا دین چھوڑ دیا تھا ایسے ہی انھوں نے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

قولہ بنی الاصفر اس سے مراد رومی ہیں ان کی رنگت کے لحاظ سے، اور عینی وغیرہ نے کہا کہ ان کے آباء واجداد میں سے کسی کی طرف نسبت کی گئی ہے۔

حتی ادخل اللہ علی الاسلام یعنی اس وقت سے برابر یقین رہا اس میں تغیر نہیں ہوا۔

فَلَمَّا اسْتَخْبَرَهُ هِرَقْلُ قَالَ اذْهَبُوا فَانْظُرُوا أَمُخْتَتِنٌ هُوَ أَمْ لَا ، فَنَظَرُوا إِلَيْهِ فَحَدَّثُوهُ

جب ہرقل نے سب خبر اس سے سن لی تو (اپنے لوگوں سے) کہنے لگا ذرا جاکر اس شخص کو دیکھو اس کا ختنہ ہوا ہے یا نہیں، انھوں نے

أَنَّهُ مُخْتَتِنٌ وَسَأَلَهُ عَنِ الْعَرَبِ فَقَالَ هُمْ يَخْتَتِنُونَ فَقَالَ هِرَقْلُ هٰذَا مُلْكُ هٰذِهِ

اس کو دیکھا اور جاکر ہرقل سے بیان کیا کہ اس کا ختنہ ہوا ہے اور ہرقل نے اس شخص سے پوچھا کیا عرب ختنہ کرتے ہیں؟ اس نے کہا

الْأُمَّةِ قَدْ ظَهَرَ ثُمَّ كَتَبَ هِرَقْلُ إِلَى صَاحِبٍ لَهُ بِرُومِيَةَ وَكَانَ نَظِيرَهُ فِي الْعِلْمِ

ہاں ختنہ کرتے ہیں، تب ہرقل نے کہا: یہی شخص (پیغمبر صاحب) اس امت کے بادشاہ ہیں جو غالب ہوئے ہیں، پھر ہرقل نے اپنے ایک

دوست (ضغاطر) کو رومیہ میں لکھا، وہ ہرقل کا جوڑ تھا،

حدیث ختم ہوگئی قال ابن الناطور سے زہری کا قول ہے اور یہ مدرج ہے، ابن الناطور کوئی مذہبی پیشوا تھا، بیت المقدس میں حکمراں اور ہرقل کا تابع تھا، صاحب کا حقیقی معنی تابع یا دوست ہے اور مجازی معنی امیر، یہاں دونوں معنی لیکر ایک کے لحاظ سے ہرقل کی طرف اور دوسرے کے لحاظ سے ایلیا ر کی طرف اضافت کردی گئی۔

ناطور اصل میں باغبان کو کہتے ہیں مگر عیسائیوں کے ہاں ایک عہدہ بھی ہے جیسے بطریق اور پوپ (جو سب سے بڑا پیشوا ہو) یہ اسقف تھا اس کو سُقُف سین وقاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور سین کے ضمہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ بھی یعنی باب تفعیل سے ماضی مجہول اور اُسقف بھی۔

یہ خلافت عمری میں مسلمان ہوگئے تھے، وہ مسلمان ہونے کے بعد بیان کرتے ہیں کہ ہرقل جب ایلیا ر میں پہونچا تو ایک روز صبح کو بہت مکدر اور پریشان حال اور بدمزہ سا اٹھا۔

بَطَارِقَة . جمع ہے بِطریق کی، اور یہاں خواص مراد ہیں۔

حَزَّاءً ، اصل میں اسے کہتے ہیں جو قیافہ اور قرائن سے کچھ معلوم کرلیتا ہے مگر مراد یہاں کاہن ہے، ہرقل کاہن بھی تھا اور نجومی بھی

ملك الختان مَلِک بھی پڑھا گیا ہے اور مُلک بھی۔

قدظهر فمن يختتن من هٰذه الامة يعنى من هٰذا القرن ومن هٰذا الزمان یہاں غلبہ سے یہ مراد ہے کہ ساری دنیا پر چھا جائیگا اس لئے اسے اپنی بھی فکر ہوئی۔

فيقتلوا من فيهم ، یہ ایسی ہی تجویز تھی جیسی فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے باب میں سوچی تھی اور اس پر عمل کیا تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہرقل نے اس کو قبول نہیں کیا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا اس سے کیا ہونے والا ہے، چونکہ وہ عالم بھی تھا اس لئے اسے یہ مشورہ پسند نہیں آیا۔

وَسَارَ هِرَقْلُ اِلٰى حِمْصَ فَلَمْ يَرِمْ حِمْصَ حَتّٰى اَتَاهُ كِتَابٌ مِنْ صَاحِبِهٖ يُوَافِقُ رَأْيَ

اور ہرقل خود حمص گیا ، ابھی حمص سے نکلا تھا کہ اس کے دوست (ضغاطر) کا خط اس کو پہونچا ، اس کی بھی رائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

هِرَقْلَ عَلٰى خُرُوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَّهٗ نَبِيٌّ فَاَذِنَ هِرَقْلُ لِعُظَمَاءِ الرُّوْمِ

کے ظاہر ہونے میں ہرقل کے موافق تھی ، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سچے پیغمبر ہیں ، آخر ہرقل نے روم کے سرداروں کو

فِىْ دَسْكَرَةٍ لَهٗ بِحِمْصَ ثُمَّ اَمَرَ بِاَبْوَابِهَا فَغُلِّقَتْ ثُمَّ اطَّلَعَ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ الرُّوْمِ هَلْ لَكُمْ

اپنے حمص والے محل میں آنے کی اجازت دی (جب وہ آگئے) تو دروازوں کو بند کروادیا ، پھر اوپر بالاخانہ میں برآمد ہوا اور

فِى الْفَلَاحِ وَالرُّشْدِ وَاَنْ يَثْبُتَ مُلْكُكُمْ فَتُبَايِعُوْا هٰذَا النَّبِيَّ فَحَاصُوْا حَيْصَةَ حُمُرِ

کہنے لگا : روم کے لوگو ! کیا تم اپنی کامیابی اور بھلائی اور اپنی بادشاہت پر قائم رہنا چاہتے ہو ؟ اگر ایسا ہے تو اس (عربی) پیغمبر سے

الْوَحْشِ اِلَى الْاَبْوَابِ فَوَجَدُوْهَا قَدْ غُلِّقَتْ فَلَمَّا رَاٰى هِرَقْلُ نَفْرَتَهُمْ وَاَيِسَ

بیعت کرلو ، یہ سنتے ہی وہ جنگلی گدھوں کی طرح دروازوں کی طرف لپکے ، دیکھا تو وہ بند ہیں ، جب ہرقل نے دیکھا کہ ان کو ایمان سے

مِنَ الْاِيْمَانِ قَالَ رُدُّوْهُمْ عَلَيَّ ،

ایسی نفرت ہے اور ایمان لانے سے ناامید ہوگیا تو کہنے لگا : ان سرداروں کو پھر میرے پاس لاؤ

اُتِىَ هِرَقْلُ بِرَجُلٍ ممکن ہے یہ قاصد عدی بن حاتم ہوں، جو اسلام سے پہلے نصرانی تھے یہ بھی پہونچے اور اس کے بعد دحیہ بھی پہونچ گئے ، بعض روایات میں ہے کہ دحیہ اور عدی ساتھ ساتھ پہونچے تھے ۔

ارسل به ملك غسان يخبر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ، یہ مختصر قصہ ہے اور یہ خط دوسرا تھا جسے تبوک کے موقع پر بھیجا تھا اور اس میں دحیہ ہی قاصد تھے ایک احتمال یہ ہے ، دوسرا احتمال یہ ہے کہ اسی پہلے خط کا ذکر ہو ، بعض تاریخوں میں ہے کہ دحیہ ہی بروتہ الکبریٰ خط لے کر پہونچے تھے ، اس سے ان کی ہمت معلوم ہوتی ہے ۔

قولہ فلم یرم ، نہیں چھوڑا ، اس پوپ نے بھی ہرقل کی رائے سے اتفاق کیا ، اب یہ پوپ مسلمان ہوا یا نہیں ؟ تو اگر یہ پہلا خط ہے تو بظاہر مسلمان نہیں ہوا اور اگر دوسرا خط ہے تو یہ پوپ جس کا نام ضغاطر تھا ضرور مسلمان ہوا اور دحیہ کے ذریعہ اپنا سلام بھی بھجوایا مگر اس کی قوم نے اس کو قتل کردیا ، ہرقل کو یہ بہانہ ہاتھ آگیا کہ جب قوم نے اسے نہیں چھوڑا اور قتل کردیا تو مجھے یہ کب چھوڑے گی ۔

اس باب میں مورخین کا اختلاف ہے کہ جو قیصر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا اسی سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جنگ ہوئی یا وہ دوسرا تھا ؟ دونوں قول ہیں ۔

وَقَالَ اِنِّی قُلْتُ مَقَالَتِی اٰنِفًا اَخْتَبِرُ بِهَا شِدَّتَكُمْ عَلٰی دِیْنِكُمْ فَقَدْ رَأَیْتُ فَسَجَدُوْا

(جب وہ آئے) تو کہنے لگا میں نے جو بات ابھی تم سے کہی وہ تمھارے آزمانے کو کہی تھی کہ دیکھوں تم اپنے دین میں کیسے مضبوط ہو، اب میں

لَهٗ وَرَضُوْا عَنْهُ فَكَانَ ذٰلِكَ اٰخِرَ شَأْنِ هِرَقْلَ .

وہ دیکھ چکا، تب سب نے اس کو سجدہ کیا اور اس سے راضی ہو گئے، یہ ہرقل کا آخری حال ہوا،

قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ رَوَاهُ صَالِحُ بْنُ كَیْسَانَ وَیُوْنُسُ وَمَعْمَرٌ عَنِ الزُّهْرِیِّ .

امام بخاری نے کہا اس حدیث کو صالح بن کیسان اور یونس اور معمر نے بھی (شعیب کی طرح) زہری سے روایت کیا ہے۔

دَسْكَرَة، وہ محل جس کے گرد باغ ہوں، اَطلاع، اوپر سے نیچے دیکھنا، اِشراف، نیچے سے اوپر دیکھنا، اپنی حفاظت اور جان کے خوف کی وجہ سے اوپر ہی سے کہا اور نیچے نہیں اترا۔

حافظ نے شد بفتح شین ضبط کیا ہے گو بسکون بھی صحیح ہے، قرآن پاک میں دونوں لفظ آئے ہیں اور یہ رخی کا مقابل ہے،

قولہ وان یثبت ملککم، اسے اس بات کا یقین تھا کہ اسلام قبول نہ کروں گا تو ملک نہ رہے گا۔

حمار وحشی میں سب جانوروں سے زیادہ نفور ہوتا ہے۔

قولہ انی قلت مقالتی انفا اختبر بھا، یعنی میں تو یہ بات کہہ کر تمہارا امتحان لے رہا تھا ورنہ میں اپنے دین پر قائم ہوں، اب مجھے معلوم ہو گیا کہ تم بھی بڑے پکے ہو۔

فسجدوا لہ، یعنی سب راضی اور خوش ہو گئے اور اسے سجدہ کیا۔

فکان ذلک اٰخر شأن ھرقل، یعنی پھر وہ اسلام نہ لایا اور یہی حال اس کا آخر عمر تک رہا۔

ابو عبد اللہ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کنیت ہے۔

کتابُ الایمان

کتاب ایمان کے بیان میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امام بخاری نے کتاب الایمان کے آغاز میں بہت ساری آیات اور احادیث و آثار جمع کر دیے اور اس سے ان کا کیا مقصد ہے یہ بعد میں بیان ہوگا، پہلے بطور مقدمہ کے ایمان کے متعلق چند امور بیان کرتا ہوں تاکہ تفہیم میں سہولت ہو، اصل یہ ہے کہ ایمان کا ایک معنی لغوی ہے اور اس کا مادہ امن ہے اور یہ خوف کی ضد ہے، امن نام ہے زوال خوف اور حصول طمانیت کا، قرآن میں تصریح ہے اٰمَنَھُمْ مِنْ خَوْفٍ (۱) نیز فرمایا وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا (۲) اس سے معلوم ہوا کہ امن ضد خوف ہے تو امن نام ہوا زوالِ خوف اور مطمئن ہو جانے کا اور ایمان باب افعال سے ہے، اس کے معنی اب کیا ہوں گے؟ تو سنو کہ کبھی تو یہ متعدی بنفسہ ہوتا ہے اور کبھی متعدی بالحرف آتا ہے، جب متعدی بنفسہ ہو جیسے اٰمنتُ زیدًا تو معنی ہوں گے میں نے زید کو امن دے دیا جس طرح اٰمَنَھُمْ مِنْ خَوْفٍ میں کہ اللہ نے قریش کو خوف سے مامون کر دیا، حرم میں انھیں رکھا جس کی تعظیم ساری دنیا کرتی ہے۔

اور جب متعدی بالحرف ہوتا ہے تو کبھی با، کے ساتھ تعدیہ ہوتا ہے جیسے اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (۳) (رسول ایمان لائے اس پر جو ان کی طرف ان کے رب کے پاس سے نازل کیا گیا اور ایمان والے بھی) کثرت سے تعدیہ با، کے ساتھ ہی ہوتا ہے اور کبھی لام کے ساتھ ہوتا ہے جیسے وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا (۴) (الآیہ) یہ قول اخوان یوسف کا ہے جو انھوں نے یعقوب علیہ السلام سے کہا تھا، یہاں تعدیہ باللام ہوا، جب تعدیہ باللام یا بالبار ہو تو اس میں ایک ضمنی معنیٰ پیدا ہوتے ہیں، وہ ضمن کیا ہے، مثلاً کوئی کہے کہ ہاں ٹھیک ہے تو سچا ہے، تو اس شخص نے اس کو تکذیب و مخالفت سے مامون کر دیا اور مطمئن کر دیا کہ مخالفت نہ کرے گا، تو جب تک انسان کی تصدیق نہ ہو اس وقت تک اطمینان نہیں ہوتا اور جب تصدیق کر دی گئی تو اطمینان ہو گیا تو تصدیق ایمان کا اصل معنی نہیں مگر چونکہ ذریعہ حصولِ اطمینان ہے اس لئے اس کو ایمان کے معنی میں شامل کر کے ایمان کی تفسیر تصدیق سے کر دیتے ہیں اور چونکہ تصدیق کا صلہ بار آتا ہے جیسے وَصَدَّقَ بِہٖ اس لئے ایمان کا صلہ بھی بار لے آئے، جیسے اٰمن الرسول بما انزل (الآیہ) اور جب تصدیق کر دی گئی تو گویا سچائی کے سامنے جھک گیا تو اب ایمان اذعان و انقیاد کے معنی کا بھی متضمن ہو گیا

(۱) قریش: (۲) نور: ۵۵ (۳) بقرہ: ۲۸۵ (۴) یوسف: ۱۷

. . . .

اس لئے لام سے بھی اس کا تعدیہ ہوا کیونکہ اذعان کا صلہ لام آتا ہے جیسے وما انت بمؤمن لنا (الآیہ) ای مذعن ومنقاد لنا یعنی آپ ہماری خبر کو تسلیم نہیں کریں گے ، تو تعدیہ تین طرح کا ہوا ، ایک بنفسہٖ دوسرا بالباء تیسرا باللام ، صحیح مسلم میں کتاب الایمان میں ایک حدیث ہے ..... الا اعطی من الآیات ما مثله آمن علیه البشر (۱) صرف یہ ایک مقام ہے جہاں ایمان کا صلہ علیٰ آیا ہے اس کے علاوہ اور کہیں ایمان کا صلہ علیٰ نظر سے نہیں گذرا ، اور اس کی تفسیر یہ کی گئی کہ آمن معتمداً علیه البشر .

یہ لغوی تحقیق تھی اور اس سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ کبھی ایمان کے معنی تصدیق کے آتے ہیں اور کبھی وثوق کے بھی آتے ہیں جیسے امن بہٖ اور جب علیٰ صلہ ہو تو متضمن ہوگا اعتماد کے معنی کو جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے جو ابھی گذری ، تو ایمان تمام معانی کو متضمن ہے .

لغت کی تحقیق کے بعد سنو کہ شریعت میں ایمان نام ہے التصدیق بما عُلم مجیئ الرسول به ضرورةً کا ، آگے قید ہے تفصیلاً فیما علم تفصیلاً واجمالاً فیما علم اجمالاً . خلاصہ یہ کہ ایمان تصدیق ہے اس چیز کی جس کی نسبت بالضرورۃ معلوم ہو کہ اس کو پیغمبر علیہ السلام اللہ کی طرف سے لائے ہیں جس کا اجمالی علم ہو اس کی تصدیق اجمالاً اور جس کا تفصیلی علم ہو اس کی تصدیق تفصیلاً ، یہ تعریف متکلمین نے کی ہے ، فقہا کبھی ضرورۃً کو ترک کر دیتے ہیں . اس تعریف میں جو تصدیق کا لفظ آیا ہے اس سے کیا مراد ہے ؟ لغوی معنی یا اس کے علاوہ چونکہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں علوم یونانیہ کا رواج ہوگیا ہے اس لئے جب کوئی ایسا لفظ بولا جاتا ہے جو فنون حکمت میں مستعمل ہے اور ان کی اصطلاحات میں معروف ہوگیا ہے تو اس کا وہی معنی متبادر ہوتا ہے جو مصطلح فلسفہ ہے مگر یہ یاد رہے کہ ان مصطلحات پر مدار شریعت نہیں ہے اس لئے وہاں لغوی بحث ہوگی الا ان یزید علیه الشریعة شیئاً تو یونانیوں بلکہ فقہا تک کی مصطلحات کا بھی حدیث وقرآن میں دخل نہیں ، قرآن اور حدیث میں تو لغت اور مصطلحات شرعیہ کا اعتبار ہے .

تصدیق کے لغوی اور شرعی معنی میرے نزدیک بظاہر (واللہ اعلم) ایک ہیں تصدیق کے لغوی معنی باور کردن اور گرویدن کے ہیں یعنی کسی کو سچا ماننا اور سچا کہنا تصدیق ہے جاننا کافی نہیں ، مثلاً کوئی کہے کہ یہ میری کتاب ہے ، دوسرا باوجودیکہ یہ سمجھتا ہے کہ اسی کی ہے مگر مانتا نہیں کہ ہاں تیری ہے تو لغت میں اسے تصدیق نہ کہیں گے ، معرفت ، علم ، یقین کہہ دیں گے مگر تصدیق نہ کہیں گے گو منطقیین تصدیق کہہ دیں ، لغت والے تصدیق اس وقت کہیں گے جب وہ تسلیم کرلے اور مان لے ، چنانچہ یاد ہوگا کہ قرآن میں علم ، معرفت ، یقین کا لفظ کفار کے لئے ہے مگر انھیں مومن نہیں کہا گیا .

عَلم : جاننا ، معرفت : پہچاننا ، یقین : ایک جانب متعین ہو جانا ، شک نہ ہونا .

---

(۱) یہ حدیث بخاری ص ۱۰۸۰ میں بھی ہے .

. . . .

قرآن میں اہل کتاب کے لئے فرمایا: اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ [۱] (جنھیں ہم نے کتاب دی وہ اس کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں) یہاں معرفت ہے مگر ایمان نہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ [۲] (تو جان چکا ہے کہ یہ چیزیں کسی نے نہیں اتاریں مگر آسمان وزمین کے مالک نے سُجھانے کو) یہاں علم ہے مگر ایمان نہیں۔

ایک اور مقام پر فرمایا: وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ [۳] (اور انھوں نے انکار کیا حالانکہ ان کے نفسوں کو یقین تھا) یہاں یقین ہے مگر ایمان نہیں۔

ان مذکورہ آیات میں علم، معرفت اور یقین فرمایا گیا مگر تصدیق کا لفظ نہیں فرمایا گیا نہ ایمان فرمایا گیا، یہ لفظ عموماً وہیں بولا جاتا ہے جہاں قبول ہو، اگر قبول نہیں ہے تو وہ تصدیق لغوی نہیں، ـــــ تو تصدیق ضد انکار ہے اور معرفت ضد نکارت ہے، نکارت نہ پہچاننے کو کہتے ہیں جیسے کتب حدیث میں مُنکَر آتا ہے اسے معروف کے مقابل لاتے ہیں، یہاں بھی (یعنی منکر) نکارت سے ہے اور انکار میں عدم قبول ہے اور انکار اس وقت زائل ہوتا ہے جب قبول آتا ہے، چنانچہ محققین کہتے ہیں کہ تصدیق لغوی وشرعی ایک چیز ہے، دوسری چیز پر اطلاق ہوگیا تو شاذ ہے۔

میں کہا کرتا ہوں کہ دو لفظ یاد رکھو تو کبھی کوئی دقت نہ ہوگی، وہ یہ کہ تصدیق نام جاننے کا نہیں بلکہ ماننے کا ہے، یہی شرعاً یہی لغۃً تصدیق ہے، تو تصدیق کے معنی ماننا ہیں، جاننا نہیں۔

صاحب تفسیر روح المعانی نے یؤمنون بالغیب کے تحت بہترین متقن اور جامع کلام کیا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ ابن سینا کہتا ہے کہ تصدیق کے معنی گرویدن اور باور کردن کے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منطقی بھی وہی کہتے ہیں جو لغوی کہتے ہیں، مگر بعض نے کہا ہے کہ نسبت تامہ خبریہ کے علم کا نام تصدیق ہے، مثلاً دور سے کوئی جانور دیکھا مگر متعین نہیں، قریب پہونچ کر جوں ہی نظر پڑی تو دفعۃً پہچان لیا کہ یہ شیر ہے تو یہ تصدیق منطقی ہے مگر شرع اسے معرفت کہتی ہے یعرفون ابناءھم تصدیق نہیں، تو منطقیین کے ہاں تصدیق علم کا نام ہے اور اس میں اختلاف ہے کہ وہ کس مقولہ سے ہے، اور شریعت میں تصدیق فعل ہے افعال نفس سے، دوسرے یہ کہ منطقیین کے ہاں تصدیق ظنیات کو بھی شامل ہے اور از روئے شریعت وہ یقینیات میں منحصر ہے۔

---

(۱) بقرہ: ۱۴۶ (۲) بنی اسرائیل: ۱۰۲ (۳) نمل: ۱۴

روح المعانی میں لکھا ہے کہ سید جرجانی وغیرہ کہتے ہیں کہ جب منطقی علم منطق کی ضرورت کو ثابت کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ علم یا تصور ہے یا تصدیق اور ان میں سے ہر ایک بدیہی ہے یا نظری اور نظری میں کبھی خطا ہوتی ہے، لہٰذا ایسے قانون کی ضرورت ہے جو عاصم عن الخطا ہو، اسی کا نام منطق ہے، لہٰذا ہم منطق کے محتاج ہیں اور منطق میں قیاس جدلی بھی ہے اور قیاس خطابی اور قیاس شعری بھی، قیاسِ جدلی مسلمات خصم پر موقوف ہے اور خطابی محض ظنیات پر اور شعری محض تخیلات کا نام ہے، تو یہاں اگر قطعیات کو لے لیں تو پھر یہ قیاسات ثلاثہ اس سے خارج ہو جائیں گے، حالانکہ ان کی طرف بھی احتیاج ہے اور یہ جزو منطق ہیں لہٰذا بدیہی بات ہے کہ تصدیق کو عام رکھنا پڑے گا تاکہ مظنونات اور قطعیات دونوں کو تمام و شامل رہے، اور تصدیق شرعی صرف قطعیات میں منحصر ہے۔

حاصل یہ کہ ایمان تصدیق لغوی کا نام ہے اور سب کا حاصل یہ کہ ماننا اور قبول کرنا، اور اذعان و یقین و تصدیق فعل ہے افعال نفس سے، اسی کو امام فخر الدین اور امام الحرمین نے لکھا ہے کہ تصدیق کلام نفس کے جنس سے ہے یعنی اقرار کر لینا قلب سے اور یہ فعل ہے افعال نفس سے، سمجھنے کو تصدیق نہیں کہیں گے۔

بعضوں نے اسی کو کہا ہے کہ التصدیق قول القلب یعنی جیسے زبان سے کہتا ہے ایسے ہی دل سے بھی کہے، یہ صرف الفاظ اور تعبیر کا فرق ہے، مطلب سب کا ایک ہے کہ دل سے ماننے کو تصدیق کہتے ہیں اور یہی ایمان ہے، خالی سمجھنا نہ تصدیق ہے نہ ایمان۔ حضورؐ کو دیکھنے والوں میں سے بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ نبی ہیں مگر چونکہ اختیار نہیں تھا یعنی ماننا نہیں تھا اس لئے انھیں مومن نہیں کہتے، لہٰذا محض معرفت، علم، یقین کافی نہیں بلکہ تسلیم و اختیار ضروری ہے۔

تفسیر خازن میں ابو طالب کے دو شعر نقل کئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضور علیہ السلام کا نبی ہونا جانتے تھے مگر چونکہ مانا نہیں اس لئے مومن نہ کہلائے، شعر یہ ہیں:

وَلَقَدْ عَلِمْتُ بِاَنَّ دِیْنَ مُحَمَّدٍ ۔ مِنْ خَیْرِ اَدْیَانِ الْبَرِیَّۃِ دِیْنًا

مجھے معلوم ہو گیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین سارے جہان کے دینوں سے بہتر دین ہے

لَوْلَا الْمَلَامَۃُ اَوْحَذَارُ مُسَبَّۃٍ ۔ لَوَجَدْتَنِیْ سَمْحًا بِذَاكَ مُبِیْنًا

اگر لوگوں کی ملامت اور ان کے برا بھلا کہنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو آپ مجھے کشادہ دل اور واضح طور سے اس کو ماننے والا پاتے 10

امام ابو حنیفہ سے ایک لفظ منقول ہے الایمان معرفۃ واقرار، ایمان پہچاننے اور اقرار کرنے کا نام ہے، اس کی

. . . .

دھوکہ نہ ہو اس لئے کہ امام کی مراد اس معرفت سے معرفت اختیاریہ مکتسبہ[1] ہے، نہ مطلق معرفت، خواہ بالاختیار ہو یا بلا اختیار، ورنہ پھر وہ جھمیہ کا مذہب ہو جائے گا۔

امام ابوحنیفہؒ سے اور جہم بن صفوان بانی مذہب جھمیہ سے اسی مسئلہ پر مناظرہ ہوا ہے اور اس میں امام صاحب نے خود بتلایا ہے کہ معرفت مطلقہ کا نام ایمان نہیں بلکہ ایمان اختیار کر لینا اور قبول کر لینا ہے۔

یا یہ کہا جائے کہ معرفت موقوف علیہ ہے ایمان کا، کیونکہ تصدیق اسی وقت ہوگی جب کہ معرفت ہو، تو امام موقوف علیہ کو بیان فرما رہے ہیں، یا صوفیہ کی معرفت مراد ہے اور وہ ذکر کی کثرت کے بعد ہوتی ہے، یعنی ایمان کامل کا نام ایمان ہے۔ بہرحال تاویل ضروری ہے کیونکہ جہم ابن صفوان سے امام صاحب کا مناظرہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کی مراد یہ نہیں ہے، جھمیہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ان کا ایمان، ایمان صدیق کے مثل ہے، وبطلانہ ظاهر۔

دوسرا جزو "بما علم مجیئه علیه السلام به ضرورة" ہے، یعنی ایمان نام ہے نبی کو سچا ماننے کا ان تمام اشیاء میں جو نبی علیہ السلام اللہ کی طرف سے لائے اور ہمیں اس کا علم ضرورۃً ہوگیا، ضرورۃً کی قید اس لئے لگائی کہ جو چیزیں خبر واحد یا قیاس سے ثابت ہوں ان کے انکار سے کفر لازم نہیں آتا، اور اگر ضروریات میں سے کسی چیز کا انکار کر دے تو بیشک کافر ہوگا، ضرورۃً کے معنے یہ ہے کہ جس کے متعلق علم قطعی ہو کہ حضور علیہ السلام سے یہ منقول ہے، گو وہ مستحب ہی کیوں نہ ہو، جیسے مسواک کا انکار کہ حضور سے ثابت نہیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ کوئی پیدا ہی نہ ہوئے، تو چونکہ قرناً بعد قرنٍ تواتر چلا آرہا ہے اس لئے اس کا منکر کافر ہوگا، تو ضرورۃً کے معنی قطعی کے ہیں مگر ایسا قطعی جس سے ہر عام وخاص واقف ہے۔

اور بعض اشیاء نظری ہیں، مگر علم اس کا ضروری ہے جیسے عذاب قبر کہ اس کا علم اور ثبوت بالضرورۃ ہے، اگر کوئی عذاب قبر کے ثبوت کا منکر ہو جائے تو وہ کافر ہے، اسی لئے مسئلہ رویت باری تعالیٰ کے منکر کو مبتدع کہا گیا ہے، نہ کافر، کیونکہ پھر بھی کچھ نظری چیزیں باقی ہیں۔

ایمان کی تعریف میں اس کے بعد یہ قید مذکور ہے کہ "اجمالاً فیما علم اجمالاً الخ" یعنی اگر ایک حکم اجمالی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے تو مومن ہونے کے لئے اس کا اجمالی علم کافی ہے جیسے عذاب قبر، کہ اس کا اجمالی علم کافی ہے، باقی رہی یہ تفصیل کہ اس کی کیفیت کیا ہے تو اس کا تسلیم کرنا ضروری نہیں، نہ اس کا منکر کافر ہوگا، ہاں مبتدع ضرور ہو جائے گا۔

---

(۱) جو دلائل سے حاصل ہوتی ہے۔

. . . .

ایمان کی تعریف ختم ہوگئی، مگر اس میں یہ کہیں نہیں آیا کہ اقرار بھی جزوِ ایمان ہے یا نہیں؟ ـــــ دراصل اس میں تین قول ہیں، بعض کہتے ہیں اقرار نہ شرط ہے نہ جزو، صرف تصدیق کافی ہے خواہ ہم اسے مومن نہ کہیں اور احکام اسلام اس پر جاری نہ کریں، تو ایک احکام ظاہری کا اجراء ہے اور ایک احکام اخروی کا، تو وہ ہمارے عرف میں مومن نہیں مگر فی ما بینہ و بین اللہ مومن ہے، مرجئہ کا مسلک یہی ہے، اہل حق کہتے ہیں کہ اس میں کچھ تفصیل ہے، ایک یہ کہ ایک شخص نے قلب سے تصدیق کی مگر اسے نطق کا موقعہ نہ ملا، مثلاً اس کو سکتہ یا لقوہ ہو گیا، یا وہ اخرس (گونگا) ہے، تو محققین کہتے ہیں کہ جو عاجز عن النطق ہو خواہ عجز کسی وجہ سے ہو تو وہ مومن ہے کیونکہ ایمان تصدیق قلبی ہی کا نام ہے فرمایا: اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ [1] نیز فرمایا: وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ ط [2] ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ ایمان صفت قلب ہے، تو قلب سے ماننے والا اگرچہ اقرار لسانی سے عاجز ہو مومن ہے، اور ایک وہ ہے جسے اقرار کا موقعہ ملا مگر اس نے اقرار نہیں کیا، تو یہ کافر ہے، اس کے حق میں اقرار جزوِ ایمان ہے، تو اب ان قائلین جزئیت کے ہاں اکراہ کی صورت میں بھی ایمان متحقق نہ ہوگا، اور بعض لوگوں نے اقرار کو جزو نہیں کہا کیونکہ اکراہ کی صورت میں ان کے نزدیک اقرار کا اعتبار ساقط ہو جاتا ہے، ہاں انھوں نے اقرار کو شرط کہا ہے۔

ابن ہمام نے نقل کیا ہے کہ جو لوگ اقرار کو شرط نہیں کہتے ان کی مراد یہ ہے کہ اگر اس سے مطالبہ کیا جائے اور اقرار نہ کرے تو وہ کافر ہے، مطالبہ کے وقت اسے اقرار کرنا ضروری ہے اور اس میں گفتگو اسی وقت تک ہے جب تک اس سے مطالبہ نہ ہو، تو ایمان تصدیق کا نام ہے اور اقرار شرط ایمان ہے یا جزو، یا بالکل ضروری نہیں، اس بارے میں امام صاحب سے دو قول منقول ہیں، ایک یہ کہ شرط ہے، دوسرا یہ کہ شطر ہے، یہ تو اصل تعریف ایمان ہے، آگے ایک تیسری چیز ہے جس میں اختلاف ہے کہ وہ بھی جزوِ ایمان ہے یا نہیں اور اگر جزو ہے تو کس حیثیت کا، یہ تیسری چیز اعمال ہیں، اس میں چار مذہب مشہور ہیں، چاہو تو پانچ بھی بتا سکتے ہو۔

اول معتزلہ و خوارج کا ہے، کہ اعمال جزو ہیں، اگر ایک عمل بھی چھوڑا، یا ایک کبیرہ کا مرتکب ہوا، تو وہ مومن نہ رہا، وہ قطعاً خارج عن الایمان ہے، لیکن ایمان سے نکل کر کافر ہوا یا نہیں؟ خوارج کہتے ہیں کہ وہ کافر ہوگیا کیونکہ بیچ میں کوئی چیز نہیں، معتزلہ کہتے ہیں کہ وہ کافر ہے نہ مومن بلکہ وہ ایسا بن گیا جیسے خنثیٰ مشکل، اور اس کا نام فاسق رکھا، فاسق ہمارے یہاں بھی ہے مگر وہ مومن ہی کے تحت داخل ہے، مگر ان کے ہاں تین نوعیں ہوگئیں، ایک مومن، ایک کافر، ایک فاسق، اسی کو لقب مقامات میں

---

(۱) مجادلہ : ۲۲ (۲) حجرات : ۱۴

کہتے ہیں واسطۃ بین الایمان والکفر جیسے مرد ایک صنف، عورت ایک صنف، خنثیٰ مشکل ایک صنف، تو معتزلہ وخوارج اس میں تو متفق ہیں کہ اعمال جزو ایمان ہیں اور ان کے نہ رہنے سے مومن نہ رہے گا، پھر آگے وہ اختلاف ہے جو مذکور ہوا۔

اس کے بالکل بالمقابل مرجئہ ہیں، وہ کہتے ہیں کہ عمل کا کوئی تعلق ایمان سے نہیں، نہ جزو، نہ کچھ اور، عذاب میں عمل کو دخل بالکل نہیں، غیر عامل ایک منٹ کو بھی داخل فی النار نہیں ہوسکتا، خواہ کیسے ہی عمل کرو، ثواب و عذاب میں اسے کچھ دخل نہیں، صرف تصدیق قلبی کافی ہے، حتیٰ کہ قول کی بھی ضرورت نہیں، تو ان کے ہاں اعمال معطل ہیں، عجیب بات ہے، معتزلہ نے ایک کبیرہ کے مرتکب کو ابدالآباد کے لئے جہنم میں جھونک دیا اور مرجئہ نے کہا کہ چاہے اعمال بد عمر بھر کرتا رہے، ایک منٹ کو بھی جہنم میں نہ جائے گا دونوں ایک ایک سرے پر ہیں، درمیان میں اہل السنۃ ہیں جو کہتے ہیں کہ نہ تو ایسا جزو ہے کہ ایمان سے خارج کردے، اور نہ ایسا علیحدہ کہ اسے کوئی دخل ہی نہ ہو، تمام اہل السنۃ اس بات پر متفق ہیں کہ تارک عمل کے لئے خلود فی النار نہیں لیکن وہ مستحق عذاب ہے، اس پر تمام ائمہ متفق ہیں، آگے تعبیر اور عنوان میں فرق ہے، جمہور محدثین، امام اوزاعی، اسحٰق، امام مالک، امام شافعی وغیرہم ائمہ نے کہہ دیا کہ ایمان قول و عمل و اعتقاد کا نام ہے [1] اور امام ابو حنیفہ اور جمہور متکلمین کہتے ہیں کہ عمل جزو ایمان نہیں، صرف تصدیق کا نام ایمان ہے، نفس حقیقت [2] ایمان میں اعمال داخل نہیں، محدثین کی تعبیر قریب بمذہب معتزلہ ہے اور امام و متکلمین کی قریب بمذہب مرجئہ، حتیٰ کہ بعض نے (جیسے ابن قتیبہ وغیرہ) امام کو مرجئہ میں شمار کردیا، محدثین نے بھی امام کو مرجئہ سے شمار کیا، مگر اس کے معنی دوسرے ہیں جو بعد میں بیان کئے جائیں گے، تمام اہل سنت ثمرہ و نتیجہ میں متفق ہیں، تعبیر اور عنوان کے اختیار کرنے میں مختلف ہیں، بیت ایک ہے، دروازے مختلف ہیں اور ہر ایک الگ الگ دروازے سے داخل ہوتا ہے، کما قال :

عباراتنا شتّیٰ وحسنك واحد ؛ وكل الى ذاك الجمال يُشير

تو اہل سنت کی بھی یہی حالت ہے، ثمرہ میں سب ایک ہیں اور عنوان میں باہم اختلاف ہے، یہ نہ سمجھنا کہ یہ نزاع لفظی ہے کیونکہ یہ ائمہ کی شان کے خلاف ہے، ہاں مشابہ بہ نزاع لفظی ضرور ہے۔

ایک بحث ایمان کے زیادۃ اور نقصان کی بھی ہے، عامۂ محدثین یزید وینقص کہتے ہیں اور امام اعظم لایزید و لاینقص فرماتے ہیں، اس میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو ذخیرہ ہے آیات و احادیث کا، اور دوسری طرف معاملہ بالکل

---

(1) لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ نیز لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ قَتَّاتٌ وغیرہ احادیث اس کی مؤید ہیں (2) وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ وغیرہ اس کی مؤید ہیں

. . . .

خالی نظر آتا ہے، مگر انشراح حقیقت کے بعد سب اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا اور معلوم ہو جائے گا کہ سب ٹھیک کہتے ہیں اور سوائے تعبیر و عنوان کے کچھ اختلاف نہیں، معنوں سب کا ایک ہے۔

پہلی چیز یہ ہے کہ جو لوگ ایمان کو مرکب کہتے ہیں، ان کے نزدیک تین چیزیں ہیں، اعتقاد، قول، عمل۔ تو ان کے نزدیک محل ایمان صرف قلب نہ ہوا، بلکہ تین چیزیں ہوئیں، حالانکہ بکثرت قرآن میں محل ایمان قلب کو بتایا گیا ہے جیسے أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ (۱) وَلَٰكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ (۲) وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ (۳) وغیرہا۔

اسی طرح حدیث میں آیا ہے: يُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنَ الْإِيمَانِ، تو اگر ایمان میں اعمال جوارح بھی داخل ہوتے تو صرف قلب کو محل ایمان کیوں کہتے۔ دوسرے یہ کہ قرآن و حدیث میں بکثرت عمل کا عطف ایمان پر کیا گیا ہے جو مغایرت کی دلیل ہے، اگر یہ جزو ہوتا تو عطف سے کیوں بیان کرتے۔ اور یہ کہنا کہ "جزو کا عطف کل پر ہے" صحیح نہیں، کیونکہ اول تو یہ شائع نہیں، دوم یہ کہ اصل عطف کی مغایرت ہے، نیز قرآن کریم میں عمل صالح کے ساتھ "وَهُوَ مُؤْمِنٌ" کی قید لگائی گئی ہے، اگر عمل جزو ہوتا تو یہ قید کیوں لگاتے۔ یہ بھی مشعر ہے کہ عمل ایمان سے علٰحدہ شے ہے، کہیں باوجود عصیان کے ایمان کا اطلاق ہوا ہے، جیسے وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ (۴) (اگر دو فریق مسلمانوں کے آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں ملاپ کرا دو، پھر اگر چڑھا چلا جائے ایک ان میں سے دوسرے پر، تو تم سب لڑو اس چڑھائی والے سے یہاں تک کہ پھر آئے اللہ کے حکم پر) تو باوجودیکہ باغی گروہ امراللہ سے ہٹا ہوا تھا مگر اس کو مومن کہا گیا، چوتھی چیز یہ کہ توبہ کے ساتھ ایمان کو جمع کیا گیا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَصُوحًا (۵) معلوم ہوا کہ معصیت کے ساتھ ایمان جمع ہو سکتا ہے، اسی طرح اور بہت سی دلیلیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل ایمان سے خارج ہے، ہاں کہیں کہیں لفظ ایمان کا اطلاق عمل پر کیا گیا ہے جیسے مَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ (۶) مگر اطلاق میں کلام نہیں، کلام اس میں ہے کہ آیا حقیقت ایمان میں اعمال داخل ہیں یا نہیں علاوہ بریں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ایمان تصدیق کا نام ہے اور تصدیق یا تو زبان کا وصف ہے یا قلب کا، وہ کسی تیسری چیز کا وصف نہیں بن سکتی۔ دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ تصدیق یا تو زبان کا فعل ہو سکتا ہے یا قلب کا، کسی تیسری چیز کا فعل نہیں ہو سکتا، اب اگر ایمان تصدیق و عمل کے مجموعہ کا نام رکھا جائے تو گویا شریعت نے ایمان کو لغوی معنی سے علٰحدہ کر دیا اور اس کا اطلاق ایسے معنی میں کیا جس کو اہل عرب نہیں

(۱) مجادلہ: ۲۲ (۲) حجرات: ۷ (۳) نحل: ۱۰۶ (۴) حجرات: ۹ (۵) تحریم: ۸ (۶) بقرہ: ۱۴۳

. . . .

. .

جانتے تھے، حالانکہ اہل عرب کو خطاب کرنے میں انھیں کے فہم کے مطابق کلام ہونا چاہیے اور جو معنی وہ سمجھتے ہوں وہی مراد ہونے چاہئیں، تو جب اہل عرب لغوی معنی ہی سمجھتے ہیں اور اس میں اعمال داخل نہیں ہیں تو اعمال کو جزو ایمان کہنا صحیح نہ ہوگا۔

حدیث جبریل میں دیکھو کہ جب ایمان کا سوال ہوا تو عقائد کا ذکر کیا اور جب اسلام کا سوال کیا تو اعمال کا ذکر کیا، یہ واقعہ ہے کہ ایمان پر اسلام کا اور اسلام پر ایمان کا اطلاق ہوتا ہے مگر یہ توسعاً ہے، حقیقت میں یہ دونوں علٰحدہ ہیں، یہاں سے اسلام و ایمان کا فرق بھی معلوم ہو گیا، یہ بھی ایک اختلافی مسئلہ ہے کہ آیا یہ دونوں ایک ہی ہیں یا علٰحدہ علٰحدہ؟ کسی نے ایک کہا اور استدلال کیا وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ [1] سے اور استدلال کیا اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ [2] سے کسی نے کہا کہ اسلام نام ہے انقیاد کا اور انقیاد وہ وصف ہے جو زبان اور قلب و جوارح سب کو شامل ہے، اور ایمان خاص انقیاد قلبی کا نام ہے، لہٰذا یہ دونوں خاص و عام ہیں، بعض نے کہا دونوں متغائر ہیں اور فرق ایسا ہی ہے جیسا بدن اور روح میں یا قلب و قالب میں، قالب اسلام ہے اور روح ایمان، مگر اسلام معتد بہ جب ہوگا کہ اس میں روح یعنی ایمان ہو، اگر صرف بدن ہے تو اس کا اعتبار نہیں، جیسے مردہ انسان، ہاں صورت کے اعتبار سے کبھی اسے انسان کہہ دیتے ہیں، ایسے ہی حقیقی اسلام یہ ہے کہ زبان سے تلفظ بالشہادہ اور اعمال مفروضہ و غیر مفروضہ کی ادائیگی ہو، مگر یہ معتد بہ اس وقت ہوگا جب روح ایمان موجود ہو، جس طرح کہ ایمان اگرچہ تصدیق قلبی کا نام ہے فرمایا: وهو ان تومن بالله الخ مگر یہ ایمان کامل اس وقت ہوگا جبکہ اس ڈھانچہ میں ہو، اور اسلام معتد بہ جب ہوگا جب کہ اس میں یہ روح ہو، روح اگر تنہا ہو اور بدن نہ ہو تو بھی حامل حقیقت انسانیہ ہو سکتی ہے گو اب بھی بہت سے وہ اعمال جو بدن سے مطلوب ہیں پائے نہ جائیں گے، تو یہ نقصان ہے مگر وہ حقیقت کی حامل ضرور ہے گو مکمل طور پر نہ ہو، اور بدن میں اگر روح نہ ہو تو وہ بالکل بیکار اور لاشئے محض ہے، وہ صرف صورت ہے اور انسانیت سے بے بہرہ ہے، یہی حال منافق کا ہے کہ جہاد میں شریک ہوتا ہے، نماز پڑھتا ہے اور اَشْهَدُ اَنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ کہتا ہے، مگر چونکہ یہ صرف صورت ہے اس لئے دنیا میں کام چل جاتا ہے مگر چونکہ روح نہیں اس لئے آخرت میں بے بہرہ رہتا ہے، تو ایمان (روح) بدون اسلام (بدن) کے گو معتبر ہے مگر ناقص رہیگا اور کمال حاصل نہ ہوگا اور اسلام بدون ایمان (روح) کے بالکل بیکار ہے، کچھ مفید نہیں، تو حدیث جبریل بہت بڑی دلیل ہے کیونکہ ایمان و اسلام دونوں کے متعلق الگ الگ اور دونوں میں امتیاز کا سوال ہے اور اسی کا جواب دیا گیا ہے، اب اگر اعمال پر ایمان کا اطلاق ہو جائے تو کچھ مضائقہ نہیں، جیسے ای الاعمال افضل کے جواب میں فرمایا: الایمان باللّٰه الخ، اسی طرح ایمان پر عمل کا اطلاق ہو جاتے تے بھی

---

(۱) آل عمران : ۸۵ (۲) آل عمران : ۱۹

مضائقہ نہیں، جیسے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ (۱) ای ایمانکم (۲) یا جیسے فرمایا: فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۳) یہاں عمل سے مراد قول لا الٰہ الا اللہ ہے جیسا کہ بخاری میں ہے، نیز فرمایا: وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۴) یہاں عمل سے مراد ایمان ہے، پس عمل کا اطلاق ایمان پر کیا گیا، مگر ہم حقیقت بیان کر رہے ہیں، توسع اور مجاز سے بحث نہیں ہے، ایمان و اسلام میں تفریق پر سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے کہ جب مال آیا اور حضور علیہ السلام تقسیم فرمانے لگے تو ایک شخص کو آپؐ نے نہ دیا تو سعد نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ انھیں چھوڑے دیتے ہیں، وھو مومن، آپؐ نے فرمایا أَوْ مُسْلِمٌ، تین بار سوال وجواب کے بعد فرمایا: أَقِتَالًا يَا سَعْدُ! (۵) پھر فرمایا: بعض کو یہ سمجھ کر دیتا ہوں کہ ان کے ایمان میں کمزوری ہے اس حدیث میں سب لکھتے ہیں کہ سعد کو متنبہ کرنا مقصود ہے کہ ایمان قلب کا فعل ہے، تمھیں کیا حق ہے کہ اس کے قلب پر حکم لگاؤ اور پھر اصرار کرو، تم یہی کہو کہ وہ مسلم ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مومن اور مسلم میں وہی فرق ہے جو ایمان و اسلام میں ہے، تو عند اللہ مسلم وہ ہوگا جو مومن ہو، مگر عند الناس مسلم کیلئے مومن ہونا ضروری نہیں، قرآن میں خود موجود ہے: قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا (۶) ان اعراب میں یا تو ایمان ہی نہ تھا، صرف زبان سے اظہار تھا، یا ایمان تو لائے تھے مگر رسوخ نہ ہوا تھا، اسی کو فرمایا: وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ (۷) معلوم ہوا کہ ایمان قلب میں ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام و ایمان میں ظاہر و باطن اور روح و بدن کا فرق ہے، مگر یہ یاد رہے کہ روح بلا بدن پھر ایک چیز رہتی ہے اور بدن بلا روح لاشئے محض ہے اور غالباً لاشہ جو ہمارے یہاں مشہور ہے اسی لاشئ سے لیا گیا ہے، تو عمل درحقیقت مکمل ہے اور آثار میں سے ہے مگر نفس ایمان میں داخل نہیں۔

دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ سلف کے وقت سے کہتے چلے آئے ہیں کہ ایمان قول وعمل کا نام ہے (یہ نہیں کہا کہ مرکب ہے، نہ جزو وکل کا اطلاق کیا ہے) قرآن و حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ عمل علحدہ چیز ہے اور ایمان علحدہ، اور سلف کا قول یہ ہے حتی کہ صحابہ و تابعین بھی اس میں شریک ہیں، تو پھر اس قول کا مطلب کیا ہوگا؟

یہاں پر ایک اشکال پیش آیا ہے، حتی کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے پکے متبع امام رازی تک گھبرا گئے ہیں اور تفسیر کبیر اور مناقب الشافعی میں بھی یہ کہہ گئے ہیں کہ جب عمل نہ رہا تو جزو فوت ہوا اور انتفاء جزو مستلزم ہے انتفاء کل کو، اور جب کل فوت ہوا تو ایمان کہاں رہا، یہ تو معتزلہ کا مسلک

(۱) فرقان: ۷۷ (۲) کما ورد فی البخاری من تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ (جامع) (۳) الحجر: ۹۳
(۴) زخرف: ۷۳ (۵) مسلم (ص ۸۵ ج ۱) ۱۲ مرتب (۶) حجرات: ۱۴ (۷) ایضاً

. . . .

ہوگیا، جب اشکال پیش آیا تو بکثرت لوگ مثلاً حافظ و رازی وغیرہ وہ ہیں جنھوں نے فیصلہ کیا کہ عمل نفس ایمان کا جزو ہوئے یہ تو صحیح نہیں، ہاں ایمان کامل کا وہ جزو ہے، اور ایمان کامل میں تمام اعمال دعقائد داخل ہیں، اب بتاؤ کہ نزاع کیا رہا، امام ابوحنیفہ بھی تو یہی کہتے ہیں کہ عمل نفس ایمان کا جزو نہیں ہے، اس کو ایمان کامل کا جزو تو وہ بھی مانتے ہیں

شکر ایزد کہ میان من و اوصلح فتاد ٭ حوریاں رقص کناں ساغر و پیمانہ زدند

مگر میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ یہ نزاع لفظی نہیں ہے کیونکہ بڑے بڑے ائمہ کا قول ہے، کچھ نہ کچھ اختلاف حقیقی ماننا پڑے گا، لہٰذا تعبیر اس کی کچھ اور ہونا چاہئے، چنانچہ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ لوگوں نے رازی کے اشکال سے متاثر ہوکر یہ قول اختیار کرلیا، حالانکہ یہ غلط ہے ہم کہتے ہیں کہ اعمال جزو ہیں نفس ایمان کے، مگر جزو کی دو قسمیں ہیں (۱) جزو حقیقی (۲) جزو عرفی، جزو حقیقی جیسے انسان نام ہے حیوان ناطق کا، ان میں سے کوئی جزو خواہ حیوان، خواہ ناطق فوت ہوگا تو انسان نہ رہے گا، اور یہ قاعدہ کہ انتفاء جزو مستلزم ہے انتفاء کل کو، وہ صرف اجزائے حقیقیہ میں ہے، اور یہ اصطلاح فلاسفہ ہے، لغوی معنی نہیں۔ اور ایک اجزائے عرفیہ ہیں جیسے عرف، عام میں اجزاء اعضائے بدن کو کہتے ہیں، تو زید کے تمام اعضاء اجزاء ہیں، اب اگر اجزائے عرفیہ میں سے کوئی جزو فوت ہوجائے تو یہ انتفاء کل کو مستلزم نہیں۔ لنگڑے اور اندھے کو انسان ہی کہتے ہیں، چنانچہ اس قاعدہ کو حکماء بھی تسلیم کرتے ہیں، تو اب ہمارا قول یہ ہے کہ اعمال ایمان کے عرفی اجزاء ہیں، مگر اجزائے عرفیہ میں بھی تفاوت ہوتا ہے، دیکھو اگر شہ رگ کٹ جائے تو حیات ختم، لیکن بال اترنے سے یا ٹانگ ٹوٹنے سے حیات باقی رہتی ہے، تو اجزائے عرفیہ میں بھی بعض اجزاء کے انتفاء سے کل کا انتفاء ہوتا ہے اور بعض کے انتفاء سے نہیں، ایسے ہی یہاں ایمان نام ہے قول وعمل اور اعتقاد کا، مگر اعمال میں باہم ایسا ہی تفاوت ہے جیسا کہ اجزائے انسانیہ میں، کہ بعض رئیسہ ہیں بعض غیر رئیسہ، بعض کے جانے سے انسانیت ختم ہوجاتی ہے اور بعض کے جانے سے نہیں، ایسے ہی ایمان کے لئے اعمال ہیں کہ بعض کے انتفاء سے ایمان جاتا رہتا ہے جیسے امام احمد کے یہاں ترک صلوٰۃ سے، یا جیسے انتفائے اقرار سے یا انتفاء تصدیق سے کہ ان سب صورتوں میں ایمان کا انتفاء ہوجائے گا، اور بعض کے انتفاء سے ایمان باقی رہے گا، گو ناقص ہوگا، جیسے صوم و زکوٰۃ وحج وغیرہ، کہ یہ اعمال نہ ہوں تو ایمان کا انتفاء نہ ہوگا۔ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ یہ ہے مسئلہ کی حقیقت، نہ کہ وہ جو امام رازی نے سمجھی ہے، امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ ایمان وہی ہے جو حدیث جبریل میں ہے اور جو قرآن میں ہے اور جو اعمال کا معطوف علیہ ہے۔ اور وہ فرماتے ہیں کہ ایمان وعمل میں وہ نسبت نہیں ہے جو تم کہتے ہو بلکہ ان دونوں میں وہ نسبت ہے جو اصل و فرع میں ہے، ایمان اصل ہے اور اعمال فرع، تو جزو وکل کی نسبت نہیں ہے، اصل و فرع کی ہے، یا یوں کہئے کہ نسبت وہ ہے جو قالب کو قلب سے اور بدن کو روح سے ہے [عنوان و تعبیر کے اس اختلاف کے باوجود] نتیجہ دونوں کے نزدیک ایک ہی ہے، تارک صلوٰۃ [دونوں کے نزدیک] مستحق عذاب ہے نہ کہ مخلد فی النار۔

. . . .

سب یہی کہتے ہیں، اور معتزلہ، مرجئہ، خوارج کے سب خلاف ہیں، نہ کوئی تارک عمل کو مخلد فی النار کہتا ہے، جیسا کہ خوارج و معتزلہ کہتے ہیں، نہ کوئی یہ کہتا ہے کہ عمل کو کچھ دخل ہی نہیں، جیسا کہ مرجیہ کہتے ہیں، اہل حق ان خوارج و معتزلہ اور مرجئہ کے بین بین ہیں، اہل حق میں کچھ اختلاف ضرور ہے مگر یہ اختلاف انظار کا ہے نتیجہ کا نہیں، ایک نے اعمال کو جز کہا اور ایک نے فرع، تو احناف کہتے ہیں کہ ایمان دعامہ ہے اور اعمال اس کی شاخیں، ہاں تارک اعمال مستحقِ نار ضرور ہے، تو اب نزاع صرف لفظی نہ رہا بلکہ انظار کا فرق ہوا، یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ اعمال کو جزء نہ کہنا بدعت اعتقادیہ سے تو نہیں مگر بدعت الفاظ و اقوال سے ضرور ہے، اور یہ تعبیر سلف کی نہیں، آگے کہتے ہیں کہ اس بدعت لفظی کے اختیار کرنے سے بہت بڑا فساد پیدا ہو گیا، کیونکہ لوگوں کے دلوں سے وقعت عمل جاتی رہی اور مرجئہ کو اس سے مدد ملتی ہے اور فسق و فجور کا شیوع ہوتا ہے، لوگ اس تعبیر سے یہ سمجھتے ہیں کہ اعمال کے نہ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا، میرے استاذ [شیخ الہندؒ] فرماتے تھے کہ ابن تیمیہؒ جدھر جھکتے ہیں جھکتے چلے جاتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ اگر جزء کہو گے تو پھر معتزلہ اور خوارج کو مدد ملے گی، ایسی صورت میں تم کو بھی مطلب کی تحلیل کرنی پڑے گی تو اس صورت میں ہم بھی مراد کو حل کریں گے، خوارج کا فتنہ تو مرجئہ سے بڑھ کر ہے، اس فتنہ سے ہزاروں خون ہو گئے کیونکہ عمل جب جزء ایمان ہے تو بے عمل مومن نہیں رہا اور جب مومن نہیں تو کافر ہوا اور جب کافر ہے تو مباح الدم و جائز القتل، حقیقت یہ ہے کہ ابن تیمیہ نے غلطی کی ہے، سلف کا وہ قول نہ ہو مگر قرآن کا قول تو ہے اور سلف نے تو جزء و کل کہا نہیں، ان کے الفاظ تو یہ ہیں کہ "الایمان قول و عمل" ہمارے استاذ فرماتے تھے کہ یہ اختلاف نہ نظر کا ہے نہ ثمرہ کا، بلکہ مقتضیات مقام و احوال کا اختلاف تھا، فرض کرو ایک مرجی تم سے کہے کہ عمل ہرگز جزء ایمان نہیں، بالکل بیکار ہے، تو اس وقت تم بھی یہی کہو گے کہ نہیں، جزء ایمان ہے اور بہت ضروری ہے، اور جب تم یہ کہو گے تو تمہاری مراد یہ ہو گی کہ اس قسم کا جزء ہے جس قسم کے جزء کی وہ نفی کر رہے ہیں، وہ جزئیت کی نفی اس معنی میں کر رہے ہیں کہ اس کو کوئی مدخل ہی نہیں، اور ہم اس کا اثبات کر رہے ہیں کہ وہ اجزاء عرفیہ سے ہے اور اس سے کمال ہوتا ہے اور اگر کوئی خارجی آ کر کہے کہ عمل جزء ہے اور بلا اس کے مومن نہیں ہو گا اور ترک سے خلود فی النار ہو گا، تو ہم کہیں گے غلط ہے، وہ ہرگز جزء نہیں ہے اور اس قسم کی جزئیت کی ہم نفی کریں گے جس کا وہ مدعی ہے یعنی یہ کہ اس کے بدون ایمان نہ رہے گا، تو استاذ فرماتے تھے کہ محدثین کو زیادہ سابقہ مرجئہ سے پڑا ہے اور وہ منکر جزئیت ہیں، لہٰذا محدثین نے کہا کہ ضرور جزء ہے، اور امام صاحب کا سابقہ زیادہ تر خوارج سے پڑا اور ان سے بڑے بڑے مناظرے ہوئے ہیں اور وہ جزئیت کے اثبات کے درپے تھے، اس لئے امام ابو حنیفہ نفی کرتے تھے کہ وہ ہرگز ایسا جزء نہیں ہے جیسا تم کہتے ہو، تو اب فرق یہ ہوا کہ یہ اختلاف نہ نظر کا ہے نہ ثمرہ کا، بلکہ اختلاف مقتضیات احوال کا ہے، یہ استاد کا محاکمہ تھا، پس اگر اختلاف ہے تو نظر کا ہے اور اگر اختلاف نہیں ہے تو مقتضیاتِ احوال کی بنا پر ایسا قول کیا گیا، ہاں مرجئہ اور خوارج کا اختلاف بیشک حقیقی ہے کیونکہ وہ افراط و تفریط میں پڑ گئے انھوں نے ایک طرف نظر کی اور انھوں نے دوسری طرف طرفین کا احاطہ نہیں کیا اسلئے غلطی کھائی، ایک کونہ پر معتزلہ و خوارج اور ایک کونہ پر مرجئہ،

. . . .

درمیان میں اہل السنۃ ہیں جن کا مسلک کتاب وسنت کے عین مطابق ہے اور افراط وتفریط سے پاک اور معتدل ہے۔

ایک دوسرا معرکۃ الآرا مسئلہ یہاں یہ ہے کہ ایمان زائد وناقص ہوتا ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ کے بارے میں یہ سمجھ لو کہ بخاری نے جو الفاظ نقل کئے ہیں وہ پورے نہیں ہیں، سلف کے پورے الفاظ یہ ہیں: یَزِید بالطاعۃ وَیَنقص بالمعصیۃ (ھکذا قالہ الحافظ فی الفتح، وابن تیمیۃ فی رسالتہ) امام ابوحنیفہ اور ان کے استاد حماد رحمہما اللہ سے لایزید ولاینقص کے الفاظ منقول ہیں۔

امام رازی نے کہا کہ یہ مسئلہ فرع ہے پہلے مسئلہ کی [اگر یہ کہئے کہ ایمان تصدیق کا نام ہے تو وہ متفاوت (کم وبیش) نہ ہوگا اور اگر یہ کہو کہ اعمال بھی ایمان میں داخل ہیں تو یہ متفاوت (کم وبیش) ہوسکتا ہے] تو یزید کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس کے اجزاء (اعمال) زائد ہیں، اور ینقص کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اجزاء (اعمال) کم ہیں، حاصل اس کا یہ ہوا کہ یزید وینقص باجزائہ (یعنی بالاعمال) اور جس نے [صرف تصدیق کو ایمان کہا اس کے نزدیک اعمال جن پر کمی وبیشی کا مدار ہے ایمان میں داخل ہی نہیں ہیں، تو ایمان کم وبیش نہیں ہوسکتا] اسلئے اس نے کہا: لایزید ولاینقص، اور ٹھیک ہی کہا کیونکہ اس کے نزدیک اعمال جن سے کمی بیشی ہوتی ہے ایمان میں داخل ہی نہیں ہیں تو یہ مسئلہ متفرع ہوا پہلے مسئلہ پر، امام رازی کے علاوہ اوروں نے بھی یہی لکھا ہے۔

مگر متاخرین کہتے ہیں کہ ایمان میں اعمال کے داخل ہونے سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ دیکھنا کہ آیا اس میں زیادۃ ونقصان ہے یا نہیں؟ تو بعض لوگ اس کے قائل ہیں اور بعض منکر۔

میں کہتا ہوں سلف شاہد عدل ہیں، ان کے الفاظ میں غور کرو، ان سے یہ چیز نکلتی ہے کہ ان کے نزدیک بھی عمل ایمان سے علٰحدہ چیز ہے اور وہ ایمان کا جزء نہیں ہے بلکہ ایمان سے الگ ایک چیز ہے جس سے ایمان بڑھتا ہے اس لئے کہ کوئی چیز اپنی ذات سے زائد نہیں ہوتی یعنی اس کی ذات سے اس میں زیادتی نہیں پیدا ہوتی مثلاً یہ کہنا صحیح نہیں کہ انسان میں اس کے سر سے اضافہ ہوتا ہے، ہاں یہ کہنا صحیح ہے کہ انسان میں اس کی داڑھی سے اضافہ ہوتا ہے:

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی کہتے ہیں [کہ اعمال، ایمان سے زائد ہیں، اس کی ذات میں داخل نہیں ہیں]

اب رہا زیادۃ ونقصانِ ایمان کا مسئلہ، تو انصاف یہ ہے کہ قرآن اس سے بھرا پڑا ہے، کتنی آیات ہیں جن میں زیادۃ کی تصریح ہے نقص کا لفظ اگرچہ نہیں ہے مگر زیادۃ [کے ثبوت سے بالمقابل نقص کا ثبوت لازم ہے] تو جب یہ مسئلہ قرآن سے ثابت ہے، پھر ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کیونکر ممکن ہے کہ قرآن کی ان آیات کے ہوتے ہوئے وہ لایزید ولاینقص کہدیں، عقلاً یہ ناممکن بات ہے کہ قرآن کی ان آیات کی طرف ان کا ذہن

. . . .

نہ گیا جو بیس چالیس ہزار بار قرآن ختم کئے ہوں اس سے کیونکر ممکن ہے کہ اس نے غور نہ کیا ہو حقیقت یہ ہے کہ ابو حنیفہؒ کا اس پر اتفاق ہے کہ زیادۃ و نقصان ہوتا ہے اور اس کی تصریح موجود ہے، رہی وہ کمی بیشی جس کے امام صاحب منکر ہیں، وہ دوسری شے ہے، اس کے بارے میں امام صاحب کہتے ہیں کہ ایمان تصدیق کا نام ہے، یعنی نبی علیہ السلام کی اطاعت و انقیاد کا التزام کرنا اور قبول کرنا اور گردن ڈال دینا، تو اب اس کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص ابھی ایمان لایا تو اس کے دل میں یہ التزام ہے کہ جو فرمان رسول ہوگا وہ سب کروں گا، تو یہ ایک التزام حاوی ہے تمام جزئیات شرعیہ کو، اس لئے کہ اگر کوئی شخص کسی ایک جزء کے بھی التزام کا قائل نہ ہو تو کیا وہ مومن ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (۱) اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جس چیز کو طبیعت چاہے قبول کرے اور جس کو جی نہ چاہے قبول نہ کرے، ایسا آدمی مومن نہیں ہو سکتا، ایک جزء میں بھی تفریق کرے گا تو وہ مومن ہرگز نہ رہے گا، عمل بعد کی چیز ہے ابھی التزام کی بات ہو رہی ہے، دوسری جگہ فرمایا: يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ (۲) ــــ معلوم ہوا کہ تفریق سے ایمان نہیں رہتا، التزام کل کا لازم ہے اور اسی کا نام ہے ایمان، اور یہ التزام یا یہ تصدیق لایزید ولاینقص ہے، اس میں کمی زیادتی مطلقاً کسی قسم کی نہیں ہو سکتی، اور اس میں ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما اور زید و عمرو سب شریک ہیں، اس میں کمی بیشی کا کوئی امکان نہیں، یعنی جس طرح کل ما جاء به الرسول کا بلا کم و کاست التزام کرنا اور ماننا ایک کے لئے ضروری ہے، اسی طرح دوسرے کے لئے بھی ضروری ہے، دونوں میں کوئی تفاوت نہیں (۳)

اب مطلب ہوا کہ مؤمن بہ (جس پر ایمان لایا جائے) کے اعتبار سے کمی زیادتی، کہ ایک تو سو باتوں پر ایمان رکھتا ہو اور دوسرا پچاس باتوں پر یہ ناممکن ہے [مومن ہونے کے لئے لازم ہے کہ ہر مومن، ہر ایک مؤمن بہ کا التزام کرے] خواہ ولی ہو، قطب ہو، غوث ہو، صحابی ہو، سب اس میں برابر شریک ہیں، آج اگر ایک شخص سب باتیں مان لے اور کہے کہ میں صرف شراب کے حکم کو نہ مانوں گا تو کیا یہ شخص مومن ہو سکتا ہے؟ چنانچہ زار روس نے یہی کہا تھا مگر علماء نے جواب دیا کہ یہ ناممکن ہے کہ کسی معمولی سے معمولی چیز کا انکار کیا جا سکے۔ الغرض اس ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی، تو نفس مومن میں کوئی فرق نہیں، ہاں صرف اجمال و تفصیل کا فرق ہے، مثلاً جو لوگ ابتدائے اسلام میں ایمان لائے اور احکام بعد کو

---

(۱) بقرہ : ۸۵ (۲) نساء : ۱۵۰، ۱۵۱۔

(۳) راجع لہ القسطلانی صـ۴۴۳ باب الکفن فی القمیص الذی یکف او لایکف (جامع)

. . . .

آتے رہے، تو یہ لوگ سب کا التزام پہلے اجمالاً کرچکے تھے اور اب یہ تفصیل ہے اسی ایمان مجمل کی، امام ابو حنیفہؒ نے اسی کو فرمایا: آمنوا بالجملة ثمّ بالتفصیل، یہ الفاظ خاص انھیں کے ہیں، یہ اس وقت فرمایا تھا جب لوگوں نے اعتراضات کئے تھے اور دلیل کے طور پر آیات پیش کی تھیں معلوم ہوا کہ یہ زیادہ نہیں ہے بلکہ اسی اجمال کی تفصیل ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے نکاح کے وقت صرف قبلتُ کہا جاتا ہے مگر اس ایجاب وقبول میں جو کہ مجمل ہے جملہ حقوق زوجیت کا ایجاب وقبول مندرج ہے، اسی کو امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مومن بہ اجمال وتفصیل کے لحاظ سے کم اور بیش ہوتا ہے مگر مومن بالتزام نہیں بڑھتا اور وہ اول سے آخر تک ایک ہے۔ میرے نزدیک اس جواب سے بہتر کوئی جواب نہیں ہو سکتا، اب تمام آیات کو پڑھ جاؤ، امام صاحب کا قول کسی آیت کے بھی خلاف معلوم نہ ہوگا: ہاں قوت ہوتی ہے، نور پیدا ہوتا ہے اور بڑھتا ہے اور حسن آتا ہے، سب مسلّم ہے مگر نفس ایمان میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا وہ علی حالہ باقی رہتا ہے، اب ایمان زید وایمان صدیق اکبر کا مطلب بھی حل ہوگیا، یعنی جو التزام ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا وہی التزام زید نے کیا، ہاں قوت کا فرق بے شک ہے، اس سے انکار نہیں، اس کی نظیر یہ ہے کہ ایک آنکھ کا نور ہے اور ایک مبصرات ہیں، ایک شخص کوٹھری میں بیٹھا ہے مگر اس کی مبصرات کم ہیں گو وہ حدید النظر ہے اور ایک ضعیف البصر ہے مگر اس کے مبصرات بہت ہیں، تو اس کی قوت میں کچھ فرق ہے: ہاں مبصرات بہت ہیں۔

تو ایمان درحقیقت ایک نور ہے، کما قال تعالیٰ: أَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ [1] ــــ نیز فرمایا: أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهُ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ط [2] تو یہ نور متفاوت نہیں ہوا مومن بہ کے اجمال وتفصیل سے، بلکہ یہ اپنی جگہ پر ہے خلاصہ یہ کہ ابو حنیفہ مطلقاً زیادۃ ونقصان کے منکر نہیں، اب تمام آیات کو پڑھ لو:

لِيَزْدَادُوْا إِيْمَانًا مَّعَ إِيْمَانِهِمْ [3] ــــ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى [4] ــــ وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى [5] ــــ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰىهُمْ [6] وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا إِيْمَانًا [7] ــــ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖ إِيْمَانًا ج [8] ــــ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيْمَانًا ق صلے [9] ــــ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيْمَانًا۔ [10]

---

(۱) زمر: ۲۲ ــــ (۲) انعام: ۱۲۲ ــــ (۳) فتح: ۴ ــــ (۴) کہف: ۱۳ ــــ (۵) مریم: ۷۶ ــــ
(۶) محمد: ۱۷ ــــ (۷) مدثر: ۳۱ ــــ (۸) توبہ: ۱۲۴ ــــ (۹) آل عمران: ۱۷۳ ــــ (۱۰) احزاب: ۲۲

. . . .

ان تمام آیات میں نیکی کی توفیق اور ثمرات و آثار وغیرہ کا بیان ہے جس کا انکار نہیں، متکلمین نے اس بارے میں بہت بحثیں کی ہیں۔

ابن حزم نے "الملل والنحل" میں لکھا ہے کہ ایمان تصدیق کا نام ہے، اور اس میں سب برابر ہیں، زیادتی خارج سے ہوتی ہے، نفس تصدیق میں تفاوت نہیں ہوتا تفاوت خارج سے آتا ہے اور الکل اعظم من الجزء کی تصدیق اور العالم حادث کی تصدیق میں صرف سرعت اور بطوء کا تفاوت ہے، فی نفسہٖ اس تصدیق اور اس تصدیق میں کوئی تفاوت نہیں ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ دونوں برابر ہیں، اب اگر تصدیق میں نقصان ہے تو یہ تصدیق کیا ہوئی یہ تو شک یا تردد ہوا، یا وہم وظن جو جزم کی حد تک نہیں پہونچا، لیکن جو چیز جزم کی حد تک پہونچ جائے اس میں کمی بیشی کا سوال ہی نہیں، رہا طاعات سے نور کا بڑھنا، تو نور نفس ایمان نہیں ہے، ایمان کے لواحق سے ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ ایمان میں جو کمی بیشی اعمال کے سبب سے ہے، وہ اس کے آثار میں ہے، نفس ایمان میں نہیں۔

تیسرے صاحب نے کہا کہ ایک ایمان منجی ہے وھو لا یزید ولا ینقص، اور ایک ایمان کامل ہے جس کے ذریعہ مومن دخول اولی کا مستحق یا مقربین میں شامل ہوتا ہے، وھو یزید وینقص، تو وہ ایمان جو بمعنی لولاہ لامتنع ہے، وہ لایزید ولاینقص ہے اور جو ایمان رافع درجات ہے وہ کم زیادہ ہوتا ہے۔

تین جواب ہوئے ایک التزام مومن بہ کا، کہ اس میں کچھ زیادۃ ونقصان نہیں ہوتا، ہاں تبیین وانجلاء کا فرق ہے، دوسرا جواب ابن حزم کا ہے کہ نفس تصدیق میں زیادۃ ونقصان نہیں، ہاں آثار ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے، تیسرا وہ ہے جو قریب قریب دوسرے کے ہے کہ ایمان منجی لا یزید ولا ینقص اور ایمان کامل یزید وینقص۔

اس تیسرے جواب کے متعلق شیخ اکبر کا لفظ نقل کرتا ہوں، وہ فتوحات میں ایمان منجی کی حقیقت بتلاتے ہیں کہ وہ ایمان فطرت ہے جسے حدیث میں کہا گیا ہے: کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ فَاَبَوَاہُ یُہَوِّدَانِہٖ اَوْ یُنَصِّرَانِہٖ اَوْ یُمَجِّسَانِہٖ، یعنی اسلام فطری چیز ہے (مقابلہ سے معلوم ہوا کہ علاوہ اسلام کے اور کوئی مذہب فطرت نہیں) جس پر ہر بچہ پیدا ہوتا ہے، اور جو تبدیلی بڑے ہونے پر اس میں پیدا ہوتی ہے وہ خارجی تاثیرات سے پیدا ہوتی ہے، تو اس کی موت فطری ایمان پر آئی ہے، اور درمیانی مدوجزر جو طاری ہوتے ہیں، اصلی نہیں، وہ کہتے ہیں کہ ایمان طاری میں زیادۃ ونقصان ہے اور ایمان منجی فطری ہے وھو لا یزید ولا ینقصُ۔

. . . .

خلاصہ یہ کہ ایمان مبنی ایمان فطری ہے اور درمیان میں جو طریان ہے احوال کا وہ خارجی چیز ہے، یہ خلاصہ ہے مسئلہ یزید وینقص کا۔ اب کوئی آیت اور کوئی حدیث ہمارے خلاف نہیں۔

یہ تو ایمان کا بیان تھا، اب کفر کے متعلق کچھ کہدوں:

کفر کی چار قسمیں ہیں:

کفر انکار[1]، کفر جحود[2]، کفر عناد[3]، کفر نفاق[4]۔

اگر آدمی کو تصدیق یعنی تسلیم نہ قلبی حاصل ہے اور نہ زبانی، تو کفر انکار ہے۔

اگر دل میں تسلیم ہے، زبان سے اقرار نہیں تو کفر جحود ہے: وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ (۱)

اگر دل سے بھی تسلیم ہے، یعنی یقین رکھتا ہے اور زبان سے اظہار بھی ہے مگر التزام نہیں جیسے ابو طالب [کا کفر] تو یہ کفر عناد ہے خواہ کسی وجہ سے ہو، حبّ جاہ و مال کی بناء پر، جیسے ہرقل کا کفر، یا تقلید آباء کی وجہ سے ہو جیسے ابو طالب کا کفر، یا کسی اور وجہ سے۔

اور اگر دل میں تسلیم و تصدیق نہیں اور زبان سے تسلیم اور ظاہر میں انقیاد و التزام سب کچھ ہے، تو یہ کفر نفاق ہے۔

اور کفر ضد ایمان ہے، کیونکہ ایمان نام ہے ضروریات دین کے ماننے کا، اور ضروریات وہ ہیں جو متواتر ہیں۔

شاہ صاحب (حضرت مولانا انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ) نے تواتر کی چار قسمیں قرار دی ہیں، یہ تقسیم اور کہیں نہیں ملتی، جزئیات ملتے ہیں مگر تقسیم کہیں نہیں،

فرماتے ہیں تواتر چار قسم کا ہے:

تواتر اسناد[1]، تواتر طبقہ[2]، تواتر عمل[3]، تواتر قدر مشترک[4]

---

(۱) نمل : ۱۴

اسناد کا تواتر یہ ہے کہ سلسلۂ اسناد میں اس قدر روایت کرنے والے ہوں کہ ان کا اجتماع علی الکذب محال ہو [حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فتح الملہم کے مقدمہ میں فرماتے ہیں: وَهُوَ اَنْ يَرْوِىَ الْحَدِيْثَ مِنْ اَوَّلِ الْاِسْنَادِ اِلٰى اٰخِرِهٖ جَمَاعَةٌ يَسْتَحِيْلُ اِجْتِمَاعُهُمْ عَلَى الْكَذِبِ. یعنی تواتر اسناد وہ ہے جس کو اول سے آخر تک ایک ایسی جماعت روایت کرے جن کا جھوٹ پر اجتماع محال ہو ــــ آگے فرماتے ہیں: وَهٰذَا تَوَاتُرُ الْمُحَدِّثِيْنَ كَحَدِيْثِ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ. یعنی یہی محدثین کے نزدیک تواتر کے نام سے مشہور ہے جیسے حدیث مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا الخ اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ متواتر ہے] (۱)

تواتر طبقہ: جیسے قرآن کا تواتر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو نقل کرنے والے، سننے والے، پڑھنے پڑھانے والے، ہر طبقہ میں صحابہ کے عہد سے لے کر آج تک اسی کثرت سے ہیں جن کا کذب پر اتفاق محال ہے، قرآن پاک بالاتفاق جیلاً بعد جیلٍ ہم تک حرف بحرف اسی طرح پہونچا ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا اور وہ اسی معنی میں متواتر ہے، ہر چند کہ کتابوں میں حَدَّثَنَا فُلَانٌ عَنْ فُلَانٍ کے طرز پر اس کی ایک سند بھی نہیں ہے۔ [مگر بایں ہمہ اس کا تواتر شرق سے مغرب تک سارے عالم میں درساً وتلاوۃً حفظاً وقراءۃً آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے برابر چلا آرہا ہے، جس میں نہ تو کسی مومن کو اختلاف اور انکار ہے، نہ کسی کافر کو (۲) یعنی دوست دشمن سب اس پر متفق ہیں]

تیسرا تواتر عمل ہے [وَهُوَ اَنْ يَعْمَلَ بِهٖ فِىْ كُلِّ قَرْنٍ مِنْ عَهْدِ صَاحِبِ الشَّرِيْعَةِ اِلٰى يَوْمِنَا هٰذَا جَمٌّ غَفِيْرٌ مِنَ الْعَامِلِيْنَ بِحَيْثُ يَسْتَحِيْلُ عَادَةً تَوَاطُئُهُمْ عَلٰى كَذِبٍ اَوْ غَلَطٍ. یعنی تواتر عمل وہ ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لے کر آج تک ایک جم غفیر کا برابر عمل رہا ہو، جن کا کسی غلط اور جھوٹی بات پر ایسا مسلسل عمل عادۃً محال اور ناممکن ہو] (۳) جیسے حج کے موقع پر جمع بین الصلاتین اور مسواک کی سنت وغیرہ کہ عملاً یہ متواتر ہیں۔

تواتر عمل کے باب میں ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں کچھ کلام کیا ہے، اس لئے اس میں مجھ کو کچھ تردد ہو گیا ہے، لیکن بقیہ تینوں قسموں میں سے کسی ایک قسم کا کوئی انکار کردے تو بالاتفاق کافر ہے۔

چوتھا تواتر قدر مشترک ہے، اس میں کسی معین واقعہ یا قول وفعل کی نقل تواتر کے ساتھ نہیں ہوتی مگر بہت سے ایسے

---

(۱) اضافہ مرتب از مقدمہ فتح الملہم ص۵ (۲) اضافہ مرتب از مقدمہ فتح الملہم ص۵ (۳) اضافہ مرتب از مقدمہ فتح الملہم ص۶

واقعات و جزئیات بکثرت منقول ہوتے ہیں جن میں سے کوئی ایک بھی متواتر نہیں ہوتا مگر ان سب میں ایک قدر مشترک پایا جاتا ہے جو ان روایات کثیرہ سے ثابت ہوتا ہے، تو وہ قدر مشترک متواتر ہے۔ [مولانا مقدمہ میں فرماتے ہیں: وَهُوَمَا تَخْتَلِفُ فِيهِ أَلْفَاظُ الرُّوَاةِ بِأَنْ يَرْوِيَ قَوْمٌ مِنْهُمْ وَاقِعَةً وَغَيْرُهُ وَاقِعَةً أُخْرَى وَهَلُمَّ جَرًّا غَيْرَ أَنَّ هٰذِهِ الْوَقَائِعَ تَكُونُ مُشْتَمِلَةً عَلَى قَدْرٍ مُشْتَرَكٍ فَهٰذَا الْقَدْرُ الْمُشْتَرَكُ بِالْمُتَوَاتِرِ الْمَعْنَوِيِّ وَالْمُتَوَاتِرِ مِنْ جِهَةِ الْمَعْنَى] [1] جیسے حاتم کی سخاوت، کہ اس کا کوئی خاص واقعہ متواتر نہیں، مگر ایسے واقعات بحد کثرت سے منقول ہیں جن کا قدر مشترک حاتم کی سخاوت ہے، اس لئے حاتم کی سخاوت متواتر ہے، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت قدر مشترک کے طور پر متواتر ہے، معجزات نبوی کے واقعات کا قدر مشترک بھی متواتر ہے، لہذا کوئی اگر نفس معجزہ کا منکر ہے تو وہ کافر ہے، لیکن اگر کسی خاص معجزہ کو نہیں مانتا تو کافر نہ ہوگا بلکہ مبتدع ہوگا۔

---

(۱) مقدمہ فتح الملہم ص ۶

بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ وَهُوَ قَوْلٌ وَفِعْلٌ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ فرمانے کے بیان میں کہ اسلام کی عمارت پانچ چیزوں پر اٹھائی گئی، اور ایمان قول اور فعل کو کہتے ہیں

وَيَزِيْدُ وَيَنْقُصُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى لِيَزْدَادُوْا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ وَزِدْنٰهُمْ

اور وہ بڑھتا ہے گھٹتا ہے، اللہ تعالیٰ نے (سورۂ فتح میں) فرمایا تاکہ (ان کے پہلے) ایمان کے ساتھ اور ایمان زیادہ ہو، اور: ـ

هُدًى وَّيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى۔

(سورۂ کہف میں) ہم نے انکو اور زیادہ ہدایت دی اور (سورۂ مریم میں) جو لوگ سیدھے راہ پر ہیں

قولہ بنی الاسلام علی خمس الخ یہ مترجم بہ ہے اور یہی مترجم لہ بھی ہے، فرق یہ ہے کہ مترجم بہ مفصل نہیں ہے اور مترجم لہ مفصل ہے، مقصود بخاری یہ ہے کہ ایمان مرکب ہے کیونکہ زہد و تقوی، بر اور ہدی سب ایمان میں داخل ہیں۔

یہاں قول و فعل کا ذکر کیا، اعتقاد کا ذکر نہیں کیا یا تو اس وجہ سے کہ وہ سب کو معلوم اور مفروغ عنہ ہے یا اسلئے کہ قول عام ہے قول لسان کو اور قول قلب کو کما مرّ نقلا عن امام الحرمین والرازی وغیرھما، یا فعل عام ہے فعل جوارح اور فعل قلب کو،

بہرحال اگر داخل ہے تو اسکے یہ وجوہ ہیں اور اگر خارج ہے تو اس وجہ سے کہ وہ مفروغ عنہ ہے، بعض نسخوں میں فعل کے بجائے عمل کا لفظ ہے لیکن معنی دونوں کے ایک ہیں (لغویین نے کچھ فرق کیا ہے)

یہاں بخاری نے آٹھ آیات جمع کی ہیں اور غالباً اور کہیں ترجمہ میں اتنی آیات و احادیث جمع نہیں کی ہیں۔

قولہ لیزدادوا الخ ایمان کے اعتبار سے زیادت ثابت ہوتی ہے۔ اور موجب زیادت نہ پائے جانے کی صورت میں نقص خود بخود اس سے ثابت ہو جائے گا۔

ایک تو لفظ زیادہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ یزید و ینقص صحیح ہے، دوسرے لفظ مع زیادہ کو تبلا رہا ہے، لیکن زیادہ سے کیا مراد ہے، بخاری نے اس کی تشریح نہیں کی، مگر میری تقریر کے بعد کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا، کیونکہ جس معنی میں زیادہ و نقصان کی نفی کی گئی ہے، اس کا اثبات اس آیت میں نہیں ہے، اور جو کچھ اس آیت میں بیان کیا گیا ہے اس کا انکار نہیں کیونکہ ہمارے نزدیک ایمان التزام کا نام ہے، وہ کم زیادہ نہیں ہوتا، یا ایمان سے ایمان منجی مراد ہے اور اس میں زیادہ و نقصان نہیں، اور آیت میں ایمان منجی کا ذکر نہیں بلکہ ایمان طاری کا ذکر ہے، جیسا کہ عنقریب بیان ہوگا، یہاں تفسیر

. . . .

بیان کرنے سے پہلے یہ کہتا ہوں کہ حنفی مفسرین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ زیادۃ مومن بہ کے اعتبار سے ہے، کیونکہ ابتداءً صرف چند احکام پر ایمان لانا ضروری تھا، اسکے بعد بتدریج احکام کا نزول ہوتا رہا اور ان پر ایمان لانا ضروری ہوتا رہا، مثلاً صوم وحج وزکوٰۃ وغیرہ، کہ یہ سب بعد میں آئے، تو مطلب یہ ہوا کہ مومن بہ کی زیادت کی وجہ سے ایمان میں زیادۃ ہے، صاحب کشاف نے (جو اصول کے اعتبار سے معتزلی اور فروع کے اعتبار سے حنفی تھے، اور عربیت کے امام تھے، عربیت میں ان کی امامت کے سب قائل ہیں) اسے نقل کیا ہے، میں نے امام اعظم کا ایک لفظ مناقب کردری سے نقل کیا تھا، 'امنوا بالجملة ثم بالتفصیل' یعنی مجملاً التزام تو سب کے لئے لازم ہے خواہ کوئی احکام ہوں اور کتنے ہی آئیں، تو مومن بہ تفصیل کے اعتبار سے کسی وقت کم اور کسی وقت زیادہ ہوتا ہے مگر درحقیقت یہ زیادۃ ونقصان نہیں ہے، بلکہ اجمال وتفصیل ہے خواہ تم اسے کچھ کہہ لو۔

زمخشری کا یہ جواب دل کو نہیں لگتا، خصوصاً اس آیت کے متعلق، کیونکہ اس کا سیاق یہ ہے هو الذی انزل السكينة فی قلوب المومنين ليزدادوا ايمانا مع ايمانهم (۱) اور اس میں انزال سکینہ کا مقصد یا فائدہ بتایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ انزال سکینہ اس لئے ہوا تاکہ ایمان بڑھے کسی حکم کے نازل ہونے کا ذکر نہیں ہے نہ نزول حکم کی وجہ سے ایمان کے بڑھنے کا ہے، اس لئے یہاں یہ جواب نہ بنے گا، ہاں واذا ما انزلت سورة فمنهم من يقول ايكم زادته هذه ايمانا، فاما الذين امنوا فزادتهم ايمانا وهم يستبشرون واما الذين فی قلوبهم مرض فزادتهم رجسا الی رجسهم وماتوا وهم كافرون (۲) میں ضرور یہ معنی بن سکتے ہیں اور جواب منطبق ہوسکتا ہے۔ مگر آیت بالا میں نہیں،

اصل یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب نے فوائد میں کچھ اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ایمان کے بہت سے شعبے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے الایمان بضع وسبعون شعبة، اور ان شعبوں میں سے بعض بعض کو بیان بھی فرمایا کما ورد "الحياء شعبة من الايمان"، اور وہ شعب متفاوت ومتنوع ہیں، اور ہم اپنے لفظوں میں یوں کہتے ہیں کہ ایمان کے الوان مختلف ہیں کہیں ایک رنگ ہے کہیں دوسرا، اور ان کے مراتب بھی مختلف ہیں، یہاں پہلے واقعہ سمجھ لو تاکہ مطلب

---

(۱) سورۂ فتح :۔ ۴،

(۲) سورۂ توبہ :۔ ۱۲۴، ۱۲۵

. . . .

سمجھنے میں سہولت ہو، یہ واقعہ حدیبیہ کا ہے، شروع میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا تو یہاں افواہ پھیل گئی کہ عثمان کو کفار نے روک لیا یا قتل کر دیا، حضرت کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ ہزار کا مجمع تھا اور سب کے سب جاں نثار تھے جو تمام دنیا کے لئے کافی تھے، اس خبر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مجمع سے بیعت جہاد لی (کیکر کے درخت کے نیچے یہ بیعت ہوئی تھی) قرآن نے کہا ان الذین یبایعونك انما یبایعون اللہ(۱) الخ تمام صحابہ نے بیعت کی بعد میں خبر غلط ثابت ہوئی، اور انجام کار صلح پر معاملہ ختم ہوا مگر جس معاہدہ کی بنیاد پر صلح ہوئی تھی وہ معاہدہ ایسا تھا کہ تمام صحابہ حتی کہ عمر فاروق تک گھبرا گئے، معاہدہ کے شرائط بہت مایوس کن تھے، اور بظاہر بہت دب کر صلح لی گئی تھی، مثلاً معاہدہ کی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر کوئی مسلمان مدینہ سے مکہ چلا آئے گا تو اہل مکہ اسکو واپس نہ کریں گے، اور اگر مکہ والوں کا کوئی آدمی مدینہ آجائے گا تو مدینہ والے اسکو اپنے یہاں رہنے نہ دیں گے، یہ کتنی مغلوبیت کی بات تھی؟ مگر اللہ نے اپنے رسول کو یہ بتا دیا تھا کہ اس میں کتنے فوائد ہیں اور کتنے اسرار مخفی ہیں، لیکن دیکھنے میں دب کر صلح ہوئی تھی، اور یہ صلح دس سال کے لئے ہوئی تھی، صلح سے پہلے جو بیعت ہوئی تھی وہ جہاد کے لئے پہلی بیعت تھی اور اس کے لئے سب تیار تھے، پورے مجمع میں جوش ایمان بھرا ہوا تھا، اسکے بعد جب صلح کا حکم آیا تو صحابہ پریشان ہو گئے، حتی کہ عمر نے جو ابوبکر کے بعد مرتبہ رکھتے ہیں حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا، تو آپ نے فرمایا اللہ ورسولہ اعلم، ابوبکر کے پاس گئے تو انھوں نے بھی اللہ ورسولہ اعلم کہا، تو خاموش ہو گئے، یہانتک کہ آیات انا فتحنا لك الخ نازل ہوئیں، اور آپ نے عمر فاروق کو بلا کر سنایا (اس وقت آپ اونٹنی پر سوار تھے) تو عمر فاروق نے عرض کیا (فتح ھو؟ حضرت نے فرمایا، ہاں، تو درحقیقت یہ صلح مبادی ومقدمات فتح سے تھی، مگر ظاہر حالات سے تمام صحابہ کو اندازہ نہ ہو سکا۔ اس موقع پر ایمان والوں کے ایمان کا دو طرح امتحان ہوتا ہے، اول یہ کہ جان دینے کا حکم ہو تو گھر کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھنا اور جان پیش کر دینا، دوسرے یہ کہ جب بندوق چل رہی ہو اور اس وقت حکم ہو جائے کہ کندے نیچے کر لو، اور کچھ ہاتھ پیر مت چلاؤ، تو یہ امتحان پہلے سے مشکل ہے، خصوصاً جب قدرت وطاقت بھی ہو، اس وجہ سے تمام صحابہ بے چین تھے اور اس تمنا میں تھے کہ حکم بدل جائے اور قتال کی اجازت مل جائے، اسی بنا پر احرام کھولنے کا حکم ملنے پر بھی احرام نہیں کھول رہے تھے۔

اس سفر میں ازواج مطہرات میں ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا ساتھ تھیں، آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا میں نے اِحلال کا حکم دیا، مگر فرط غم سے نیز اس خیال سے کہ شاید حکم بدل جائے کوئی بھی احرام

(۱) سورۂ فتح پ ۱۰،

. . . .

نہیں کھولتا، انھوں نے بہترین مشورہ عرض کیا، وہ یہ کہ حضور آپ اپنی ہدی کا جانور ذبح فرمادیں اور احرام کھول دیں، تاکہ حالت منتظرہ باقی نہ رہے، اور صحابہ سمجھ لیں کہ اب ترمیم نہ ہوگی، چنانچہ آپنے جانور ذبح کر دیا اور احرام سے باہر ہوگئے تو سب نے احرام کھول دیا، واقعہ ختم ہوا،

اب آیت پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ایک وہ ایمان تھا کہ بیعت کی اور جان دینے پر راضی ہوگئے، دوسرا یہ ایمان تھا کہ حکم خدا وحکم رسُول کے سامنے سر تسلیم خم کردیا، اور باوجود قدرت کے حکم نبی کو ترجیح دیکر انقیاد وتسلیم کا ثبوت دیا، اسی کا بیان ہے ھوالذی انزل الخ یعنی وہ رنگ جو پہلے تھا اور بیعت کی تھی، اس میں ایک رنگ دوسرا یعنی صلح میں انقیاد کا ملالیا، تو معلوم ہوا کہ یہ ایمان کے دو شعبے، دو رنگ دو اثر اور دو مرتبے ہیں، اور مومن کا یہی کام ہے کہ جس وقت جیسا حکم ہو اسی پر سر جھکا دے۔

قولہ:- زدناھم ھدی، یہ سورۂ کہف کی آیت کا جزء ہے، اور آیت اصحاب کہف کے بارے میں ہے فرماتے ہیں انھم فتیۃ اٰمنوا بربھم وزدناھم ھدی، پہلے کے الفاظ ملانے سے مطلب واضح ہوتا ہے، کہ ایمان تو پہلے سے تھا ہی، اس میں اور زیادتی اور انشراح ہوگیا، پھر یہاں تو ایمان کا لفظ بھی نہیں، ھدی کا لفظ ہے، ابوحنیفہ نے ھدی میں زیادت کا کب انکار کیا، ہدیٰ، تقویٰ، بر، خیر وغیرہ میں ہم زیادۃ کے منکر نہیں، مگر بخاری چونکہ اعتقاد، اخلاق، اعمال وغیرہ سب کو ایمان کہتے ہیں اسلئے ان کا استدلال صحیح ہوسکتا ہے، مگر ہمارے نزدیک ایمان التزام کا نام ہے۔ اس میں کچھ فرق نہیں ہوا، ہاں سمجھ پیدا فرمائی، ہدایت فرمائی تاکہ وقائق کا علم انھیں ہوسکے، تو زیادۃ ہدایت میں ہے، نہ ایمان میں۔

قولہ:- ویزید اللہ الذین اھتدوا ھدی، یہ درحقیقت دوسرے مضمون کے مقابل ہے، اس سے پہلے کی آیت یہ ہے قل من کان فی الضلالۃ فلیمدد لہ الرحمٰن مدا، یعنی جو گمراہی کو اختیار کرتا ہے اس نے اپنے سوء صنیع سے اگر گمراہی پسند کی تو پھر ہم اُسی میں اُسے اور گھسیٹتے ہیں، حتی اذا راٰوا مایوعدون فسیعلمون من ھو شر مکانا واضعف جندا، یہاں تک کہ جب وہ عذاب دیکھینگے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا، تو سمجھ لیں گے کہ کون بدتر مقام پر ہے اور کون لشکر میں کمزور ہے، اسکے بعد فرمایا، ویزید اللہ الخ تو یہ مقابل ہے فلیمدد لہ الرحمٰن مدا کا، یعنی جو چاہے ادھر چلے، اور جو چاہے اُدھر چلے، تو فی الجملہ بندے کو آزادی بخشی اور دونوں راستے بتلادیئے، اور سمجھا دیئے، اس کے بعد بھی اگر ضلالت میں پڑا رہنا چاہے تو فلیمدد لہ الرحمٰن، اور لفظ رحمٰن نے بتلادیا کہ ہماری

وَالَّذِیۡنَ اهۡتَدَوۡا زَادَهُمۡ هُدًی وَّاٰتٰهُمۡ تَقۡوٰهُمۡ وَیَزۡدَادَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِیۡمَانًا

اور (سورۃ قتال میں) جو لوگ راہ پر ہیں انکو اللہ نے اور زیادہ ہدایت دی، اور انکو پرہیزگاری عطا فرمائی، اور (سورۃ مدثر میں) جو لوگ ایماندار ہیں ان کا اور

طرف سے کچھ نہیں، مگر جب یہ اسی کو پسند کرتا ہے تو یہی سہی، پھر اسکے بالمقابل فرمایا، ویزید اللہ الخ تو مراد یہ ہوئی کہ ہدایت کا ابقاء اور اس کو مستمر رکھنا ہمارا فعل ہے۔ توفیق عطا ہوتی ہے نور بڑھتا ہے، بصیرت زیادہ ہوتی ہے، اس میں سے کسی چیز کا انکار نہیں، مگر التزام میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا [اور التزام ہی کا نام ایمان ہے]۔

قولہ:۔ وَالَّذِیۡنَ اهۡتَدَوۡا زَادَهُمۡ هُدًی وَّاٰتٰهُمۡ تَقۡوٰهُمۡ[1]، اس سے پہلے یہ آیت ہے وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّسۡتَمِعُ اِلَیۡكَ حَتّٰۤی اِذَا خَرَجُوۡا مِنۡ عِنۡدِكَ قَالُوۡا لِلَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا اُولٰٓئِكَ الَّذِیۡنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ وَاتَّبَعُوۡۤا اَهۡوَآءَهُمۡ[2] یعنی منافقین بظاہر تو آپ کی باتوں کی طرف کان لگاتے ہیں، مگر ان میں تذکر وحفظ اور تدبر وفہم کچھ بھی نہیں، اسی لئے جب باہر جاتے ہیں تو صحابہ سے پوچھتے ہیں کہ نبی نے کیا کہا۔ حَتّٰۤی اِذَا خَرَجُوۡا مِنۡ عِنۡدِكَ قَالُوۡا الخ چونکہ توجہ نہیں، سمجھ نہیں، اسلئے یہ سوال کرتے ہیں، آگے فرماتے ہیں اُولٰٓئِكَ الَّذِیۡنَ الخ یعنی جنھیں اتنی توجہ نہیں ان سے بہتری کی کیا امید ہوسکتی ہے، اسی لئے ہم ان کے قلوب پر مہر کردیتے ہیں، وَاتَّبَعُوۡۤا اَهۡوَآءَهُمۡ اور وہ تو اپنی خواہشوں کے پیچھے لگ گئے ہیں، آگے فرمایا وَالَّذِیۡنَ اهۡتَدَوۡا الخ تو اب مقابلہ پورا ہوگیا، کہ جسنے توجہ نہ کی اس کے دل پر مہر لگادی تاکہ آگے توجہ کر بھی نہ سکے، اور اس نے چونکہ توجہ کی اس لئے ہم نے بھی ہدایت میں زیادتی کردی، تو نفس تصدیق نہیں بڑھتی، بلکہ اسکے آثار بڑھتے ہیں اور ثمرات میں اضافہ ہوتا ہے، چنانچہ یہاں بھی **هدی** کا لفظ ہے۔ آگے فرماتے ہیں وَاٰتٰهُمۡ تَقۡوٰهُمۡ یعنی اور ہم تقوی کی راہیں کھول دیتے ہیں، تقوی کی اضافت انھیں کی طرف کی، کہ وہ لوگ جو تقوی اختیار کرتے ہیں اس میں زیادہ کردیتے ہیں،

قولہ:۔ وَیَزۡدَادَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِیۡمَانًا، اس سے پہلے ہے عَلَیۡهَا تِسۡعَةَ عَشَرَ، جہنم میں جو فرشتے مقرر ہیں ان کی تعداد اللہ نے بتلائی کہ انیس ۱۹ ہے، تو مشرک اس کا مذاق اڑاتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم سب کے لئے کافی ہیں، ایکنے کہا سترہ کو میں تنہا کافی ہوں باقی کو تم بھگت لینا، اس کا جواب دیا وَمَا جَعَلۡنَاۤ اَصۡحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً الخ[3] کہ ہم نے جہنم کا محافظ فرشتوں کو بنایا ہے، جن کی قوت کا یہ حال ہے کہ ان میں سے صرف ایک نے قوم لوط کی بستی کو اٹھا کر پٹخ دیا تھا، جامع ترمذی میں آیا ہے کہ یہی انیس ۱۹ کی عدد پہلی کتب سماویہ میں بھی مذکور ہے، جب قرآن اسکی تصدیق کرے گا،

---

(۱) سورۃ محمد آیت ۱۷، (۲) ایضاً، آیت ۱۶، (۳) سورۃ مدثر آیت ۳۱

تو اہل کتاب کو قرآن کی حقانیت و صداقت کا یقین ہو جائے گا، اور ان ایمان لانے والوں میں ایمان کی زیادتی پیدا ہوگی، وَلَا يَرْتَابَ الخ یعنی اہل کتاب کچھ شک نہیں کریں گے۔ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ سے ضعیف الایمان یا منافق مراد ہیں (دونوں تفسیریں ہیں) اور کافر کہیں گے اللہ نے کیا اس عدد سے مراد لی ہے؟ تو ہم نے اس عدد میں بہت سی حکمتیں اور مصلحتیں رکھی ہیں، انیس ۱۹ کی حکمتیں تو بہت سی بیان کی گئی ہیں، مگر میرے نزدیک ان میں سب سے بہتر شاہ عبدالعزیز صاحب کا بیان ہے، لکھتے ہیں کہ ملائکہ قدرت کے سامنے ایسے ہیں جیسے انسان کے لئے جوارح ہیں، تشبیہ صرف اس میں ہے کہ جس طرح ہم جوارح سے کام لیتے ہیں، اسی طرح یہ ملائکہ نفاذ احکام کے لئے جوارح ہیں، مگر جس طرح ہم آنکھ کا کام کان سے نہیں لے سکتے، تمام عمر مطالعہ کریں تو آنکھ نہیں تھکتی، لیکن آنکھوں سے تقریر سن لیں یہ ناممکن ہے، اور یہ آنکھ عاجز ہے، اور کان سے مطالعہ ناممکن ہے، کیوں؟ اسلئے کہ قدرت نے حد بندی کر رکھی ہے، اور اس دائرہ میں اب وہ محدود ہے، فرماتے ہیں، کہ جبریل کی وہ قدرت ہے کہ ایک لمحہ میں عرش سے وحی لے آتے ہیں اور پہونچا دیتے ہیں اور ذرا تکان نہیں ہوتا، خواہ لاکھ بار ایک گھنٹہ میں لائیں، لیکن اگر ان سے کہا جائے کہ تم بارش برسا دو تو ناممکن ہے، کیونکہ وہ ان کے ذریعہ سے نہیں بلکہ میکائیل کے ذریعہ ہوتی ہے، اسی طرح عزرائیل ایک منٹ میں ایک لاکھ جانیں نکال لیں، لیکن ایک بچہ میں نفخ روح ان سے ناممکن ہے، تو اللہ نے ہر ایک کے لئے حد بندی کر دی ہے، اسی کو فرمایا وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ (۱) اسی طرح جہنمیوں پر جو عذاب ہوگا، وہ مختلف نوع کے ہوں گے، اور ہر نوع پر ایک فرشتہ مقرر ہوگا، اور انواع عذاب انیس ۱۹ ہیں، (۲) اسلئے فرشتے بھی انیس ۱۹ متعین کئے گئے ہیں، اسی کو حق تعالیٰ نے فرمایا عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ، یہ ہم نے تبرعًا بیان کر دیا، ورنہ ضرورت نہ تھی، یہ بھی یاد رکھو کہ جہنم کے محافظ اتنے ہی فرشتے نہیں ہیں، یہاں صرف افسروں کا ذکر ہے جو انیس ۱۹ ہیں، اسی کو فرمایا۔ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ (۳)

خلاصہ یہ ہے کہ يَزْدَادَ الَّذِينَ کی مراد یہ ہے کہ جب نئی آیت اتری تو جو پہلے مجملاً معلوم ہو چکا تھا اس کی تفصیل کا علم ہوا، یا یوں کہو کہ جب اہل کتاب نے تصدیق کی تو ان میں ایک ایمانی کیفیت کا اور اضافہ ہوا، اسی اضافہ کا بیان وَيَزْدَادُ میں ہے۔

---

(۱) سورۂ صافات، آیت ۱۶۴، (۲) تفصیلات تفسیر عزیزی میں ملاحظہ فرمائیے۔ (۳) سورۂ مدثر آیت ۳۱

وَقَوْلِهٖ عَزَّ وَجَلَّ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖ اِيْمَانًا. فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ

اور (سورۂ براءۃ میں) فرمایا اس سورت نے تم میں سے کس کا ایمان بڑھایا جو لوگ ایمان لائے ان کا ایمان بڑھایا، اور (سورۂ آل عمران میں) فرمایا

اِيْمَانًا وَّقَوْلِهٖ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا

(لوگوں نے مسلمانوں سے کہا) تم کافروں سے ڈرتے رہنا تو ان کا ایمان اور بڑھ گیا۔

قولہ:۔ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖ اِيْمَانًا الخ کفار استہزا کرتے تھے کہ اس میں کون سے حقائق ہیں جن سے ایمان میں زیادتی ہوئی، تو اس کا جواب دیا، فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الخ یعنی جنھیں پیغمبر کے مصدق کا یقین ہے، ان کا ایمان ضرور بڑھتا ہے، اور کفار کے لئے یہی چیز ذریعہ گندگی (رجس) ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ ایک تندرست شخص عمدہ غذا کھائے تو غذا سے اسے تقویت حاصل ہوگی، لیکن اگر وہی غذا کوئی نازک مریض کھالے تو مر جائے، تو ایک ہی غذا ایک کے لئے جو صحیح المزاج ہو، مفرح، مقوی و مسکن ہے، اور دوسرا غذا بدمزاج کے لئے مہلک ہے، تو یہ غذا کا قصور نہیں، بلکہ مزاج و اخلاط کا قصور ہے، اسی کو فرماتے ہیں کہ تم نے تستے کیا ہو، ان میں اچھی استعداد ہے اسلئے اضافہ ہوتا ہے، اور تم میں سوء استعداد کی وجہ سے باعثِ زیادۃ رِجس ہے، جیسا کہ سعدی کہتے ہیں ؎

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

درحقیقت یہ زمین کی استعداد کا فرق ہے نہ بارش کا، منافقین نے اپنی فطری استعداد کو خراب کرلیا اور اسکے بعد اگر وہ چاہیں کہ ایمان کی زیادتی ہو، تو کیونکر ممکن ہے، یہ بھی اشارۃً معلوم ہوگیا کہ وہ مرض ان کا خود پیدا کیا ہوا ہے اللہ کی طرف سے نہیں، یہ ایک مستقل مسئلہ ہے، جس کا یہ موقع نہیں،

قولہ:۔ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا [(1)] اس کا مختصر قصہ یہ ہے کہ جب جنگ اُحد ختم ہوئی تو چونکہ مسلمانوں کو بظاہر ہزیمت ہوئی تھی اور اہلِ اسلام بہت زخمی ہوئے تھے، حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ [جو اسوقت تک ایمان نہیں لائے تھے کافروں کی طرف سے] امیر لشکر تھے، وہ جب اپنا قافلہ لے کر خوشی خوشی واپس جانے لگے تو اچانک انھیں خیال آیا کہ ہم سے غلطی ہوگئی مسلمان زخمی ہو چکے ہیں، ہمیں اس وقت ان کو بالکل ہی نیست و نابود کر دینا چاہیئے تھا، لہٰذا واپسی کا ارادہ کیا، مگر غیبی انتظام ایسا ہوا کہ بجائے اس کے کہ وہ خود آگے بڑھیں، عبدالقیس کا ایک تجارتی قافلہ مدینہ جا رہا تھا، انھیں کو کچھ دے دلا کر یہ کہا کہ مدینہ جا کر کہہ دینا کہ ابوسفیان بڑا لشکر لے کر آرہا ہے، اس قافلہ نے آکر خبر دی، اسی کی حکایت اللہ تعالیٰ

---

(۱) آل عمران، آیت ۱۷۳،

وَقَوْلِهٖ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا، وَّالْحُبُّ فِى اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِى اللّٰهِ مِنَ الْاِيْمَانِ

اور (سورۂ احزاب میں) فرمایا ان کا کچھ نہیں بڑھا مگر ایمان اور اطاعت کا شیوہ، (اور حدیث کی رو سے) اللہ کی راہ میں محبت رکھنا اور اللہ کی راہ میں دشمنی رکھنا ایمان میں داخل ہے۔

فرماتا ہے، اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ (تم ڈرو کہ وہ لوگ آرہے ہیں) جب مسلمانوں نے وہ خبر سنی تو ان کی کیا کیفیت ہوئی اس کو اللہ نقل فرما رہا ہے کہ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا۔ یعنی ان کا ایمان بڑھ گیا، چنانچہ حضور علیہ السلام نے حکم دیا کہ تیار ہو جاؤ اور انھیں لوگوں کو حکم دیا جو اُحد میں شریک تھے اور زخم خوردہ تھے، تو سب فوراً تیار ہو گئے، کافروں نے تو ڈرانا چاہا تھا، مگر یہاں ایمان میں زیادتی ہوگئی اور مسلمانوں نے کہا، حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ الخ[1] یہ ایک تفسیر ہے،

دوسری تفسیر یہ ہے کہ ابو سفیان رضی اللہ عنہ نے جو اس وقت مسلمان نہ تھے اور کافروں کا جھنڈا ان کے ہاتھ میں تھا، اُحد کے دن ہی یہ کہہ دیا تھا کہ آئندہ سال پھر جنگ ہوگی، جب سال گذر گیا اور وہ وقت آگیا تو ابو سفیان اپنا لشکر لے کر نکلے، مگر راستہ سے لوٹ گئے اور جنگ کے مقام تک نہیں آئے،

اس کے برخلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو لے کر وہاں تک پہونچ گئے، مگر مقابل فوج آئی نہیں، اس لئے لڑائی نہیں ہوئی، اس واقعہ کو بدر صغریٰ کے نام سے یاد کرتے ہیں، لڑائی تو نہیں ہوئی مگر اس راہ میں مسلمانوں کو تجارت کا موقع مل گیا اور اللہ نے خوب نفع دیا، اس لئے اس کو "جیش السویق"[2] کہتے ہیں، فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ[3] میں انھیں مجاہدین کا ذکر ہے، کہ اللہ کی نعمت لے کر لوٹے، اور کسی قسم کا گزند نہیں پہونچا، پہلے معنی کا لحاظ کیا جائے، تو معنوی نعمت مراد ہوگی، اور زیادت ایمان سے زیادت توکل مراد ہوگی، جس پر ان کا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ کہنا دلالت کرتا ہے، اور ہم زیادۃ توکل کے منکر نہیں،

راجح یہی معنی ہے کیونکہ "حمراء الاسد" تک صحابہ کرام گئے تھے، جو مدینہ سے تقریباً آٹھ میل دور ہے۔

قولہ:۔ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا، پوری آیت یہ ہے، وَلَمَّا رَاَى الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا[4] یعنی جب ایمان والوں نے دیکھا کہ تمام لشکر ہم پر ٹوٹ پڑے تو کہنے لگے ہمیں پہلے ہی خبر دے دی گئی تھی، کہ ایسا ہونیوالا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں ہے، اللہ اور رسول سچے ہیں، وَمَا زَادَهُمْ الخ یعنی اس مشاہدہ سے ان کے یقین کی پختگی اور اطاعت شعاری بڑھی۔

---

(۱) ایضاً ۱۷۳، ۱۷۴ (۲) وہ لشکر جو محض ستو کھانے گیا تھا، (۳) آل عمران، آیت ۱۷۴ (۴) احزاب، آیت ۲۲

وَكَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ اِلٰى عَدِيِّ بْنِ عَدِيٍّ اِنَّ لِلْاِيْمَانِ فَرَائِضَ وَشَرَائِعَ

اور عمر بن عبد العزیز (خلیفہ) نے عدی بن عدی کو لکھا کہ ایمان میں فرض ہیں اور عقیدے اور حرام باتیں:۔

هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ، میں جس وعدہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے باب میں بعضوں نے کہا کہ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ الخ[1] کا وعدہ مراد ہے، اور بعضوں نے کہا کہ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ[2]، میں جو وعدہ ہے۔ وہ مراد ہے، اس میں احزاب کی شکست کی پیشین گوئی کی گئی ہے اور اس کو مکہ ہی میں بتلا دیا گیا تھا، یہاں بھی احزاب کا لفظ ہے اور وہاں بھی احزاب کا لفظ ہے، اب غور سے دیکھو تو ان آیات میں سے کوئی آیت ہمارے خلاف نہیں، ہم اس کا انکار نہیں کرتے کہ ایمان کی کیفیات میں زیادت و نقصان ہوتا ہے، ہم تو یہ کہتے ہیں کہ التزام میں زیادت و نقصان نہیں ہوتا، اور یہ کسی آیت سے ثابت نہیں ہوا کہ نفس تصدیق والتزام میں زیادت و نقصان کا تحقق ہوتا ہے۔

قولہ:۔ اَلْحُبُّ فِي اللّٰهِ، امام بخاری کے نقطۂ نظر سے یہ چیز زیادت و نقص ایمان کے مسئلہ سے بے تعلق نہیں ہے، کیونکہ ان کے ہاں زہد و تقویٰ اور بر وغیرہ سب ایمان میں داخل ہیں، اور ہمارے یہاں چونکہ سب ثمرات وآثار وانوار اور توابع و فروع وغیرہ ہیں، اس لئے نفس ایمان سے خارج ہیں، اور اگر جزء ہیں بھی، تو ایمان کامل کے جزء ہیں، اور یہ اسوقت ہے جب مِنَ الْاِيْمَانِ کا لفظ حدیث نبوی کا لفظ ہو، ورنہ ابوداؤد میں تو مِنَ الْاِيْمَانِ کے بجائے اِسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ ہے اور اگر یہی لفظ حدیث ہے تو بعید نہیں کہ یہ ہماری دلیل بن جائے، کیونکہ تب حُبٌّ فِي اللّٰهِ ایمان کامل کا جزء ثابت ہوگا، پس اگر یہ بخاری کا لفظ ہے، تو جواب کی ضرورت نہیں، اور اگر سلف کا لفظ ہے تو ہم جواب دے چکے کہ مِنْ تبعیضیہ نہیں، كَمَا فَهِمَ الْبُخَارِی، بلکہ اس کی مراد من آثار الایمان ومن فروع الایمان وغیرھما ہے، اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بغض و حب محض اللہ کیلئے ہو، اپنی غرض سے نہ ہو،

قولہ:۔ كَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ الخ عمر بن عبد العزیز کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی خلافت تکملہ ہے خلافت عمرؓ کا، یہ صحابی تو نہیں ہیں، مگر ان میں اسلامی محاسن و کمالات اسقدر ہیں کہ لوگوں نے انکو صحابہ میں شمار کیا ہے۔

ابن مبارک رحمہ اللہ جو خود حدیث و رجال کے امام اور زہد و فقہ میں قدوہ ہیں اور بہت اعلیٰ مرتبہ رکھتے ہیں،

---

(۱) البقرہ، آیت ۲۱۴، (۲) سورۂ ص، آیت ۱۱،

وَحُدُوْدًا وَسُنَنًا فَمَنِ اسْتَكْمَلَهَا اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَكْمِلْهَا

اور مستحب و مسنون باتیں پھر جو کوئی ان کو پورا ادا کرے اس نے اپنا ایمان پورا کرلیا اور جو کوئی ان کو پورا ادا نہ کرے۔

لَمْ يَسْتَكْمِلِ الْإِيْمَانَ فَإِنْ أَعِشْ فَسَأُبَيِّنُهَا لَكُمْ حَتّٰى تَعْمَلُوْا بِهَا وَإِنْ أَمُتْ

اس نے اپنا ایمان پورا نہیں کیا، پھر اگر (آئندہ) میں جیتا رہا تو ان سب باتوں کو ان پر عمل کرنے کیلئے تم سے بیان کردوں گا، اور اگر میں مرگیا تو مجھ کو

فَمَا أَنَا عَلٰى صُحْبَتِكُمْ بِحَرِيْصٍ قَالَ إِبْرَاهِيْمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ

تمہاری صحبت میں رہنے کی کچھ ہوس نہیں ہے، اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے دل کو تسلی ہوجائے

ان سے جب سوال کیا گیا، عمر بن عبدالعزیز افضل ہیں یا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، تو چونکہ امیر معاویہ صحابی ہیں اور یہ تابعی، اسلئے ابن مبارک جواب دیتے ہیں اور یہ جواب انھیں کا حق ہے، کہ معاویہ تو معاویہ، ان کے گھوڑے کی گرد کے برابر بھی ایک عمر بن عبدالعزیز کیا، ہزار عمر بن عبدالعزیز بھی نہیں ہوسکتے، اور اس کی وجہ بھی بیان کردی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے، اور حضور کے وَلَا الضَّالِّيْنَ پڑھنے کے بعد آمین کہنے کا جو شرف حاصل ہوا ہے وہ عمر بن عبدالعزیز کو کہاں نصیب؟ یہی وجہِ افضلیت ہے، تو صحابی کا درجہ کسی قطب، ولی، ابدال کو نہیں مل سکتا، بایں ہمہ عمر بن عبدالعزیز اتنے بلند مرتبہ ہیں کہ بعض لوگوں نے انھیں زمرۂ صحابہ میں شامل کرلیا ہے۔

حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب محشر میں ساری امتیں اپنے مظالم بیان کریں گی تو ہم حجاج کے مظالم کو پیش کریں گے، اور جب ساری امتیں اپنے عدل و انصاف کو پیش کریں گی تو ہم عمر بن عبدالعزیز کے کارنامے پیش کریں گے، تو (بظن غالب) یہ کارنامے غالب رہیں گے۔

اب سنو کہ عمر بن عبدالعزیز عدی بن عدی[1] کو خط لکھتے ہیں، إِنَّ لِلْإِيْمَانِ فَرَائِضَ وَشَرَائِعَ وَحُدُوْدًا وَسُنَنًا، فَمَنِ اسْتَكْمَلَهَا اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَكْمِلْهَا لَمْ يَسْتَكْمِلِ الْإِيْمَانَ، الخ یہاں لِلْإِيْمَانِ لام کے ساتھ ہے، اور بعض نسخ میں إِنَّ الْإِيْمَانَ ہے، دونوں کی تعبیر میں فرق ہے، دوسری صورت صریح ہے، مقصود میں، اور پہلی صورت صریح فی المقصود نہیں،

عمر بن عبدالعزیز لکھتے ہیں کہ ایمان کے لئے کچھ شرائع (اصول اخلاق، عقائد) ہیں اور کچھ فرائض اور کچھ حدود ہیں، یعنی تحدیدات احکام ہیں، اور بعض نے کہا کہ حدود سے مراد منہیات ہیں جنکے ذریعہ اللہ نے روک لگادی ہے،

---

(۱) عدی بن عدی موصل کے گورنر تھے۔

. . . .

کہ اس سے آگے مت بڑھو، داخلہ ممنوع ہے، یا حدود سے زواجر مراد ہوں مثلاً قطع ید اور رجم وغیرہ، مگر بظاہر میں تحدید احکام ہی مراد ہے۔

قولہ:۔ وَسُنَنًا، سنن سے مراد بظاہر مندوبات ہیں اور ممکن ہے کہ مراد اعم ہو،
آگے لکھتے ہیں فَمَنِ اسْتَکْمَلَهَا الخ یعنی جتنا ان امور کو پورا کرے گا اتنا ہی ایمان میں کمال ہوگا۔
اس سے بخاری نے استدلال کردیا، حالانکہ لام سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ جزء ہیں اور اگر دوسرے نسخے کو لیں تو احتمال ہے کہ مبالغۃً کہا گیا ہو، ایمان کا اطلاق اصل و فرع دونوں پر ہے، جیسے پتہ، آم، جڑ سب کو آم ہی کہینگے، لفظ اِستکمل ہمارے لئے مفید ہے چنانچہ حافظ نے لکھا ہے کہ ایمان کامل کے اجزاء ہیں نہ نفس ایمان کے، فَاِنْ اَعِشْ یعنی اگر میں زندہ رہا تو تمام احکام و ابواب مرتب کرجاؤں گا اور تمام تفاصیل و فروع تمہارے پاس موجود ہو جائینگی، وَاِنْ اَمُتْ، اور اگر میں مرگیا تو مجھے اس کی حرص بھی نہیں کہ تمہارے پاس رہوں، جیسا کہ کہا گیا ؎

درزمیریم عُذر ما بہ پذیر　　　اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

قَالَ اِبْرَاهِيمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَلٰكِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ اسکو علیحدہ لائے یا تو اس لئے کہ وہاں خیال نہیں رہا بعد کو یاد آیا، یا اسلئے کہ اس کا تعلق وہاں سے نہ تھا اسلئے علیحدہ بیان کیا، مقصود یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام ایسے تو نہ تھے کہ پہلے سے ایمان نہ تھا اور اس کی نسبت تو کسی ادنیٰ مومن کی طرف بھی نہیں کی جاسکتی چہ جائیکہ ایک صاحب ع۔م نبی ورسول کی طرف کیجائے، اطمینان قلب کے لئے سوال کیا تھا تو جواب ملا اَوَلَمْ تُؤْمِنْ کیا تم ایمان نہیں لائے؟ انھوں نے عرض کیا بلیٰ، ہاں ایمان تو میں یقیناً لایا، مگر صرف دلی اطمینان کی خاطر دیکھنا چاہتا ہوں [عدم ایمان یا انکار و نفی تو درکنار وہ تو اس کو مستبعد بھی نہیں سمجھتے تھے، انھوں نے تو صرف حصول اطمینان قلب کے لئے یہ فرمایا تھا] امام بخاری کے نزدیک یہی زیادہ ہے کہ طمانینت حاصل ہوگئی، اگر یہی مراد ہے تو ہمارے خلاف نہیں۔

ابن ہمام لکھتے ہیں کہ مقصد یہ نہ تھا کہ آپ کیونکر احیاء موتیٰ کرتے ہیں، یا کرسکتے ہیں یا نہیں، بلکہ مقصود یہ تھا کہ مجھے دکھلا دیجئے، رَبِّ اَرِنِیْ کہا، تو رویت کا اشتیاق کمال یقین پر دال ہے نہ فقدان پر، جب آدمی مکہ کی تعریف کرتا ہے تو یقین تو ہوتا ہے مگر شوق ہوتا ہے رویت کا، ایسے ہی ابراہیم علیہ السلام کا سوال تھا، اور بظاہر چونکہ انبیاء علیہم السلام کا مرتبہ اعلیٰ ہے، اس لئے شاید یہ سوال کچھ مناسب اور پسندیدہ نہ آیا ہو اسلئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَوَلَمْ تُؤْمِنْ اسکی تقریر

وَقَالَ مُعَاذٌ اِجْلِسْ بِنَا نُؤْمِنْ سَاعَةً وَّقَالَ اِبْنُ مَسْعُوْدٍ اَلْيَقِيْنُ الْاِيْمَانُ كُلُّهٗ

اور معاذ نے (اسود بن ہلال سے) کہا ہمارے پاس بیٹھ ایک گھڑی ایمان کی باتیں کریں، ابن مسعود نے کہا یقین پورا ایمان ہے، اور ابن عمر نے کہا

وَقَالَ اِبْنُ عُمَرَ لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ حَقِيْقَةَ التَّقْوٰى حَتّٰى يَدَعَ مَا حَاكَ فِي الصَّدْرِ

بندہ تقوی کی اصل حقیقت (یعنی کنہ) کو نہیں پہونچ سکتا اس وقت تک کہ جو بات دل میں چبھے اس کو چھوڑ دے، اور مجاہد نے

وَقَالَ مُجَاهِدٌ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا اَوْصَيْنَاكَ يَا مُحَمَّدُ وَاِيَّاهُ

کہا اس آیت کی تفسیر میں (اس نے تمہارے لئے دین کا وہی رستہ ٹھہرایا جس کا نوح کو حکم دیا تھا) ہم نے تجھ کو اے محمد اور نوح

دِيْنًا وَّاحِدًا وَقَالَ اِبْنُ عَبَّاسٍ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا سَبِيْلًا وَّسُنَّةً وَدُعَاؤُكُمْ

کو ایک ہی دین کا حکم دیا، اور ابن عباس نے کہا (اس آیت کی تفسیر میں) شرعۃ ومنہاجا یعنی راستہ اور طریقہ اور (سورۂ فرقان کی اس

اِيْمَانُكُمْ

آیت کی تفسیر میں کہا) دعاؤکم یعنی ایمانکم

انشاء اللہ حدیث اَنَا اَحَقُّ الخ جہاں بخاری میں آئے گی وہاں ہوگی، تو درحقیقت حصول طمانیت مقصود تھا، اور وہ زیادۃ فی نفس الایمان نہیں ہے،

قولہ:۔ اِجْلِسْ بِنَا نُؤْمِنْ سَاعَةً ۔ بخاری نے مراد لیا کہ ذکر سے یا تسبیح وتہلیل سے یا تذکیر وموعظت سے ایمان کو بڑھائیں اور ہم اسے تجدید ایمان سے تعبیر کرتے ہیں، تجدید کے معنی یہ ہیں کہ انسان پر جب غفلت طاری ہو، تو جو چیزیں باعث تازگی ایمان ہوتی ہیں، اور غفلت کو دور کرتی ہیں، انکو اختیار کرنا۔

قولہ:۔ اَلْيَقِيْنُ الْاِيْمَانُ كُلُّهٗ، لفظ کل سے امام بخاری نے استدلال کیا کہ جب ایمان کا "کل" ہوگا تو اسکے اجزاء بھی ہوں گے، کیونکہ "کل" مجموعہ اجزاء کو کہا جاتا ہے، اور اس سے صاف یہ جملہ ہے اَلصَّبْرُ نِصْفُ الْاِيْمَانِ ہم کہتے ہیں کہ پہلے فقرہ میں یقین سے یقین کا وہ مرتبہ مراد ہے جو اولیاء اللہ کے ہاں ہوتا ہے، یعنی کمال یقین۔

قولہ:۔ لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ حَقِيْقَةَ التَّقْوٰى الخ یعنی ٹھیک اور پوری طرح تقوی کا تحقق اسوقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ شک کی چیزیں بھی نہ چھوڑ دے، ہم بھی یہی کہتے ہیں کیونکہ تقوی کے بہت سے مراتب ہیں ایک یہ کہ شرک وکفر چھوڑے، ایک یہ کہ کبائر چھوڑے، ایک یہ کہ توکل علی الغیر کو چھوڑے، ایک یہ کہ صغائر کو بھی ترک کردے، ایک یہ کہ بہت سے مباحات بھی ترک کردے، یہ سب مراتب تقوی ہیں۔

۷ - حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ مُوْسٰى قَالَ اَخْبَرَنَا حَنْظَلَةُ بْنُ اَبِيْ سُفْيَانَ
ہم سے بیان کیا عبید اللہ بن موسیٰ نے کہا ہم کو خبر دی حنظلہ بن ابی سفیان نے
عَنْ عِكْرِمَةَ بْنِ خَالِدٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
انھوں نے سنا عکرمہ بن خالد سے انھوں نے ابن عمرؓ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

قوله :- شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا الخ اس کی تفسیر میں مجاہد کہتے ہیں کہ اے محمدؐ ہم نے آپ کو اور نوح علیہ السلام کو ایک ہی دین کی نصیحت کی، اور یہ بھی مسلّم ہے کہ ہر ہر شریعت کے فروع و احکام میں کمی بیشی ضرور ہوئی ہے۔ لہٰذا ایمان میں بھی کمی وزیادتی ہوگی۔

شِرْعَةً :- بڑا راستہ، مِنْهَاجٌ :- چھوٹا راستہ، سَبِيْلًا وَّسُنَّةً میں لف ونشر غیر مرتب شرعۃ کی تفسیر سنۃ سے اور منہاج کی سبیل سے کی ہے(۱)

قوله :- دُعَاؤُكُمْ، اِيْمَانُكُمْ، قرآن میں ہے، قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ(۲) میرا رب تمہاری ذرا بھی پرواہ نہیں رکھتا اگر تم اسے نہ پکارو، کما ورد فی الحدیث لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى لَا يُقَالَ فِي الْاَرْضِ اَللّٰهُ اَللّٰهُ (۳) تو درحقیقت بقاء اس وجہ سے ہے کہ دعا اور ذکر اللہ جاری ہے اس آیت میں دعاؤکم کی تفسیر ابن عباس نے ایمانکم سے کی ہے، یعنی دعا کا اطلاق ایمان پر کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ دعاء عمل ہے، پس یہ اطلاق بھی صحیح ہوگا کہ ایمان عمل ہے جیسا کہ فتح الباری میں ہے، ہمارا کہنا ہے کہ اس اطلاق کے جواز کا کوئی منکر نہیں ہے وہ جائز بلکہ واقع ہے، انکار تو نفس ایمان میں کمی بیشی ہونے کا ہے، وھو لم یثبت بعد،

حدیث ۷ ، حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ مُوْسٰى الخ یہ حدیث ابن عمرؓ کی ہے، اس میں اسلام کو خیمہ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح خیمہ میں اوتاد واطناب ودعائم ہوتے ہیں اور اس کا دارومدار انھیں پانچ کھونٹیوں پر ہوتا ہے، ایسا ہی اسلام کہ اسکے بھی پانچ دعائم اور ستون ہیں، اور اس میں بیچ کا جسے قطب کہتے ہیں شہادۃ ہے، اور بقیہ ملحقات وتوابع ہیں، پانچ میں حصر کیوں کیا حالانکہ اور بھی ہوسکتے تھے، مثلاً جہاد وغیرہ، اس کی وجہ یہ ہے کہ بہتر اور اصل اصول یہی ہیں، عقائد کا حصہ شہادۃ میں آگیا، اور یہ سب کے لئے عنوان ہے(۵)، اور چار اعظم فرائض سے ہیں، اور باقی لواحق

---

(۱) یہاں پر فضل الباری میں جو بیان کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ دیکھو فتح الباری ص ۳/۱ (۲) سورۃ الفرقان آیت ۷۷ (۳) رواہ مسلم
(۵) یعنی شہادت ہی تمام احکام شرعیہ کا عنوان ہے جس نے اس کا اقرار کرلیا گویا تمام کا اقرار کرلیا۔

بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ شَهَادَةُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ

اسلام کی عمارت پانچ چیزوں پر اٹھائی گئی ہے، گواہی دینا اس بات کی کہ اللہ کے سوا کوئی سچا خدا نہیں اور محمد اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں

وَاِقَامُ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءُ الزَّكٰوةِ وَالْحَجُّ وَصَوْمُ رَمَضَانَ

اور نماز کو درستی سے ادا کرنا، اور زکوٰۃ دینا، اور حج کرنا، اور رمضان کے روزے رکھنا۔

وآثار میں سے ہیں۔ استقراء سے یہ معلوم ہوا کہ شہادۃ کے لئے جب یہ کلمہ لاتے ہیں تو توحید و رسالت کو جمع کر دیتے ہیں اور جہاں شہادۃ کے لئے نہ ہو وہاں بسا اوقات اکتفا کلمہ توحید پر کرتے ہیں اور رسالت کا ذکر نہیں کرتے، اس میں کیا بھید ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا مگر اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اقرار بالشہادتین درحقیقت تصدیق قلبی کا اظہار ہے۔ تو اصل موضوع لہٗ شہادۃ کا یہ ہے کہ دل میں جو ہے اس کی وہ خبر دے رہا ہے، اقرار و تسلیم کر رہا ہے، اور اسے حجت کے طور پر پیش کرتا ہے کہ میں مومن ہوں، تو قلب میں جو عقیدت مکنون ہے شہادت سے اس کا اظہار ہے۔

اور صرف لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ میں کبھی تو مقصود کا اظہار ہوتا ہے، اور کبھی محض ذکر مقصود ہوتا ہے، کیونکہ یہ خود مستقل ایک ذکر ہے، بلکہ افضل الاذکار ہے، اور ذکر و ورد محض لا الٰہ الا اللہ بنتا ہے، محمد رسول اللہ کا ذکر معروف فی الشریعۃ نہیں، یہی وجہ ہے کہ صوفیا کے اذکار میں محمد رسول اللہ داخل نہیں، درود تو اذکار میں سے ہے مگر یہ نہیں ہے تو کلمۂ شہادت بطور ذکر مستعمل نہیں ہے اور کلمۂ لا الٰہ الا اللہ بطور ذکر مستعمل ہے (یہ شاہ صاحب کا مضمون ہے اور کہیں نہیں نظر سے گذرا)

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ نے ضیاء القلوب میں لکھا ہے کہ جب ذکر کرے تو کرتا رہے، اور تنبیہہ نفس کے لئے کبھی کبھی درمیان میں محمد رسول اللہ بھی کہہ لیا کرے، تاکہ ادھر سے غفلت نہ ہو، تو سب سے بڑا ستون شہادت ہے اور یہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ اسلام کا شعار ہو گیا ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہتا ہے کہ قل ھو اللہ، پڑھ لو، تو یہ مطلب نہیں کہ صرف قل ھو اللہ، قل ھو اللہ رٹتے رہو، بلکہ تمام سورت کا پڑھنا مراد ہوتا ہے، اسی طرح کلمہ لا الٰہ الا اللہ عنوان ہے جمیع امور شرعیہ کا۔

قولہ:- وَاِقَامُ الصَّلٰوةِ، قرآن میں بہت سے مقامات میں اس کا ذکر ہے، اور اقامۃ سے مراد صرف نماز پڑھ لینا نہیں ہے بلکہ جمیع شرائط اور حقوق کے ادائگی کے ساتھ پڑھنا مراد ہے۔

قولہ:- وَاِيْتَاءُ الزَّكٰوةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمُ رَمَضَانَ، مسلم میں بھی ابن عمرؓ ہی کی روایت سے یہ حدیث ہے مگر وہاں وصوم رمضان والحج ہے یعنی وصوم رمضان وہاں مقدم ہے۔ بظاہر مطلب ایک ہے، مگر اس تقدم

. . . .

وتاخر میں ایک واقعہ پیش آیا ہے وہ یہ کہ ابن عمر نے جب یہ حدیث بیان کی تو ان کے ایک شاگرد نے اسے دہرایا، اور ابن عمر نے جس ترتیب سے بیان کیا تھا اس کو بدل کر حج کو مقدم کر دیا، جیساکہ بخاری میں ہے، تو ابن عمر نے اس کا رد فرماتے ہوئے کہا لا، "وصیام رمضان والحج"، هٰکذا سمعت من رسول الله صلی الله علیه وسلم (۱) تو اس سے صراحت ہوگئی کہ کلام نبوی کی اصل ترتیب یہ ہے کہ صوم مقدم اور حج مؤخر ہے۔

ابن الصلاح نے (جو نووی کے شیوخ میں ہیں) یہ واقعہ نقل کر کے لکھا ہے کہ جو لوگ "واو" کو ترتیب کیلئے مانتے ہیں، ان کے لئے یہ ایک دلیل ہے، کما قاله الشوافع، ورنہ ابن عمر کیوں رد کرتے خصوصًا جبکہ معنی میں بھی فرق نہیں ہوتا، معلوم ہوا کہ "واو" ترتیب کے لئے ہے، اور ابن عمر کا مقصود یہ ہے کہ جو روایت حضور سے ہے اس میں تصرف کیوں کیا جائے، دراصل اس پر تنبیہ کرنا تھا کہ الفاظ حدیث کی جہاں تک ممکن ہو حفاظت کی جائے۔ اسلئے ابن الصلاح کا قول درست نہیں اور نہ [وجہ رد کی مذکورہ بالا تصریح کے بعد] اس سے استدلال صحیح ہے۔

ابن حجر نے کسی کا قول نقل کیا ہے کہ جب بخاری میں یہ ترتیب ہے اور مسلم میں اس ترتیب کا رد کیا ہے تو ممکن ہے ابن عمر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں طرح سنا ہو، اور جس وقت اس آدمی پر رد کیا ہو، اس وقت دوسرے طریقہ پر یعنی حج کی تقدیم کے ساتھ سُننا بھول گئے ہوں، حافظ کہتے ہیں کہ یہ قول ٹھیک نہیں، بہتر یہ ہے کہ نیچے کے راوی کے متعلق کہا جائے کہ اسے نسیان ہوگیا، یہ اس سے سہل ہے کہ ابن عمر کی طرف نسیان کو منسوب کریں،

حافظ سے پھر دوسرا کلام یہ کیا ہے کہ چاہے "واو" ترتیب کے لئے نہ ہو، مگر ایک چیز ضروری ہے کہ تقدیم وتاخیر فی الذکر کی حفاظت جو کی ہے، تو اس میں کوئی نہ کوئی نکتہ ضرور ہے، پھر انھوں نے اس نکتہ کو بیان کیا ہے کہ حکم صیام ۲ھ میں نازل ہوا ہے، اور حکم حج (علی اختلاف القولین) ۶ھ یا ۹ھ میں نازل ہوا ہے تو صوم چونکہ نزول میں مقدم ہے، لہذا ذکر میں بھی مقدم رکھنا مناسب ہوا، اور یہ ایسا ہی ہے جیساکہ حضور نے صفا ومروہ کی سعی فرمائی تو فرمایا اِبْدَءُوا بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ بِهٖ اور پھر یہ آیت پڑھی اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ، تو تقدم نزولی کا لحاظ رکھکر صوم رمضان کو بھی مقدم رکھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام جو کلام فرماتے ہیں وہ یوں ہی کیف ما اتفق نہیں ہوتا بلکہ اس میں (یعنی اسکی ترتیب میں) بھی کوئی نہ کوئی نکتہ ہوتا ہے، یہ نکتہ یہاں حافظ نے بیان کردیا۔

(۱) فتح الباری ص ۵۶ ج ۱

ارکانِ اربعہ کی حقیقت

شاید ترمذی میں گذر چکا ہے کہ عبادات دو طرح کی ہیں، ایک وہ جو مظہرِ حکم باری ہیں، جن میں بلالِ باری تعالیٰ کا اظہار ہوتا ہے، دوسری وہ جو مظہرِ محبوبیت ہیں پہلی قسم کی دو عبادتیں ہیں، ایک نماز، دوسری زکوٰۃ، اور دوسری قسم کی بھی دو ہی ہیں، یعنی صوم اور حج۔ زکوٰۃ و صلوٰۃ معبود کی حاکمانہ شان کو بتاتی ہیں، تمام اوضاع و اطوار [ارکان و احکام] دیکھ لو، جیسے ایک ذلیل غلام اپنے آقا کے سامنے اور محکوم حاکم کے روبرو عرض و معروض کرتے ہوئے کبھی تو اپنے آقا کے سامنے جھکتا ہے، اور کبھی ہاتھ باندھتا ہے، سر ٹیکتا ہے، اور عرض و معروض اور درخواست پیش کرنے میں پورے سکون و وقار کا اظہار کرتا ہے، بعینہٖ یہی سب کچھ اللہ کا بندہ بھی اپنے اللہ کے سامنے کرتا ہے، اسی طرح جب سورۂ فاتحہ کے بعد قرآن کی کوئی سورہ پڑھتا ہے، تو وہ معروضہ (فاتحہ) کا جواب ہے، پھر جیسے بادشاہ کے دربار میں ہدیہ (نذرانہ) گذارا جاتا ہے ایسے ہی جھکر (قعدہ میں) ادب کا نذرانہ التحیات پڑھ کر گذارتا ہے، یہی نماز ہے، اور زکوٰۃ تابعِ صلوٰۃ ہے، جب صلوٰۃ کے ذریعہ اپنے غلام ہونے کا اقرار واظہار کر دیا، کہ میں غلام ہوں، تو اب جو کچھ اس کے پاس ہے، وہ سب آقا ہی کا ہے، جس طرح رعیت پر ٹیکس لگایا جاتا ہے، اور پھر وہ رعیت ہی پر صرف کیا جاتا ہے، اسی طرح یہاں بھی جب بندے نے اپنی محکومیت کا اظہار کیا، تو کہا، اچھا تم سے سب تو نہیں لیتے، البتہ کہیں چالیسواں، کہیں دسواں، کہیں پانچواں حصہ مقرر کرتے ہیں، یہ محکوم خوشی خوشی ادا کرتا ہے اور اس کو اپنی سعادت سمجھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اکثر نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر ہے، مثلاً یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ، نیز فرمایا وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ (۱)، اس بیان سے جمع [یعنی دونوں کو ساتھ ساتھ ذکر کرنے] کا سر سمجھ میں آگیا ہوگا،

ابتدائے خلافت صدیقی میں جب کچھ لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو حضرت صدیق اکبرؓ نے انکے خلاف جہاد کا فیصلہ صادر فرمایا، بعض اکابر صحابہ کو اس میں تردد تھا، اس سلسلہ میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے جب گفتگو کی، تو آپ نے فاروق اعظم کو ایک جواب یہ دیا تھا، دانہما لقرینتان فی القرآن چونکہ نماز سے معبود کی حاکمیت اور عابد کی عبدیت کا اظہار ہوتا ہے، لہذا حکم ہوتا ہے کہ اب اس کی تصدیق کیلئے کچھ پیش کرو، تو یہ دونوں حاکمانہ شان کی مظہر ہیں، اور یہ تعلق جو حاکم و محکوم میں ہوتا ہے، جبری ہے، خواہی نخواہی یہ تعلق پیدا کرنا ہے

(۱) سورۂ بقرہ، آیت ۳

دوسرا تعلق وہ ہے جو محبوب اور محب کے درمیان ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندہ کو وہ تعلق بھی ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ جمیع مخلوق سے زیادہ محبت کا مستحق ہے، فرمایا، وَالَّذِینَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ [1] عشق نہیں کہا کسی حکمت سے، بلکہ أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ کہا، جو درحقیقت عشق ہی کا مرتبہ ہے، اور جب وہ محبوب اور ہم محب ہوتے تو پھر محب کے سے اعمال بھی ہونے چاہئیں، عاشق کا سب سے پہلا کام اور پہلی منزل یہ ہے کہ محبوب و محب میں جو چیزیں حائل ہوں، محب کو چاہیئے کہ سب سے قطع تعلق کر دے، دنیاوی محبتوں میں دیکھا جاتا ہے کہ کھانا، پینا تک چھوٹ جاتا ہے، تو پہلی چیز یہ ہے کہ ہر ماسوا سے جو حارج و مانع ہوں، تعلق منقطع کرلے، چاہے وہ اولاد اور والدین ہی کیوں نہ ہوں، ہاں جو حارج و مانع نہ ہوں ان سے تعلق منقطع کرنا نہیں ہے، یہ مرتبہ تخلیہ کا ہے، دوسرا مرتبہ تحلیہ کا ہے، اس میں نہ اسے کھانے پینے کی خبر، نہ تن بدن کا ہوش، نہ کسی سے تعلق نہ لگاؤ، جنگل میں مارا مارا پھرتا ہے، محبوب کے شہر کا چکر لگاتا ہے، گلیوں اور کوچوں کی خاک چھانتا ہے، اس کا آخری درجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی جان سے بیزار ہو کر جان تک دینے کو تیار ہو جاتا ہے،

شیخ اکبر اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ دونوں عبادتیں (صوم و حج) صفات محبوبیت کی مظہر ہیں۔

پہلی عبادت صیام ہے، کہ اس میں ماسوا اللہ کو ترک کرنا ہے، تین ہی چیزیں ایسی ہیں جنکے ترک کے بعد انسان کو کو پھر کسی چیز کی حاجت نہیں رہ جاتی، اور وہ تینوں چیزیں، کھانا، پینا اور جماع ہیں، امام غزالی کہتے ہیں کہ ریاضت دو شہوتوں کے کسر اور انقطاع کا نام ہے، اور وہ شہوۃ بطن، اور شہوۃ فرج ہے، اور ان شہوتوں کے ترک کا نام روزہ ہے، بشرطیکہ نیت ہو حکم الٰہی کی بجا آوری اور اسی کی طرف انتساب کی۔

جب انسان نے ان شہوتوں کو چھوڑ دیا، تو گویا تمام دنیا کو چھوڑ دیا، اور اب اسے دنیا سے وحشت ہونے لگی، اور اس نے ان تین چیزوں کو چھوڑ کر ثابت کر دیا کہ وہ سب سے بیزار ہے سوائے محبوب کے۔

اب اس کے آگے کا درجہ یہ ہے کہ اگر طاقت و امکان ہو تو محبوب کے گھر کا راستہ لے، اور یہی حج ہے، حج کے تمام حالات جنون ہی کے سے ہیں، مثلاً مُردے کے کفن کی طرح دو کپڑے دے دیے، اور کہا کہ تمام لباس فاخرہ اتار دو، ناخن بڑھ رہے ہیں، کاٹنے کی اجازت نہیں، بدن پر میل کچیل ہے، دور کرنے کی اجازت نہیں، بال بڑھے ہوئے ہیں کٹا نہیں سکتا، بدن میں پسینہ کی بو ہے، خوشبو نہیں لگا سکتا، غرض تمام آثار دیوانگی جمع ہیں، اور یہی محبوب ہے،

(۱) بقرہ، آیت ۱۶۵

. . . .

بلکہ جو جس قدر زیادہ پریشان حال ہو اتنا ہی زیادہ محبوب ہے، فرماتے ہیں کہ حج میں جو جسقدر میل کچیل میں ملوث ہو، اور نفل جس پر جتنا زیادہ ہو، اور جس کی حالت جتنی زیادہ سرگشتگی اور پریشانی کی ہو، وہی ہمیں زیادہ محبوب ہے، نماز میں تو ہر طرح کا تزکیہ ہے، حکم ہے کہ کھجاؤ مت، حرکت مت کرو، کَاَنَّہٗ عُوْدٌ رہو، بالکل ادھر ادھر مت دیکھو، مگر یہاں محبت کا راستہ ہے، تمام حرکت ہی حرکت ہے، طواف میں حرکت ہے، اور عرفات میں تو حرکت ہی حرکت ہے، یہ سب دیوانگی ہی تو ہے، مگر دیوانے کس کے ہیں؟ اللہ کے۔

تو یہ دو عبادتیں (صوم وحج) معبود کی شانِ محبوبیت کو ظاہر کرتی ہیں، اور وہ دونوں (صلوٰۃ وزکوٰۃ) حکومت کی شان کو، ہمارے اس بیان کے بعد یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ صوم کو طبعاً حج پر مقدم ہونا چاہیئے، کیونکہ پہلے تخلیہ ہونا چاہیئے، پھر تحلیہ، پہلے اگر تخلیہ نہیں ہوگا تو تحلیہ کیسے ہوگا، جب تک چیز صاف نہیں ہوگی تو چمک کہاں سے آئے گی، عجیب معاملہ ہے، کہ ادھر رمضان ختم ہوا، ادھر یکم شوال سے ایام حج شروع ہوگئے، یہ کیوں؟ اس لئے کہ عاشق صرف مکہ ہی میں تو نہیں، کوئی ہند میں، کوئی سندھ میں، کوئی فرانس میں، کوئی چین، اسی طرح ساری دنیا میں، تو اشہر حج کی تعیین میں اس بات کو ملحوظ رکھا کہ سب جمع ہوسکیں، اس طرح روزہ بدایت ہے حج کی، جب روزہ رکھ کر ماسوی اللہ سے قطع تعلق کو ثابت کر دیا، تو فرمایا کہ اب بیت اللہ کی راہ لے، حافظ نے جو سرّ بیان کیا وہ یہی تھا، اور جو تشریح اور اسرار ہم نے بیان کئے، وہ سرّ السّر ہے، اس سے معلوم ہوگیا کہ نزول صیام پہلے کیوں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ طبعی ترتیب یہی ہے کہ روزہ مقدم ہو، اسی طرح نماز وزکوٰۃ میں بھی طبعی ترتیب یہی ہے، کیونکہ جب نماز سے محکومیت ثابت کر دی تب حکم ہوا کہ زکوٰۃ دو،

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ قربانی کی کیا مصلحت ہے، اصل میں مناسب تو یہ تھا کہ ہر مسلمان شخص اپنی جان خود قربان کر دے، مگر چونکہ یہ منشأ تخلیق کے خلاف تھا، اسلئے فرمایا کہ اس کے عوض میں فدیہ دو، چنانچہ ادھر قربانی کی گئی اور اُدھر حکم حق ہوگیا، کہ حکم ادا ہوگیا اور سب کچھ ہوچکا، اور اسکے بعد ناصحِ نادان جو شیطٰن ہے، اس پر جمرات میں رمی کا حکم دے کر ثابت کرنا ہے کہ یہ ناصحِ نادان ہے، اور اس سے اس موقع کی تذکیر مقصود ہے، جب ابلیس نے حضرات ابراہیم و اسماعیل علیہما السّلام کے دل میں وسوسہ ڈالا تھا، گویا کنکری مار کر ہم بتاتے ہیں کہ ہم تیرے دشمن پر پتھر پھینک کر تیری طرف آتے ہیں، اس سے کمالِ انقیاد معلوم ہوتا ہے، جس طرح ہم رکوع کرتے ہیں، تو یہ علامت ہے انقیاد کی۔

اسی بیان سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ عبادت کے لئے انھیں چاروں کو مخصوص کیوں کیا اور چار میں منحصر کیوں کیا، بات یہ ہے کہ عبادت نام ہے غایت تذلل کا، اور اس کی صرف دو بنیادیں ہیں۔ یا حکومت یا محبت، جس کی بنیاد حکومت پر ہو اس کی دو شاخیں ہوں گی، ایک بدنی، دوسری مالی، بدنی نماز ہے، اور مالی زکوٰۃ، اسی طرح محبت کی دو منزلیں ہیں ایک ماسوا سے بیزاری، دوسری صرف محبوب کا ہو رہنا، اول صوم ہے، دوم حج ہے، تو حقیقت میں یہی چار چیزیں بنیادی ہیں، اور باقی دوسری چیزیں جو بھی ہیں ان میں سے کچھ تو مبادی اور کچھ مکملات ہیں، مثلاً نکاح یا طلاق، جس کا ذکر آگے آئے گا، اس کے تمام احکام اس لئے ہیں کہ مرد و عورت سکون کے ساتھ زندگی گذاریں فرمایا وَمِنْ آيَاتِهِ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً، (۱) اور یہ سکون عبادت کیلئے مطلوب ہے، اسی طرح جتنے سلسلے کھانے پینے پہننے کے ہیں یا اور کسی اور چیز کے، سب کی غرض یہ ہے کہ آدمی کو سکون نصیب ہو، اور سکون اس لئے ضروری ہے، کہ عبادت کا حق ادا ہو، تو ان چاروں میں تمام اشیاء آگئیں، اب ضرورت نہیں کہ کہا جائے کہ یہ اصل ہیں باقی فروع، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ سب انھیں میں داخل ہیں،

---

(۱) سورۂ روم، آیت ۲۱

۳

بَابُ اُمُوْرِ الْاِیْمَانِ

ایمان کے کاموں کا بیان

وَقَوْلِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ
اور اللہ تعالیٰ کے اسی قول میں نیکی یہی نہیں ہے کہ (نماز میں) اپنا منہ پورب یا پچھم کی طرف

وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ اِلٰی قَوْلِہٖ الْمُتَّقُوْنَ،
کرلو، بلکہ اصل نیکی ان کی ہے جو اللہ پر ایمان لائے۔ اخیر آیت متقون تک۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاٰیَۃَ
اور قد افلح المومنون اخیر تک

بَابُ اُمُوْرِ الْاِیْمَانِ

بخاری کی ترتیب بھی عجیب ہے، پہلے بُنِیَ الْاِسْلَامُ کا ترجمہ لائے، پھر امور الایمان کا باب باندھا، کیا اصل یہ نہ تھے؟ ہتھے تو مگر اس کی کچھ تفصیل بیان کریں گے، ان ابواب کے علاوہ کچھ اور بھی بیان کریں گے، جیسے خیمہ کے لئے ایک تو دعائم ہیں، دوسرے اس کے لواحق، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقصود بخاری کچھ تفصیل کرنا ہے، اور تمام قرآن سے صرف دو آیتیں لائے ہیں، اسلئے کہ اتنا ربط سے یہ بیان شاید تمام قرآن میں سوائے ان دو آیتوں کے اور کہیں نہ ملے گا، چنانچہ پڑھلو، لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ج وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا ج وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ط اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ (۱) تمام ایمانیات وعقاید بیان کردئے، کہہ سکتے ہو کہ

---

(۱) بقرہ، آیت ۱۷۷

پوری آیت میں تین چیزوں کا بیان ہے، حسن[1] اعتقاد، حسن[2] معاشرت، اور تہذیب[3] نفس، یہی اصول ہیں۔ وَالنَّبِيِّينَ تک حسن اعتقاد، اور فِي الرِّقَابِ تک حسن معاشرت، حِينَ الْبَأْسِ تک تہذیب اخلاق ۔ پھر فرمایا اُولٰٓئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا[1]۔ غالباً اس کا تعلق ایمان کے ساتھ ہے، اور مُفْلِحُونَ کا تعلق غالباً بعد کی عبارت سے ہے۔

تھوڑی سی تفسیر لَيْسَ الْبِرَّ کی کرتا ہوں، ترجمۂ ظاہری تو یہی ہے کہ نیکی نہیں ہے کہ آدمی اپنا چہرہ مشرق ومغرب کی طرف پھیرے، حالانکہ نیکی تو ہے کیونکہ اگر قبلہ کی طرف منہ نہ کریں تو نماز نہ ہوگی، جواب یہ ہے کہ یہود نے اعتراض کیا تھا کہ یہ نبی بھی عجیب ہیں کہ ہر بات میں ہماری مخالفت کرتے ہیں، حتیٰ کہ ہمارا قبلہ جس طرف اب تک نماز پڑھتے تھے اس کو بھی ترک کر دیا، اسی کو فرمایا سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ الخ[2]۔ پھر اس کا جواب دیا، کہ یہ سوال ہی باطل ہے، کیونکہ ایک جہت سے دوسری جہت کی طرف پھیرنے والا وہی ہے جس کا مشرق ومغرب ہے، فرمایا قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ[3] اسکے بعد کچھ دور چل کر یہ آیت ہے، اس میں بتلاتے ہیں کہ بڑی حقیقت یہ نہیں ہے کہ مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرے، ہمارے لئے توجہ الی القبلہ کا حکم ضروری ہے، مگر یہ بڑی حقیقت نہیں ہے صورت ہے حقیقت بر کی یہ ہے کہ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ الخ یعنی مومن وہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام پر یقین رکھتا ہو اور اللہ کے تمام احکام کو مانتا ہو، اور جب اسے یقین ہوگا اور وہ مانتا ہوگا تو کیا اس سے ممکن ہے کہ وہ یہ سوال کرے مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا الخ[4]۔ اگر کوئی آقا غلام سے کسی کام کو کہے تو کیا وہ کہہ سکتا ہے کہ تم نے ان کو کیوں نہیں کیا؟ ہرگز نہیں، ایک معمولی بات ہے کہ حکومت کی جانب سے یہ حکم ہے بائیں جانب چلو، تو کیا کوئی سوال کر سکتا ہے کہ داہنے ہاتھ کی طرف چلنے کا حکم کیوں نہیں ہے، ہرگز نہیں، تو پھر اللہ کے حکم کے بارے میں کیوں سوال ہو رہا ہے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان میں اخلاص نہیں ہے، جذبۂ ایمان نہیں ہے، تو بر کی حقیقت یہ ہے کہ پہلے ایمان لاؤ، پھر اللہ کا حکم سمجھ کر توجہ الی القبلہ کرو، اگر کوئی ہزار سال متوجہ الی القبلہ رہے، مگر وہ مومن نہ ہو تو اس کا کچھ اعتبار نہیں، فرمایا اُولٰٓئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ

---

(۱) بقرہ، آیت ۱۷۷، (۲-۳-۴) بقرہ، آیت ۱۴۲،

اِلَّا النَّارُ، وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ،(۱)

وایضاً قال:۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْــــًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ(۲)،

وایضاً قال:۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (۳)

توخلاصہ یہ ہے کہ ایک صورت ہے بر کی، اور ایک حقیقت ہے، منافقین کی نماز صورت تھی بر کی، اور حقیقت بر کی یہ ہے کہ پہلے ایمان لاؤ پھر نماز پڑھو، توانھیں تبلایا کہ اہتمام کے ساتھ پہلے ایمان لانا ہے، ایمان ہو تو یہ سمجھنا آسان ہے کہ ہمارے مالک نے پہلے یہ حکم دیا تو ہم اس کو بجالائے، اور جب دوسرا حکم دیا، تو ہم اسکے لئے بھی تیار ہیں، اسکے بعد توابع ومکملات ایمان بیان کرتے ہیں، کہ محض اعتقاد کافی نہیں، بلکہ کچھ خرچ کرو، اور خرچ بھی کرو تو مالِ محبوب، لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ(۴)

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ میں مرجع ضمیر اگر اللہ کو بنایا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی محبت میں خرچ کرے، اَلرِّقَابِ میں سب داخل ہیں، خواہ غلام کو آزاد کردے، خواہ مکاتب بنادے، خواہ مدبر بنادے، وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ، یعنی جو عہد کیا ہے اسے پورا کرتے ہیں، اگر جمے نہ رہے تو پھر کمال نہیں، کمال تو جب ہے کہ بَاْسَاۗءِ، آفات مالی، اور ضَرَّاۗءِ، آفات بدنی میں جمے رہیں، خصوصًا جہاد میں۔

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا، یہی ہیں سچے جنھوں نے اپنی سچائی ثابت کردی، اور یہی متقی ہیں۔

دوسری آیت قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ(۵) الخ ہے، یعنی مفلحین وہ لوگ ہیں جن میں یہ کمالات اور یہ صفات پائی جاتی ہوں، اب معترضین اپنے کو تول کر دیکھیں کہ ان آیات میں مومن کی جو صفات بیان کی گئی ہیں، ان میں یہ صفات و کمالات پائے جاتے ہیں؟ اگر نہیں پائے جاتے تو وہ کس منہ سے مومنین مخلصین پر معترض ہوتے ہیں،

(۱) سورۂ ہود، آیت ۱۶، (۲) سورۂ نور آیت ۳۹، (۳) سورۂ نحل، آیت ۹۷ (۴) آل عمران، آیت ۹۲ (۵) مومنون، آیت ۱تا۱۱

۸ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْجُعْفِيُّ قَالَ ثَنَا اَبُوْ عَامِرٍ الْعَقَدِيُّ قَالَ
ہم سے بیان کیا عبداللہ بن محمد الجعفی نے کہا ہم سے بیان کیا ابو عامر عقدی نے کہا

ثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ بِلَالٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ اَبِيْ صَالِحٍ عَنْ
ہم سے بیان کیا سلیمان بن بلال نے انھوں نے عبداللہ بن دینار سے انھوں نے ابی صالح سے انھوں نے

اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْاِيْمَانُ بِضْعٌ
ابو ھریرہ سے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ ایمان کی ساٹھ پر

وَّسِتُّوْنَ شُعْبَةً
کئی شاخیں ہیں

بخاری کا اشارہ ادھر بھی ہے کہ یہ اجزاء ایمان ہیں، جس معنے میں ان کا اجزاء ہونا ثابت ہوتا ہے اسکے ہم منکر نہیں ہیں اسلئے ہمارے لئے مضر نہیں، کما مرّ مراراً، کیوں کہ ہم انھیں فروع کہتے ہیں، اور اگر چاہو تو اجزاء بھی کہہ سکتے ہو مگر ایسے اجزاء نہیں کہ ان میں سے کسی جزو کے نہ ہونے سے ایمان کا انتفاء ہو جائے۔

حدیث ۸ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدٍ الخ یہ روایت ابو عامر عقدی کی ہے، حدیث میں فرماتے ہیں کہ ایمان کے کچھ اوپر ساٹھ شعبے ہیں، بِضْعٌ کے معنے ہیں بہت سے اقوال ہیں، اغلب یہ ہے کہ وہ قول اصح ہے جس میں بضعة کی مراد سات بتائی گئی ہے، ویسے اس کا اطلاق تین سے لیکر دس تک ہوتا ہے نویا سات تک بھی کہا جاتا ہے، تو اگر کوئی یہ ترجمہ کرے کہ ایمان کے ۶۷ شعبے ہیں تو کچھ مضائقہ نہیں، اتنا اور یاد رکھو کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی اس حدیث کی روایات مختلف ہیں، کسی میں ستون کے بجائے سبعون ہے، اور بعض میں شک کے ساتھ سبعون او ستون ہے،

اوپر جو میں نے یہ کہا کہ یہ ابو عامر کی روایت ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حافظ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ کسی روایت میں ستون اور کسی میں سبعون آیا ہے، مگر ابو عامر کی روایت میں سب جگہ ستون ہے، میں کہتا ہوں کہ حافظ کو ذہول ہوا ہے، مسلم کتاب الایمان میں بھی ایک روایت ابو عامر کی ہے، اور وہاں سبعون کا لفظ ہے، حافظ کو یہ روایت مستحضر نہیں رہی، دونوں روایتوں میں جن حضرات نے جمع وتطبیق کی کوشش کی ہے انمیں سے بعض نے یہ فرمایا کہ ممکن ہے کبھی (ستون) فرمایا ہو اور کبھی (سبعون) رہا یہ سوال کہ ایسا کیوں ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے پہلے (ستون) کا حکم دیا گیا ہو اور بعد کو اضافہ ہو گیا ہو، میں کہتا ہوں کہ یہ احتمال تو ضرور ہے مگر اس کو

. . . .

میرا وجدان قبول نہیں کرتا، احادیث میں وہ احتمال لینا چاہئیے کہ اسے ذوق بھی قبول کرے، اس سے بہتر تو یہ ہے کہ کہا جائے کہ اصل شعبے تو ستون ہی ہیں اور دس ایسے ہیں کہ اگر چاہیں تو ان کو جزئی طور پر علیحدہ بھی شمار کر سکتے ہیں، تو وہ چیز فی حد ذاتہ بھی شعبہ ہے اور اس کے کچھ اصناف ایسے بھی ہیں کہ انھیں مستقلاً بھی شمار کر سکتے ہیں، بضع وستون میں اصول سکھلا دیئے اور سبعون میں بعض ایسے ہیں کہ انھیں اگر چاہیں تو مستقل کہہ سکتے ہیں مگر انکے شمار کا تذکرہ نہیں[1]، بہت سے لوگوں نے ان شعبوں کے بیان میں کتابیں لکھی ہیں، شعب الایمان للبیھقی بھی اسی موضوع پر ہے۔ (جو غیر مطبوع ہے) ہاں اس کا خلاصہ چھپا ہے، حافظ وعینی نے لکھا ہے کہ ابو حاتم ابن حبان نے جو کتاب لکھی ہے وہ سب سے بہتر ہے، میں نے ان کی کتاب نہیں دیکھی، نہ حافظ نے دیکھی ہے اس نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ جب میں نے یہ حدیث پڑھی تو میں نے ان احادیث کا تتبع شروع کیا جن میں کسی چیز کو ایمان میں سے قرار دیا گیا ہے، جب سب کو جمع کر چکا اور شمار کیا تو یہ عدد پورا نہ ہوا، پھر میں نے قرآن کا تتبع کیا تو اس میں جو ملا وہ بھی کم رہا، پھر میں نے دونوں کو جمع کیا تو تعداد بڑھ گئی اس کے بعد میں نے مکرر کو ساقط کر دیا، یعنی جو قرآن وحدیث دونوں میں تھے ان میں سے ایک لے لیا تو ٹھیک عدد نکل آیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کتاب بہتر لکھی ہوگی، ابن حجر نے اور عینی نے بھی ان امور کو شمار کیا ہے اور ہم نے بھی کوشش کی ہے، چونکہ قرآن سے کچھ فطری مناسبت رہی ہے اس لئے غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ شعب تو وہی ہیں جو کلام اللہ میں ہیں مگر ان کی تعداد وہ نہیں ہے جو حدیث میں ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ کمی جو راجع الی الایمان ہیں لے لیا جائے اور کچھ توسع کیا جائے تو اس طرح پورے ۷۰ نکلتے ہیں، پھر میں نے دوبارہ کوشش کی اس طرح جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ بعض مستقل بھی ہو سکتے ہیں اور شامل بھی ہو سکتے ہیں۔ تو اسطرح تلاش سے تہتر نکلا، اور لفظ بضع اس پر بھی صادق ہے، اور اس صورت میں دونوں روایات میں انطباق ہو گیا،

پہلے بحوالہ شاہ ولی اللہ یہ گذر چکا ہے کہ اس میں ساٹھیں ہیں تو اصل ایمان ہوا اور یہ فروع

---

(۱) جامع تقریر کی تعبیر واضح نہیں ہے، غالباً مراد یہ ہوگی کہ شعب ایمان کے اصول تو ساٹھ ہی ہیں، مگر ان اصول کی بعض جزئیات یا فروع ایسے ہیں کہ ان کو مستقل طور پر بھی شعبہ قرار دیا جا سکتا ہے، انھیں فروع کو ملا کر دوسری روایت میں، سبعون شعبۃ فرمادیا، (مرتب)

. . . .

اب اتنا اور سمجھ لو کہ محدثین یہ تعبیر کریں گے کہ ایمان و اعمال میں ایسا تعلق ہے جیسا کہ شجرہ کا فروع سے، یعنی جزو کا کل کے ساتھ ہے، اور ہم کہیں گے کہ جو تعلق اصل کا فرع سے ہے وہی تعلق یہاں ہے، تو ایمان کی تشبیہ اصل شجرہ سے ہوئی نہ شجرہ سے، اور اعمال کی فروع سے تشبیہ ہوئی، اور یہ واضح ہے، قرآن میں فرمایا اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ[1] یعنی کلمہ طیبہ شجرہ ہے اور اسکی جڑ مومنین کے قلوب میں ہے اور اس کا پھیلاؤ آسمان تک ہے، تو تشبیہ میں کلمہ کو شجرہ کہا ہے، اور یہاں ایمان کہا ہی تو یہ اصل ہے شجرہ نہیں، تو آیت وحدیث میں فرق ہے،

قولہ:۔ اَلْحَیَاءُ شُعْبَۃٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ، اسے علیحدہ کیوں لائے بعضوں نے کہا کہ حیا ایک خلق ہے، جو آمادہ کرتا ہے، اعمال صالحہ پر اور بیزار کرتا ہے منہیات سے اور یہ ایک بڑی شاخ ہے، اسلئے اسے علیحدہ بیان کیا، شاہ صاحب فرماتے تھے کہ حیا کے شعبہ ہونے میں شبہ تھا، کیونکہ شعب اعمال ہیں، اور حیا غرائز میں سے ہے، اور وہ ملکات ہیں جو فطری طور پر انسان میں ہوتے ہیں، اور وہ کسبی نہیں ہوتے، تو شبہ ہوتا تھا کہ شعب تو وہ ہیں کہ جنہیں کسب کو دخل ہو اور حیاء میں کسب کو دخل نہیں، اس کو دفع کرنے کے لئے فرمایا وَالْحَیَاءُ شُعْبَۃٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ۔ توضیح اسکی یہ ہے کہ حیا دو ہیں، ایک فطری، ایک کسبی، پہلی غریزہ ہے اور دوسری خلق۔ انسان جب برائی سے اجتناب کرتا رہتا ہے تو اجتناب ایک ملکہ بن جاتا ہے، یہاں ملکہ مراد ہے جو کسب سے پیدا ہوتا ہے مگر مسلم میں جو زیادہ ہے وہ اس تقریر کے منافی ہے، اسلئے کہ وہاں افضل وادنیٰ کا پھر حیا کا بیان ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت ان شعب کے تفاوت کو بتانا مقصود ہے کہ ایک اعلیٰ کنارہ ہے اور ایک ادنیٰ، اور میان میں کچھ متوسطات ہیں، افضل تو قول لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے، ایمان اصل ایمان اور جڑ ہے اور قول لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تنا ہے، اور دیگر اعمال فروع ہیں، تنا بھی گو شاخ ہی ہے، مگر یہ اعلیٰ ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام سے پہلی چیز یہی کہی گئی، فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی ۝ اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ الخ[1] اور جب ایسا ہے تو فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ[2] اور ادنیٰ شاخ (ادنی نسبتاً ہے ورنہ ہر ایک کامل ہے) اماطۃ اذی عن الطریق ہے، پھر بیچ کے شعب میں ایک بیان کر دیا جس طرح اعلیٰ اور ادنیٰ کی ایک ایک مثال دے دی،

اب رہا یہ کہ متوسطات میں سے حیا ہی کو مخصوص کیوں کیا، تو اس کی وجہ وہ لے لو، جو شاہ صاحب نے

(۱) طٰہٰ: ۱۳ و ۱۴ (۲) ایضاً

. . . .

بیاں فرمائی ہے یا دوسری تفسیر لے لو، بعض لوگوں نے حیا کی دو قسمیں بیان کی ہیں ایک عرفی دوسری شرعی، وہ اسطرح کہ بسا اوقات انسان کسی سے شرما کر منافع کو ترک کر دیتا ہے یہ عرفی حیاء ہے حیاء شرعی یہ ہے کہ اللہ سے شرما کر ترک کرے، حدیث میں حیاء شرعی مراد ہوگی، نہ عرفی، کیونکہ حدیث میں ہے نِعْمَتِ النِّسَاءُ نِسَاءُ الْاَنْصَارِ، فَاِنَّهُ لَمْ يَمْنَعْهُنَّ الْحَيَاءُ عَنِ التَّفَقُّهِ فِي الدِّيْنِ تو یہ عرفی حیا تھی، اور شارع کی نظر میں اسکی کچھ وقعت نہیں، ہاں اگر حیاء شرعی کے مخالف نہ پڑے تو بیشک ایک حد تک اس کا بھی اعتبار ہے، اور محمود ہے، بعضوں نے ایک قسم اور نکالی، یعنی حیاء عقلی، حیاء شرعی کا تارک فاسق کہلائیگا، حیاء عقلی کا تارک مجنون، اور حیاء عرفی کا تارک اَبْلَہ، دراصل حیا کی حقیقت وہ ہے جو امام راغب نے لکھی ہے یعنی هُوَ اِنْقِبَاضُ النَّفْسِ عَنِ الْقَبَائِحِ وَتَرْكُهُ لِذٰلِكَ (۱) اب اگر وہ شرعاً قبیح ہے تو اس سے انقباض حیاء شرعی ہے اور اگر عرفاً قبیح ہے تو عرفی، اور عقلاً قبیح ہے تو عقلی،

عارفین نے حقیقت حیا یہ تبلائی ہے اِنَّ لَا يَرَاكَ مَوْلَاكَ (۲) حَيْثُ نَهَاكَ، یعنی حیاء یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمکو اس جگہ نہ دیکھے جہاں ہونے کو اس نے منع کر دیا ہے، یہ حقیقت ہے کہ مجرم کو حضورِ الٰہی کا یقین ہو، تو پھر کوئی جرم نہیں کر سکتا، چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ صرف دیکھ کر مجرم کو یہ فرمایا تھا کہ لوگ زنا کرتے ہیں اور ہماری مجلس میں آتے ہیں،

ترمذی میں ہے، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسْتَحْيُوْا مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ (اللہ سے حیا کرو جیسا کہ اس کا حق ہے) صحابہ نے کہا اِنَّا نَسْتَحْيِيْ مِنَ اللهِ يَا نَبِيَّ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ (اے اللہ کے نبی، الحمد للہ ہم تو خدا سے حیا کرتے ہیں) آپ نے فرمایا لَيْسَ ذٰلِكَ (یہ وہ حیا نہیں ہے) وَلٰكِنْ مَنِ اسْتَحْيٰى مِنَ اللهِ حَقَّ الحياء (بلکہ جو شخص اللہ سے حیا کرے جیسا کہ اس کا حق ہے) فَلْيَحْفَظِ الرَّاسَ وَمَا وَعٰى تو حفاظت کرے سر کی اور ان خیالات وعقائد کی جو سر میں ہیں، وَلْيَحْفَظِ الْبَطْنَ وَمَا حَوٰى (اور پیٹ کی حفاظت کرے اور ان چیزوں کی جو پیٹ میں ہیں) یعنی حرام سے بچے اور حلال پر قناعت کرے، وغیرہ، وَلْيَذْكُرِ الْمَوْتَ وَالْبِلٰى (اور یاد کرے موت کو اور وہاں کی بوسیدگی کو) وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ تَرَكَ زِيْنَةَ الدُّنْيَا (اور جو طالب آخرت ہوگا وہ دنیا کی زیب وزینت کو چھوڑ دے گا)

---

(۱) مفردات میں اسی طرح ہے، تقریر میں "عَنْ فِعْلٍ قَبِيْحٍ" اور فضل الباری میں "عَنِ الْقَبِيْحِ الْعَقْلِيِّ" ہے (۲) میرے نزدیک یہی صحیح ہے فضل الباری میں اور اس تقریر میں بھی اِنَّ مَوْلَاكَ لَا يَرَاكَ ہے۔ جو میرے نزدیک صحیح نہیں ہے،

بَاب اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ

مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں

۹ـــ حَدَّثَنَا اٰدَمُ بْنُ اَبِیْ اِیَاسٍ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ

ہم سے بیان کیا آدم بن ابی ایاس نے کہا ہم سے بیان کیا شعبہ نے انھوں نے عبداللہ ابن ابی السفر

اَبِی السَّفَرِ وَاِسْمَاعِیْلَ عَنِ الشَّعْبِیِّ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ

اور اسماعیل ابن ابی خالد سے، انھوں نے عامر شعبی سے، انھوں نے عبداللہ ابن عمرو سے، انھوں نے نبی

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ ،

صلی اللہ علیہ وسلم سے، فرمایا: مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں.

وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ .

اور مہاجر وہ ہے جو ان کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع کیا.

فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ فَقَدِ اسْتَحْيٰى مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ[1] (پس جس شخص نے یہ سب کچھ کر لیا، اس نے بیشک اللہ سے حیا کی، جیسا کہ حیا کا حق ہے) یہ ہے کمال حیا کا، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ میں یہ وصف بدرجۂ اتم موجود تھا، اسی بنا پر آنحضرت ؐ نے فرمایا تھا اَصْدَقُهُمْ حَيَاءً عُثْمَانُ (سب سے سچی حیا والے عثمان ہیں) مجلس والا واقعہ بھی ان کے کمال حیا کی دلیل ہے، ان کی حیا لطیف نے آنے والے کی نگاہ دیکھ کر سمجھ لیا کہ اس نے آنکھ کا زنا کیا ہے، اور آنے والے نے اعتراف کیا کہ اس نے آتے ہوئے ایک اجنبی عورت کو تاکا تھا.

بَابُ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ

حدیث ۹ قولہ المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ (مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں) یعنی جو شخص مسلم کہلاتا ہے تو کم از کم اس نام کی لاج رکھنی چاہئے، کیونکہ مسلم کا مادہ "سلم" ہے جس کے معنی صلح و آشتی کے ہیں اور یہ لفظ "حرب" کا مقابل ہے، تو جو شخص (ناحق) ایذا پہونچائے، خواہ ہاتھ کے ذریعہ ہو یا زبان کے، وہ اس لقب کا مستحق نہیں ہاتھ کی ایذا میں ہاتھ سے کسی کی برائی لکھنا، تحریری طور پر سب و شتم، بہتان طرازی اور غیبت بھی داخل ہے، اور زبان سے ایذا ظاہر ہے.

---

(۱) یہ حدیث مشکوٰۃ باب تمنی الموت وذکرہ میں بروایت مسند احمد و ترمذی انھیں لفظوں کے ساتھ مذکور ہے.

قَالَ أَبُوعَبْدِ اللهِ وَقَالَ أَبُومُعَاوِيَةَ ثَنَا دَاوُدُ بْنُ أَبِي هِنْدٍ

امام بخاری نے کہا اور معاویہ نے بیان کیا، ہم سے بیان کیا داؤد نے، انھوں نے عامر شعبی سے، کہا کہ میں نے

عَنْ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللهِ بْنَ عَمْرٍو يُحَدِّثُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ

سنا عبداللہ بن عمرو سے، انھوں نے سنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے (پھر یہی حدیث بیان کی) اور

وَسَلَّمَ، وَقَالَ عَبْدُ الْأَعْلَى عَنْ دَاوُدَ عَنْ عَامِرٍ عَنْ عَبْدِ اللهِ عَنْ

عبدالاعلیٰ نے اس کو روایت کیا داؤد سے، انھوں نے عامر سے، انھوں نے عبداللہ سے، انھوں نے

النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

بعض لوگ اس میں تاویل کرتے ہیں کہ مسلم سے مسلم کامل مراد ہے، مگر اس سے حدیث کا وزن گھٹ جاتا ہے، اور جس چیز سے تنفیر مقصود تھی وہ حاصل نہیں ہوتی، کیونکہ ہر شخص کہہ دے گا کہ ہم کون سے جنید و شبلی ہیں، ہم تو پہلے ہی سے ناقص ہیں، ایک نقص یہ بھی سہی، لہٰذا اسے سطح کلام ہی پر رکھنا چاہئے اور مبالغہ پر حمل کرنا چاہئے جیساکہ ہم محاورات میں کہتے ہیں کہ آدمی وہ ہے جو کسی کو ایذا نہ پہونچائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اس کے خلاف کرنے پر آدمیت سے نکل گیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ خصلت آدمیت کی ہے، ایسے ہی مسلم وہ ہے یعنی خصلت مسلم یہ ہے کہ وہ ایذا، نہ پہونچائے.

یہ بھی یاد رکھو کہ مَن سلم المسلمون کی قید سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم کو ایذا پہونچا سکتا ہے، کیونکہ مفہوم مخالف یہی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ کفار کی ایک قسم وہ ہے جن کو حربی کہا جاتا ہے، جن کے ساتھ نہ ہم نے عقد ذمہ کیا ہے اور نہ ہمارے ان کے درمیان باہمی رواداری اور صلح و آشتی کا معاہدہ یا معمول ہے، اور ان سے ہم محفوظ نہیں تو وہ بھی ہم سے محفوظ نہیں ہیں، دوسری قسم کفار کی وہ ہے جن سے ہم نے عقد ذمہ کیا ہے یا جن کے ساتھ باہمی رواداری کا معاہدہ یا معمول ہے، کفار کی یہ قسم ذمی کہلاتی ہے اور ایذا رسانی کے معاملہ میں مسلمانوں کے حکم میں ہے، حتیٰ کہ اسلام نے ذمیوں کے جان و مال بلکہ ان کے مذہب کی حفاظت کا بھی ذمہ لیا ہے.

تو اب مراد یہ ہوئی کہ مسلمین اور وہ جو مسلمین کے ذمہ میں ہیں معاملات میں المُسلمُون کے حکم میں ہیں اور جو کافر محارب ہیں وہ اس حکم سے خارج ہیں اسی کو قرآن نے فرمایا لَا يَنْهَاكُمُ اللهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ[1] (الآیہ)

---

(۱) ممتحنہ : ۸

باب ۵ اَیُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ

کون سا اسلام افضل ہے۔

۱۰ ــــ حَدَّثَنَا سَعِيْدُ بْنُ يَحْيٰى بْنِ سَعِيْدِ الْاُمَوِيُّ الْقُرَشِيُّ قَالَ ثَنَا

ہم سے بیان کیا سید ابن یحییٰ ابن سعید اموی قرشی نے، کہا ہم سے بیان کیا والد نے، کہا

اَبِيْ قَالَ ثَنَا اَبُوْبُرْدَةَ بْنُ عَبْدِ اللهِ بْنُ اَبِيْ بُرْدَةَ عَنْ اَبِيْ بُرْدَةَ عَنْ اَبِيْ مُوْسٰى

ہم سے بیان کیا ابو بردہ بن عبداللہ ابن ابی بردہ نے، انھوں نے ابو بردہ سے، انھوں نے ابوموسیٰ اشعری سے

قَالَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللهِ! اَيُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ

صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کون سا اسلام افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: جس کے ہاتھ اور زبان سے

مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ۔

مسلمان بچے رہیں۔

قولہ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللهُ عَنْهُ (مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے) ہجرت کی دو قسمیں ہیں: ایک ہجرت ظاہرہ، یعنی مکہ مکرمہ سے یا کسی جگہ سے مدینہ منورہ یا کسی دار الاسلام کی طرف منتقل ہونا اور کافرانہ ماحول کو ترک کر دینا، اور دوسری ہجرت باطنہ ہے، اور وہ محارم و منہیات کا ترک کرنا ہے۔ ایک شخص نے دار الکفر کو چھوڑ دیا مگر دار الاسلام میں پہونچ کر محارم و فواحش کا ارتکاب شروع کر دیا تو یہ ہجرت کیا ہوئی؟ ہجرت اس لئے ہے کہ دین کی حفاظت ہو اور جب اس نے یہ نہ کیا تو ہجرت کی غرض مفقود ہوگئی۔

قولہ قال ابو عبد اللہ وقال ابو معاویۃ، یہاں امام بخاری کو یہ بتلانا مقصود ہے کہ پہلی روایت شعبہ کی ہے اور ان کے دو شیخ ہیں، ابن ابی السفر اور اسمٰعیل، اور دونوں کی متابعت داؤد ابن ابی ہند نے کی ہے، شعبی سے ان دونوں نے بھی روایت کی ہے اور داؤد نے بھی، فرق صرف یہ ہے کہ پہلے دونوں نے سماع کی تصریح نہیں کی ہے اور داؤد نے تصریح کی ہے کہ عامر(۱) نے سمعت عبد اللہ ابن عمرو کہا۔

قولہ وقال عبد الاعلیٰ الخ، یہاں پر امام بخاری نے یہ بتایا ہے کہ داؤد کی روایت میں سماع کی تصریح

---

(۱) شعبی اور عامر ایک ہی شخص ہیں، عامر نام ہے اور شعبی نسبت، اور یہ امام ابوحنیفہؒ کے استاد اور شیخ ہیں۔

باب ۶ اِطْعَامُ الطَّعَامِ مِنَ الْاِسْلَامِ

کھانا کھلانا اسلام کی خصلت ہے

۱۱ــــ حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ خَالِدٍ قَالَ ثَنَا اللَّيْثُ عَنْ يَزِيْدِ عَنْ

ہم سے بیان کیا عمرو ابن خالد نے، کہا بیان کیا ہم سے لیث نے، انھوں نے یزید سے

اَبِى الْخَيْرِ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

انھوں نے ابوالخیر سے، انھوں نے عبداللہ ابن عمرو سے: ایک مرد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

وَسَلَّمَ اَىُّ الْاِسْلَامِ خَيْرٌ قَالَ تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَتَقْرَأُ السَّلَامَ عَلٰى مَنْ

پوچھا: اسلام کی کون سی خصلت بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا: کھانا کھلانا اور (ہر ایک مسلمان کو) سلام کرنا

عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ .

اس کو پہچانتا ہو یا نہ پہچانتا ہو۔

ان کا شاگرد ابو معاویہ کرتا ہے۔ اور واؤد کا دوسرا شاگرد عبدالاعلی سماع کی تصریح نہیں کرتا بلکہ عن عبد اللہ کہتا ہے۔

بابٌ اىُّ الاسلام افضلُ

اول ارکان خمسہ کو اسلام کا ستون ثابت کرنے کے بعد اب کچھ دوسری تفصیلات بیان کرتے ہیں۔

المسلم من سلم المسلمون کو ذکر کرکے بتایا کہ ہاتھ اور زبان سے کسی مسلم کو ایذا نہ پہونچانا بھی شیوۂ اسلام ہے اس کے بعد اىّ الاسلام افضلُ کا ذکر کرکے بتا رہے ہیں کہ کوئی اسلام فاضل اور کوئی مفضول ہوتا ہے، یعنی اسلام کے مراتب متفاوت ہیں اور جب اسلام کے مراتب متفاوت ہوئے تو ایمان کے بھی متفاوت ہوں گے، کیونکہ امام بخاریؒ کے یہاں دونوں ایک ہیں۔

بابٌ اطعام الطعام من الاسلام

حدیث ۱۱ قولہٗ اىّ الاسلام خيرٌ یعنی اىّ خصالِ الاسلام خيرٌ، اسلام کی کون سی خصلت بہتر ہے، یا کون سی خصلت والا بہتر ہے۔

قولہٗ تُطعمُ الطَّعامَ، اس میں مفعول اول کو حذف کردیا تاکہ دلالت کرے کہ کھانا کھلانا، بلاتخصیص خصال اسلام میں سے ہے، نادار کو کھلائے یا غیر نادار کو۔

. . . .

قولہ وَتَقْرَأُ السَّلَامَ عَلٰی مَنْ عَرَفْتَ وَعَلٰی مَنْ لَمْ تَعْرِفْ ، یعنی ہر ایک کو سلام کرنا چاہئے ، خواہ پہچان ہو یا نہ ہو ، یہ بات اشراط قیامت میں سے ہے کہ اخیر زمانہ میں صرف پہچان والوں کو ہی سلام کیا جائے گا ۔

ایک ہی طرح کے سوال کے مختلف جواب کی تحقیق

اس قسم کی حدیثیں متعدد ہیں جن میں بعض اعمال کی بعض پر فضیلت بیان فرمائی گئی ہیں ، سب میں سوالات قریب قریب یکساں ہیں ، مگر جوابات مختلف ہیں ترمذی میں ہے : ای الاعمال افضل ؟ جواب میں فرمایا گیا : الایمان باللّٰہ ، مسلم کی حدیث ایّ الاسلام خیرٌ کے جواب میں فرمایا : اَنْ تُطْعِمَ الطعامَ وتقرَأُ السّلام علٰی مَنْ عَرَفْتَ وعلٰی مَن لم تعرِفْ ، ترمذی میں ایّ الاعمالِ افضلُ کے جواب میں فرمایا : الصّلوٰۃ علٰی مواقیتھا ، غرض سوالات متقارب ہیں ، مگر جوابات متفاوت ، اور بظاہر ان میں تغایر بھی ہے ، اور ترتیب بھی الگ الگ ہے ، ایسا کیوں ہوا ؟ مشہور جواب یہ ہے کہ سائلین ، یا اوقات ، یا احوال کے لحاظ اور اختلاف سے جوابات بھی مختلف دیئے ، جس نے پوچھا : ایّ الاسلام خیرٌ ؟ اس میں آپ نے کچھ بخل دیکھا ہوگا اس لئے فرمایا : اَن تُطعِمَ الطعامَ ، مطلب یہ نہیں ہے کہ علی الاطلاق سب سے بہتر عمل یہی ہے ، بلکہ اس شخص کے حق میں یہی بہتر ہے ۔

یا کبھی اوقات یا احوال کے اعتبار سے جواب دیا ، مثلاً جہاد کا وقت ہے اور اخراجات کی ضرورت ہے اور مواساۃ مقصود ہے تو اطعام طعام کو افضل فرمایا چنانچہ اَن تطعمَ الطعامَ کے بارے میں تصریح ہے کہ یہ اوائل اسلام کی حدیث ہے ، جب اس کی سخت ضرورت تھی [1] ، یہ تو مشہور جواب کا خلاصہ ہوا ! مگر جہاں تک ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ کہیں کہیں یہ ضرورتیں پیش آتی ہیں اور اس کی بنا پر جوابات مختلف ہوتے ہیں ، مگر یہاں پر الفاظ حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوال کے الفاظ کا تفاوت بھی اختلافِ جواب کا باعث ہے ، مثلاً ایک روایت میں لفظ افضل ہے ، یہ سب کو شامل ہے اَن تطعمَ الطعامَ میں اکثر روایات میں لفظ خیرٌ آیا ہے ، جس حدیث کے آخر میں حجّ مبرورٌ ہے اس کی تمام روایات میں افضل کا لفظ ہے ، ترمذی کی حدیث جو بخاری میں ہے اس میں احبّ کا لفظ ہے اور اس کے جواب میں فرمایا الصّلوٰۃ لوقتھا ، چونکہ افضلیت ہر ایک میں ہے ، اس لئے رواۃ ہر جگہ افضل بول دیتے ہیں ، خیر مقابل شر ہے ، جب خیر کا سوال کیا تو مراد یہ ہے کہ جس میں شر کا بالکل شائبہ نہ ہو ، نہ صورۃً نہ معنیً ، اس لئے فرمایا : اَن تُطعِمَ الطعامَ ، یہ وہ وصف ہے جس میں کسی کے نزدیک بھی شر نہیں

---

(۱) یہ توجیہات امام نووی اور حافظ ابن حجر وغیرہما نے بیان کی ہیں ۔

. . . .

فطرت صحیحہ بتلاتی ہے کہ مطلقاً شر نہیں ہے، تجربہ بھی شاہد ہے کہ جس شخص میں یہ وصف موجود ہے اس کی نیک نامی اور سرخروئی ہوتی ہے۔ تو اس میں کسی عنوان سے کسی بھی شر کا شائبہ نہیں، جس پر تمام عالم کا اتفاق ہو، بلکہ کافر ہو یا ملحد سب کے نزدیک وہ بہتر ہے اور اس میں کسی قسم کے فتنہ کا احتمال بھی نہیں۔

اسی سوال کے جواب میں دوسری روایت میں آتا ہے ان یسلم المسلمون عن الخ تو معلوم ہوا کہ تمام دنیا کے نزدیک اس میں خیر محض ہے، شر بالکل نہیں، نہ صورۃً نہ حقیقۃً [ورنہ بعض امور ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں بظاہر شر کا پہلو بھی نکلتا ہے] مثلاً جہاد کہ اس میں خیر ہے مگر فقہاء کہتے ہیں کہ حسن لغیرہ ہے، چونکہ اعلاء کلمۃ اللہ ہے، اس مقصد اور استرضاء الٰہی کے اعتبار سے حسن ہے، اگر بظاہر فساد معلوم ہوتا ہے کہ لیکن اطعام طعام میں کسی کے نزدیک فساد نہیں تو خیر کے سوال کا جواب ایسا ہی ہونا چاہئے تھا جس میں شر کا شائبہ بھی نہ ہو، اور جب سوال ہوا کہ ای الاعمال افضل[1] تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس میں اجر زائد ہو وہ کون سا عمل ہے؟ تو آپ جواب میں فرماتے ہیں کہ الایمان باللہ، اور اس زمانہ میں ایک کافر کو کفر چھوڑ کر ایمان کا اختیار کرنا سب سے مشکل کام تھا، اس کے مقابلہ میں ہر چیز آسان تھی اس کا ثبوت یہ ہے کہ اہل عرب نے مرجانا اور تباہ ہوجانا گوارہ کرلیا مگر کلمہ پڑھنا گوارہ نہ کیا، معلوم ہوا کہ اس سے بڑھ کر کوئی مجاہدہ نہیں، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جان مال سب سے بڑھ کر مذہب کی محبت ہوتی ہے، فرق یہ ہوتا ہے کہ مومنین کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے اور اہل باطل کو باطل سے کما قال اللہ تعالیٰ: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (۲)

پھر اس کے بعد فرمایا: جہاد افضل ہے، کیونکہ ایمان کے بعد سب سے مشکل کام یہی ہے، اس لئے کہ تمام بیوی بچوں کو چھوڑ کر اعزاء اقرباء کو چھوڑ کر دولت وتجارت کو چھوڑ کر جانا پڑتا ہے، خود قرآن کہتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰي مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّةَ (۳) (الآیۃ) تو معلوم ہوا کہ دوسرے درجہ میں شاق عمل جہاد ہے۔

اس کے بعد فرمایا حج مبرور، مشاہدہ ہے کہ یہاں انفاق مال بھی ہے اور مشقت بھی، حاجی گرمی اور لو میں چلتا ہے اور تمام راحت وآرام ترک کرتا ہے، اسی لئے فرمایا کہ عورتوں کا جہاد حج ہے، تو بعد جہاد کے سب سے مشکل اور سب سے افضل حج ہے، اسی کو فرمایا: العطایا علیٰ متن البلایا۔

---

(۱) افضل، فضل سے ہے اور اس کے معنیٰ زیادۃ کے ہیں (۲) بقرہ: ۱۶۵ (۳) توبہ: ۱۱۱

مکتوبات میں مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

کیف الوصول الیٰ سعاد ودونہا ❊ قلل الجبال ودونہن قطوف

تو اللہ تک پہونچنا عین مقصود ہے مگر کام مشکل ہے، اور بڑا جوانمرد ہے وہ جو اس راہ پر چل پڑے اور سب کچھ جھیلنے کو تیار ہو جائے، اسی کو فرماتے ہیں :

ھنیئًا لارباب النعیم نعیمھم ❊ وللعاشق المسکین ما یتجرّع

تیسری چیز ایک اور ہے، وہ یہ کہ بعض اعمال اپنی ہیئت ظاہری صورت کے اعتبار سے وظیفۂ عبودیت کے مناسب ہوتے ہیں جیسے نماز کہ اس میں کوئی اتنی مشقت نہیں جتنی جہاد وحج میں ہے، مگر یہاں بندوں کی ہر ادا سے تذلل اور انکساری ظاہر ہوتی ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ کسی مالک کو اس سے بڑھ کر محبوب کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ اس کا غلام غایت انکساری کا مظاہرہ کرے، اور اس سے مبغوض کوئی شے نہیں کہ غلام نخوت وسرکشی سے پیش آئے، لہٰذا جب سوال کیا اىّ الاعمال احبُّ الی اللہ، تو سوال محبوب چیز کا ہو رہا ہے اور اس سے زیادہ محبوب کوئی چیز نہیں کہ اظہار تذلل ہو، اسلئے فرمایا: الصَّلوٰۃ لوقتہا، کیونکہ اس میں مبادرت ثابت ہوتی ہے امتثال امر میں اور یہ مظہر اکمل ہے عبودیت کا.

اس کے بعد فرمایا بِرُّ الوَالِدَیْن، کیونکہ ماں باپ صفت ایجاد کے اعتبار سے عالم اسباب میں قائم مقام اللہ کے ہیں اور تخلیق کا وجود ان کے واسطے سے ہوا ہے، اسی لئے قرآن میں کئی جگہ اپنے حقوق کے ساتھ والدین کے حقوق کا بھی ذکر فرمایا، ارشاد باری ہے: اَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ[1] ط تو والدین کے ساتھ بِرّ کون کرے گا؟ وہی جو خالق کا حق پہچانتا ہو، کیونکہ جو شخص والدین کے ساتھ احسان نہ کرے ان کی اطاعت نہ کرے تو اللہ کے حقوق کی ادائیگی کی اس سے کیا امید ہو سکتی ہے،

تیسرے درجہ میں اطاعت اولی الامر[2] مراد ہے اور اس کا سب سے بڑا مظاہرہ جہاد کے وقت ہوتا ہے، اس لئے فرمایا: اَلْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللہِ، تو اول درجہ میں اللہ کی اطاعت، دوم درجہ میں برّ الوالدین اور تیسرے درجہ میں اولی الامر کی اطاعت رکھی، اس اعتبار کر بندہ سراپا اطاعت ہے اور اس صورت میں بھی ترتیب رہنی چاہئے، اسی لئے فرمایا: وَاِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰی اَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا مگر آگے یہ بھی فرمایا کہ : وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا[3] (الآیۃ) بس یہ انتہا ہے،

(١) لقمان : ١۴ (٢) اسی کو فرمایا : اَطِيعُوا اللہَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (نساء: ۵۹) (٣) لقمان : ١۵

. . . .

اب اگر یہ ماں باپ شرک کا حکم دیں تو ان کی اطاعت واجب نہیں [1] مگر والدین کے ساتھ حسن سلوک کے معاملہ کا حکم جب بھی ہے، یہ اس لئے کہ ان کا حق بہت بڑا ہے، خود فرمایا: وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ [2] اور کہا اللہ سے ان پر رحمت کی دعا کر [وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا [2] تو رب کی صفت ربوبیت کا ظہور ان سے ہوتا ہے، اس لئے ان کا رتبہ اللہ کے بعد ہے، رہا لفظ افضل وہ سب کو شامل ہے، مگر جس میں صرف افضل آیا ہے وہاں میرے نزدیک صرف زیادۃ کے معنی میں ہے اور جہاں دوسرے الفاظ کے ساتھ میں آیا ہے وہاں اس نوع کے اعتبار سے فضیلت ہوگی، فضیلتِ کلی ایمان باللہ کو ہے اس کے بعد صلوٰۃ کو علماء نے لکھا ہے۔

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شئون نبوت بھی مختلف ہوتے ہیں، جس صفت کا جس وقت ظہور ہوتا تھا اسی کے اعتبار سے اس وقت اس کا بیان بھی فرما دیتے تھے (مزید ان شاء اللہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث نعلین میں آئے گا)

اب ان دو حدیثوں کے بارے میں جو یہاں بخاری میں ہیں کچھ کہنا ہے، ان کے بارے میں حافظ تو کہتے ہیں کہ جو شخص کسی کو کھانا کھلائےگا تو اغلب یہ ہے کہ اس کے ہاتھ سے لوگ محفوظ بھی رہیں گے، اسی طرح جو ہر ایک کو سلام کرتا ہے تو اغلب یہ ہے کہ لوگ اس کی زبان سے محفوظ رہیں گے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ جو کھانا کھلائے وہی لاٹھی لے کر اس پر چڑھ بھی آئے، یا سلام کرے اور پھر برا بھی کہے، چنانچہ جب دل میں کچھ ہوتا ہے تو سلام ترک کر دیتے ہیں، تو تطعمُ الطعام کنایہ ہے سلامتِ ید سے اور تقرءُ السَّلام کنایہ ہے سلامت لسان سے۔ تو اس طرح انھوں نے (حافظ نے) ان کو پہلی حدیث کی طرف راجع کر دیا۔

اپنی سمجھ میں یہ آیا ہے کہ بخاری ایک خاص ترتیب اور عجیب لطافت کے ساتھ ابواب لا رہے ہیں، پہلے ادنیٰ مرتبہ بیان کیا، کہ ایک شخص فاسق ہے، فاجر ہے، بدکار ہے، عاصی ہے، مگر لوگ اس کی ایذاء سے محفوظ ہیں، اسلام ہی کا نہیں بلکہ آدمیت کا ادنیٰ مرتبہ یہی ہے [دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ بھلائی کرے] تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ مومن اپنے بھائی کے لئے وہ بات پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، تو یہ کتنی اچھی ترتیب ہے، ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ ایذاء نہ پہونچائے، اس سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ بھلائی کرے، اس سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ يُحِبُّ لِاَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ اور اس سے بھی اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اپنی جان سے بڑھ کر دوسرے سے تعلق ہو اور وہ پیغمبروں کی ذات ہے کہ ان کے ساتھ ایسی محبت ہو کہ تمام دنیا کو ان کے مقابلہ میں حتیٰ کہ اپنی محبوب جان کو

---

(1) کیونکہ وہ کافر ہو گئے اور کافر کی اطاعت واجب نہیں (انتہیٰ) جامع تقریر نے یہی لکھا ہے، مگر اولیٰ یہ ہے کہ کہا جائے یہ معصیت خالق ہے وَلَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ (مرتب)

(2) بنی اسرائیل : ٢٤

بابُ مِنَ الْاِیْمَانِ اَنْ یُّحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ

ایمان کی بات یہ ہے کہ جو اپنے لئے چاہے وہی اپنے بھائی (مسلمان) کیلئے چاہے

۱۲ــــ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا یَحْیٰی عَنْ شُعْبَۃَ عَنْ قَتَادَۃَ عَنْ

ہم سے بیان کیا مسدد نے کہا ہم سے بیان کیا یحیٰی نے، انھوں نے روایت کی شعبہ سے، انھوں نے قتادہ سے

اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ، وَعَنْ حُسَیْنِ الْمُعَلِّمِ قَالَ ثَنَا قَتَادَۃُ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ

انھوں نے انس سے، انھوں نے آنحضرتؐ سے، دوسری سند، یحیٰی نے اس کو روایت کیا حسین معلم سے، کہا ہم سے بیان کیا قتادہ نے، اس نے

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ

روایت کی انس سے، انھوں نے آنحضرتؐ سے فرمایا کہ کوئی تم میں سے اس وقت تک مومن نہیں ہوتا یہاں تک کہ اپنے لئے جو چاہتا ہے وہی اپنے بھائی (مسلمان) کیلئے چاہے

بھی پس پشت ڈال دے، اس سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ اس کے متعلقین سے بھی محبت کرے، اس لئے کہ قاعدہ یہ ہے کہ جب برتن پانی سے بھر جائے گا تو پانی اس کے اردگرد گرے گا۔ اسی طرح جب محبت کا پیمانہ بھی بھر جاتا ہے تو اردگرد گرتا ہے اور متعلقین سے محبت ہوجاتی ہے اسی کو لائے ہیں باب حب الانصار من الایمان میں اور درمیان میں حلاوۃ الایمان کا باب لائے ہیں (اسے بعد میں آگے بیان کروں گا) حاصل یہ کہ میرے نزدیک اس حدیث کو پہلی حدیث کی طرف راجع کرنا ایک طرح کا قصور ہے جس کی وجہ سے ترتیب کی وہ خصوصیت اور لطافت باقی نہ رہے گی کما بینتھا۔

مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ کے عموم سے یہ بات نکالی ہے کہ کافر کو بھی سلام جائز ہے، مگر یہ مسئلہ کتب فقہ میں منصوص ہے کہ کافر کو پہلے سلام نہ کرے بلکہ محض جواب دے اور جواب بھی وہ نہیں جو مسلم کے لئے ہے، بلکہ ھَدَاکَ اللّٰہ وغیرہ سے جواب دے، تو مَنْ عَرَفْتَ کا عموم خاص مسلمین کے لئے ہے، مگر یہ مسئلہ اس وقت کے لئے ہے جب اسلام کو شوکت وحکومت حاصل ہو، ورنہ جب چارہ نہ رہے تو اپنی جان بچانے کے لئے "آداب" وغیرہ کہہ دیا جائے، سلام نہ کیا جائے۔

اسلام نے سلام کا طریقہ سکھایا ہے، دنیا کے تمام فرق ملنے کے وقت ایک تحفہ پیش کرتے ہیں، مگر اس سے بہتر کوئی لفظ نہیں کیونکہ یہاں سلامتی کی دعا بھی ہے اور بشارت بھی اور ایک دوسرے کو مطمئن بھی کردیتا ہے کہ یہ میرا خیرخواہ ہے اور میری سلامتی چاہتا ہے، سنا ہے کہ اہل بدو (ڈاکوؤں) کا جنھیں حرامی کہتے ہیں، یہ قاعدہ ہے کہ حملے سے پہلے اگر انھیں سلام کیا جائے، تو اگر انھوں نے جواب دے دیا تو سمجھو کہ لوٹیں گے نہیں اور اگر جواب نہ دیا تو اب خطرہ ہے، گویا سلام کے جواب سے مطمئن کردیا گیا، چنانچہ

ایک واقعہ بھی میرے ساتھ پیش آیا کہ چند بدو ہمارے قافلہ کے ساتھ تھے مگر نہ انھوں نے سلام کیا، نہ ہم نے، نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی ہی دیر میں ہمارے قافلہ کو لوٹ لیا۔

باب من الایمان ان یحب لاخیہ مایحب لنفسہ

حدیث ۱۲۔ یحییٰ کے دو شیخ ہیں، ایک شعبہ دوسرے حسین، اور دونوں قتادہ پر جا کر مل گئے۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ کا وہی مطلب ہے کہ اس میں مومن کی خصلت نہیں، جیسے کہا جاتا ہے کہ بیٹا باپ کو مارے تو وہ بیٹا نہیں، تو کیا وہ نسل سے خارج ہو جائے گا اور میراث نہ پائے گا؟ نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے اس فعل کی وجہ سے اس لائق نہیں کہ اسے بیٹا کہا جائے، ایسے ہی یہاں ہے کہ ناقص کو معدوم کے مرتبہ میں قرار دے دیا ہے، ارشاد ہے کہ مومن وہ ہے جو اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، یعنی مومن کی خصلت یہ ہے۔

اس میں کئی اشکال وارد کئے جاتے ہیں، یحب لاخیہ الخ کی ایسی تفسیر جس سے سب اشکال مندفع ہو جائیں میرے نزدیک دو طرح سے ہے، ایک یہ کہ میں جس قسم کے معاملہ کا اپنے بھائیوں سے امیدوار ہوں، اسی قسم اور اسی نوع کا معاملہ مجھے ان سے کرنا چاہئے۔

دوسرے یہ کہ اگر میں اس مقام پر ہوتا جس پر بھائی ہے تو میں اس وقت جو اپنے لئے پسند کرتا، وہی اب اس وقت اپنے بھائی کے لئے پسند کروں، فرض کرو میرا بھائی تاجر ہے اور وہ مجھ سے تجارت کا کچھ مشورہ لے تو کیا میں اس حدیث کو سامنے رکھ کر یہ کہوں کہ میں اپنے لئے بخاری پڑھنا پسند کرتا ہوں لہٰذا تو بھی بخاری پڑھ جیسا کہ میں پڑھ رہا ہوں، تو حدیث کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ میں سوچ کر جواب دوں کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو اپنے لئے کیا کرتا، جو اپنے لئے چاہتا وہی اس کے لئے بھی چاہوں، یہ معنی کہ بعینہٖ وہی چاہے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے تو کیا ایک بادشاہ یہ چاہے گا کہ سب مجھ جیسے بادشاہ ہو جائیں، ظاہر ہے کہ یہ معنیٰ درست نہیں، ہمارے والد صاحب مرحوم (جو منجملہ بانیان مدرسۂ دیوبند تھے) اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے والد مولانا ذوالفقار علی صاحب مرحوم (بھی بانیوں میں سے تھے) دونوں مدرسہ کے ممبر تھے اور دونوں دیندار تھے اور دونوں کے لڑکے مدرسہ میں تعلیم دیتے تھے، مولانا ذوالفقار علیؒ کے فرزند حضرت شیخ الہند اور والد صاحب کے لڑکے مولانا عزیز الرحمٰن صاحبؒ تھے تو جب کبھی مجلس شوریٰ میں کوئی ایسا مسئلہ پیش ہوتا جس میں بیٹوں کا معاملہ ہوتا، تو مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ بالکل علٰحدہ ہو جاتے اور والد صاحبؒ فرماتے کہ ہم تو رائے دیں گے، اگر یہ سمجھ کر کہ اس کی جگہ کوئی غیر ہوتا تو ہم کیا رائے دیتے، اپنے بیٹے کے لئے بھی وہی رائے دیں گے جو غیر کے لئے دیتے۔

اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ حدیث کا مطلب یہ ہے، نہ کہ کچھ اور، ورنہ پھر اشکالات پیش آئیں گے، کیونکہ ہر شخص چاہتا ہے کہ میں

باب حُبّ الرَّسُول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْإِيمَانِ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنا ایمان کا ایک جزو ہے

۱۳ـ حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ ثَنَا شُعَيْبٌ قَالَ ثَنَا أَبُو الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ

ہم سے بیان کیا ابوالیمان نے، کہا ہم کو خبر دی شعیب نے، کہا ہم سے بیان کیا ابوالزناد نے، انھوں نے اعرج سے، انھوں نے

أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ

ابوہریرہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اس (خدا) کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے

افضل رہوں تو کیونکر پھر ہر ایک کے لئے چاہے گا کہ سب افضل ہو جائیں، اور یہ اجتماع کیونکر ممکن ہے، واعظ چاہے کہ سب واعظ ہو جائیں، درویش چاہے کہ سب تسبیح لے کر بیٹھ جائیں، تو یہ حماقت ہوگی، مطلب وہی ہے کہ جو دوسرے کے حالات کے موافق ہو اس کے لئے اسے بہتر سمجھے، اور اب یہ مطلب فطرت کے مناسب ہوگا، پہلے معنی میں اور اس میں کچھ تھوڑا سا فرق ہے، پہلے معنی کا مطلب یہ ہے کہ میں معاملہ کی جو امید دوسروں سے رکھوں، وہی معاملہ میں اس کے ساتھ کروں، مثلاً چاہوں کہ وہ میرے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آئے تو مجھے بھی چاہیے کہ میں اس سے حسنِ اخلاق سے پیش آؤں، اس کی تائید میں ابن کثیر کی ایک حدیث ہے کہ ایک شخص دربار نبوی میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں اس شرط سے ایمان لاتا ہوں کہ مجھے زنا کی اجازت دی جائے، یہ سن کر صحابہ کے چہرے متغیر ہوگئے اور انھوں نے اسے ڈانٹا، مگر آپ حکیم تھے، آپ نے صحابہ کو روکا اور اسے قریب بلایا اور فرمایا کہ کیا تو پسند کرتا ہے کہ لوگ تیری ماں کے ساتھ ایسا کام کریں، یا تیری بیٹی یا تیری پھوپھی وغیرہ کے ساتھ یہ فعل کریں؟ کہا ہرگز نہیں! آپ نے فرمایا کہ جس سے یہ کام تو کرنا چاہے گا، وہ بھی کسی کی ماں کسی کی بیٹی، کسی کی پھوپھی وغیرہ ہوگی! سبحان اللہ! اس خوبی سے سمجھایا کہ اس کی سمجھ میں آگیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ اے اللہ اس کی آنکھ اور فرج کو بیجا شہوت سے محفوظ فرما، لکھا ہے کہ وہ مسلمان ہوگیا اور پھر کبھی کسی کی طرف غلط طور پر آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، اس سے زنا کی حرمت کی ایک حکمت بھی معلوم ہوگئی کہ اگر فطرت اجازت دیتی تو اپنی ماں بہن وغیرہ کے لئے کیوں نہیں پسند کرتا، دیکھو اگر کوئی ماں بہن کی گالی دیتا ہے تو کیا حالت ہوتی ہے، حالانکہ صرف زبانی الفاظ ہیں، فعل کا تحقق نہیں ہے، تو جب اس پر اس قدر ناراضگی ہے پھر زنا تو اس سے بڑھ کر ہے، اب یحبّ لاخیہ کے معنی واضح ہوگئے کہ جس طرح دوسرے سے چاہے اسی طرح دوسرے کے ساتھ بھی کرے۔

باب حُبّ الرسُول صلی اللہ علیہ وسلم من الایمان

قولہ حبّ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، محبت رسول ہر چیز سے زیادہ ہونی چاہیے، اس میں کلام ہے کہ کون سی محبت مراد ہے، بظاہر یہ اشکال ہوا ہوگا کہ اولاد کی محبت فطری ہے اور حضور کی محبت عقلی ہے تو حب طبعی سے کیونکر بڑھ جائے گی؟ اس لئے

لَا یُؤمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ ۔

تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوتا جب تک اس کو میری محبت اپنے باپ اور اولاد سے زیادہ نہ ہو ۔

علامہ بیضاوی وغیرہ نے اس سے حب عقلی مراد لی، یعنی عقلی محبت سب سے زائد ہونی چاہئے، خواہ طبعی محبت دوسرے سے زائد ہو، مگر اس تاویل سے کلام وزن دار نہ رہا، خصوصاً مثال سے تو کلام بالکل ہلکا ہوگیا، مثال یہ دی جاتی ہے کہ کڑوی دوا کا پینا طبعاً مکروہ ہے، مگر عقلاً چونکہ اس سے تندرستی حاصل ہوتی ہے اس لئے اسے پیتا ہے، حالانکہ کوئی دوا کو محبوب نہیں رکھتا مگر مجبوراً اسے اختیار کرتا ہے ۔ تو کیا یہ مطلب ہے کہ حضورؐ سے ایسی ہی محبت ہو جیسی دوا سے ؟ نہیں ! ہرگز نہیں !! بلکہ یہاں حب ایمانی مراد ہے، مراد یہ ہے کہ حب ایمانی جب تک غالب نہ ہو جائے اس وقت تک کامل مومن کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا، بیضاوی کی تقریر ابتدا کے لحاظ سے تو ٹھیک ہے کہ ابتدا بیشک حب عقلی سے ہوتی ہے مگر بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہونچ جاتی ہے کہ اولاد و والدین کی محبت چھوٹ جاتی ہے، جیساکہ صحابۂ کرامؓ کی ہجرت کا واقعہ اس پر شاہد ہے کہ حب نبویؐ سب پر غالب ہوگئی اور ساری محبتیں مغلوب ہوگئیں اور سب کو چھوڑ چھاڑ کر حضورؐ کے قدموں میں پہونچ گئے ۔

عبداللہ ابن زید رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی اس محبت کا ایک نمونہ ہے، وہ اپنے کسی کھیت یا باغ میں تھے، وہیں انھیں وفات نبویؐ کی خبر پہونچی، یہ خبر سن کر انھوں نے فوراً دعا مانگی کہ یا اللہ ! میری بینائی سلب کرلے، میں اپنی اس آنکھ سے اپنے حبیبؐ کے بعد کسی اور کو دیکھنا نہیں چاہتا، ان کی یہ دعا مقبول ہوگئی اور بینائی جاتی رہی ۔ کیا اس محبت کے بارے میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ محبت ویسی ہی تھی جیسی دوا سے، استغفر اللہ !

حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ نے اسے حب عشقی کہا ہے، مگر میں عشقی نہیں کہتا، کیونکہ یہ نام قرآن وحدیث سے مستفاد نہیں ہوتا، ایسے مواقع پر قرآن وحدیث میں یہ لفظ مستعمل نہیں، میں اسے حب ایمانی سے تعبیر کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ حب ایمانی اتنی ہونی چاہئے کہ حب طبعی سے بڑھ جائے، صحابہؓ میں یہی حب ایمانی تھی جو حب طبعی پر غالب تھی، اس کے بہت سے شواہد ملتے ہیں

ایک انصاری عورت کا مشہور واقعہ ہے کہ غزوۂ احد میں ان کے باپ، بھائی اور شوہر شریک ہوئے تھے اور وہ ان میں سے ہر ایک کی خیریت دریافت کر رہی تھیں، لوگوں نے بتایا کہ وہ سب شہید ہوگئے، اس کے بعد انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خیریت پوچھی، جواب ملا کہ آپؐ بحمد اللہ محفوظ ہیں، کہنے لگیں مجھے دکھلادو، جوں ہی دیدار سے مشرف ہوئیں بولیں : کُلُّ مُصِیْبَۃٍ بَعْدَکَ جَلَلٌ (ای حقیر) حضور آپؐ کے ہوتے ہر مصیبت نہایت ہلکی ہے ۔ تو کیا باپ، شوہر اور بھائی سے حب طبعی نہ تھی ؟

۱۴ حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ ثَنَا ابْنُ عُلَيَّةَ عَنْ عَبْدِ الْعَزِيزِ

ہم سے بیان کیا یعقوب ابن ابراہیم نے، کہا ہم سے بیان کیا ابن علیہ نے، انھوں نے عبدالعزیز ابن صہیب سے

بْنِ صُهَيْبٍ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ح وَحَدَّثَنَا آدَمُ بْنُ

انھوں نے انس سے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ دوسری سند! اور ہم سے بیان کیا آدم ابن ابی ایاس نے، کہا ہم سے

أَبِي إِيَاسٍ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ

بیان کیا شعبہ نے، انھوں نے قتادہ سے، انھوں نے انس سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص اس وقت

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ

تک (پورا) مومن نہیں ہوتا جب تک اس کو میری محبت اپنے باپ اور اپنی اولاد سب لوگوں سے

وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ

زیادہ نہ ہو۔

ضرور تھی مگر حب طبعی پر حب ایمانی غالب تھی۔

ابن اثیر نے کامل میں، عبداللہ ابن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں یہ امیر لشکر بن کر رومیوں کے مقابلہ میں لڑنے کے لئے گئے، اتفاقاً مغلوب ہوکر قید ہوگئے، بادشاہ نے ان سے کہا: ہم تمھارے مرتبہ سے واقف ہیں، تم اگر ہماری بات مان لو اور اپنا دین چھوڑ کر عیسائی مذہب قبول کرلو تو نہ صرف یہ کہ ہم تمھیں چھوڑ دیں گے بلکہ تم کو اچھا عہدہ دیں گے اور شاہی خاندان میں شادی بھی کردیں گے وغیرہ، حضرت عبداللہ ابن حذافہ رضی اللہ عنہ نے حقارت کے ساتھ یہ پیشکش ٹھکرادی تو انھیں مع ساتھیوں کے قید کردیا گیا اور کھانا پانی بند کردیا گیا حتی کہ جان پر بن آئی اور مخمصہ کی حالت کو پہونچ گئے تو خنزیر کا گوشت اور شراب پیش کی گئی، فرمایا ہر چند کہ اس وقت مخمصہ کی حالت ہے اور ایسی حالت میں شریعت جان بچانے کے لئے اس کی اجازت دیتی ہے، مگر میری غیرت ایمانی اسے قبول نہیں کرتی، میں اسے نہ کھاؤں گا، صاف انکار کردیا اور سبھوں نے انکار کردیا، پھر اس نے یہ تدبیر اختیار کی کہ ایک بڑے کڑھاؤ میں تیل گرم کرایا اور ان کے سامنے ایک مسلمان مجاہد کو اس میں ڈلوا دیا، ذرا دیر میں وہ جل کر کباب ہوگئے (اللہ کی ہزار ہا رحمتیں ان پر) پھر ان کی طرف مخاطب ہوکر بولا: تمھارے ساتھ بھی یہی معاملہ کرنے والا ہوں، مگر ایک بار اور موقع دیتا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ میری بات مان لو، اس کے بعد بھی انھوں نے انکار ہی میں جواب دیا، تب اس نے جل کر حکم دیا کہ ان کو بھی اس کڑھاؤ میں ڈال دو، جب لوگ ان کو لے کر چلے تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے، بادشاہ کو اطلاع دی گئی کہ وہ رو رہے ہیں، حکم ہوا کہ لوٹا لاؤ، لائے گئے تو بولا: شاید اب

عقل آگئی، موت نے ہوش ٹھیک کر دئے، حذافہ یہ سن کر ہنسے اور فرمایا! میرے آنسوؤں سے تجھے دھوکا لگا ہے! خدا کی قسم میں موت کے ڈر سے نہیں رو رہا ہوں بلکہ اس وقت دل میں یہ حسرت اور تمنا پیدا ہوئی کہ افسوس میرے پاس صرف ایک جان ہے جو اس وقت پیش کر رہا ہوں، کاش! میرے پاس ہزار جانیں ہوتیں تو انھیں بھی اسی طرح اللہ کی راہ میں قربان کردیتا، بس یہ تمنا آنسو بن کر ٹپک پڑی اور تجھ کو خیال ہوا کہ میں موت سے ڈر گیا، بادشاہ اس جذبۂ حق سے مرعوب ہوگیا اور کہنے لگا کہ میں تجھے چھوڑ دونگا بشرطیکہ تم میری پیشانی کو ایک بوسہ دے دو، سوچ کر بولے: تنہا مجھے چھوڑ دیگا یا میرے سب ساتھیوں کو؟ جواب دیا سب کو، فرمایا: منظور ہے، بادشاہ نے دربار سجایا اور انھوں نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور سب کو چھڑا لائے ۔ کیا فہم تھی صحابہؓ کی، سبحان اللہ! جہاں صرف اپنی جان کی حفاظت کا سوال تھا تو انکار کردیا اور یہاں چونکہ تمام جماعت کی جان بچ رہی تھی، اس لئے گوارہ کرلیا، جب یہ مدینہ پہونچے اور امیر المومنین کو واقعہ کی اطلاع ملی تو دربار کیا اور فرمایا کہ اس جانباز کا حق ہے کہ آج ہر شخص اس کی پیشانی کو بوسہ دے چنانچہ سب مسلمانوں نے بوسہ دیا اور خود انھوں نے بھی بوسہ دیا۔

ان شواہد نے بتایا کہ اس حدیث میں وہ مرتبہ مراد نہیں ہے جو بیضاوی نے بیان کیا ہے، بلکہ آخری مرتبہ مراد ہے، جہاں حب ایمانی حب طبعی پر غالب آجاتی ہے، اور یہی مطلوب ہے، شاہد اس پر یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور سے عرض کیا: يَا رَسُولَ اللهِ لَاَنْتَ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ اِلَّا نَفْسِي (یا رسول اللہ میں ہر چیز سے زیادہ آپ کو محبوب رکھتا ہوں مگر اپنے نفس سے زیادہ نہیں) کیا یہ حب عقلی کے متعلق تھا؟ وہ تو ایمان کے لئے لازم ہے، وہ نہ ہو تو ایمان کہاں؟ پھر کیا مراد تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی، وہ کس محبت کی نفی کر رہے ہیں؟ بالکل ظاہر ہے کہ محبت طبعی کی نفی کر رہے ہیں، اس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْكَ مِنْ نَفْسِكَ فَقَالَ لَهٗ عُمَرُ فَاِنَّهُ الْاٰنَ وَاللهِ لَاَنْتَ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ نَفْسِي، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْاٰنَ يَا عُمَرُ[1] (نہیں، قسم اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، جب تک میں تمہارے نفس سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں، حضرت عمرؓ نے عرض کیا، بے شک، اب خدا کی قسم آپ میرے نفس سے زیادہ محبوب ہیں، حضورؐ نے ارشاد فرمایا: ہاں! اے عمر اب صحیح بات ہوئی) کھلی بات ہے کہ یہاں مطالبہ اسی محبت کا ہے جو حب طبعی پر غالب آجائے اور اسی کو میں نے حب ایمانی کہا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ عرض کرتے ہیں کہ اب مجھ میں وہ محبت آگئی۔

علماء نے لکھا ہے کہ عمر فاروقؓ میں وہ محبت تھی تو پہلے سے مگر اس طرف توجہ نہ تھی، ذہول تھا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

(۱) بخاری شریف (ص ۹۸۱) حضرت عمرؓ کے جواب میں یہی فرمایا گیا تھا، جامع تقریر نے سہواً دوسرے الفاظ لکھ دئے تھے (مرتب)

باب حلاوۃ الایمان

ایمان کا مزہ

۱۵ ـ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنّٰی قَالَ ثَنَا عَبْدُ الْوَھَّابِ الثَّقَفِیُّ قَالَ

ہم سے بیان کیا محمد بن مثنی نے، کہا ہم سے بیان کیا عبد الوہاب ثقفی نے، کہا ہم سے بیان کیا

ثَنَا اَیُّوْبُ عَنْ اَبِیْ قِلَابَۃَ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثٌ

ایوب نے، انھوں نے ابوقلابہ سے، انھوں نے انس سے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے، فرمایا: جس میں

مَنْ کُنَّ فِیْہِ وَجَدَ حَلَاوَۃَ الْاِیْمَانِ اَنْ یَّکُوْنَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَحَبَّ اِلَیْہِ

تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کا مزہ پائے گا، ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت اس کو سب سے زیادہ ہو،

مِمَّا سِوَاھُمَا، وَاَنْ یُّحِبَّ الْمَرْءَ لَا یُحِبُّہٗ اِلَّا لِلّٰہِ، وَاَنْ یَّکْرَہَ اَنْ یَّعُوْدَ فِی الْکُفْرِ

دوسرے یہ کہ فقط اللہ کے لئے کسی سے دوستی رکھے، تیسرے یہ کہ دوبارہ کافر بننا اس کو اتنا ناگوار ہو

کَمَا یَکْرَہُ اَنْ یُّقْذَفَ فِی النَّارِ۔

جیسے آگ میں جھونکا جانا۔

انھیں متوجہ فرمایا اور سنادیا کہ اتنی محبت کافی نہیں، تب انھوں نے توجہ کی اور اپنے نفس کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ آپ کی وہ محبت جو ساری محبتوں پر غالب ہو، اصلاً میرے اندر موجود ہے، مگر میں نے خیال نہیں کیا تھا اور اب وہ مستحضر ہوگئی، یہ جو فرمایا کہ اب وہ محبت آگئی، اس کا مطلب یہی ہے کہ استحضار ہوگیا فرمایا: ہاں ہاں اب اے عمر! اب ایمان بھی کامل ہوگیا۔ تو یہ مرتبہ آخری ہے، نہ ابتدائی، ابتدائی وہ ہے جو بیضاوی نے کہا، خود قرآن میں ہے قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَاۗؤُکُمْ وَاَبْنَاۗؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ ۣاقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَاۤ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ ۭ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ [1] (کہہ دیجئے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی، اور بیویاں، اور کنبے اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ سوداگری جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور وہ حویلیاں جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ اور اس کے رسول سے اور لڑنے سے اس کی راہ میں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے، اور اللہ نافرمانوں کو راہ نہیں دکھلاتا۔) ــــ حدیث مذکور اسی آیت قرآنی کا اقتباس ہے۔

---

(۱) توبہ : ۲۴

بَابٌ عَلَامَةُ الْاِيْمَانِ حُبُّ الْاَنْصَارِ

انصار سے محبت رکھنا ایمان کی نشانی ہے

۱۶ ۔ حَدَّثَنَا اَبُو الْوَلِيْدِ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ قَالَ اَخْبَرَنِيْ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ

ہم سے بیان کیا ابوالولید نے، کہا ہم سے بیان کیا شعبہ نے، کہا مجھ کو خبر دی عبداللہ ابن جبر نے، کہا میں نے انس

بْنِ جَبْرٍ قَالَ سَمِعْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اٰيَةُ الْاِيْمَانِ

ابن مالک سے سنا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے، فرمایا: ایمان کی نشانی انصار سے محبت رکھنا ہے، اور نفاق کی

حُبُّ الْاَنْصَارِ وَاٰيَةُ النِّفَاقِ بُغْضُ الْاَنْصَارِ

نشانی انصار سے بیر رکھنا ہے۔

بَابُ حَلَاوَةِ الْاِيْمَانِ

۱۵۔ قولہ حلاوۃ الایمان، درحقیقت یہ مستقل چیز نہیں بلکہ حب رسولؐ کا ثمرہ ہے، اس کو ظاہر کرتے ہیں کہ حلاوت ایمان اس وقت ملتی ہے جب حب رسول ہو، حلاوت لغت میں شیرینی اور مٹھاس کو کہتے ہیں، تو ایمان کی مٹھاس اور لذت اس وقت نصیب ہوتی ہے جب یہ تین چیزیں ہوں، وہ مٹھاس اور شیرینی ہے کیا؟ ابن ابی جمرہ جو عارف کامل اور کبار اولیاء اللہ میں سے ہیں فرماتے ہیں (جیساکہ فتح الباری میں نقل کیا ہے) کہ حلاوت معنویہ بھی مراد ہوسکتی ہے اور حسیہ بھی، دونوں ہی احتمال ہیں، معنویہ یہ ہے کہ انشراح صدر ہو، کشادہ دلی ہو جیسے میٹھی چیز کھاکر دل خوش ہوتا ہے اسی طرح اس سے خوشی حاصل ہو، اسی کو امام نوویؒ نے استلذاذ بالطاعات سے تعبیر کیا ہے، یعنی طاعت مزے دار ہوجائے اور مزہ جب آئے گا جب یہ تین چیزیں ہوں، یہ تو ہوئی حلاوت معنوی، مگر عارف ابن ابی جمرہ کہتے ہیں کہ حلاوت حسی راجح ہے اور اسے وہی سمجھے گا جس نے چکھا ہوگا، ہر شخص نہیں سمجھ سکتا، چنانچہ امام غزالی وغیرہ نے اس موقع پر یہ شعر لکھ دیا ہے ؎

اذا لم تر الهلال فسلم ۔ لاناس رأوه بالابصار

جب تمھیں چاند نظر نہ آئے تو ان کی بات مان لو جن لوگوں نے اسے آنکھوں سے دیکھا ہے

تو چکھنے والے جب کہتے ہیں تو ماننا چاہیئے، اسی کو کہا ہے:

ع ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

قولہ ان یکون اللہ ورسولہ الخ یہ پہلی چیز ہے اور میرے نزدیک یہی اصل اصول ہے، اسی پر دوسری چیز متفرع ہے جب اللہ ورسول کی سچی محبت ہوگی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے سے بھی محبت اللہ اور رسول کے واسطے ہوگی، اور اگر غیر اللہ کے لئے ہوگی تو معلوم

ہو گا کہ اللہ اور رسول کی محبت مستولی نہیں ہے، یہی معیار ہے۔

قولہ وان یکرہ ان یعود الی الکفر الخ یعنی جس طرح آگ میں ڈالا جانا برداشت سے باہر ہے' اسی طرح عود الی الکفر (دوبارہ کفر اختیار کرنے) سے بھی بیزار رہے' بعض روایات میں ہے کہ اس سے بھی زیادہ مکروہ سمجھیگا' چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ سختی کی حالت میں بھی احد احد ہی کہتے تھے' یہ بھی اسی محبت کا نتیجہ اور اللہ ورسول کی محبت کے غلبہ کا اثر ہے۔

لفظ عود شبہہ پیدا کرتا ہے کہ جو شخص غیر مسلم ہو پھر مسلمان ہو جائے تو عود الی الکفر' یعنی کفر کی طرف لوٹنا اسے ناپسند ہو' یہ لازم اور ضروری نہیں، چونکہ نبی علیہ السلام کے زمانہ میں کثرت سے یہی صورت تھی اس لئے لفظ عود لایا گیا' اور اگر عموم رکھا جائے تو عود کے معنی صیرورۃ[1] کے ہوں گے۔

باب علامۃ الایمان حب الانصار

حدیث ۱۶ قولہ اٰیۃ الایمان حب الانصار واٰیۃ النفاق بغض الانصار' یہاں انصار کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کر کے مہاجرین کو توجہ دلائی ہے کہ ان کے حقوق کا پورا پورا لحاظ رکھنا کیونکہ ان کا رتبہ اللہ کے ہاں بہت بلند ہے' قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی: وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ط[2] (اور وہ لوگ جو دار الاسلام میں اور ایمان میں ان کے قبل سے قرار پکڑے ہوئے ہیں جو ان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے اس سے محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو جو کچھ ملتا ہے اس سے اپنے دلوں میں کوئی رشک نہیں پاتے اور اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ ان پر فاقہ ہو) اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کا ذکر خاص طور سے کیا۔ اور انصار کو بھی رسول علیہ السلام سے ہمیشہ گہرا تعلق رہا' چنانچہ فتنہ کے زمانہ میں جب کہ مہاجرین کے دو حصے ہو گئے تھے' ایک حضرت علیؓ کے ساتھ تھا، دوسرا اختلاف، مگر انصار کل کے کل حضرت علیؓ کے ساتھ تھے' یہ اسی تعلق کا ثمرہ تھا۔

اٰیۃ کے معنی علامت ونشانی کے ہیں، عنوان انصار کا رکھا، خاص کسی کا نام نہیں لیا، اس طرح بتادیا کہ انصار من حیث الانصار سے محبت رکھنا ایمان کی نشانی ہے اور واقعہ یہی ہے کہ من حیث الانصار کوئی بھی ہرگز ہرگز انصار سے بغض نہیں رکھ سکتا' رہی بعد میں آپس کی ناچاقی تو وہ بغض کی راہ سے نہ تھی بلکہ آپس میں معاشرت میں ہو جاتی تھی' جیسے دو بھائیوں سے رہن سہن میں ہو جاتی ہے' تو لڑائی جھگڑا اور چیز ہے

---

(۱) (۲) حشر : ۹

باب ۱۱

۱۷۔ حَدَّثَنَا اَبُو الْیَمَانِ قَالَ حَدَّثَنَا شُعَیْبٌ عَنِ الزُّھْرِیِّ قَالَ

ہم سے بیان کیا ابوالیمان نے، کہا ہم سے بیان کیا شعیب نے، انھوں نے زہری سے، کہا ہم کو خبر دی

اَنَا اَبُو اِدْرِیْسَ عَائِذُ اللّٰہِ بْنُ عَبْدِ اللّٰہِ اَنَّ عُبَادَۃَ ابْنَ الصَّامِتِ وَکَانَ شَھِدَ بَدْرًا

ابوادریس عائذاللہ ابن عبداللہ نے، ان سے (بیان کیا) عُبادۃ ابن صامت نے، اور یہ عبادہ وہ تھے جو بدر میں شریک تھے

وَھُوَ اَحَدُ النُّقَبَاءِ لَیْلَۃَ الْعَقَبَۃِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ وَحَوْلَہٗ

اور عقبہ کی رات میں وہ بھی ایک نقیب تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (صحابہ سے) فرمایا ان کی ایک جماعت آپ کے

عِصَابَۃٌ مِّنْ اَصْحَابِہٖ بَایِعُوْنِیْ عَلٰی اَنْ لَّا تُشْرِکُوْا بِاللّٰہِ شَیْئًا وَّلَا تَسْرِقُوْا وَلَا تَزْنُوْا وَ

گرداگرد تھی: تم مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ اللہ کا کسی کو شریک نہ بناؤگے اور چوری نہ کروگے اور زنا نہ کروگے اور

لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَکُمْ

اپنی اولاد کو نہ ماروگے۔

اور بغض و عداوت اور چیز، دو بھائی آپس میں لڑتے ہیں مگر جب کبھی کسی ایک بھائی پر مصیبت آتی ہے تو سب سے پہلے وہی بھائی تڑپ جاتا ہے اور امداد کرتا ہے، اسی طرح ان صحابہؓ کا معاملہ تھا، وہ کبھی کبھی آپس میں لڑ بھی جاتے تھے مگر جب وقت پڑتا تو محبت اپنا کام کر جاتی اور بڑھ بڑھ کر ایک دوسرے کا ساتھ دیتے، تو لڑنا اور چیز ہے اور محبت شئے دیگر، لڑنے سے محبت نہیں جاتی۔

باب ۱۱

حدیث ۱۷ حدثنا ابوالیمان، عبادہ اس کے راوی ہیں اور ابوادریس عبادہ کی منقبت میں کہتے ہیں کہ وہ اصحاب بدر سے ہیں، نیز یہ کہ نقباء مدینہ سے ہیں، بیعت عقبہ میں شریک تھے (یہ دوسری مرتبہ آئے تھے)۔

نقیب کے معنی چودھری کے ہیں، جمع نُقَبَاء ہے، آپؐ نے بارہ نقیب (افسر) مقرر فرمائے تھے، بارہ کا عدد قرآن سے ماخوذ ہے: وَبَعَثْنَا مِنْھُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا[1]

لیلۃ العقبۃ اس رات کو کہتے ہیں جس رات میں آپؐ نے ان سے بیعت لی تھی۔ عقبۃ ایک گھاٹی کا نام ہے، وہاں مسجد بنی ہوئی ہے جو منیٰ جاتے ہوئے بائیں طرف پڑتی ہے، یہ مسجد عیدگاہ کی طرح تھی۔

---

(۱) مائدہ: ۱۲

. . . .

عِصَابَة کے معنی عینی، قسطلانی وغیرہ نے لکھا ہے کہ دس سے چالیس تک کے عدد پر بولا جاتا ہے، راوی کا مقصد یہ ہے کہ اس وقت مجلس مبارک میں دس سے زیادہ اور چالیس سے کم صحابہؓ تھے، تعداد معین معلوم نہیں۔

قولہ بایعونی، یہ معلوم ہو چکا کہ یہ سب صحابہ تھے اور مسلمان تھے، بعض ان میں سے بدر میں شریک ہو چکے تھے، پھر ان سے بایعونی (مجھے بیعت کرو) فرمانا یا تجدید ایمان کے لئے ہے یا یہ بیعت توبہ ہے، یعنی ان امور سے توبہ کرو، یہیں سے صوفیہ کے ہاں بیعتِ توبہ کا رواج ہوا۔

قولہ لاتشرکوا باللہ شیئاً، حدیث مذکور میں مناہی کا بیان ہے، شرک نہ کرنا، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور افعال میں کسی کو خدا کے برابر نہ سمجھنا، اسی کو دوسری جگہ ایک صحابی کے سوال پر اَیُّ الذنبِ اَکبرُ عندَ اللہِ (اللہ کے نزدیک کون سا گناہ سب سے بڑا ہے) کے جواب میں فرمایا: ان تدعو اللہ ندّاً وھو خلقک، یعنی سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ جس خدا نے تجھ کو پیدا کیا اس کے برابر کسی اور کو بنائے۔ اہلِ نار اپنے معبودوں سے جہنم میں کہیں گے: تَاللہِ اِن کُنَّا لَفِی ضَلَالٍ مُّبِینٍ ہ اِذ نُسَوِّیکُم بِرَبِّ العٰلَمِینَ[1]، (خدا کی قسم ہم کھلی گمراہی میں تھے کہ تم کو رب العالمین کے برابر قرار دیتے تھے) یہی ہے وہ شرک جس کی یہاں ممانعت کی جا رہی ہے کہ کسی بات میں بھی کسی کو رب العالمین کے برابر نہ سمجھنا۔

قولہ ولاتسرقوا، چوری نہ کرنا، یہ بھی ایک گناہ کبیرہ ہے، قرآن پاک میں حکم دیا کہ چور کے ہاتھ کاٹ دو خواہ مرد ہو یا عورت۔

قولہ ولاتزنوا، یہ تیسری بات ممانعت کی بیان فرمائی، زنا نہ کرنا، یہ بھی ایک گناہ کبیرہ ہے، قرآن پاک میں اس کی سزا سو کوڑے قرار دی گئی جب کہ یہ غیر شادی شدہ ہوں، اور شادی شدہ کے لئے حدیث پاک میں رجم کی سزا تجویز فرمائی گئی، نبی علیہ السلام نے اسی پر عمل فرمایا۔

قولہ ولاتقتلوا اولادکم، چوتھی بات بیان فرمائی کہ اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا، یہ بھی گناہ کبیرہ ہے، عرب میں بعض لوگ عار کی وجہ سے صرف لڑکی کو قتل کرتے تھے، قرآن پاک میں فرمایا: وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُھُم بِالاُنثٰی ظَلَّ وَجھُہٗ مُسوَدًّا وَّھُوَ کَظِیمٌ ہ یَتَوَارٰی مِنَ القَومِ مِن سُوْءِ مَا بُشِّرَ بِہٖ اَیُمسِکُہٗ عَلٰی ھُونٍ اَم یَدُسُّہٗ فِی التُّرَابِ[2] (جب ان میں کسی کو لڑکی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا منہ بگڑ جاتا ہے اور وہ گھٹنے لگتا ہے، قوم سے اسی خبر بد کی وجہ سے چھپا چھپا پھرتا ہے

---

(۱) شعراء: ۹۷۔ ۹۸ (۲) نحل: ۵۸۔ ۵۹

وَلَا تَأْتُوا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُونَهُ بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ وَلَا تَعْصُوا فِي مَعْرُوفٍ فَمَنْ

اور اپنے ہاتھ اور پاؤں کے سامنے (جان بوجھ کر) کوئی بہتان بنا کر نہیں اٹھاؤ گے، اور نیک کاموں میں نافرمانی نہ کرو گے، پھر جو کوئی

وَفَّى مِنْكُمْ فَأَجْرُهُ عَلَى اللهِ وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوقِبَ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ

تم میں یہ اقرار پورا کرے اس کا ثواب اللہ پر ہے، اور جو کوئی ان (گناہوں) میں سے کچھ کر بیٹھے اس کو دنیا میں اس کی سزا مل جائیگی

لَهُ وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللهُ فَهُوَ إِلَى اللهِ إِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ

(حد پڑ جائے) تو اس کا گناہ اتر جائے گا، اور جو کوئی ان (گناہوں) میں سے کچھ کر بیٹھے پھر اللہ (دنیا میں) اس کو چھپائے رکھے تو

وَإِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ ، فَبَايَعْنَاهُ عَلَى ذٰلِكَ ،

وہ اللہ کے حوالے ہے، اگر چاہے (آخرت میں بھی) اس کو معاف کر دے اور اگر چاہے عذاب کرے، پھر ہم نے ان باتوں پر آپ سے بیعت کر لی.

اور سوچتا ہے کہ ذلت برداشت کر کے اسے زندہ رہنے دے یا اسے مٹی کے نیچے دفن کر دے)

اللہ تعالیٰ نے اس فعل کی مذمت کی اور نبی علیہ السلام نے توبہ کرائی ـــــ اور بعض لوگ اپنی اولاد کو لڑکی ہو یا لڑکا قتل کر دیتے تھے، یہ قتل اولاد افلاس کے ڈر سے ہوتا تھا کہ انھیں کہاں سے کھلائیں گے، قرآن میں اس موقع پر ایک جگہ مِنْ إِمْلَاقٍ اور دوسری جگہ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ فرمایا، اسی طرح ایک جگہ فرمایا: نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ، پوری آیت یوں ہے: لَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ۔[1] (اپنی اولاد کو مفلسی سے مار نہ ڈالو، ہم رزق دیتے ہیں تم کو اور ان کو) دوسری جگہ فرمایا: لَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ[2] (اور نہ مار ڈالو اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے، ہم روزی دیتے ہیں ان کو اور تم کو) دونوں آیتوں کا مطلب بظاہر ایک ہے مگر دونوں میں لطیف فرق ہے، علامہ ابن کثیر نے بیان کیا ہے اور در حقیقت یہ تفسیر کی جان ہے، کہتے ہیں: ایک جگہ نَحْنُ نَرْزُقُ کو مِنْ إِمْلَاقٍ پر متفرع کیا اور دوسری جگہ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ پر، اور یہ فرق اس لئے ہے کہ اولاد کو قتل کرنے والے دو قسم کے تھے، ایک وہ جو فی الحال مفلس تھے، یہ کہتے تھے ہمارے ہی کھانے کو نہیں ہے تو اولاد کو کہاں سے کھلائیں گے، دوسرے وہ تھے جو فی الحال تو مفلس نہ تھے، ان کے پاس ان کے کھانے بھر کو تھا مگر آئندہ کا خوف تھا کہ ابھی تو ہے اولاد ہو جائے گی تو پھر ہم مفلس ہو جائیں گے، ان کے واسطے کہاں سے لائیں گے، اللہ کا کلام عجیب و غریب ہے، اس کا کوئی گوشہ بھی دقائق سے خالی نہیں، یہاں دونوں گروہوں کو الگ الگ سمجھایا، جو فی الحال مفلس تھے انھیں اپنی فکر تھی تو ایک مقام پر انھیں مقدم

---

(۱) انعام : ۱۵۱ . (۲) اسراء : ۳۱

. . . .

رکھا، فرمایا: نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ، ہم تم کو دیں گے گھبراتے کیوں ہو، اور ان کو بھی دیں گے جو پیدا ہوں گے وَاِيَّاهُمۡ، لہٰذا بے فکر رہو، انھیں قتل مت کرو، رازق ہم ہیں، تم نہیں ہو، اور جن کو آئندہ کا ڈر تھا کہ فی الحال تو ہے آئندہ کیا ہوگا؟ تو دوسرے مقام پر انھیں آنے والوں کی طرف سے پہلے مطمئن کیا کہ ان کو ہم دیں گے، ہم رازق ہیں تم بے فکر رہو، فرمایا: نحن نرزقهم ان کو ہم دیں گے تم کیوں گھبراتے ہو، پھر بعد میں وایاکم فرماکر آگاہ کیا کہ اب تک تمھیں جو ملا ہوا ہے وہ بھی تو ہمارا ہی دیا ہوا ہے، جس نے تم کو فی الحال دے رکھا ہے وہی آئندہ بھی دے گا۔ سبحان اللہ! کیسا عجیب کلام ہے۔

قولہ بین ایدیکم وارجلکم کنایہ ہے عمداً و جہاراً طوفان اٹھانے سے، جیسے ہمارے یہاں دن دہاڑے اور کھلے بندوں کہتے ہیں۔

قولہ فی معروف، یعنی معقول بات میں، یہ قید اس لئے لگائی کہ قرآن نے بھی یہ قید لگائی ہے (یہ حدیث قرآن پاک کی آیت کا اقتباس ہے، سورۂ ممتحنہ میں فرمایا: يَآاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الۡمُؤۡمِنٰتُ يُبَايِعۡنَكَ عَلٰٓى اَنۡ لَّا يُشۡرِكۡنَ بِاللّٰهِ شَيۡـًٔا وَّلَا يَسۡرِقۡنَ وَلَا يَزۡنِيۡنَ وَلَا يَقۡتُلۡنَ اَوۡلَادَهُنَّ وَلَا يَاۡتِيۡنَ بِبُهۡتَانٍ يَّفۡتَرِيۡنَهٗ بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِنَّ وَاَرۡجُلِهِنَّ وَ لَا يَعۡصِيۡنَكَ فِيۡ مَعۡرُوۡفٍ فَبَايِعۡهُنَّ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝[1])

بیضاوی نے لکھا ہے کہ طاعت معروف ہی میں ہوتی ہے، غیر معروف (منکر) میں کسی کی طاعت نہیں، یہ بات مسلم ہے کہ نبی معروف ہی کا حکم دیتے ہیں مگر یہاں متنبہ کردیا کہ طاعت کسی کی بھی ہو صرف معروف ہی میں ہے، منکر میں نہیں، (یہیں سے یہ کلیہ بنا: لَاطَاعَةَ لِمَخۡلُوۡقٍ فِيۡ مَعۡصِيَةِ الۡخَالِقِ)

قولہ فَاَجۡرُهٗ عَلَى اللّٰهِ یعنی اس کا اجر ثابت ہوگیا، اللہ کے وعدہ کے موافق۔

قولہ وَمَنۡ اَصَابَ الخ مبتلی کے دو حال ہیں، یا تو دنیا میں سزا مل گئی، تو یہ عقوبت کفارہ گناہ بن گئی اور حدود وغیرہ کفارہ ہوں گے، بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، یا دنیا میں اللہ نے پردہ پوشی فرمائی اور سزا نہ ملی تو وہ تحت المشیئۃ ہے، چاہے سزا دے چاہے معاف فرمادے، اس سے معلوم ہوا کہ کبائر مفوض الی اللہ ہیں کما قالت المعتزلۃ والخوارج، اگر کبائر معاف نہ ہوتے تو پھر قرآن کے خلاف ہوگا کیونکہ اس نے غیر مشرک کو تحت المشیئۃ رکھا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ[2]

---

(۱) ممتحنہ : ۱۲ (۲) نساء : ۴۸

. . . .

(اللہ شرک کو نہ بخشے گا اور شرک کے سوا نیچے کے گناہ بخشتا ہے جس کو چاہے)

یہاں ترجمہ کچھ نہیں رکھا صرف حدیث بیان کردی، مقصود کچھ نہیں بتلایا، بعض شراح بخاری نے یہ کہا کہ ایسے وقت میں یہ باب باب سابق کا تتمہ اور اس کی ایک فصل ہوگا، تکملہ اس طرح ہوگا کہ پہلے امور ایمان میں سے چند امور لائے اور یہ بھی امور ایمان میں سے ہے اس لئے تکملۃً اس کو بھی بیان کر دیا، استاد (حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ) فرماتے تھے کہ بخاری کبھی کبھی قصداً ترجمہ ترک کر دیتے ہیں اور مقصود تشحیذ اذہان[1] ہوتا ہے کہ اللہ نے تمہیں توفیق اور فہم دیا ہو تو تم بھی غور کرکے کوئی مسئلہ نکال لو، اپنی سمجھ میں یہ آتا ہے کہ بخاری یہاں معتزلہ اور خوارج کا رد کر رہے ہیں کہ امور ایمان میں سے جو اجزاء بیان کئے گئے ہیں یہ ایسے نہیں ہیں کہ بعض کے انتفاء سے ایمان کا انتفاء ہو جائے یہاں اِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ فرمانے کا منشا یہی ہے کہ ایمان باقی ہے اور یہ مجرم ہے، خدا چاہے تو جرم کی سزا دے اور اگر چاہے تو بغیر سزا دئے ہی بخش دے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب مجرم کا ایمان تسلیم ہو ورنہ غیر مومن کی بخشایش کیسی؟ تو در اصل یہ رد ہے معتزلہ اور خوارج کا۔

یہاں ایک مسئلہ ہے "فتح الباری" میں اس کے متعلق تقریباً چار صفحے لکھے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ حدود زواجر ہیں یا سواتر و کفارات سواتر کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدود ڈھک دیتی ہیں اور کفارہ بن جاتی ہیں، زواجر کا مطلب یہ ہے کہ حدود محض آئندہ کے روکنے کے لئے ہیں، دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ حدود پاک کر دیتے ہیں یا صرف روکنے کے لئے ہیں؟ احناف کہتے ہیں کہ زواجر ہیں اور جمہور سواتر کہتے ہیں جمہور میں سے شوافع اس حدیث کو مستدل بناتے ہیں کہ سزا کفارہ ہے، تو یہ حدیث حنفیہ کے خلاف ہوئی، یہ بات یاد رہے کہ ائمہ ثلاثہ (امام اعظم اور صاحبین) سے کوئی روایت نہیں ملی، فقہاء ضرور نقل کرتے ہیں کہ احناف کا یہ مسلک ہے، مگر یہ کہیں نہیں دیکھا کہ ابو حنیفہ اور صاحبین کا یہ مسلک ہے، حاصل یہ کہ ایک حدیث تو یہ باب کی ہے جو مستدل شوافع ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدود کفارہ بن جاتے ہیں، دوسری حدیث ابو ہریرہ کی ہے جو مستدرک میں ہے، حافظ نے بھی اس کو صحیح علی شرط الشیخین کہا ہے، اس کا مضمون یہ ہے: لَا اَدْرِی الْحُدُوْدُ كَفَّارَاتٌ لِاَهْلِهَا اَمْ لَا[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو حدود کے کفارات بننے کا علم نہ تھا، احناف کہتے ہیں کہ جب خود حضور نفی فرما رہے ہیں تو ہم کیسے کہیں کہ کفارات بنتے ہیں، شوافع کو جواب مشکل ہوا تو کہا کہ یہ حدیث عبادہ کی اصل ہے، پہلے علم نہ تھا اس لئے

---

(۱) شحذ کے معنی تیز کرنے کے ہیں، یعنی ذہن کو تیز کرکے اور اس پر زور دے کر مطلب نکالو، (مرتب)

(۲) فتح الباری میں یہی الفاظ ہیں، فضل الباری میں اسی طرح جامع تقریر نے بھی اس سے مختلف الفاظ نقل کئے ہیں (مرتب)

. . . .

لَاَدْرِی فرمایا اور جب علم ہوگیا تو فرمایا: وہ کفارات ہیں، تو لاادری والی حدیث پہلے کی ہے اور یہ بعد کی، وجدان بھی اسی کو قبول کرتا ہے کہ علم کو عدم علم سے موخر رکھا جائے لا بالعکس، احناف نے اس پر یہ اعتراض وارد کیا کہ ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لیلۃ العقبہ کی بیعت کا واقعہ ہے جو انصار سے لی گئی تھی اور یہ مکہ کا قصہ ہے اور ابو ہریرہؓ کی روایت یقیناً اس کے بعد کی ہونی چاہئے، کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ ۷ھ میں ایمان لائے ہیں، تو طبعی اور عقلی ترتیب اگرچہ وہی ہے جو تم نے بیان کی ہے مگر تاریخ بتلاتی ہے کہ واقعہ یوں نہیں ہے، شوافع نے جواب میں کہا کہ اسکی تصریح کہاں ہے کہ یہ بیعت لیلۃ العقبہ کی ہے؟ وہ تو صرف حضرت عبادہ ابن الصامت جو حدیث کے راوی ہیں ان کی تنویہ شان کو بتلانا تھا کہ یہ وہ راوی ہیں جو لیلۃ العقبہ میں شریک تھے، تو ممکن ہے جس کا ذکر ہے وہ بعد کی ہو، اور یہ ثابت ہے کہ ایک بیعت فتح مکہ کے بعد ہوئی ہے اور اس میں بھی حضرت عبادہؓ شریک تھے، اس کا مضمون بھی یہی ہے، تو معلوم ہوا کہ ایک بیعت لیلۃ العقبہ کی ہے، دوسری فتح مکہ کے بعد کی، مگر یہاں بخاری کس کا ذکر کر رہے ہیں اس کی تصریح نہیں، لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ فتح مکہ کے بعد کا واقعہ نقل کر رہے ہیں، اب یہ احتمال تو ہے کہ یہ بعد کا واقعہ ہو اور ابو ہریرہ والی بات پہلے کی ہو، مگر حنفیہ کہتے ہیں کہ سنن نسائی کی اس روایت میں تصریح ہے کہ یہ بیعت لیلۃ العقبہ میں تھی، چنانچہ قسطلانی نے نسائی کی روایت نقل کر کے کہا ہے کہ یہ صریح ہے کہ یہ بیعت لیلۃ العقبہ میں تھی، حنفیہ اس سے اگرچہ مطمئن ہو گئے ہیں مگر سچی بات ہے کہ اب تک مجھے پورے طور پر انشراح نہیں ہوا ہے کہ یہ لیلۃ العقبہ کا ذکر ہے یا بعد کا، کیونکہ مخالفین کے پاس بھی بہت سی روایات ہیں، لہٰذا اسے چھوڑ کر میں کہتا ہوں کہ جو حضرات حدود کو کفارہ قرار دے رہے ہیں وہ یہاں لفظ فعوقب سے استدلال کر رہے ہیں، یعنی سزا دیگئی لفظ حد نہیں ہے بلکہ لفظ عقاب ہے اور ان مراد لینے والوں نے اس عقوبت کو حد پر حمل کر لیا، اب اگر لیلۃ العقبہ ہی میں رکھیں جیسا کہ بعض روایات میں تصریح ہے تو اس عقوبت سے حد مراد ہو ہی نہیں سکتی، کیونکہ حدود مدینہ میں نازل ہوئی ہیں تو اس صورت میں حدود کا کفارات بننا کیسے ثابت ہوگا؟ اسی بنا پر عینی نے کہا کہ یہاں عقوبت سے مراد مطلق سزا ہے نہ کہ حد، کما قال تعالیٰ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا (۱) پس اگر عقوبت سے مطلق سزا اور مصائب وبلایا مراد ہیں تب تو معنی بھی بن جاتے ہیں اور ان کے کفارہ ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہے۔

حد اور دوسری عقوبتوں میں فرق یہ ہے کہ حد میں جرم کی معین سزا ہوتی ہے اور عقوبت میں مبہم اور تکوینی سزائیں ہوتی ہیں جنھیں مصائب وآفات کہا جاتا ہے، تو عینی کہتے ہیں کہ بخاری کی حدیث میں عوقب سے مصائب مراد لیے جائیں اور حدیث کا مضمون یہ ہے کہ

۱۴

(۱) آل عمران : ۱۵۵

. . . .

مصائب وبلایا مومن کے لئے کفارہ بنتے ہیں یعنی جو مبتلا ہوا اور سزا مل گئی تو یہ مصائب وبلایا اس شخص کے حق میں کفارہ بن جائیں گی "فھو کفارۃ لہ" میں لہٗ کی ضمیر کا مرجع مَنْ کی طرف ہے، اب اگر یہ حدیث لیلۃ العقبہ کی مانیں اور عوقب سے مصائب وبلایا مراد لیں تو معنی بھی صحیح ہوگئے اور حدود کے کفارات بننے کے مسئلہ سے اس کا کوئی لگاؤ بھی نہ رہا کیونکہ اس وقت حدود اس میں داخل ہی نہ رہے، مگر کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ عقوبت کو عام رکھا جائے خواہ تشریعی ہوں یا تکوینی، اس عموم میں آنے والی حدود بھی شامل ہیں کیونکہ وہ بھی عقاب میں داخل ہیں، تو مطلب یہ ہوگا کہ مقصود بالذات مطلق عقوبت ہے خواہ حدود کی صورت میں ہو یا غیر حدود کی صورت میں، قرینہ یہ ہے کہ جب احادیث سے یہ ثابت ہے کہ مومن کو کانٹا بھی چبھ جائے تو وہ اس کے لئے کفارہ بنتا ہے، تو اسی کوڑے جیسے حدود شرعیہ تو بطریق اولیٰ کفارہ بنیں گے۔

ایک چیز اور بھی ہے جس سے عموم معلوم ہوتا ہے، یعنی حدود وغیر حدود سب کو شامل ہونا معلوم ہوتا ہے، وہ ہے جملہ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ، "ذٰلِكَ" کا مشار الیہ بظاہر تمام اشیاء ہیں، تمام اشیاء میں شرک بھی ہے، پس اگر مرتد کو قتل کر دیا گیا تو کیا جرم ارتداد معاف ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں! اس کے باب میں تو صراحت ہے کہ وہ مخلد فی النار ہے، لہٰذا اسے یا تو مستثنیٰ کرو یا کوئی اور معنی لو، اکثر نے اسے مستثنیٰ قرار دیا ہے بقیہ جرائم کے حدود کے متعلق حکم ہے کہ کفارہ ہوتے ہیں مگر ان میں سے بھی سرقہ اور زنا کے حدود میں تو تسلیم ہے کہ کفارہ ہوتے ہیں مگر قتل اولاد کی حد ہی نہیں، حتیٰ کہ قصاص تک میں بھی گفتگو ہے، اسے بھی چھوڑو، بہتان پر کیا حد ہے؟ کچھ نہیں (قذف اور چیز ہے) تو اب عقوبت کو عام رکھنا پڑے گا اور مخصوص بالحد نہ کیا جاسکے گا، اور عام رکھنے کی صورت میں بہرحال حدود کفارہ بنیں گے، تو حنفیہ کو تسلیم کرنا پڑا کہ حدود کفارات ہیں، میں کہتا ہوں بیشک درست ہے، لیکن حنفیہ کا یہ کہنا کہ حدود کفارہ نہیں بنتے، بھی غلط نہیں ہے کیونکہ حنفیہ کہتے ہیں کہ من وجہٍ کفارہ نہیں بنتے، اس کو یوں سمجھو کہ حد میں دو چیزیں ہیں، ایک حد من حیث ہو حد، یہ کفارہ نہیں، ایک من حیث ہو مصیبۃ وایذاء، یہ کفارہ ہے، یعنی اس کی وضع تو اس لئے نہیں کہ کفارہ بنے مگر چونکہ اس سے تکلیف پہونچتی ہے اس لئے ضرورۃً کفارہ بنے گی، اس کو یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ حد کی غرض کیا ہے؟ پاک کرنا مقصود ہے یا دوسروں کو روکنا؟ حنفیہ کہتے ہیں کہ اصل غرض حدود کی یہ ہے کہ لوگ اس سے عبرت حاصل کریں اور ان گناہوں سے باز رہیں، نہ یہ کہ پاک کیا جائے، یہ غرض ضمناً حاصل ہو جائے تو اور بات ہے، اگر حد کی وضع تطہیر کے لئے ہوتی تو حد سے وہ بالکل پاک ہو جاتا تو توبہ کی حاجت نہ رہتی، حالانکہ ایسا نہیں ہے، ہاں اگر زجر کے لئے ہے تو اب بالکلیہ حد سے تطہیر نہ ہوگی، من وجہٍ ہوگی، اور پوری تطہیر توبہ سے ہوگی، حد سے تطہیر صرف اسی طرح ہوگی جس طرح مصائب سے ہوتی ہے، ہاں جب توبہ کرلے گا تو بالکلیہ تطہیر ہو جائے گی اس سے معلوم ہوا کہ حد تنکیل کیلئے ہوتی ہے، فرمایا: فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا[1] الآیۃ. نکال وہ عذاب ہے

(۱) بقرہ : ۶۶

. . . .

جس سے روکنا مقصود ہو، نِکْلٌ اس بیڑی کو کہا جاتا ہے جو جانور کے پیر میں روکنے کے لئے ڈال دی جائے تو تنکیل ہے اور اس آیت سے نکلتا ہے وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْآ اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً ۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ (۱) کہ قطع ید روپیہ وغیرہ مال مسروقہ کا معاوضہ نہیں بلکہ اس فعل سرقہ (بِمَا كَسَبَا) کی سزا ہے، آگے فرماتے ہیں نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ، اب اس کی کیا ضرورت تھی، مقصود تو حاصل ہو چکا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ روکنا مقصود ہے، زواجر کا ترجمہ منکل کا ہے، اس کے بعد فرمایا: وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ چونکہ وہ غالب ہے اسلئے اسے حق ہے کہ قانون جاری کرے، اور چونکہ حکیم ہے اس لئے وہ ایسی سزا تجویز کرتا ہے جس سے عبرت اور جرائم کا انسداد ہو، چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جہاں چند آدمیوں کو سزا دی گئی اور ہاتھ کاٹے گئے، سب کانپ گئے اور پھر کوئی سرقہ کی ہمت نہیں کرتا اور جہاں جیل کی سزا ہے تم دیکھ رہے ہو کہ کہیں چوری نہیں ختم ہوئی، اہل یورپ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ وحشیانہ سزا ہے، لیکن میں نے فوائد (۲) میں لکھا ہے کہ چوری ہی کون سی مہذب چیز ہے کہ اس کی سزا بھی مہذب ہو، اور اگر یہ سزا وحشیانہ ہی ہے تو ایک وحشت کی سزا سے اگر ہزار وحشتوں کو دفع کر دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔

محمد علی قادیانی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ سزا تو بیشک ہے قطع ید کی مگر یہ انتہائی سزا ہے اس سے پہلے کچھ اختیارات ہیں، حاکم چاہے تو سزا میں تخفیف کر سکتا ہے ــــ مگر میں نے لکھا ہے کہ اتنے زمانہ میں ایک چور کو بھی ابتدائی سزا نہیں دی گئی بلکہ سب کو آخری سزا کا مستحق شمار کیا گیا۔

ایک ملحد (۳) نے اعتراض کیا کہ جس ہاتھ کی دیت پانچ سو دینار ہے اس کو دس درم میں کاٹ دیا جائے، یہ حکمت کے خلاف ہے، کسی حکیم نے اس کا جواب دیا: لَمَّا كَانَتْ اَمِيْنَةً كَانَتْ ثَمِيْنَةً فَاِذَا خَانَتْ هَانَتْ (۴) یہی ہاتھ بڑا قیمتی تھا جب یہ امین تھا اور جب یہ خائن بن گیا تو اس کی قیمت نہ رہ گئی، غرض لفظ نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ میں تصریح ہے کہ مقصود عبرت و تنکیل ہے، آگے فرماتے ہیں: فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ (۵) سب کہتے ہیں کہ اس آیت میں ظلم سے مراد سرقہ ہے اور اسی کے متعلق فرمان ہے کہ اگر توبہ کر لی اور اپنی اصلاح بھی کر لی تو اللہ کے ہاں راحت میں کمی نہیں، تو پورا مسئلہ حنفیہ کا آیت سے ثابت ہے کہ

---

(۱) مائدہ : ۳۸ (۲) اس سے مراد وہ فوائد ہیں جو مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمۂ قرآن کے حاشیہ پر تحریر فرمائے ہیں (مرتب) (۳) ابو العلاء معری (مرتب) (۴) جامع تقریر نے پہلی جگہ "اذا" دوسری جگہ "واذا" لکھا ہے۔ (۵) مائدہ : ۳۹۔

بابٌ[۱۲] مِنَ الدِّيْنِ الْفِرَارُ مِنَ الْفِتَنِ

فتنے سے بھاگنا دینداری ہے

۱۸ — حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ

ہم سے بیان کیا عبداللہ ابن مسلمہ نے، انھوں نے امام مالک سے، انھوں نے عبدالرحمٰن ابن عبداللہ ابن عبدالرحمٰن

بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ صَعْصَعَةَ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ

ابن ابی صعصعہ سے، انھوں نے اپنے باپ (عبداللہ) سے، انھوں نے ابوسعید خدری سے، انھوں نے آنحضرت

اَنَّہٗ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُوْشِكُ اَنْ یَّكُوْنَ خَیْرُ مَالِ الْمُسْلِمِ

صلی اللہ علیہ وسلم سے، فرمایا: وہ زمانہ قریب ہے جب مسلمان کا بہتر مال بکریاں ہوں گی جن کے پیچھے پہاڑ کی چوٹیوں اور

غَنَمٌ یَّتْبَعُ بِهَا شَعَفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ یَفِرُّ بِدِیْنِهٖ مِنَ الْفِتَنِ

بارش کے مقاموں میں وہ اپنا دین فتنوں سے بچائے ہوئے بھاگتا پھرے گا۔

اصل وضع حد کی زجر کے لئے ہے، ہاں بلا، ومصیبت ہونے کی وجہ سے وہ فی الجملہ ستر وکفارہ ضرور بن جائے گی، یہ استاد کے الفاظ ہیں کہ وضع حدود زجر کے لئے ہے نہ تطہیر کے لئے، شوافع زجر کو مقصود ثانوی کہتے ہیں اور تطہیر کو اولاً و بالذات مقصود کہتے ہیں، حنفیہ کی طرف سے اس جواب میں پوری صفائی سے کہتے ہیں کہ لفظ نکالاً من اللہ سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ اصل وضع اس کی زجر کے لئے ہے تطہیر اگر ہے بھی تو ثانیاً ہے اور اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ یہ بھی سمجھ لو کہ ابوہریرۃؓ کی حدیث میں یہ لفظ ہیں لَا اَدْرِیْ اَنَّ الْحُدُوْدَ كَفَّارَاتٌ لِاَهْلِهَا اَمْ لَا۔ مجھے معلوم نہیں کہ حدود کفارہ ہیں یا نہیں، لفظ زواجر نہیں بولا گیا، اور حدیث عُبادہ میں فرمایا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ یعنی یہ عقوبت اس کے لئے کفارہ ہے۔

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ کفارہ فی الجملہ بنیگی من حیث انہا مصائب، لیکن اصل وضع حد زجری ہے، وجدان یہ کہتا ہے کہ یہ قصہ لیلۃ العقبہ کے بعد کا ہے، لیلۃ العقبہ کا مضمون تو یہ ہے کہ میری مدد کرو، حفاظت کرو اپنی بیٹیوں کی، بیٹیوں سے زیادہ میرا خیال کرو، وغیرہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس نے لیلۃ العقبہ کہا اس کو وہم ہوگیا۔

باب من الدین الفرار من الفتن

چونکہ امام بخاری کے ہاں اسلام، ایمان، دین وغیرہ سب ایک ہی چیز ہے اس لئے الفرار من الفتن کو کتاب الایمان میں لائے، اب تک جو چیزیں بیان ہوئیں وہ ثبوتی اور وجودی چیزیں تھیں، اس لئے اب چند وہ چیزیں لارہے ہیں

بَاب ۱۳ قَوْلِ النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَا اَعْلَمُکُمْ بِاللہِ وَاَنَّ الْمَعْرِفَۃَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا کہ میں تم سے زیادہ اللہ کا جاننے والا ہوں اور معرفت (یقین) دل کا

فِعْلُ الْقَلْبِ لِقَوْلِ اللہِ تَعَالٰی وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ

فعل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا (سورہ بقرہ میں) لیکن ان قسموں پر تم کو پکڑے گا جو تمہارے دلوں نے (جان بوجھ کر) کھائیں.

جو عدم اور ترک کی ہیں، اسی سلسلہ کی یہ حدیث بھی ہے.

حدیث ۱۸ شَعَفٌ جمع ہے شَعَفَۃ کی، پہاڑ کی چوٹی ــــ مَوَاقِعُ الْقَطْرِ، بارش کی جگہیں، مراد وادیاں اور گڈھے ہیں، ترجمہ یہ ہے کہ حفاظت دین کے لئے پہاڑوں اور غاروں میں چلا جائے ــــ بکری کا لے جانا اس لئے ہے کہ دودھ غذا اور شراب (کھانے اور پینے) دونوں کا کام دیتا ہے ــــ مَوَاقِعُ الْقَطْرِ اور شَعَفُ الْجِبَالِ اس لئے پسند کرے گا کہ وہاں بارش کی وجہ سے چشمے اور چراگاہیں ہوتی ہیں ــــ بکری میں انحصار مقصود نہیں ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ مختصر سا سامان لے کر چلا جائے، رہبانیت کی تعلیم نہیں دی جارہی ہے بلکہ یہ بتایا جارہا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ صحبت سے فائدہ نہ ہوگا اور جب صحبت مضر ہونے لگے اور تنہائی وعزلت نشینی بقائے ایمان کے لئے مفید ہو تو اس وقت یہی کرنا چاہئے، یہ اس شخص کے بارے میں نہیں ہے جس کی صحبت سے لوگوں کو فائدہ پہونچ سکتا ہو، بلکہ جو شخص اس خرابی کا رخ موڑ سکتا ہو اس کو تو جم کر دین برحق کی تبلیغ کرنی چاہئے.

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ فِتَن سے مراد عرف شرع میں یہ ہے کہ دینی امور کی مخالفت عام ہو جائے اور دین کی حفاظت مشکل ہو جائے اور اسباب وذرائع مفقود ہو جائیں تو کمزوروں کو اجازت ہے کہ وہ حفاظت دین کی خاطر نکل بھاگیں، لفظ بدینہٖ کی باء کو بعض نے سبب کے لئے لیا ہے کہ وہ اپنے دین کے سبب سے اس کے بچانے کے لئے بھاگ جائے اور چونکہ دین کو بچانے کے لئے بھاگنا بھی دین ہی اس لئے امام بخاری نے یہ ترجمہ رکھ دیا ــــ بعض نے باء ابتدائیہ لیا ہے اور باء ابتدائیہ کا مطلب یہ ہے کہ فرار ناشی عن دین ہو، یعنی منشائے فرار دین ہو ــــ میں کہتا ہوں کہ باء کو معیت کے لئے لیا جائے، یعنی اپنے دین کو ساتھ لے کر بھاگ جائے، جیسے [حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں] "فَرَّ بِثَوْبِہٖ" کے معنی ہیں کہ وہ پتھر کپڑا لے کر بھاگ گیا، یہ میرے نزدیک لطیف ہے.

باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا اعلمکم باللہ الخ

امام بخاری نے ترجمے کے دو جزء کر دئے ہیں، ایک "انا اعلمکم باللہ" دوسرا "ان المعرفۃ فعل القلب" عموماً شارحین سمجھتے ہیں کہ دونوں ترجمے علٰحدہ ہیں، پہلے جزء کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا علم رکھنے والا سب سے زیادہ میں ہوں، اور اعلم

. . . .

اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور اس میں مراتب ہیں اور علم باللہ ایمان ہے، تو ایمان کے بھی مراتب ہوئے، دوسرے جزو سے مرجئہ اور کرامیہ فرقوں کا رد کرنا مقصود ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ صرف قول لا الٰہ الا اللہ کافی ہے، چاہے معرفت ہو یا نہ ہو، ان کا جواب دیا کہ صرف قول کافی نہیں ہے، معرفت ضروری ہے اور معرفت قلب کا فعل ہے، زبان کا نہیں، اس لئے صرف زبان سے کہہ دینے سے ایمان نہیں ہوتا۔

میرے نزدیک یہ دونوں جزو علٰحدہ نہیں ہیں بلکہ دوسرے جزو سے پہلے کی تشریح مقصود ہے، کیونکہ پہلا جزو حدیث کا ٹکڑا ہے اور کوئی علم کو ایمان نہیں کہتا بلکہ ایمان میں معرفت جو فعل قلب ہے اور اختیاری چیز ہے معتبر ہے، تو حدیث کے لفظ کو اپنی جگہ پر رکھا اور بتلا دیا کہ علم کے مراتب ہیں، لہٰذا معرفت کے بھی مراتب ہیں اور معرفت ایمان ہے، لہٰذا ایمان کے بھی مراتب ہیں، اب یہ کہ معرفت فعل قلب ہے، اس کی دلیل "وَلٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ"(۱) ہے، شراح پریشان ہیں کیونکہ دعویٰ تو یہ ہے کہ معرفت فعل قلب ہے، اور دلیل میں وہ آیت پیش کی جو اَیمان (قسم) کے بارے میں ہے، اِیمان کو اَیمان سے کیا تعلق؟ چنانچہ توجیہات کے درپے ہوئے، حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس آیت میں امام بخاری کا مقصود "بِمَا كَسَبَتْ" سے صرف یہ بتلانا ہے کہ قلوب بھی کسب کرتے ہیں یعنی ان سے بھی فعل ہوتا ہے، فعل محض مخصوص بالجوارح نہیں ہیں، لہٰذا یہ دعویٰ کہ معرفت فعل قلب ہے کچھ بعید نہیں۔

حاصل یہ نکلا کہ استشہاد صرف اس پر ہے کہ فعل قلب کا بھی ہوتا ہے، مگر یہ بات کہ معرفت جو عقیدۂ اسلام ہے وہ فعل قلب ہے یا نہیں؟ اس سے نہیں ثابت ہوا، اس توجیہ سے یا اور دوسری توجیہات سے اب تک تشفی نہیں ہوئی، اپنی سمجھ میں یہ آتا ہے کہ اس آیت کے متعلق حافظ نے مشہور تابعی اور مفسر حضرت زید ابن اسلمؒ کا ایک اثر نقل کیا ہے جس میں زید ابن اسلم اس آیت لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر کوئی قسم کھالے کہ میں فلاں کام کروں تو کافر ہوں (العیاذ باللہ) تو دیکھا جائے گا کہ اس نے اگر یوں ہی منہ سے لفظ بک دیا ہے تو وہ کافر نہ ہوگا، بلکہ وہ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْ اَيْمَانِكُمْ میں داخل ہوگا، اور اگر دل کے عقیدے سے کہا ہے اور سمجھتا ہے کہ واقعی میں کافر ہو جاؤں گا اور پھر کر گذرا تو اب وہ کافر ہو گیا اور وَلٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ میں داخل ہو گیا، اس لئے کہ یہ رضا بالکفر ہے اور رضا بالکفر کفر ہے۔ انتھیٰ قول زید بن اسلم

اب مسئلہ صاف اور واضح ہو گیا کہ معرفت فعل قلب ہے، یعنی یہ عقیدہ کہ اس فعل کے کرنے سے کافر ہو جاؤں گا، فعل قلب ہے غالب گمان یہ ہے کہ امام بخاری نے اس تفسیر کو پیش نظر رکھ کر یہ ترجمہ رکھا ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری نے

---

(۱) بقرہ

۱۹۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ اَنَا عَبْدَةُ عَنْ هِشَامٍ عَنْ اَبِيْهِ

ہم سے بیان کیا محمد ابن سلام بیکندی نے، خبر دی ہم کو عبدہ نے، انھوں نے ہشام سے، انھوں نے

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَمَرَهُمْ اَمَرَهُمْ

اپنے باپ (عروہ) سے، انھوں نے حضرت عائشہ سے، کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہ کو کوئی حکم دیتے تو انھیں کاموں کا

مِنَ الْاَعْمَالِ بِمَا يُطِيْقُوْنَ قَالُوْا اِنَّا لَسْنَا كَهَيْئَتِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ غَفَرَ

حکم دیتے جن کو وہ کرسکتے تھے، وہ عرض کرتے یا رسول اللہ! ہم آپ کی طرح تھوڑے ہیں، آپ کے تو اللہ نے سب اگلے پچھلے گناہ

لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ فَيَغْضَبُ حَتّٰى يُعْرَفَ الْغَضَبُ فِيْ وَجْهِهٖ

معاف کر دئے ہیں، یہ سن کر آپ اتنا غصہ ہوتے کہ آپ کے (مبارک) چہرہ پر غصہ نمودار ہوتا، پھر آپ فرماتے

ثُمَّ يَقُوْلُ اِنَّ اَتْقَاكُمْ وَاَعْلَمَكُمْ بِاللّٰهِ اَنَا۔

(کیا تم کو معلوم نہیں) تم سب میں زیادہ پرہیزگار اور اللہ کو زیادہ جاننے والا میں ہوں

اسی تفسیر کو لے کر یہاں منطبق کر دیا، کیونکہ امام بخاری کے معلومات بڑے وسیع اور نظر بہت دقیق ہے، اس لئے ذرا سی چیز کے اشارے سے حل پڑتے ہیں، واللہ اعلم بالصواب۔

حدیث ۱۹ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ، سلام بالتخفیف ہے، بالتشدید کو بعضوں نے لحن شمار کیا ہے۔

حدیث میں حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنا ہی عمل بتلاتے تھے جتنا سہولت کے ساتھ اٹھایا جا سکے، بھاری کام نہ بتلاتے تھے، نیز خود بھی اپنے لئے وہ چیز اختیار فرماتے جس میں امت کو تیسیر اور آسانی ہو، ہاں کبھی کبھی عزیمت کے لئے جانب اشق [دشوار اور پرمشقت پہلو] بھی اختیار فرمالیتے، صحابہؓ چونکہ اسوہ بننے والے تھے اس لئے انھیں بھی ویسی ہی تعلیم فرماتے۔

قولہ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ غَفَرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ، صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم آپ کی طرح نہیں، آپ تو معصوم ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے پچھلے سب قصور معاف فرما چکا ہے اور ہم سے خطائیں ہوتی ہیں لہٰذا ہم محتاج ہیں کہ کثرت سے عبادت کریں۔

قولہ فَيَغْضَبُ حَتّٰى يُعْرَفَ الْغَضَبُ فِيْ وَجْهِهٖ، چونکہ انھوں نے حضورؐ کے فعل کو قلیل سمجھا اس بنا پر کہا کہ آپ کو تو ضرورت نہیں مگر ہم محتاج اور ضرورتمند ہیں، اس لئے اس بات پر آپ کو غصہ آگیا اور فرمایا کہ گویا میرے گناہ معاف ہو چکے ہیں اس لئے میں مطمئن ہوں۔

اس سے ایک تو صحابہؓ کی حرص معلوم ہوتی ہے اور ان کی عزیمت وہمت کا حال معلوم ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ آسانی اور سہولت کی صورت اختیار فرماتے تھے۔

مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ میں حضرت انسؓ سے یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ منقول ہے کہ تین آدمی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضورؐ کی عبادت (مراد شب کی عبادت ہے، اس لئے کہ دن میں تو وہ سب کچھ دیکھتے ہی رہتے تھے) کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے شب کا پورا نظام بیان کردیا (اس میں گھر کے کام کاج، صحابیات کے مسائل، ازواج کے حقوق آرام فرمانا اور پھر عبادت خداوندی کی تفصیل شامل تھی) جب انھوں نے یہ تفصیل سنی تو ان کے ذہن میں جو عبادت نبوی کا تصور تھا اس سے یہ کم معلوم ہوئی۔ حدیث کے الفاظ ہیں: کَاَنَّھُمْ تَقَالُّوْھَا، گویا انھوں نے اس عبادت کو قلیل شمار کیا، اس پر انھیں خیال ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو معصوم ہیں، ان کے تو اگلے پچھلے سارے گناہ معاف ہیں، تب بولے: کہاں ہم کہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے تو سب اگلے پچھلے گناہ معاف ہیں، آپ اگر عبادت کم بھی کریں تو کوئی حرج نہیں مگر ہم تو قصور وار اور گنہگار ہیں، ہم کو زیادہ عبادت کرنی چاہئے، اس لئے ایک نے کہا میں تو ہمیشہ رات بھر نمازیں پڑھتا رہوں گا، دوسرے نے کہا میں ہمیشہ دن کا روزہ رکھا کروں گا، تیسرے نے کہا میں ہمیشہ عورتوں سے کنارہ کش رہونگا کبھی نکاح نہ کروں گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ باتیں معلوم ہوئیں تو آپ باہر تشریف لائے اور فرمایا: تم نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں؟ سنو! خدا کی قسم میں تم سب سے زیادہ خشیت خداوندی رکھتا ہوں اور تم سب سے زیادہ متقی ہوں بایں ہمہ میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نمازیں بھی پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، (تم نے جو یہ باتیں کیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کم ہیں اور تم مجھ سے بھی بڑھ جانا چاہتے ہو) تو سنو! جو بھی میری سنت اور میرے طریقے سے اعراض کرے گا وہ میرا نہیں ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ غصہ کا سبب حضورؐ کی عبادت کو کم سمجھنا تھا تو آپ نے اس کی اصلاح فرمادی اور فرمایا میں سارے عالم میں سب سے زیادہ اعلم باللہ اور اتقیٰ ہوں، میری عبادت میں کوئی کمی نہیں۔

میں لفظ اعلمکم کہنے کی ایک مثال پیش کرتا ہوں تاکہ خوب واضح ہوجائے، بادشاہوں اور سلاطین کا ایک قانون ہوتا ہے جس میں دفعات مقرر ہوتی ہیں، جرائم کی تفصیل ہوتی ہے، اس کا علم تمام رعایا کو کرادیا جاتا ہے، تو تمام رعایا کا مرتبہ تو یہ ہے کہ وہ اس قانون اور اس کی دفعات کی پابندی کریں، لیکن ایک طبقہ مصاحبین خاص کا ہوتا ہے، ان کا حال اور نوعیت یہی نہیں ہوتی کہ صرف قانون اور اس کی دفعات کا لحاظ رکھیں بلکہ وہ دن رات بادشاہ کی اداشناسی اور اس کی مزاج دانی کا خیال رکھنا اپنے فرائض منصبی کا کمال سمجھتے ہیں، وہ ہمیشہ اس کی مرضی دیکھتے ہیں اور جس چیز میں اس کی خوشی پاتے ہیں وہی اختیار کرتے ہیں، پھر ان مصاحبین خاص میں سے بھی جو زیادہ قرب واختصاص رکھتے ہیں وہ اور زیادہ ہر وقت مزاج دانی واداشناسی کی فکر رکھتے ہیں، ان کی نگاہ قانون پر نہیں رہتی بلکہ مزاج شناسی پر رہتی ہے تو یہی مزاج دانی اور اداشناسی معرفت ہے اور یہ چیز برسوں کے بعد حاصل ہوتی ہے، اسی کو فرماتے ہیں انا اعلمکم باللہ، مزاج شناسی کا

بَابٌ ۱۴ مَنْ كَرِهَ اَنْ يَّعُوْدَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ مِنَ الْاِيْمَانِ

جو شخص پھر کافر ہو جانے کو اتنا برا سمجھے جیسے آگ میں ڈالا جانا، وہ سچا مومن ہے۔

۲۰ — حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ

ہم سے بیان کیا سلیمان بن حرب نے، کہا ہم سے بیان کیا شعبہ نے، انھوں نے قتادہ سے، انھوں نے انس سے

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ: مَنْ كَانَ

انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے، فرمایا جس میں تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کا مزہ پائے گا، ایک تو اللہ اور اس کے رسول کی محبت

اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَمَنْ اَحَبَّ عَبْدًا لَا يُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ وَمَنْ يَّكْرَهُ

اس کو سب سے زیادہ ہو، دوسرے کسی بندہ سے خالص اللہ کے لئے دوستی رکھے، تیسرے پھر کفر میں جانا جب اللہ نے

اَنْ يَّعُوْدَ فِي الْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْقَذَهُ اللّٰهُ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ

اس سے کفر چھڑا دیا اتنا برا سمجھے جیسے آگ میں ڈالا جانا۔

لفظ وہاں نہیں ہے اس لئے اسے استعمال نہیں کرسکتا کیونکہ یہ قرآن کے خلاف ہوگا مگر انبیاء علیہم السلام جو فرماتے ہیں کہ "اعلم" ہیں اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ مزاج دان اور اداشناس ہوتے ہیں، وہ ہر وقت اسی فکر میں رہتے ہیں کہ اللہ کن چیزوں سے خوش ہوتا ہے تاکہ وہ اسی کو اختیار کریں۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ معرفت کسبی ہے، یہ وہ معرفت نہیں جو عام اشخاص کو ہوتی ہے بلکہ یہ مخصوص بالانبیاء ہے انھیں کو یہ معرفت ہوتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو سید الانبیاء ہیں اس لئے آپ "اعرف" بھی ہوں گے اور جو اعرف ہوں گے وہی زیادہ متقرب بھی ہوں گے، اور جو جس قدر زیادہ مقرب ہوں گے وہی سب سے زیادہ ڈرنے والے بھی ہوں گے اور جب معرفت کاملہ اور تقویٰ کامل ہوگا تو عبادت بھی اکمل ہوگی اور ان کا ایک بار سبحان اللہ کہنا ہمارے دس لاکھ مرتبہ کہنے سے بڑھ کر ہوگا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ حل فرمادیا اور صحابہ کو بتلادیا کہ کیت مت دیکھو ورنہ جوگی وراہب اور برہمن سب جان مارتے ہیں مگر چونکہ تقویٰ اور معرفت صحیح اور قوی نہیں اس لئے سب بیکار ہے، اور جب معرفت ہے تو گو مقدار میں کم ہے مگر اعلیٰ وارفع ہے، معلوم ہوا کہ معرفت ایمان کا اعلیٰ مرتبہ ہے، تو اب امام ابو حنیفہؒ کا قول (کہ ایمان معرفت بالجنان واقرار باللسان کا نام ہے) بھی حل ہوگیا کہ معرفت تامہ کا نام ایمان ہے فالحمد للہ علیٰ ذلک

باب ۱۴ من کرہ ان یعود فی الکفر الخ

(حدیث ۲۰) یہ حدیث پہلے گذر چکی ہے، وہاں اس کی تشریح بھی بیان ہو چکی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ فضائل ایمان سے

بابٌ ۱۵ تَفَاضُلِ اَهْلِ الْاِیْمَانِ مِنَ الْاَعْمَالِ

ایمان داروں کا اعمال کے رو سے ایک دوسرے پر افضل ہونا

۲۱ـــ حَدَّثَنَا اِسْمٰعِیْلُ قَالَ حَدَّثَنِیْ مَالِکٌ عَنْ عَمْرِو بْنِ یَحْیَی الْمَازِنِیِّ
ہم سے بیان کیا اسماعیل (ابن ابی اویس) نے کہا مجھ سے بیان کیا امام مالک نے، انھوں نے عمرو بن یحیی مازنی سے، انھوں نے

عَنْ اَبِیْهِ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ
اپنے باپ (یحیی مازنی) سے، انھوں نے ابو سعید خدری سے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے، فرمایا، (حساب کتاب کے بعد)

یَدْخُلُ اَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ وَاَهْلُ النَّارِ النَّارَ ثُمَّ یَقُوْلُ اللّٰهُ اَخْرِجُوْا مَنْ
بہشت والے بہشت میں اور دوزخ والے دوزخ میں چل دیں گے، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر

کَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ اِیْمَانٍ فَیُخْرَجُوْنَ مِنْهَا قَدِ اسْوَدُّوْا
ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکال لو، پھر ایسے لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے، وہ (جل کر) کالے ہو گئے ہوں گے،

فَیُلْقَوْنَ فِیْ نَهْرِ الْحَیَا اَوِ الْحَیَاةِ ـ شَکَّ مَالِکٌ ـ فَیَنْبُتُوْنَ کَمَا تَنْبُتُ الْحِبَّةُ فِیْ
پھر برسات کی نہر یا زندگی کی نہر میں ڈالے جائیں گے۔ امام مالک کو شک ہے۔ وہ اس طرح (نئے سرے سے) اُگ

جَانِبِ السَّیْلِ اَلَمْ تَرَ اَنَّهَا تَخْرُجُ صَفْرَاءَ مُلْتَوِیَةً قَالَ وُهَیْبٌ حَدَّثَنَا عَمْرٌو
آئیں گے جیسے دانہ ندی کے کنارے اُگ آتا ہے، کیا تو نہیں دیکھتا کیسے زرد زرد لپٹا ہوا نکلتا ہے، وہیب نے کہا مجھ سے

اَلْحَیَاةِ وَقَالَ خَرْدَلٍ مِّنْ خَیْرٍ۔
عمرو بن یحیی نے یہ حدیث بیان کی، اس میں "زندگی کی نہر" کہی اور ایمان کے بدل خیر کا لفظ کہا۔

ایک یہ بھی ہے کہ انسان کفر کو بُرا سمجھے اور اس سے بیزار رہے (قسطلانی نے کہا اللہ اور اس کے رسول سے محبت کی نشانی یہ ہے کہ دین کی مدد کرے، قول اور فعل سے اور آپ کی شریعت کی حمایت کرے اور اسلام کے مخالفین جو اسلام پر اعتراض کریں ان کا جواب دے، اور اخلاق و عادات مثلاً سخاوت، ایثار، حلم، صبر اور تواضع میں آپ کی پیروی کرے۔

بابٌ ۱۵ تفاضل اهل الایمان من الاعمال

عنوان باب کی عبارت کا مطلب بالکل ظاہر ہے کہ اہل ایمان اعمال کے اعتبار سے فاضل و مفضول [اور باہم متفاوت ہوتے ہیں، ایک کا ایمان عمل کی زیادتی کے اعتبار سے زیادہ اور دوسرے کا عمل کی کمی کی وجہ سے کم ہوتا ہے] اور امام بخاری کا

مقصود یہ ہے کہ اس سے ایمان کی کمی اور زیادتی کا ثبوت ہوتا ہے، اس حدیث کو امام بخاری نے مختصر کر کے ذکر کیا ہے، یہ حدیث مسلم کتاب الایمان میں مفصل مذکور ہے، پہلے اسے سنو!

بابُ مَعرفةِ طريقِ الرُّؤيةِ میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث منقول ہے، اس کے آخر میں ہے کہ ایمان والے اللہ تعالیٰ سے عصاۃ مومنین کی شفاعت کریں گے اور یوں عرض کریں گے:

رَبَّنَا كَانُوا يَصُومُونَ مَعَنَا وَيُصَلُّونَ وَيَحُجُّونَ فَيُقَالُ لَهُمْ أَخْرِجُوا مَنْ عَرَفْتُمْ فَتُحَرَّمُ صُوَرُهُمْ عَلَى النَّارِ فَيُخْرِجُونَ خَلْقًا كَثِيرًا قَدْ أَخَذَتِ النَّارُ إِلَى نِصْفِ سَاقَيْهِ وَإِلَى رُكْبَتَيْهِ ثُمَّ يَقُولُونَ رَبَّنَا مَا بَقِيَ فِيهَا أَحَدٌ مِمَّنْ أَمَرْتَنَا بِهِ فَيَقُولُ ارْجِعُوا فَمَنْ وَجَدْتُمْ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالَ دِينَارٍ مِنْ خَيْرٍ فَأَخْرِجُوهُ فَيُخْرِجُونَ خَلْقًا كَثِيرًا ثُمَّ يَقُولُونَ رَبَّنَا لَمْ نَذَرْ فِيهَا أَحَدًا مِمَّنْ أَمَرْتَنَا بِهِ ثُمَّ يَقُولُ ارْجِعُوا فَمَنْ وَجَدْتُمْ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالَ نِصْفِ دِينَارٍ مِنْ خَيْرٍ فَأَخْرِجُوهُ فَيُخْرِجُونَ خَلْقًا كَثِيرًا ثُمَّ يَقُولُونَ رَبَّنَا لَمْ نَذَرْ فِيهَا مِمَّنْ أَمَرْتَنَا أَحَدًا ثُمَّ يَقُولُ ارْجِعُوا فَمَنْ وَجَدْتُمْ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ فَأَخْرِجُوهُ فَيُخْرِجُونَ خَلْقًا كَثِيرًا ثُمَّ يَقُولُونَ رَبَّنَا لَمْ نَذَرْ فِيهَا خَيْرًا وَكَانَ أَبُو سَعِيدٍ الْخُدْرِيُّ يَقُولُ إِنْ لَمْ تُصَدِّقُونِي بِهَذَا الْحَدِيثِ فَاقْرَءُوا

اے ہمارے رب یہ تو ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے اور نماز پڑھتے تھے اور حج کرتے تھے، تو ان سے کہا جائے گا کہ نکال لو جسے پہچانتے ہو، ان کی صورتوں کا جلانا آگ پر حرام ہوگا، پھر وہ لوگ بہتوں کو نکال لیں گے اس حال میں کہ بعض کو نصف پنڈلیوں اور کسی کو گھٹنوں تک آگ نے جلایا ہوگا، پھر وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب جن کے لئے آپ نے فرمایا تھا ان میں سے کوئی اب نہیں رہ گیا پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ پھر جاؤ جس کے دل میں دینار کے برابر ایمان پاؤ اسے نکال لو، تو وہ بہتوں کو نکال لیں گے اور کہیں گے کہ اے ہمارے رب جن کو آپ نے فرمایا تھا ان میں سے کسی کو ہم نے اس میں نہیں چھوڑا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ پھر جاؤ جس کے دل میں نصف دینار برابر ایمان پاؤ اسے نکال لو، تو بہتوں کو نکال لیں گے پھر کہیں گے اے ہمارے رب جن کو آپ نے فرمایا تھا ان میں سے کسی کو ہم نے اس میں نہیں چھوڑا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا جاؤ جس کے دل میں ذرہ بھر ایمان پاؤ اسے نکال لو، تو وہ بہتوں کو نکالیں گے اس کے بعد کہیں گے اے ہمارے رب ہم نے اس میں کسی ایمان والے کو نہیں چھوڑا (ابو سعید خدری فرماتے تھے کہ اگر اس حدیث میں تم میری تصدیق نہیں کرتے تو چاہو تو اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ

إِن شِئْتُمْ (إِنَّ اللهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَإِن تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِن لَّدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا) (۱) فَيَقُولُ اللهُ تَعَالَى شَفَعَتِ الْمَلَائِكَةُ وَشَفَعَ النَّبِيُّونَ وَشَفَعَ الْمُؤْمِنُونَ وَلَمْ يَبْقَ إِلَّا أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ فَيَقْبِضُ قَبْضَةً مِنَ النَّارِ فَيُخْرِجُ مِنْهَا قَوْمًا لَمْ يَعْمَلُوا خَيْرًا قَطُّ قَدْ عَادُوا حُمَمًا فَيُلْقِيهِمْ فِي نَهْرٍ فِي أَفْوَاهِ الْجَنَّةِ يُقَالُ لَهُ نَهْرُ الْحَيَاةِ فَيَخْرُجُونَ كَمَا تَخْرُجُ الْحِبَّةُ فِي حَمِيلِ السَّيْلِ (الى قوله) هٰؤُلَاءِ عُتَقَاءُ اللهِ الَّذِينَ أَدْخَلَهُمُ اللهُ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ عَمَلٍ عَمِلُوهُ وَلَا خَيْرٍ قَدَّمُوهُ ۔

ذَرَّةٍ وَإِن تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِن لَّدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا پڑھ لو) پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ فرشتوں، نبیوں اور مومنوں نے سفارش کرلی اب ارحم الراحمین رہ گیا ہے، پھر مٹھی بھر لوگوں کو جہنم سے نکالے گا جنھوں نے کبھی کوئی نیکی نہیں کی، وہ جھلس کر کوئلہ کی طرح ہوگئے ہوں گے پھر ان کو جنت کے دروازے کی نہر حیات میں ڈالے گا تو وہ تروتازہ ہو کر نکلیں گے جیسے بیج اگتا ہے سیلاب کے بہائے کوڑا کرکٹ میں، (الیٰ قولہ) یہ اللہ کے وہ آزاد کردہ لوگ ہیں جن کو بغیر کسی عمل اور نیکی کے جو انھوں نے عمل کرکے آگے بھیجی ہو، اللہ نے جنت میں داخل کر دیا۔

انسؓ ابن مالک کی حدیث کا ایک حصہ اور سن لو، جو حدیث شفاعت میں ہے کہ جب شفاعت کی اجازت مل جائیگی:

فَيُقَالُ انْطَلِقْ فَمَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ بُرَّةٍ أَوْ شَعِيرَةٍ مِنْ إِيمَانٍ فَأَخْرِجْهُ مِنْهَا ۔ فَأَنْطَلِقُ فَأَفْعَلُ ثُمَّ أَرْجِعُ إِلَى رَبِّي تَعَالَى فَأَحْمَدُهُ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ ثُمَّ أَخِرُّ لَهُ سَاجِدًا فَيُقَالُ لِي يَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَأْسَكَ وَقُلْ يُسْمَعْ لَكَ، وَسَلْ تُعْطَهْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَأَقُولُ يَا رَبِّ أُمَّتِي أُمَّتِي، فَيُقَالُ لِي انْطَلِقْ فَمَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ إِيمَانٍ فَأَخْرِجْهُ مِنْهَا ۔ فَأَنْطَلِقُ فَأَفْعَلُ

تو حکم ہوگا جا، جس کے دل میں گیہوں یا جو کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو اس کو نکال لے دوزخ سے۔ میں ایسے سب لوگوں کو نکال لوں گا اور پھر اپنے مالک کے پاس آن کر ویسی ہی تعریفیں کروں گا، پھر سجدے میں گر پڑوں گا، حکم ہوگا اے محمدؐ! اپنا سر اٹھا اور کہہ جو کہنا ہے، تیری بات سنی جائے گی، مانگ جو مانگنا ہے ملے گا، سفارش کر، تیری سفارش قبول ہوگی، میں عرض کروں گا مالک میرے! امت میری امت میری (یعنی اپنی امت کی بخشش چاہتا ہوں) حکم ہوگا، جا اور جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی

(۱) نساء : ۴۰

. . . .

ثُمَّ اَعُوْدُ اِلٰی رَبِّیْ فَاَحْمَدُهٗ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ ثُمَّ اَخِرُّلَهٗ سَاجِدًا فَیُقَالُ لِیْ یَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَأْسَكَ وَقُلْ یُسْمَعْ لَكَ وَسَلْ تُعْطَهٗ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَاَقُوْلُ یَا رَبِّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ فَیُقَالُ لِیْ اِنْطَلِقْ فَمَنْ كَانَ فِیْ قَلْبِهٖ اَدْنٰی اَدْنٰی اَدْنٰی مِنْ مِثْقَالِ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ اِیْمَانٍ فَاَخْرِجْهُ مِنَ النَّارِ فَاَنْطَلِقُ فَاَفْعَلُ .

ایمان ہو اس کو جہنم سے نکال لے، میں ایسا ہی کروں گا اور پھر لوٹ کر اپنے پروردگار کے پاس آؤں گا اور ایسی ہی تعریفیں کروں گا اور سجدے میں گر پڑوں گا، حکم ہوگا اے محمدؐ! اپنا سر اٹھا اور کہہ ہم سنیں گے، مانگ، دینگے، سفارش کر، قبول کریں گے، میں عرض کروں گا اے میرے مالک! میری امت میری امت، حکم ہوگا جا اور جس کے دل میں رائی کے دانے سے بھی کم، بہت کم، بہت ہی کم ایمان ہو اس کو جہنم سے نکال لے، پھر میں جاؤں گا اور ایسا ہی کروں گا۔

هٰذا حدیث انس الذی انبانا به قال فخرجنا من عنده فلما کنا بظهر الجبان قلنا لو ملنا الی الحسن فسلمنا علیه وهو مستخف فی دار ابی خلیفة قال فدخلنا علیه فسلمنا علیه قلنا یا ابا سعید جئنا من عند اخیك ابی حمزة فلم نسمع بمثل حدیث حدثناه فی الشفاعة فقال هِیهِ فحدثناه الحدیث فقال هِیهِ قلنا ما زادنا قال قد حدثنا به منذ عشرین سنة وهو یومئذ جمیع ولقد ترك شیئًا ما ادری انسی الشیخ اوکره ان یحدثکم فتتکلوا، قلنا له حدّثنا فضحك وقال خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ماذکرت لکم هٰذا الا وانا ارید ان اُحَدِّثَکُمُوهُ قال ثم ارجع الی ربی فی الرابعة فاحمده بتلك المحامد ثم اخرله ساجدًا فیقال لی یا محمد ارفع رأسك وقل یسمع لك وسل تعطه واشفع تشفع فاقول یا رب ائذن لی فیمن قال لا اله الا الله، قال لیس ذاك لك، اوقال لیس ذاك الیك ولکن وعزتی وکبریائی وعظمتی وجبریائی لاخرجن من قال لا اله الا الله (۱)

چونکہ ان دونوں حدیثوں کے الفاظ پر کلام کرنا ہے اس لئے ان دونوں روایتوں کا پیش نظر رہنا ضروری تھا۔

حدیث ۲۱ حیاً بالقصر، بارش کو کہتے ہیں، اور چونکہ بارش کے ذریعہ دانے اگتے ہیں اور انھیں زندگی ملتی ہے اس لئے وہ سبب حیاة ہے، حیاً اور حیاۃ یہاں نہر کا نام ہے، مطلب دونوں کا ایک ہے، بعض نے حیآء بالمد پڑھا ہے

---

(۱) فتح الملہم ج ۱ ص ۳۶۶۔

. . . .

مگر خطابی نے جزماً بیان کیا ہے کہ بالقصر صحیح ہے اور بالمد کے یہاں کوئی معنی بھی نہیں۔

ینبتون الخ مراد اس سے تشبیہ ہے کہ بہت تیزی اور پوری شادابی کے ساتھ اُگے گا۔ حِبّۃ بالکسر: صحرائی تخم۔ حَبّۃ بالفتح عام ہے، حِبّۃ کی جمع حِبَب ہے اور حَبّۃ کی جمع حُبوب آتی ہے، مشبہ بہ کو محسوس کرنے کے لئے فرمایا۔

الم تر الخ یعنی اس کی رنگت دیکھ کر دیکھنے والے کی طبیعت خوش ہوتی ہے، اسی طرح جہنم کے لوگ بڑھیں گے اور دیکھ کر خوشی ہوگی۔

قال وُھیبٌ، یعنی وہیب کی اس روایت میں راوی نے لفظ حیاۃ بلاشک نقل کیا ہے اور ابو سعید خدریؓ کی روایت میں امام مالک کو شک ہے کہ لفظ حیا بولے یا لفظ حیاۃ، دوسرا فرق یہ ہے کہ یہاں خَرْدَل مِنْ خَیْرٍ ہے اور ابو سعیدؓ کی روایت میں خَرْدَلٌ مِنْ اِیْمَانٍ ہے۔

اکثر شراح لکھتے ہیں کہ استشہاد خردل من ایمان سے ہے کہ اہل ایمان، ایمان میں متفاوت ہیں، شراح کا ذہن اس طرف نہ گیا ہوگا کہ ترجمہ تو تھا تفاضل اھل الایمان فی الاعمال کا اور یہاں نکلا تفاضل نفس ایمان میں، نہ کہ اعمال میں، تو ترجمہ سے ربط نہ رہا۔ یہاں ایک اشکال اس سے بھی بڑا ہے وہ یہ کہ یہاں ترجمہ ہے تفاضل الاعمال کا جس میں ابو سعید خدریؓ کی حدیث بیان کی ہے اور دوسرا اسی کے مشابہ آگے آرہا ہے جس کا عنوان ہے باب زیادۃ الایمان ونقصانہ وقول اللّٰہ تعالیٰ وزدناھم ھدی الخ اور مضمون قریب قریب وہی ہے جو ابو سعید خدریؓ کی روایت کا ہے، اس میں حضرت انس کی روایت بیان کی گئی ہے جس میں "من خیر" کا لفظ آیا ہے، مگر ابو سعید خدریؓ کی روایت میں "من ایمان" آیا ہے، بظاہر اس کے برعکس ہونا چاہیئے تھا کیونکہ ابو سعید خدریؓ کی روایت کا ترجمہ تفاضل اعمال کا تھا، اور خیر کا لفظ اعمال میں اکثر بولا جاتا ہے، اس لئے وہاں "من خیر" لانا چاہیئے تھا، اور حضرت انسؓ کی آگے آنے والی روایت میں "من ایمان" ہونا چاہیئے اس لئے کہ ترجمہ زیادۃ الایمان ونقصانہ قائم کیا ہے، مگر امام بخاری نے برعکس کر دیا جو خلاف ظاہر ہے، اسی کے ساتھ اتنی بات اور یاد رکھو کہ حدیث ابی سعیدؓ میں جو باب کی اصل حدیث ہے گو لفظ "من ایمان" ہے مگر وہیب کی جو روایت تعلیقاً بیان کی ہے اس میں "من خیر" ہے اور اسی طرح انسؓ کی روایت میں جو باب کی اصل حدیث ہے "من خیر" کا لفظ ہے اور دوسری روایت میں جو بطور متابعت کے لائے ہیں "من ایمان" ہے۔ حاصل یہ کہ امام بخاری نے ترتیب یہ رکھی ہے کہ جہاں عنوان باب میں اعمال کا ذکر تھا وہاں تو "من ایمان" والی روایت بیان کی اور "من خیر" والی روایت تعلیقاً لائے اور جہاں ایمان کا ذکر تھا وہاں "من خیر" والی حدیث پہلے لائے

. . . .

اور مناسبت میں وہ حدیث لائے جس میں "من ایمان" کا لفظ آیا ہے، حالانکہ بالکل واضح اور صاف ترتیب یہ تھی کہ تفاضل اعمال کے ترجمہ میں "من خیر" والی حضرت انسؓ کی روایت لاتے اور زیادۃ الایمان ونقصانہ کے ترجمہ میں "من ایمان" والی حضرت ابوسعیدؓ کی روایت درج فرماتے، مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

حافظ وغیرہ نے اس پر کلام کرتے ہوئے دونوں ترجموں میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ اعمال چونکہ جزو ایمان ہیں اس لئے جب عمل میں کمی بیشی ہوگی تو ایمان میں کمی بیشی ہوگی، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ جس طرح اعمال سے کمی بیشی ہوتی ہے اسی طرح نفس ایمان یعنی تصدیق میں بھی کمی بیشی ہوتی ہو، تو ایک کو یہاں بیان کیا اور دوسرے کو آگے لائے، یہاں مطمح نظر اعمال ہیں اور وہاں اعمال سے قطع نظر نفس تصدیق میں تفاضل مقصود ہے، اس طرح ان شراح نے دونوں حدیثوں کو دونوں ترجموں کے ساتھ تطبیق دینے کی کوشش کی ہے، مگر پھر بھی ہمارے سوالات کا حل نہیں ہوا، اس لئے کہ صرف دونوں ترجموں کا فرق بیان کر دیا گیا مگر اس کی وضاحت نہیں کی گئی کہ حدیث کو ترجمہ کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟ اسی طرح اس کا حل بھی نہیں نکلا کہ اس حدیث کو وہاں اور دوسری کو یہاں کیوں لائے؟ اس لئے یہ جوابات تشفی بخش ثابت نہیں ہوئے، میں کہتا ہوں کہ یہ اشکالات صرف اس وقت تک ہیں جب تک کہ مفصل حدیث سامنے نہ ہو، میں نے صحیح مسلم کی دونوں حدیثیں اسی لئے پہلے بیان کر دی ہیں، اس کے بعد ان شاء اللہ مسئلہ منقح ہو جائے گا۔ بخاری بھی یہ حدیث بابُ الشفاعۃ میں لائیں گے، مگر صحیح مسلم میں ابوسعیدؓ کی روایت بہت مفصل ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب اہل ایمان شفاعت کر چکیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: سب شفاعت کر چکے، اب صرف ارحم الراحمین باقی رہا، پھر اللہ تعالیٰ جہنم سے ایک ایسی قوم کو نکالے گا جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ لم یعملوا خیرًا قط یعنی بالکل عمل خیر تھا ہی نہیں۔

لم یعملوا خیرًا قط سے یہاں اس حدیث میں کیا مراد ہے؟ یہ مراد تو ہو ہی نہیں سکتی کہ ان کے اندر ایمان بالکلیہ نہیں تھا کیونکہ نصوص کتاب وسنت شاہد ہیں کہ ایمان کے بغیر خروج من النار نہیں ہوگا، لہٰذا یہاں پر کہا جائے گا کہ ایمان کے سوا اور کوئی چیز زائد نہ تھی، دوسرے لم یعملوا سے عمل جوارح اور عمل قلب دونوں کی نفی ہے، عمل یہاں عمل جوارح اور عمل قلب کو عام ہے اور دونوں ہی کی نفی کی گئی ہے، اہل محشر میں سے بعض کے پاس دونوں طرح کے عمل ہوں گے، عمل جوارح بھی اور عمل قلب بھی، مگر بعض کے پاس اعمال جوارح تو نہ ہوں گے مگر دل میں ایمان کی حرارت ضرور موجود ہوگی، وہ مبتلائے معاصی ضرور ہوں گے مگر ساتھ ہی ندامت وپشیمانی کی کسک بھی محسوس کرتے ہوں گے، تو یہاں اسی طرح کے لوگ مراد ہیں کیونکہ اعمال جوارح والے تو شفاعت مومنین کے وقت جہنم سے نکالے جا چکے ہوں گے، اب وہی باقی رہ جائیں گے جن کے اعمال قلب ہوں گے، اور اعمال قلب میں بھی مدارج ومراتب ہیں، بعض مراتب

. . . .

میں اہل ایمان ان اعمال قلب سے واقف ہوں گے اور انھیں وہ اعمال دکھادیئے جائیں گے اور بعض اعمال قلب وہ ہوں گے جو مومنین کو بھی نہ معلوم ہوں گے، تو اب ابوسعیدؓ کی روایت میں تین قسم کے لوگ ہوئے، اولؔ اعمال جوارح والے، دومؔ وہ اعمال قلب والے جن کے اعمال قلب اہل ایمان کو بتلادیئے جائیں گے، ان دونوں قسموں کے لوگ شفاعت مومنین سے نکال لئے جائیں گے، تیسری قسم اعمال قلب والوں کی وہ ہوگی جن کے اعمال قلب پر صرف رب العلمین مطلع ہوگا اس لئے انھیں اللہ ہی نکالے گا، یہ وہ گروہ ہوگا جن کے دل میں ایمان کے علاوہ عمل قلب کے آثار میں سے کچھ نہ ہوگا، بس یہ گروہ صرف خدا کی رحمت سے نکلے گا ——— چنانچہ مسلم کی دوسری حدیث میں ہے "بغیر عمل عملوہ ولا قدم قدموہ" یعنی نہ عمل جوارح تھا نہ عمل قلب۔

دوسری روایت انسؓ ابن مالک کی دو تین صفحے کے بعد ہے جو پہلے آچکی ہے، اسے پڑھو، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا مفصل بیان ہے، حضورؐ فرماتے ہیں:

روز حشر میں جب لوگ بے چین ہوکر شفاعت کی خاطر حضرت آدم وابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام کے پاس سے مایوس ہوکر میرے پاس آئیں گے تو میں اسے منظور کرلوں گا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوکر اجازت چاہوں گا اور جب اجازت مل جائے گی تو پہلے میں اس کے سامنے کھڑے ہوکر اس کے محامد ایسے الفاظ اور ایسے طرق سے بیان کروں گا کہ آج اس دنیا میں اس پر قدرت نہیں، وہ الفاظ اور وہ انداز بیان مجھے اسی وقت خاص طور پر القاء کئے جائیں گے ("المحامد" جمع ہے "حمد" کی، خلاف قیاس جیسے "محاسن" جمع "حسن" کی ——— یا جمع "محمدۃ" کی) پھر میں اس کے سامنے سجدے میں گر جاؤں گا (اور سجدہ میں پڑا رہوں گا جب تک اللہ چاہے گا کما فی روایۃ) پھر حکم ہوگا: اے محمدؐ! اپنا سر سجدے سے اٹھاؤ اور کہو جو کہنا چاہتے ہو، تمہاری بات سنی جائے گی اور مانگو تمہیں دیا جائے گا، اور شفاعت کرو تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی، تو میں عرض کروں گا: اے رب! میری امت میری امت (یعنی میری امت کو بخش دیجئے) تو مجھ سے کہا جائیگا جاؤ! تم کو اجازت ہے جس کے دل میں گیہوں یا جو کے برابر بھی ایمان ہو اس کو جہنم سے نکال لاؤ (دوسری روایت میں ہے فیحد لی حدًا یعنی ایک حد بتادی جائے گی کہ اس قسم کے لوگ نکال لاؤ) میں جاؤں گا اور جہنم سے اس حد تک کے لوگوں کو نکال لاؤنگا پھر دوبارہ دربار الٰہی میں حاضر ہوں گا پھر انھیں محامد کو بیان کروں گا اور سجدہ میں گر جاؤں گا، پھر حکم ہوگا: اے محمدؐ! سر اٹھاؤ کہو تمہاری بات سنی جائے گی، سوال کرو، پورا کیا جائے گا، شفاعت کرو، قبول کی جائے گی، تو میں عرض کروں گا یارب! امتی امتی، تب حکم ہوگا جاؤ جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو، جہنم سے نکال لاؤ، میں جاؤں گا اور اس

. . . .

قسم کے لوگوں کو نکال لاؤں گا، پھر میں تیسری بار دربار خداوندی میں حاضری دوں گا، پھر میں اپنے رب کی وہی تعریفیں کروں گا، پھر میں سجدے میں گر جاؤں گا، پھر حکم ہوگا اے محمدؐ! سر اٹھاؤ کہو تمہاری بات سنی جائے گی، سوال کرو، پورا کیا جائے گا، شفاعت کرو، قبول کی جائیگی تب میں عرض کروں گا یا رب! امتی امتی، حکم ہوگا جاؤ جس کے دل میں رائی کے دانہ سے ادنیٰ ادنیٰ ادنیٰ[1] درجہ کا ایمان ہو اسے جہنم سے نکال لاؤ، میں جاکر اس قسم کے لوگوں کو جہنم سے نکال لاؤں گا۔

راوی نے کہا ہم یہ حدیث سن کر حضرت انسؓ کی مجلس سے نکلے تو جب ہم ظہر جبان[2] میں پہونچے (جبّان بفتح الجیم و تشدید الباء) تو ہم نے کہا اچھا ہوتا کہ ہم حضرت حسن بصریؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر انھیں بھی سلام کرتے چلتے، حسن بصریؒ اس وقت حجاج ابن یوسف کے خوف سے دار ابی خلیفہ[3] میں چھپے ہوئے تھے، چنانچہ ہم لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کرکے عرض کیا کہ ہم لوگ آپ کے بھائی ابو حمزہ کے پاس سے آرہے ہیں، انھوں نے شفاعت کے بارے میں ایک ایسی حدیث سنائی ہے جو ہم نے اب تک کسی سے نہیں سنی تھی، انھوں نے فرمایا بیان کرو، تو ہم نے جس قدر حدیث ان سے سنی تھی، سب سنا دی، انھوں نے فرمایا اور آگے؟ ہم نے عرض کیا: انھوں نے ہم کو اسی قدر سنایا ہے، تو فرمایا: میں نے بیس سال پہلے یہ حدیث ان کو اس وقت سنائی تھی جبکہ وہ جوان تھے اور حافظہ بھی اچھا تھا، انھوں نے یہ حدیث پوری نہیں سنائی، پتہ نہیں وہ بھول گئے یا بالارادہ نہیں سنایا کہ کہیں تم اس پر تکیہ کرلو، ہم نے عرض کیا: حضرت! آپ سنا دیں، فرمایا: خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ[4] اللہ کے بندو! میں نے سنانے ہی کی خاطر تو اس کا ذکر کیا ہے، سنو! جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں چوتھی بار دربار خداوندی میں پھر حاضری دوں گا اور پھر اللہ رب العزت کی ویسی ہی تعریفیں بیان کروں گا جس طرح پہلے کرچکا تھا، پھر میں سجدے میں گر جاؤں گا تو مجھ سے کہا جائے گا: سر اٹھاؤ، کہو، تمہاری بات سنی جائے گی، سوال کرو، پورا کیا جائے گا شفاعت کرو، قبول کی جائے گی، میں عرض کروں گا: اے میرے رب! مجھے جہنم سے ان لوگوں کو نکالنے کی اجازت دیجئے جنھوں نے "لا الٰہ الا اللہ" کہا ہو، تو میرا رب فرمائے گا: نہیں! اس کی تم کو اجازت نہیں، لیکن مجھے اپنی عزت، کبریائی، عظمت کی قسم ان کو میں خود نکالوں گا۔ اب اس حدیث اور حدیث ابی سعید کے سیاق پر غور کرو تو ایک چیز قابل لحاظ نظر آئے گی کہ اس میں صلوٰۃ (نماز) وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا تھا: "کَانُوْا یَصُوْمُوْنَ مَعَنَا وَیُصَلُّوْنَ وَیَحُجُّوْنَ" وہ ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے اور حج کرتے تھے

---

15 (1) "ادنیٰ" کے تین بار ذکر سے قلت میں مبالغہ مقصود ہے (جامع) (2) هی الصحراء ویسمّٰی بها المقابر لانها تکون فی الصحراء وهو من تسمية الشیٔ باموضعه وقوله بظهر الجبّان ای بظاهرها واعلاها المرتفع منها (فتح الملہم) (3) ابو خلیفہ کا نام حجاج بن عتاب العبدی بصری ہے، (4) انبیاء: ۳۷۔

. . . .

حکم ہوگا جاؤ جن کو تم پہچانتے ہو نکال لاؤ، تو وہاں اعمال کا ذکر تھا اور یہاں اعمال کا ذکر نہیں ہے بلکہ ایمان کا ذکر ہے، اس لئے ترتیب میں اس حدیث کو اس حدیث کے بعد رکھو کیونکہ ایک تو اعمال جوارح ہیں جن کا ذکر وہاں ہے، اور ایک اعمال قلب ہیں، اور ان میں بھی تفاوت ہے جیسے بیاض شدید و بیاض ضعیف اور سواد شدید و سواد ضعیف، تو غالباً انسؓ کی روایت میں نفس ایمان کی کمی بیشی اور تفاضل اور قوت وضعف کا ذکر ہے اور ان میں سے آخری درجہ وہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کے دل میں بھی یہ خیال نہ ہوگا کہ اب بھی ایسا کوئی شخص باقی رہ گیا ہے جس میں ایمان ہو، یعنی ظاہراً ان میں ایمان نہ ہوگا مگر قلب میں اس قدر خفیف ایمان موجود ہوگا جس کا احساس نبی علیہ السلام کو نہ ہوگا لیکن بایں ہمہ حضورؐ وفور رحمت کی وجہ سے اللہ سے عرض کریں گے کہ خداوندا! جو لوگ خالی عن التصدیق والتکذیب ہیں اور جو صرف زبان سے ایمان کا اظہار کرتے تھے ان کی مغفرت کی بھی اجازت ہو تو ان کی بابت حق تعالیٰ فرمائے گا کہ یہ تمہارا حق نہیں ہے کیونکہ تمہیں وہیں تک حق ہے جہاں تک تمہارا علم ہے اور بظاہر نبی کو اس کا علم نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم اس کے حقدار نہیں ہو — یہ میری تشریح ہے! البتہ شراح کہتے ہیں کہ یہ متعلقات ایمان کے مراتب ہیں نہ کہ نفس ایمان کے، تم خواہ کوئی معنی لو، نفس ایمان کے مراتب لو، یا متعلقات ایمان کے، بہرحال وہ ایمان کے مراتب نہیں، اس لئے کہ حدیث میں اعمال جوارح کے مراتب ہیں اور یہاں اعمال قلب کے اب دونوں کے ملانے سے ترتیب یہ ہوگی کہ پہلے اعمال جوارح والے نکالے جائیں گے پھر اعمال قلب والے، پھر وہ لوگ جن کے قلوب میں سوائے نفس ایمان کے اور کچھ نہ ہوگا جن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ انھیں میں اپنی رحمت سے بخشوں گا، کسی کی شفاعت ان کے حق میں قبول نہ ہوگی، اس تقریر و تشریح کے بعد بخاری کی حدیث دیکھو۔

جب یہ معلوم ہوگیا کہ حدیث ابوسعید میں اعمال کا ذکر ہے تو اب من ایمان سے مراد نفس ایمان کے مراتب نہیں بلکہ عمل خیر کے مراتب ہیں، اسی لئے بخاری نے اشارہ کیا کہ وہیب کہتے ہیں من خیر لہٰذا یہاں ایمان مرادمت لو، بلکہ من خیر مراد لو، یعنی عمل، مگر عمل قلب، اور انسؓ کی روایت میں عمل قلوب کا ذکر ہے، تو اگرچہ لفظ من خیر آیا ہے مگر مراد دوسری روایت لاکر بتلادیا کہ خیر سے مراد یہاں ایمان ہے، اور جب ایمان مراد ہوا تو کمی بیشی نفس ایمان میں ہوئی لہٰذا اب مناسبت ہوگئی، یہ شاہ صاحب کی تقریر ہے اور بہترین تقریر ہے، اس کے ساتھ اتنا اور اضافہ کرلو کہ ابوسعیدؓ کی روایت میں ہے کہ بعض نصف الساقین تک اور بعض رکبتین تک نار میں ہوں گے، اس سے معلوم ہوا کہ اعمال جوارح میں بھی تفاوت ہوگا، سزا کا تفاوت اس پر صراحۃً دال ہے، اگر اعمال میں تفاوت نہ ہوتا تو سزا میں بھی تفاوت نہ ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے عدل وحکمت کے خلاف ہے یہ امر کہ غیر مستحق کو بھی ایک ہی قسم کی سزا دی جائے، تو اب ہر جگہ تفاوت ہوا، اعمال جوارح کا تفاوت ہوا اور اعمال قلوب کا بھی اور نفس ایمان میں بھی تفاوت ہوا، شراح کہتے ہیں کہ تفاوت آثار میں ہے، میں کہتا

. . . .

ہوں کہ تفاوت نفس ایمان میں بھی ہے۔

بسا اوقات بخاری لفظ ایسا لاتے ہیں کہ مناسبت ترجمہ سے نہیں ہوتی، تو شراح کہہ دیا کرتے ہیں کہ مناسبت نہیں، مگر بخاری چونکہ وسیع النظر ہیں اس لئے صرف اشارہ کر کے چھوڑ دیتے ہیں تاکہ تم دیگر طرق پر نظر رکھو اور تلاش کر کے ان تمام روایات کو جمع کرو، پھر مناسبت پر غور کرو تو ضرور مناسبت نکل آئے گی، چنانچہ یہاں بھی دوسرے طرق جمع کرنے سے مناسبت نکل آئی اور دونوں بابوں [1] کا مطلب بھی خوب عمدہ حل ہو گیا۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نفس تصدیق میں بھی تفاوت ہے، ہاں تصدیق منجی میں بیشک تفاوت نہیں، اس کی مثال میں ایک حدیث مسلم کی ہے: مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ ــــــ دوسری روایت میں ہے: فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْإِيمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ، تو تغییر بالقلب کے کیا معنی ہیں شراح لکھ دیتے ہیں کہ دل سے برا سمجھے، مگر یہ تو ہر شخص سمجھتا ہی ہے، اس میں تغییر کیا ہوا، برا سمجھنا تو عقیدہ ہوا اور تغییر کا مطلب تو یہ ہے کہ اسے بدلے، نیز لفظ جَاهَدَ اس پر صراحۃً دال ہے، محققین لکھتے ہیں کہ یہ مطلب نہیں کہ بس دل سے برا سمجھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہر وقت فکر میں لگا رہے اور کوشش کرتا رہے اور صرف ہمت کرے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اسے بدل دوں گا اور ضرور اس کا استیصال کروں گا تو یہ مجاہدہ بالقلب اور تغییر بالقلب ہے، ملا علی قاری نے مرقاۃ میں لکھا ہے کہ فبقلبہ سے مراد یہ ہے کہ اس فکر میں رہے کہ اگر قادر ہوں گا تو ضرور بدلوں گا، یہ پہلے دل میں میرے گذرتا تھا، بہت دنوں بعد مبسوط شمس الائمہ سرخسی میں دیکھا کہ ذٰلِكَ أَدْنَى الْإِيمَانِ کی تشریح کی ہے " وذلك اضعف آثار الایمان " سے، یعنی ایمان کے اثرات میں ضعیف تر اثر ہے، یہ درجہ معلوم ہوا کہ دل سے تغییر ادنیٰ آثار ایمان سے ہے، اس لفظ نے بصیرت پیدا کر دی کہ جس طرح یہاں آثار مراد ہیں، یہی انس ابن مالک کی حدیث میں بھی مراد لے لو، مگر جس کے دل میں ادنیٰ آثار ایمان بھی نہیں اور محض نفس ایمان ہے اس کے بارے میں کسی کی بھی حتیٰ کہ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی شفاعت قبول نہیں ہوگی، صرف اللہ انھیں جہنم سے نکالے گا ــــــ الحمد للہ مسئلہ بالکل منقح ہو گیا۔

---

(١) باب تفاضل الایمان اور باب زیادۃ الایمان ونقصانہ۔

۲۲ ـ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عُبَيْدِ اللّٰهِ قَالَ ثَنَا اِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ

ہم سے بیان کیا محمد ابن عبید اللہ نے، کہا ہم سے بیان کیا ابراہیم ابن سعد نے، انھوں نے صالح سے، انھوں نے

صَالِحٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ اَبِی اُمَامَةَ بْنِ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ اَنَّهٗ سَمِعَ

ابن شہاب سے، انھوں نے ابو امامہ ابن سہل ابن حنیف سے، انھوں نے سنا ابو سعید خدری سے، وہ کہتے تھے آنحضرت

اَبَا سَعِيْدِ الْخُدْرِیَّ يَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَا اَنَا

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک مرتبہ میں سو رہا تھا، میں نے (خواب میں) لوگوں کو دیکھا وہ میرے سامنے

نَائِمٌ رَاَيْتُ النَّاسَ يُعْرَضُوْنَ عَلَیَّ وَعَلَيْهِمْ قُمُصٌ مِنْهَا مَا يَبْلُغُ الثُّدِیَّ وَمِنْهَا

لائے جاتے ہیں اور وہ کرتے پہنے ہوئے ہیں، بعضوں کے کرتے چھاتیوں تک ہیں اور بعضوں کے اس سے

مَا دُوْنَ ذٰلِكَ وَعُرِضَ عَلَیَّ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَعَلَيْهِ قَمِيْصٌ يَجُرُّهٗ قَالُوْا

بھی کم اور عمر بن خطاب میرے سامنے لائے گئے وہ ایسا کرتہ پہنے ہیں جس کو سمیٹ رہے ہیں (اتنا نیچا ہے) صحابہ نے کہا:

فَمَا اَوَّلْتَ ذٰلِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ الدِّيْنَ ۔

یا رسول اللہ آپ اس کی تعبیر کیا دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: دین!

حدیث ۲۲ حدثنا محمد بن عُبید اللہ الخ قولہ ثُدِیّ جمع ثَدْیٌ کی ہے (چھاتیاں) انبیا علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے اور یہ تعبیر والا خواب تھا، ایک خواب وہ ہوتا ہے جس کی تعبیر کی ضرورت نہیں ہوتی، ممکن ہے حضورؐ نے قرآن سے استنباط کیا ہو قرآن پاک میں لباسُ التقویٰ آیا ہے جس طرح لباس ظاہری سے انسان بے شرمی اور عریانی سے بچاؤ حاصل کرتا ہے اسی طرح دین کا لباس ہر قسم کی حفاظت کرتا ہے اور جس طرح لباس ظاہر کا ساتر ہے، اسی طرح تقویٰ اور دین تمام بے حیائیوں اور فحشا اور کمزوریوں کا ساتر ہے، سب کو چھپا دیتا ہے خواب میں عمر فاروق کا قمیص اتنا بڑا دکھایا گیا جو بدن سے نیچے تھا، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب صحابہ نے اس کی تعبیر پوچھی تو آپؐ نے فرمایا دین، یعنی دین میں بعض لوگ ناقص ہیں اور بعض کامل۔ ناقص کے صرف دو ہی درجے بیان فرمائے، مقصد دو میں حصر کرنا نہیں، مثال کے طور پر دو مرتبوں کا ذکر کر دیا، جو قمیص اتنا بڑا تھا کہ بدن سے باہر تھا تو اس سے دین کا کامل ہونا بلکہ اکمل ہونا معلوم ہوتا ہے، گویا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عمر رضی اللہ عنہ کے دین کو کامل بلکہ اکمل قرار دے رہے ہیں، مگر اس سے کوئی شبہہ نہ کرے کہ عمرؓ سب سے حتیٰ کہ ابو بکرؓ سے بھی افضل ہو گئے، یہ تو مسلم ہے کہ عمرؓ کا مرتبہ صدیق اکبرؓ کے بعد سب سے اونچا ہے اور خود عمرؓ دربار نبوی میں ایک خاص درجہ اور مرتبہ رکھتے ہیں، جو بجز صدیق اکبرؓ کے کسی دوسرے کو حاصل نہیں، اس حدیث سے عمرؓ کے دین کا کمال معلوم ہو گیا لیکن اس سے دوسروں کی نفی نہیں ہوتی، کیونکہ تمام صحابہ کا ذکر نہیں

. . . .

اور اگر بالفرض ہو بھی تو ہم کہیں گے کہ خاص اعتبار سے یہ دکھلایا گیا ہے اور وہ یہ کہ فتوحات وغیرہ ان کے دور میں اتنی زیادہ ہوئیں کہ کسی دور میں اتنی زیادہ نہیں ہوئیں اسی طرح اور ظاہری فائدے جس قدر ان سے پہونچے کسی سے نہیں پہونچے ' تو فی نفسہ اپنے کمالات خصوصی کے اعتبار سے ابوبکر ہی افضل الامۃ ہیں جیساکہ امت کا اس پہ اجماع ہے مگر ظاہری طور پر غلبہ عمر فاروق ہی کے دور میں ہوا ' ابوبکر رضی اللہ عنہ کا زمانہ زمین ہموار کرنے کا تھا ' انھوں نے سارے کام کا نقشہ بنایا ' پورا منصوبہ انھیں کا بنایا ہوا تھا ' فیض نبوی نے انھیں نمونۂ نبی بنا دیا تھا ۔

صلح حدیبیہ میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نبی علیہ السلام سے دب کر صلح کرتے وقت عرض کیا تھا : اَلَسْنَا عَلَی الْحَقِّ وَھُمْ عَلَی الْبَاطِلِ ؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا : بیشک ہم حق پر ہیں اور وہ باطل پر مگر میں اللہ کا نبی ہوں ، اس کی نافرمانی نہیں کرسکتا ' حضرت عمر رضؓ یہ جواب پاکر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے تو انھوں نے بھی بالکل وہی جواب دیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا ' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عکس نبوی تھے جیساکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : ماصبّ اللہ فی قلبی صببتہ فی قلب ابی بکر ' جو چیزیں اللہ نے میرے قلب میں القاء فرمائیں میں نے وہ سب ابوبکر رضؓ کے قلب میں ڈال دیں ــــ جیش اسامہ رضؓ کے روانہ کرنے کے سلسلہ میں جو استقلال حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ظاہر فرمایا اس پر تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بھی رشک ہوتا تھا ' لہٰذا افضل و اتقیٰ تو [ابوبکر رضؓ] ہی ہیں ' ہاں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں فتوحات زیادہ ہوئیں مگر وہ بھی نقشۂ ابوبکر رضؓ کے مطابق ' لہٰذا اصل کارنامہ تو انھیں کا تھا کہ راستہ صاف کردیا ' پھر انھیں وقت بہت کم ملا ۔ اور جو ملا بھی تو اس میں مرتدین کا استیصال کیا ' مدعیان نبوت کا مقابلہ کرکے اس فتنہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیا ' رومیوں کے بالمقابل لشکر روانہ کیا ' جب راستے کے کانٹے دور ہوگئے تو عمر فاروق رضؓ کے دور میں کثرت فتوحات ' نشر اسلام اور کمال دین ظاہر ہوا ' اور یہی حدیث کا منشا ہے ۔

" جرقمیص علی الارض " سے اشارہ ہے کہ دین ان کے زمانہ میں روئے زمین پر پھیلے گا ' یہ ایک جزئی فضیلت ہوئی ــــ (مزید سمجھنے کے لیے وہ حدیث پڑھو جس میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن موذنین کو نورانی ممبروں پر بٹھایا جائے گا)

باب ۱۶ اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَانِ

حیا (شرم) ایمان کا ایک جزو ہے

۲۳ ـــ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ یُوْسُفَ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِكُ بْنُ اَنَسٍ عَنْ

ہم سے بیان کیا عبداللہ ابن یوسف نے، کہا ہم کو خبر دی (امام) مالک ابن انس نے، انھوں نے

ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ عَنْ اَبِیْهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ

ابن شہاب سے، انھوں نے سالم ابن عبداللہ سے، انھوں نے اپنے باپ (عبداللہ ابن عمر) سے کہ آنحضرت صلی اللہ

وَسَلَّمَ مَرَّ عَلٰی رَجُلٍ مِنَ الْاَنْصَارِ وَهُوَ یَعِظُ اَخَاهُ فِی الْحَیَاءِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ

علیہ وسلم ایک انصاری مرد پر گذرے اور وہ اپنے بھائی کو سمجھا رہا تھا اتنی شرم کیوں کرتا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ دَعْهُ فَاِنَّ الْحَیَاءَ مِنَ الْاِیْمَانِ

اس سے فرمایا: جانے دے، کیونکہ شرم تو ایمان میں داخل ہے۔

باب ۱۶ الحیاء من الایمان

حدیث ۲۳، حیا بیشک اچھی چیز ہے، ہاں اگر مانع عن التفقہ ہو تو مضر ہے، حیا شرعی خیر ہی خیر ہے، اگر اس میں شر آتا ہے تو عوارض اور خارجی اشیاء سے، جیسے ہتھیار فی حد ذاتہ اچھی چیز ہے مگر کوئی شخص اس سے کسی کو ناحق شہید کر دے تو یہی اچھی چیز اس عارض کی بنا پر بری ہو جائے گی، امر مباح میں حیا باب مروۃ سے ہے اور اس میں حیا کرنی چاہئے کیونکہ وہ ایک اچھی چیز ہے، شریعت جس چیز کو قبیح کہتی ہے مومن کے لئے اس میں حیا اعلیٰ وارفع ہے، ضرور کرنا چاہئے اور کبھی اس قبیح کا ارتکاب نہ کرنا چاہئے، ہاں جسے عرف برا سمجھے اور شریعت اچھا سمجھے تو پھر وہاں حیا نہ کرنی چاہئے، بات شریعت ہی کی اونچی رہے گی جیساکہ حدیث میں انصاری عورتوں کی تعریف فرمائی کہ یہ بہت اچھی عورتیں ہیں کیونکہ حیا انھیں دین سیکھنے سے نہیں روکتی۔

امام راغب نے لکھا ہے کہ حیا مرکب ہے جُبن اور عفت سے۔ آگے لکھتے ہیں کہ حیادار کبھی فاسق نہ ہوگا کیونکہ عفت کے خلاف ہے اور شجاع بہت کم مستحیی ہوتا ہے کیونکہ شجاع میں ایک جزو جُبن کی کمی ہے اسلئے حیا بہادری کو کم کر دیتی ہے اور چونکہ حیا کا ایک جزو عفت ہے اس لئے حیادار میں فسق نہ ہوگا، عبداللہ ابن مسعودؓ کی ایک روایت میں بہت شافی بیان ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: اِسْتَحْیُوْا مِنَ اللّٰہِ حَقَّ الْحَیَاءِ اللہ سے ایسی حیا کرو جیسی کرنی چاہئے، صحابہؓ نے عرض کیا: اِنَّا نَسْتَحْیِیْ مِنَ اللّٰہِ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اے اللہ کے محبوب اللہ کا شکر ہے ہم اللہ سے حیا کرتے ہیں، آپ نے فرمایا لَیْسَ ذٰلِكَ

یہ نہیں ، یعنی جس کو تم نے حیا کرنا سمجھا ہے وہ مراد نہیں ہے، حیا کا مفہوم بہت وسیع ہے، پھر نبی علیہ السلام نے خود ہی وضاحت فرمائی: وَلٰكِنَّ الْاِسْتِحْيَاءَ مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ اَنْ تَحْفَظَ الرَّأْسَ وَمَا وَعٰى ، اللہ سے حیا کرنے کا حق یہ ہے کہ سر اور سر میں جو کچھ افکار خیالات وغیرہ ہوں ان سب کی نگہداشت کرو، کوئی برا خیال اور کوئی غیر حق اس میں جگہ نہ پاسکے، برے خیالات سے دماغ و ذہن ہمیشہ صاف رہیں وَالْبَطْنَ وَمَا حَوٰى ، اور پیٹ کی اور جو کچھ پیٹ میں بھرا ہے اس کی نگرانی کرو، یعنی حرام و ناجائز غذا سے پوری طرح پرہیز کرو (کیونکہ جو بدن حرام غذا سے پلتا ہے وہ جہنم کے لائق ہوتا ہے، اس لئے اس سے پوری طرح بچو) وَتَذْكُرَ الْمَوْتَ وَالْبِلٰى ، اور موت اور موت کے بعد قبر میں جو حالت ہوتی ہے اس کو یاد کرو، موت ہمیشہ سامنے رہے اور سمجھتا رہے کہ مرنے کے بعد قبر آخرت کی پہلی منزل ہے، اسے بنانے کی فکر میں لگا رہے، آگے ایک اصول بتایا کہ حیا کا حق کون ادا کرسکتا ہے، فرمایا: وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ تَرَكَ زِيْنَةَ الدُّنْيَا وَاٰثَرَ الْاٰخِرَةَ عَلَى الْاُوْلٰى ، اور جو شخص آخرت کا طلبگار ہوگا وہ دنیا کی زیب و زینت سے علٰحدہ رہے گا اور اس چند روزہ دنیوی عیش کی زندگی کے مقابلہ میں آنے والی زندگی کی کامیابی کو اپنے لئے پسند کرے گا اور اسی کو ترجیح دے گا، پھر فرمایا: فَمَنْ يَّعْمَلْ ذٰلِكَ فَقَدِ اسْتَحْيٰى مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ پس جس نے یہ سب کچھ کر لیا اس نے اللہ سے حیا کرنے کا حق ادا کر لیا، اس حدیث نے بتایا کہ حیا کا مفہوم کس قدر وسیع ہے اور کیوں اسے الحیاء من الایمان سے تعبیر فرمایا، اب جو آدمی دنیا کا طالب ہے فکر آخرت سے اس کا دماغ خالی ہے، دنیا کی زندگی بنانے میں مرنے کے بعد والی زندگی کا بناؤ اور بگاڑ اس کے سامنے نہیں، تو زبانی جمع خرچ کتنا ہی کرے وہ اللہ سے حیا کرنے کا حق ادا کرنے والا نہیں ہوسکتا، یہی حقیقت دوسری جگہ یوں بیان فرمائی: ان لایراك مولاك حیث نهاك تمہارا آقا تم کو اس مقام پر نہ دیکھے جہاں موجود ہونے سے اس نے منع کیا ہے، وہاں ہرگز قدم نہ جائیں جہاں جانا رب تعالیٰ کو پسند نہ ہو، اسی طرح پوری زندگی گذارے اور ہمیشہ ممنوعات و منہیات سے دور بھاگے ـــــ یہ ہے اللہ سے حیا کرنا، راغب نے تو حیا کی تعریف کی تھی انقباض النفس عن القبیح، بری بات سے نفس کا منقبض ہونا حیا ہے، دوسری تعریف یہ کی گئی: هو انقباض النفس خشية ارتكاب ما یکرہ اعم من ان یکون شرعیا او عقلیا او عرفیا ، مکروہ کے ارتکاب کے خوف سے نفس کا رک جانا، چاہے وہ شرعی ہو یا عقلی ہو یا عرفی، اب اگر مکروہ شرعی کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ فاسق کہلائے گا اور مکروہ عقلی میں پڑتا ہے تو مجنون اور پاگل کہلائے گا اور اگر عرفی مکروہ میں پڑے گا تو وہ ابلہ اور بے وقوف کہلائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ حیا ہر حال میں بہتر ہے جیسا کہ حدیث میں ہے اَلْحَيَاءُ خَيْرٌ كُلُّهٗ .

بابٌ فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوۡا سَبِيۡلَهُمۡ

اس آیت کی تفسیر میں کہ پھر اگر وہ توبہ کریں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔

۲۴ — حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْمُسْنَدِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ رَوْحٍ الْحَرَمِيُّ

ہم سے بیان کیا عبداللہ ابن محمد نے، کہا ہم سے بیان کیا ابو روح ابن عمارہ نے، کہا ہم سے بیان کیا شعبہ نے، انھوں نے

ابْنُ عُمَارَةَ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ وَاقِدِ بْنِ مُحَمَّدٍ قَالَ سَمِعْتُ اَبِيْ يُحَدِّثُ

واقد ابن محمد سے، انھوں نے اپنے باپ سے، وہ عبداللہ ابن عمر سے نقل کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ

نے فرمایا مجھے (خدا کا یہ) حکم ہوا ہے کہ لوگوں سے (کافروں سے) اس وقت تک لڑوں جب تک یہ گواہی نہ دیں کہ اللہ کے

حَتّٰى يَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ

سوا کوئی سچا خدا نہیں ہے اور محمد اس کے رسول ہیں اور نماز درستی سے ادا کریں اور زکوٰۃ دیں، جب وہ یہ کرنے لگیں تو

فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَاءَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ

انھوں نے اپنی جانوں اور مالوں کو مجھ سے بچا لیا مگر اسلام کے حق سے اور ان (کے دل کی باتوں) کا حساب اللہ پر رہے گا۔

باب فان تابوا واقاموا الصلوٰة واتوا الزکوٰة فخلوا سبیلهم

مشرک کی توبہ یہی ہے کہ ایمان لے آئے اور اقامت صلوٰۃ بھی کرے اور زکوٰۃ بھی دے، اگر مشرک یہ طریقہ اختیار کرے تو حکم ہے: فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ، اس کا راستہ چھوڑ دو، اس سے تعرض نہ کرو۔ چند آیات کے بعد یہ مضمون ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ[1] اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں، امام بخاری نے ان آیتوں کی تفسیر حدیث سے بیان کردی کیونکہ دونوں کا مضمون ایک ہے، مذکورہ آیت میں جن تین چیزوں کا بیان ہے وہ تین چیزیں حدیث میں بھی مذکور ہیں اور یہی ان میں وجہ مناسبت ہے۔

الا بحق الاسلام فرما کر بتا دیا کہ مومن ہونے کے بعد بھی اگر کوئی شخص اسلامی قانون توڑنے کا مرتکب ہوگا تو اس کے خلاف کارروائی کی جائے گی، مسلمان کو بھی قانون شکنی کی اجازت نہیں دی جائے گی، مثلاً کسی کو قصداً قتل کر دیا تو اس سے قصاص لیا جائے گا

---

(۱) توبہ : ۱۱

. . . .

یا دیت لی جائے گی، اسی طرح کسی نے اگر زکوٰۃ نہ دی تو اس سے بھی مطالبہ کیا جائے گا، ہاں اب اسے کافر نہ کہا جائے گا۔

قولہ وحسابھم علی اللہ کہہ کر یہ بتلایا کہ جو آدمی شہادت دے اور نماز پڑھے، زکوٰۃ دے، تو ہم اس کے باطن کی تفتیش نہ کریں گے، ظاہر حال پر قناعت کر کے اسے مسلم قرار دیں گے، اس کی جستجو نہ کریں گے کہ یہ دل سے مسلمان ہوا ہے یا نہیں، یہ ہم اللہ کے حوالہ کردیں گے (ہاں اگر دلائل وشواہد سے وہ اپنے اس اعلان واقرار میں جھوٹا ثابت ہوگا تو اب معاملہ دوسرا ہوگا) یہی فقہاء کا مسلک ہے کہ ظاہر پر معاملہ کیا جائے گا، باطن اللہ کے حوالہ کردیا جائے گا، اب یہاں دو چیزیں بیان کرنے کی ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ عصمتِ دم وعصمت مال کو تین چیزوں پر مرتب کیا گیا ہے، اگر ان میں سے کوئی جزو فوت ہو جائے گا تو وہ معصوم نہ رہے گا اور اس کے ساتھ قتال مباح ہوگا، وہ تین چیزیں یہ ہیں: ادائے شہادت، اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ۔ اب اشکال یہ ہے کہ ایک معاہد یا ذمی کا دم ومال بھی محفوظ ہے، اسی طرح مودی جزیہ کا بھی دم محفوظ ہے، حالانکہ وہ نماز پڑھیں نہ زکوٰۃ دیں اور یہ سب یعنی معاہد و ذمی اور جزیہ دینے والے شہادت سے بھی خالی ہیں تو جو شرطیں معصوم ہونے کی تھیں وہ بالکل نہیں پائی جاتیں پھر بھی معصوم قرار دئے جاتے ہیں یہ اشکال کا خلاصہ ہے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس کے پانچ چھ جواب دئے ہیں، ایک یہ کہ یہ آیت پہلے کی ہے اور حکم جزیہ بعد کا ہے، دوسرے جواب میں فرمایا کہ اس فرمان کی مراد یہ ہے کہ جان ومال اس شخص کا محفوظ ہے جو یہ تین کام کرے یا ان تین کام کرنے والوں کے سامنے ایسا منقاد ہو جائے کہ ان کا محکوم بن جائے اور ان کی ماتحتی قبول کرلے، مثلاً معاہدہ کرلے یا جزیہ دے، خلاصہ یہ کہ اسلام کے سامنے گردن نہ اٹھائے بلکہ اس کے سامنے جھکا رہے تو وہ بھی معصوم المال والدم ہو جائے گا، میرے نزدیک یہی جواب بہتر ہے۔ واللہ اعلم۔

دوسری بات اقامت صلوٰۃ کے بارے میں بیان کرنے کی ہے، حدیث بالا سے معلوم ہوا کہ جو شخص مومن تارک صلوٰۃ ہے اس کا قتل مباح ہے، کیونکہ معصوم ہونے کے لئے جس مجموعہ کی ضرورت تھی وہ مجموعہ اب نہ رہا تو معصومیت بھی نہ رہی، چنانچہ تین امام یعنی امام احمدؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ کہتے ہیں کہ تارک صلوٰۃ معصوم نہیں بلکہ اس کا قتل واجب ہے، آگے کچھ اور تفصیل بھی ہے کہ امام احمد کہتے ہیں کہ ایسا شخص مرتد ہو جاتا ہے اور مرتد چونکہ واجب القتل ہے اس لئے یہ قتل ارتداداً وکفراً ہوا، اور اس کا نکاح بھی باطل ہو جائے گا اور میراث سے بھی محروم ہوگا، اور امام شافعیؒ وامام مالکؒ کہتے ہیں کہ قتل تو کیا جائے گا مگر یہ قتل حدّاً ہے نہ کہ ارتداداً، اس لئے کہ یہ مرتد نہیں کیونکہ جحود نہیں پایا گیا، صرف تارک عمل ہے، ہاں اگر فرضیت صلوٰۃ ہی کا انکار کرنے لگے تو بیشک اب یہ قتل ارتداداً شمار ہوگا، ورنہ ایک حد شرعی کے تحت اسے قتل کردیا جائے گا اور اس وقت یہ نہ میراث سے محروم ہوگا اور نہ اس کا نکاح باطل ہوگا۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ تارک صلوۃ نہ کافر ہے نہ واجب القتل اس لئے وہ تعزیر کا مستحق ہے، امیر کو اس کا مارنا، باندھنا، قید کرنا سب جائز ہے اسے مختلف قسم کی سزائیں دی جائیں گی اور اتنا ستایا جائے گا کہ وہ نماز پڑھنے پر مجبور ہو جائے، ابن عابدین نے تو امام صاحب کا مذہب یہ نقل کیا ہے کہ یہ سب اس وقت تک کیا جائے گا حتی یتوب او یموت، یہاں تک کہ توبہ کرے یا مر جائے۔

ائمہ ثلاثہ کے اتباع اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں، مگر حق یہ ہے کہ اس حدیث سے یہ استدلال بالکل غیر صحیح ہے، ائمہ میں خود امام شافعیؒ سے یہ رد منقول ہے، چنانچہ ایک بہت بڑے شافعی عالم شیخ تقی الدین ابن دقیق العید جو پہلے مالکی تھے، بعد میں شافعی ہو گئے تھے، شرح عمدہ میں لکھتے ہیں: ایسی دلیلوں سے استدلال علی القتل غلطی ہے، کیونکہ قتال اور قتل دو الگ الگ چیزیں ہیں، قتال کے معنی لڑائی کرنے کے ہیں، مار ڈالنے کے نہیں ہیں، اور قتل کے معنی مار ڈالنے کے ہیں، اور حدیث میں قتال آیا ہے اس کو قتل کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا اس کا بہترین شاہد حدیث کے وہ الفاظ ہیں جو سترہ کے باب میں فرمائے گئے فلیقاتل فانہ شیطان ظاہر ہے یہاں قتال سے مار ڈالنا مراد نہیں بلکہ صرف دفع کرنا مراد ہے، الفاظ حدیث یہ ہیں: اذا کان احدکم یصلی فلا یدع احدا بین یدیہ ولیدرأہ ما استطاع فان ابی فلیقاتلہ فانہ شیطان (۱) (جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو کسی کو اپنے سامنے سے گذرنے نہ دے اور جس قدر ممکن ہو اس کو دفع کرے اور روکے، پھر بھی اگر وہ نہ مانے اور گذرنے ہی پر اڑ جائے تو اس سے قتال کرے کیونکہ وہ شیطان ہے (کہ ایک نمازی کو خراب کرنے کے درپے ہے) صاف ظاہر ہے کہ یہاں قتال سے قتل مراد نہیں ہے اور اسی طرح اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ سے بھی مراد قتال ہے نہ کہ قتل، تو تارک صلوۃ کا قتل کرنا اس حدیث سے نہیں ثابت ہوتا، اس بنا پر تارک صلوۃ کے قتل پر اس حدیث سے استدلال درست نہیں ـــــ دوسری دلیل قرآن میں ہے: وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا (۲) (اگر ایمان والے دو گروہ آپس میں لڑنے لگیں تو تم صلح کرا دو) یہاں قتل مراد نہیں، نہ قتل ہوا تھا، اسی آیت میں آگے ہے: فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ (۳) (اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرنے لگے تو تم اے مسلمانو! اس زیادتی کرنے والے سے قتال کرو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم پر پلٹ آئے) یہاں مقاتلہ سے قتل ہرگز مراد نہیں، اسی طرح تارک صلوۃ سے قتال تو ہوگا مگر قتل نہ ہوگا، چنانچہ بیہقیؒ نے امام شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ لیس القتال من القتل بسبیل فقد یحل قتال الرجل ولا یحل قتلہ یعنی لڑنا حلال ہے مگر قتل کرنا حلال نہیں جس طرح حدیث سترہ میں کہ لڑنا حلال ہے مگر قتل حلال نہیں، اب حاصل یہ ہوا کہ تارک صلوۃ سے لڑیں گے، قتال کریں گے، اگر کسی بستی والے

---

(۱) فتح الملہم ۲ / ۱۰۷ (۲) الحجرات: ۹ (۳) ایضاً: ۹

. . . .

متفقہ طور پر نماز چھوڑ دیں تو امام ان سے قتال کرے گا، اس کے متعلق امام اعظمؒ سے کوئی تصریح نہیں ملی، مگر امام محمدؒ سے منقول ہے کہ اگر بستی والے اذان چھوڑ دیں تو امام وقت ان سے قتال کرے گا، اسی طرح تارک ختنہ سے بھی امام وقت قتال کرے گا، جب اذان وختنہ جیسے امور میں جو نماز کے مقابلہ میں ادنیٰ درجہ رکھتے ہیں، یہ حکم ہے تو اعلیٰ میں بطریق اولیٰ ہوگا، خلاصہ یہ کہ تارک صلوٰۃ کا قتل اس حدیث سے نہیں نکلتا۔

دوسرا قرینہ یہاں عدم قتل کا یہ ہے جس کا خصم کے پاس کوئی جواب نہیں ہے کہ آگے حدیث میں وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ بھی ہے اور مانعِ زکوٰۃ کے قتل کو کوئی نہیں کہتا بلکہ یوں فرماتے ہیں کہ تھہرا وصول کرلی جائیگی، قتل نہ کیا جائے گا، اگر تھہرا بھی وصول نہ ہوسکے تو امام قتال کرے گا، تو اب مسئلہ صاف ہوگیا کہ جس طرح مانع زکوٰۃ مستحق قتل نہیں، اسی طرح تارک صلوٰۃ بھی نہ کافر ہے نہ مستحق قتل۔

اتنا یاد رکھو کہ ابن قیم نے اپنی کتاب الصلوٰۃ میں عمدہ مواد جمع کردیا ہے، وہ بحثیں آگے آئیں گی، یہاں تھوڑا سا مضمون نقل کرتا ہوں اس نے ہمارے سارے جوابات کا قلع قمع کردیا، وہ کہتے ہیں کہ یہاں تو (یعنی حدیث مذکور میں) توجیہ کرلی مگر قرآن میں کیا کروگے جہاں فرمایا گیا ہے: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ (۱) (تو مارو مشرکین کو جہاں پاؤ اور پکڑو اور گھیرو اور بیٹھو ہر جگہ ان کی تاک میں پھر اگر وہ توبہ کریں اور قائم رکھیں نماز اور دیا کریں زکوٰۃ تو چھوڑ دو ان کا راستہ) ابن قیم کہتے ہیں کہ یہاں تو صاف قتل کا ذکر ہے نہ کہ قتال کا اور مشرکین کو اس وقت تک قتل کرنے کا حکم ہے جب تک وہ تائب ہوکر نماز بھی قائم نہ کریں۔ اس استدلال سے ابن دقیق العید کی ساری تقریریں بیکار ہوگئیں اور قتل والا مسلک ثابت ہوگیا، اس کا جواب کہیں نہیں دیکھا، اپنی سمجھ میں جو کچھ آرہا ہے اس کو ذیل میں بیان کررہا ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اولاً تو حدیث باب مقتبس ہے سورۂ برات کی آیت سے اور آیت میں قتل کا ذکر ہے اور حدیث میں قتال کا، تو اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو آیت میں قتل سے قتال مراد لیا جائے اور حدیث کو آیت کی تفسیر قرار دیا جائے، یا حدیث میں جو لفظ قتال ہے اسے قتل کے معنی میں لیا جائے بہ سبب آیت کے، عقلی قرائن بتلاتے ہیں کہ آیت میں قتال مراد ہے اس لئے کہ حدیث مفسر اور شرح ہوتی ہے آیت کی، تو گویا حضورؐ نے تنبیہ فرمادی کہ آیت میں قتل صبراً مراد نہیں ہے بلکہ قتال مراد ہے، ایسے تجوزات شائع فی اللغۃ ہیں۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ تارک زکوٰۃ کے قتل کا کوئی قائل نہیں، ہاں اگر تارک زکوٰۃ بہت سی جماعت ہو تو امام کو محاربہ کا حکم ہے اور یہ مسئلہ اجماعی ہے اور جب تارک زکوٰۃ پر عدم قتل کا اجماع ثابت ہوگیا تو اب دیکھو کہ قرآن میں تخلیۂ سبیل کی جو تین شرطیں مذکور ہیں ان میں زکوٰۃ بھی ہے

---

(۱) توبہ : ۵

. . . .

اب اگر آیت میں لفظ قتل کو اپنے ہی معنیٰ میں لیا جائے تو تارک زکوٰۃ کو قتل کرنا ہوگا، حالانکہ سب اس پر متفق ہیں کہ اس کے قتل کا حکم نہیں ہے، تو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ آیت میں بھی قتال ہی مراد ہے اور حدیث کو آیت کی تفسیر قرار دیا جائے گا، اس سے بخاری کی دقت نظر معلوم ہوتی ہے کہ ترجمۃ الباب میں آیت کو رکھا اور حدیث لائے اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ والی، بخاری کی اس دقت نظر پر نظر رکھتے ہوئے میرا گمان یہ ہے کہ ان کا منشا یہ ہے کہ اپنا اشکال رفع کرلو اور سمجھ لو کہ آیت میں گو لفظ قتل ہے مگر مراد قتال ہے جیساکہ حدیث باب نے اسے واضح کردیا، میرے نزدیک اب ابن قیم کا جواب مکمل ہوگیا، اسی طرح اس جواب سے امام بخاری کی دقت نظر بھی واضح ہوگئی۔

اوپر میں نے تارک زکوٰۃ کے عدم قتل پر اجماع نقل کیا ہے، گو امام احمدؒ کی ایک روایت عدم فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ کی ہے مگر اصح وہی ہے جو میں نے نقل کیا۔

اب میں ایک اور چیز نقل کرتا ہوں، امام نووی نے کہا ہے کہ مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ عَمَدًا يُقْتَل (جس نے قصداً نماز چھوڑی اسے قتل کیا جائے گا) اور جب تارک زکوٰۃ کے متعلق پوچھا گیا تو کہا حکمهما واحد (دونوں کا حکم ایک ہی ہے) یعنی تارک صلوٰۃ ہی کی طرح تارک زکوٰۃ کو بھی قتل کیا جائے گا، امام نووی کی اس بات کا حفاظ نے رد کیا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے بھی رد کیا ہے، میرے خیال میں نووی کا مقصد لفظ قتال سے نہیں ہے نہ نووی نے اس سے استدلال کیا ہے بلکہ نووی کا مستدل فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَاءَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ ہے اور عصمت جان اور عصمت مال دونوں کے اس مجموعہ کا ترتب اس وقت ہوگا جب یہ تین امور متحقق ہو جائیں، یعنی عصمت جان و مال اس وقت ہوگی جب شہادت، اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ تینوں موجود ہوں، اگر کوئی جزو فوت ہوا تو عصمت بھی فوت ہو جائے گی، آگے تفصیل ہے کہ اگر پہلا جزو یعنی شہادت فوت ہے تو مجموعۂ عصمتِ دم و عصمتِ مال بھی فوت ہے، نہ اس کی جان محفوظ ہے نہ مال[1] اور اگر دوسرا جزو یعنی صلوٰۃ فوت ہے تو اس وقت عصمت مال منتفی نہیں ہوتی بلکہ عصمت دم اٹھ جاتی ہے (یعنی تارک صلوٰۃ کے قتل کے جو لوگ قائل ہیں وہ اس سے استدلال کرتے ہیں) اور اگر تیسرا جزو ایتاء زکوٰۃ فوت ہوا تو عصمت مال اٹھ جاتی ہے نہ کہ عصمت دم، اس تعبیر سے یہ کلام نہایت حکیمانہ ہو جاتا ہے، اگر تینوں ہیں تو سب کچھ ہے اور تینوں نہیں تو کچھ نہیں، نہ عصمتِ دم، نہ عصمتِ مال۔ اگر ایک جزو صلوٰۃ فوت ہوا تو عصمت دم اٹھ گئی[2] اور اگر ایتاء زکوٰۃ فوت ہوا تو عصمت مال جاتی رہی کیونکہ یہ روح ہے اعمال مالی کی[3]۔

اس تقریر کے بعد اب شیخ تقی الدین کی تقریر نہیں کام دے گی اور اس کا جواب احناف کو دینا ہوگا کیونکہ حنفیہ ہی تارک صلوٰۃ کے

---

(۱) معاہد الگ چیز ہے (جامع) (۲) کیونکہ یہ روح ہے اعمال بدنی کی (جامع) (۳) اس تشریح سے معلوم ہوا کہ امام نووی تارک زکوٰۃ کے بھی قتل کا فتویٰ دیتے ہیں (جامع)

.   .   .   .

قتل کے منکر ہیں، یہ بہت قوی اشکال ہے اور بظاہر اس کا جواب نہیں، میں کہتا ہوں کہ اگر امام اعظم سے منقول لفظ حتّٰی یتوب او یموت کو یاد کرو تو اس اشکال کا جواب مل جائے گا، غور کرو امام صاحب کی کیا مراد ہے؟ مراد یہ ہے کہ تارک صلوٰۃ امام صاحب کے نزدیک بھی معصوم الدم نہیں ہے فرق صرف اتنا ہے کہ دیگر ائمہ مہلت نہیں دیتے فوراً قتل کا حکم دیتے ہیں اور امام صاحب مہلت دیتے ہیں اور فرماتے ہیں سسکا سسکا کر مارو، مرنے کی پرواہ مت کرو، مرجانے دو، مگر جلدی نہ کرو، قید کردو، بھوکا رکھو، اتنا مارو کہ خون بہنے لگے، پھر بھی جان محفوظ نہیں حتی یتوب او یموت —— تو کون کہہ سکتا ہے کہ امام ابو حنیفہ جان کو محفوظ کہتے ہیں، ہاں موقع ضرور دیتے ہیں ورنہ یہ الفاظ کیوں کہتے کہ اگر توبہ کرے تو بچ جائے گا۔ اس کے بعد آیت قرآن پر غور کرو، فرمایا گیا: فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ، پکڑو، باندھو، گھات لگاؤ، جانے مت دو، قتل کردو، اس کے بعد فرماتے ہیں: فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ، اب اگر وہ توبہ کرکے مسلمان ہوجائیں اور نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، سوچو کہ فاقتلوا میں غایت نہیں بیان کی گئی اور حدیث میں غایت بیان کی گئی حتّٰی یشھدوا الخ پھر آیت میں ایک مستانف حکم فرماتے ہیں: فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ تخلیۂ سبیل عام ہے اس کا بھی ہوسکتا ہے جس کو مارا جائے اور اس کا بھی جس کو گھیرا جائے اور اسکا بھی جس کو باندھا جائے۔ معلوم ہوا کہ یہ صرف فاقتلوا کے مقابلہ میں نہیں لایا گیا ورنہ یوں فرماتے فلا تقتلوا یعنی آیت یوں ہوتی فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَلَا تَقْتُلُوْهُمْ، مگر آیت یوں ہے: فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ، یعنی اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں تو اب راستہ چھوڑ دو، نہ مارو، نہ باندھو، نہ گھات میں بیٹھو۔ تو ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ راستہ نہیں چھوڑا جائے گا جب تک تین چیزیں پائی جائیں، تو قرآن نے دو باتیں بتلائی ہیں، مشرکین کے لئے قتل وحصر وغیرہ اور غیر مشرکین کے لئے تخلیۂ سبیل بشرطیکہ اشیاء ثلٰثہ پائی جائیں، اس تقریر سے امام ابو حنیفہ کا مسلک قرآن وحدیث کے عین مطابق ہے، کوئی چیز بھی اس کے خلاف نہیں، بلکہ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ مدعا کو اور واضح کررہا ہے کہ یہ صرف فاقتلوا کے مقابل نہیں ورنہ فلا تقتلوا فرمایا جاتا عصمت دم نہ ہونے کے معنی یہی تو ہیں کہ اس کا خون محترم نہ رہے اور یہ واقعہ ہے کہ امام ابو حنیفہ اس کے خون کو محترم نہیں کہتے، اسی لئے فرماتے ہیں مارو، باندھو، حتی یتوب او یموت —— الحمد للہ حنفیہ کا مسلک پوری طرح واضح ہوگیا اور قرآن وحدیث کے ساتھ اس کی مطابقت ثابت ہوگئی (۱)

---

(۱) اتنی بات اور واضح ہوگئی کہ تارک صلوٰۃ کا خون محترم نہیں اور اس کو جینے کا حق نہیں، یہ تو سب کے نزدیک ہے اور چاروں امام اس پر متفق ہیں، فرق یہ ہے کہ تین امام تو فرماتے ہیں قتل کردو دیر نہ کرو، امام احمد فرماتے ہیں کہ یہ قتل ارتداداً ہے اور امام شافعی وامام مالک فرماتے ہیں یہ قتل حداً ہے، مگر امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں اس کی زندگی مفلوج اور اس قدر اجیرن کردو کہ وہ خود مرجائے اور تمھیں قتل کی ضرورت نہ پیش آئے یعنی زندگی کا حق اس کو نہیں رہا، دوسری بات یہ واضح ہوگئی کہ امام نووی کے نزدیک بھی تارک زکوٰۃ کا قتل نہیں جیسا کہ اجماعِ امت ہے وہ صرف عصمت مال کا اٹھ جانا بتاتے ہیں۔ (جامع)

بابٌ مَن قَالَ اِنَّ الْاِیمَانَ هُوَالْعَمَلُ لِقَوْلِ اللّٰہِ تَعَالٰی (وَتِلْکَ الْجَنَّۃُ

اس شخص کی دلیل جو کہتا ہے کہ ایمان ایک عمل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (سورۂ زخرف میں) فرمایا: یہ جنت جس کے

الَّتِیْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ) وَقَالَ عِدَّۃٌ مِّنْ اَھْلِ الْعِلْمِ فِیْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی (فَوَرَبِّکَ

تم وارث ہوئے تمہارے عمل کا بدلہ ہے۔ اور کئی عالموں نے اس آیت کی تفسیر (جو سورۂ حجر میں ہے) فرمایا قسم تیرے مالک کی

لَنَسْئَلَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ) عَنْ قَوْلِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، وَقَالَ (لِمِثْلِ ھٰذَا

ہم ان سب لوگوں سے ان کے عمل کی باز پرس کریں گے، یہ کہا ہے کہ لاالٰہ الا اللہ کہنے سے، اور (سورۂ والصّٰفّٰت میں) فرمایا ایسی ہی کامیابی

فَلْیَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ)

کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔

لطیفہ امام شافعی امام احمد کے استاد ہیں، طبقات الشافعیہ میں ان دونوں استاد شاگرد کا ایک دلچسپ مناظرہ منقول ہے کہ امام شافعی نے امام احمد سے فرمایا: میں نے سنا ہے کہ تم تارک صلوٰۃ کو کافر کہتے ہو؟ جواب دیا: ہاں! امام شافعی نے پھر پوچھا: کیا ترک صلوٰۃ سے کافر ہوگیا؟ تو جواب میں کہا: ہاں! اس کے بعد امام شافعی نے دریافت فرمایا: اگر توبہ کرنا چاہے تو کیا کرے؟ امام احمد نے کہا: کلمہ پڑھ لے۔

بابٌ من قال ان الایمان ھوالعمل الخ

ایمان عمل ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ احتمال کے درجہ میں دو معنی مراد ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ عمل سے قلب کا عمل مراد ہو، تو اس ان لوگوں کا رد ہوگا جو کہتے ہیں کہ ایمان نفس معرفت کا نام ہے خواہ اضطراراً ہو یا اختیاراً، یہ قول کرامیہ ومرجئہ کا ہے، اہل سنت کہتے ہیں کہ نفس معرفت ایمان نہیں قرآن میں ہے: اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ[1] (جن کو ہم نے دی ہے کتاب پہچانتے ہیں اس کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو) مگر وہ اس معرفت سے مومن نہ ہو سکے، معلوم ہوا کہ نفس معرفت ایمان نہیں بلکہ اس میں التزام (ماننا) شرط ہے، اسی التزام کا نام ایمان ہے اور یہ افعال نفس میں سے ہے، تو اب امام بخاری کا مطلب یہ ہوگا کہ ایمان عمل قلب ہے، نفس معرفت نہیں دوسری مراد یہ ہو سکتی ہے کہ ایمان میں عمل یعنی عمل جوارح بھی داخل ہیں، پہلی صورت میں مرجئہ وغیرہ کا رد ہوگا اور دوسری صورت میں جزئیت ایمان کے منکرین کا۔

قولہ وَتِلْکَ الْجَنَّۃُ الَّتِیْٓ اُوْرِثْتُمُوْھَا الخ (اور یہ جنت وہ ہے جس کے تم وارث بنائے گئے ہو) یہاں سوال پیدا

---

(۱) بقرہ: ۱۴۶

. . . .

ہوتا ہے کہ اِرث تو آبا، واجداد سے ملتی ہے، جنت کیونکر ارث بنی جوان کو وراثت میں ملی؟ تو اس کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں، میرے نزدیک بہتر توجیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت دی تھی تو گویا وہ اس کے مالک تھے اور جب حضرت آدمؑ مالک تھے، تو انھیں کی اولاد ہم ہیں اور باپ دادا کا ترکہ اولاد ہی کو ملتا ہے، لہٰذا ہم کو ان کی اِرث ملی اور ہم اس کے وارث ہوئے، اسی بناء پر لفظ اِرث ارشاد فرمایا گیا ہے یہ توجیہ شاہ عبدالقادرؒ نے فوائد میں ذکر فرمائی ہے، یہ تو وراثت کا جواب ہوا۔

امام بخاریؒ نے آگے جو دلائل پیش کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پہلے معنیٰ یعنی عمل مراد لئے ہیں اور اسی کو ثابت کرنے کے لئے یہ آیت "وتلك الجنة التی اورثتموها بما كنتم تعملون" پیش کی ہے، یہ مسلم امر ہے کہ دخول جنت کا مدار ایمان ہے، یہاں "بما كنتم تعملون" سے معلوم ہوا کہ ایمان مراد ہے، یعنی تم جنت کے وارث ایمان کی وجہ سے بنائے گئے ہو، تو امام بخاری نے کہا دیکھو اللہ نے ایمان پر عمل کا لفظ ارشاد فرمایا، بجائے "بما كنتم تؤمنون" کے "بما كنتم تعملون" ارشاد فرمایا، معلوم ہوا کہ ایمان ہی عمل ہے، اگر عمل کو عمل جوارح اور عمل قلب دونوں کے لئے عام لیا جائے تب بھی درست ہے، اللہ نے فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ[1] (بیشک جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کے لئے جنتیں ہیں) مگر ظاہر یہی ہے کہ عمل قلب مراد ہے

قال عدة من اهل العلم فی قوله تعالیٰ: فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ الخ یعنی بہت سے اہل علم نے اس آیت میں "عما كانوا يعملون" سے قول "لا اله الا الله" مراد لیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قسم آپ کے رب کی ہم ان سب (اہل کفر سے) ضرور پوچھیں گے، لا الٰہ الا اللہ کے بارے میں، صراحۃً دال ہے کہ ایمان پر عمل بولا گیا، قرینہ اس پر یہ ہے کہ یہاں کفار کا ذکر ہے، اس سے پہلے کی آیت سے انھیں کفار کا ذکر چلا آ رہا ہے كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ۝[2] (جیسا کہ ہم نے ان لوگوں پر نازل کیا ہے جنھوں نے حصے کر رکھے تھے، یعنی آسمانی کتب کے مختلف اجزاء قرار دے رکھے تھے) ظاہر ہے کہ یہ کافر ہی تھے، تو یہ سوال کافروں سے ہوگا، کیونکہ یہ متفقہ طور پر ثابت ہے کہ کفار سے ایمان کا مطالبہ ہوگا اور اسی کے مکلف ہیں، اس میں تو کوئی اختلاف نہیں، ہاں اعمال کے لحاظ سے بھی مکلف ہیں یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، تو ان اہل علم کا یہ کہنا ہے کہ یہاں آیت میں "عما كانوا يعملون" سے یقیناً قول لا الٰہ الا اللہ مراد ہے کیونکہ عمل کے مکلف ہونے میں اختلاف ہے، تو عمل مراد کیسے بن سکتے ہیں، لہٰذا امام بخاری کی بات ثابت ہوگئی کہ عمل بول کر ایمان مراد لیا۔

---

(۱) بروج: ۱۱ (۲) الحجر: ۹۰، ۹۱

۲۵ـــ حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ يُوْنُسَ وَمُوْسَى بْنُ اِسْمَاعِيْلَ قَالَا حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ
ہم سے بیان کیا احمد ابن یونس اور موسیٰ ابن اسماعیل نے، کہا دونوں نے ہم سے بیان کیا ابراہیم بن سعد نے

بْنُ سَعْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ شِهَابٍ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ
کہا ہم سے بیان کیا ابن شہاب نے، انھوں نے سعید ابن مسیب سے، انھوں نے ابوہریرہؓ سے کہ (لوگوں نے) آنحضرت

رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ اَيُّ الْعَمَلِ اَفْضَلُ؟ فَقَالَ اِيْمَانٌ بِاللّٰهِ
صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کون سا عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ اوراس کے رسول پر ایمان لانا، کہا پھر

وَرَسُوْلِهٖ، قِيْلَ ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، قِيْلَ ثُمَّ مَاذَا؟
کون سا (عمل)؟ فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد کرنا، کہا پھر کون سا عمل؟ فرمایا:

قَالَ حَجٌّ مَّبْرُوْرٌ
وہ حج جو مبرور ہو

قولہ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ (ایسی ہی کامیابی کیلئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے) "ھٰذا" سے اشارہ "فوز عظیم" کی طرف ہے جس کا اس سے پہلی آیت میں ذکر ہے، اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (1) (یقیناً یہی عظیم الشان کامیابی ہے) اور یہ فوز عظیم ہی ایمان ہے۔

ان آیات ثلاثہ سے اشارہ تھے کہ ایمان از قبیل فعل نفس ہے اور قول قلب ہے نہ کہ از قبیل ادراک، کما قال المنطقیون۔

حدیث ۲۵ قولہ اَيُّ الْعَمَلِ اَفْضَلُ؟ کون سا عمل افضل ہے؟ جواب میں فرمایا: "الایمان باللہ و رسولہ" یہاں ایمان کو عمل کے جواب میں بولا گیا جب ہی تو جواب سوال پر منطبق ہوگا، ورنہ انطباق نہ ہوگا، اس قسم کی متعدد روایتیں ہیں اس کی پوری تقریر باب اطعام الطعام من الاسلام میں گذر چکی ہے، فانظر ہناک۔

یہاں تین باتیں بیان فرمائیں اور تینوں عمل میں بہت شاق ہیں، ان میں جو کامیاب ہوگیا بس وہی حقیقۃً کامیاب ہے، ان میں سے سب سے مشکل کام پچھلا دین (شرک وکفر) چھوڑنا اور اللہ و رسول پر ایمان لانا ہے، دیکھو اہل کفر و شرک نے جانیں دے دیں مگر ایمان باللہ قبول نہ کیا، تو اپنے مذہب کو چھوڑنا بہت شاق عمل ہے اسی لئے اس کو افضل فرمایا گیا، اور یہ

---

(1) الصافات: ۶۰

باب [۱۹] اِذَا لَمْ يَكُنِ الْإِسْلَامُ عَلَى الْحَقِيْقَةِ وَكَانَ عَلَى الْإِسْتِسْلَامِ

کبھی اسلام سے اس کے حقیقی (شرعی) معنی مراد نہیں ہوتے، بلکہ ظاہری تابعداری یا

اَوِ الْخَوْفِ مِنَ الْقَتْلِ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ

جان کے ڈر سے مان لینا جیسے اللہ تعالیٰ نے (سورۂ حجرات میں) فرمایا: گنوار لوگ کہتے ہیں ہم ایمان لائے،

قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا فَاِذَا كَانَ عَلَى الْحَقِيْقَةِ فَهُوَ عَلٰى قَوْلِهٖ جَلَّ ذِكْرُهٗ اِنَّ الدِّيْنَ

(اے پیغمبرؐ!) ان سے کہدے تم ایمان نہیں لائے، یوں کہو ہم اسلام لائے، لیکن اسلام جب اپنے حقیقی معنی (شرعی معنی)

عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ الآیۃ

میں ہوگا تو وہ اسلام ہوگا جو (سورۂ آل عمران) کی اس آیت میں مراد ہے کہ اللہ کے نزدیک (سچا) دین اسلام ہے؛ (آخر تک)

نفل سے مشتق ہے، اس کے معنی زیادتی کے ہیں، مشہور ہے العطایا علی متن البلایا۔

اس کے بعد جہاد کا نمبر ہے اور یہ واقعہ ہے کہ یہ بھی بہت مشکل کام ہے، اس میں جانی اور مالی ہر قسم کی قربانی دینی پڑتی ہے اور یہ بڑے دل گردے کا کام ہے، اسی لئے ایمان کے بعد یہاں اس کا ذکر فرمایا۔

اس کے بعد حج مبرور ہے، یعنی ایسا حج جسمیں کسی جنایت کا ارتکاب نہ ہو، فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ [1] (پھر جس نے لازم کرلیا ان میں حج تو بے حجاب ہونا جائز نہیں عورت سے اور نہ گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا حج کے زمانہ میں) یعنی حج میں یہ سب چیزیں چھوڑنی ہوں گی، ایسا حج جس میں جنایت کا ارتکاب نہ ہو اور خالص خدا کی خوشنودی کے لئے ہو اس کا درجہ بہت بلند ہے، ایسا حاجی اس طرح لوٹتا ہے جیسے ماں کے پیٹ سے بے گناہ پیدا ہوا تھا اسی طرح اب پاک صاف ہوکر لوٹا، اس کی علامت یعنی حج مقبول کی علامت یہ بتلائی گئی کہ حج کے بعد کی زندگی دینی اعتبار سے حج سے پہلے کی زندگی سے بہتر ہو

باب [۱۹] اذا لم یکن الاسلام علی الحقیقۃ الخ

پہلے یہ سمجھ لو کہ بخاری کا مقصود اب تک تمام ابواب کے مجموعہ سے یہ معلوم ہوا کہ دین، اسلام، ایمان، زہد، تقویٰ، بر وغیرہ درحقیقت سب ایک ہیں مگر وہ سب زائد و ناقص ہوتے ہیں، تو اب یہ شبہہ ہوتا ہے کہ بخاری تو ان میں کوئی فرق نہیں کرتے اور سب کو ایک بتاتے ہیں مگر قرآن کی اس آیت میں تو فرق بیان کیا جارہا ہے، فرمایا: قالت الاعراب اٰمنا قل لم تؤمنوا

---

(۱) بقرہ : ۱۹۷

۲۶۔ حَدَّثَنَا اَبُو الْيَمَانِ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ

ہم سے بیان کیا ابوالیمان (حکم ابن نافع) نے، کہا ہم کو خبر دی شعیب نے، انھوں نے زہری سے

اَخْبَرَنِي عَامِرُ بْنُ سَعْدِ بْنِ اَبِي وَقَّاصٍ عَنْ سَعْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

کہا مجھ کو خبر دی عامر ابن سعد ابن ابی وقاص نے، انھوں نے اپنے باپ سعد ابن ابی وقاص سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطٰى رَهْطًا وَسَعْدٌ جَالِسٌ فَتَرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

نے چند لوگوں کو کچھ مال دیا اور سعد بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے ایک شخص (جعیل ابن سراقہ) کو چھوڑ دیا (نہ دیا) وہ

وَسَلَّمَ رَجُلًا هُوَ اَعْجَبُهُمْ اِلَيَّ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا لَكَ عَنْ فُلَانٍ فَوَاللّٰهِ

ان سب لوگوں میں مجھے زیادہ پسند تھا، میں نے کہا یا رسول اللہ آپ نے فلاں شخص کو چھوڑ دیا، قسم خدا کی

اِنِّيْ لَاَرَاهُ مُؤْمِنًا فَقَالَ اَوْ مُسْلِمًا فَسَكَتُّ قَلِيْلًا

میں تو اس کو مومن سمجھتا ہوں، آپ نے فرمایا: یا مسلم؟ پھر تھوڑی دیر میں چپ رہا

وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا[1] (اعراب نے کہا ہم ایمان لائے، آپ فرما دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے لیکن یوں کہو کہ ہم اسلام لائے۔) اس سے ایمان اور اسلام الگ الگ معلوم ہوتے ہیں، نیز یہ بھی بتلا رہا ہے کہ ایمان کی طرح اسلام کے بھی مراتب ہیں، ایک وہ کہ آخرت میں نافع ہو، ایک یہ کہ صرف دنیا میں نافع ہو جیسا کہ منافقین کا اسلام ہے کہ دنیا میں ان کو نفع پہونچ گیا مگر آخرت میں کچھ نہیں بلکہ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ[2] (بیشک منافق جہنم کے سب سے نیچے کے طبقے میں ہوں گے) اور مفید وہ اسلام ہے جو مع الایمان ہو، بخاری اس شبہہ کا جواب دے رہے ہیں کہ ہماری مراد وہ اسلام ہے جو دل میں گڑا ہوا ہو اور حقیقت پر ہو وہ عین ایمان ہے، اور اگر صرف استسلام ہے یعنی ظاہری انقیاد واطاعت۔ یا قتل کے خوف سے کلمہ پڑھ لیا، غور کرو دو لفظ ہیں، ایک استسلام دوسرا خوف قتل، یہ دونوں عام وخاص ہیں، استسلام عام ہے کہ کبھی قتل اور کبھی طمع وغیرہ سے ہوتا ہے، اور "الخوف من القتل" خاص ہے "اذا لم يكن الاسلام على الحقيقة" کی جزا "لا ينفع في الآخرة" محذوف ہے، یعنی یہ استسلام آخرت میں نافع نہیں اور غیر نافع ہونے کی دلیل ہے: قالت الاعراب آمنا الخ یعنی یہ آیت ان کے حق میں ہے جن میں صرف ظاہری اطاعت تھی ایمان نہ تھا لیکن بعض کہتے ہیں کہ ایمان تھا مگر راسخ نہ تھا، ان کے لئے فرمایا "آمنا" مت کہو "اسلمنا" کہو، کیونکہ "آمنا" ان کی شان کے لائق ہے

---

(۱) حجرات: ۱۴ (۲) نساء: ۱۴۵

ثُمَّ غَلَبَنِیْ مَا اَعْلَمُ مِنْهُ فَعُدْتُ لِمَقَالَتِیْ فَقُلْتُ مَا لَكَ عَنْ فُلَانٍ فَوَاللّٰهِ اِنِّیْ

پھر جو حال میں اس کا جانتا تھا اس نے زور کیا، میں نے دوبارہ عرض کیا آپ نے فلاں شخص کو کیوں چھوڑ دیا، قسم خدا کی میں اس کو

لَاُرَاهُ مُؤْمِنًا فَقَالَ اَوْ مُسْلِمًا، فَسَكَتُّ قَلِيْلًا ثُمَّ غَلَبَنِیْ مَا اَعْلَمُ مِنْهُ فَعُدْتُ

مومن جانتا ہوں، آپ نے فرمایا: یا مسلم؟ پھر تھوڑی دیر میں چپ رہا، پھر جو حال میں اس کا جانتا تھا اس نے زور کیا، میں نے

لِمَقَالَتِیْ وَعَادَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ يَا سَعْدُ اِنِّیْ لَاُعْطِی الرَّجُلَ

تیسری بار وہی عرض کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی فرمایا اس کے بعد یہ فرمایا: اے سعد! میں ایک شخص کو کچھ دیتا ہوں اور

وَغَيْرُهُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْهُ خَشْيَةَ اَنْ يَّكُبَّهُ اللّٰهُ فِی النَّارِ، رَوَاهُ يُوْنُسُ وَصَالِحٌ وَمَعْمَرٌ

دوسرے شخص کو اس سے اچھا سمجھتا ہوں، مجھے یہ ڈر رہتا ہے کہ کہیں اللہ اس کو اوندھا دوزخ میں نہ دھکیل دے، اس حدیث کو یونس اور

وَابْنُ اَخِی الزُّهْرِیِّ عَنِ الزُّهْرِیِّ

صالح اور معمر اور زہری کے بھتیجے نے (شعیب کی طرح) زہری سے روایت کیا ہے

جن کے قلوب میں ایمان راسخ ہو، فاذا كان على الحقيقة یعنی اسلام کا منشا ایمان قلبی ہو فهو على قوله اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (۱) (اللہ کے نزدیک اسلام ہی معتبر ہے) اس سے مراد ظاہری انقیاد نہیں، کیونکہ محض ظاہری انقیاد نار کے درک اسفل میں پہونچاتا ہے بلکہ وفاداری کامل قلباً وقالباً، ظاہراً و باطناً مراد ہے۔

حدیث ۲۶۔ رَهْط تین سے دس تک کی جماعت کو کہتے ہیں۔

سَعْد رضی اللہ عنہ، یہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتے میں ماموں ہوتے تھے، اور وہ آدمی جس کو حضورؐ نے نظر انداز فرما دیا تھا اعلیٰ طبقہ کے مسلمان تھے، ان کا نام جعیل ابن سراقہ تھا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند لوگوں کو کچھ مال دیا اور انھیں نظر انداز فرما دیا تو حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو خیال ہوا کہ یہ تو بڑے اچھے صحابی ہیں، اس عطیہ سے یہ کیوں محروم رہ گئے، تو فرماتے ہیں کہ میں نے حضورؐ سے عرض کیا۔ اور بعض روایات میں فسارَرتُه آیا ہے، یعنی میں نے چپکے سے عرض کیا، اس سے ادب معلوم ہوا، حضورؐ کی تعلیمات نے صحابہ کو بڑا ہی مودب بنا دیا تھا، وہ اگر کوئی بات کہنا بھی چاہتے تھے تو ادب نبویؐ کا پورا لحاظ رکھتے تھے۔ دنیا کے لئے اس میں سبق اور تعلیم بھی ہے کہ اگر چھوٹے کو کسی بات میں شبہہ ہو تو بڑے کا ادب و لحاظ رکھ کر چپکے سے عرض کرے

---

(۱) آل عمران : ۱۹

. . . .

مجمع میں زور سے نہ کہے۔ حضرت سعدؓ نے عرض کیا: حضور! آپ نے انھیں چھوڑ دیا فواللہ انی لاراہ مؤمنًا خدا کی قسم میں تو ان کو مومن گمان کرتا ہوں یہاں "اُراہ" بالضم ہے، بالفتح نہیں ہے، "اُراہ" اَظُنُّہٗ کے معنی میں ہے، یعنی میں گمان کرتا ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَوْمُسلمًا یعنی تم قطعی مومن ہونے کا حکم کیوں لگاتے ہو، تم قلب کا حال کیا جانو، یا یہ مطلب ہو کہ مسلم کا لفظ کہو یا مومن و مسلم دونوں لفظ بولو، اس سے معلوم ہوا کہ مومن اور مسلم میں فرق ہے، اسلئے کہ اسلام تو ظاہری انقیاد میں بھی ہے اور ایمان مخصوص ہے قلب کے رسوخ پر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ کسی کو حق نہیں ہے کہ باطنی امور پر قطعی حکم لگائے خاص طور سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موجود ہوتے ہوئے ایسا قطعی حکم لگانا ہرگز مناسب نہ تھا اس لئے اس کی اصلاح فرمائی کہ ایسا مت کرو، خواہ وہ صدیق ہی کیوں نہ ہو مگر تمھیں ایسا حکم لگانے کا حق نہیں خصوصًا حضور نبوی میں، پھر ایک بار بھی نہیں تین تین بار اور وہ بھی قسم کے ساتھ ــــ مسلم وغیرہ میں ایک لفظ زائد ہے اَقِتَالًا یَاسَعْدُ! اے سعد کیا تو مجھ سے جھگڑتا ہے اور لڑتا ہے ــــ دیکھو لفظ قتال فرمارہے ہیں اور یہ لفظ قتال وہی ہے جو حدیث اُمِرْتُ ان اقاتل میں آیا ہے، ظاہر ہے یہاں قتال کے معنی قتل کے نہیں ہیں، اسی طرح امرت ان اقاتل میں بھی قتل مراد نہیں ہے، خیر درمیان میں ایک موقع کی بات آگئی، اس سے آگاہ کر دیا ــــ تو نبی علیہ السلام نے حضرت سعد کو ایک بات تو یہ سمجھائی کہ کسی کے باطن پر حکم لگانے کی اجازت نہیں اور دوسری بات یہ فرمائی کہ تم نے یہ سمجھا کہ میں نے اس کو اس بنا پر نظر انداز کر دیا کہ میرے نزدیک وہ اچھا آدمی نہیں ہے، اس لئے تم بار بار اصرار کر کے یقین دلا رہے ہو کہ وہ اچھا آدمی ہے، تو تمھارا ایسا سمجھنا غلط ہے، میرے چھوڑنے کی وجہ وہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو، بلکہ میرا منشا ضعفار مومنین کے دین کی محافظت ہے، یعنی میں نے جن کو دیا وہ ضعفار الایمان اور مولفۃ القلوب میں سے ہیں، اگر انھیں کھانے کو نہ ملے تو ممکن ہے بھوک کی وجہ سے اسلام ہی سے پھر جائیں اور جو قوی الایمان ہے اسے کتنے ہی فاقے کیوں نہ ہوں وہ گھبرا نہیں سکتا، تو جسے ضعیف الایمان سمجھتا ہوں اسے دیتا ہوں (اور جعیل ایسے ہیں نہیں اس لئے انھیں نہیں دیا)

یہاں دو مسئلے ہیں اور دونوں کا الگ الگ حکم ہے، ایک ضعیف الایمان کا مسئلہ ہے کہ وہ مسلمان تو ہو چکا ہے مگر ابھی مکمل پختگی نہیں آئی، خطرہ ہے کہ کہیں معاشی تنگی کی وجہ سے اس کے قدم نہ اکھڑ جائیں، تو اس کی مدد کرنا، تاکہ وہ جم جائے، ابھار دیہ ہے، اور ایک مومن کے دین کی حفاظت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جماعت کے دین کی حفاظت کی خاطر مدد فرمائی، جیسا کہ خود فرمایا کہ اس ڈر سے دیتا ہوں کہ کہیں اس کو اللہ دوزخ میں اوندھا نہ ڈھکیل دے، تو یہ تھی دین کی حفاظت۔

اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ایمان لانے سے پہلے کوئی کہے کہ روپیہ دو تو ایمان لاویں جیسے ملکانہ کہتے تھے، جب مجھ سے انکے بارے میں دریافت کیا گیا تو میں نے کہہ دیا تھا کہ ایک پیسہ بھی دینے کا وعدہ نہ کیا جائے، بلکہ ان سے صاف کہہ دیا جائے کہ فاتہ مستی میں

باب ۲۰ اِفشَاءُ السَّلَامِ مِنَ الْاِسْلَامِ وَقَالَ عَمَّارٌ ثَلَاثٌ مَنْ جَمَعَهُنَّ

افشاء اسلام کرنا اسلام میں داخل ہے، اور عمار نے کہا تین باتیں جس نے اکٹھا کرلیں

فَقَدْ جَمَعَ الْاِیْمَانَ، اَلْاِنْصَافُ مِنْ نَفْسِكَ، وَبَذْلُ السَّلَامِ لِلْعَالَمِ، وَالْاِنْفَاقُ

اس نے ایمان کو جوڑ لیا، ایک تو اپنا انصاف اپنے جی میں کرنا اور دوسرے سب کو سلام کرنا (ہر مسلمان کو)

مِنَ الْاِقْتَارِ

اور تیسرے تنگی ہونے پر خرچ کرنا

شریک ہو جاؤ تو ٹھیک ہے ورنہ کچھ ضرورت نہیں، مت آؤ، اس لئے کہ ایمان کی طرف لالچ دلا کر نہیں بلایا جاتا، ہاں جو حق سمجھ کر قبول کرلیں اور غریب و حاجت مند ہوں، ان کے ایمان کی حفاظت کی خاطر ان کی مدد کرنا، یہ بہتر اور نیک کام ہے، یہ بھی یاد رکھو کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اب مولفۃ القلوب کی کوئی مد نہیں کیونکہ اسلام غالب ہے، تکثیر سواد کی کچھ حاجت نہیں، کوئی نکلتا ہے تو نکل جائے، تاہم یہ بھی تصریح ہے کہ امام کی مصلحت اور اسکی صوابدید پر موقوف ہے، وہ اگر مناسب سمجھے تو ضرور خدمت کرسکتا ہے، ممنوع نہیں ہے۔

ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جعیل ابن سراقہ رضی اللہ عنہ بڑے درجہ کے صحابی ہیں، مہاجرین میں سے ہیں اور کاملین میں اعلیٰ طبقہ کے ہیں، حضرت ابوذر غفاری رض فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ جعیل رض گذرے تو حضور ص نے مجھ سے پوچھا تم اسے کیا سمجھتے ہو؟ میں نے کہا "کشکلہ من المھاجرین" یعنی جیسے اور مہاجرین ہیں ویسے ہی یہ بھی ہیں، اس کے بعد ایک دوسرے صحابی گذرے تو حضور ص نے پوچھا: یہ کیسے ہیں؟ میں نے کہا "سید من سادات الناس" انھیں کیا پوچھنا سرداروں میں سے ایک ہیں، حضور ص نے فرمایا: اگر ساری زمین ایسے سادات سے بھری ہو تو یہی اکیلا جعیل ان سب سے بہتر ہے — تو یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ ضعفاء میں سے تھے، خود حضور ص کا یہ فرمانا انی لاعطی الرجل وغیرہ احب الی منہ (میں ایک آدمی کو دیتا ہوں حالانکہ دوسرا اس سے زیادہ مجھ کو محبوب ہوتا ہے) اس پر دال ہے کہ جعیل رض حضور ص کو محبوب ہیں، لیکن حضرت سعد کو اس پر تنبیہ فرمایا کہ تمھیں حق نہیں کہ بواطن پر حکم لگاؤ۔

بعض نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ مظنون پر حلف ہو سکتا ہے، مگر یہ صحیح نہیں، اس لئے کہ ایک حلف ہے وجدانِ ظن پر اور ایک حلف ہے مظنون پر، حضرت سعد یہاں ظن کرنے پر قسم کھا رہے ہیں، نہ اس مظنون پر، تو ظن کا پایا جانا تو قطعی ہے، حافظ نے فتح الباری میں اس پر تنبیہ کی ہے۔[1]

---

(۱) ملاحظہ ہو فتح الباری ص ۸۷ ج ۱ (مرتب)

۲۷ــ حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ يَزِيْدَ بْنِ أَبِي حَبِيْبٍ

ہم سے بیان کیا قتیبہ نے، کہا ہم سے بیان کیا لیث نے، انھوں نے سنا یزید ابن ابی حبیب سے

عَنْ أَبِي الْخَيْرِ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

انھوں نے ابوالخیر سے، انھوں نے عبداللہ ابن عمرو ابن عاصؓ سے ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيُّ الْإِسْلَامِ خَيْرٌ قَالَ تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَتَقْرَأُ السَّلَامَ عَلٰى مَنْ

اسلام کی کون سی خصلت بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا کھانا کھلانا اور ہر ایک کو سلام کرنا،

عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ

اس سے تیری پہچان ہو یا نہ ہو

یَکُبُّ یہ عجیب لفظ ہے عموماً الفاظ باب افعال میں آکر متعدی بن جاتے ہیں مگر یہ جب مجرد ہو تو متعدی ہوتا ہے اور جب باب افعال میں آئے تو لازم ہو جاتا ہے۔

بابٌ افشاء السّلام من الاسلام

یعنی افشاء سلام بھی اسلام کا ایک شعبہ ہے، حضرت عمارؓ فرماتے ہیں کہ تین چیزیں جس کے اندر جمع ہو جائیں، اس نے اسلام کے تمام شعبے جمع کرلیے، بخاری کی غرض تو یہ ہے کہ اسلام کے اجزاء ہیں مگر ہم کہیں گے کہ اس کے شعبے مراد ہیں۔

قولہ اَلْاِنْصَافُ مِنْ نَفْسِكَ. ای الانصاف الناشی من نفسك، یعنی دل سے انصاف ہو، بعضوں نے کہا کہ اپنے نفس سے انصاف کا مطلب یہ ہے کہ اپنے معاملہ میں بھی انصاف کرے ای مع نفسك یا فی معاملۃ نفسك، یہ عمدہ وصف ہے کہ انصاف انصاف رہے خواہ اپنے نفس کا معاملہ ہی کیوں نہ پیش آجائے، ایسا نہ ہو کہ دوسروں کے ساتھ انصاف، اور اپنی بات ہو تو بے انصافی۔

قولہ وَبَذْلُ السَّلَامِ، یعنی ہر ایک کو سلام کرنا، چاہے جان پہچان ہو یا نہ ہو بلاتخصیص صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے سلام کرے۔

قولہ وَالْاِنْفَاقُ مِنَ الْاِقْتَارِ، تنگدستی کے وقت خرچ کرنا، اور یہ بہت مشکل کام ہے، ایک طالب علم نے مجھ سے دست غیب کے عمل کا سوال کیا تو میں نے کہا قرآن پاک کی اس آیت پر عمل کرو وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا اٰتَاهُ اللّٰهُ۔(۱)

---

(۱) طلاق : ۷

. . . .

(اور جس کو نپی تلی ملتی ہے اس کی روزی تو خرچ کرے جیسا کہ دیا ہے اس کو اللہ نے) گویہ بات طلاق کے باب میں فرمائی جارہی ہے مگر اشارہ عام مضمون کی طرف ہے، تو میں نے کہا یہ وعدۂ ایزدی ہے' اس کا خلاف ناممکن ہے اور امت میں سے بہت سے لوگوں کا یہی تجربہ ہے

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند جو دستخط کرنا بھی نہ جانتے تھے مگر شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے اجل خلفا میں سے تھے اور بڑے کامل تھے' فرماتے تھے کہ ہمارا مدرسہ دیوبند مثل کنویں کے ہے جتنا نکالو نکلتا آئے گا 'اگر نہ کھینچو گے تو زیادتی نہ ہوگی اور نہ بڑھے گا بلکہ ممکن ہے خرابی ہو جائے، عجیب لفظ فرمائے ہیں بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ یہ حضرت عمار کا قول ہے مگر بعض لوگوں نے اسے مرفوعاً بھی روایت کیا ہے' آگے لکھا ہے کہ بہ حیثیت صناعت اسناد کے معلول ہے' مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے' یہ درست ہے ہمیں اس سے انکار نہیں مگر سچی بات یہ ہے کہ اس کلام کے مضامین مشابہ ہیں اس ذات مقدسؐ کے کلام کے جن کو اللہ نے جوامع الکلم کی شان عطا فرمائی تھی' اس لئے گمان ہوتا ہے کہ حضرت عمارؓ نے حضورؐ سے ضرور سنا ہوگا۔

حافظ ابن حجرؒ کے اس کلام سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محدثین اگرچہ اسناد کے اعتبار سے کچھ کہیں مگر کہیں کہیں ان کا وجدان گواہی دیتا ہے کہ یہ کلام پیغمبر ہے اگرچہ اسے وہ ثابت نہ کر سکیں۔

پچھلی صدی میں شیخ عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ ایک بزرگ گذرے ہیں' وہ قطب وقت اور امی محض تھے' قرآن بھی نہیں پڑھا تھا لیکن بڑے بڑے علما ان سے علم حاصل کرتے تھے' ان کے ایک خادم جو خود بہت بڑے عالم تھے اور چالیس سال تک علم کی خدمت میں مشغول رہ چکے تھے' انھوں نے شیخ کے ملفوظات میں ایک کتاب "الابریز" لکھی ہے' وہ لکھتے ہیں کہ جس قدر میں علم حاصل کر چکا تھا وہ سب یہاں آنے پر ہیچ معلوم ہوتا تھا' شیخ کے علوم کا حال یہ تھا کہ معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر چلے آرہے ہیں' ایک دفعہ بعض متوسلین نے خواہش ظاہر کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چال چل کر ہمیں دکھائیے' تو شیخ نے فرمایا کل آنا' اگلے دن ان لوگوں کو جنگل میں لے گئے اور فرمایا کل میں نے اس لئے نہیں دکھلایا کہ اس وقت مجھے بھی معلوم نہ تھا' تمہارے سوال کے بعد شب میں میں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ یہ لوگ مجھ سے آپ کے چلنے کی ہیئت دریافت کرتے ہیں اس لئے آپ چل کر دکھلا دیجئے تو میں ان کو دکھلا دوں' حضورؐ نے میری درخواست کو شرف پذیرائی بخشتے ہوئے دکھلا دیا' لہٰذا اب میں تم کو دکھلاتا ہوں' پھر انھوں نے چل کر دکھلا دیا' مگر وہ لوگ اس کی تاب نہ لاسکے اور سب کے سب گھبرا گئے' اس پر شیخ نے فرمایا کہ وہ تو صحابہ کرامؓ تھے کہ برداشت کر لیتے تھے' ورنہ دوسرا کوئی اسے برداشت نہیں کر سکتا۔

شیخ عبدالعزیزؒ کے حالات میں یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے سامنے جب کوئی شخص کچھ پڑھتا تو سن کر بتا دیا کرتے تھے کہ قرآن کی آیت ہے،

بابٌ[۲۱] كُفْرَانِ الْعَشِيرِ وَكُفْرٌ دُونَ كُفْرٍ فِيهِ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

خاوند کی ناشکری بھی ایک طرح کا کفر ہے، اور ایک کفر دوسرے کفر سے کم ہوتا ہے، اس باب میں ابوسعیدؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا۔

یا حدیث نبویؐ، لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ کیسے سمجھ لیتے ہیں کہ یہ آیت ہے یا حدیث؟ شیخ نے فرمایا کہ یہ میرے لئے بالکل بدیہی ہے، خدا کی قسم میں دیکھتا ہوں کہ جب کوئی قرآن پڑھتا ہے تو اس کے منہ سے مثل سورج کے روشنی نکلتی ہے اور جب حدیث پڑھتا ہے تو چاند کی طرح روشنی محسوس ہوتی ہے اور جب کسی اور کا کلام ہوتا ہے تو کوئی روشنی نہیں ہوتی بلکہ تاریکی رہتی ہے، چنانچہ ایک بار لوگوں نے امتحاناً یہ آیت اس طرح پیش کی: حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَوٰةِ الْوُسْطٰى (وصلوٰة العصر) وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ، فوراً بولے: "وصلوٰة العصر" حدیث ہے، اس میں حدیث کا نور ہے، بقیہ قرآن ہے۔

ان واقعات سے معلوم ہوا کہ عارفین کاملین کشف کے ذریعہ معلوم کر لیتے ہیں مگر وہ حجۃ نہیں، اسی طرح محدثین کو بھی انکے اشتغال بالحدیث کی وجہ سے ایک ملکہ حاصل ہوتا ہے جیسے صراف سونے چاندی کو صرف دیکھ کر بتلا دیتا ہے کہ کھرا ہے یا کھوٹا، مگر اس کی وجہ نہیں بتلا سکتا، بس ذوق سے پہچان لیتا ہے، اسی کو حافظ نے کہا کہ ذوق حدیث بتلاتا ہے کہ یہ کلام عمارؓ نہیں ہے بلکہ فرمان نبویؐ معلوم ہوتا ہے۔

بابٌ[۲۱] كفران العشير وكفر دون كفر الخ

امام بخاری ترجمہ کے دو لفظ لائے ہیں، ایک "کفران العشیر" دوسرا "کفر دون کفر" عشیر وہ ہے جس کے ساتھ زندگی بسر کی جائے، زوج کو عشیر اسی بنا پر کہتے ہیں، اس ترجمہ میں ایک تو زوج کے کفران نعمت کا ذکر کریں گے اور دوسرے مدارج کفر بیان کریں گے، اس لئے کفر دون کفر لائے۔

دون کے معنی کبھی غیر کے آتے ہیں جو مماثل ہو اور کبھی دون کے معنی اسفل کے آتے ہیں، حافظ وغیرہ نے دونوں قول نقل کئے ہیں، مگر شاہ صاحب نے غیر کے معنی لئے ہیں اور میرے نزدیک ثانی معنی بہتر ہیں، بخاریؒ کا مقصد یہاں یہ بتانا ہے کہ ایمان کے مراتب ہیں، اس لئے کہ جب کفر کے مراتب ثابت ہیں تو ایمان کے بھی مراتب ہوں گے۔ تشکیک دونوں میں ہے "کفران عشیر" کے ساتھ "کفر دون کفر" لانے سے بخاری کا مقصود تو یہ ہے کہ کفران زوج بھی ایک شعبہ کفر ہے مگر کفر کے مراتب ہیں، ایک مرتبہ تو یہ ہے کہ ملت سے خروج ہو جائے، اور ایک یہ کہ خروج تو نہ ہو مگر کام ہو کفر کا، اسے یوں سمجھو کہ جتنی اچھائیاں ہیں وہ سب ایمان کی خصلتیں ہیں

۲۸۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ مَسْلَمَۃَ عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ

ہم سے بیان کیا عبداللہ ابن مسلمہ نے، انھوں نے امام مالک سے، انھوں نے زید ابن اسلم سے،

عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ عَنِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْہِ وَسَلَّمَ اُرِيْتُ النَّارَ

انھوں نے عطاء ابن یسار سے، انھوں نے ابن عباس سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (ایک لمبی حدیث میں) اور

فَاِذَا اَكْثَرُ اَهْلِهَا النِّسَاءُ يَكْفُرْنَ، قِيْلَ اَيَكْفُرْنَ بِاللّٰہِ ؟ قَالَ يَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ وَيَكْفُرْنَ

میں نے دوزخ کو دیکھا، کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں عورتیں بہت ہیں، وہ کفر کرتی ہیں، لوگوں نے کہا کیا اللہ کا کفر کرتی ہیں؟ آپ نے فرمایا

الْاِحْسَانَ لَوْ اَحْسَنْتَ اِلٰى اِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ ثُمَّ رَاَتْ مِنْكَ شَيْئًا قَالَتْ مَا رَاَيْتُ

(نہیں) خاوند کا کفر (اسکی ناشکری) کرتی ہیں اور احسان نہیں مانیں، اگر تو ایک عورت سے ساری عمر احسان کرے پھر وہ (ایک ذراسی)

مِنْكَ شَيْئًا، قَالَتْ مَا رَاَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ ۔

کوئی بات تجھ سے دیکھے (جس کو پسند نہ کرتی ہو) تو کہنے لگتی ہے میں نے تو تجھ سے کبھی کوئی بھلائی نہیں پائی۔

اور جتنی برائیاں ہیں وہ سب کفر کی خصلتیں ہیں، تو شعبے دونوں کے ہیں مگر ان میں تفاوت ہے، اب جہاں کہیں عمل معصیت پر کفر کا اطلاق ہوگا تو وہاں امام بخاری تاویل نہیں کرتے اور یہ کہتے ہیں کہ تاویل کی حاجت نہیں، من ترك الصلوٰة متعمدًا فقد کفر میں عام طور پر لوگ اس کی توجیہ کرتے ہیں کہ اس نے فعل کفر کیا یا قریب بہ کفر ہوگیا، مگر امام بخاری کہتے ہیں کہ کسی توجیہ کی ضرورت نہیں ہے، وہ کفر ہے مگر ایسا نہیں کہ دین سے نکال دے، اور تارک صلوٰۃ نے بلا شبہ کفر کیا مگر وہ کفر ایسا نہیں ہے کہ اسے خروج عن الاسلام قرار دیا جائے، اسی طرح من ادّعی غیر ابیه وانتمیٰ الی غیر موالیه میں بخاری توجیہ نہیں کرتے، ایسے ہی جس حدیث میں نیاحۃ (نوحہ) کو کفر کہا گیا، یا وہ حدیث جس میں فرمایا گیا ہے سباب المسلم فسوق وقتاله کفر اس قسم کی جملہ صورتوں میں امام بخاری کوئی توجیہ نہیں کرتے بلکہ ان سب میں یہی کہتے ہیں کہ کفر تو ہے مگر کفر کے مراتب ہیں، اس لئے ان باتوں سے وہ دین سے خارج ہوکر کافر نہیں ہوجاتا، کفر جب ہوگا جب جحود (انکار) ہوگا۔

شراح حدیث کے نزدیک یہ الفاظ کفر دون کفر یا ظلم دون ظلم عطا، ابن یسار کے ہیں جو تابعی اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے شاگرد ہیں، اور ان کے یہ الفاظ غالباً حبر الامت سیدنا عبداللہ ابن عباسؓ سے مستفاد و ماخوذ ہیں جو انھوں نے اس آیت وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ [1] کے ذیل میں فرماتے ہیں یعنی ما انزل اللّٰہ کے مطابق

---

(۱) مائدہ : ۴۴

باب ۲۲ المعاصی من امر الجاھلیۃ ولا یکفر صاحبھا بارتکابھا

گناہ جاہلیت کے کام ہیں اور گناہ کرنے والا گناہ سے کافر نہیں ہوتا، البتہ اگر شرک

الا بالشرک لقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم انک امرؤ فیک جاھلیۃ، وقول

کرے (یا کفر کا اعتقاد رکھے) تو کافر ہوجائے گا، کیونکہ آنحضرت نے (ابوذرؓ سے) فرمایا تو ایسا آدمی ہے جس میں جاہلیت کی خصلت

اللہ تعالیٰ ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء، وان

ہے، اور اللہ نے (سورہ نساء میں) فرمایا اللہ تو شرک کو نہیں بخشے گا اور اس سے کم جس کے چاہے گا (گناہ) بخش دے گا

طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما، فسماھم المؤمنین۔

اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں میل کرادو، اللہ نے دونوں کو مسلمان کہا۔

فیصلہ کرنا کفر تو ہے مگر ایسا کفر نہیں ہے جو دین اسلام سے خارج کردے، حضرت ابن عباس نے تنبیہ فرمادی "کفر لاینقل عن الملۃ" معلوم ہوا کہ کفر کے مراتب ہیں، اور بعض کفر ایمان کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے مگر وہ کفر جو ملت سے خارج کرنے والا نہ ہو، یوں کہہ لو کہ ایک کفر النعمۃ ہے ایک کفر الملۃ، چنانچہ کفران العشیر یہی ہے کہ شوہر کے انعامات پر ناشکری کی گئی ہو، لطیف بات یہ ہے جو حدیث میں مروی ہے کہ اگر میں غیر اللہ کو سجدہ کی اجازت دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ خاوند کا سجدہ کیا کرے، اس سے معلوم ہوا کہ زوج کا حق مشابہ ہے اللہ کے حق کے، کیونکہ سجدہ شرک ہے مگر اس کے متعلق ایسا فرما رہے ہیں تو معلوم ہوا کہ اس کا مرتبہ بہت بڑا ہے، اس لئے جہاں جہاں کفر کا لفظ آیا ہے اس کو اسی پر حمل کریں گے

قولہ فیہ عن ابی سعید، یعنی اس ترجمہ کے مناسب ایک حدیث مرفوع ہے اور اس کو کتاب الحیض میں لائیں گے۔

قولہ یکفرن، یعنی علت کفران نعمت ہے، بخاری نے کہا بس ہمارا مدعا ثابت ہوگیا کہ یہاں کفر کا اطلاق کیا گیا ہے اور یہ کفر وہ نہیں ہے جو ملت سے خارج کردے، تو کفر کے مراتب ثابت ہوگئے۔

باب ۲۲ المعاصی من امر الجاھلیۃ الخ

فرماتے ہیں کہ معاصی امر جاہلیت سے ہیں، اشارہ ہے "کفر دون کفر" کی طرف، جاہلیت سے وہ زمانہ مراد ہے جو بعثت نبوی سے قبل کفر کا گذرا، یعنی ہر معصیت کفر کا ایک شعبہ اور ایک علامت ہے لیکن صرف اس سے تکفیر نہیں ہوسکتی، ہاں اگر کفر صریح کا مرتکب ہو تو تکفیر کی جائیگی، پہلے جزو کا ثبوت حدیث سے دیں گے اور دوسرے کا آیت سے، پہلے کا ثبوت انک امرؤ فیک جاھلیۃ ہے، تم ایسے آدمی ہو جس میں جاہلیت ہے۔

. . . .

یہ ایک خاص قصہ تھا، انھوں نے (ابوذر غفاریؓ نے) کسی کو باندی بچہ (یا ابن السوداء) کہہ دیا تھا، حضورؐ نے سنکر فرمایا اِنَّكَ امْرُؤٌ الخ تم میں جاہلیت ہے، یعنی آپؐ نے سمجھایا کہ کسی کو عار دلانا (یا گالی دینا) یہ جاہلیت کی نشانی ہے اور یہ نشانی تم میں باقی ہے، اس لئے تمھیں اسے چھوڑ دینا چاہئے، دوسرا جزو ولا یکفر صاحبھا الخ ہے، اس کی دلیل ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ [1] الآیۃ۔ یعنی شرک بھی ایک فردِ کفر کا ہے، علاوہ کفر و شرک کے کسی پر تخلید فی النار کا حکم نہیں لگا سکتے، اب یہ سوال باقی ہے کہ آیت میں شرک کیوں فرمایا، کفر کیوں نہیں فرمایا گیا؟ اس پر مفسرین نے بہت کچھ لکھا ہے، مگر شافی جواب اب تک نہیں ملا، یوں کہا جا سکتا ہے کہ مشرکین کی کثرت کی وجہ سے یہ عنوان رکھا گیا ہو، مگر اصل یہ ہے کہ کوئی قوم و ملت جو اسلام کے اعتبار سے کافر ہو، شرک سے خالی نہیں، گویا یہ شرک ایک حیثیت سے کفر کو لازم ہو گیا ہے، ہنود کا شرک تو کھلا ہوا ہے، عیسائی زبان سے توحید کے قائل ہیں مگر ساتھ ہی توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں جو منافیٔ توحید ہے۔ مجوسی کہتے ہیں دو مستقل خدا ہیں، ایک کا تعلق خیر سے ہے اور ایک کا شر سے، یہود کی توحید ان سب سے بڑھ کر ہے، وہ ایک کے سوا کسی کو خدا نہیں مانتے لیکن شرک کا انحصار شرک فی الذات میں نہیں بلکہ اگر حق تعالیٰ کے لئے ایسے صفات ثابت کئے جائیں جو ایک معمولی انسان کے لئے ہیں تو یہ بھی شرک ہے اور بہت بڑا شرک ہے چنانچہ پہلے کہیں گذر چکا ہے کہ اب بھی ان کی توارت میں اس طرح کے خرافات بھرے پڑے ہیں، منجملہ ان کے یہ بھی ہے کہ ایک دفعہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی کشتی ہوئی اور یعقوب علیہ السلام نے (العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ) اللہ تعالیٰ کو پچھاڑ بھی دیا تھا کَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا [2]

یہود کے قلوب ان کی حد سے زیادہ سرکشی اور بدکاری کے سبب مسخ ہو گئے تھے اور وہ اللہ کی بارگاہ اقدس میں بے انتہا گستاخ ہو گئے تھے، اللہ کے بارے میں ان کی بے باکی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ بدزبانی کی حد تک بکواس کرنے لگے تھے، قرآن نے انھیں کا یہ قول نقل فرمایا ہے يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ [3] (اللہ کا ہاتھ بند ہو گیا) اس سے ان کی مراد یا تو یہ تھی کہ اللہ تنگدست ہو گیا، اب اس کے پس کچھ نہیں رہا، یا غَلِّ يَد بخل و امساک سے کنایہ قرار دیا ہو، یعنی وہ تنگدست تو نہیں مگر بخیل ہو گیا۔

اسی طرح جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا [4] (کون ایسا ہے جو قرض دے اللہ کو اچھی طرح) تو انھیں یہود نے مذاق اڑاتے ہوئے یہ کہا تھا: اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ [5] (اللہ فقیر ہے اور ہم مالدار)

---

(۱) نساء: ۱۱۶ (۲) کہف: ۵ (۳) مائدہ: ۶۴ (۴) بقرہ: ۲۴۵ (۵) آل عمران: ۱۸۱

. . . .

دیکھو اللہ فقیر ہوگیا ہے اور ہم غنی ہیں اس لئے ہم سے قرض مانگتا ہے' یہ ان یہود کا حال تھا جو توحید کے قائل تھے' میں تو کہا کرتا ہوں کہ نصاریٰ نے آدمی کو خدا بنا دیا اور یہود نے خدا کو آدمی' بلکہ آدمی سے بھی کم بنا دیا۔ الغرض کافروں کی کوئی قوم شرک سے خالی نہیں' پکا سچا موحد بس مسلمان ہی ہے۔ میری مراد ان مسلمانوں سے ہے جو اصل اسلام سے تمسک کرنے والے ہوں' بتدعین کا ذکر نہیں' مسلمانوں میں مبتدعین ہیں ان میں اور مشرکین میں باریک فرق ہے جو پھر کبھی بیان ہوگا۔ تو تنبہ کر دیا کہ کفر و شرک توأم ہیں اور دونوں ساتھ رہتے ہیں تکوین یا تشریع میں یا ذات وصفات میں' کسی نہ کسی میں ضرور شریک ہیں اور یہ اتفاق کفر و شرک کے اجتماع کے سبب ہے' لزوم عقلی تو نہیں ہے مگر واقعہ یوں ہی ہے۔

یہی حال آریہ سماج کا بھی ہے' ان کے یہاں تین خدا ہیں' ایک مادہ' دوسرا روح' تیسرا خدا۔ بلکہ ان کے معبود ہنود کے معبودوں سے بھی بڑھ کر ہیں' کیونکہ ان کے (آریہ کے) یہاں وہ ذرات جن کو فلاسفہ اجزائے ذی مقراطیسیہ کہتے ہیں' غیر مخلوق ہیں' فرق اتنا ہے کہ خدا کی قدرت غیر محدود ہے اور ان اجزاء کی محدود۔ سناتن دھرم تو کہتے ہیں کہ غیر مخلوق صرف اللہ ہے' باقی سب مخلوق ہیں' گو وہ ان کے معبود بھی ہیں' مگر یہ آریہ تو روح اور مادہ کو بھی غیر مخلوق کہتے ہیں اور یہ کہ وہ اپنے وجود میں اللہ کے محتاج نہیں ہیں بلکہ اللہ انکا محتاج ہے' وہ قادر نہیں کہ بلا روح و مادہ کے کوئی کام کر سکے' تو ان میں خالص توحید کہاں۔ رہے سکھ تو ان کا مجھے کافی علم نہیں' کسی سکھ کی لکھی ہوئی صرف ایک کتاب دیکھی ہے جو مسلمان ہوگیا تھا' سکھوں کے پیر گرو نانک حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے شریک مجلس رہ چکے ہیں اور ان کے دوہے بھی ہیں جن سے توحید و رسالت ثابت ہے' ان کے چولے میں آیۃ الکرسی اور دوسری آیات بھی لکھی ہیں' بعض لوگوں کے نزدیک موحد اور سچے مسلمان تھے' ان کا مقصود یہ تھا کہ ہنود سے گھل مل کر انھیں مسلمان بنایا جائے مگر ان کے بعد ان کا گروہ مسلمانوں کا حریف ایک سیاسی گروہ بن گیا اور گردواروں کو پوجنے لگا۔ الحاصل اصلی موحد سوائے اہل اسلام کے اور کوئی نہیں۔

قولہٗ الْمَعَاصِي مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ' گناہ جاہلیت کے کام ہیں [امر جاہلیت سے مراد امور کفر ہیں' اسلئے کہ دور جاہلیت کا اطلاق دور کفر پر ہوتا ہے] اس سے شبہہ گذرے گا کہ جب معاصی شعب کفر ہیں تو ہر عاصی میں شعبۂ کفر بھی موجود ہے' پھر اسے کافر کیوں نہیں کہتے؟ کیونکہ مشتق کا حمل وہاں ہوگا جہاں مبدأ قائم ہو' اسی شبہہ کا جواب دے رہے ہیں کہ شعبۂ کفر تو ہے' مگر لَا يُكَفَّرُ صَاحِبُهَا یعنی اس کے مرتکب کی تکفیر نہ کی جائے گی نہ وہ مخلد فی النار ہوگا' مخلد فی النار اس وقت ہوگا جب وہ جہاراً کفر کا التزام کرے۔ جس طرح اعضائے انسانی میں تفاوت ہے' اسی طرح ایمان وکفر میں تفاوت مراتب ہے' اکثر شراح یہی کہتے ہیں مگر میرے نزدیک سب سے بہتر اور عمدہ جواب وہ ہے جو ابن قیم نے اپنی کتاب الصلاۃ میں دیا ہے' وہ کہتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ جب مبدأ اشتقاق قائم ہو تو عرفاً مشتق کا حمل کیا جائے' مثلاً کوئی فقہ کے چند مسئلے جانتا ہو تو اسے فقیہ نہ کہیں گے' ایسے ہی طبیب اس کو

. . . .

نہ کہیں گے جس کو چند مسئلے یا چند نسخے طب کے آتے ہوں، اسی طرح مالدار اسے نہ کہیں گے جو چند روپے رکھتا ہو، تو یہ ضابطہ کلیہ نہ ہوا کہ جب مبدأ اشتقاق قائم ہو تو مشتق کا حمل ضرور ہو، کسی کو طبیب یا عالم یا مالدار اسی وقت بولیں گے جب اس میں ایک خاص درجہ طب یا علم یا مالداری کا موجود ہو، اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ ہر معصیت کفر ہے اور ہر طاعت ایمان، مگر یہ لازم نہیں کہ جہاں کوئی معصیت پائی جائے تو اس کا مرتکب کافر ہو جائے اور جہاں کوئی طاعت پائی گئی تو مومن ہو جائے، بلکہ کافر اس وقت کہیں گے جب حد مخصوص پر پہونچ جائے جیسا کہ ابن ہمام نے تصریح کی ہے کہ اگر کوئی صنم کو سجدہ کرے یا نعوذ باللہ مصحف کو قاذورات میں ڈال دے تو اب یہ حد ہے کہ اس کو کافر کہا جائے، اس حد مخصوص سے نیچے یہ تو کہیں گے کہ فعل کفر کیا مگر یہ نہ کہیں گے کہ کافر ہو گیا۔ اب بخاری کے لفظ کو دیکھو (لا یکفر صاحبها یعنی کفر تو ہے مگر جس نے کیا ہے اسے کافر نہ کہیں گے ملت سے خارج نہ کریں گے۔

قولہ وَإِنْ طَائِفَتَانِ الخ میرے نزدیک یہی ایک آیت بخاری ہمارے موافق لا رہے ہیں، مگر افسوس ہے کہ شراح احناف بھی سرسری گذر گئے اور کچھ زائد اعتنا نہیں کیا، ورنہ بخاری بڑی گہری بات کہہ گئے ہیں، شروع میں گذر چکا ہے کہ جزئیت و عدم جزئیت اعمال میں نظر کا فرق ہے، ثمرہ کا فرق نہیں، ہاں اس میں اختلاف ہے کہ کیا مطلقاً لفظ مومن بلا کسی شرط و قید کے کسی معصیت کے مرتکب یا فرض و واجب کے تارک پر بولا جائے گا؟ تو جمہور کہتے ہیں کہ مطلق نہ کہیں گے بلکہ کوئی نہ کوئی قید لگائیں گے، چنانچہ ابن تیمیہ نے کتاب الایمان میں بیان کیا ہے کہ مطلق مومن تو کہیں گے لیکن مومن مطلق نہ کہیں گے، مومن بایمان ناقص وغیرہ کہیں گے۔

یہاں بخاری آیت وان طائفتان کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر مومنین کی دو جماعتیں جھگڑ پڑیں تو ان میں باہم صلح کرا دو، فان بغت الآیۃ یعنی ان میں کوئی ایک تعدی کرے (بغی کے معنی یہاں تعدی کے ہیں) تو اب باغی سے لڑو، حَتّٰى تَفِيءَ الآیۃ یہاں تک کہ اللہ کے امر کی طرف لوٹ آئے۔ تو ان دو لڑنے والی جماعتوں کے احکام بیان کر رہے ہیں اور ساتھ ہی فرماتے ہیں "من المؤمنین" مسلمین بھی نہیں کہتے، اس ترجمہ کے ساتھ یہ آیت لا کر بتلا دیا کہ معاصی کے مرتکب کو مومن کہیں گے، آگے بخاری خود کہتے ہیں فسماهم المؤمنین معلوم ہوا کہ مرتکب کبیرہ یا تارک صلوٰۃ وغیرہ پر مومن ہی کا اطلاق ہوگا، اب بھی اسے مومن ہی کہیں گے، امام بخاری نے بڑی چیز بیان کر دی ہے، مگر شارحین نے زیادہ اعتنا نہیں کیا۔

حدیث ۲۹ اگلی حدیث بھی اسی کے مناسب ہے، اس میں احنف ابن قیسؓ کا واقعہ ہے کہ میں اپنے گھر سے اس رجل (سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ) کی مدد کرنے کے لئے نکلا، یہ اپنی قوم کے سردار تھے، اور بعض روایات میں ہے کہ میں مع اپنی قوم کے نکلا، فتح الباری میں تصریح ہے کہ یہ واقعہ جمل کا ہے، راستہ میں ابوبکرہؓ مل گئے اور سوال کیا کہاں جا رہے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ ان کی مدد کرنے، کہنے لگے لوٹ چلو، فتنے سے

۲۹ـــ حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ الْمُبَارَكِ قَالَ حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ قَالَ

ہم سے بیان کیا عبد الرحمن بن مبارک نے کہا ہم سے بیان کیا حماد بن زید نے، کہا ہم سے بیان کیا ایوب و یونس نے

علٰحدہ رہو، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب دو مسلمان تلوار لیکر گتھ جائیں (التقاء: گتھ جانا) تو قاتل و مقتول دونوں نار میں ہیں، میں نے کہا یا رسول اللہ مقتول کا کیا قصور ہے؟ آپ نے فرمایا یہ بھی اس کے قتل پر حریص تھا، اتفاق سے اس کا وار نہ چلا ورنہ مستعدی میں کچھ کمی نہیں تھی، یعنی یہ مقتول بھی قاتل بننا چاہتا تھا، اس کی تیاری بھی کی تھی، مستعد بھی تھا، اس لئے یہ بھی سزا کا مستحق ہوا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم لفظ حریص بولے، یعنی یہ کہ صرف عزم و ارادہ نہیں تھا، عزم میں تو اختلاف ہے کہ اس پر مواخذہ ہے یا نہیں، بعض کے نزدیک عزم پر بھی مواخذہ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ نہیں، البتہ میرے نزدیک عزم پر اس وقت تک کوئی مواخذہ نہیں جب تک اسے کرتا نہیں، رہا حریص جو حدیث میں مذکور ہے، تو اس کے متعلق میری سمجھ میں آتا ہے کہ اس کا مرتبہ عزم سے بڑھ کر ہے اور اس پر ضرور عذاب ہے، حریص کا مطلب یہ ہے کہ وہ کوشش کرے، اسباب مہیا کرے اور جد و جہد میں لگا رہے اور یہ عزم سے آگے کا مرتبہ ہے، عزم میں حب یا حسد وغیرہ کو داخل کرنا صحیح نہیں کیونکہ وہ علاوہ عزم کے افعال قلب میں سے ہیں، یہی مفہوم ہے اس آیت کا إِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ أَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ[1] یہ حب، اشاعت فحش، سبب عذاب ہے یہ عزم نہیں ہے۔

حضرت ابو بکرہؓ نے حدیث کے اطلاق و عموم کو دیکھ کر اس موقع پر اس کو بیان کر دیا، حالانکہ یہ ان حضرات پر ہرگز چسپاں نہیں ہوتی، در اصل حدیث ان لوگوں کے حق میں ہے جو بدون کسی تاویل اور بلا کسی اجتہادی غلطی کے ناحق لڑیں، ان ناحق لڑنے والوں میں چونکہ اکثر پر نفسانیت غالب رہتی ہے اور اللہ واسطے نہیں ہوتی، اس لئے حضورؐ نے ان کی مذمت فرمائی، لیکن جو شخص دین کے لئے لڑتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ یہی اہل اسلام کے لئے اصلح ہے تو وہ اس حدیث کے تحت داخل نہیں، ایسی صورت میں فریقین میں سے کسی کے بارے میں فی النار نہیں کہہ سکتے، ہاں خطاءِ اجتہادی ہو تو ہو، مگر خطاءِ اجتہادی ہرگز قابل گرفت نہیں اور اگر درمیان میں کچھ زیادتی بھی ہوگئی ہو تو وہ ان کے حسنات کے مقابلہ میں کچھ نہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے قرآن میں موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا قصہ بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر جب فرمان خداوندی لینے کو جانے لگے تو اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنا قائم مقام بنایا اور انھیں تاکید کی کہ میرے جانے کے بعد میری قوم کی دیکھ بھال کرتے رہیں، جب موسیٰ علیہ السلام چلے گئے تو سامری نے ایک بچھڑا بنا کر قوم سے کہا کہ هٰذَا إِلٰهُكُمْ وَإِلٰهُ مُوْسٰى[2] (یہ تمہارا معبود ہے اور موسیٰ علیہ السلام کا بھی) قوم نے سامری کی بات مان لی اور گوسالہ کو پوجنے لگے، ہارون علیہ السلام نے انھیں بہت سمجھایا اور پورا زور لگا دیا مگر قوم نے نہ مانا بلکہ ہارون علیہ السلام کی مخالف ہوگئی جیسا کہ خود ہارون علیہ السلام نے کہا وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ[3] (قریب تھا کہ مجھے قتل ہی کر ڈالیں) تو ہارون علیہ السلام مجبور ہو کر چپ

---

(۱) نور: ۱۹ (۲) طٰہٰ: ۸۸ (۳) اعراف: ۱۵۰

حَدَّثَنَا أَيُّوبُ وَيُونُسُ عَنِ الْحَسَنِ عَنِ الْأَحْنَفِ بْنِ قَيْسٍ قَالَ ذَهَبْتُ لِأَنْصُرَ هٰذَا

حسن سے، انھوں نے احنف ابن قیس سے، کہا میں چلا اس شخص کی مدد کرنے کو، راستہ میں مجھ سے ابوبکرہ نے پوچھا،

الرَّجُلَ فَلَقِيَنِي أَبُو بَكْرَةَ فَقَالَ أَيْنَ تُرِيدُ قُلْتُ أَنْصُرُ هٰذَا الرَّجُلَ ، قَالَ ارْجِعْ فَإِنِّي

کہاں جاتے ہو؟ میں نے کہا اس شخص کی مدد کرنے کو، کہا اپنے گھر کو لوٹ جاؤ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا

سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِذَا الْتَقَى الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفَيْهِمَا فَالْقَاتِلُ

آپ فرماتے تھے جب دو مسلمان اپنی اپنی تلواریں لے کر لڑ جائیں تو قاتل و مقتول دونوں دوزخی ہیں، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ

وَالْمَقْتُولُ فِي النَّارِ ، قُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ هٰذَا الْقَاتِلُ فَمَا بَالُ الْمَقْتُولِ ، قَالَ إِنَّهُ كَانَ

قاتل تو خیر (ضرور دوزخی ہوگا) مقتول کیوں دوزخی ہوگا؟ فرمایا: اس کو اپنے بھائی کو مار ڈالنے کی

حَرِيصًا عَلٰى قَتْلِ أَخِيهِ

خواہش تھی۔

ہو رہے ' اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو خبر دی کہ سامری نے قوم کو گمراہ کر دیا، موسیٰ علیہ السلام آئے تو بھائی ہارون پر خوب خفا ہوئے اور فرمایا یٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا ۝ أَلَّا تَتَّبِعَنِ ۖ أَفَعَصَيْتَ أَمْرِي ۝ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي (1) الآیۃ تم نے میری نافرمانی کی اور ان کو روکا نہیں، اور اتنا خفا ہوئے کہ ان کی داڑھی اور سر کے بال پکڑ کر جھنجھوڑا، تب ہارون علیہ السلام نے کہا آپ میری داڑھی اور سر کے بال نہ پکڑیں، دیکھئے اس سے دشمنوں کو اور خوش ہونے کا موقعہ ملے گا، میں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی مگر قوم میرے قتل کے درپے ہوگئی، اور اس نے میری بات نہ مانی۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے اپنے اور اپنے بھائی کے لئے معافی چاہی' یہ واقعہ قرآن میں مذکور ہے، تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہارون علیہ السلام جو نبی تھے اور موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے کہہ کر ان کے لئے نبوت کا پروانہ لیا تھا' بڑے بھائی تھے، ان کی موسیٰ علیہ السلام نے توہین کی؟ ہرگز نہیں! کوئی اسے توہینِ نبی نہیں کہہ سکتا، تو جس طرح یہ ایک مشاجرہ تھا موسیٰ وہارون علیہما السلام میں، اسی طرح صحابہؓ کے مشاجرات کو سمجھو' اللہ نے ایک نمونہ دکھلا دیا کہ آپس کے ایسے مشاجرات کی وجہ سے نار میں جانا ضروری نہیں

اس وقت تو احنف ابن قیسؓ واپس آگئے مگر دوسرے معرکوں میں شرکت کی، جنگ جمل کے بارے میں اتنی بات یاد رکھو کہ یہ تکلیف دہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مدینہ میں بیعت ہوئی، اس بیعت

---

(1) طٰہٰ : ۹۲ ، ۹۳ ، ۹۴

. . . .

میں قاتلین عثمان بھی تھے، بلکہ وہ آگے آگے تھے، عبداللہ ابن سبا یہودی نے جو گروہ دین اسلام کی دشمنی میں بنایا تھا اسی گروہ نے عثمان غنیؓ کو شہید کر کے علی مرتضیٰؓ کو خلافت کے لئے منتخب کیا، اہل مدینہ نے بھی بیعت کرلی، اس وقت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حج کو گئی تھیں، عشرہ مبشرہ میں دو صحابی طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما ام المومنین کے پاس حاضر ہوئے اور بتلایا کہ عثمانؓ کو گھر میں تلاوت قرآن کی حالت میں ظلماً شہید کر دیا گیا اور قاتل حضرت علیؓ کی جماعت میں شامل ہوگئے ہیں، اس لئے حضرت علیؓ سے قصاص عثمانؓ کا مطالبہ کرنا اور قاتلین کو سزا دلوانا چاہیئے، ام المومنینؓ نے تائید فرمائی، اس کے بعد یہ حضرات انھیں لے کر بصرہ پہونچے اور وہاں کے لوگوں کو ہم خیال بنایا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو جب معلوم ہوا کہ اس طرح مقابلہ کی تیاری ہو رہی ہے تو انھوں نے بھی جوابی تیاری کرلی لیکن لڑائی سے پہلے کی گفتگو میں یہ بات طے ہوگئی کہ قاتلین عثمانؓ کو حضرت علیؓ اپنے لشکر سے جدا کردیں گے کیونکہ ان سے قصاص لینے کی ابھی گنجائش نہ تھی، ان قاتلین نے سوچا کہ یہ تو کچھ نہ ہوا، انھوں نے صلح کرلی اور ہم پٹے، تو انھوں نے آپس میں سازش کر کے اپنے کچھ آدمیوں کے ذریعہ رات کے وقت حضرت علیؓ کے لشکر پر پتھراؤ کرادیا، یہ سمجھے کہ ہم سے غدر کیا گیا، اسی طرح کچھ لوگوں نے ام المومنینؓ کے لشکر پر پتھراؤ کیا، انھوں نے بھی یہی سمجھا کہ ہم سے دھوکہ کیا گیا، اس طرح لڑائی شروع ہوگئی اور فریقین کے بہت سے صحابہؓ شہید ہوگئے، اس کے بعد حضرت علیؓ نے پورے احترام کے ساتھ ام المومنینؓ کو مدینہ پہونچا دیا، اس معرکہ میں طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما بھی شہید ہوگئے، حضرت علیؓ نے قاتل زبیرؓ کو جہنم کی بشارت سنائی، جو انھوں نے حضور سے سنی تھی اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا وہ ہاتھ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدافعت میں غزوۂ احد میں شل ہوگیا تھا، حضرت علیؓ بار بار چومتے اور روتے ہوئے کہتے: ہائے یہ وہ ہاتھ ہے جس نے غزوۂ احد میں حضور پر برستے ہوئے تیر روکے تھے۔ ان قاتلین عثمانؓ کو اور موقع مل گیا اور وہ زیادہ دخیل ہوگئے، اور ان دشمنان دین نے حضرت علیؓ کو خانہ جنگی میں جھونک دیا اور ایسے فتنے قائم کردئے جو آج تک چل رہے ہیں، انھوں نے حضرت علیؓ سے بڑے بڑے عہدے بھی حاصل کئے اور سیاست پر کچھ اس طرح چھائے رہے کہ حضرت علیؓ بے بس ہوگئے، پھر اسی گروہ کے ایک طبقہ نے خارجی بن کر حضرت علیؓ کو جام شہادت نوش کرایا (۱) اس واقعہ جمل میں جتنے صحابہ شہید ہوئے وہ سب جنتی ہیں خواہ وہ کسی فریق کے ہوں، اور چونکہ یہ لڑائی نفسانیت کی نہ تھی حق پرستی پر لڑی گئی اس لئے کوئی بھی ان میں سے خدا کے ہاں مجرم نہیں اور نہ اس حدیث کے تحت آتا ہے جس میں "القاتل والمقتول کلاهما فی النار" فرمایا گیا ہے، ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے حدیث کے اطلاق و عموم کو دیکھ کر غلط فہمی کی بنا پر اس حدیث کو اس موقع پر بیان کردیا، یہ بات خوب

---

(۱) اور دوسرا گروہ روافض کے نام سے آج بھی اس فتنہ کو زندہ کئے ہوئے ہے (جامع)

۳۰ــ حَدَّثَنَا سُلَیمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ وَاصِلٍ الْأَحْدَبِ

ہم سے بیان کیا سلیمان ابن حرب نے، کہا ہم سے بیان کیا شعبہ نے، انھوں نے واصل احدب سے

عَنِ الْمَعْرُوْرِ قَالَ لَقِیْتُ اَبَا ذَرٍّ بِالرَّبَذَةِ وَعَلَیْهِ حُلَّةٌ وَعَلٰی غُلَامِهٖ حُلَّةٌ فَسَأَلْتُهٗ

انھوں نے معرور سے، کہا میں نے ربذہ میں ابوذر سے ملاقات کی وہ ایک جوڑا پہنے تھے، اور ان کا غلام بھی ویسا ہی ایک جوڑا

عَنْ ذٰلِکَ، فَقَالَ اِنِّیْ سَابَبْتُ رَجُلًا فَعَیَّرْتُهٗ بِاُمِّهٖ فَقَالَ لِیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

پہنے ہوئے تھے، میں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی، انھوں نے کہا میں نے ایک شخص سے گالی گلوج کی اور اس کو ماں کی گالی دی۔

یَا اَبَا ذَرٍّ اَعَیَّرْتَهٗ بِاُمِّهٖ اِنَّکَ امْرُؤٌ فِیْکَ جَاهِلِیَّةٌ، اِخْوَانُکُمْ خَوَلُکُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: تو نے اس کو ماں کی گالی دی، تو وہ آدمی ہے جس میں جاہلیت کی خصلت ہے، تمہارے غلام

اَیْدِیْکُمْ فَمَنْ کَانَ اَخُوْهُ تَحْتَ یَدِهٖ فَلْیُطْعِمْهُ مِمَّا یَاْکُلُ وَلْیُلْبِسْهُ مِمَّا یَلْبَسُ

تمہارے بھائی ہیں، اللہ نے انھیں تمہارے ہاتھ تلے کردیا، پھر جس کا بھائی اس کے ہاتھ تلے ہو وہ اس کو وہی کھلائے جو آپ

وَلَا تُکَلِّفُوْهُمْ مَا یَغْلِبُهُمْ فَاِنْ کَلَّفْتُمُوْهُمْ فَاَعِیْنُوْهُمْ

کھائے اور وہی پہنائے جو آپ پہنے اور ان سے وہ کام نہ لو جو ان سے نہ ہو سکے، اگر ایسا کام لینا چاہو تو انکی مدد کرو

یاد رکھنے کی ہے کہ مشاجرات صحابہؓ میں کسی فریق کے خلاف کچھ نہ کہا جائے، معاملہ ان کا اور خدا کا ہے، دونوں خدا کے چہیتے ہیں، دین کے فدائی اور نبی علیہ السلام کے جاں نثار ہیں۔ ان کے بارے میں گستاخی سے سلب ایمان کا خطرہ ہے، حضورؐ کا ارشادِ گرامی ہے: اِذَا رَأَیْتُمُ الَّذِیْنَ یَسُبُّوْنَ اَصْحَابِیْ فَقُوْلُوْا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلٰی شَرِّکُمْ، ای لعنة اللّٰه علیکم بسبب شرّکم[1] (جب تم دیکھو ان لوگوں کو جو میرے اصحاب کو برا کہتے ہیں تو کہو اللہ کی لعنت تمہارے شر پر، یعنی اللہ کی لعنت تم پر تمہارے شر کی وجہ سے) اس لئے سب مسلمانوں کو اس سے بچنا بہت ضروری ہے۔

یہاں ترجمہ کو حدیث سے دو طرح سے مناسبت ہے، اول تو یوں کہ باوجودیکہ حکم فرمارہے ہیں القاتل والمقتول فی النّار، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمارہے ہیں کہ اذا التقی المسلمان الخ معلوم ہوا کہ وہ اسلام سے خارج نہیں ہیں، لہٰذا ولا یکفر صاحبها (اس لڑنے والے کی تکفیر نہ کی جائے گی) بالکل صحیح اور درست ہوا، اور امام بخاری اسی کو ثابت کرنا چاہتے تھے۔ ۱۷

---

(۱) رواہ الترمذی

. . . .

حدیث ۳۰ قولہ عن المعرور الخ معرور کہتے ہیں کہ میں ربذہ میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے ملا، ربذہ ایک مقام ہے جو مدینہ منورہ سے تین مرحلے کی دوری پر واقع ہے، یہاں ایک چھاؤنی تھی جس میں کئی ہزار گھوڑے رہتے تھے، ابوذر رضی اللہ عنہ بحکم خلیفۂ سوم یہیں رہتے تھے اور گویا نظر بند تھے، معرور کہتے ہیں کہ میں نے ابوذرؓ کو دیکھا کہ آپ کے جسم پر ایک حُلّہ تھا، حُلّہ لغت عرب میں دو کپڑوں کو کہتے ہیں اور ہمارے یہاں پوشاک کے معنی میں۔ اور بالکل ویسا ہی حلہ ان کا غلام بھی پہنے ہوئے تھا، تو میں نے سوال کیا، یہ کیا قصہ ہے جیسی پوشاک آپ نے پہنی ہے بالکل ویسی ہی غلام کو پہنا رکھی ہے، جواب دیا کہ پہلے قصہ سن لو۔

انی سابَبت رجلاً فعیرتہ بامّہ، ایک بار میں نے غلام کو باندی بچہ کہدیا تو حضورؐ نے فرمایا اَعَیَّرتَہٗ بِاُمِّہٖ؟ (کیا تم نے اس کو اس کی ماں کی طرف سے عار دلایا) انک امرؤفیک جاھلیۃ (تم ایسے آدمی ہو جس میں جاہلیت موجود ہے) یعنی یہ بات اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے کہ کسی کو حقیر اور ذلیل سمجھ کر اسے طعنہ دیا جائے۔

لفظ "امرؤ" کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ جیسا اعراب اس کے لام کلمہ پر ہوگا اسی طرح کا اعراب عین کلمہ پر بھی ہوگا، یہاں لام کلمہ ہمزہ ہے اور اس پر ضمہ ہے اس لئے عین کلمہ یعنی راء پر بھی ضمہ ہوگا۔

پھر آپ نے سمجھایا اخوانکم خولکم یہ تمھارے خدمت گار تمھارے بھائی ہیں "خول" سے مراد محض غلام نہیں، بلکہ عام خدمت گار کے معنی میں ہے، خواہ غلام ہو یا نہ ہو، چونکہ انسان ان سے تمتع حاصل کرتا ہے اس لئے ان کو خول کہتے ہیں۔

جعلھم اللہ تحت ایدیکم، ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ اللہ نے انھیں تمھارے ہاتھ کے نیچے کر دیا ہے لہذا تم ان کے ساتھ سختی نہ کرو۔

پھر فرمایا فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ ممّا یأکل الخ بلکہ جب کسی مومن کا بھائی اس کی ماتحتی میں ہو تو اس کو چاہئے کہ جو خود کھائے وہی اس کو بھی کھلائے اور جو خود پہنے وہی اس کو بھی پہنائے اور اس سے دشوار کام مت لو اور اگر کوئی ایسا کام پڑ ہی جائے تو تم خود بھی اس کی مدد کرو تاکہ اس کی حوصلہ افزائی ہو۔

اس کا اثر ابوذر رضی اللہ عنہ پر ایک تو یہ پڑا کہ انھوں نے اپنے اس غلام[1] سے معافی مانگی اور معاف کرا کر ہی چھوڑا، دوسرا یہ کہ اپنے غلام کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جس پر معرور کو تعجب ہوا، یہاں بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں پر یکساں حلہ تھا یعنی جیسا ابوذرؓ کا تھا

---

(۱) بعض لوگوں کے نزدیک یہ غلام حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ تھے، منہ

بابٌ ظُلْمٌ دُوْنَ ظُلْمٍ

ایک گناہ دوسرے گناہ سے کم ہوتا ہے

۳۱ــ حَدَّثَنَا اَبُو الْوَلِيْدِ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ ح قَالَ وَحَدَّثَنِيْ بِشْرٌ قَالَ

ہم سے بیان کیا ابوالولید نے کہا ہم سے بیان کیا شعبہ نے، دوسری سند: امام بخاری نے کہا اور مجھ سے بیان کیا بشر نے

حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ سُلَيْمَانَ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ

کہا ہم سے بیان کیا محمد نے، انھوں نے شعبہ سے، انھوں نے سلیمان سے، انھوں نے ابراہیم سے، انھوں نے علقمہ سے، انھوں نے عبداللہ بن مسعود سے

ویسا ہی غلام کا بھی تھا، مگر بعض روایات میں تصریح ہے کہ حلّہ یکساں نہ تھا بلکہ شکل یہ تھی کہ دو حلّے تھے اور ان میں سے ایک کی نوعیت کچھ اور تھی، دوسرے کی کچھ اور۔ حلّہ میں دو کپڑے ہوتے ہیں، ایک تہبند کے کام آتا ہے، دوسرا اوپر کے بدن پر اور دونوں ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں، مگر یہاں حضرت ابوذرؓ نے یہ کیا تھا کہ ایک حلّہ کا ایک کپڑا خود پہنا اور اسی حلّہ کا دوسرا کپڑا غلام کو پہنایا، اسی طرح دوسرے حلّہ کا ایک اپنے لئے منتخب کیا اور دوسرا غلام کے لئے، اس پر معرور کو تعجب ہوا اور سوال کیا، ابوذرؓ نے اس کا جواب دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں اور خدمتگاروں کے ساتھ سلوک کے یہ اخلاق سکھائے ہیں اس لئے میں اس پر عامل ہوں۔

یہ بات یاد رکھو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مراد نہیں تھی کہ بالکل مساوات ہو بلکہ مراد یہ تھی کہ ان کے ساتھ مواساۃ اور ہمدردی ہونی چاہئے جیساکہ دوسری روایت میں ہے فانه ولی علاجه کیونکہ اس نے مشقت برداشت کی ہے اور محنت کی ہے، تو تم اس کے ساتھ ہمدردی کرو، اسی کھانے میں سے کچھ اس کو بھی دیدو، اسی طرح اگر بھاری کام لو تو تم بھی اس کی مدد کرو، کچھ شرکت کرلو، یعنی اس کی غمخواری کرو، مگر یہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا کمال تقویٰ تھا کہ انھوں نے مواساۃ کو مساواۃ تک پہونچادیا۔

حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے بلند اخلاق سکھائے ہیں اور غلاموں کا درجہ کتنا اونچا کردیا ہے، پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ وہی غلام اسلامی تعلیم سے فیض پاکر کس طرح دنیا میں چمکے اور کس کس طرح اسلام کو دنیا میں چمکایا، منھ چڑانے والے یورپ نے بھی غلامی کو مٹانے کی کوشش کی، مگر میں کہتا ہوں کہ غلامی کو مٹانے کی کوشش کرتے ہو لیکن کالے اور گورے میں انسان اور کتے کا سا معاملہ کرتے ہوئے اس غلامی کو جاری بھی کرتے ہو، ادھر دیکھو ہمارے ایک پیشوا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب تم سے بیت المقدس لینے کے لئے سفر کیا تو اس سفر میں انھوں نے اپنے غلام کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا، غلاموں کے ساتھ اس قسم کے سلوک کی کوئی نظیر پیش کرسکتے ہو؟

امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذرؓ کو تنبیہ فرماتے ہوئے اس فعل کو جاہلیت کا فعل تو قرار

لَمَّا نَزَلَتْ : اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْآ اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ ، قَالَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ

جب سورۂ انعام کی یہ آیت الذین اٰمنوا الخ اتری تو صحابہ نے عرض کیا (یا رسول اللہ یہ تو بہت مشکل ہے) ہم سے کون

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : اَيُّنَا لَمْ يَظْلِمْ ، فَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ : اِنَّ الشِّرْكَ

ایسا ہے جس نے گناہ نہیں کیا ، تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ لقمان کی یہ آیت اتاری کہ شرک بڑا

لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ

ظلم ہے ۔

دیا مگر ایمان سے خارج نہیں فرمایا ، لہٰذا معلوم ہوا کہ معاصی امور جاہلیت میں سے ضرور ہیں مگر معصیت سے آدمی کافر نہیں ہوتا ۔

باب ۲۳ ظُلْمٌ دُوْنَ ظُلْمٍ ۔

حدیث ۳۱ یہ عبداللہ ابن مسعود ہیں ، صحابہ کے دور کی یہ گویا اصطلاح بن گئی ہے کہ جب صرف عبداللہ بولیں گے تو مراد ابن مسعود ہوں گے ، وہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم نازل ہوئی تو صحابہؓ پر بہت شاق ہوئی ، انھوں نے عرض کیا اَیُّنا لم یظلم اور بعض روایت میں آیا اَیُّنا لم یظلم نفسہ (ہم میں سے کون ایسا ہے کہ اس نے اپنے نفس پر ظلم نہ کیا ہو) تو کوئی بھی ان میں نہیں ۔

تم پہلے پوری آیت سامنے رکھ کر صحابہؓ کے سوال کا منشا اور غرض سمجھ لو ، اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْآ اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ [1] " لبس یلبس " ضرب سے ، اس کے معنی خلط ملط کرنا ، گڈمڈ کر دینا ، کہ امتیاز نہ رہے اور " لبس یلبس " سمع سے پہننے کے معنی میں آتا ہے ، آیت کا ترجمہ یہ ہوا (وہ لوگ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم سے خلط ملط نہیں کیا تو وہی ہیں جن کے لئے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں) یہ حصر کا کلمہ ہے کہ ایمان لائے اور مخلوط نہ کیا ظلم سے تو انھیں کے لئے امن ہے اور یہی ہدایت پر ہیں) تو صحابہؓ نے امن کو اس میں منحصر سمجھا کہ کسی قسم کا ظلم نہ کریں ، چونکہ " بظلم " نکرہ ہے اور نفی کے تحت میں ہے اس لئے عموم و استغراق پر دلالت کرتا ہے کہ کسی قسم کا ظلم نہ ہو ، صحابہؓ ڈر گئے کہ دنیا میں کوئی شخص (بجز انبیاء علیہم السلام کے) اس سے محفوظ نہیں رہ سکتا ، اس لئے عرض کیا اَیُّنا لم یظلم نفسہ ہم میں سے کون ہے جس نے کوئی نہ کوئی ظلم نہ کیا ہو ، کبھی نہ کبھی کوئی جنایت تو ہو ہی جاتی ہے تو پھر امن بھی نہ رہا ، یہ منشا تھا اس سوال کا ، جواب دیا اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ [2] (ظلم عظیم شرک ہے) یہ روایت بالمعنی ہے ورنہ یہ آیت اس موقع پر نازل نہیں ہوئی ، بعض روایات

---

(۱) انعام ، ۸۳ (۲) لقمان : ۱۳

. . . .

میں یہ تصریح موجود ہے کہ آپ نے فرمایا: الم تسمع قول لقمان لابنه "ان الشرك لظلم عظيم" (کیا تم نے لقمان کا قول نہیں سنا جو انھوں نے اپنے بیٹے سے کہا تھا کہ بیشک شرک ظلم عظیم ہے)، تو یہ آیت پہلے نازل ہو چکی تھی، حدیث میں اسی کا حوالہ دیا گیا، مراد یہ ہے کہ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے اور بظلمٍ کی تنوین تعظیم کے لئے ہے نہ کہ تعمیم کے لئے کما فهمه الصحابة اب مطلب یہ ہوا کہ جو ایمان لائے اور کسی قسم کا شرک نہ کرے تو ان کے لئے امن ہے اور وہ ہدایت یافتہ ہیں، ظلم کا اطلاق کبھی شرک پر بھی ہوتا ہے، کیونکہ اللہ کے مقابلہ میں کسی کو معبود ٹھہرانا اللہ سے بہت بڑی بغاوت ہے، تو یہاں روایت بالمعنیٰ ہے یا یوں کہو کہ فانزل کے یہ معنیٰ نہیں کہ خاص اسی معاملہ میں اتاری گئی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس کے لئے آیت نازل ہوئی تھی اس کے مضمون کے تحت یہ بھی داخل ہے، اس سے امام بخاری کا مطلب ظاہر ہو گیا کہ ظلم کے مراتب ہیں جس طرح ایمان وکفر کے مراتب ہیں۔

اب میں آیت کے متعلق کچھ علٰحدہ سے کہنا چاہتا ہوں، علماء فرماتے ہیں کہ کیا اس تفسیر پر کوئی ایسا قرینہ بھی موجود ہے کہ ظلم سے مراد شرک ہے، یا یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے یہ تفسیر فرما دی، تو بظاہر کوئی قرینہ موجود نہیں ہے مگر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آیت میں قرینہ موجود ہے اور وہ لفظ "لبس" ہے، وہی اس بات کا قرینہ ہے کہ شرک مراد ہے، زنا اور چوری وغیرہ مراد نہیں، کیونکہ "لبس" کے معنیٰ ہیں ایک ظرف میں دو چیزوں کو اس طرح مخلوط کرنے کے کہ امتیاز نہ ہو سکے، اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب دونوں کا ظرف اور محل ایک ہو جیسے شربت کہ یہ اسی وقت بن سکتا ہے جب پانی میں شکر ملا دی جائے، اس کے بعد امتیاز باقی نہیں رہتا، تو یہاں اگر جوارح کے اعمال مراد لئے جائیں تو اتحاد نہ ہوگا[1] اتحاد جب ہوگا کہ ظلم کے وہ معنیٰ ہوں جو ایمان کے ساتھ ایک ظرف اور محل میں جمع ہو جائیں، اور یہ شرک ہی۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھلا دیا اور حق تعالیٰ کی مراد ظاہر فرما دی، یہ مصداق ہے وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ کا۔

معتزلہ کہتے ہیں کہ ظلم سے مراد اعمال جوارح ہیں نہ کہ کفر و شرک، وہ کہتے ہیں کہ اگر شرک مراد لیا جائے تو ایمان وکفر کا اجتماع کیونکر ہو سکتا ہے، ایمان وکفر تو نقیضین ہیں اور نقیضین کا اجتماع ایک محل میں ناممکن ہے، "لَمْ يَلْبِسُوْا" اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ فی نفسہٖ اجتماع ممکن ہو، اور یہاں اجتماع ناممکن ہے لہٰذا "لم يلبسوا" کا حکم اور اس کی نفی کیونکر صحیح ہوگی، یہ معتزلہ کا قول ہے، مگر کوئی ان سے پوچھے کہ یہ تفسیر کس کی ہے؟ یہ تفسیر تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اور یہ روایت صحیحین کی ہے، مگر باایں ہمہ وہ کہتے ہیں کہ ہم ایسی روایت کو ہرگز نہیں مانتے جو خلاف عقل ہو۔

---

(۱) کیونکہ اعمال کا ظرف اور محل جوارح ہیں اور ایمان کا قلب، ہاں شرک ہو سکتا ہے کیونکہ اس کا ظرف بھی قلب ہے۔ منہ۔

. . . .

مفسرین نے اس مقام پر الزامی جواب دیتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ تم اعمال جوارح مراد لیتے ہو اور ایک کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے اسے خارج از اسلام قرار دیتے ہو تو پھر اجتماع کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ جب ایمان ہوا تو لازم ہے کہ ہر گناہ سے پاک ہو، اب اگر ایک گناہ بھی کیا تو خارج از اسلام ہو گیا، تو ایمان اور کفر کا اجتماع کیسے ہوگا؟ فما هو جوابكم فهو جوابنا۔

چنانچہ زمخشری معتزلی وغیرہ نے گھبرا کر کہا کہ ایمان سے لغوی معنی یعنی تصدیق مراد ہے نہ کہ شرعی معنی، ہم کہتے ہیں کہ جب ایمان کے لغوی معنی مراد ہیں تو "بِظُلْمٍ" سے شرک مراد لینے میں کیا قباحت ہے؟ اور پھر نبوی تفسیر کو رد کیوں کرتے ہو؟

قرآن میں یہ صراحت موجود ہے: وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ [1] یہاں ایمان و شرک کا اجتماع ہو گیا، تو تم کہتے ہو کہ ایمان سے لغوی معنی مراد ہیں، اسی طرح یہاں بھی یہی کہو اور ظلم سے شرک مراد لے کر جس طرح آیت بالا میں ایمان و شرک کا اجتماع جائز قرار دیتے ہو اسی طرح الذين آمنوا ولم يلبسوا إيمانهم بظلم میں بھی جائز قرار دو۔

اب ہم اس حدیث سے قطع نظر کر کے تمہاری تفسیر لیتے ہیں اور ظلم سے مراد عمل لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امن اسے ہے جو مرتکب معصیت نہ ہو، تو امن کس چیز سے؟ ہم کہیں گے دخول نار سے مامون ہوں گے، اور تم کہو گے خلود فی النار سے مامون ہوں گے، گفتگو یہاں مفہوم میں ہے نہ کہ منطوق میں، یعنی اگر "لبس" کیا تو ہمارے ہاں دخول نار ہو سکتا ہے، اور معتزلہ کے ہاں خلود ہو سکتا ہے، تو تمہارا کیا مدعا ثابت ہوا؟

اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہوں گا کہ نفس قرآن میں امن نہ دخول سے ہے نہ خلود سے، قرآن میں غور کرو، ارشاد فرمایا وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ، ابراہیمؑ کی قوم نے ان سے حجت کی، قَالَ أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ ط اللہ کے معاملہ میں جھگڑتے ہو حالانکہ اس نے مجھے ہدایت کی ہے، کیا میں اس تمہارے جھگڑے سے متاثر ہو جاؤں گا؟ وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ، میں ہرگز خوف نہیں کھاؤں گا اس چیز سے جس کو تم شریک کرتے ہو إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا لیکن میرا رب ہی اگر چاہے تو سب ہو سکتا ہے، ابراہیم علیہ السلام نے انھیں اس بات کا جواب دیا جو وہ کہتے تھے کہ کیا تم ڈراتے ہو تم خود جل جاؤ گے، یہ بت جن کی تم مذمت کرتے ہو یہ کہیں تم کو پاگل نہ بنا دیں، آگے کہتے ہیں: وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا اس کا علم ہر شخص کو محیط ہے، وہ دیکھ کر نبی بناتا ہے، یہ بت کیا نقصان پہونچا سکتے ہیں وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ میں کیونکر ڈر سکتا ہوں، ڈرنا تم کو چاہئے کہ تم اللہ کا شریک بناتے ہو

---

(۱) یوسف ، ۱۰۶

بابٌ عَلَامَةِ الْمُنَافِقِ

منافق کی نشانیاں ،

۳۲ ـ حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ أَبُو الرَّبِيعِ قَالَ حَدَّثَنَا إِسْمٰعِيلُ بْنُ جَعْفَرٍ قَالَ

ہم سے بیان کیا سلیمان ابو الربیع نے ، کہا ہم سے بیان کیا اسمٰعیل بن جعفر نے ، کہا ہم سے بیان کیا نافع ابن مالک

حَدَّثَنَا نَافِعُ بْنُ مَالِكِ بْنِ أَبِي عَامِرٍ أَبُو سُهَيْلٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ

ابن ابو عامر ابوسہیل نے ، انھوں نے اپنے باپ مالک سے ، انھوں نے ابوہریرہ سے ، انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ، فرمایا

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ ، إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ ، وَإِذَا

منافق کی تین نشانیاں ہیں : جب بات کہے جھوٹ کہے اور جب وعدہ کرے خلاف کرے ، اور جب اس کے پاس

وَعَدَ أَخْلَفَ ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ .

امانت رکھیں خیانت کرے .

دوسروں کو اور پھر اللہ کے قہر سے نہیں ڈرتے فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۱) بتاؤ کون سا فریق احق ہے مامون و بے خوف رہنے کا اگر جانتے ہو ـــ وہ کیا بتلاتے خود ہی بتلاتے ہیں اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الخ تو یہ امن وہی ہے جو پہلی آیت سے مفہوم ہوتا ہے یعنی جس چیز سے وہ ڈرا رہے تھے اس سے بے خوفی مراد ہے ، تو معلوم ہوا کہ ظلم کے معنی شرک ہی ہیں ، دوسرے معنی کوئی بن ہی نہیں سکتے جس چیز کا سوال ہے اسی کا جواب ہے ، الحمدللہ اب بالکل شرح صدر ہو جاتا ہے اور اس سے امن کی بھی تفسیر ہوگئی کہ امن دنیا کا مراد ہے نہ کہ آخرت کا . مگر دوسرا جملہ وَهُمْ مُهْتَدُوْنَ آخرت سے متعلق ہے ، یا امن کو عام رکھو مگر اس وقت بھی امن دنیوی اولاً معتبر ہے ، نہ اس میں معتزلہ کی کچھ چلتی ہے نہ اور کسی کی ، زمخشری نے مذہب کے تعصب میں آکر ایسا لکھ دیا ورنہ کوئی معمولی شخص بھی پورے رکوع پر نظر رکھتے ہوئے وہ بات نہیں کہہ سکتا جو زمخشری نے کہدی (۲) ہے .

بابٌ علامة المنافق

حدیث ۳۲ ، بخاری کی غرض یہ ہے کہ جیسے ایمان و کفر اور ظلم کے مراتب ہیں ایسے ہی نفاق کے بھی مراتب ہیں ، چنانچہ

---

(۱) انعام : ۸۰ ، ۸۱ ـــ (۲) **لطیفۂ علمی** : حضرت شیخ الہندؒ کے قرینہ بتانے پر علامہ کشمیری نے کہا کہ یہی قرینہ تاج الدین سبکی نے عروس الافراح میں لکھا ہے ۔ ایضاح البخاری ص ۳۲۹ ـ (جامع)

۳۳ - حَدَّثَنَا قَبِيصَةُ بْنُ عُقْبَةَ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنِ الْأَعْمَشِ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مُرَّةَ عَنْ مَسْرُوقٍ عَنْ

ہم سے بیان کیا قبیصہ ابن عقبہ نے، کہا ہم سے بیان کیا سفیان نے، انھوں نے اعمش سے، انھوں نے

عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ

عبداللہ ابن مرہ سے، انھوں نے مسروق سے، انھوں نے عبداللہ ابن عمرو سے کہ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے: چار باتیں جن میں ہوں گی وہ پرا

كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَعَهَا: إِذَا أُؤْتُمِنَ خَانَ

منافق ہوگا اور جس میں ان چار باتوں میں سے ایک بات ہوگی اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی جب تک کہ وہ اسے چھوڑ نہ دے،

وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ، تَابَعَهُ شُعْبَةُ

جب اس کے پاس امانت رکھیں تو خیانت کرے، اور جب بات کہے تو جھوٹ کہے، اور جب عہد کرے دغا دے، اور جب

عَنِ الْأَعْمَشِ،

جھگڑے تو ناحق کی طرف چلے، سفیان کے ساتھ شعبہ نے بھی اس حدیث کو اعمش سے روایت کیا

اس کی علامات بتاتے ہیں کہ جس میں زیادہ علامات ہیں وہ پکا منافق ہے اور جس میں کم ہیں وہ ناقص، تو معلوم ہوا کہ نفاق کے بھی درجے ہیں، یہ ابوہریرہ رضؓ کی حدیث ہے، اس میں مفعول کو حذف کرکے بتلادیا کہ اس کی عادت ایسی ہو، یعنی ان تینوں باتوں کا وہ عادی ہو۔

یہاں تین چیزیں بتلائیں: کذب[1]، اخلاف[2] وعدہ اور خیانت[3]۔ آیت شناخت کی نشانی کو کہتے ہیں، یعنی جس میں یہ تین چیزیں پائی جائیں وہ مشابہ ہے منافق کے: منافق کے لفظ میں شراح نے تین طرح تقریر کی ہے، اسے میں اگلی حدیث میں بیان کروں گا، یہاں اتنا سمجھ لو کہ علامات مطرد ومنعکس نہیں ہوا کرتیں کہ جہاں علامت پائی جائے وہ منافق ہو ہی جائے، جائز ہے کہ علامت ہو اور منافق نہ ہو، دوسری بات یہ ہے کہ یہاں تین خصلتیں بیان کیں اور اگلی حدیث میں چار بیان کیں، معلوم ہوا کہ حصر مقصود نہیں ہے تین میں، جیسا موقع ہوا بیان فرمادیا، قرینہ یہ ہے کہ مسلم میں بجائے آیۃ المنافق کے من علامۃ المنافق فرمایا، مِن تبعیضیہ لاکر مطلب صاف کردیا۔

وَعَدَ کا لفظ خیر وشر دونوں میں مستعمل ہوتا ہے اور ایعاد محض شر کیلئے آتا ہے اَوْعَدَ اس وقت کہیں گے جب دھمکی دینا ہو، یہاں لفظ وَعَدَ ہے تو بظاہر خیر وشر دونوں کو عام ہوگا، مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ خیر کا وعدہ مراد ہے کہ اس میں خلاف نہ کرے اور شر کے وعدہ کا خلاف محمود ہے بلکہ بعض جگہ خلاف واجب ہے، تو یہاں خیر کا وعدہ مراد ہوگا اور یہی علامت نفاق قرار پائے گی کہ خیر کا وعدہ کرے اور پھر خلاف کرے۔

وَاِذَا اؤتُمِنَ خَانَ یعنی خیانت کی عادت ہو، اور اگر احیاناً خیانت ہوگئی ہو تو اسے علامت نفاق شمار نہ کریں گے۔

حدیث ۳۳ : حَدَّثَنَا قَبِیصَۃ، اس حدیث میں فرمایا کہ جس میں چار خصلتیں ہوں وہ خالص منافق ہے اور اسمیں نفاق ہی نفاق ہے، اور پورا پورا منافق ہے۔ یہاں پر شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے منافق ہونے کا حکم کیسے لگا دیا گیا جبکہ وہ کلمہ پڑھتا ہے اور مومن ہے، تو کیا ان چیزوں کے پائے جانے سے وہ اسلام سے خارج ہو جائے گا اور اِنَّ المنافقین فی الدرک الاسفل من النار[1] کا مصداق بن جائے گا؟ حالانکہ ایسا نہیں ہے اور دلائل قاطعہ اس پر قائم ہیں کہ جب تک جحود نہ ہو اس وقت تک کفر نہ ہوگا اور چونکہ اس مومن میں یہاں جحود نہیں ہے اس لئے اسے خارج از اسلام نہیں کہہ سکتے، پھر کیا توجیہ ہوگی اس حدیث کی؟ تو لوگوں نے اس کی مختلف توجیہات کی ہیں، بعض نے کہا کہ اس سے نفاق عملی مراد ہے کہ دل میں اعتقاد تو صحیح ہے مگر عمل خلاف ہے، اور نفاق اعتقادی وہ ہے کہ اعتقاد کے خلاف گواہی دے، یعنی دل سے اعتقاد تو نہیں ہے مگر ظاہر کرے کہ وہ معتقد ہے جیسے قرآن میں فرمایا: اِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ م وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُولُهٗ ط وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكٰذِبُونَ[2] یعنی جو لوگ دل میں کفر لئے ہوئے تھے اور نبی علیہ السلام کے پاس آکر ایمان ظاہر کرتے تھے ان کو اللہ نے جھوٹا قرار دیا ـــــ اور ایسے ہی اعتقادی منافقوں کے لئے قرآن میں فرمایا گیا ہے: اِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ کہ جہنم کے نچلے طبقے میں ہوں گے۔

نافقاء لغت عرب میں ضبّ (گوہ) کے سوراخ کو کہتے ہیں، وہ اپنے گھر میں دو سوراخ رکھتی ہے، ایک ظاہری ہوتا ہے اور یہی کھلا رہتا ہے، دوسرا سوراخ کسی اور جانب اس طرح بناتی ہے کہ نظر نہیں آتا اور دیکھنے میں زمین برابر معلوم ہوتی ہے مگر سوراخ کے منہ پر مٹی کا بہت ہلکا سا پردہ ہوتا ہے جو معمولی ٹھوکر سے کھل جاتا ہے، وہی چھپا ہوا سوراخ اس وقت کام آتا ہے جب کوئی شکاری اسے پکڑنے آتا ہے اور ظاہری سوراخ پر ٹھہرتا ہے اور یہ اس دوسرے خفیہ سوراخ سے نکل جاتی ہے اور شکاری کے ہاتھ نہیں لگتی، اسی خفیہ سوراخ کا نام نافقاء ہے اور دوسرا کھلا ہوا سوراخ جس سے آتی جاتی ہے اور سب کو نظر آتا ہے قاصعاء ہے۔

یہی حال منافق کا بھی ہوتا ہے کہ وہ چور دروازے سے کام لیتا ہے اور کھلے طور پر اپنے کو مسلمان کہتا ہے، ہمارے یہاں اردو کے محاورہ میں اس کو دورنگی کہیں گے (یہ دورنگی یا نفاق کی زندگی میں بالکل نہ تھا، ابن کثیر نے صراحت کی ہے اِنَّ مَكَّةَ لَمْ يَكُنْ هُنَاكَ

---

(۱) نساء: ۱۴۵ (۲) منافقون: ۱

. . . .

نفاق" (کہ میں نفاق نہ تھا) یہ بیماری مدینہ میں پیدا ہوئی، جب کچھ لوگوں کو دین برحق پسند نہ آیا، اور مخالفت کی طاقت اپنے میں نہ پائی تو وہ چور دروازے سے داخل ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایمان کا اظہار کرتے مگر دل میں کفر پر جمے رہتے، اس طرح انھوں نے اسلام اور اہل اسلام کو بہت نقصانات پہونچائے اور یہ ان کے خاص خصائل تھے جن کا حدیث میں ذکر ہے۔

اب اگر یہ عادتیں کسی مخلص مومن میں پائی جائیں تو ان کی توجیہ قرطبی اور بیضاوی نے عملی نفاق سے کی کہ جس میں منافق کی جتنی خصلتیں ہوں گی اتنا ہی وہ عملاً منافق ہوگا اور جس میں چاروں خصلتیں ہوں گی وہ پکا منافق عملی ہوگا اور جس میں کم ہیں اتنا ہی وہ کم منافق عملی ہوگا۔

بعض لوگوں نے دوسری توجیہ یہ کی کہ اسے منافق خالص اعتقادی کے شبیہ قرار دیا یعنی فعله فعل المنافقين و صورته صورة المنافقين، انھوں نے اپنی اس توجیہ میں لفظ منافق میں تصرف نہیں کیا، صرف نسبت میں فرق کر دیا۔

تیسری توجیہ یہ ہے کہ یہ عام نہیں ہے بلکہ عہد نبوت میں جو منافق تھے ان کے بارے میں صحابہ سے فرما رہے ہیں کہ جس میں یہ چار باتیں دیکھو تو سمجھ لو کہ پکا منافق ہے اور جس میں کم ہوں تو اس میں نفاق کم ہے، پس یہ مخصوص اشخاص کے لئے ہے۔

مگر ہم کہتے ہیں کہ بخاری کے صنیع سے ظاہر ہوتا ہے کہ مراتب نفاق بتلا رہے ہیں کہ یہ بھی نفاق ہے اور اعلیٰ مرتبہ نفاق کا ہے اس لئے نفاق کی تین یا چار خصلتیں پائی جا رہی ہیں گر پھر بھی ایسا نفاق نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے خلود فی النار ہو جائے اور ان میں سے بھی نہیں جن کے بارے میں قرآن نے انّ المنافقين فى الدرك الاسفل من النّار کہا ہے جیسے امام بخاری "قتاله كفر" میں کہتے ہیں، تو اس سے امام بخاری کے مسلک کے مطابق نفاق کے مراتب نکل آئے اور بخاری کی بات اسی وقت ثابت ہوگی جب مومن میں یہ خصلتیں پائی جائیں، اسلئے یہ توجیہ بے وزن ہے کہ عہد نبوی کے منافقین کے بارے میں یہ فرمان نبوی ہے۔

پہلی حدیث میں "واذا وعد اخلف" تھا اور یہاں "واذا عاهد غدر" ہے، کچھ زیادہ فرق نہیں ہے بس اتنا فرق ہے کہ معاہدہ طرفین سے ہوتا ہے اور وعدہ ایک طرف سے اور اس کے عموم میں معاہدہ بھی داخل ہے، نیز معاہدہ کا نقض حرام ہے بشرطیکہ یہ معاہدہ خلاف شرع نہ ہو اور وعدہ کا نقض مکروہ ہے، اس میں بھی اگر پہلے سے ایفاء کی نیت تھی اور پھر بدل دیا تو مکروہ تنزیہی ہے اور اگر وعدہ کرتے وقت ہی پورا کرنے کی نیت نہ تھی تو مکروہ تحریمی ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہ فرمان نبوی جوامع الکلم میں سے ہے، کیونکہ انسان میں تین چیزیں ہیں: قول، فعل، نیت، جب یہ تینوں درست ہو جائیں تو اب کیا باقی رہ گیا، اسی طرح عمل کے تین درجے ہیں، ایک دل کا فعل، دوسرا زبان کا، تیسرا جوارح کا، "اذا حدّث كذب" قول کے فساد پر دال ہے، "اذا اؤتمن خان" فعل کے فساد پر مبنی ہے، "واذا وعد اخلف" میں

باب ۲۵ قِيَامُ لَيْلَةِ الْقَدْرِ مِنَ الْاِيْمَانِ

شب قدر میں عبادت بجالانا ایمان میں داخل ہے

۳۴ ـ حَدَّثَنَا اَبُو الْيَمَانِ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُو الزِّنَادِ عَنِ

ہم سے بیان کیا ابوالیمان نے کہا ہم کو خبر دی شعیب نے، کہا ہم سے بیان کیا ابوالزناد نے، انھوں نے اعرج

الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يَّقُمْ لَيْلَةَ

سے، انھوں نے ابوہریرہ سے، کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص شب قدر میں عبادت کرے ایمان کے ساتھ ثواب کی

الْقَدْرِ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ

نیت کر کے اس کے اگلے گناہ بخش دیے جائینگے

نیت کا فساد ہے اور اخلاف وعدہ وہی مذموم ہے جس میں ایفاء وعدہ کی نیت نہ ہو، اگر نیت تھی مگر مجبوراً پورا نہ کرسکا تو مذموم نہیں، چنانچہ امام غزالی نے احیاء العلوم میں تصریح کی ہے کہ اصل چیز "وعدہ" میں نیت ہے، اگر فساد نیت ہے تو مذموم ہے ــــ تو یہ نیت کا فعل ہے اور جو ان تینوں چیزوں میں سچا نہیں وہ منافق نہیں تو اور کیا ہوگا؟

وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ، فجور سے مراد یہ ہے کہ گالی پر اتر آئے، گالی گلوچ مومن کی شان کے خلاف ہے، اور یہ منافق کا کام ہے۔

قولہ تابعہ شعبۃ عن الاعمش، یہ سفیان ثوری کا متابع بیان کیا کہ اعمش سے شعبہ بھی راوی ہیں، اس لئے بیان کیا کہ پہلی سند قبیصہ کی ہے اور قبیصہ کو یحییٰ ابن معین ضعیف کہتے ہیں اس لئے بخاری نے اس کا اظہار کردیا کہ راوی دوسرا بھی ہے مگر یہ تعلیق ہے، کتاب المظالم میں اس کو موصولاً بیان کیا گیا ہے۔

باب ۲۵ قیام لیلۃ القدر من الایمان

یعنی لیلۃ القدر کی عبادت ایمان میں سے ہے مگر از روئے ایمان و احتساب کے۔

ہر عمل طاعت میں دو شرطیں ہیں، اول ایمان کہ اس کے بغیر کوئی عمل کار آمد نہیں سب بیکار ہوگا، یہی وجہ ہے کہ کفار کے عمل بیکار ہیں، قرآن پاک میں دو مقام پر ان کے اعمال کا بیکار ہونا بتلایا گیا ہے، ایک تو سورۂ ابراہیم میں ارشاد فرمایا گیا مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اِِشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ط لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ط ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ [1] (حال ان لوگوں کا جو منکر ہوئے اپنے رب سے ان کے اعمال ہیں جیسے وہ راکھ جو زور کی

---

(۱) ابراہیم : ۱۸

. . . .

چلے اس پر ہوا آندھی کے دن، کچھ ان کے ہاتھ میں نہ ہوگا اپنی کمائی میں سے، یہی ہے بہک کر دور جا پڑنا) اس آیت نے یہ امر واضح کر دیا کہ کفار کے اعمال چاہے وہ کتنے ہی بھلے معلوم ہوتے ہوں اور مخلوق ان سے کتنے ہی فائدے کیوں نہ اٹھا چکی ہو مگر یہ راکھ کے ڈھیر کی طرح قیامت میں اڑ جائیں گے اور وہ حسرت کرتے رہ جائیں گے، معلوم ہوا کہ بغیر ایمان کے اعمال کا کچھ اعتبار نہیں۔

دوسری جگہ سورۂ نور میں فرمایا: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَاۗءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـــًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ[1] (اور جو لوگ منکر ہیں ان کے کام جیسے ریت جنگل میں، پیاسا جانے اس کو پانی، یہاں تک کہ جب پہونچا اس پر اس کو کچھ نہ پایا اور اللہ کو پایا اپنے پاس پھر اس کو پورا پہونچا دیا اس کا لکھا اور اللہ جلد لینے والا ہے حساب) جن کافروں نے سمجھا تھا کہ ہم بڑے بڑے کام کرتے ہیں، ہزاروں مخلوق کے کام آتے ہیں، کیا یہ سب رائگاں جائے گا، انھیں جواب دیا کہ اللہ پر ایمان کے بغیر کوئی عمل قیمتی نہیں، دنیا میں دیکھو باغی کے کسی اچھے عمل کی کوئی قیمت حکومت کی نگاہ میں نہیں ہے، تو پھر اللہ کے باغی کا کوئی عمدہ عمل بھی بے وزن ہے۔

تو حدیث میں پہلی قید ایمان کی لگائی اور دوسری شرط احتساب کی، یعنی حسبۃً للہ کام کرے، معلوم ہوا کہ نیت کا صاف رکھنا ضروری ہے، فرض کرو ایک شخص تہجد پڑھتا ہے تو اس سے اس کا پہلا منشا تو یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے درجات میں ترقی فرمائے گا اور یقین رکھتا ہے کہ میں چونکہ اس کے حکم کو تسلیم کرتا ہوں اور اس کو اپنا حاکم سمجھتا ہوں، اس کے نبی پر اور اس کے کلام پر ایمان رکھتا ہوں، لہٰذا میرے درجات میں ترقی ہوگی، اب ایک شخص کو یقین تو سب کچھ ہے مگر نیت یہ بھی ہے کہ لوگ دیکھیں گے تو کہیں گے بڑا عابد ہے، تو یہ ریا ہے، احتساب نہیں، نیت خیر کی ہونی چاہئے، بالکل ذہول بھی نہ ہو اور نیت شر بھی نہ ہو، تو تنہا ایمان کافی نہیں احتساب بھی ہونا چاہئے۔

اسی طرح لیلۃ القدر میں عبادت سے پچھلے گناہ معاف ہوتے ہیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون سے گناہ معاف ہوتے ہونگے سلف کہتے ہیں کہ صغائر تو یقیناً معاف ہوں گے اور کبائر مفوض الی مشیۃ اللہ ہیں، معاف کرے یا نہ کرے، کچھ معاف کرے یا کل، یہ تو سلف کا قول ہے، میں ان شاء اللہ آگے بیان کروں گا۔

یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ قیام لیل بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے، اسی کو فرمایا: مَنْ یَّقُمْ لَیْلَۃَ الْقَدْرِ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا

---

(۱) نور: ۳۹

باب ۲۶ اَلْجِهَادُ مِنَ الْاِیْمَانِ

جہاد ایمان میں داخل ہے۔

۳۵ — حَدَّثَنَا حَرَمِیُّ بْنُ حَفْصٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ قَالَ حَدَّثَنَا

ہم سے بیان کیا حرمی بن حفص نے، کہا ہم سے بیان کیا عبدالواحد نے، کہا ہم سے بیان کیا

عُمَارَةُ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْزُرْعَةَ بْنُ عَمْرِو بْنِ جَرِيْرٍ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ

عمارہ نے، کہا ہم سے بیان کیا ابوزرعۃ ابن عمرو ابن جریر نے، کہا میں نے سنا ابوہریرہ سے، انھوں نے نبی

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنْتَدَبَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ لِمَنْ خَرَجَ فِيْ سَبِيْلِهِ

صلی اللہ علیہ وسلم سے، فرمایا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جو شخص میری راہ میں (یعنی جہاد کے لئے) نکلے اس کو

لَا يُخْرِجُهُ اِلَّا اِيْمَانٌ بِيْ اَوْتَصْدِيْقٌ بِرُسُلِيْ اَنْ اُرْجِعَهُ بِمَا نَالَ مِنْ اَجْرٍ اَوْ غَنِيْمَةٍ

(اس کے گھر سے) اسی بات نے نکالا ہو کہ مجھ پر ایمان رکھتا ہے اور میرے پیغمبروں کو سچا جانتا ہے تو میں اس کے لئے یہ ذمہ لیتا ہوں

اَوْ اُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ وَلَوْلَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰى اُمَّتِيْ مَا قَعَدْتُ خَلْفَ سَرِيَّةٍ وَلَوَدِدْتُ

یا تو اس کو (جہاد کا) ثواب اور لوٹ کا مال دے کر (زندہ) مع الخیر (اس کے گھر کو) لوٹا دوں گا یا (اگر وہ شہید ہو گیا ہو) اس کو بہشت میں لے جاؤں گا آنحضرت

اَنِّيْ اُقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْيٰى ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيٰى ثُمَّ اُقْتَلُ.

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں ہر لشکر کے ساتھ جو جہاد کو جاتا، نکلتا۔ اور مجھے تو یہ آرزو ہے کہ اللہ کی راہ میں مارا جاؤں، پھر جلایا جاؤں، پھر مارا جاؤں پھر جلایا جاؤں، پھر مارا جاؤں۔

غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ، جو شخص بھی ایمان و احتساب کے ساتھ لیلۃ القدر میں قیام کرے، تو اس کے پچھلے گناہ بخش دیے جائینگے آگے باب التطوع قیام رمضان میں بھی یہی حدیث لا رہے ہیں مگر وہاں کچھ تغیر ہے، ایک تو "مَنْ قَامَ رَمَضَانَ" فرمایا، یعنی وہاں عام کر دیا، اس پر شبہہ ہوتا ہے کہ جو وعدہ قیام لیلۃ القدر پر تھا وہ سارے رمضان کے قیام پر ہو گیا، تو اب یہ ثواب سارے رمضان کے قیام پر ہے یا لیلۃ القدر پر؟ تو اس کا بہتر جواب زرقانی نے دیا ہے کہ جو شخص تمام رمضان قیام نہ کر سکے تو صرف لیلۃ القدر کا قیام کافی ہے بشرطیکہ یہ اسے مل جائے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ لیلۃ القدر میں "مَنْ يَّقُمْ" مضارع کا صیغہ ہے اور رمضان میں "قَامَ" ماضی ہے اور اس کے بعد "مَنْ صَامَ" بھی ماضی ہے، تو اس کے متعلق کرمانی جو شارح بخاری ہیں، اور حافظ سے پہلے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس میں یہ

. . . .

نکتہ ہے کہ جو شخص رمضان میں قیام کر رہا ہے تو رمضان کے محقق ومتعین ہونے کی وجہ سے یقینی طور پر وہ قیام کر چکا اس لئے اس کو ماضی لائے مگر لیلۃ القدر میں تحقق یقینی نہیں، اس لئے مضارع کا صیغہ لائے، واللہ اعلم بالصواب۔

باب[۲۶] الجهاد من الایمان

قولہ انتدب اللہ لمن خرج فی سبیلہ لا یخرجہ الا ایمان بی وتصدیق برسلی، ـــ

انتدب بمعنی تکفل، دوسری روایت میں تکفل کا لفظ ہی ہے، انتداب کہتے ہیں سرعت کے ساتھ اجابت کو، یعنی اللہ نے اس شخص کا تکفل کرلیا جو جہاد کے لئے نکل چکا ہو، مگر شرط یہ ہے کہ نکلنے کی بنیاد اور غرض اللہ پر ایمان اور پیغمبر کی تصدیق اور بشارات پیغمبر پر اعتقاد رکھتے ہوئے ہو، نہ سلطنت کی طلب ہو، نہ مال وجاہ کی چاہت، محض خالصۃً لوجہ اللہ نکلا ہو۔

ان ارجعہ بما نال، اللہ نے اس شخص کا تکفل کرلیا اور ذمہ داری لے لی کہ میں اس کو لوٹاؤں گا اس چیز کے ساتھ جو اس کو ملے گی، وہ کیا ہے؟ من اجر او غنیمۃ! اجر ہر حال میں اور غنیمت کبھی کبھی او ادخلہ الجنۃ یا میں اسکو داخل کروں گا جنت میں ـــ تو اس کو دو باتوں میں سے ایک ضرور ملے گی، اجر وغنیمت یا جنت "لا یخرجہ الا ایمان بی" سے معلوم ہوا کہ جہاد کی روح ایمان باللہ اور تصدیق بالرسل ہے، تو جہاد بھی ایمان میں داخل ہوگیا وھو مقصود البخاری (یہی بخاری کا مقصود ہے) اور اس سے کسی کو انکار نہیں، فرق اتنا ہے کہ کچھ لوگ اس کو جزو ایمان کہتے ہیں اور کچھ لوگ شعبۂ ایمان کہتے ہیں

قولہ ولولا ان اشق علی امتی ما قعدت خلف سریۃ، یعنی مجھے اپنی امت پر مشقت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ہر سریہ کے پیچھے جاتا، "سریۃ" اس چھوٹی جماعت کو کہتے ہیں جس میں زیادہ سے زیادہ چار سو آدمی ہوں، اس سے زیادہ کو جیش کہتے ہیں امت پر مشقت یوں ہوتی کہ بہت سے اہم امور جو مدینہ میں ہو رہے تھے وہ معطل ہو جاتے، یا یہ کہ جب خلفاء کا دور آئے تو وہ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خلیفہ کا نکلنا ضروری ہے، تو ایسی حالت میں بہت سے اہم کام معطل ہو جائیں گے، انھیں مصالح کے پیش نظر آپ نہیں نکلتے، ورنہ ہر سریہ کے ساتھ آپ ضرور نکلتے۔(۱)

قولہ لوددت انی اقتل فی سبیل اللہ ثم احیی ثم اقتل ثم احیی ثم اقتل، یعنی مجھے جہاد میں ایسی

---

(۱) ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میری امت کے وہ کمزور لوگ جن کے پاس خرچ نہیں ہے میرے ساتھ چلنے کے متمنی ہوتے مگر ناداری سے نہ جا سکتے اور میرے پاس بھی انتظام نہ ہو سکتا تو ان کو سخت کڑھن ہوتی، تو ان کی رعایت بھی پیش نظر ہے (جامع)

بَابٌ ۲۷ تَطَوُّعُ قِيَامِ رَمَضَانَ مِنَ الْإِيمَانِ

رمضان میں راتوں کو نفل نماز پڑھنا ایمان میں داخل ہے

۳۶ —— • حَدَّثَنَا إِسْمٰعِيلُ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ

ہم سے بیان کیا اسمٰعیل نے، کہا مجھ سے بیان کیا مالک نے، انھوں نے ابن شہاب سے، انھوں نے

حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ

حمید ابن عبدالرحمٰن سے، انھوں نے ابوہریرہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کوئی رمضان میں

مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ

(راتوں کو) ایمان رکھ کر اور ثواب کے لئے عبادت کرے اس کے اگلے گناہ بخش دئے جائیں گے

لذت آتی ہے کہ ایک دو بار نہیں بلکہ جی چاہتا ہے کہ بار بار جان دیتا رہوں، یہاں تمنا ہے شہادت کی، اور تمنائے شہادت بھی شہادت ہے چنانچہ ابوداؤد میں ہے کہ بہت سے لوگ بستر پر جان دے دیتے ہیں اور وہ شہید ہوتے ہیں اور حضورؐ کی حیات دوسروں کی شہادت سے لاکھوں درجے بڑھ کر ہے اور شہادت سے آپ کے کمال میں اضافہ نہ ہوتا، یہاں محض شوق وجذبہ کا اظہار ہے، اور حقیقت میں یہ مرتبہ اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو محبت الٰہی میں مستغرق ہو۔

ترمذی کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فقرہ لوددت ان اقتل الخ مدرج ہے یعنی یہ ابوہریرہ کا قول ہے، اور یہ انکی تمنا ہے لیکن بخاری نے یہاں تو کچھ نہیں کہا۔ البتہ باب ماجاء فی التمنی میں تصریح کی ہے کہ یہ قول خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے

بَابٌ ۲۷ تَطَوُّعُ قِيَامِ رَمَضَانَ

امام بخاری اس ترجمہ میں لفظ "تطوع" لاکر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس طرح فرائض اعمال داخلِ ایمان ہیں، اسی طرح نوافل اعمال بھی داخل ایمان ہیں، رات کا قیام فرض نہیں ہے، نفل ہے، قیام لیالی رمضان میں تراویح بھی ہے اور دیگر نوافل بھی شامل ہو سکتے ہیں، تہجد، تلاوت قرآن، اذکار وغیرہ سب قیام رمضان میں شامل ہیں، تو معلوم ہوا کہ نوافل اعمال بھی داخل ایمان ہیں۔

حدیث ۳۶ قولہ، مَنْ قَامَ الخ سے بظاہر مراد یہ ہے کہ لیل میں معتد بہ قیام کرے، اور بعض محققین نے لکھا ہے کہ قیام سے تراویح مراد ہے، کہ جس شخص نے تراویح کی مداومت کی تو گویا اس نے تمام رمضان قیام کیا، اس عمل کا خاصہ بیان فرمایا کہ اس سے گناہ بخش دئے جائیں گے، یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ہر عمل کی ایک خاصیت ہوتی ہے جس طرح ہر دوا کی ایک خاصیت ہوتی ہے، مگر جس طرح دوا کی تاثیر میں یہ شرط ہے کہ اس تاثیر کی باطل کرنے والی کوئی چیز نہ ہو ورنہ اثر ظاہر نہ ہوگا اسی طرح یہاں سمجھو کہ یہ مغفرتِ ذنوب اس نیک

باب ۲۸ صَوْمُ رَمَضَانَ اِحْتِسَابًا مِنَ الْاِیْمَانِ

رمضان کے روزے رکھنا ثواب کی نیت سے ایمان میں داخل ہے

۳۷ — حَدَّثَنَا ابْنُ سَلَامٍ قَالَ اَخْبَرَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فُضَیْلٍ قَالَ حَدَّثَنَا

ہم سے بیان کیا ابن سلام نے، کہا ہم کو خبر دی محمد ابن فضیل نے، کہا ہم سے بیان کیا یحییٰ ابن سعید نے

یَحْیٰی بْنُ سَعِیْدٍ عَنْ اَبِیْ سَلَمَۃَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ

انھوں نے ابوسلمہ سے، انھوں نے ابوہریرہ سے، کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص رمضان کے روزے

وَسَلَّمَ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ

ایمان رکھ کر اور ثواب کی نیت سے رکھے اس کے اگلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

عمل کی خاصیت ہے بشرطیکہ کوئی ایسا مانع نہ پیدا ہوجائے جو اس کی اس خاصیت کو ظاہر نہ ہونے دے، اسی لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اہتمام فرمایا اور امت کو تعلیم دی کہ اپنے اس عمل کو اللہ کی نافرمانی سے بالکل صاف و پاک رکھو، کیونکہ نافرمانی سے اس بابرکت عمل کی تاثیر کام نہ کرسکیگی۔ اسی لئے فرمایا کہ جو آدمی گناہوں کو نہیں چھوڑتا اس کو جاگنے کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا، اسی طرح ایمان کے ساتھ احتساب کی قید یہ بتاتی ہے کہ صرف خدا کی خوشنودی پیش نظر رہے، اور اسی کا نام اخلاص ہے، جس قدر اس کے اخلاص میں بلندی ہوگی اسی قدر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات کی بارش ہوگی۔

باب ۲۸ صوم رمضان الخ

حدیث ۳۷ مبارک ارشاد سے معلوم ہوا کہ رمضان میں روزہ رکھنا ان دو شرطوں کے ساتھ جن کا ذکر پہلے "لیلۃ القدر" اور "قیام رمضان" میں آچکا ہے، مغفرت ذنوب کا ذریعہ ہے، رمضان کا پورا مہینہ خیر و برکت کا مہینہ ہے، رحمت الٰہی جوش میں ہوتی ہے جیساکہ حدیث شریف میں ہے کہ رمضان کی پہلی رات سے اعلان شروع ہوجاتا ہے یا باغی الخیر اقبل و باغی الشر اقصر ولله عتقاء من النار، اے خیر کے طلبگار آگے بڑھ (اور رحمت سے بھرپور فائدہ حاصل کرلے) اور شر کے چاہنے والے رک جا، (یعنی شر بالکل چھوڑ دے تاکہ خسارہ سے بچ جائے) اور اللہ کے لئے بہت لوگ (بہ برکت ماہ رمضان) دوزخ سے آزاد کئے ہوئے ہیں اس رحمت کی تکمیل گویا اس چیز سے ہوتی ہے کہ سرکش شیطان قید کردئے جاتے ہیں تاکہ اب انھیں فساد پھیلانے اور اللہ کی رحمت سے روکنے کا موقع نہ مل سکے اور رحمت سے فائدہ اٹھانے والے پوری طرح فائدہ اٹھا سکیں، یہی وجہ ہے کہ اس اعلان سے اگر کوئی اب بھی فائدہ نہیں اٹھاتا اور اپنی مغفرت نہیں کراتا تو اس کو سخت وعیدیں بھی سنا دیں، تاکہ آدمی ڈر کر برائی چھوڑ دے، لیلۃ القدر کے منافع

باب ۲۹ اَلدِّیْنُ یُسْرٌ وَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَحَبُّ الدِّیْنِ

اسلام کا دین آسان ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کو وہ دین بہت پسند ہے جو سچا،

اِلَی اللّٰهِ الْحَنِیْفِیَّةُ السَّمْحَةُ

سیدھا، آسان ہو

بیان کرکے یہ بھی سنادیا من حرم خیرھا فقد حرم، جو اس شب کی خیر سے محروم رہا وہ بالکل ہی محروم رہا، اسی طرح فرمایا رغم انف رجل دخل علیه رمضان ثم انسلخ قبل ان یغفر له، خاک آلودہ ہو اس شخص کی ناک کہ جس پر رمضان آیا پھر وہ ختم ہوگیا اس سے پیشتر کہ اس شخص کی بخشش کی جائے، اور اس سے سخت وعید اس حدیث میں ہے جو کعب ابن عجرہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ ممبر کے قریب ہوجاؤ، ہم لوگ قریب ہوگئے تو آپ ممبر پر چڑھے، جوں ہی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا فرمایا آمین، پھر جب دوسرے زینہ پر قدم رکھا تو فرمایا آمین، اسی طرح تیسری سیڑھی پر بھی قدم رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا آمین، ہم نے عرض کیا یارسول اللہ آج یہ نئی بات دیکھی گئی، فرمایا: ہاں! ہوا یہ کہ اس وقت جبریل امین میرے سامنے آئے تھے، جب پہلے درجہ پر میں نے قدم رکھا تو انھوں نے کہا: ہلاک ہو وہ شخص جس نے رمضان کا مبارک مہینہ پایا پھر بھی اس کی مغفرت نہ ہوئی، میں نے کہا آمین، پھر جب میں دوسرے درجہ پر چڑھا تو جبریل نے کہا: ہلاک ہو وہ شخص جس کے سامنے میرا ذکر ہو اور وہ درود نہ بھیجے، میں نے کہا آمین، جب میں تیسرے درجہ پر پہونچا تو جبریل نے کہا: ہلاک ہو وہ شخص جس کے والدین یا ان میں سے کوئی ایک بڑھاپے کو پاوے اور وہ اس کو جنت میں داخل نہ کرائے، میں نے کہا آمین۔

اللہ کے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کی راتوں کے قیام اور دن کے روزے کو مغفرت کا ذریعہ قرار دیا، اور بخاری نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق انھیں ایمان میں داخل بتایا۔

بخاری نے یہاں تطوعِ قیامِ لیل کو صومِ فرضِ رمضان سے بیان کیا، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ قیامِ لیل ترتیب میں مقدم ہے کیونکہ شریعت میں رات پہلے ہوتی ہے اور دن بعد میں، تو رات کا قیام اور تراویح رات ہی سے شروع ہوگی اور روزہ دن میں ہوگا، اسلئے پہلے قیام کا باب لائے، واللہ اعلم بالصواب۔

باب ۲۹ اَلدِّیْنُ یُسْرٌ الخ

دین آسانی کا نام ہے، یعنی سارا دین سہل ہے، کوئی مشکل چیز نہیں، یا یہ کہ جن امور میں مختلف شکلیں جواز کی نکلتی ہوں، وہ سب کی سب اگرچہ شرعاً جائز ہیں مگر ان میں سے بہتر وہ ہیں جن میں تسہیل و سہولت ہو۔

. . . .

یہاں ایک کھٹک یہ پیدا ہوتی ہے کہ ایمان کے سلسلہ کے ابواب سے الدّین یسرٌ کا باب بے جوڑ معلوم ہوتا ہے، اس کو کہیں آگے لانا چاہیے تھا جب ابواب ایمان کا سلسلہ ختم ہو جاتا، اسی طرح الجهاد من الایمان کا جو باب لائے ہیں اس میں بھی بے ترتیبی سی معلوم ہوتی ہے، تو وہاں حافظ نے لکھا ہے کہ لیلۃ القدر کا قیام اور اس کی تلاش میں جدوجہد چونکہ بہت مشکل ہے اور یہ وہی شخص کر سکتا ہے جو مجاہدہ کرتا ہو اور وہ ایسا ہی ہے جیسے جہاد میں جانا اور لیلۃ القدر کا قیام اسی کو حاصل ہوتا ہے جو جدوجہد کرے تو وہاں من وجہ ربط پایا جاتا ہے، کیونکہ دونوں میں جدوجہد ہے اور دونوں من الایمان ہیں۔ مگر یہاں تو کچھ بھی نہیں، ایک دن قرآن پر نظر پڑی اس وقت سمجھ میں آیا کہ بخاری کی نظر قرآن پر ہے، وہاں بھی پہلے رمضان کا ذکر ہے، بعد میں "یُسر" کا، پڑھو: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ[1] مہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن، ہدایت ہے واسطے لوگوں کے اور دلیلیں روشن، راہ پانے کی، اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی، سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینہ کو تو ضرور رکھے اسکے روزے اور جو کوئی ہو بیمار یا مسافر تو اس کو گنتی پوری کرنی چاہیے اور دنوں سے، اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر دشواری۔

امام بخاری نے جب صیام کا باب باندھا تو فوراً ادھر منتقل ہو گئے، چونکہ آیت میں یُسر کا ذکر تھا اس لئے انھوں نے یسر ہی کا باب باندھ دیا۔

اس پر بہت جی خوش ہوا اور جو ایک بے ترتیبی سی معلوم ہو کر باعث تکدر ہو رہی تھی وہ الحمدللہ بالکل دور ہو گئی۔

قولہ احبّ الدّین الی اللہ الحنیفیّۃ السّمحۃ، فرماتے ہیں: محبوب دین ملت حنیفیہ ہے، "حنیف" کے معنی لغت میں مائل کے ہیں اور قرآن و سنت میں "حنیف" اسے کہتے ہیں جو سب سے ٹوٹ کر اللہ کی طرف جھک جائے اور صرف اللہ ہی کی طرف مائل ہو جائے، جیسے ابراہیم علیہ السلام تھے اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا ؕ وَلَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ[2] (اصل میں تو ابراہیم تھا راہ ڈالنے والا فرماں بردار اللہ کا سب سے ایک طرف ہو کر اور نہ تھا شرک والوں میں) یعنی کسی قسم کا شرک نہ تھا، بال برابر بھی شائبہ شرک نہیں تھا، اسی کی توصیف کرتے ہیں ؎

---

(۱) بقرہ : ۱۸۵ (۲) نحل : ۱۲۰

. . . .

از یکے گو وز ہمہ یکسوئے باش　　یک دل ویک قبلہ ویک روئے باش

یہ شعر حضرت شیخ فرید الدین عطار رحمہ اللہ کے رسالہ منطق الطیر کا ہے، ان کا مرتبہ مولانا رومؒ سے بلند ہے، بقیہ اشعار یہ ہیں، بڑے کام کے ہیں:

آں خداوندے کہ ہستی ذات اوست　　جملہ عالم مصحفِ آیات اوست

او ز جملہ بیش و ہم پیش از ہمہ　　جملہ از خود دیدہ وخویش از ہمہ(۱)

جاں نہاں در جسم او در جاں نہاں　　اے نہاں اندر نہاں اے جانِ جاں

چوں نہاں بینی عیاں آنگہہ شود　　چوں عیاں بینی نہاں آنگہہ شود

چوں ہم بینی چوں بے چون ست او　　آں زماں از ہر دو بیرون ست او

از یکے یگو وز ہمہ یکسوئے باش　　یک دلی ویک قبلہ ویک روئے باش

یہ آخری شعر اصل حنیف کا ترجمہ ہے، وہی ہے جو حدیث میں ہے: مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ، جس نے محبت کی تو اللہ کے لئے اور بغض کیا تو اللہ کے لئے، یعنی سب کچھ اللہ ہی کے لئے، تو اس نے ایمان کامل کر لیا۔

ابراہیم علیہ السلام کو حنیف کہا گیا اس لئے کہ سب سے پہلے پرستار توحید اور مظہرِ توحید ہی تھے، گھر کو چھوڑا، باپ کو چھوڑا، قوم کو چھوڑا اور وطن کو چھوڑا، صرف سیدنا لوط علیہ السلام کو جو بھتیجے تھے، لیکر چل دئے، قرآن میں ہے: فَاٰمَنَ لَہٗ لُوْطٌ م وَقَالَ اِنِّیْ مُھَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ط(۲) (پھر مان لیا اس کو لوط نے اور وہ بولا میں تو وطن چھوڑتا ہوں اپنے رب کی طرف) اس کے بعد حکم ہوا کہ ہاجر کو اپنے چھوٹے بچے کے ساتھ وادیٔ غیر ذی زرع میں چھوڑ دو، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فوراً تعمیل حکم کی، حدیث میں ہے حضرت ابراہیم نے جب حضرت ہاجر کو چھوڑا تو بولیں: یہاں ہمیں تنہائی میں جو چھوڑے جا رہے ہو یہ اللہ کے حکم سے ہے یا اپنی رائے سے؟ کہا اللہ کے حکم سے، تو کہنے لگیں: اب جاؤ کچھ پرواہ نہیں، پھر ذبح کا معاملہ سامنے آیا تو کیسے مضبوط نکلے، کتنی تمناؤں سے ان کو اللہ سے مانگا تھا مگر جب اللہ کا حکم ملا تو ذرا بھی تامل نہ کیا، فوراً کر گذرے، جب نمرود نے آگ میں ڈالا تو فرشتے نے کہا ہم مدد کریں؟ کیسا جواب دیا سبحان اللہ! فرمایا: امّا الیک فلا تم سے تو ہرگز نہیں، وامّا الی اللہ فحسبنا اللہ ونعم الوکیل، رہا اللہ سے، تو بیشک اس سے ضرور، کیونکہ وہ اللہ ہمارے لئے

---

(۱) یہ ھوالاوّل ھوالاٰخر ھوالظاھر ھوالباطن کا ترجمہ ہے　　(۲) عنکبوت: ۲۶

۳۸ــــ حَدَّثَنَا عَبْدُ السَّلَامِ بْنُ مُطَهَّرٍ قَالَ نَا عُمَرُ بْنُ عَلِيٍّ عَنْ مَعْنِ بْنِ مُحَمَّدٍ

ہم سے بیان کیا عبد السلام ابن مطہر نے، کہا خبر دی ہم کو عمر ابن علی نے، انھوں نے معن ابن محمد غفاری سے

الْغِفَارِيِّ عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي سَعِيدٍ الْمَقْبُرِيِّ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

انھوں نے سعید ابن ابی سعید مقبری سے، انھوں نے ابو ہریرہ سے، انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے، فرمایا

وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ فَسَدِّدُوا وَقَارِبُوا وَأَبْشِرُوا

بیشک (اسلام کا) دین آسان ہے، اور دین میں جو کوئی سختی کرے گا تو دین اس پر غالب آئے گا، اس لئے بیچ کی چال چلو

وَاسْتَعِينُوا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدُّلْجَةِ

اور (افضل کام نہ کر سکو تو) اس کے قریب رہو اور ثواب کی امید رکھ کر اس سے خوش رہو، اور صبح کی چہل قدمی اور شام کی چہل قدمی اور اخیر رات کی کچھ چہل قدمی سے مدد لو۔

بالکل کافی ہے اور بہترین کارساز ہے ــــ ہر طرح کا امتحان ہوگیا، اسی کو فرمایا ہے: إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (۱) جب ابراہیمؑ سے کہا ان کے رب نے اے ابراہیم! اپنے رب کے فرماں بردار بن جاؤ، تو بولے میں تو رب العالمین کا فرماں بردار بن گیا ــــ قرآن پاک میں لفظ "حنیف" صرف ابراہیم علیہ السلام کے لئے استعمال کیا گیا ہے، یعنی ان کا لقب ہوگیا، کسی دوسری ذات کو قرآن میں "حنیف" نہیں کہا گیا، ہاں "حُنفاء" دوسرے مومنین کے لئے آیا ہے، مگر "حنیف" کسی اور کے لئے نہیں آیا ــــ اب ملت کو "حنیفیہ" اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ان کی طرف منسوب ہے، فرماتے ہیں: احب الدّين الى الله الحنيفيّة السّمحة، اللہ کو وہ دین بہت محبوب ہے جو سیدھا، سچا اور آسان ہو، شبہہ ہوگا کہ تمام ادیان اللہ کی طرف سے ہیں، جواب یہ ہے کہ محبوب تو سب ہیں لیکن "احب" دین ابراہیمی ہے، سَمْحَة سہل سہل باتیں، جس میں سخت گیری نہیں، یہود کی طرح سختی نہیں، چنانچہ قرآن میں نبی علیہ السلام کے اوصاف میں فرمایا گیا: الرّسول النّبی الامّی الّذی یجدونه مکتوبًا عندهم فی التوراة والانجیل یامرهم بالمعروف وینهاهم عن المنکر ویحلّ لهم الطیّبات ویحرّم علیهم الخبائث ویضع عنهم اصرهم والاغلال الّتی کانت علیهم (۲) وہ رسول و نبی امی جسے اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں، جو بھلائیوں کا حکم دیتے ہیں اور منکرات سے روکتے ہیں اور اتار دیتے ہیں ان کا بوجھ، اور وہ بیڑیاں جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے یعنی جن زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، سب توڑ دیں

---

(۱) بقرہ : ۱۳۱ (۲) اعراف : ۱۵۶

. . . .

یعنی سختیاں اٹھا دی گئیں اور آسانیاں کر دی گئیں۔

قرآن میں شاہد موجود ہے: وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (۱) اللہ نے تم پر دین میں کچھ تنگی نہیں کی اور غالباً "لَنْ يُّشَادَّ الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ" اسی آیت سے اقتباس ہے، کوئی شخص دین سے زور آزمائی نہیں کرتا لیکن دین اس پر غالب آجاتا ہے، مُشَادَّة: ایک دوسرے پر غالب آنے کے لئے سختی کرنا، یعنی کوئی دین پر حاوی ہونا چاہے تو ناممکن ہے، اگر کوئی شخص چاہے کہ تمام عبادات اور تمام عزیمتیں جمع کر لے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ چند دن ایسا کرے گا، پھر سب کو چھوڑ دے گا کیونکہ یہ نبھ نہیں سکتا، اس پر دوام نہیں ہو سکتا پھر دین سے مغلوب ہو جاتا ہے اور یہ کنایہ ہے کہ آدمی تمام عزائم جمع کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا تو آدمی کو چاہئے کہ اس قدر کرے جسے نباہ سکے، اور اس پر دوام ہو سکے، یہی طریقہ اچھا ہے، اس میں ہمیشہ کام ہوتا رہتا ہے، نیز طبیعت میں نشاط بھی رہتا ہے۔

فَسَدِّدُوْا: یعنی میانہ روی اختیار کرو، سَدَاد: بین بین راستہ اختیار کرنا، متوسط درجہ پسند کرنا، بفتح السین ہے، اور بکسر السین سِدَاد کے معنی ڈاٹ لگانا اور روکنا ہیں، کما قال الشاعر:

اَضَاعُوْنِیْ وَاَیَّ فَتًی اَضَاعُوْا ۔۔۔ لِیَوْمِ كَرِيْهَةٍ وَسِدَادِ ثَغْرٍ

وَقَارِبُوْا: قریب قریب لگے رہو، یعنی اکمل کا حصول تو مشکل ہے، ہاں ساتھ ساتھ لگے چلو۔

قولہ وَاَبْشِرُوْا: یعنی بشارت حاصل کرو کہ تھوڑا کام کرنا اور دوام کے ساتھ کرنا بہتر ہے بہت کام کرنے سے مگر چند دن کرنے سے۔

امام غزالی نے لکھا ہے کہ ایک قطرہ جو مسلسل کسی پتھر پر گرتا رہے گا وہ برسوں کے بعد پتھر میں سوراخ کر دے گا لیکن اگر اتنا ہی پانی ایکدم گرا دیا جائے تو کچھ بھی اثر نہ ہوگا۔

اسی طرح مداومت ذکر قلب کو چھید دیتی ہے، شاہ ولی اللہؒ کا قول حجۃ اللہ البالغہ میں درج ہے کہ شریعت نے تقلیل عبادت کا حکم تکثیر کے لئے دیا ہے یعنی جو قلیل کرے گا اور کرتا رہے گا تو وہ بہت ہو جائے گا اور جب یکدم بہت سا کر لیا تو عمر بھر پابندی تو نہ کر سکے گا چھوٹ جائے گا لہٰذا کم رہ جائے گا، جو دوکاندار نفع کم لیتا ہے وہ زیادہ بیچ لیتا ہے اس لئے نفع بھی زیادہ کما لیتا ہے اور جو زیادہ نفع لیتا ہے وہ کم بیچتا ہے اور وہ قائم نہیں رہتا اس لئے نفع میں کمی ہو جاتی ہے، بس یہی معاملہ عبادات میں بھی ہے، اس کو اتنا پکڑو کہ

---

(۱) حج: ۷۸

بابٌ الصّلوٰة من الایمان وقول اللّٰہ تعالیٰ (وما کان اللّٰہ لیضیع ایمانکم) یعنی صلوٰتکم عند البیت۔

نماز ایمان میں داخل ہے اور حق تعالیٰ نے ۱۔س ''بقرہ میں ''فرمایا ''اور ایسا نہیں جو تمہارا ایمان اکارت کرے'' یعنی بیت اللہ کے پاس جو تم نے نماز پڑھی (بیت المقدس کی طرف منہ کر کے)

نباہ سکو۔

قولہ واستعینوا بالغدوۃ والروحۃ وشیئ من الدلجۃ: یہ جملے اگر انسان مضبوطی سے پکڑلے تو ولی بن سکتا ہے اس میں حضورؐ نے اپنی رحمت سے تعلیم و تربیت کا خلاصہ کردیا ہے، فرماتے ہیں: صبح اور شام کا اور کچھ حصہ دلجہ کا کافی ہے' بس ان سے مدد حاصل کرو، غُدْوَۃ شروع دن میں چلنے کو کہتے ہیں، اور رَوْحَۃ بعد زوال چلنے کو، دُلجۃ'' رات کے آخری حصہ کو کہتے ہیں' تو یہ تین اوقات آدمی کے لئے کافی ہیں جبکہ وہ پابندی سے لگا رہے، ایسے لوگ جن کو ذوق عبادت ایسا ہو کہ کم کرنے سے وحشت ہو، وہ بہت کم ہیں جیسے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ جو تابعی ہیں[1] ان کے بارے میں منقول ہے کہ چالیس برس تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی' چالیس ہزار قرآن ختم کئے' غالباً تیس ہزار اس مقام پر ختم کئے ہوں گے جہاں شب میں عبادت کرتے تھے اور دس ہزار اس کے علاوہ دیگر مقامات پر' اور بہت سے حج کئے' انھیں عبادت کم کرنے سے وحشت ہوتی تھی۔

دیوبند میں ایک صاحب صائم الدہر تھے' سال کے وہ پانچ دن جن میں روزہ رکھنا حرام ہے' ان میں کہتے تھے جیسے تمھیں نہ کھانے سے تکلیف ہوتی ہے ایسے ہی مجھے کھانے سے ہوتی ہے۔

فضیل ابن عیاض یا سفیان ثوری کا مقولہ ہے کہ اگر بادشاہ کو اس لذت کا علم ہوجائے جو ہمیں عبادت میں حاصل ہے تو وہ اسے حاصل کرنے کے لئے ہم پر لشکر لے کر چڑھائی کردیں۔

تو یہ خواص کا مرتبہ ہے اور یہاں حکم عوام کا ذکر ہو رہا ہے کہ وہ برداشت نہیں کرسکتے' حضرت مولانا گنگوہی فرماتے تھے کہ تیس ۳۰ برس کے تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ جو چیز اتنی مشکل معلوم ہوتی تھی وہ تو بہت آسانی سے حاصل ہوسکتی ہے' پھر یہ حدیث سنائی: ''واستعینوا بالغدوۃ والروحۃ وشیئ من الدلجۃ''، اور جو چاہے اس کا تجربہ کرلے' پھر دیکھے کیا کیفیت ہوتی ہے

بابٌ الصّلوٰۃ من الایمان

ترجمۃ الصلوٰۃ من الایمان، اور اس کے استشہاد میں آیت پیش کی: وما کان اللّٰہ لیضیع ایمانکم یہاں ایمان بول کر عمل

---

(۱) امام سیوطی نے اپنی کتاب ''تبییض الصحیفہ فی مناقب ابی حنیفہ'' میں امام ابو حنیفہ کی تابعیت تسلیم کی ہے' اسی طرح ابن حجر مکیؒ اور ابن حجر عسقلانیؒ بھی امام اعظمؒ کی تابعیت تسلیم کرتے ہیں' صحابۂ کرامؓ میں حضرت انسؓ کے علاوہ اور بھی کئی صحابہؓ کی رویت ثابت ہے' البتہ سماع کا ثبوت نہیں' امام بیہقی نے بھی مناقب امام اعظم میں ایک رسالہ لکھا ہے جس میں انھوں نے امام صاحب کی تابعیت تسلیم کی ہے' منہ

۳۹ـ حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ خَالِدٍ قَالَ نَا زُهَيْرٌ قَالَ نَا اَبُو اِسْحَاقَ عَنِ الْبَرَاءِ اَنَّ

ہم سے عمرو ابن خالد نے بیان کیا، کہا ہم سے زہیر نے بیان کیا، کہا ہم سے ابو اسحاق نے براء سے بیان کیا کہ آنحضرت

النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ اَوَّلَ مَا قَدِمَ الْمَدِیْنَةَ نَزَلَ عَلٰی اَجْدَادِہٖ اَوْقَالَ

صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے تو اپنے ننہیال یا ممہیال میں اترے جو انصاری لوگوں میں تھے اور آپ سولہ یا سترہ مہینے

اَخْوَالِہٖ مِنَ الْاَنْصَارِ وَاَنَّہٗ صَلّٰی قِبَلَ بَیْتِ الْمَقْدِسِ سِتَّةَ عَشَرَ شَهْرًا اَوْسَبْعَةَ عَشَرَ شَهْرًا

تک (مدینہ میں) بیت المقدس کی طرف منھ کرکے نماز پڑھتے رہے

مراد لیا گیا ہے اور اس پر قرینہ یہ حدیث ہے مَاتَ عَلَی الْقِبْلَةِ قَبْلَ اَنْ تُحَوَّلَ، اور یہی مدعا تھا اس لئے کہ نماز پر ایمان کا اطلاق ہوتا ہے، یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ "عند البیت" سے بظاہر کعبہ مراد ہے، کیونکہ جب مطلق "البیت" باللام بولا جاتا ہے تو کعبہ ہی مراد ہوتا ہے، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ بیت سے بیت المقدس مراد ہو، بظاہر سوال "الی بیت المقدس" سے تھا، کہ انھیں کعبہ کی طرف منھ کرکے نماز پڑھنا میسر نہ ہوا تھا اور وہ بیت المقدس ہی کی طرف نماز پڑھتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوگئے تھے، اب اگر بیت اللہ مراد لیا جائے تو مطلب نہیں بنتا، اور اگر بیت سے بیت المقدس مراد لیا جائے تو خلاف عرف ہے، مسند طیالسی میں "صلوتکم الی بیت المقدس" کی تصریح ہے، اس روایت سے تائید ہوتی ہے کہ بیت المقدس مراد ہے، مگر حافظ نے [اس موقع پر] جو یہ کچھ لکھا ہے وہی میرے نزدیک بھی قوی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ صلوٰۃ سے مراد تو وہی صلوۃ الی بیت المقدس ہے لیکن البیت سے مراد کعبہ ہے مطلب یہ کہ وہ نماز جو متوجہاً الی بیت المقدس پڑھی گئی وہ کعبہ کے قریب پڑھی گئی، امام بخاری نے یہ اس وجہ سے کہا ہے کہ جب کعبہ کے قریب بیت المقدس کی طرف رخ کرکے پڑھی ہوئی نماز باوجود قرب کعبہ کے ضائع نہیں ہوئی تو وہ نماز جو مدینہ میں کعبہ سے بہت دور بیت المقدس کی طرف منھ کرکے پڑھی گئی ہے کیونکر ضائع ہوگی، اس صورت میں البیت سے وہی مراد لی گئی جو معروف ہے اور عند البیت سے مراد یہ ہے کہ اس کا وقوع بیت اللہ کے قریب ہوا جبکہ توجہ بیت المقدس کی طرف تھی تو لفظ عند معنی میں "الی" کے نہیں بلکہ نفس قرب مراد ہے۔

حدیث ۳۹ کَانَ اَوَّلَ مَا قَدِمَ الْمَدِیْنَةَ نَزَلَ عَلٰی اَجْدَادِہٖ اَوْقَالَ اَخْوَالِہٖ اَجْدَاد سے وہ اجداد مراد ہیں جو ماں کی طرف سے ہیں یعنی نانا وغیرہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب[1] نے ایک نکاح مدینہ کے قبیلہ بنو النجار میں کیا تھا اور یہ انصار کا ایک قبیلہ ہے، اس لئے یہ حضورؐ کا ننہیال ہوا۔

---

(۱) جن کا اصلی نام شیبہ تھا یا شیبۃ الحمد، اس کی پوری تفصیل ایضاح البخاری ص ۳۶۲ میں دیکھو، ۱۲ (جامع تقریر)

وَكَانَ يُعْجِبُهُ اَنْ تَكُوْنَ قِبْلَتُهُ قِبَلَ الْبَيْتِ وَاَنَّهُ صَلّٰى اَوَّلَ صَلٰوةٍ صَلَّاهَا

اور آپ یہ پسند کرتے تھے کہ آپ کا قبلہ کعبہ کی طرف ہو جائے۔ اور پہلی نماز جو آپ نے (کعبہ کی طرف) پڑھی وہ عصر کی نماز تھی، اور

صَلٰوةَ الْعَصْرِ وَصَلّٰى مَعَهُ قَوْمٌ فَخَرَجَ رَجُلٌ مِّمَّنْ صَلّٰى مَعَهُ فَمَرَّ عَلٰى اَهْلِ مَسْجِدٍ

آپ کے ساتھ اور لوگ بھی تھے، ان میں سے ایک شخص جو آپ کے ساتھ نماز پڑھ چکا تھا ایک اور مسجد والوں کی طرف سے

وَهُمْ رَاكِعُوْنَ فَقَالَ اَشْهَدُ بِاللّٰهِ لَقَدْ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

گذرا اور وہ رکوع میں تھے (بیت المقدس کی طرف منھ کئے ہوئے) اس نے کہا میں اللہ کا نام لے کر گواہی دیتا ہوں کہ میں نے (ابھی)

قِبَلَ مَكَّةَ فَدَارُوْا كَمَا هُمْ قِبَلَ الْبَيْتِ وَكَانَتِ الْيَهُوْدُ قَدْ اَعْجَبَهُمْ اِذْ كَانَ يُصَلِّىْ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کعبہ کی طرف نماز پڑھی، یہ سنتے ہی وہ لوگ نماز ہی میں کعبہ کی طرف پھر گئے، اور جب آپ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا

قِبَلَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ وَاَهْلُ الْكِتَابِ فَلَمَّا وَلّٰى وَجْهَهُ قِبَلَ الْبَيْتِ اَنْكَرُوْا ذٰلِكَ

کرتے تھے تو یہودی اور دوسرے اہل کتاب (نصاریٰ) خوش تھے، جب آپ نے اپنا منھ کعبہ کی طرف پھیر لیا تو انھوں نے برا مانا۔

قولہ اَوَّلَ صَلٰوةٍ صَلَّاهَا صَلٰوةَ الْعَصْرِ اس میں کچھ اختلاف ہے، اس روایت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس میں تحویل قبلہ ہوا تھا وہ نماز عصر تھی، مگر کتب سیر میں ابن سعد وغیرہ نے لکھا ہے کہ پہلی جو نماز کعبہ کی طرف ادا کی گئی وہ ظہر کی تھی، حافظ ابن حجر نے دونوں میں تطبیق یوں دی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کے وقت مسجد نبوی میں نہ تھے بلکہ ایک دوسری مسجد بنو سلمہ میں جسے اب مسجد ذوالقبلتین کہتے ہیں نماز پڑھا رہے تھے اور دو رکعتیں پڑھ چکے تھے، کہ حکم آیا، اور آپ نے تحویل فرمائی تو ظہر کی دو رکعتیں بیت المقدس کی جانب ہوئیں اور دو رکعتیں کعبہ کی طرف، اس کے بعد مسجد نبوی میں سب سے پہلے جو نماز پڑھی گئی وہ عصر کی نماز تھی، تو اب مطلب یہ ہوا کہ اول صلوٰۃ تامہ عصر ہے اور فی الجملہ اول ظہر بھی ہے، کیونکہ بعض اجزاء کعبہ کی طرف بھی ہوئے۔ لیکن روح المعانی میں سیوطی کے رسالے سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ اسے رد کرتے ہیں اور سیر کی روایت کو ترجیح دیتے ہیں اور وہ اس کے قائل نہیں ہیں کہ کچھ کعبہ کی طرف ہوئی اور کچھ بیت المقدس کی طرف، بلکہ کہتے ہیں کہ پوری نماز کعبہ کی طرف ہوئی اور تحویل کا حکم پہلے ہو چکا تھا، اس کی تائید میں انھوں نے نسائی کی وہ روایت پیش کی ہے جو ابو سعید بن المعلّٰی سے مروی ہے کہ ایک روز ہم نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر تشریف فرما ہیں، ہم بھی سننے کو بیٹھ گئے تو آپ نے تحویل قبلہ کی آیت تلاوت فرمائی، ابو سعید رضؓ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے ساتھی سے کہا آؤ ہم سب سے پہلے دو رکعتیں پڑھ لیں تاکہ ہم سابق ہوں، تو انھوں نے دو رکعتیں پڑھیں اور سب سے پہلے پڑھیں حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ابھی تک نہیں پڑھی تھیں، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھائی۔

. . . .

اس روایت کو ہم نے نسائی میں تلاش کیا مگر ابواب میں تو نہیں ملی، ممکن ہے سنن کبریٰ یا کسی اور کتاب میں ہو تو اب دو باتیں ثابت ہوئیں، اول یہ کہ تحویل مسجد نبوی میں ہوئی، دوسری یہ کہ پوری نماز ظہر کعبہ کی طرف ہوئی، یہ من وجہ سیر کی روایت کے خلاف ہے، کیونکہ سیر کی روایت میں ہے کہ ظہر کی دو رکعتیں کعبہ کی طرف ہوئیں، اور یہاں یہ ہے کہ پوری کعبہ کی طرف ہوئی، نیز وہاں ہے کہ وہ مسجد بنو سلمہ کی تھی اور یہاں یہ ہے کہ وہ مسجد نبوی تھی، ہاں اس میں دونوں متفق ہیں کہ وقت ظہر کا تھا، عصر کا نہ تھا، کتب سیر میں مسجد بنو سلمہ میں تحویل قبلہ کا ذکر ہے لیکن سنن ابوداؤد میں تصریح ہے کہ بعد تحویل صبح کی نماز کے وقت بنو سلمہ کی مسجد میں اطلاع ہوئی تھی، اس سے بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ تحویل مسجد نبوی میں ہوئی، دوسرے یہ کہ پوری نماز ظہر کعبہ کی طرف ہوئی، اب رہا بخاری کا قول تو ان دونوں میں جس کو ترجیح ہو اس پر عمل ہوگا، ظاہری طور پر تو بخاری ہی کی روایت کو ترجیح حاصل ہوگی، تطبیق درست نہیں۔

قولہ **فمرّ علیٰ اھل مسجد وھم راکعون**، بعض محشیوں نے غلطی سے یہاں پر لکھ دیا ہے کہ یہ مسجد بنو سلمہ کی ہے، حالانکہ درست نہیں، بلکہ یہ مسجد بنو حارثہ ہے ــــ مسجد بنی عمرو بن عوف و مسجد قبا اور مسجد بنو سلمہ میں تو روایات سے ثابت ہے کہ صبح کو اطلاع پہونچی تھی۔

نورالدین سمہودی نے اپنی کتاب وفاء الوفاء میں لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدینہ میں بہت سی مساجد تھیں۔

قولہ **یُصلّی قبل بیت المقدس**، یہ معروف و مجہول دونوں طرح ہے، یہود خوش بھی تھے، نیز طعن بھی کرتے تھے کہ ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔

واھل الکتاب، اہل کتاب سے بظاہر نصاریٰ مراد ہیں مگر اشکال یہ ہے کہ نصاریٰ کا قبلہ **بیت اللحم** ہے، جو مولد مسیح ہے، نہ کہ بیت المقدس، اور ان دونوں میں فاصلہ ہے، اگرچہ دونوں شام ہی میں ہیں، لہٰذا اب نصاریٰ کی موافقت کہاں رہی؟ ایک جواب تو یہ ہے کہ دونوں کی سمت ایک ہی ہے اس لئے کسی ایک کی طرف رخ کرنے سے دونوں کی طرف ہوجاتا ہے، دوسرا یہ ہے کہ بیت المقدس موسیٰ علیہ السلام کا مقرر کیا ہوا قبلہ ہے اور نصاریٰ بھی احکام تورات اور دین تورات کے مامور ہیں لہٰذا فی الجملہ اشتراک اور قرب ہے اس لئے وہ بھی خوش ہوتے ہیں، اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ مراد یہودی ہی ہیں، تغایر صرف عنوان کا ہے اور اوصاف پر منطف ہے اور ایسا شائع ہے جیسا کہ **ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ** الخ میں ہے، بعض نے کہا ہے کہ اہل کتاب کا عطف **یُصَلِّی** کی ضمیر پر ہے یعنی چونکہ یہود بھی بیت المقدس ہی کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے تھے اس لئے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے تو یہود خوش ہوتے تھے، لہٰذا مراد یہود ہی ہیں مگر ضمیر راجع الی النبی ہے، پھر جب تحویل ہوئی تو انھوں نے انکار کیا کہ یہ اچھے

قَالَ زُهَيرٌ حَدَّثَنَا اَبُو اِسحَاقَ عَنِ البَرَاءِ فِي حَدِيثِهٖ هٰذَا اَنَّهٗ مَاتَ عَلَى القِبلَةِ قَبلَ

زہیر نے کہا ہم سے بیان کیا ابو اسحاق نے، انھوں نے براء سے اسی حدیث میں کہ قبلہ بدل جانے سے پہلے کچھ لوگ مرگئے تھے،

اَن تُحَوَّلَ رِجَالٌ وَقُتِلُوا فَلَم نَدرِ مَانَقُولُ فِيهِم فَاَنزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَمَا كَانَ اللّٰهُ

جو (اگلے) قبلہ ہی کی طرف نماز پڑھتے رہے اور کچھ شہید ہوگئے تھے، ہم ان کے حق میں کیا کہیں (ان کو نماز کا ثواب ملا یا نہیں) تب

لِيُضِيعَ اِيمَانَكُم

اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: اللہ ایسا نہیں ہے جو تمہارا ایمان اکارت کردے (یعنی تمہاری نماز)

نبی ہیں کہ کبھی ادھر اور کبھی ادھر نماز پڑھتے ہیں، اسی کو قرآن نے بیان کیا ہے کہ سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ یعنی یہ بے وقوف یوں کہیں گے کہ کیا اللہ میاں سے غلطی ہوگئی تھی کہ پہلے اُدھر پڑھنے کو کہا اور پھر اِدھر؟ جواب دیا: قل للّٰه المشرق والمغرب، آپ کہہ دیجئے کہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے تو ہیں، اس کے مصالح ہیں جیسا مناسب سمجھتا ہے حکم دیتا ہے، کسی کو اس میں دخل دینے کا کیا حق ہے —— شروع میں اہل کتاب کے قبلہ کی طرف توجہ کرانے میں ممکن ہے محض تالیف قلوب مقصود ہو کہ نبی کسی نبی کے کسی شعار کی اہانت نہیں کرتا، بلکہ اس کی تعظیم کرتا ہے، وكذلك جعلناكم امة وسطا (الآیۃ) اسی طرح ہم نے تم کو معتدل امت بنایا، تو ایک حکمت اس تحویل قبلہ میں یہ بھی ہے کہ نمایاں ہو جائے کہ کون حکم مانتا ہے اور کون سرتابی کرتے ہوئے پچھلے پیر لوٹ جاتا ہے، چنانچہ لکھا ہے کہ ضعیف الایمان لوگ اس واقعۂ تحویل قبلہ کی وجہ سے مرتد ہوگئے مگر راسخ العقیدہ لوگ نہیں ہٹے، ان کے لئے فرمایا گیا: ماکان الله لیضیع ایمانکم، اللہ تمہارا ایمان ضائع نہیں کرے گا بلکہ پورا پورا ثواب دے گا، اگر یہ شان نزول نہ ہوتا تو میں کہتا کہ ایمان سے ایمان ہی مراد ہے، یہی سیاق کے بھی موافق ہے کیونکہ امتحان مقصود ہے کہ جو لوگ ہٹے نہیں وہ سمجھ لیں کہ اللہ کے ہاں ان کی قدر ہے اور اللہ ان کا ایمان ضائع نہ کرے گا: انّ الله بالناس لرؤف رحيم ○ بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑی شفقت والا اور بڑی رحمت والا ہے۔

تو نظم قرآن بظاہر یہی بتلاتا ہے اور اس پر صلوٰۃ الی بیت المقدس منطبق نہیں، لیکن چونکہ صحیح حدیث میں آگیا اسلئے اب کچھ نہیں کہتے مگر مندرج اب بھی اس میں ہے کہ جو لوگ ایک طرف نماز پڑھ کر دنیا سے رخصت ہوگئے، جب ان کی صلوٰۃ ضائع نہیں ہوگی تو جو مومنین ہیں ان کی تو بطریق اولیٰ ضائع نہ ہوگی۔

قال زهير الخ یہ تعلیق نہیں ہے بلکہ وہی حدیث ہے کہ جب تحویل ہوگئی تو خیال ہوا کہ جو مر چکے ہیں نہ معلوم ان کی نمازوں کا کیا حال ہے، لفظ وقتلوا میں زہیر منفرد ہے۔ ترمذی، ابو داؤد، نسائی اور مسلم وغیرہ میں قتلوا کا لفظ نہیں ہے، صرف ماتوا

. . . .

کالفظ ہے اور اس لفظ سے اشکال پیدا ہوتا ہے کہ قبل تحویل قبلہ کوئی جنگ نہیں ہوئی، سب سے پہلے بدر کی جنگ ہوئی ہے جو رمضان میں ہے اور تحویل اس سے پہلے رجب میں ہو چکی تھی، جنگ بدر میں کچھ صحابہ ضرور شہید ہوئے تھے لیکن تحویل سے قبل کوئی شہید نہیں ہوا

حافظ کہتے ہیں کہ جہاں تک ہم نے تاریخ وسیر کا مطالعہ کیا ہمیں نہیں معلوم ہوا کہ تحویل سے پہلے کوئی شہید ہوا ہو، ممکن ہے کچھ لوگ شہید ہوئے ہوں مگر ہم نے بہت تلاش کیا ہمیں نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کون لوگ ہیں ـــــ اور زہیر کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں کہتا لہٰذا بظاہر یہ لفظ **قتلوا** صحیح نہیں۔

دوسرا اشکال ایک اور ہے اور اسے بھی کسی نے حل نہیں کیا، ہم نے اپنے استاذ کے سامنے یہ اشکال پیش کیا تو انھوں نے کچھ حل کیا، سوال یہ ہوتا ہے کہ نسخ تو بہت سے احکام میں ہوا ہے مگر صحابہ کو کہیں یہ خیال نہیں ہوا کہ جو چیز منسوخ ہوئی اور کچھ لوگوں نے صرف اس پر عمل کیا، ناسخ پر عمل نہیں کیا اور مر گئے تو اس کا کیا بنے گا؟ آخر یہاں کیا خصوصیت تھی کہ یہ سوال پیدا ہوا؟ اصل چیز تو اوامرِ الٰہیہ کا اتباع ہے، جب پہلے حکم پر عمل کر لیا اور دوسرے کا وقت ہی نہیں پایا تو اب یہ سوال کیسا کہ کیا ہوگا؟ ہوتا کیا جیسا انھیں ایک بات کا امر ہوا انھوں نے اسکی تعمیل کر دی اور دوسرے امر کا تو زمانہ ہی نہیں پایا، آخر اس میں خاص بات کیا ہے؟ کیوں یہ سوال اٹھا؟؟ مجھے کہیں اس کا جواب نہیں ملا، نہ تفسیر میں، نہ حدیث میں، ہمارے استاذ (حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ کل ذخیرۂ حدیث میں ایسے دو موقعوں کا ذکر ہے ایک موقع تو یہی تحویل قبلہ کا ہے اور دوسرا خمر کی حرمت کے موقع پر یہی سوال پیدا ہوا، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ بعض لوگ غزوہ احد میں اس حال میں شہید ہوئے کہ ان کے پیٹوں میں شراب موجود تھی، تو اگرچہ شراب بعد کو حرام ہوئی تھی پھر بھی سوال کیا گیا، اسی کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی: لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْا إِذَا مَا اتَّقَوْا[1] الآیۃ، (جو لوگ ایمان لائے اور کام نیک کئے ان پر کوئی گناہ نہیں اس پر جو پہلے کھا چکے جبکہ آئندہ کو ڈر گئے) تو جس طرح وہاں پر شراب کے بارے میں آیت کا نزول ہوا اسی طرح یہاں پر **مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ إِيْمَانَكُمْ** کا نزول ہوا۔

ابن کثیر نے مسند امام احمد سے ایک روایت نقل کی ہے اس میں دونوں قصوں کو یکجا کر دیا ہے، ان کا یہ جمع کرنا اس لئے نہیں ہے کہ دونوں واقعے ساتھ پیش آئے، بلکہ اس لئے جمع کیا ہے کہ یہی دو واقعے اس قسم کے ہیں۔

تو استاذ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ ان کا نسخ ترتب اور انتظار کے بعد ہوا ہے، ہر مسلمان قرائن سے اندازہ کر رہا تھا

---

(۱) مائدہ : ۹۳

کہ اب صبح وشام میں امر آنے والا ہے، چنانچہ خمر کے متعلق سب سے پہلے یہ آیت نازل ہوئی: یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ (۱) جب یہ آیت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سنی تو کہا: اَللّٰھُمَّ بَیِّنْ لَنَا بَیَانًا شَافِیًا (اے اللہ ہمارے لئے شافی بیان نازل فرمادے) اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰی (۲) (اے ایمان والو نشہ کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ) اس کے بعد بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلی ہی بات عرض کی اَللّٰھُمَّ بَیِّنْ لَنَا بَیَانًا شَافِیًا فِی الْخَمْرِ (یا اللہ شراب کے بارے میں فیصلہ کن بات فرمادے) اس سے معلوم ہوا کہ لوگوں کو انتظار تھا کہ حرمت ضرور ہوگی، اور حرمت کا آخری حکم آنے ہی والا ہے، تب تیسری بار یہ آیت اتری جس میں حرمت کا صاف حکم تھا: اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (۳) (یہ شراب اور جوا اور بت اور پانسے سب گندے کام ہیں شیطان کے، سو ان سے بچتے رہو تاکہ تم نجات پاؤ، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ ڈالے تم میں دشمنی اور بیر بذریعہ شراب اور جوا کے اور روکے تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے، سو اب بھی تم باز آؤ گے؟) جب یہ آیت نازل ہوئی تب عمر فاروق رضی اللہ عنہ بولے: اِنْتَھَیْنَا یَا رَبِّ (ہم باز آئے یا رب!) اب انتظار ختم ہوگیا۔

اسی طرح تحویل قبلہ میں بھی ہوا، یہاں بھی قرائن تھے اس لئے ہر شخص ہمہ وقت منتظر رہتا تھا کہ اب تحویل قبلہ کا حکم آیا، طبری میں مذکور ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں تمنا تھی کہ ہمارا قبلہ کعبہ ہو جائے، یہی ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا اور آپ ابراہیم علیہ السلام سے احق تھے اس لئے دعا مانگتے تھے اور بار بار چہرۂ آسمان کی طرف آمد وحی کے انتظار میں اٹھاتے تھے، قرآن نے فرمایا: قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (۴) (بیشک ہم دیکھتے ہیں بار بار اٹھنا آپ کے چہرے کا آسمان کی طرف، سو البتہ پھیریں گے ہم آپ کو اس قبلہ کی طرف جس سے آپ راضی ہیں، اب آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیرلیں) اس کا پورا واقعہ مختصراً یہ ہے پہلے کعبہ مسلمانوں کا قبلہ مقرر ہوا تھا، اس کے بعد امتحاناً چند دنوں (سولہ یا سترہ ماہ) کے لئے بیت المقدس کو قبلہ بنادیا گیا، اور ظاہر ہے کہ امتحان اسی میں ہوتا ہے جو نفس پر بھاری ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِیْرَةً اِلَّا عَلَی الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ (۵) (اور بیشک یہ بات بھاری ہوئی مگر ان پر جن کو راہ دکھائی اللہ نے) عوام مسلمانوں پر تو یہ بات اس لئے گراں ہوئی کہ ان میں زیادہ تر قریش تھے اور قریش کو کعبہ کی افضلیت پر اعتقاد تھا اس لئے جب اس کے خلاف حکم پر عمل کرنا پڑا تو اگرچہ عمل کیا مگر دل میں خیال رہا، اور خواص کو

(۱) بقرہ: ۲۱۹ (۲) نساء: ۴۳ (۳) مائدہ: ۹۰، ۹۱ (۴) بقرہ: ۱۴۴ (۵) بقرہ: ۱۴۳

. . . .

اس لئے بار تھا کہ یہ حکم ملت ابراہیمی کے خلاف تھا اور وہ ملت ابراہیمی کے مامور تھے، اللہ نے فرمایا: مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ (۱) اور اخص الخواص جو ذوق سلیم رکھتے تھے اور جن کو مراتب میں امتیاز کرنے کی صلاحیت عطا ہوئی تھی وہ اسے ترقی معکوس سمجھ رہے تھے، مگر جنھیں اللہ نے اسرار و حکم تک رسائی مرحمت فرمائی تھی اور جو حقیقت بیت المقدس اور حقیقت کعبہ کو اس فراست کے نور سے جو اللہ نے انھیں عطا فرمائی تھی جدا جدا سمجھتے تھے، ان کو اس کا علم تھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہم السلام کے جامع ہیں اور آپ کی رسالت جملہ عالم اور تمام امتوں کو شامل ہے، اس لئے حکمت الٰہی میں یہ ضروری ہے کہ استقبال بیت المقدس بھی کچھ دنوں کے لئے ضرور کرایا جائے، اس لئے انھیں کوئی گھبراہٹ نہیں ہوئی، جب امتحان ہو چکا اور حکمت الٰہی پوری ہوگئی تو حکم ہوا کہ اب کعبہ کی طرف منھ کیجئے، تو چونکہ پہلے سے انتظار تھا اور لوگ سمجھ رہے تھے کہ قبلہ بدل کر رہے گا اور نبی علیہ السلام کی تمنا بھی تھی جو پوری ہوئی اور حکمت خداوندی کا تقاضا بھی تھا اس لئے حکم ملتے ہی فوراً تعمیل ہوئی اور کسی نے یہ نہیں سوچا کہ ایک آدمی کے خبر دینے سے ہم کیسے رخ بدل لیں۔

واقعہ یوں پیش آیا کہ جب مسجد قبا اور مسجد بنو سلمہ میں ایک شخص نے جاکر خبر دی کہ تحویل کا حکم آگیا تو لوگوں نے اسی وقت بیت اللہ کی طرف رخ کرلیا، چونکہ وہ پہلے سے اس حکم کے منتظر تھے اس لئے انھیں کوئی تامل نہ ہوا اور فوراً رخ بدل لیا ــــ نخبہ وغیرہ میں اس پر بحث آئی ہے کہ قاطع کا نسخ خبر واحد سے کیسے ہوسکتا ہے؟ تو یہاں بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنا قطعی تھا پھر خبر واحد سے کیسے نسخ ہوگیا اور لوگوں نے کیوں رخ بدل دیا؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ خبر واحد جو محفوف بالقرائن ہو قطعی بن جاتی ہے اور ناسخ بھی بن جاتی ہے اور یہاں ایسا ہی تھا کہ قرائن موجود تھے، قرائن کیا تھے؟ حضورؐ کی دعائیں، ہر شخص کا انتظار وغیرہ، تو ان دونوں واقعات میں ناسخ ترقب وانتظار اور یقین کے بعد آیا، تو ایک طرح اللہ کی مرضی لوگوں پر ظاہر ہو چکی تھی، اس لئے سوال کا پیدا ہونا مستبعد نہیں تھا بلکہ ضروری تھا کہ جب ایک شخص پہلے سے جانتا ہے کہ ناسخ آنے والا ہے اور ابھی آیا نہیں کہ اس کی موت واقع ہوگئی اور کعبہ کی طرف نماز نہ پڑھ سکے، تو اب انکے ایمانوں میں (ان کی نمازوں میں) کچھ کمی تو نہ ہوگی؟ کیونکہ کعبہ جو افضل تھا اسکی طرف توجہ نہ کرسکے۔ یہ مطلب نہیں کہ انکو اسمیں تردد تھا کہ ان کی نماز مطلقاً ہوئی یا نہیں، نہ ایسا صحابہ سمجھ سکتے ہیں، چنانچہ یہاں فلم ندر ما نقول ہے۔ یعنی ہم نہ سمجھے کہ ان کے حق میں کیا کہیں۔ بہرحال ان کے دل میں جو کھٹک تھی اس کا جواب دیا مَا كَانَ اللهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ (اللہ ان کا ایمان (نماز) ضائع نہیں کرے گا۔ اب یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہاں ایمان سے کیوں تعبیر کیا، اس لئے کہ لوگ اصل روح صلوٰۃ پر مطلع ہو جائیں کہ اصل منشا حکم الٰہی ہے اور وہ اس حکم پر

---

(۱) حج : ۷۸

. . . .

چلتے رہے، ان کے مرنے کے بعد جب اللہ نے دوسرا حکم دے دیا تو ان کا کیا قصور ہوا؟ ان کا ایمان کیوں ضائع ہوگا؟ ان کی تو کوئی کوتاہی تھی نہیں، یہی تحریم خمر میں بھی فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے اور ایمان میں ترقی کرتے کرتے درجۂ احسان تک پہونچ گئے تو ایسے لوگوں کے بارے میں کیا سوال کرتے ہو، ان میں کچھ فرق نہیں وہ تو محسنین ہیں واللہ یحب المحسنین (اور اللہ محسنین سے محبت فرماتا ہے)

تو یہاں شبہ ہونا ہی چاہئے تھا کیونکہ افضل اور مفضول کا سوال ہے، کعبہ بالاتفاق بیت المقدس سے افضل ہے اور افضل پر عمل ہونہ سکا تو شبہ ہوا کہ ممکن ہے ثواب کچھ کمی ہوگئی ہو، اس کو اللہ نے فرمادیا کہ کچھ کمی نہیں آئی، ہم تو دلوں کا حال دیکھتے ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ انکے دلوں میں کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کا کس قدر جذبہ تھا اور کس قدر شوق رکھتے تھے مگر یہ ان کے اختیار سے باہر تھا کہ موت کو روک لیں، موت نے یہ عمل نہ کرنے دیا ورنہ ان کے جذبات ضرور ایسے تھے اور وہ دل سے متمنی تھے کہ کعبہ کی طرف نماز پڑھیں۔

چنانچہ ایک صحابی براء ابن معرور جو مدینہ میں تھے اپنے اجتہاد سے کعبہ کی طرف نماز پڑھتے تھے مگر حضورؐ نے منع فرمادیا تو مجبوراً بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے لگے مگر جب تحویل قبلہ سے ایک ماہ قبل ان کا انتقال ہونے لگا تو وصیت کی کہ مجھے کعبہ کی طرف دفن کرنا، اس سے معلوم ہوا کہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ ان کے دل میں جذبہ وشوق تھا اس لئے اللہ فرماتا ہے کہ ہم تو جذبہ کو دیکھتے ہیں، ان کے شوق کو دیکھتے ہیں، کیا ہم ان کے ایمان کو ضائع کردیں گے (۱)

اس میں کلام ہے کہ نسخ قبلہ دوبار ہوا یا ایک بار، دونوں روایات ہیں، تفصیل یہ ہے کہ تیرہ سال نبی علیہ السلام مکہ مکرمہ میں رہے اور نماز پڑھتے ہی تھے، تو بعض علماء کہتے ہیں کہ پہلے آپ کعبہ کی طرف نماز پڑھتے تھے، بعد کو مکہ ہی میں بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے لگے، پھر مدینہ میں بیت اللہ کی طرف پڑھنے کا حکم ہوا، تو نسخ دوبار ہوا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ شروع ہی سے بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے تھے رکنین کے قریب اس طرح کھڑے ہوتے کہ رخ بیت المقدس کی طرف بھی ہو اور بیت اللہ کی طرف بھی، مقصود تو استقبال بیت المقدس ہوتا مگر آپ اپنی طبیعت سے یہ صورت اختیار کرتے تھے تاکہ دونوں کا استقبال حاصل رہے، اس قول پر نسخ کا ایک بار اور وہ بھی مدینہ میں ہونا ثابت ہوا، روایات سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ قبلہ بیت المقدس ہی تھا اور کوئی روایت ایسی نہیں ہے جس میں یہ ہو کہ کی زندگی میں بیت اللہ قبلہ رہا ہے، مگر حدیث امامت جبرئیلؑ میں ایک لفظ عند باب البیت ہے (بیت اللہ کے دروازے کے قریب) اور اس جگہ کھڑے ہونے سے استقبال بیت المقدس نا ممکن ہے، لہٰذا اس سے کعبہ ہی قبلہ معلوم ہوتا ہے

(۱) اصابہ میں یہ واقعہ مذکور ہے، یاد رکھو صحابہ کے حالات میں تین کتابیں مشہور ہیں، ان میں اصابہ جو حافظ ابن حجر عسقلانی کی تصنیف ہے سب سے بہتر اور سب کو حاوی ہے، دوسری "الاستیعاب" لابن عبدالبر اور اسد الغابہ لابن الاثیر الجزری ہے۔

باب ۳۱ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ، قَالَ مَالِكٌ اَخْبَرَنِی زَیْدُ بْنُ اَسْلَمَ اَنَّ

اسلام کی خوبی کا بیان . امام مالک نے کہا مجھ کو زید ابن اسلم نے خبر دی ' ان کو عطار ابن یسار نے خبر دی،

عَطَاءَ بْنَ یَسَارٍ اَخْبَرَهٗ اَنَّ اَبَا سَعِیْدٍ الْخُدْرِیَّ اَخْبَرَهٗ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ

ان کو ابو سعید خدری نے خبر دی انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ' آپ فرماتے تھے جب کوئی بندہ مسلمان

عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِذَا اَسْلَمَ الْعَبْدُ فَحَسُنَ اِسْلَامُهٗ یُکَفِّرُ اللّٰهُ عَنْهُ کُلَّ سَیِّئَةٍ

ہو جائے پس اچھی طرح مسلمان ہو تو اللہ اس کا ہر ایک گناہ اتار دے گا جو وہ (اسلام سے پہلے) کر چکا تھا ' اور اس کے

کَانَ زَلَفَهَا وَکَانَ بَعْدَ ذٰلِكَ الْقِصَاصُ الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰی سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ

بعد جب حساب شروع ہوگا ایک نیکی کے بدل ویسی دس نیکیاں سات سو نیکیوں تک (لکھی جائیں گی) اور برائی کے بدل

وَالسَّیِّئَةُ بِمِثْلِهَا اِلَّا اَنْ یَّتَجَاوَزَ اللّٰهُ عَنْهَا۔

ویسی ہی ایک برائی (لکھی جائے گی) مگر جب اللہ اسے معاف کر دے۔

اس صورت میں پھر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ سب سے پہلی نماز وہ ہے جو جبریلؑ نے پڑھائی اور وہ بھی بیت اللہ کی طرف ' تو کہنا پڑے گا کہ نسخ کا دوبارہ ہونا ماننا پڑے گا ' ابتک اس سلسلہ میں کوئی تشفی بخش چیز نہیں ملی ' شراح بھی پریشان ہیں ' میرے دل میں اب بھی یہی خیال گذرتا ہے کہ نسخ ایک ہی بار ہوا ' اور اس کی توجیہ یوں سمجھ میں آتی ہے کہ اس وقت تک جبتک کہ حکم خاص کسی جہت کا نہ تھا بلکہ صرف نماز کا حکم تھا تو آپ اپنے طوع سے کعبہ کی طرف منہ کرتے تھے کیونکہ یہ ابراہیم علیہ السلام کا کعبہ تھا اور آپ قرآن کے بموجب احق تھے ابراہیمؑ کے ' قرآن میں فرمایا گیا : اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰهِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ (۱) (لوگوں میں زیادہ مناسبت ابراہیمؑ سے ان کو تھی جو اس کے ساتھ تھے اور اس نبی کو) وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ (۱) (اور جو ایمان لائے اس نبی پر اور اللہ والی ہے مسلمانوں کا)

یہ تو قرآن کا بیان تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے انا اشبه بابراهیم (میں ابراہیم سے زیادہ مشابہ ہوں ' تو اس خلقی مناسبت نیز اس لئے بھی کہ معروف قبلہ عند العرب کعبہ ہی تھا ' آپ کعبہ کی طرف توجہ کرتے تھے ـــــ تو میں کہتا ہوں کہ خاص امر صرف نماز کا تھا ' توجہ کدھر ہو اس کا حکم نہ تھا ' آپ اپنی طبیعت سے کعبہ کی طرف پڑھتے تھے ' جب بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم آیا تو آپ اس طرح پڑھنے لگے کہ دونوں کی طرف توجہ ہو جائے ' مگر جب مدینہ پہونچے تو جمع ناممکن ہو گیا لہٰذا آپ دعائیں کرنے لگے ' آپ چاہتے تھے کہ کعبہ ہی قبلہ مقرر ہو جائے ' تو اللہ نے

---

(۲) آل عمران : ۶۸

تحویل قبلہ کا حکم دیا، اس صورت میں نسخ ایک بار ہوگا اور پہلے استقبال کعبہ آپ کے فطری رجحان کا اثر تھا وحی سے نہیں تھا اور جبریلؑ نے بھی اسی کو ترجیح دیتے ہوئے بیت اللہ کی طرف توجہ کی۔ یہ میرا خیال ہے، واللہ اعلم صحیح ہے یا غلط۔

باب حسن اسلام المرء

اسلام تو سارا ہی بہتر ہے مگر مسلمان ہونے والے کئی طرح کے ہیں، ایک وہ ہے جو محض روٹی کے لئے مسلمان ہوا، ایک وہ ہے کہ ایمان تو دل سے لایا لیکن اعمال سیئہ نہیں چھوڑے، تو یہ دونوں اچھے نہیں، ایک وہ ہے کہ کفر چھوڑ کر اسلام میں آیا اور عمل بھی بہتر کئے، یہ اسلام حسن ہے۔

بخاری کی غرض یہ ہے کہ اسلام کے بھی مراتب ہیں اور اس حدیث سے مراتب ہی ثابت کرنا چاہتے ہیں، حدیث پاک میں بہت بڑی بشارت اور اللہ کی رحمت بے پایاں کا بیان ہے کہ جس آدمی نے اسلام قبول کر لیا اور اچھی طرح قبول کیا یعنی اس کے احکام پر عمل بھی کرنے لگا تو ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اس کا سارا پچھلا کیا ہوا معاف ہو جائیگا یعنی اسنے جسقدر نافرمانیاں کی ہونگی اور اللہ کے حقوق ضایع کئے ہوں گے اللہ انھیں معاف فرما دیگا رہے حقوق العباد تو ان کا معاملہ دوسرا ہوگا، وہ صاحب حق کے معاف کرنے ہی سے معاف ہوں گے، پھر اب اس کا از سر نو نیا کھاتہ بایں طور شروع ہوگا کہ جو نیکی کرے گا اس کے بدلے کم از کم دس ویسے ہی نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں لکھی جائیں گی، سات سو تک اس میں اضافہ ہوتا چلا جائیگا اور جو برائی کرے گا وہ ایک ہی لکھی جائے گی۔ سات سو تک کا یہ اضافہ بھی ایک ضابطہ ہے، اضافہ اسی حد تک محدود نہیں ہے، وہ جتنا چاہے زیادہ کر سکتا ہے، قرآن میں ہے: وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ [1] اللہ جس کے لئے چاہے سات سو سے بھی زیادہ کر دے گا، پھر یہ اجر بھی ختم نہ ہوگا، قرآن ہی میں دوسری جگہ فرمایا: اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ [2] (جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کے لئے اجر ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگا) رہیں سیئات تو ان میں اضافہ نہ ہوگا بلکہ ایک کے بدلے ایک ہی ہوگی اور اس میں بھی چاہے گا تو معاف فرما دے گا۔ الا ان یتجاوز اللہ میں یہی بیان فرمایا گیا ہے۔

یہ حدیث امام مالک کی ہے، دارقطنی نے اپنی کتاب "غرائب مالک" میں یہ حدیث درج فرمائی ہے، اس میں "فَحَسُنَ اِسْلَامُهٗ" کے بعد ایک جملہ یہ بھی مذکور ہے کہ کافر کے اعمال نامہ میں اس کے اسلام سے پہلے کے اچھے اعمال بھی لکھ لئے جائیں گے، یعنی زمانہ قبل اسلام کی ساری برائیاں تو ختم ہو جائیں گی البتہ کفر کے زمانہ والی بھلائیاں اس نئے اعمال نامہ میں لکھ لی جائیں گی جو اس کے حق میں

(۱) بقرہ : ۲۶۱ (۲) التین : ۶

۴۰۔ حَدَّثَنَا اِسْحٰقُ بْنُ مَنْصُوْرٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ قَالَ اَخْبَرَنَا مَعْمَرٌ

ہم سے بیان کیا اسحٰق ابن منصور نے، کہا ہم سے بیان کیا عبد الرزاق نے، کہا خبر دی ہم کو معمر نے

عَنْ هَمَّامٍ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَحْسَنَ اَحَدُکُمْ

انھوں نے ہمام سے، انھوں نے ابوہریرہ سے، کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب تم میں کوئی اچھی طرح مسلمان ہو

اِسْلَامَهٗ فَکُلُّ حَسَنَةٍ یَّعْمَلُهَا تُکْتَبُ لَهٗ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰی سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ وَکُلُّ

تو اس کے بعد جو نیکی وہ کرے گا وہ دس گنے سے سات سو گنا تک لکھی جائے گی اور جو برائی کرے گا وہ

سَیِّئَةٍ یَّعْمَلُهَا تُکْتَبُ لَهٗ بِمِثْلِهَا

ویسی ہی ایک لکھی جائے گی

نافع ہوں گی، امام بخاری نے یہ جملہ چھوڑ دیا ہے حالانکہ دارقطنی نے نو طرق سے یہ حدیث پیش کی ہے اور سب میں یہ اضافہ نقل کیا ہے، مگر نہ معلوم کیوں امام بخاری نے اسے حذف کر دیا اور حدیث میں اختصار کیا۔ اس کے بارے میں محدثین بالعموم یہ کہہ دیتے ہیں کہ اس اختصار کی مصلحت معلوم نہیں ہوتی، بعضوں نے یہ لکھ دیا کہ شاید بخاری نے اس ٹکڑے کو مسلمات اہل سنت کے خلاف پایا ہوگا اس لئے اسے نہیں لائے بخاری نے سوچا ہوگا کہ یہ مسلم امر ہے کہ کافر کے حسنات غیر مقبول ہیں اور یہاں اس کے خلاف ہے اس لئے چھوڑ دیا مگر حافظ نے لکھا ہے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے کیونکہ حدیث کو قطع نہیں کیا جا سکتا، ہاں اس کی تردید کرو یا تاویل کرو مگر نقل تو کرنا ہی چاہئے اور یہ بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ کافر کے حسنات کے غیر مقبول ہونے کا مسئلہ مسلمہ ہے، نووی تو کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے کہ کافر کے حسنات نافع نہیں، بلکہ یہ مسئلہ اجماع کے قریب ہے کہ کافر کے حسنات نافع ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، آخرت میں گناہ و عذاب میں تخفیف ہوگی ورنہ پھر عدل کے خلاف لازم آئے گا، فرض کرو کفار میں ایک سخت ظالم و جابر اور غاصب ہے اور دوسرا وہ جو دوسروں کے حقوق کا لحاظ رکھتا ہے، کسی پر جبر و ظلم نہیں کرتا، تو کیا دونوں برابر ہو جائیں گے ہرگز نہیں، یہ بات عدل الٰہی کے خلاف ہے۔ لہٰذا حسنات آخرت میں ضرور نافع ہوں گی اور عذاب میں تخفیف ہوگی، چنانچہ ابوطالب کے عذاب میں تخفیف کا ہونا حدیث پاک سے ثابت ہے، روایت ہے کہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ کی ذات گرامی سے ابوطالب کو کچھ نفع پہونچا یا نہیں؟ وہ تو آپ کی بڑی حمایت کرتے اور آپ سے بے انتہا محبت کا تعلق رکھتے تھے، تو آپ نے فرمایا: ہاں اگر میں نہ ہوتا تو وہ جہنم کے نیچے کے طبقہ میں ہوتے، میری وجہ سے ان کے عذاب میں اتنی تخفیف ہوگئی کہ انھیں آگ کی صرف دو جوتیاں پہنا دی گئی ہیں جو سب سے ہلکا عذاب ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہاں کا ہلکا عذاب بھی بہت سخت ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوطالب کا دماغ اس طرح کھول رہا ہوگا جس طرح ہانڈی چولھے پر کھولتی ہے، یہاں غرض یہ ثابت کرنا ہے کہ کافر کے عذاب میں

. . . .

تخفیف ہوگی اور یہ تخفیف انھیں حسنات کی وجہ سے ہوگی جو انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں کیے تھے، ابولہب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کی خوشی میں ایک باندی ثوبیہ کو آزاد کر دیا تھا تو اس دن اس کے عذاب میں تخفیف ہو جاتی ہے، رہی وہ آیت جس میں فرمایا گیا ہے لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ[1] عذاب میں تخفیف نہ کی جائے گی، اس کے متعلق میں یہ کہتا ہوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بعد تخفیف بھی اس کو ایسا لگے گا کہ تخفیف نہیں ہوئی، جیساکہ حدیث میں ہے کہ ابو طالب کو سب سے ہلکا عذاب ہوگا مگر وہ سمجھیں گے کہ سب سے زیادہ سخت عذاب مجھ کو ہو رہا ہے، مسلم کی روایت میں ہے: مايرى ان احدًا اشد منه عذابًا وانه لاهونهم عذابًا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ کا ایک دوسرا مطلب یہ بھی بیان کیا گیا کہ شروع ہی میں جو عذاب تجویز ہوگا اسی میں تخفیف ہو چکی ہوگی، اب اس تخفیف شدہ عذاب میں مزید تخفیف نہ ہوگی ___ غرض کافر کے حسنات سے آخرت میں فائدہ ہونا ثابت ہے اسی کو امام نووی نے کہا ہے کہ یہ بات قریب بہ اجماع ہے کہ کافر کے حسنات نافع ہیں۔

یہ تو آخرت کی بات تھی، دنیا میں بھی کافر کے حسنات نافع ہیں، مال کا ہونا اولاد کا ہونا، آرام و آسائش کا مہیا ہونا، یہ سب اعمال کا نفع ہے، اب اس کے بعد اگر کافر ایمان لے آیا اور اس نے استقامت دکھلائی تو اس کے حسنات اگر مقبول ہو جائیں تو کوئی مستبعد نہیں، اور نہ اہل السنۃ کے خلاف ہی ہے، جب اللہ تعالیٰ بہت سے ان اعمال کو محسوب کر لیتا ہے جو ابھی کیے ہی نہیں، جیساکہ آتا ہے کہ ایک شخص تہجد پڑھنے کے خیال سے سویا لیکن آنکھ نہ کھلی تو اسے تہجد کا ثواب ملے گا، اسی طرح ایک شخص جماعت کے ارادہ سے چلا مگر جماعت نہ ملی تو اسے بھی جماعت کا ثواب ملے گا، جب شریعت میں ایسے شواہد موجود ہیں تو پھر اس مومن نے بھی تو حالت کفر میں عمل کیا تھا مگر شرط پوری نہ تھی، یعنی نیت، لہٰذا اب جب کہ مسلمان ہو گیا تو اگر اللہ تعالیٰ اس کے وہ اعمال محسوب کر لے تو کیا استبعاد ہے بلکہ میں تو ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے بعید ہی نہیں بلکہ اسی کی توقع ہے ___ حدیث پاک میں ہے کہ قیامت میں ایک شخص پیش کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ صغار ذنوب کے بارے میں اس سے سوال کرے گا تو وہ مجبوراً اقرار کرے گا مگر ڈر سے سہما جا رہا ہوگا کہ یہ تو صغار ذنوب ہیں، نہ معلوم کبائر پر کیا گذرے گی، لیکن اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں نے تیرے سب گناہ معاف کر دیے اور انہیں حسنات سے بدل دیا فاولئك يبدل الله سيئاتهم حسنات[2] حدیث میں آتا ہے کہ اس پر وہ شخص کہے گا اے اللہ ابھی میرے کچھ کبیرہ گناہ بھی باقی ہیں، تو اللہ تعالیٰ ہنسے گا ___ پس جب سیئات کو حسنات سے تبدیل کر دیتے ہیں تو اس میں کیا استبعاد ہے کہ کافر کے حسنات کو اس کے مسلمان ہو جانے کے بعد محسوب کر لیں ___ تو یہاں میں یہی

---

(۱) بقرہ : ۸۶ (۲) فرقان : ۷۰

باب ۳۲ اَحَبُّ الدِّيْنِ اِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ اَدْوَمُهٗ

اللہ کو وہ عمل بہت پسند ہے جو ہمیشہ کیا جائے۔

۴۱۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنّٰى قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ هِشَامٍ قَالَ

ہم سے بیان کیا محمد ابن المثنی نے کہا ہم سے بیان کیا یحیٰی نے، انھوں نے ہشام سے، کہا مجھ

اَخْبَرَنِىْ اَبِىْ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلَيْهَا وَعِنْدَهَا

خبردی میرے باپ (عروہ) نے، انھوں نے عائشہ صدیقہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے وہاں

اِمْرَاَةٌ قَالَ مَنْ هٰذِهٖ قَالَتْ فُلَانَةٌ تَذْكُرُ مِنْ صَلَاتِهَا قَالَ مَهْ عَلَيْكُمْ بِمَا

ایک عورت (بیٹھی) تھی آپ نے پوچھا یہ کون ہے، حضرت عائشہ نے کہا فلانی عورت ہے اور اس کی نماز کا حال بیان

تُطِيْقُوْنَ فَوَاللّٰهِ لَا يَمَلُّ اللّٰهُ حَتّٰى تَمَلُّوْا وَكَانَ اَحَبُّ الدِّيْنِ اِلَى اللّٰهِ مَادَاوَمَ عَلَيْهِ

کرنے لگیں (کہ یہ رات بھر عبادت کرتی ہیں) آپ نے فرمایا بس بس! وہ کام کرو جو (ہمیشہ) کرسکو، کیونکہ خدا کی قسم اللہ تو

صَاحِبُهٗ

(ثواب دینے سے) نہیں تھکے گا، تم ہی تھک جاؤ گے، اور حضور کو وہ عمل بہت پسند تھا جس کا کرنے والا اس کو ہمیشہ کرے۔

کہتا ہوں کہ اسلام لانے سے اللہ تعالیٰ اس کے ماقبل اسلام کے حسنات بھی شمار فرمائے گا مگر یہ معاملہ فضل کا ہے ــــ اور وہ جو ایک حدیث میں ہے کہ بعد اسلام اگر اس نے اچھے کام کئے تو وہ اسلام اس کے لئے ہادم سیئات ہوگا، اور اگر [اسلام کے بعد بھی] وہ شرارت سے باز نہ آیا تو اُخذ باوّلہ وآخرہ، یعنی اول وآخر سب کی پکڑ ہوگی ــــ اس کی مختلف تاویلیں کی گئی ہیں، مثلاً یہ کہ وہ منافق ہوگا، مگر یہ درست نہیں، بلکہ امام احمدؒ نے لکھا ہے کہ اگر اب بھی وہ باز نہ آیا اور گناہوں پر مصر رہا تو اب اس سے باز پرس ہوگی ــــ مگر اس میں مجھے تردد ہے، اس لئے میں تو وہی کہتا ہوں جو امام ابو حنیفہؒ نے کہا ہے کہ اسلام سب کو ہدم کردے گا۔

اب رہا اُخذ باوّلہ وآخرہ تو اس کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھاتا ہوں:

ایک طالب علم نے کوئی قصور کیا تو مہتمم صاحب نے اسے کہا اب کی مرتبہ معاف کئے دیتا ہوں مگر پھر مت کرنا، مگر اس نے پھر وہی جرم کیا، مہتمم صاحب نے دوبارہ بھی اس کو سمجھایا اور کہا جاؤ ابکی پھر چھوڑے دیتا ہوں لیکن اگر اب بھی تم باز نہ آئے تو ضرور سزا ملے گی، مگر اس کے باوجود وہ نہ مانا اور پھر جرم کیا، تو اب اسے سخت سزا ملے گی، اگرچہ یہ سزا ایک ہی جرم کی ہے مگر اس قدر سخت ہے کہ سب جرموں کے برابر ہوگئی۔

تو یہاں بھی ایسا ہی معاملہ ہے، کہ اسلام نے سب کو ہدم کر دیا تھا اور محض اسلام لانے سے سب سے توبہ بھی ہوگئی تھی مگر اسکے بعد بھی اس نے پھر وہی بدمعاشیاں اور شرارتیں شروع کر دیں، تو اب سزا بھی سخت ہوگی کیونکہ تکرار جرم سختی کا باعث ہے، جرم ایک ہی ہے مگر سزا مضاعف ہے، تو اُخذ بالاولہ والآخرہ کا میرے نزدیک یہی مطلب ہے کہ اول و آخر پر جو سزا ہونی چاہئے تھی وہ سب آخر پر ہو جائے گی، کیونکہ اس نے معافی کی قدر نہیں کی لہٰذا سزا بھی سخت ہوگی۔

باب ۳۲ اَحَبُّ الدِّیْنِ اِلَی اللّٰہِ الخ

امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ یہاں عمل پر بلکہ دوام عمل پر دین کا اطلاق کیا گیا، معلوم ہوا کہ اعمال تو مطلوب ہیں ہی، ان کا دوام بھی مطلوب ہے، پہلے باب میں کہا تھا کہ حسن اسلام مطلوب ہے اور یہاں یہ بتلایا کہ وہ حسن اسلام دوام عمل ہے۔

حدیث ۴۱ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے تو اس وقت میرے پاس ایک مسماۃ بیٹھی تھیں، جن کا نام خولار بنت تویت تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ کون ہیں؟ حضرت صدیقہؓ نے جواب دیا کہ خولار بنت تویت۔ صدیقہؓ نے ان کی نماز کا حضورؐ سے تذکرہ کیا کہ بہت نمازیں پڑھتی ہیں، بعض روایات میں ہے کہ فرمایا: یہ رات بھر نمازیں پڑھتی رہتی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ نوافل ہونگی، تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رہنے دو، اتنا زیادہ بوجھ مت لادو کہ نباہ نہ ہو سکے، بس اتنا کرو جس پر پابندی کر سکو جیسا کہ پچھلے باب میں سَدِّدُوا وَقَارِبُوا کے ضمن میں تقریر ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ثواب دینے میں کوئی کمی نہیں ہے بلکہ تم خود ہی تھک کر کچھ دنوں میں اسے یا تو ترک کر دو گے یا بے دلی سے کرو گے اور دونوں باتیں بری ہیں۔

علیکم بما تطیقون میں یہی تعلیم دی کہ اپنے لئے وہی کام اختیار کرو جس کی طاقت ہو یعنی جس پر دوام و پابندی ہو سکے، جوش میں بہت کرنا شروع کیا اور کچھ دنوں بعد جوش ٹھنڈا ہوا تو سب چھوٹ گیا، یہ اللہ کو پسند نہیں۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فواللہ لا یمل اللہ حتی تملوا، خدا کی قسم اللہ تو ثواب دینے سے نہیں تھکے گا، تم ہی تھک جاؤ گے۔ **ملال** اس تکان اور تعب کو کہتے ہیں کہ جو مشقت کرنے کے بعد لاحق ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ تعب و مشقت اس کو ہو، مراد نفی ملال من اللہ ہے، یعنی اللہ تو ثواب برابر دیتا رہے گا جب تک تم عمل کرتے رہو گے، وہاں کمی نہیں، مگر تم سے اس کا نباہ دشوار ہوگا۔

فتح الباری میں حسن ابن سفیان کے سند سے نقل کیا گیا ہے کہ عائشہ صدیقہؓ نے ان مسماۃ کی یہ تعریف کی کہ بہت نمازیں

باب ۳۳ زِيَادَةِ الْإِيمَانِ وَنُقْصَانِهِ وَقَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى. وَزِدْنَاهُمْ هُدًى

ایمان کے بڑھنے اور گھٹنے کے بیان میں، اور اللہ تعالیٰ نے (سورۂ کہف) میں فرمایا: اور ہم نے ان کو اور زیادہ

وَيَزْدَادَ الَّذِينَ اٰمَنُوا اِيمَانًا، وَقَالَ: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ. فَاِذَا تَرَكَ

ہدایت دی، اور (سورۂ مدثر میں) ایمان داروں کا ایمان اور بڑھے، اور (سورۂ مائدہ میں): آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین پورا کیا، اور (قاعدہ ہے کہ)

شَيْئًا مِنَ الْكَمَالِ فَهُوَ نَاقِصٌ

پورے میں سے کوئی کچھ چھوڑ دے تو وہ ادھورا رہ جاتا ہے۔

۴۲ـ حَدَّثَنَا مُسْلِمُ بْنُ اِبْرَاهِيمَ قَالَ حَدَّثَنَا هِشَامٌ قَالَ حَدَّثَنَا

ہم سے بیان کیا مسلم ابن ابراہیم نے، کہا ہم سے بیان کیا ہشام نے، کہا ہم سے بیان کیا قتادہ نے، انہوں نے

قَتَادَةُ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ

انس سے، انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے، فرمایا جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اور اس کے دل میں جو برابر بھلائی (ایمان)

مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَفِي قَلْبِهِ وَزْنُ شَعِيرَةٍ مِنْ خَيْرٍ وَيَخْرُجُ مِنَ

ہو تو وہ (ایک نہ ایک دن ضرور) دوزخ سے نکلے گا، اور جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اور اس کے دل میں گیہوں برابر بھلائی ہو

النَّارِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَفِي قَلْبِهِ وَزْنُ بُرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ وَيَخْرُجُ مِنَ النَّارِ

وہ (ایک نہ ایک دن ضرور) دوزخ سے نکلے گا، اور جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اور اس کے دل میں ذرہ (چیونٹی)

مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَفِي قَلْبِهِ وَزْنُ ذَرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ

برابر بھلائی ہو وہ (ایک نہ ایک دن ضرور) دوزخ سے نکلے گا

پڑھتی ہیں، اس وقت کی تھی جب وہ مسماۃ حضرت صدیقہ کی مجلس سے جا چکی تھیں، اس لئے منہ پر تعریف نہ ہوئی جس کی حضورؐ نے ممانعت فرمائی تھی، یہ جملہ "لا یمل اللہ حتی تملوا" بطریق شاکلت ہے جیسے جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (۱)

باب ۳۳ زیادۃ الایمان ونقصانہ

یہ مسئلہ گذر چکا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں زیادۃ ونقصان کا مسئلہ بالذات مذکور ہے اور وہاں تبعاً ذکر تھا، چنانچہ آیات

---

(۱) شوریٰ: ۴۰

قَالَ اَبُو عَبْدِ اللهِ قَالَ اَبَانٌ حَدَّثَنَا قَتَادَةُ حَدَّثَنَا اَنَسٌ عَنِ النَّبِيِّ
امام بخاری نے کہا، ابان نے اس حدیث کو روایت کیا، کہا ہم سے قتادہ نے بیان کیا، کہا ہم سے انس نے بیان کیا
صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "مِنْ اِيْمَانٍ" مَكَانَ "خَيْرٍ"
انھوں نے حضورؐ سے اس میں من ایمان ہے بجائے خیر کے

۴۳ ـ حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ الصَّبَّاحِ سَمِعَ جَعْفَرَ بْنَ عَوْنٍ حَدَّثَنَا اَبُو الْعُمَيْسِ
ہم سے بیان کیا حسن ابن صباح نے انھوں نے جعفر ابن عون سے سنا، کہا ہم سے بیان کیا ابوالعمیس نے

بھی سب وہی ہیں، صرف ایک آیت الیوم اکملت الخ یہاں زیادہ ہے۔ بخاری کہتے ہیں کہ کمال کا لفظ بتلا رہا ہے کہ اس کے مراتب ہیں، قرآن کے لفظ اکملتُ پر امام بخاری کہنا چاہتے ہیں کہ یہ لفظ بتلاتا ہے کہ اب تک نقصان تھا، بخاری ناقص بولتے ہیں، مگر یہ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا اس لئے میں غیر کامل بولتا ہوں، گو مآل دونوں کا ایک ہی ہے، کیا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ شہداء بدر و احد کا دین و ایمان ناقص تھا؟ ہرگز نہیں! ہاں یہ تعبیر مناسب ہوگی کہ ان کے ایمان میں اجمال تھا زیادہ تفصیل نہ تھی، امام ابوحنیفہؒ کے الفاظ یاد کرو: "اٰمنوا بالجملة ثمّ بالتفصيل" تو ان کا ایمان ناقص نہ تھا بلکہ ضعفاء اور فتح مکہ کے بہت سے لوگوں سے وہ افضل ہیں، انھوں نے کچھ کمی نہیں کی تھی بلکہ ایمان سب پر لا چکے تھے، ہاں تمام تفصیلات پر عمل نہ کر سکے، تو اس سے نقصان لازم نہیں آتا۔ یہ بھی یاد رکھو کہ امام بخاری کمی بیشی نفس تصدیق میں بھی مانتے ہیں اور عمل کے اعتبار سے بھی وہ کمی بیشی کے قائل ہیں اور مومن بہ کے اعتبار سے بھی کمی بیشی مانتے ہیں، مومن بہ کے اعتبار سے کمی بیشی کا مفہوم یہ ہے کہ ایمانیات کی تعداد بڑھتی رہتی تھی، پہلے دو چار چیزوں پر ایمان لانا ضروری تھا اس لئے کہ اتنا ہی بتایا گیا تھا اس کے بعد ان کی تعداد بڑھی اور بڑھتی گئی تو مسلمانوں کا ایمان بھی بڑھتا گیا اور یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ آیت "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ" جب نازل ہوئی تو اب مومن بہ سب کے سب آگئے اور سب پر ایمان ہوگیا، پہلے کم پر تھا، اب زیادہ پر ہوگیا، لہٰذا امام بخاری کا مقصد پورا ہوگیا۔ ہم اجمال و تفصیل کا فرق کہیں گے، ایمان تو سب پر اول دن ہی تھا، تفصیل بعد میں آئی۔

حدیث ۴۳. قولہ لَاتَّخَذْنَا ذٰلِكَ الْيَوْمَ عِيْدًا، ایک یہودی نے امیرالمومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تمہیں اس آیت کی قدر نہیں، اگر ہمارے ہاں اترتی تو ہم اس دن کو عید منایا کرتے، بعض روایات میں تصریح ہے کہ یہ کہنے والے کعب احبار تھے جو حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ میں ایمان لائے ہیں، بعض روایات میں "اَنَّ نَاسًا مِنَ الْيَهُوْدِ" آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان کے علاوہ اور بھی کچھ لوگ تھے حدیث کے لفظ "اَنَّ رَجُلًا مِنَ الْيَهُوْدِ" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، ورنہ مومن کے لئے یہ لفظ مناسب

أَخْبَرَنَا قَيْسُ بْنُ مُسْلِمٍ عَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ أَنَّ رَجُلًا

کہا ہم کو خبر دی قیس ابن مسلم نے ، انھوں نے طارق ابن شہاب سے ، انھوں نے عمر ابن الخطاب سے کہ ایک یہودی آدمی نے ان سے

مِنَ الْيَهُودِ قَالَ لَهُ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ آيَةٌ فِي كِتَابِكُمْ تَقْرَءُونَهَا لَوْ عَلَيْنَا مَعْشَرَ الْيَهُودِ

کہا ، اے امیر المومنین! تمھاری کتاب (قرآن) میں ایک آیت ہے جس کو تم پڑھتے رہتے ہو ، اگر وہ آیت ہم یہود لوگوں پر اترتی تو ہم اس

نَزَلَتْ لَاتَّخَذْنَا ذَلِكَ الْيَوْمَ عِيدًا ، قَالَ أَيُّ آيَةٍ ؟ قَالَ (اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ

دن کو (جس دن وہ آیت اترتی) عید کا دن ٹھیرا لیتے ، انھوں نے پوچھا: وہ کون سی آیت ہے ؟ اس نے کہا: یہ آیت (آج میں نے تمھارے

وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا) قَالَ عُمَرُ قَدْ عَرَفْنَا

لئے تمھارا دین پورا کیا اور اپنا احسان تم پر تمام کر دیا اور اسلام کا دین تمھارے لئے پسند کیا) حضرت عمر نے کہا ہم اس دن کو جانتے ہیں اور

ذَلِكَ الْيَوْمَ وَالْمَكَانَ الَّذِي نَزَلَتْ فِيهِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اس جگہ کو بھی جس میں یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری تھی ، وہ جمعہ کا دن تھا جب آپ عرفات میں

وَهُوَ قَائِمٌ بِعَرَفَةَ يَوْمَ جُمُعَةٍ

کھڑے تھے

نہ تھا۔ خیر واقعہ خواہ کسی وقت کا ہو مگر اس میں شک نہیں کہ قائل خوب سمجھا ، تمام قرآن میں سے اچھا انتخاب کیا ، جب آیت الیوم اکملت لکم نازل ہوگئی تو اب کیا رہ گیا ، دین کی تکمیل ہوئی اور اتمام نعمت ہوگیا ، اللہ نے یہ دین اسلام امت کے لئے پسند فرمایا اب اور کیا چاہئے سب کچھ تو ہوگیا۔ قولہ قد عرفنا ، یہاں مختصر ہے ، طبرانی وغیرہ میں یہ الفاظ بھی ہیں کلاھما بفضل اللہ لنا عید یعنی عمر فاروق نے فرمایا ہمیں خوب معلوم ہے ، تم ایک عید کہتے ہو ، الحمد للہ دو عیدیں جمع تھیں ، نیز تم کہتے ہو کہ ہم اس دن کو عید بناتے اور یہاں اللہ تعالیٰ نے خود عید بنا دی تھی۔ عرفہ کے متعلق قریب قریب اتفاق ہے کہ سید الایام ہے ، حدیث میں بھی تصریح ہے ، اس میں بھی اختلاف ہے کہ عشرہ ذی الحجہ افضل ہے یا عشرہ رمضان ، زاد المعاد میں علامہ ابن قیم نے خوب لکھا ہے کہ ایام تو عشرہ ذی الحجہ کے افضل ہیں[1] اور لیالی عشرہ رمضان کی ، کیونکہ اس میں لیلۃ القدر ہے۔

کرمانی نے جواب دیا کہ یہ آیت عرفہ کے دن زوال کے بعد اتری تھی اور اگر کوئی بعد زوال طلوع ہلال کا یقین کرے تو اگرچہ

---

(۱) اس لئے کہ اس میں سید الایام عرفہ بھی ہے ۔ ۱۲ منہ

باب ٣٤ الزكوٰة من الاسلام وقوله تعالىٰ: وما أمروا الا ليعبدوا الله

زکوٰۃ دینا اسلام میں داخل ہے، اور اللہ تعالیٰ نے (سورۂ لم یکن میں) فرمایا: حالانکہ ان کافروں کو یہی حکم دیا گیا کہ

مخلصين له الدين حنفاء ويقيموا الصلوٰة ويؤتوا الزكوٰة وذلك دين القيمة

خالص اللہ ہی کی بندگی کی نیت سے ایک طرف کے ہوکر اس کو پوجیں، اور نماز کو ٹھیک کریں اور زکوٰۃ دیں، اور یہی پکا دین ہے

٤٤ـ حدثنا اسمعيل قال حدثني مالك بن انس عن عمه ابي سهيل

ہم سے اسمٰعیل نے بیان کیا کہا مجھ سے امام مالک ابن انس نے بیان کیا، انھوں نے اپنے چچا ابوسہیل بن مالک

بن مالك عن ابيه انه سمع طلحة بن عبيد الله يقول جاء رجل الى رسول الله

سے، انھوں نے اپنے باپ مالک ابن ابی عامر سے، انھوں نے طلحہ ابن عبید اللہ سے، وہ کہتے تھے نجد والوں میں سے ایک شخص

صلى الله عليه وسلم من اهل نجد ثائر الرأس نسمع دوي صوته ولا نفقه ما

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، سر پریشان (یعنی اس کے بال بکھرے ہوئے تھے) ہم بھن بھن اس کی آواز سنتے تھے اور اسکی

يقول حتى دنا وهو يسأل عن الاسلام فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم خمس

بات سمجھ میں نہیں آتی تھی یہاں تک کہ وہ نزدیک آ پہونچا، جب معلوم ہوا کہ وہ اسلام کو پوچھ رہا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

صلوات في اليوم والليلة فقال هل علي غيرها قال لا الا ان تطوع. قال رسول

اسلام، دن رات میں پانچ نمازیں پڑھنا ہے، اس نے کہا بس اس کے سوا تو اور کوئی نماز مجھ پر نہیں؟ فرمایا: نہیں! مگر تو نفل پڑھے

الله صلى الله عليه وسلم وصيام رمضان، قال هل علي غيره؟ قال لا، الا

(تو اور بات ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اور رمضان کے روزے رکھنا، اس نے کہا اور تو کوئی روزہ مجھ پر نہیں؟

ان تطوع

فرمایا: نہیں! مگر تو نفل رکھے

ب نا: نہیں مگر دن عید ہی کا ہوگا، چونکہ یہ بعد زوال اتری اسلئے حکماً دن عید ہی ہوگا، کرمانی نے ان لفظوں پر غور نہیں کیا جو طبرانی نے نقل کئے ہیں ورنہ وہ ایسا نہ کہتے، بہتر وہی ہے جو حافظ نے کہا کہ اصلی عید یوم عرفہ ہے اور اسکی عید دسویں ذی الحجہ، اب دو عیدیں ہوئیں، ایک اسلئے کہ یوم عرفہ تھا، دوسرا اس لئے کہ یوم جمعہ تھا۔

باب ٣٤ الزكوٰة من الاسلام

دین قیم وہ ہے جس میں عبادت الٰہی اور اقامت وایتاء زکوٰۃ ہو، یہی دین مستقیم ہے۔

. . . .

حدیث ۴۴ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ اَھْلِ نَجْدٍ ۔ نجد عرب کے بلند حصے کو کہتے ہیں اور پست حصہ کو تہامہ اور اوسط حصہ کو حجاز کہتے ہیں۔ دَوِیّ گنگناہٹ۔

امام شافعی نے کتاب الام میں اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے: ففرائض الصّلوٰۃ خمسٌ وماسواھا تطوع۔ یعنی فرض نمازیں صرف پانچ ہیں، ان کے سوا سب نفل ہیں، فرض وواجب کوئی نہیں، حتی کہ وتر بھی واجب نہیں ہے نفل ہے، یہ خود امام شافعی کے الفاظ ہیں، اور شوافع نے تصریح کی ہے کہ یہ حدیث امام ابوحنیفہؒ کے قول وجوب وتر کو رد کرتی ہے، حنفیہ نے جواب دیا ہے کہ وتر کا وجوب ممکن ہے اس کے بعد ہوا ہو جیسے اور بہت سے احکام ہیں مثلاً صدقۃ الفطر احناف کے نزدیک واجب ہے اور شوافع کے ہاں فرض ہے، تو الا ان تطوّع سے نماز وتر کی طرح صدقۂ فطر بھی نفل ہی میں آتا ہے، تو تم فرض کیوں کہتے ہو فما ھو جوابکم فھو جوابنا۔ شوافع کہتے ہیں کہ اس وقت تک حکم نہ آیا ہوگا، بس یہی جواب ہم بھی یہاں دیں گے۔

میں کہتا ہوں اس جواب دہی کی کوئی ضرورت نہیں اس لئے کہ بہت سے احکام زمانے اور وقت کے لحاظ سے دئے جاتے ہیں، مثلاً کوئی نومسلم کہے کہ مجھے نماز سکھا دو تو ہم کہیں گے کہ بھائی پانچ نمازیں فرض ہیں، بس تم پانچ نمازیں پڑھا کرو تو ہمارے اس جملہ کا مطلب سوا اس کے کچھ نہیں کہ ایک مجمل حکم تمہیں بتا دیا گیا، تفصیل بعد میں معلوم کرنا ___ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پانچ نمازیں ہیں، تو کیا اس کا گمان ہو سکتا ہے کہ حضورؐ نے اسے کوئی تفصیل نہ بتائی ہوگی؟ عقل کہتی ہے کہ پڑھنے کا ڈھنگ ضرور بتایا ہوگا، رکوع وسجود بتائے ہوں گے تعداد رکعات بتائی ہوگی، التحیات، درود، قراءۃ بتائی ہوگی، شروط وآداب وغیرہ سب سمجھائے ہوں گے، مثلاً آپ نے بتلایا ہوگا کہ فجر کی دو رکعتیں ہیں اور وہ اس طرح پڑھی جاتی ہیں، شروط، آداب، محسنات وغیرہ سب کی تعلیم دی ہوگی، اس وقت کے نومسلم کو فرض، سنت، نفل، رکوع سجدہ، تعداد رکعات، تسبیحات رکوع وسجود وغیرہ سب بتلانے پڑیں گے، مگر کہا یہی جائے گا کہ پانچ ہی نمازیں ہیں۔

اب ہم کہتے ہیں کہ وتر اگرچہ من وجہ مستقل واجب ہے لیکن من وجہ صلوات خمسہ یا عشاء کے توابع میں سے ہے، چنانچہ نہ اس کے لئے مستقل علحدہ وقت ہے نہ اس کے لئے مستقل جماعت ہے سوائے رمضان کے، نہ اس کے لئے اذان ہے جس طرح صلواتِ خمسہ کے لئے اذان ہے، اسی لئے بعض محققین کہتے ہیں کہ وتر صلوات خمسہ کا مکمل ہے، ہم باوجودیکہ وتر کو واجب کہتے ہیں مگر نماز پانچ ہی کہتے ہیں، کسی نے چھ نمازیں نہیں کہیں، تو جس طرح بعض واجبات نماز کے اندر ہیں اسی طرح خارج میں بھی بعض واجبات ہیں جیسے بعض سنن داخلِ نماز ہیں اور بعض خارج جو مکمل نماز ہیں جیسے تسویۂ صفوف وغیرہ، اسی طرح واجبات داخلی بھی ہیں اور خارجی بھی، تو اب ترجمہ یہ ہوگا لازم است بر تو نماز پنجگانہ، اس میں تمام واجبات وسنن داخل ہیں بلکہ میں دعوٰی کرتا ہوں کہ سنن رواتب بھی اس میں داخل ہیں اور حضورؐ کے ارشاد

قَالَ وَذَكَرَ لَهُ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الزَّكٰوةَ، قَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا

طلحہ نے کہا: اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے زکوٰۃ کا بیان کیا وہ کہنے لگا: بس اور تو کوئی صدقہ تو مجھ پر نہیں؟ آپ نے

قَالَ لَا اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ . قَالَ فَاَدْبَرَ الرَّجُلُ وَهُوَ يَقُولُ : وَاللّٰهِ لَا اَزِيْدُ عَلٰى هٰذَا

فرمایا: نہیں! مگر نفل صدقہ دو (تو اور بات ہے) راوی نے کہا کہ وہ شخص پیٹھ موڑ کر چلا یہ کہتا ہوا کہ خدا کی قسم میں نہ اس سے

وَلَا اَنْقُصُ، قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفْلَحَ اِنْ صَدَقَ.

بڑھاؤں گا نہ گھٹاؤں گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر یہ سچا ہے تو اپنی مراد کو پہونچ گیا.

"اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ" میں تطوع سے مراد میرے نزدیک صلوات نافلہ مجردہ ہیں، عام شراح نے تطوع میں رواتب وغیرہ کو داخل کیا ہے اور "لا ازید ولا انقص" پر جو اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب تطوع میں سنن رواتب داخل ہیں تو پھر سائل کا حلف اٹھانا کہ میں ابدًا اس سے رکا رہوں گا اور اس پر حضورؐ کا "اَفْلَحَ اِنْ صَدَقَ" فرمانا کیسے صحیح ہوگا؟ تو لوگوں نے اس اعتراض سے بچنے کے لئے تاویلیں کی ہیں، کسی نے کہا قسم اس پر کھائی اور "لا ازید ولا انقص" اس پر کہا ہے کہ مثلاً چار رکعت فرض کے بجائے تین یا پانچ رکعت نہ پڑھوں گا، کسی نے یہ مراد بیان کی کہ تبلیغ میں کوتاہی نہ کروں گا اور کمی زیادتی نہ کروں گا، کسی نے یہ کہا کہ کیفیات فرائض میں کمی زیادتی نہ کروں گا، مگر یہ سب تاویلات رکیکہ ہیں کیونکہ بخاری میں آگے یہ روایت آئے گی کہ اس نے بجائے "لا ازید ولا انقص" کے یہ کہا کہ "لا اتطوع شيئًا" تو اب وہ تاویلات کہاں گئیں، سب بیکار ہوگئیں، اس لئے میں کہتا ہوں کہ مراد محض نوافل ہیں، ان کے بارے میں اس نے کہا لا ازید، اور قسم کھانا اس لئے نہیں کہ اس کو انکار اور اباء ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ سے نہ ہو سکے گا اور میں برداشت نہ کر سکوں گا کیونکہ میں کاروباری آدمی ہوں، مجھے اتنی فرصت نہ ملے گی ____ تو درحقیقت وتر، سنن رواتب، توابع ہیں فرائض کے، یہی حدیث اسمٰعیل ابن جعفر کی روایت سے آگے آئی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: فَاَخْبَرَهُ بِشَرَائِعِ الْاِسْلَامِ اس کے بعد فرمایا لا الا اَنْ تَطَوَّعَ، تو شرائع میں وتر و صدقۃ الفطر سب آگئے لہٰذا نہ احناف پر اعتراض ہے نہ شوافع پر۔

محمد ابن نصر مروزی نے کتاب قیام اللیل میں نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے امام ابو حنیفہ سے پوچھا فرض نمازیں کتنی ہیں؟ امامؒ نے کہا: پانچ! سوال کیا وتر فرض ہے یا نہیں؟ فرمایا: فَرِيْضَةٌ! (اى بمعنى واجب) پھر کہا کل کتنی ہوئیں؟ فرمایا پانچ کہا شمار کرو: فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء۔ پھر پوچھا: وتر کیا ہے؟ فرمایا: فرض! کئی بار اسی طرح سوال و جواب ہوا، تو کہنے لگا: انك لا تحسن الحساب تمہیں حساب نہیں آتا ____ اس نے تو یہ کہا مگر ہم کہتے ہیں کہ اسی واقعہ سے امام ابو حنیفہ کا کمال تفقہ معلوم ہوتا ہے کہ فرائض اصلی پانچ ہی ہیں اور وتر اگرچہ واجب ہے لیکن توابع فرائض سے ہے اور اس سے سائل کی غباوت

باب ۳۵ اِتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ مِنَ الْاِیْمَانِ

جنازے کے ساتھ جانا ایمان میں داخل ہے۔

۴۵ — حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَلِیٍّ الْمَنْجُوْفِیُّ قَالَ حَدَّثَنَا

ہم سے احمد ابن عبداللہ ابن علی منجوفی نے بیان کیا، ہم سے بیان کیا روح نے کہا ہم سے

رَوْحٌ قَالَ حَدَّثَنَا عَوْفٌ عَنِ الْحَسَنِ وَمُحَمَّدٍ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ

بیان کیا عوف نے انھوں نے حسن اور محمد سے، انھوں نے ابوہریرہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ اتَّبَعَ جَنَازَةَ مُسْلِمٍ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا وَّكَانَ

جو کوئی ایمان رکھ کر اور ثواب کی نیت سے کسی مسلمان کے جنازے کے ساتھ جائے اور نماز اور دفن سے فراغت تک

مَعَهٗ حَتّٰى یُصَلّٰى عَلَیْهَا وَیَفْرُغَ مِنْ دَفْنِهَا فَاِنَّهٗ یَرْجِعُ مِنَ الْاَجْرِ بِقِیْرَاطَیْنِ كُلُّ

اس کے ساتھ رہے تو وہ دو قیراط ثواب لے کر لوٹے گا، ہر قیراط اتنا بڑا ہوگا جیسے احد کا پہاڑ، اور جو شخص جنازے

قِیْرَاطٍ مِثْلُ اُحُدٍ وَمَنْ صَلّٰى عَلَیْهَا ثُمَّ رَجَعَ قَبْلَ اَنْ تُدْفَنَ فَاِنَّهٗ یَرْجِعُ مِنَ الْاَجْرِ بِقِیْرَاطٍ

پر نماز پڑھ کر دفن سے پہلے لوٹ جائے تو وہ ایک قیراط ثواب لے کر لوٹے گا۔ روح کے ساتھ اس

تَابَعَهٗ عُثْمَانُ الْمُؤَذِّنُ قَالَ حَدَّثَنَا عَوْفٌ عَنْ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ

حدیث کو عثمان موذن نے بھی روایت کیا، کہا ہم سے عوف نے بیان کیا، انھوں نے محمد ابن سیرین سے

صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَحْوَهٗ

سنا، انھوں نے ابوہریرہؓ سے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اگلی روایت کی طرح

معلوم ہوتی ہے، ورنہ امام صاحب تو درحقیقت اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

قولہ اَفْلَحَ اِنْ صَدَقَ بعض دوسری روایات میں اور مسلم وغیرہ میں بھی "اَفْلَحَ وَاَبِیْهِ" آیا ہے، اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ غیر اللہ کی قسم تو جائز نہیں، تو جواب میں اس کی مختلف تاویلات کی گئی ہیں، کسی نے کہا کہ یہ خصائص نبوی سے ہے، سوال ہوا کیوں خصائص سے ہے؟ تو زرقانی نے لکھا ہے کہ حلف لغیر اللہ کی ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ تعظیم مفرط غیر اللہ کی نہ ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ تعظیم مفرط سے مامون ہیں اس لئے آپ کے لئے جائز ہے[1] مگر بہترین جواب حنفی عالم حسن چلپی کا ہے، وہ مطول کے حاشیہ میں

(۱) بعضوں نے کہا کہ یہاں مضاف محذوف ہے، اصل میں "ورب ابیہ" تھا۔ ۱۲ منہ

بَابُ ٣٦ خَوْفِ الْمُؤْمِنِ اَنْ يَّحْبَطَ عَمَلُهٗ وَهُوَلَايَشْعُرُ

مومن کو ڈرنا چاہیئے کہ کہیں اس کے عمل مٹ نہ جائیں اور اس کو خبر نہ ہو

وَقَالَ اِبْرَاهِيْمُ التَّيْمِيُّ مَا عَرَضْتُ قَوْلِيْ عَلٰى عَمَلِيْ اِلَّاخَشِيْتُ اَنْ

اور ابراہیم تیمی نے کہا (جو واعظ تھے) میں نے اپنی گفتار اور کردار کو جب ملایا تو مجھ کو ڈر ہوا کہ کہیں میں

اَكُوْنَ مُكَذِّبًا

(شریعت کے) جھٹلانے والوں (کافروں) میں سے نہ ہوں،

لکھتے ہیں کہ قسم دو ہیں، ایک لغوی، دوسری شرعی، لغوی میں صیغہ قسم کا ہوتا ہے مگر مقصود تزئین کلام ہوتی ہے اور محض ترویج اور خوبصورت بنانا ہوتا ہے جیساکہ ذوق کا شعر ہے ؎

اتنا ہوں تری تیغ کا شرمندۂ احسان ٭ سر میرا ترے سر کی قسم اٹھ نہیں سکتا
شمع نے آگ رکھی سر پہ قسم کھانے کو ٭ بخدا میں نے جلایا نہیں پروانے کو

تو درحقیقت یہاں تزئین ہے، اور شرعی قسم وہ ہے جہاں تعظیم ہو اور وہ حلف ہے.

درمختار کے خطبہ میں جہاں "وَلَعَمرِی" آیا ہے وہیں شامی نے حسن چلپی کی یہ عبارت نقل کی ہے

بَابُ ٣٥ اتباع الجنائز من الایمان

حدیث ٤٥ فرماتے ہیں کہ جو شخص صرف اللہ کے لئے پورے خلوص کے ساتھ اور اس کے وعدے پر یقین کرکے جنازہ کے ساتھ جاتا ہے اور اس کے دفن تک ساتھ رہتا ہے تو وہ دو قیراط اجر لے کر لوٹتا ہے اور جو دفن میں شریک نہ ہو تو ایک قیراط اجر اسے ملے گا اور قیراط سے آخرت کا قیراط مراد ہے جو احد پہاڑ کی طرح ہے، مقصود اتباع جنائز کی ترغیب ہے، ابن عمر کو جب یہ حدیث پہونچی تو فرمایا لقد فرطنا من قراریط کثیرۃ یعنی بہت سے قیراط سے ہم محروم رہے، یہاں حدیث میں ایمان کے ساتھ احتساب کی قید لگائی تاکہ شریک ہونے والا اچھی طرح سوچ کر اللہ کی رضا اور اجر کی خاطر شرکت کرے اور رسمی طور پر جو لوگ شریک ہوتے ہیں یا اس خیال سے کہ ہم نہ جائیں گے تو یہ بھی ہمارے یہاں نہ آئیں گے، وہ اپنی اصلاح کریں اور ارادہ کرکے اخلاص کے ساتھ شریک ہوں تاکہ محرومی اجر سے محفوظ رہیں.

حدیث میں اتَّبع جنازۃ مسلم ایماناً واحتساباً آیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے.

لفظ اتباع سے یہ بھی نکالا گیا کہ جنازہ کے پیچھے چلنا مناسب ہے اور اتباع اسی وقت صادق آئے گا، یہی امام ابو حنیفہؒ کا مسلک ہے ـــــ شوافع کے نزدیک جنازہ کے آگے چلنا چاہیے.

. . . .

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ صلوۃ الجنازہ مسجد کے اندر ہو یا باہر؟ تو اس کے بارے میں ان شاء اللہ کتاب الجنائز میں اس پر بحث کروں گا

تابعہٗ عثمان المؤذن ، اس حدیث میں عثمان المؤذن ، روح کا متابع ہے ، انھوں نے بھی عوف سے روایت کی ہے ، مگر ان کی سند میں حسن نہیں ہیں ، بلکہ صرف ابن سیرین ہیں ، حسن صرف ایک سند میں ہیں ، اور ابن سیرین دونوں میں ۔

باب ۳۶ خوف المؤمن الخ

یعنی مومن کی شان یہ ہے کہ وہ ہر وقت ڈرتا رہے کہ کہیں اس کے عمل اکارت نہ کر دیئے جائیں اور خدا نخواستہ یہ حبط عمل اس طرح ہو کہ اس کو پتہ ہی نہ چلے ، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی غفلت اور لاپرواہی میں کوئی جملہ بولتا ہے اور اسے بہت معمولی سمجھتا ہے مگر وہ اسقدر بڑا ہوتا ہے کہ اگر سمندر پر ڈال دیا جائے تو اس پر بھی گراں ہو ، یہ حدیث دراصل اس آیت سے مقتبس ہے : یٰاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْہَرُوْا لَہٗ بِالْقَوْلِ کَجَہْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ(۱) (اے ایمان والو اپنی آوازیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر بلند نہ کرو اور نہ ان کے سامنے اس طرح زور سے بولو جس طرح آپس میں ایک دوسرے کے سامنے بولتے ہو ، ایسا نہ ہو کہ تمھارے سارے اعمال اکارت جائیں اور تم کو شعور بھی نہ ہو) اس میں تعظیم کا حکم دیا گیا تاکہ کوئی مسلمان توقیر نبی میں کوتاہی نہ کرے ، نبی کی مجلس کا ادب سکھایا جا رہا ہے کہ اسے اپنی مجلس جیسا نہ سمجھو کہ اس میں بے جھجک گفتگو میں کرو یا آزادی اور بے باکی سے بولو ، یہاں اس کی بالکل گنجائش نہیں بلکہ اس بات کا خطرہ ہے کہ ذرا سی غفلت سے سارا کیا کرایا برباد نہ ہو جائے اور تم کو پتہ بھی نہ چلے ، بعض چیزیں بظاہر بہت معمولی معلوم ہوتی ہیں مگر حقیقت میں بڑی خطرناک ثابت ہوتی ہیں ، دیکھو ڈائنامیٹ ذرا سا ہوتا ہے مگر پہاڑ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے ، اس لیے تم کو آداب دربار نبوی کا بہت خیال رکھنا چاہیئے ۔

یہاں ایک اشکال وارد کیا گیا ہے کہ کفر تو بیشک محبط اعمال ہے مگر سیئہ کا محبط اعمال ہونا اہل السنۃ کا مسلک نہیں ، حالانکہ یہاں قرآن ناطق ہے کہ معصیۃ محبط اعمال ہے ، اس کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں ، میرے نزدیک ابن المنیر مالکی نے جو نہایت ذکاوت رکھتے ہیں ، انھوں نے حاشیہ کشاف میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب سے بہترین جواب ہے ، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امت اس پر متفق ہے کہ نبی کو عمداً ایذا پہونچانا حد کفر تک پہونچاتا ہے اور ایک حد تک ایذا رسانی بالاتفاق کفر ہے ، رفع صوت اور اپنی آواز کو آپ کی آواز پر غالب کرنے کے بعض مراتب ایسے ضرور ہیں جو حد کفر تک پہونچ جاتے ہیں کیونکہ اس سے نبی کو ایذا پہونچتی ہے اور نبی کو ایذا پہونچانا کفر ہے اور وہ بالاتفاق محبط ہے ، اسی لئے

---

(۱) حجرات : ۲

قرآن میں فرمایا گیا : وانتم لاتشعرون ، یعنی تم کو خبر بھی نہ ہو اور سارا کیا کرایا ستیاناس ہو جائے ۔

اس تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ ایذا سبب ہے حبط اعمال کا ، اس لئے رفع صوت اور قول بالجہر کو مطلقاً ممنوع قرار دیا کیونکہ بعض مرتبہ رفع صوت اور جہر بالقول سے بھی ایذا پہونچتی ہے اور ایذا پہونچانا کفر ہے ، اسلئے مطلقاً ممانعت فرما دی تاکہ خطرہ بھی نہ رہے ، جیسے اِنَّ بَعۡضَ الظَّنِّ اِثۡمٌ [1] کہکر مطلق ظن (بدگمانی) سے روک دیا کہ تم کسی پر برائی کا ظن مت کرو ۔

قولہ وقال ابراھیمُ التیمی ما عرضتُ قولی علی عملی الاخشیتُ ان اکونَ مُکذَّبًا ، گو بعضوں نے مُکذِّبًا اسم فاعل پڑھا ہے لیکن اصح مکذَّبًا اسم مفعول ہے ، ابراہیم تیمی واعظ تھے اور واعظ کو مشکل ہوتی ہے کہ جب وہ دوسروں کو امر کرتا ہے اور خود کوتاہی کرتا ہے تو لوگ طعن کرتے ہیں ، چنانچہ حافظ شیرازی نے کہا ہے ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند ؏ چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند
مشکلے دارم زدانشمند مجلس باز پرس ؏ توبہ فرمایان چرا خود توبہ کمتر می کنند

ابراہیم تیمی بڑے متقی و عابد تھے ، یہ بات وہ تواضعاً کہہ رہے ہیں کہ [جب میں اپنے قول و عمل کا موازنہ کرتا ہوں تو مجھے اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ] کہیں ایسا نہ ہو کہ میں جھٹلا دیا جاؤں کہ تیرا قول و عمل یکساں نہیں ہے ، یہ اشارہ اس آیت کی طرف ہے :

تقولونَ مالا تفعلونَ ٥ کَبُرَ مقتاً عندَ اللہِ اَن تقولوا مالا تفعلونَ [2]

بخاری کا مقصد مرجیہ کی تردید ہے ، جو کہتے ہیں کہ محض ایمان کافی ہے ، عمل کی ضرورت نہیں ۔ بخاری بتا رہے ہیں کہ دیکھو عمل کس قدر ضروری ہے ، مرجیہ کا یہ بھی قول ہے کہ جس طرح کفر جنت میں نہ جائے گا اسی طرح ایمان دوزخ میں نہ جائے گا ، یعنی جس طرح کفر کے ہوتے ہوئے کوئی حسنہ مقبول نہیں اسی طرح ایمان کے ہوتے ہوئے کوئی سیئہ بھی مضر نہیں اور صرف قول لاالٰہ الااللہ جنت میں پہونچانے کے لئے کافی ہے ۔

میں کہتا ہوں کہ یہ حماقت ہے ، فرض کرو کہ ایک شخص سنکھیا کھالے تو اس کا اثر تمام رگ وپے میں فوراً ہوتا ہے ، اسی طرح سانپ کاٹ لے تو تمام بدن سیاہ ہو جاتا ہے مگر ہر زہر یکساں نہیں ، اگر بھڑ کاٹ لے تو تمام بدن اس سے متاثر نہ ہوگا ، اس کے برعکس اگر کوئی خمیرہ گاؤزباں عنبری کھالے تو تمام اعضاء کو تقویت ہوگی ، تو کفر کی مثال بھی سنکھیا اور سم الفار کی ہوگی ، جہاں ذرا سا بھی آیا تو بالکل ایسا

(۱) حجرات : ۱۲ (۲) صف : ۳ ، ۲

وَقَالَ ابْنُ اَبِیْ مُلَیْکَۃَ اَدْرَکْتُ ثَلٰثِیْنَ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

اور ابن ابی ملیکہ نے کہا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تیس ۳۰ صحابہ سے ملا

ہوگیا جیسے سانپ نے کاٹ لیا اور حیات جاتی رہی ___ اس کے برعکس ایمان کفر کے مقابلہ میں بمنزلہ حیات کے ہے اور حیات میں کمزوری وضعف اور نقصان بھی ہوتا ہے، تو جب تک سانس چل رہا ہے کمزوری وضعف کے باوجود حیات باقی ہے، تو جس طرح مرض وضعف زندگی کے منافی نہیں، اسی طرح معصیت ایمان کے منافی نہیں، مرجیہ کا یہ جملہ کہ ایمان دوزخ میں نہ جائے گا اور کفر جنت میں، بڑا موثر ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص مثلاً زانی ہے تو دوزخ میں اس کا ایمان کیسے جائے گا؟ محدثین ومفسرین کے یہاں اس کا کوئی جواب نظر سے نہیں گذرا، ہاں ارباب حقائق نے لکھا ہے کہ جب ایسے مجرم کو دوزخ میں لے جائیں گے تو اس کے حسنات اور اس کا ایمان دروازۂ جہنم پر اتار کر رکھ لیا جائے گا جیسے یہاں قیدیوں کے ساتھ برتاؤ ہوتا ہے اور یہ جو کہا کہ کوئی سیئہ جنت میں نہ جائے گا تو جنت میں جب موحد جائے گا تو تمام گناہوں سے پاک وصاف ہوکر بالکل نکھر کر جائے گا، جیسے سنار سونے کو کندن بناتا ہے ___ پیچھے گذر چکا ہے کہ جب دوزخ سے مومن کو نکالیں گے تو نہر حیاۃ میں ڈالیں گے پھر وہاں فَیَنْبُتُوْنَ کَمَا تَنْبُتُ الْحِبَّۃُ فِیْ جَانِبِ السَّیْلِ ___ معلوم ہوا کہ جنت میں داخلہ کے وقت کوئی سیئہ باقی نہ رہے گا اور یہ سیئات سے پاک ہوکر جنت میں جائے گا، میں سمجھتا ہوں کہ قلب چونکہ ایمان کا محل ہے اور عذاب جسم پر ہو رہا ہے اس لئے قلب محفوظ رہے گا۔ باقی یہ جو قرآن میں فرمایا گیا ہے: نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ[1] (ایک آگ ہے اللہ کی سلگائی ہوئی جو جھانک لیتی ہے دلوں کو) یہ صرف کفار کے لئے ہے، تو میرے خیال میں عذاب مومنین کے لئے صرف جسم پر ہے نہ کہ قلب پر، اس لئے محل ایمان عذاب سے محفوظ ہے۔

قَالَ ابْنُ اَبِیْ مُلَیْکَۃَ الخ ابن ابی ملیکہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کا عام حال یہ تھا کہ ڈرتے تھے کہ کہیں نفاق عملی، دورنگی اور دوغلے پن کا الزام اللہ کی بارگاہ میں ان پر نہ آجائے، اس کا اثر یہ تھا کہ وہ بہت محتاط زندگی گذارتے تھے اور ہر وقت اخلاص کی راہ تلاش کیا کرتے، اور ہر کام میں خلوص نیت کا اس قدر اہتمام کرتے کہ خدا کی طرف سے ان کے مخلص ہونے کی بار بار توثیق ہوتی۔

صلح حدیبیہ میں جس طرح امتثال امر نبوی کا ثبوت صحابہ نے پیش کیا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِہِمْ فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ عَلَیْہِمْ[2] (یقیناً اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جبکہ اے محبوب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے (اللہ کے نام پر جان دینے کی) تو اللہ نے ان کے دلوں کا حال جان لیا اور ان پر سکینہ نازل فرمایا) اس آیت میں "فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِہِمْ" سے ان کے اخلاص پر مہر تصدیق ثبت ہوگئی

---

(۱) ہُمزہ: ۶، ۷ (۲) فتح: ۱۸

كُلُّهُمْ يَخَافُ النِّفَاقَ عَلَىٰ نَفْسِهٖ مَا مِنْهُمْ اَحَدٌ يَقُوْلُ اِنَّهٗ عَلٰى اِيْمَانِ

ان میں ہر ایک کو اپنے اوپر نفاق کا ڈر لگا ہوا تھا، ان میں سے کوئی نہ کہتا تھا کہ میرا ایمان جبرئیل یا میکائیل کے

جِبْرِيْلَ وَمِيْكَائِيْلَ

ایمان کا سا ہے

اسی طرح غزوۂ تبوک کے موقع پر کچھ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا ہم اللہ کے نام پر جان کی قربانی دینے کے لئے آئے ہیں مگر ہمارے پاس سواری نہیں ہے آپ اس کا انتظام فرمادیں، آپ نے فرمایا: لَا اَجِدُ مَا اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ، میں تو تمہاری سواری کا انتظام نہیں کرسکتا، تو قرآن ان کے زبان ودل کی تصدیق میں فرماتا ہے: وَ ۔ وَاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ[1] یعنی وہ اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اس رنج وغم میں کہ ہمارے پاس خرچ کرنے کو نہیں ورنہ ہم بھی جان دینے کو تیار تھے۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات ان کے خلوص پر شاہد عدل ہیں، یہ اسی لئے تو تھا کہ وہ ہر وقت ترساں ولرزاں رہتے تھے اور اپنا جائزہ لیتے رہتے تھے بلکہ ہر ایک دوسرے سے پوچھتا رہتا تھا کہ کہیں بات میرے اندر نفاق کی تو نہیں معلوم ہوتی، یہی ان کی فکر انھیں محفوظ رکھتی تھی رضی اللہ عنہم اجمعین۔

قولہٗ مَا مِنْهُمْ اَحَدٌ يَقُوْلُ الخ یعنی کوئی ایک بھی ان میں سے یہ نہیں کہتا تھا کہ میرا ایمان جبریل ومیکائیل جیسا ہے اس میں اشارۃً امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول "ایمانی کایمان جبریل" کی تردید ہے، امام بخاری کہنا یہ چاہتے ہیں کہ یہ ایک بہت بڑا دعویٰ ہے کہ آدمی اپنے ایمان کو جبرئیل کے ایمان کی طرح قرار دے جبکہ جبرئیل کا ایمان یقینی اور ان کا ایمان پر خاتمہ بھی یقینی ہے، کسی اور شخص کو سوائے ان لوگوں کے جن کو جنت کی بشارت دے دی گئی تھی جبریل کے خاتمہ جیسا یقین نہیں پیدا ہوسکتا، اسی بنا پر کوئی بھی ایسا دعویٰ نہیں کرتا تھا جیسا ابوحنیفہ نے کردیا ۔۔۔ یہ خلاصہ ہے اعتراض کا ۔۔۔ جواب سے پہلے یہ سمجھو کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس سلسلہ میں تین قول منقول ہیں:

اول ایمانی کایمان جبرئیل ولا اقول مثل ایمان جبرئیل ۔۔۔ اور یہی سب سے زیادہ مشہور ہے۔

دوم اکرہ ان یقول الرجل ایمانی کایمان جبرئیل ولکن یقول اٰمنت بما اٰمن بہ جبرئیل ۔۔۔

اس کی تائید امام محمد کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ "میں نہ تو یہ کہتا ہوں کہ ایمانی کایمان جبرئیل اور نہ یہ کہتا ہوں کہ ایمانی

---

(۱) توبہ : ۹۲

مثل ایمان جبرئیل بلکہ میں کہتا ہوں "آمنت بما آمن بہ جبرئیل" (میں بھی اس پر ایمان لایا جس پر جبریل ایمان لائے) یعنی دونوں کا مومن بہ ایک ہے۔

سوم ایماننا مثل ایمان الملائکۃ۔

ان اقوال میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ اس سے امام کا مقصود واضح ہوجاتا ہے۔ وہ صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مومن بہ ہمارا اور جبریل کا ایک ہے، یہ جملہ "آمنت بما آمن بہ جبریل" بالکل واضح ہے کہ جس پر جبریل کا ایمان ہے اسی پر ہمارا بھی ایمان ہے کیفیات ایمانی میں برابری کا بتانا مقصود نہیں ہے، "العالم والمتعلم" میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مکالمہ منقول ہے، اس سے مسئلہ پر پوری روشنی پڑتی ہے، — ابومقاتل نے امام صاحب سے کہا کہ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو ایک بات پوچھوں "کیا ہمارے لئے یہ کہنا مناسب ہے کہ ہمارا ایمان ملائکہ ورسل جیسا ہے، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ ہم سے کہیں زیادہ مطیع وفرماں بردار ہیں" امام صاحب نے فرمایا: تم جانتے ہو کہ وہ ہم سے زیادہ فرماں بردار ہیں، اور میں پہلے بتلا چکا ہوں کہ ایمان اور عمل دو الگ الگ چیزیں ہیں، ہمارا ایمان ملائکہ ورسل جیسا ایمان ہے، کیونکہ ہم وحدانیت رب اور اس کی قدرت اور اس کے پاس سے جو کچھ آیا ہے ان سب کی تصدیق کرتے ہیں، اور انھیں چیزوں کی انبیا ورسل (اور ملائکہ) بھی تصدیق کرتے ہیں، لہٰذا معلوم ہوا کہ ہمارا اور ان سب کا ایمان ایک جیسا ہے۔[1]

یہ بھی ممکن ہے کہ امام بخاری کے قول میں اس طرف اشارہ ہو کہ بغیر ان شاء اللہ کے "انا مؤمن" کہنا درست ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں اشاعرہ کہتے ہیں کہ ان شاء اللہ کہنا چاہئے اور احناف کہتے ہیں کہ کچھ ضرورت نہیں، بعضوں نے اس کو نزاع لفظی قرار دیا ہے کہ حالت راہنہ پر نظر کرتے ہوئے ان لوگوں کے نزدیک ضرورت نہیں جو کہتے ہیں کہ نہ کہا جائے اور جو لوگ ان شاء اللہ کہنے کے قائل ہیں تو وہ بنظر استقبال اور بہ لحاظ عاقبت وانجام کہتے ہیں کیونکہ اعتبار واعتداد اسی ایمان کا ہے جس پر خاتمہ ہو، اس لئے یہ کہے کہ میں انجام کے اعتبار سے ان شاء اللہ مومن ہوں۔

ابن تیمیہ نے کتاب الایمان میں لکھا ہے کہ مذہب سلف اس پر نہیں کہ ایمان کا مواخاۃ کے اعتبار سے استثناء کیا جائے، یہ متاخرین کی تدقیق ہے، بلکہ سلف کا مسلک تزکیۂ نفس کے لحاظ سے تھا جیسے کوئی "انا ولی" کہے تو اس میں ایک طرح کا ادعا پایا جاتا ہے، حالانکہ ہر مومن ولی ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اللّٰہ ولیّ الذین آمنو[2] اور اسی طرح دوسری جگہ

۲۰

(۱) آثار امام، اس سے معلوم ہوگیا کہ امام نے ایمانی کا یمان جبریل میں مومن بہ کا اتحاد مراد لیا ہے ۱۲ (جامع تقریر) (۲) بقرہ: ۲۵۷

وَيُذْكَرُ عَنِ الْحَسَنِ مَا خَافَهُ إِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا أَمِنَهُ إِلَّا مُنَافِقٌ وَمَا يُحْذَرُ مِنَ الْإِصْرَارِ

اور حسن بصری سے منقول ہے کہ نفاق سے وہی ڈرتا ہے جو مومن ہوتا ہے اور اس سے نڈر وہی ہوتا ہے جو منافق ہے

عَلَى التَّقَاتُلِ وَالْعِصْيَانِ مِنْ غَيْرِ تَوْبَةٍ لِقَوْلِ اللهِ تَعَالَى: (وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَى مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ)

اس باب میں آپس کی لڑائی اور گناہ پر اڑے رہنے اور توبہ نہ کرنے سے بھی ڈرایا گیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (سورہ آل عمران میں) فرمایا: اور وہ اپنے (برے) کام پر جان بوجھ کر نہیں اڑتے ۔

۴۶ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَرْعَرَةَ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ زُبَيْدٍ قَالَ

ہم سے بیان کیا محمد ابن عرعرہ نے کہا ہم سے بیان کیا شعبہ نے، انھوں نے زبید ابن حارث سے،

سَأَلْتُ أَبَا وَائِلٍ عَنِ الْمُرْجِئَةِ فَقَالَ حَدَّثَنِي عَبْدُ اللهِ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ

کہا میں نے ابو وائل سے مرجئہ کے بارے میں پوچھا (کہ وہ کہتے ہیں کہ گناہ سے آدمی فاسق نہیں ہوتا) انھوں نے کہا مجھ سے

وَسَلَّمَ قَالَ سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ

عبداللہ ابن مسعود نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو گالی دینے سے آدمی فاسق ہوجاتا ہے اور مسلمان سے لڑنا کفر ہے

فرمایا: وَاللهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ[1] مگر اس کے باوجود انا ولی کہنا زیب نہیں دیتا، اسی طرح "انا مؤمن" کہنے سے بھی سلف اس لئے بچتے تھے کہ اس میں بھی ایک قسم کا ادعاء پایا جاتا ہے جو ان کی شان نہیں، اس لئے ان کے نزدیک حالت راہنہ میں بھی ان شاء اللہ کہنا چاہئے۔

قولہ "مَا خَافَهُ إِلَّا مُؤْمِنٌ" الخ یعنی اللہ[2] سے نہیں ڈرتا مگر مومن، اور نڈر نہیں ہوتا مگر منافق، نووی وغیرہ میں بھی یہی ہے[3] مگر یہ صحیح نہیں، مضمون اپنی جگہ صحیح ہے مگر حسن بصری کا یہاں یہ مطلب نہیں بلکہ ان کا مقولہ اس پر ہے کہ ضمیر "خافہ" میں نفاق کی طرف راجع ہے، یعنی نفاق سے وہی شخص خوف کھاتا ہے جو مومن ہو اور اس سے وہی بیباک اور نڈر ہوتا ہے جو منافق ہو، چونکہ دیگر روایات میں بھی اسی کی صراحت ہے اس لئے یہاں ضمیر راجع الی النفاق ہی ہے اور بکثرت روایات اس بات پر شاہد ہیں کہ صحابہ کرامؓ نفاق سے بیحد ڈرا کرتے تھے، چنانچہ حضرت عمرؓ جیسے مبشر بالجنۃ شخص حضرت حذیفہؓ صاحب سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے ہیں کہ کبھی حضورؐ نے میرا نام تو منافقین میں نہیں لیا۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اگر محشر میں یہ آواز دی جائے کہ سوائے ایک کے اور کوئی جنت

---

(۱) آل عمران: ۶۸ (۲) یہاں ضمیر خافہ، کی اللہ کی طرف راجع کی، مطلب اگرچہ صحیح ہے مگر حسن بصری کا مطلب نہیں، (منہ) (۳) شرح بخاری للکرمانی۔

. . . .

میں نہ جائے گا، تو میں امید رکھوں گا کہ شاید میں ہی وہ شخص ہوں (جو جنت میں جائے گا) اور اگر یہ ندا دی جائے کہ دوزخ میں سوائے ایک شخص کے اور کوئی نہ جائے گا تو میں خوف کروں گا کہ شاید میں ہی وہ شخص ہوں (جو دوزخ میں جائے گا) تو یہ ہے ایمان اور کمال رجاء و خوف، اور جتنا ہی بڑا کوئی شخص ہوتا ہے اتنا ہی وہ اللہ سے ڈرتا ہے[1]۔

قولہ مَا یُحذر من الاصرار' یہاں جس چیز سے ڈرایا گیا ہے وہ اصرار علی المعاصی ہے' یہ ترجمۃ الباب کا دوسرا ٹکڑا ہے اس کا عطف "خوف المؤمن" پر ہے' یعنی دوسری وہ چیز جس سے مومن کو ڈرنا چاہئے وہ گناہ پر اصرار ہے جو بہت خطرناک چیز ہے "من غیر توبۃ" تفسیر ہے اصرار کی' یعنی گناہ پر اڑنا' یہ اسی وقت بولا جائے گا جب گنہگار گناہ کرتا ہے اور اس میں ایسی ندامت نہ پیدا ہو کہ وہ گناہ چھوڑ دے اور استغفار کرے' سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے "مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ" جس نے استغفار کر لیا وہ اصرار کرنے والا نہ رہا' اصرار کا مطلب ہی یہ ہے کہ آدمی ڈھیٹ ہو جائے' اللہ کی طرف جھکے ہی نہیں اور گناہ سے باز ہی نہ آئے' اسلئے ایسے شخص کو سمجھایا کہ یہ بڑی خطرہ کی بات ہے اور اس کا نتیجہ بہت خراب نکلتا ہے' اس سے قلب مُظلم بن جاتا ہے اور پھر کبھی کبھی اس کی وجہ سے ایمان بھی جاتا رہتا ہے[2] اس لئے اس سے ڈرایا گیا۔

قولہ سألت ابا وائل عن المرجئۃ' میں نے ابو وائل سے مرجئہ کے بارے میں پوچھا کہ ان کے معتقدات کیا ہیں؟ انھوں نے جواب میں یہ حدیث سنائی کہ مومن کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے قتال (لڑنا) کفر ہے' اس سے اعمال کی اہمیت معلوم ہوئی، اور برے اعمال کا مضر ہونا ثابت ہوا اور مرجئہ اسے مضر نہیں کہتے۔ [یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ امت مسلمہ میں بہت سے گمراہ فرقے پیدا ہوئے ان میں روافض اور خوارج بہت مشہور اور خطرناک ہیں' انھیں گمراہ فرقوں میں ایک گروہ مرجئہ کا ہے جن کی نسبت شہرستانی نے لکھا ہے کہ وہ عمل کو اعتقاد قلبی سے موخر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ کوئی معصیت قطعاً مضر نہیں ہے' یہ گروہ صاحب کبیرہ کے معاملہ کو قیامت پر چھوڑتا تھا اور دنیا میں اس کے جنتی یا جہنمی ہونے کا حکم نہیں لگاتا تھا یا وہ ایمان کے ساتھ کسی معصیت کو بالکل مضر نہیں مانتا تھا' اس لئے انھوں نے کہا ایمان نجات کیلئے کافی ہے' کوئی معصیت ایمان کے ساتھ نقصان نہیں پہونچا سکتی' آدمی کی مغفرت کے لئے بالکل یہ کافی ہے کہ وہ شرک سے بچا رہے اور توحید کے عقیدے پر مرے (دیکھو ملل ونحل [لمحمد ابن] عبد الکریم الشہرستانی الفصل الخامس من الباب الاول)[3] مرجئہ میں بعضوں نے

---

(۱) اسی بنا پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے واخشاکم للہ کہ تم سب سے زیادہ خشیت خداوندی میرے اندر ہے (جامع تقریر) (۲) اللہ نے قرآن میں فرمایا ثم کان عاقبۃ الذین اساءوا السوأی' روم: ۱۰ (جامع)۔ (۳) یہاں جامع تقریر نے جلد و صفحہ کی نشاندہی کی ہے مگر اس کتاب کے اڈیشن متعدد ہیں اسلئے ہم نے اسکو بدل دیا، ۱۲،

۴۷ — حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ حَدَّثَنَا إِسْمٰعِيلُ بْنُ جَعْفَرٍ عَنْ

ہم سے بیان کیا قتیبہ ابن سعید نے، کہا ہم سے بیان کیا اسمٰعیل ابن جعفر نے، انھوں نے حمید سے

حُمَيْدٍ عَنْ أَنَسٍ قَالَ أَخْبَرَنِي عُبَادَةُ بْنُ الصَّامِتِ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

انھوں نے انس سے، کہا مجھ کو خبر دی عبادہ ابن صامت نے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (اپنے حجرے سے)

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ يُخْبِرُ بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ فَتَلَاحَى رَجُلَانِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ فَقَالَ

نکلے (لوگوں کو) شب قدر بتانا چاہتے تھے (کہ وہ کون سی رات ہے) اتنے میں دو مسلمان لڑ پڑے، آپ نے فرمایا:

یہاں تک کہدیا کہ دل میں اگر ایمان ہے تو زبان سے کفر تک بک دینے سے اسے کچھ نقصان نہیں پہونچتا (۱) — یہ تھے مختصر نظریئے مرجئہ کے۔

یہ جان لینے کے بعد بخاری کی تردید آسانی سے سمجھ میں آئے گی کہ بدعملی سے نقصان ہوتا ہے، اسی لئے وہ یہاں ابو وائل (جن کا نام شفیق ابن سلمہ تھا اور وہ کبار علمائے تابعین میں سے تھے) کی بات نقل کرتے ہیں جس سے مسلک مرجئہ کی تردید مقصود ہے] (۲)

مرجئہ کو مرجئہ اس لئے کہتے ہیں کہ انھوں نے عمل کو پیچھے ڈال دیا اور ایمان سے اس کا کوئی لگاؤ باقی نہیں رکھا (ارجاء کے معنی ہی موخر کرنے اور پیچھے ڈال دینے کے ہیں) ابن قتیبہ نے اور اسی طرح غوث اعظم نے غنیۃ الطالبین میں جو احناف کو مرجئہ میں شمار کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ احناف فرقہ ضالہ میں سے ہیں، کیونکہ یہ تو واقعہ کے خلاف ہے اور ایسے معتمد علیہ بزرگ کی شان نہیں کہ وہ خلاف واقعہ بات کہدیں، اس سلسلہ کی صحیح بات وہ ہے جس کو [محمد بن] عبدالکریم شہرستانی نے ملل ونحل میں کہی ہے کہ دراصل مرجئہ کہلانے والے دو قسم کے لوگ ہیں، ایک عمل کے اعتبار سے، جو کہتے ہیں کہ عمل جزو ایمان نہیں، دوسرے عقائد کے اعتبار سے جن کا کہنا یہ ہے کہ عمل ضروری نہیں بلکہ صرف ایمان نجات کے لئے کافی ہے۔ احناف کو جن لوگوں نے مرجئہ کہدیا ہے وہ پہلے گروہ میں آتے ہیں اس لئے کہ احناف کے نزدیک عمل جزو ایمان نہیں، نیز وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ترک عمل مضر ہے اور اس سے نقصان ہوتا ہے، احناف کہتے ہیں کہ صاحب ذنوب کبیرہ [مستحق عذاب ہے اور یوں اللہ معاف کردے تو یہ اس کا کرم ہے] تو جزو ایمان نہ ماننے کی بنا پر کچھ لوگوں نے انھیں مرجئہ کہدیا۔ اور دوسرے مرجئہ وہ ہیں جو عقیدہ رکھتے ہیں کہ عمل ضروری نہیں اور کبائر سے کوئی نقصان نہیں پہونچتا، صرف ایمان ہو تو بلا کسی سزا کے آدمی کی نجات یقینی ہے، اسی بنا پر یہ مرجئہ فرق ضالہ میں شمار ہوتے ہیں اور انھیں کی تردید امام بخاری

---

(۱) الملل والنحل لابن حزم (۲) اضافہ از جامع تقریر یہ ترمیم مرتب ۱۲

إِنِّي خَرَجْتُ لِأُخْبِرَكُمْ بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ وَإِنَّهُ تَلَاحَى فُلَانٌ وَفُلَانٌ فَرُفِعَتْ وَعَسَى [1]

میں تو اس لئے باہر نکلا تھا کہ تم کو شب قدر بتاؤں اور فلاں فلاں آدمی لڑ پڑے تو وہ (میرے دل سے) اٹھالی گئی، اور

أَنْ يَكُونَ خَيْرًا لَكُمْ فَالْتَمِسُوهَا فِي السَّبْعِ وَالتِّسْعِ وَالْخَمْسِ

شاید اسی میں تمہاری کچھ بہتری ہو، اب تم اسے ستائیس ۲۷، انتیس ۲۹ اور پچیس ۲۵ رمضان کی راتوں میں تلاش کرو۔

کر رہے ہیں۔[1]

تنبیہ: ذہبی نے تصریح کی ہے کہ "غنیۃ الطالبین" حضرت غوث الاعظم کی تصنیف ہے مگر اس میں لوگوں نے دسائس شامل کردئے ہیں، جیسے فتوحات مکیہ للشیخ الاکبر میں زنادقہ نے بہت سے دسائس شامل کردئے ہیں۔

قولہ سَبَابُ المسلمِ فسوقٌ وقتالہ کفر مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے قتال کفر ہے، بخاری کی غرض اس سے مرجئہ کی تردید ہے کہ دیکھو بدعملی مضر ثابت ہو رہی ہے، اور یہاں کفر سے مراد کفرٌ دُون کفرٍ ہے، اس پر یہ اشکال پیدا ہو رہا ہے کہ کفر دون کفر دونوں ہیں، قتال بھی اور سباب بھی، یہاں فسوق کے مقابلہ میں لفظ کفر لانا بتلاتا ہے کہ کفر سے کفر ہی مراد ہے، اور بظاہر اس سے خوارج کی تائید نکلتی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ فسق دونوں ہیں سباب بھی اور قتال بھی، مگر چونکہ قتال سباب سے اشد ہے اس لئے تعبیر میں اغلظ لفظ کا استعمال کیا گیا، اصل میں تو دونوں فسوق تھے مگر یہ بتلانے کے لئے کہ دوسرا فسوق اشد ہے، یوں تعبیر کردی تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس میں مراتب ہیں اور اس سے فرقہ ضالہ مرجئہ کے عقیدے کی تردید بھی ہو جائے۔

حدیث ۴۷. قولہ خرج یخبر بلیلۃ القدر الخ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے لیلۃ القدر متعین طور پر بتلادی گئی تھی

---

(۱) حضرت استاذ مرحوم کے بیان کو جامع تقریر کما حقہ ضبط نہیں کرسکے، شہرستانی کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ غسان کوفی جو مرجئہ کا زعیم تھا اس کا قائل ہے کہ ایمان صرف اللہ اور اس کے رسول کی معرفت کا اور اجمال کے ساتھ مَا انزلَ اللہ اور مَا جَاءَ بہ الرَّسُول کے اقرار کا نام ہے، اس کے بعد شہرستانی کہتے ہیں یہ عجیب بات ہے کہ غسان اپنے مذہب کے موافق امام ابو حنیفہ کا قول بھی نقل کرتا ہے، شاید وہ اس بارے میں جھوٹا ہے پھر قسم کھا کر کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب مرجئۃ السنۃ (سنی مرجئہ) کہلاتے تھے، یعنی مرجئہ ضالہ میں ان کو کوئی شمار نہیں کرتا تھا، مرجئہ کہنے کا شاید یہ سبب ہے کہ وہ کہتے تھے ایمان صرف تصدیق بالقلب کا نام ہے اور وہ گھٹتا بڑھتا نہیں، اس سے لوگوں نے گمان کرلیا کہ وہ عمل کو ایمان سے مؤخر کرتے ہیں (جس طرح مرجئہ ضالہ مؤخر کرتے ہیں) حالانکہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ عمل میں اتنی محنت مشقت کرنے کے ساتھ وہ ترک عمل کا فتوی دیں۔ دوسرے ان کو مرجئہ میں شمار کرنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ فرقہ قدریہ اور معتزلہ (جن کا ظہور صدر اول میں ہو چکا تھا) کی سخت مخالفت کرتے تھے اور معتزلہ ہر اس شخص کو مرجی کہتے تھے جو مسئلہ قدر میں انکی مخالفت کرتا تھا، یہی حال وعیدیہ (خوارج) کا بھی تھا تو کچھ بعید نہیں کہ یہ لقب انہیں خوارج و معتزلہ کی دین ہو (الملل والنحل الفصل الثانی من الباب الاول تحت عنوان الغسانیہ)

باب ۳۷ سُؤَالِ جِبْرِيْلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْاِيْمَانِ وَالْاِسْلَامِ وَالْاِحْسَانِ وَعِلْمِ السَّاعَةِ

حضرت جبریل کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا کہ ایمان کیا ہے، اسلام کیا ہے اور قیامت جانتے ہو (کب آئے گی؟)

اور بظاہر اس رمضان میں جو لیلۃ القدر تھی اس کی تعیین بتلائی گئی تھی، صحابہ کو اس کی خبر دینے کے لئے آپ نکلے تو دو آدمی لڑ رہے تھے، ایک کعب ابن مالک تھے، دوسرے ابن ابی حذرد اسلمی، ان میں سے ایک کا قرض دوسرے پر تھا، حضور معتکف تھے، آپ نے ان میں صلح کرادی ایک سے کہا کہ نصف معاف کردو، انھوں نے معاف کردیا، دوسرے سے کہا: بقیہ ادا کردو، جھگڑا تو ختم ہوگیا مگر اس دوران آپ کے ذہن مبارک سے وہ بات نکل گئی جس کو بتانے کے لئے آپ نکلے تھے، آپ نے فرمایا کہ اس جھگڑے کی وجہ سے لیلۃ القدر کا علم اٹھالیا گیا، مقصود تنبیہ تھی کہ جھگڑا اور نزاع حرمان کا باعث ہوگیا۔

قولہ وعسیٰ ان تکون خیرا لکم (شاید اسی میں تمہارے لئے بہتری ہو) نزاع اور جدال کی نحوست کے سبب تعیین بھلا دی گئی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت کے سبب اس میں بھی خیر کا پہلو باقی رکھا، اس لئے آپ نے فرمایا کہ من وجہ یہ بھی نافع اور باعث خیر ہے شیعوں کا یہ دعویٰ کہ لیلۃ القدر ہی اٹھالی گئی، غلط ہے، اس لئے کہ آپ نے اس کے بعد فرمایا: "التمسوھا فی السبع والتسع والخمس" یہ تلاش اور تجسس کا حکم کیوں دیا گیا؟ اگر لیلۃ القدر بالکلیہ اٹھالی جاتی تو حضورؐ یہ کبھی نہ فرماتے کہ ستائیسویں ۲۷، انتیسویں ۲۹ اور پچیسویں ۲۵ راتوں میں تلاش کرو، اس سے صاف واضح ہے کہ صرف تعیین اٹھائی گئی اور اصل باقی رہی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ معاصی سے ڈرنا چاہئے ورنہ اعمال کے حبط ہونے کا خطرہ ہے۔

باب ۳۷ سؤال جبریل الخ

اس باب میں حدیث جبریل کا بیان ہے جس میں مذکور ہے کہ انھوں نے ایک رجل کی صورت میں آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چند سوالات کئے اور آپ نے ان سب کا جواب بھی دیا، البتہ قیامت کے متعلق آپ نے فرمایا کہ مجھے اس کی تعیین معلوم نہیں، ہاں اس کی نشانیاں معلوم ہیں، جنھیں آپ نے بیان بھی فرمایا، آخر میں صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ یہ جبریل تھے، جو تمھیں دین سکھلانے کے لئے آئے تھے۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں صراحت کی ہے کہ یہ حضور کی آخری عمر کا واقعہ ہے، وہ ایک احتمال کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "وھو مردود بما رواہ ابن مندہ فی کتاب الایمان باسنادہ الذی علی شرط مسلم من طریق سلیمان التیمی"

وبیانِ النّبیّ صلّی اللہُ علیہِ وسلّم لہٗ ثمّ قال جاءَ جبریلُ علیہِ السّلام یُعلّمُ دینکم

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان باتوں کو ان سے بیان کرنا، پھر یہ فرمانا کہ یہ جبریل علیہ السلام تھے جو تمہارا دین تم کو سکھانے

فجعل ذٰلک کلّہٗ دِیناً وما بیّن النّبیّ صلّی اللہُ علیہِ وسلّم لوفدِ عبدِ القیس

آئے تھے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب باتوں کو دین فرمایا، اور اس باب میں اس کا بھی بیان ہے جو

مِنَ الْاِیمانِ وقولِہٖ تعالیٰ (ومن یّبتغ غیرَ الاسلامِ دیناً فلن یُّقبلَ مِنہُ)

آپؐ نے عبدالقیس (قبیلے) کے پیغام پہونچانے والوں کو ایمان کے معنی بتلائے اور اللہ تعالیٰ نے (سورۂ آل عمران میں) فرمایا:

اور جو کوئی اسلام کے سوا دوسرا کوئی دین چاہے تو ہرگز قبول نہ ہوگا اس کی طرف سے۔

فی حدیث عمر اولہ ان رجلا فی اخر عمر النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم جاء الی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم (۱) اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایک احتمال یہ ہے کہ حجۃ الوداع کے بعد کا یہ قصہ ہو" ویحتمل ان یکون بعد حجّۃ الوداع فانھا اخر سفراتہ ثم بعد قدومہ بقلیل دون ثلاثۃ اشھر مات" یہ سفر حضور کا آخری سفر تھا اور حجۃ الوداع میں تکمیل دین کا اعلان ہو چکا تھا" الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً"(۲) اس سفر سے واپسی پر تین ماہ بھی نہ گذرے تھے کہ آپ رفیق اعلیٰ سے جا ملے ــــ آگے حافظ لکھتے ہیں کہ [وکانہ] انما جاء (جبریل) بعد انزال جمیع الاحکام لتقریر امور الدین التی بلغھا متفرقۃ، فی مجلس واحد لتنضبط، جبریل علیہ السلام تمام احکام کے نزول کے بعد جبکہ دین مکمل ہو چکا تھا حاضر خدمت ہوئے، تاکہ جو احکام اور شریعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو مختلف اوقات میں پہونچائے تھے ان سب کو مجملاً ایک ہی مجلس میں بیان کر دیں تاکہ وہ منضبط ہو جائیں اور یہ خلاصہ ذہنوں میں محفوظ رہے اور امت کو یاد رکھنا آسان ہو جائے ــــ حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جبریل امین کو کسی نے نہیں پہچانا بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نہیں پہچانا کما سیاتی۔

اس حدیث سے امام بخاری نے یہ بات اخذ کی کہ اسلام، ایمان، اور احسان یہ سب دین میں شامل ہیں اور یہ مجموعہ دین ہے ــــ ایک چیز یہ ہوئی ــــ دوسری اس چیز کا ذکر جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد عبدالقیس سے ایمان کے بارے میں بیان فرمائی تھی۔ جس کا یہاں صرف حوالہ ہے، آگے پوری حدیث "باب اداء الخمس من الایمان" میں آئے گی، تو جبریلؑ کی حدیث سے معلوم

---

(۱) فتح الباری ج ۱، ص ۸۸ طبع خیریہ (۲) مائدہ : ۳

۴۸ ـ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا اِسْمٰعِیْلُ بْنُ اِبْرَاهِیْمَ اَخْبَرَنَا اَبُوْحَیَّانَ

ہم سے بیان کیا مسدد نے کہا ہم سے بیان کیا اسمٰعیل ابن ابراہیم نے، کہا ہم کو خبر دی ابوحیان تیمی نے

التَّیْمِیُّ عَنْ اَبِیْ زُرْعَةَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَارِزًا

انھوں نے ابوزرعہ سے، انھوں نے ابوہریرہؓ سے، انھوں نے کہا (ایسا ہوا) ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں سامنے

یَوْمًا لِلنَّاسِ فَاَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ مَا الْاِیْمَانُ قَالَ الْاِیْمَانُ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ

بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں ایک شخص آیا اور پوچھنے لگا: ایمان کسے کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ تو اللہ اور اسکے

وَبِلِقَائِهٖ وَرُسُلِهٖ وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ ،

فرشتوں کا اور اس سے ملنے کا اور اس کے پیغمبروں کا یقین کرے، اور مر کر جی اٹھنے کو مانے،

ہوا کہ سب اشیاء دین میں داخل ہیں اور وفد عبدالقیس والی حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ سب ایمان میں داخل ہیں [لہٰذا معلوم ہوا کہ اسلام اور ایمان دونوں ایک ہیں ـــ اس کے بعد امام بخاری یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام اور دین ایک ہیں، اس لئے یہ آیت لائے ہیں:] وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا الاٰیۃ، اس سے معلوم ہوا کہ دین صرف اسلام ہے ـــ ان تینوں کے مجموعہ سے معلوم ہوا کہ ایمان، اسلام، احسان وغیرہ سب ایک ہیں، جو چیزیں یہاں دین کے عنوان سے بیان کی گئی ہیں وہی دوسری حدیث میں ایمان کے عنوان سے بیان ہوئیں اور اسی کو قرآن میں اسلام کہا گیا، معلوم ہوا کہ سب ایک ہی ہیں۔

حدیث ۴۸، قولہ مَا الْاِیْمَانُ الخ یہ حدیث بہت عظیم الشان ہے، قرطبی نے کہا ہے کہ جس طرح سورہ فاتحہ ام الکتاب ہے، کیونکہ وہ پورے قرآن کا خلاصہ اور اس کا نچوڑ ہے، اسی طرح یہ حدیث بھی اس لائق ہے کہ اس کو ام السنۃ کہا جائے کیونکہ یہ بھی تمام احادیث کا خلاصہ ہے، اس میں روحانیت کے شعبے اور عبادات کے مراتب سب درج ہیں [حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے] تیئس ۲۳ سال کے عرصہ میں جو کچھ فرمایا یہ حدیث ان سب کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔

یہ پہلے آچکا ہے کہ بعض روایات میں تصریح ہے کہ یہ واقعہ بالکل آخری عمر کا ہے، اور آخری عمر سے مراد شاید یہ ہے کہ حجۃ الوداع کے بعد تین ماہ کا جو عرصہ ہے اس میں یہ واقعہ پیش آیا ہے، دین کی تکمیل حجۃ الوداع میں عرفہ کے موقع پر ہوئی اور یہ ظاہر ہے کہ خلاصہ بیان کرنا تکمیل دین کے بعد ہی ہو سکتا ہے، اس لئے اسے اخیر عمر کا واقعہ قرار دیا۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ کوئی مقرر دو گھنٹے تقریر کرے اور آخر میں کہے کہ خلاصہ تقریر یہ ہے۔ تاکہ اگر تفصیل نہ محفوظ رہے تو خلاصہ یاد رہے، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں سب کا خلاصہ بیان فرما دیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے جبریل علیہ السلام کو بھیج کر سوالات کرائے اور حضورؐ نے نہایت کامل جوابات دیتے ہوئے دین و شریعت کا خلاصہ بیان فرما دیا

قَالَ مَا الْاِسْلَامُ ؟ قَالَ الْاِسْلَامُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكَ بِهٖ وَتُقِيْمَ الصَّلٰوةَ وَ

اس نے پوچھا: اسلام کیا ہے ؟ آپ نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ اللہ کو پوجے، اس کے ساتھ شریک نہ کرے، نماز کو ٹھیک کرے اور

تُؤَدِّیَ الزَّكٰوةَ الْمَفْرُوْضَةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ ۔ قَالَ مَا الْاِحْسَانُ ؟ قَالَ اَنْ

فرض زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے، اس نے پوچھا: احسان کیا ہے ؟ آپ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ اللہ کو

تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ

ایسا (دل لگاکر) پوجے جیسا کہ تو اس کو دیکھ رہا ہے

کیونکہ ایمان جملہ عقائد کا خلاصہ ہے اور اسلام احکام فقہیہ اور ارکان و اعمال کا اور احسان سلوک و تصوف اور تزکیۂ نفس کا۔

ابحاث فلسفیہ جو متکلمین نے بیان کئے ہیں مثلاً مسئلہ جزو لایتجزی وغیرہ ان کا ذکر نہیں، البتہ جتنے عقائد ہیں وہ ایمان کی تفصیل ہیں اور سب افعال و اعمال اسلام کی تفصیل ہیں اور سارا تصوف و ریاضیات اور اسرار و حکم وغیرہ جو کچھ بھی ہیں، وہ سب احسان کی تفصیل میں؛ اسی بنا پر یہ حدیث بہت ہی قابل اعتنا ہے ـــ غالباً یہی وجہ ہے کہ امام مسلم نے اصل کتاب اسی حدیث جبریل سے شروع کی ہے [علامہ طیبی نے کہا، قرآن کی ابتدا سورۂ فاتحہ سے کی گئی جو ام الکتاب ہے غالباً اسی کی پیروی میں امام بغوی نے اپنی دونوں کتابوں (شرح السنۃ اور مصابیح) کا افتتاح حدیث جبریل سے کیا، اس لئے کہ وہ ام السنۃ ہے]۔

کلام اس میں بہت طویل ہے اور کافی بسط چاہتا ہے، اگر میں اپنی بساط کے مطابق بیان کروں تو کم از کم پندرہ دن تک بیان جاری رہے گا، مگر گنجائش نہیں اس لئے مختصراً کچھ کہتا ہوں۔

قولہ بارزًا یعنی نمایاں تھے کہ ہر شخص پہچان لے ـــ قصہ اس کا یہ ہے کہ پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب میں ملے جلے بیٹھتے تھے، اس لئے اجنبی آدمی کو شناخت میں دقت ہوتی تھی اور اس کو پوچھنا پڑتا تھا کہ من محمد فیکم، تم میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں بعد میں صحابہ نے ہی عرض کیا کہ حضور اجازت دیں تو ہم ایک دُکّان (چبوترہ) بنا دیں اور آپ اسی پر تشریف فرما ہوں، تاکہ ہر دیکھنے والا بغیر پوچھے آپ کو پہچان لے، آپ نے اجازت مرحمت فرمادی، چنانچہ صحابہؓ نے ایک چبوترہ بنا دیا، اسی پر آپ تشریف فرما ہونے لگے، اس وقت بھی غالباً اسی چبوترہ پر تشریف فرما ہوں گے، اس لئے لفظ بارزًا استعمال کیا، جس کا ہم نے "نمایاں" ترجمہ کیا تاکہ مفہوم واضح ہو جائے اور حضورؐ کی نشست کا خاکہ ذہن میں آجائے، یہیں سے یہ مسئلہ نکالا گیا کہ اگر اہل علم کو نمایاں جگہ پر اور مخصوص مقام پر بٹھایا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ ـــ فَاَتَاهُ رَجُلٌ یعنی آدمی کی صورت میں ایک صاحب آئے اور سوال کیا۔

مَا الْاِیْمَانُ ؟ ایمان کیا ہے ؟ یہ مختصر حدیث ہے اور بروایت ابوہریرہ ہے، امام مسلم نے بھی اسی حدیث کو ذکر کیا ہے۔

. . . .

گروہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے، اس میں یہ ہے کہ آنے والا آدمی آکر بیٹھ گیا واسند رکبتیہ الی رکبتیہ اور اپنے گھٹنے آپ کے گھٹنے سے ٹیک دئے، یعنی اس قدر قرب ہوا کہ اس کے گھٹنے اور آپ کے گھٹنے مل گئے ووضع کفیہ علی فخذیہ ضمیر "فخذیہ" کی کدھر راجع ہے؟ اس میں دو قول ہیں، اکثر کہتے ہیں کہ ضمیر اسی رجل کی طرف راجع ہے، یعنی آنے والے نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی دونوں رانوں پر رکھ لئے جس طرح باادب آدمی بڑوں کے سامنے بیٹھتا ہے، یہ بھی مودب بیٹھا۔ اگر ضمیر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع کریں تو اس وقت ترجمہ ہوگا (اپنے دونوں ہاتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں رانوں پر رکھ دئے) یہ ہیئت گونہ بے ادبی کی ہے اور جبریل سے یہ مستبعد معلوم ہوتا ہے لہٰذا ادھر ضمیر راجع نہ ہونی چاہئے، مگر یاد رہے کہ بعض روایات میں "فخذی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کی تصریح ہے، یعنی اپنے ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں رانوں پر رکھ دئے ــــ یہ حدیث بھی صحیح ہے، حافظ نے فتح الباری میں اس کو نقل کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ رجل کی طرف ضمیر کا راجع کرنا بھی صحیح ہے اور وہ روایت جس میں "فخذی النبی صلی اللہ علیہ وسلم" ہے وہ بھی صحیح ہے ــــ صورت یہ ہوئی ہوگی کہ اولاً اپنے ہاتھ اپنی رانوں پر رکھے ہوں گے، چنانچہ بعض روایات میں ہے: ایسے بیٹھے جیسے ہم نماز میں بیٹھتے ہیں، پھر کچھ بے تکلف ہوتے گئے اور آگے بڑھتے گئے یہاں تک کہ حضورؐ کی رانوں پر ہاتھ رکھ دئے ــــ بعض روایات میں آیا ہے "قال ادنو یا محمد؟ قال ادن" پوچھا: میں اور قریب آجاؤں؟ آپ نے فرمایا قریب آجاؤ، اور یہ کئی بار ہوا، اس سے یہ منظر بنتا ہے کہ پہلے تو آکر اس طرح مودب بیٹھے جیسے شاگرد، استاد کے سامنے بیٹھتا ہے، اس وقت ان کے ہاتھ خود اپنے رانوں پر تھے پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے اور بے تکلفی آتی گئی حتی کہ بالکل قریب پہونچ گئے اور دونوں کے گھٹنے مل گئے اور اب انھوں نے اپنے ہاتھ اپنی رانوں سے اٹھا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رانوں پر رکھ دئے ــــ اس طرح جملہ روایات میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے اور مجلس کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے، اور مقصود یہ تھا کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ یہ آنے والا کون ہے اس لئے تعمیہ اور چھپانے کی پوری سعی کی گئی تا کہ کوئی پہچان نہ سکے، یہی وجہ ہے کہ کہیں "یا محمد" کہہ کر مخاطب کیا اور کہیں "یا رسول اللہ"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل بدو اور غیر متمدن لوگ "یا محمد" کہکر خطاب کرتے تھے اور اہل مدینہ اور متمدن لوگ "یا رسول اللہ" کہکر متوجہ کرتے تھے۔ جبرئیل علیہ السلام دونوں الفاظ کہتے تھے تاکہ یہ نہ معلوم ہو سکے کہ کہاں کے باشندے ہیں۔ اسی طرح بعض روایات میں ہے کہ آنے کے بعد السلام علیک کہا جو اہل تہذیب کا شعار ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ تخطی رقاب کرتے ہوئے آئے جو اہل تہذیب کے طریقے کے خلاف تھا، ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے کو مخفی رکھنا مقصود تھا۔

حضرت عمرؓ کہتے ہیں: شدید بیاض الثوب شدید سواد الشعر لا یری علیہ اثر السفر ولا یعرفہ منا احد[1]

---

(۱) مسلم ص ۲۷ ج ۱ کتاب الایمان

. . . .

کپڑے بہت اجلے اور صاف تھے، بال نہایت سیاہ تھے، اس پر سفر کا کوئی اثر اور علامت نظر نہیں آتی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ [مسافر اور باہر کا آدمی نہیں ہے ورنہ گرد و غبار اور کپڑے ناصاف ہوتے، بلکہ مقامی باشندہ ہے] لیکن ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا نہ تھا، یہ علامت تھی کہ باہر کا کوئی آدمی ہے۔

بعض روایات میں ہے: كان اطيب ريحاً وانظف ثوباً بہترین خوشبو لگائے تھا اور نہایت ستھرے کپڑے پہنے تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ بہت سلیقہ مند اور بیحد مہذب ہے جو آداب مجلس سے پوری طرح باخبر ہے، یہ بھی تعمیہ تھا ـــ حدیث میں یہ بھی ہے کہ سوال کیا: ماالایمان؟ جب حضورؐ نے جواب دیا تو کہا صَدَقتَ یعنی آپ نے سچ کہا، جیسے اردو محاورے میں "ٹھیک ہے" کہا جاتا ہے۔ صحابہ کہتے ہیں فعجبنا له يسأله ويصدقه ہمیں تعجب ہوا کہ سوال بھی کرتے ہیں جو علامت نہ جاننے کی ہے اور تصدیق بھی کرتے ہیں جو علامت ہے واقفیت کی۔ یہ بھی تعمیہ ہے ـــ غرض ہر مرحلہ پر کوشش کی گئی ہے کہ کسی کو پتہ نہ چلے ـــ ابن حبان میں ہے: فوالذی نفسی بيده ماشبه علیّ منذ اتانی قبل مرتی هذه وما عرفته حتی ولّی، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے جبرئیل جب سے آنے لگے کبھی ان کا آنا مجھ پر مشتبہ نہیں ہوا سوائے اس مرتبہ کے کہ میں انھیں پہچان نہ سکا، جب وہ چلے گئے تو معلوم ہوا[1]۔ وفی رواية ابی فروة والذی بعث محمداً بالحق ما كنت با علم به من رجل منكم وانه لجبريل[2] وفی حديث ابی عامر ثم ولّی فلما لم نر طريقه قال النبی صلی الله عليه وسلم سبحان الله هذا جبريل جاء ليعلم الناس دينهم والذی نفس محمد بيده ما جاءنی قط الّا وانا اعرفه الا ان تكون هذه المرة[3] ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوا کہ معاملہ بالکل مخفی رکھا گیا، یہاں تک کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو تیئیس سالہ جان پہچان کے باوجود پہچان نہ سکے، جب وہ چلے گئے تب معلوم ہوا کہ جبرئیل تھے، جو امت کو دین سکھانے آئے تھے ـــ اخفاء کا اس قدر اہتمام کیا گیا، ممکن ہے اس سے یہ بتانا منظور ہو کہ سارے علوم و معارف ختم کر دئے، دین مکمل کر دیا گیا مگر پھر بھی بندہ کا حال یہ ہے کہ اس کے پاس اپنی ذات سے کچھ نہیں ہے، سب کچھ عطائے خداوندی ہے وہ اگر چاہے تو محسوس و مشاہد کا علم بھی واپس لے لے، وہ اپنی قدرت دکھاتا ہے کہ اگر ہم چاہیں تو سب کچھ واپس لے لیں ـــ نسائی کی روایت میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام دحیہؓ کی شکل میں تھے، مگر حافظ نے تصریح کی ہے کہ نسائی کی روایت کا یہ لفظ راوی کا وہم ہے، ورنہ حضورؐ کیوں نہ پہچانتے، اور صحابہؓ لا يعرفه منا احد کیوں کہتے؟ یعنی ہم میں سے کوئی ان کو پہچانتا نہ تھا ـــ اس سے سبق ملا کہ جب شاہدات

(۱، ۲، ۳) فتح الباری ص ۱۱۵ ج ۱

. . . .

کا علم جو بصر سے تعلق رکھتا ہے واپس لے لیا جا سکتا ہے، تو حقائق و معارف تو غیر محسوس چیزیں ہیں، ان کا علم بطریق اولیٰ سلب ہو سکتا ہے، چنانچہ قرآن میں فرمایا ہے: ولئن شئنا لنذهبن بالذی اوحینا الیک ثم لا تجد لک به علینا وکیلا ۝[1] آگے فرمایا: الا رحمة من ربک ط[2] یعنی ہم ایسا کریں گے نہیں مگر کر سکتے ہیں، اس کا یہ ایک نمونہ دکھلا دیا۔

حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ[3] فرماتے تھے اور قسم کھاتے تھے کہ میرے پاس ایک شخص فتویٰ لایا اور کہا کہ دستخط کر دو، میں نے دستخط کرنے کا ارادہ کیا لیکن میں اپنا نام بھول گیا، بہتیرا سوچا مگر یاد نہیں آیا ــــ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک بار میں اپنا مکان بھول گیا اور منٹوں سوچتا رہا اور غور کرتا رہا کہ کون سا مکان ہے اور کدھر جاؤں، اس پر مجھے یہ حدیث یاد آگئی۔

چونکہ آپ کو علم کامل دیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد گرامی ہے عُلِّمْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ، مجھے اولین و آخرین کا علم دیا گیا ہے اس لئے ایک نمونہ اس کا بھی دکھلا دیا گیا کہ ہم اس کے واپس لینے پر ہر وقت قادر ہیں، جس کا علم چاہیں دیکر واپس لے لیں، خواہ نبی ہو یا ولی ــــ اور یہ تمہید ہے کہ علم الساعۃ آپ کو نہیں تھا، تو اس سے تنقیص شان نبوی نہیں نکلتی۔

یہ بھی یاد رکھو کہ اگر نسائی کی روایت کو وہم راوی نہ بھی مانا جائے اور یہ کہا جائے کہ جبرئیلؑ دراصل دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں آئے تھے تو بھی مستبعد نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ پہلے سے دحیہ کلبیؓ مجلس میں موجود ہوں تو اب کیسے سمجھتے کہ یہ جبرئیل ہیں، بہرحال اس صورت میں بھی "لا یعرفه منا احد" صحیح ہے۔

قال الایمان ان تؤمن بالله الخ یعنی اس کے موجود ہونے پر اور اس کے تمام کمالات و محاسن پر اور اس پر کہ وہ سب کا منبع ہے اور تمام نقائص سے منزہ ہے۔

یہاں پر جواب میں بھی ایمان کا لفظ فرمایا، تو بعضوں نے کہا کہ سوال ایمان شرعی کا تھا اور "ان تؤمن" میں ایمان لغوی مراد لے کر جواب دیا ای ان تصدق بالله جیسا کہ قرآن میں ہے: "وما انت بمؤمن لنا"[4] ای بمصدق لنا یہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اس وقت کہا تھا جب وہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈال کر رات میں روتے ہوئے اپنے باپ کے پاس آئے تھے اور کہا تھا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا، اس کے بعد کہا آپ ہماری بات کی تصدیق نہ کریں گے، یعنی نہ مانیں گے اگرچہ ہم سچے ہیں ــــ تو یہاں ایمان کے لغوی معنی تصدیق کے مراد ہیں۔ اسی طرح حضورؐ نے سائل کو جواب دیا کہ تم ایمان لاؤ، یعنی تصدیق کرو، الخ۔

---

(۱) بنی اسرائیل : ۸۶ (۲) بنی اسرائیل : ۸۷ (۳) سابق صدر مدرس دار العلوم دیوبند (۴) یوسف : ۱۷

بعضوں نے کہا سوال نفس ایمان کا نہ تھا متعلقات ایمان کا تھا [یعنی ایمان کی تعریف نہیں پوچھ رہے تھے بلکہ اس کے متعلقات کو پوچھ رہے تھے کہ کن کن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے] اس کا جواب دیا کہ [اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی لقاء اور اس کے رسل وغیرہ پر ایمان لانا ضروری ہے] ملائکہ پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی ایسی مخلوق ہیں جو اس کے حکم پر کام کرتے ہیں اور سفراء الرحمن ہیں، اور عباد مکرمون ہیں.

قولہ وبلقائہ یعنی اللہ سے ملنے پر ایمان رکھنا، بعض نے کہا کہ اس سے رویت باری مراد ہے یعنی یہ کہ رویت باری حق ہے، آگے یہ بات کہ رویت کس کو ہوگی؟ اس کا علم اللہ کو ہے.

قولہ ورسلہ، رسولوں پر ایمان لانا یعنی وہ معصوم ہیں، اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتے، جو حکم خداوندی ہوتا ہے اسی کو بیان کرتے ہیں اور یہ سمجھاتے ہیں کہ جو کچھ خدا کی طرف سے ہے وہ سب حق ہے اور ہر حال میں حق کہنا ہمارا کام ہے، قرآن میں آخری نبی کے بارے میں فرمایا گیا: وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ (۱) یعنی وہ اپنی خواہش سے نہیں کہتے جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ وحی الٰہی ہوتی ہے جو ان کے پاس پہونچتی ہے، اسی کو وہ بیان کرتے ہیں خواہ وحی جلی ہو یا وحی خفی ___ ایک بزرگ نے اسی کو یوں کہا ہے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود * گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

قولہ وتؤمن بالبعث. بعث: قبور سے اٹھانا، یعنی اس کو بھی مانو کہ ایک وقت آئے گا جب یہ دنیا اپنی عمر پوری کرلے گی اور اسے فنا کردیا جائے گا، پھر دوبارہ ساری مخلوق پیدا کی جائے گی اور اللہ کے دربار میں حاضری ہوگی، پھر اس دنیا میں جو کچھ اچھا یا برا کیا ہے سب سامنے آئے گا اور پھر فیصلہ ہوگا، نیکیوں پر انعام اور بدیوں پر عتاب ہوگا.

قولہ قال ما الاسلام الخ یہاں روایت میں اَنْ تَعْبُدَ اللہَ ہے اور بعض روایات میں ان تشهد ان لا الٰہ الا اللہ ہے اور "تعبد" سے مراد بھی کلمہ ہی پڑھنا ہے کیونکہ یہ "ما الاسلام" کا جواب ہے ___ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اسلام مثل بدن کے ہے اور ایمان مثل روح کے، اور یہ موقع تھا کہ دونوں چیزوں کی پوری تفریق اور تعریف کی جائے، اس لئے وہ فرق واضح کردیا گیا، ہاں تجوزاً اطلاق ایک کا دوسرے پر ہوجاتا ہے.

(۱) النجم : ۳، ۴

فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ ، قَالَ مَتَى السَّاعَةُ ؟

اگر یہ نہ ہو سکے تو اتنا تو خیال رکھو کہ وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے ، اس نے کہا قیامت کب آئے گی ؟

حافظ ابن رجب حنبلی نے ایک لفظ کہا ہے ، وہ کہتے ہیں : اذا اجتمعا افترقا واذا افترقا اجتمعا ۔ یعنی جب دونوں کی تشریح ایک ساتھ ہو تو دونوں الگ الگ معنی رکھتے ہیں ، اور جب دونوں علٰحدہ علٰحدہ بولے جاتے ہیں تو ایک کا اطلاق دوسرے پر ہوجاتا ہے ۔ یہاں چونکہ ایمان واسلام ساتھ ساتھ مذکور ہیں اس لئے دونوں الگ الگ ہیں ، ایک کا تعلق قلب سے ہے اور وہ ایمان ہے ، دوسرے کا تعلق قالب وجوارح سے ہے اور وہ اسلام ہے ۔

یہاں پر بخاری کی روایت میں حج کا ذکر نہیں ہے حالانکہ یہ حدیث بعد فرضیت حج بلکہ بعد ادائیگی حج کی ہے ، مگر مسلم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں حج کا ذکر موجود ہے ، یہاں اختصار کر دیا گیا ، اس لئے کہ بعض میں تو عمرہ اور غسل جنابت کا ذکر بھی ہے ، اس سے تائید ہوتی ہے کہ یہاں اختصار ہے ، پوری حدیث دوسری جگہ موجود ہے ۔

قولہ ما الاحسان الخ ایمان واسلام ابتدائی درجے ہیں ، اول درجہ ایمان کا ہے جس پر نجات [کا مدار] ہے ۔ پھر دوسرا درجہ اسلام کا ہے جس پر کامل نجات موقوف ہے ۔ ایمان خلود نار سے نجات دیتا ہے اور اسلام مطلقاً دخول ہی سے نجات دینے والا ہے ، تو خلود سے نجات اول درجہ اور دخول سے نجات دوسرا درجہ ، اس کے بعد رفع درجات کا آخری مرتبہ ہے ، اور یہ احسان [سے حاصل ہوتا ہے ، پھر اس میں بھی مراتب ہیں ، ایک شبلی وجنید رحمہما اللہ کا مرتبہ ، ایک ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا [مرتبہ] ایک انبیاء علیہم السلام کا [رتبہ اور] ایک سید البشر افضل الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کا [مرتبہ عالی] ۔

قولہ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ الخ اس کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے ــــ یہاں فرمایا " كَاَنَّكَ تَرَاهُ " کاف تشبیہ لائے " بِاَنَّكَ " نہیں لائے ــــ معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کسی کے لئے رویت نہیں ، مسلم کی ایک حدیث میں فرمایا گیا : لن تروا ربكم حتّٰى تموتوا ، تم اپنے رب کو ہرگز نہ دیکھ سکو گے جب تک تم کو موت نہ آئے ۔ یعنی اس دنیا میں ان دنیوی آنکھوں سے تم رب کے دیکھنے کے قابل نہیں ہو ، یہ آنکھیں اس کا تحمل نہیں کر سکتیں ، ہاں قلب پر جو کشف ہوتا ہے کبھی اسکو رویت کہہ دیتے ہیں [اس میں اگر استثناء ہے تو صرف معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت کا ، بشرطیکہ رویت مسلّم ہو ـ " كَاَنَّكَ تَرَاهُ " کا مطلب یہ ہوا کہ عبادت میں قلب کا یہ حال ہو کہ گویا وہ مشاہدہ کر رہا ہے (مشاہدہ کا یہ مطلب نہیں کہ آنکھ سے دیکھ رہا ہو) یہ مقام مشاہدہ صوفیاء کے یہاں ہے ۔

فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ الخ یعنی اگر وہ حال مشاہدہ کا نہ ہو سکے تو اس سے اتر کر دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ یہ مستحضر ہو کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے یہ مقام مراقبہ کا ہے ، یہاں عقیدہ مراد نہیں ، وہ تو سب کو ہے ہی بلکہ یہاں استحضار مراد ہے کہ بندہ کا حال یہ ہو کہ وہ خدا کو سامنے پائے جس طرح

قَالَ مَا الْمَسْئُولُ بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ وَسَاُخْبِرُكَ عَنْ اَشْرَاطِهَا اِذَا وَلَدَتِ

آپ نے فرمایا جس سے پوچھتا ہے وہ بھی پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا اور میں تجھ کو اس کی نشانیاں بتلائے دیتا ہوں، جب

الْاَمَةُ رَبَّهَا وَاِذَا تَطَاوَلَ رُعَاةُ الْاِبِلِ الْبُهْمِ فِي الْبُنْيَانِ فِي خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ اِلَّا

لونڈی اپنے میاں کو جنے اور جب کالے اونٹ چرانے والے لمبی لمبی عمارتیں ٹھونکیں (بڑے بن جائیں) قیامت کا علم غیب کی ان پانچ

اللّٰهُ ثُمَّ تَلَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ الآيَة) ثُمَّ

باتوں میں سے ہے جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (سورۂ لقمان) کی یہ آیت پڑھی : بیشک اللہ ہی جانتا

اَدْبَرَ فَقَالَ رُدُّوْهُ فَلَمْ يَرَوْا شَيْئًا فَقَالَ هٰذَا جِبْرِيْلُ جَاءَ يُعَلِّمُ النَّاسَ دِيْنَهُمْ

ہے قیامت کب آئے گی الخ . پھر وہ شخص پیٹھ موڑ کر چلا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسکو پھر (میرے سامنے) لاؤ، (لوگ گئے)

قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ جَعَلَ ذٰلِكَ كُلَّهُ مِنَ الْاِيْمَانِ

تو وہاں کسی کو نہ دیکھا، آپ نے فرمایا : یہ جبریل علیہ السلام تھے، لوگوں کو ان کا دین سکھانے آئے تھے ۔ امام بخاری نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب باتوں کو (دین کہدیا) ایمان میں شریک کر دیا ۔

کسی بادشاہ کے دربار میں بیٹھنے والے کی کیفیت ہوتی ہے ـــ تو یہ دو مرتبے احسان کے ہوئے، ایک کا تعلق شہود سے اور دوسرے کا مراقبہ سے ہے مگر میرے نزدیک یہ شرح مرجوح ہے، راجح وہ ہے جو امام نووی نے شرح مسلم میں بیان کی ہے اور نووی کا یہی مضمون شیخ سندیؒ نے حاشیۂ بخاری میں لکھا ہے، لیکن اس کی عبارت اور تعبیر لطیف ہے، نووی کی تعبیر اتنی لطیف نہیں ہے ـــ پہلے ایک مثال سمجھ لو، ایک شخص مثلاً دربار شاہی میں بیٹھا ہے اور سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہیں تو اس وقت جو کیفیت ہوتی ہے اس کا اندازہ کسی درباری ہی کو ہو سکتا ہے، ہر چیز پر نظر رہتی ہے کہ کہیں کوئی ایسی حرکت نہ ہو جائے جو خلاف منشا ہو اور میں دربار سے نکال دیا جاؤں (۱) درحقیقت جو دربار میں رہتے ہیں ان کے لئے بڑی مشکل ہے ۔ ایک چیز نکتہ کی یہ ہے کہ ایک درباری بادشاہ کو دیکھتا ہے اور بادشاہ درباری کو دیکھتا ہے تو آخر اس حال میں اور اس خوف میں کس چیز کو دخل ہے ؟ اور خوف کی علت کیا ہے ؟ بادشاہ کا درباری کو دیکھنا یا درباری کا بادشاہ کو دیکھنا ؟ مناط حکم اور موثر کیا ہے ؟ اس کا دیکھنا یا اِس کا ؟ اس کی مثال یوں ہے کہ کوئی نابینا دربار میں ہو تو کیا کچھ تعظیم شاہی میں کمی

---

(۱) حضرت نے دربار حیدرآباد کے بعض واقعات بیان فرمائے تھے، گر جب تقریر پر نظر ثانی فرمائی تو انھیں قلمزد فرمادیا، اس لئے یہاں بھی انھیں چھوڑ دیا گیا . (جامع)

. . . .

کرسکتا ہے ؟ نہیں! بلکہ اور زیادہ تعظیم ہوگی ، معلوم ہوا کہ درباری کے دیکھنے کو دخل نہیں ہے بلکہ صاحب دربار کے دیکھنے کو دخل ہے اور تمام باتوں کا لحاظ کرنے میں اسی کے دیکھنے کو دخل ہے نہ کہ درباری کے دیکھنے کو ، اسی بنا پر امام نوویؒ اور شیخ سندیؒ کہتے ہیں کہ مرتبہ ایک ہی ہے دو نہیں ، اور اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وظائف عبودیت یوں ادا کرو کہ اللہ کو دیکھ رہے ہو ، اگر بالفرض تم دیکھتے ہوتے تو کیا کرتے ، جیسے اس وقت کرتے اسی طرح اب بغیر دیکھے ادا کرو " فان لم تكن تراه فانه يراك " یعنی اگرچہ تو اسے نہیں دیکھتا لیکن وہ تو تجھ کو دیکھ رہا ہے اور حقیقۃً دخل اسی کے دیکھنے کو ہے لہٰذا اسی کی رعایت کرنی چاہیئے ، اب اس تقریر کی بنا پر " كأنك تراه " میں مسئلہ رویت کی طرف توجہ کی حاجت نہیں ، مطلب یہ ہی کہ جیسے تو دیکھتے وقت کرتا اسی طرح اب بھی کر کیونکہ دخل تیرے دیکھنے کو نہیں .

یہ بھی معجزہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشکل مسئلہ کو یوں حل فرمادیا ، تمام مراتب صوفیاء اسی سے حاصل ہوتے ہیں ، اسی کو نسبت یادداشت کہتے ہیں ، سنت اور روایت یہی بتلاتی ہے اور جو صوفیا نے کہا ہے وہ بظاہر حدیث کے خلاف ہے ، بعضوں نے یہاں فنا کی بحث چھیڑی ہے ، اگر یہ بحث دیکھنا چاہو تو ابن قیم کی " مدارج السالکین " پڑھو ، بعض نے اسے اور بھی معنی پہنائے ہیں اور کان تامہ بتلایا ہے ، مگر یہ جہل ہے ، چنانچہ حافظ نے اس کا مبسوط رد کیا ہے ، مرقاۃ میں بھی یہی ہے .

قولہ قال متی الساعۃ الخ بارہا یہ خیال ہوا کہ یہ تین سوالات ایمان ، اسلام اور احسان تو باہم مربوط تھے ، ایک کا ادنیٰ درجہ تھا دوسرے کا اوسط اور تیسرے کا اعلیٰ ، مگر ساعۃ کا سوال بظاہر غیر مربوط [معلوم ہوتا] ہے ، مگر حقیقت یہ ہے کہ تمام دنیا عبادت کے لئے ہے ، اور اس کا آخری مرتبہ احسان ہے اور اعلیٰ درجہ کے محسنین ختم ہو چکے ، محسن کامل صلی اللہ علیہ وسلم بھی آچکے تو اب دنیا کے بقاء کی ضرورت کیا رہی ؟ جب عبادت درجۂ تمام تک پہونچ گئی اور ایجاد عالم کی غرض حاصل ہو چکی تو پھر اب کسی چیز کی ضرورت نہیں : وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونَ [1] اور میں نے جن و انس نہیں پیدا کئے مگر اس لئے کہ میری عبادت کریں اور وجود نبوی سے عبادت کامل ہو چکی اور " [بعثت] انا والساعۃ کھاتین " کی بھی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے جس میں آپ خود فرمارہے ہیں کہ میرا آنا گویا قیامت کا آنا ہے اور اس میں بھی یہی اشارہ موجود ہے کہ غرض تخلیق پوری ہوگئی تو اب دنیا کی کیا ضرورت رہ گئی ؟

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ تکمیل عبادت کے دو مرتبے ہیں ، ایک کیفاً دوسرا کمّاً ، کیفاً تو بایں طور حاصل ہو چکی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر اس کی تکمیل ہوگئی اور بعثت نبوی اسی تکمیل کے لئے تھی ، اور کمّاً اس وقت حاصل ہوگی

---

(۱) ذاریات : ۵۶

. . . .

جب تمام دنیا میں اسلام پھیل جائے اور کوئی جگہ باقی نہ رہے، اور یہ اب تک حاصل نہیں ہوئی، جیسا کہ خود آپ سے ایک حدیث صحیح میں فرمایا لا یبقی علی ظہر الارض بیت ولا مدر (نہ کچا، نہ پکا، نہ ڈیرہ نہ خیمہ) الا ادخلہ اللہ الاسلام بعز عزیز وذل ذلیل اور یہ مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں ہوگا اور اس کے آثار اب نظر آنے لگے ہیں، یہاں تک کہ ملحد بھی پیشین گوئی کرنے لگے ہیں کہ آئندہ تمام دنیا کا مذہب اسلام ہوگا۔

غرض جب کماً وکیفاً دونوں طرح تکمیل ہو جائے گی تو پھر دنیا اٹھالی جائے گی، کیونکہ مقصود حاصل ہوگیا، اور اٹھانا بھی اس ترتیب سے ہوگا جس ترتیب سے خلق ہوا تھا، سب سے پہلے کعبہ کو اٹھایا جائے گا کیونکہ وہی سب سے پہلا گھر ہے " اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ للذی ببکۃ مبارکًا"(۱) حدیث پاک میں ہے: ایک حبشی غلام آئے گا " ویقلع حجرا حجرا " ایک ایک پتھر نکال دے گا (اردو محاورے میں اینٹ سے اینٹ بجادے گا)(۲) وہ کعبہ جس کے متعلق فرمایا گیا کہ کوئی جابر کعبہ پر حملہ کرنا چاہے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی گردن توڑ دے گا (جیسا کہ واقعۂ اصحاب الفیل میں ہو بھی چکا)(۳) مگر اب اسے ایک حبشی غلام توڑ دے گا، جیسے دہلی کا لال قلعہ کہ اگر اس وقت بڑے سے بڑا بادشاہ چاہے تو اس پر کسی طرح تسلط حاصل نہیں کرسکتا، لیکن جب سلطنت کا خیال اس کے توڑنے کا ہو جائے تو ٹکے کے مزدوروں سے توڑوا دیا جائے گا۔

اس تقریر سے واضح ہوگیا کہ ساعۃ کا ذکر یہاں بالکل برمحل ہے، سوال کے جواب میں "ما المسئول عنہا باعلم من السائل" بجائے اس کے کہ مختصر لفظوں میں " لا اعلم " کہتے، آپ نے جواب میں اتنا طویل جملہ اختیار فرمایا، یہ بلاغت کا بہترین شاہکار ہے اس لئے کہ اس وقت اگرچہ جبریل سائل اور آپ مسئول عنہ ہیں مگر بایں ہمہ دنیا کے کسی مسئول عنہ کو نہ تو اس کا علم ہے اور نہ کسی سائل کو۔ اس عنوان کے ذریعہ علم ساعۃ سے جہل کا احاطہ واستغراق ہوگیا۔

نوادر حمیدی میں ایک روایت ہے، اس میں یہی سوال وجواب ہے مگر سائل مسیح علیہ السلام ہیں اور مجیب جبریل ؑ، حضرت جبریل ؑ نے بھی یہی جواب حضرت مسیح علیہ السلام کو دیا تھا، ممکن ہے من حیث لا یحتسب یہی جواب جبریل ؑ کو دلایا گیا ہو کہ تم خود اپنا جواب یاد کرو تم نے بھی حضرت مسیح علیہ السلام سے ما المسئول عنہا باعلم من السائل کہا تھا، وہی جواب آج میں تم کو دے رہا ہوں۔

قولہ وسأخبرك عن اشراطها، اشراط جمع ہے شَرَط کی: چھوٹی علامتیں، یہ بفتح الراء ہے، اور جو بسکون الراء شَرْط ہے اس کی جمع شروط آتی ہے، بڑی علامات یاجوج ماجوج کا خروج، مسیح علیہ السلام کا نزول وغیرہ ہیں، چھوٹی علامات یہ ہیں

(۱) آل عمران (۲) و (۳) جامع تقریر۔

. . . .

اذا ولدت الامۃ ربھا ، فتح الباری میں اس کے چار معنی لکھے ہیں، سب کو بیان کرنے کی حاجت نہیں، ظاہر یہ ہے کہ بچہ کی ماں مربی ہوتی ہے اور بچہ مربی ہوتا ہے، یہاں زمانہ کا انقلاب بتانا چاہتے ہیں کہ مربی مربی ہو جائے گا اور مربی مربی، عالی سافل بن جائے گا اور سافل عالی، تو بچہ مربی ہوگا، یہ کنایہ ہے انقلاب و انعکاس احوال سے ۔ بعض روایات میں "رَبَّتَھَا" آیا ہے۔ اس سے مراد لڑکی نہ لی جائے بلکہ تاء کے معنی میں تاویل کر لی جائے یعنی نسمۃ ، اسی کو کہا ہے ؎

اذا التحق الاسافل بالاعالی ؎ لقد طابت منادمۃ المنایا

بعضوں نے کہا ہے کہ یہ کنایہ ہے کثرت محاربات سے ، یعنی لڑائیاں کثرت سے ہوں گی تو گرفتار ہونے والی عورتیں فاتحین کی لونڈیاں ہوں گی اور ان سے اولاد ہوگی تو امہات الاولاد کی کثرت ہوگی ۔ (لڑکی ، لڑکا جب باندی سے پیدا ہوگا تو ماں ام ولد کہلائے گی اور اب وہ آزاد ہو جائے گی، تو گویا یہ اولاد اس کی آزادی کا سبب بننے سے مربی بن گئی[1])

بادشاہ حیرہ نعمان ابن منذر کی لڑکی جب حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے سامنے لائی گئی تو اس نے حسرت سے دو شعر پڑھے جسے علامہ عینی نے شرح بخاری میں نقل کیا ہے ، وہ کہتی ہے ؎

وکنا نسوس الناس والامر امرنا ؎ اذا نحن فیھم سوقۃ نتنصف

فاف لدنیا لایدوم نعیمھا ؎ تقلب تارات بنا و تصرف

تنصف : دادرسی ۔ سوقۃ : رعایا (یعنی ایک زمانہ تھا کہ ہم حکمراں تھے، آج بندھے کھڑے ہیں، ہائے اس دنیا پر اف ہے، اس کی نعمتیں دائمی نہیں ہیں، اس میں ایسے ہی انقلابات اور تفرقات ہوتے رہتے ہیں[2]) دراصل یہ اسی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اعالی، اسافل بن جائیں گے اور اسافل، اعالی ۔۔۔ دیکھ لو دنیا اسی طرف جا رہی ہے، چنانچہ سوویت حکومت قائم ہوگئی جو کمزوروں کی ہے (اور اب اس زمانہ میں (۱۹۷۵ء-۱۹۷۶ء میں) تو کثرت سے پسماندہ اقوام چمار، پاسی، مہتر وغیرہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں[3])

قولہ واذا تطاول رعاۃ الابل البھم الخ ۔ بُھْمٌ جمع ہے اَبْھَمْ کی ؛ جو بولنا نہ جانتا ہو ، دوسرے معنی ہیں سیاہ آدمی ، یعنی وحشی، گنوار، بڑے بڑے قلعے بنائیں گے، اس میں بھی اشارہ ہے کہ ذلیل، عزیز ۔ اور عزیز، ذلیل بنا دیے جائیں گے نااہل، اہل بنا دیے جائیں گے اور اہل معطل ہو جائیں گے، چنانچہ آگے حدیث آرہی ہے : اذا وسد الامر الی غیر اھلہ فانتظر الساعۃ (جب معاملہ نااہلوں کے سپرد کر دیا جائے تو قیامت کا انتظار کرو[4])

(۱، ۲، ۳، ۴) جامع تقریر

قولہ فی خمس ، یہ متعلق ہے "ما المسئول عنہا" کے ، یعنی قیامت کا علم ان پانچ چیزوں میں سے ایک ہے جس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ، پھر آپؐ نے آیت پڑھی : ان اللہ عندہ علم الساعۃ ج الآیہ (۱) لہذا ہم سے اس کا سوال نہیں ہو سکتا ۔

امام رازی نے اس آیت میں دو سوال پیدا کئے ہیں ، اول یہ کہ اس آیت کی رو سے یہ ہونا چاہئے کہ ان پانچوں میں سے کسی ایک کی جزئی بات کا علم نہ ہو ، حالانکہ ہم سیکڑوں واقعات اس کے خلاف پاتے ہیں — اولیاء کی کرامت کثرت سے منقول ہیں — صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو رحم کی حالت معلوم ہوگئی تھی اور آپ نے انتقال سے پہلے اپنی حاملہ بیوی کے متعلق فرما دیا تھا کہ ان کے لڑکی ہوگی ، اس لئے آپ نے وصیت فرمائی کہ اس حمل کو لڑکی مان کر ترکہ تقسیم کیا جائے — ایسے ہی سیکڑوں واقعات ہیں ۔

میں نے اپنے استاذ سے سنا کہ پنجاب میں ایک بزرگ عبداللہ شاہ ہیں ، ان کی عام عادت تھی کہ حمل سے متعلق تعویذ دیتے وقت بتادیتے کہ لڑکا ہے یا لڑکی اور ویسا ہی ہوتا ۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ پانچ کی کیا تخصیص ہے اور اس میں انحصار کیوں ہے ؟ اور بھی بہت سی اشیاء ہیں جن کی اوروں کو اطلاع نہیں ، تو یہ انحصار کہاں صحیح ہوا ؟ اس دوسرے سوال کا سہل جواب امام سیوطی نے "لباب النقول" میں یہ دیا ہے کہ سوال یہاں انھیں پانچ کا تھا ، اس لئے جیسا سوال تھا ویسا جواب دیا گیا — لیکن پہلے سوال کا جواب مشکل ہے ، امام رازیؒ نے تقریریں کی ہیں مگر شافی جواب نہ ہو سکا ، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کا انکشاف ہو جائے اور مسئلہ علم غیب کی حقیقت واضح ہو جائے ۔

اس سے پہلے ایک مقدمہ سمجھ لو کہ اگر ایک چیز کے کچھ فروع ہوں اور کچھ اصول ، تو اصلی علم اس وقت کہیں گے جب اس کے اصول کا علم ہو ، فرض کرو ایک شخص سو دو سو امراض اور ان کے نسخے رٹ لے تو کیا اس کو طبیب کہہ سکیں گے ؟ نہیں ! وہ طبیب نہ ہوگا ، بلکہ طبیب وہ سمجھا جائے گا جو اصول طب اور اس کے فن سے واقف ہو ، چاہے امراض اور نسخے رٹے نہ ہوں ، اسی طرح عالم وہی ہوگا جو اصول علم سے واقف ہو ، فقیہ وہ نہیں جسے جزئیات فقہ یاد ہوں ، عوام چاہے کہہ دیں لیکن علماء اسے فقیہ نہ کہیں گے ، وہ اسی کو فقیہ کہیں گے جو اصول اور ماخذ پر مطلع ہو خواہ جزئیات کم یاد ہوں ، امام اعظم کے زمانہ میں تو شاید اتنی جزئیات بھی نہ رہی ہوں گی ، اس زمانہ میں بھی مفتیین کو بہت سی جزئیات یاد ہوتی ہیں مگر ماخذ کا علم نہیں ہوتا ، اسی پر شاعر وغیرہ کو قیاس کر لو ، خلاصۂ کلام یہ ہے کہ حقیقی علم وہ ہے کہ اس کے اصول سے آگاہی ہو ، لہذا کسی چیز کا

(۱) لقمان : ۳۴

. . . .

عالم اسی وقت کہلائے گا جب اس کے اصول سے واقف ہو۔

اب سمجھو کہ غیب کے جزئیات بھی ہیں اور کلیات بھی، تو جس طرح جزئیات طب کے جاننے والے کو عالم طب اور طبیب نہیں کہیں گے، اسی طرح جزئیات غیبیہ پر مطلع کو عالم غیب نہیں کہہ سکتے، کلیات کے علم کا مطلب یہ ہے کہ ضابطہ بتلا دیا جائے کہ مثلاً فلاں ضابطے پہچان لیں کہ فلاں جگہ فلاں وقت اتنے انچ بارش ہوگی اور پھر اتنی ہی بارش اسی وقت میں جس کا تعین کیا گیا ہے ہو بھی جائے اس میں تخلف نہ ہو، بس جو اس ضابطہ کا علم رکھتا ہے اسے عالم غیب کہا جائے گا اور جو یہ ضابطہ نہیں جانتا اسے عالم غیب بھی نہیں کہہ سکتے — اب ہم کہتے ہیں دنیا میں کسی کو عالم غیب نہیں کہہ سکتے کیونکہ کسی کو بھی کلیات تکوینیہ کا علم نہیں ہو سکتا صرف ایک ہی ذات ہے اور وہ اللہ کی ہے جسے تکوینیات کا علم محیط حاصل ہے، ہاں بعض امور کا انکشاف ہو جاتا ہے مگر اسے علم نہیں کہتے، کسی طرح اگر ہم کو معلوم بھی ہو جائے کہ اس کے پیٹ میں لڑکا ہے لیکن اگر کوئی پوچھ لے کہ لڑکا کیوں ہے؟ تو یقیناً ہمارے پاس اس کا جواب کچھ نہ ہوگا، البتہ تشریع میں ہم کلیات سے جواب دے سکیں گے، تو ضوابط اور اصول غیب کا علم کسی نبی، کسی ولی کو نہیں ہو سکتا، یہ علم اللہ کی قدرت کے ساتھ مخصوص ہے، ایک کلیہ کا علم اگر ہو تو وہ مفتاح بنتا ہے بہت سی جزئیات کے علم کا، خود اللہ نے فرمایا: وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو[1] اس سے معلوم ہوا کہ قواعد وضوابط غیب کا اور تکوینیات میں کلیات غیب کا علم بجز خدا کے اور کسی کو نہیں، ہاں بعض جزئیات کا انکشاف ہو سکتا ہے جیسے اسی آیت وعندہ مفاتح الغیب الآیہ میں، اسی طرح حدیث پاک میں بھی مَفَاتِح کا لفظ آیا ہے فرمایا: "مفاتح الغیب خمسٌ" — ہاں تشریعیات کے مد میں کلیات کا علم غیب انبیاء علیہم السلام کو ہے کیونکہ اگر یہ علم انھیں نہ دیا جائے تو ان کے کلام میں فرق آجائے، البتہ وہ اسی قدر ملتا ہے جتنا اللہ اپنی حکمت کے موافق عطا فرما دے، حافظ شیرازی نے کیا اچھا شعر کہا ہے ؎

حدیثِ مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو ✧ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

خلاصہ یہ کہ حوادث دہر پر کوئی مطلع نہیں ہو سکتا، اور جزئیات کے عالم کو عالم الغیب نہیں کہہ سکتے، اسی کو فرمایا: ولا یحیطون بشیئٍ من علمہ[2] یعنی احاطہ نہیں ہو سکتا، وَسِعَ کرسیّہ، اہل حقائق نے لکھا ہے کہ کرسی مظہر ہے علم کا، جس طرح عرش مظہر ہے رحمت کا — دوسری جگہ فرمایا: عالم الغیب والشھادۃ وہ غیب و شہادت (پوشیدہ اور ظاہر) کا یکساں عالم ہے، یہ بحث تو علم غیب کی تھی — رہا کسی علم کا کسی پر منکشف ہو جانا تو یہ دوسری بات ہے اور یہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام دونوں کو ہوتا ہے

---

(۱) انعام: ۵۹ (۲) بقرہ: ۲۵۵

باب ۳۸ ۴۹ ـ حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ حَمْزَةَ قَالَ حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ

ہم سے ابراہیم ابن حمزہ نے بیان کیا، کہا ہم سے ابراہیم ابن سعد نے بیان کیا

البتہ ان دونوں کشوف میں فرق ہوتا ہے اور وہ فرق وہی ہے جس کو سورہ جن میں بیان فرمایا گیا: عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝ یعنی وہ عالم غیب ہے اور غیب پر کسی کو حاوی اور مسلط نہیں کرتا، ہاں انبیاء ورسل کو مد تشریعیات میں اور تکوینیات میں سے جتنے پر چاہے مطلع کردیتا ہے ــــ اس حصر سے مراد یہ ہے کہ اس طرح کسی کو غیب پر مسلط کردے کہ بالکل قبضہ میں ہو جائے اور کوئی چیز اس میں خلل انداز نہ ہو سکے، نہ نفس کو کچھ دخل ہو، نہ شیطان کو، نہ کسی قسم کے شک وشبہہ کو، غرض یہ کہ ہر شے سے محفوظ ہو، یہ مخصوص بالانبیاء کیوں ہے ــــ؟ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا اس لئے کہ اس کے آگے پیچھے پہرے دار ہوتے ہیں ــــ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کو جو کشف ہوتا ہے یا وحی آتی ہے، اس کے ساتھ پہرے دار ہوتے ہیں اس لئے اس میں غلطی کا احتمال نہیں ہوتا، بخلاف کشف ولی کے کہ اس میں غلطی کا احتمال بھی ہے اور شبہہ کی گنجائش بھی، اس لئے دونوں یکساں نہیں ہو سکتے ــــ اب دو فرق ہوئے ــــ نبیؑ کا علم قطعی، ولیؒ کا ظنی، وہاں اللہ کی ذمہ داری ہے اور یہاں نہیں اور یہ سب جزئیات علم ہیں، کلیات کا علم مختص بالباری ہے انھیں کو مفاتح الغیب کہا گیا ہے، یہ علوم نہ نبی کو حاصل ہیں، نہ ولی کو، انھیں جو کچھ حاصل ہے خواہ کتنا کثیر ہو سب جزئیات ہیں، اس لئے عالم الغیب نہیں کہہ سکتے ــ رہا اہل نجوم کو کچھ علم ہونا اور پیشین گوئیاں وغیرہ کرنا یا کسوف وخسوف کے متعلق کچھ بتانا تو یہ در اصل علم غیب نہیں ہے کیونکہ علم غیب وہ ہے جو عقل کے ذریعہ حاصل نہ ہو سکے، اور یہ اہل نجوم جو کچھ کہتے ہیں یہ سب حسابی چیزیں ہیں جنھیں ہر وہ شخص حاصل کر سکتا ہے جو اس فن کو عقل کے ذریعہ سیکھ لے۔ اور اس میں غلطی کا بھی ہمیشہ احتمال رہتا ہے، حساب صحیح ہوا تو نتیجہ صحیح نکل آیا، حساب غلط ہو گیا تو نتیجہ غلط نکل آیا، کتنی پیشین گوئیاں غلط ہوتی رہتی ہیں مگر انبیاء علیہم السلام کے ہاں غلطی کا احتمال نہیں۔

باب ۳۸

یہ باب بغیر ترجمہ کے ہے اور اس قسم کا جو باب آتا ہے وہ پہلے باب کے لئے مثل فصل اور تتمہ کے ہوتا ہے، گذشتہ باب میں دین، اسلام ایمان، احسان سب کا ایک دوسرے پر صادق آنا معلوم ہوا تو اب اس کی تکمیل کرتے ہیں کہ جب ایمان مجموعہ کا نام ہے [اور اس مجموعہ میں کمی بیشی ہوتی ہے] تو اس میں بھی کمی بیشی ہوگی، ہرقل کی حدیث میں لفظ "یزیدون" دال علی المدعٰی ہے، لہٰذا یہ تکملہ ہے، میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ بخاری تشحیذ اللاذہان عمدًا کبھی ترجمہ ترک کر دیتے ہیں تاکہ امتحان واختبار بھی ہو جائے، لہٰذا جب ہمیں اجازت ملی کہ ہم ربط قائم کریں تو ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے اور جس کو پہلے ثابت بھی کر چکے ہیں کہ ایمان، اسلام، کفر، نفاق، احسان وغیرہ میں مراتب ہیں اور اب یہاں کہنا چاہتے ہیں کہ یہ مراتب کا تفاوت دو طرح ہوتا ہے، کیفًا وکمًّا، کیفًا اس طرح کہ انشراح وانجلاء میں کمی زیادتی ہوتی ہے، اور کمًّا اس طرح کہ تعداد میں کمی بیشی ہوتی ہے

بْنُ سَعْدٍ عَنْ صَالِحٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ

انھوں نے صالح ابن کیسان سے ، انھوں نے ابن شہاب سے ، انھوں نے عبید اللہ ابن عبد اللہ سے ، ان کو عبداللہ ابن عباس

بْنَ عَبَّاسٍ اَخْبَرَهٗ قَالَ اَخْبَرَنِی اَبُوْسُفْيَانَ ابْنُ حَرْبٍ اَنَّ هِرَقْلَ قَالَ سَاَلْتُكَ هَلْ

نے خبر دی ، ان کو ابو سفیان بن حرب نے کہ ہرقل (شاہ روم) نے ان سے کہا میں نے تجھ سے پوچھا کہ اس پیغمبر کے

يَزِيْدُوْنَ اَمْ يَنْقُصُوْنَ فَزَعَمْتَ اَنَّهُمْ يَزِيْدُوْنَ وَكَذٰلِكَ الْاِيْمَانُ حَتّٰى يَتِمَّ وَسَاَلْتُكَ

تابعدار اور بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں؟ تو نے کہا بڑھ رہے ہیں اور ایمان کا یہی حال رہتا ہے یہاں تک کہ وہ پورا ہو ۔

هَلْ يَرْتَدُّ اَحَدٌ سَخْطَةً لِدِيْنِهٖ بَعْدَ اَنْ يَدْخُلَ فِيْهِ فَزَعَمْتَ اَنْ لَّا ، وَكَذٰلِكَ الْاِيْمَانُ

(اپنے زور کو پہونچ جائے) اور میں نے تم سے پوچھا کہ کوئی اس کے دین میں آکر پھر اس کو برا سمجھ کر پھر جاتا ہے ؟ تو نے کہا

حِيْنَ تُخَالِطُ بَشَاشَتُهُ الْقُلُوْبَ لَا يَسْخَطُهٗ اَحَدٌ .

نہیں! اور ایمان کا یہی حال ہے، جب اس کی خوشی دل میں سما جاتی ہے تو پھر کوئی اس کو برا نہیں سمجھتا ۔

یہاں حدیث ہرقل میں دونوں باتیں جمع ہیں .

حدیث ۴۹ . پہلے اس نے سوال کیا کہ تعداد میں زیادہ ہو رہے ہیں یا کم ؟ جب جواب ملا کہ زیادہ ہو رہے ہیں تو قیصر نے کہا: "کذلك الایمان حتی یتم" اس تمام سے کیا مراد ہے ؟ یہی تو ہے کہ مومنین کی کثرت ہوگی ، آگے دوسرا سوال ہے . هل يرتد الخ جواب ملا نہیں! مرتد کوئی نہیں ہوتا ، تو قیصر نے کہا : كذلك الايمان الخ یعنی جب دل میں ، رگ و پے میں پیوست ہو جائے اور رچ بس جائے تو پھر قدم نہیں ہٹتا ، تو یہاں کیفیت ایمان اور روشنی و انجلار کا ذکر ہے اور وہاں تعداد میں زیادۃ و نقصان تھا ، تو کمی بیشی کبھی نفس کیفیات ایمان میں ہوتی ہے اور کبھی تعداد میں .

ایک دوسری چیز اور ہے کہ سوال میں سخطةً لدينه ہے اور اس کے جواب میں كذلك الايمان ہے ، معلوم ہوا کہ دین و ایمان دونوں ایک ہی ہیں ، حدیث مفصل گذر چکی .

باب ۳۹ فضل من استبرأ لدينه

ترجمہ کا مطلب یہ ہے کہ جو احتیاط کرے دین کے معاملہ میں . **استبراء** : برارت چاہنا ، تقویٰ یہی ہے کہ شبہہ کی چیز سے بھی بچا جائے ، چونکہ [حدیث میں] "استبرأ لدينه" آگیا ہے [اور دین و ایمان ایک ہے] اس لئے بخاری نے [اس کے لئے بھی کتاب الایمان میں ایک ترجمہ رکھ دیا] نیز یہ بھی مراد معلوم ہوتی ہے کہ مثل ایمان و اسلام کے مراتب کے ورع کے بھی مراتب ہیں ، تقویٰ کے معنی ہیں اللہ سے

باب ۳۹ فَضْلِ مَنِ اسْتَبْرَأَ لِدِیْنِهٖ

جو شخص اپنا دین قائم رکھنے کے لئے (گناہ سے) بچے اس کی فضیلت

۵۰ — حَدَّثَنَا اَبُوْنُعَیْمٍ حَدَّثَنَا زَکَرِیَّا عَنْ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النُّعْمَانَ ابْنَ

ہم سے ابو نعیم نے بیان کیا کہا ہم سے زکریا نے بیان کیا، انھوں نے عامر سے، کہا میں نے نعمان ابن بشیر سے

بَشِیْرٍ یَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ

سنا، وہ کہتے تھے میں نے آنحضرتؐ سے سنا آپ فرماتے تھے: حلال کھلا ہوا ہے اور حرام کھلا ہوا ہے، اور ان دونوں کے

وَالْحَرَامُ بَیِّنٌ وَبَیْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَا یَعْلَمُهَا کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ.

بیچ میں بعض چیزیں شبہہ کی ہیں جن کو بہت لوگ نہیں جانتے (کہ حلال ہیں یا حرام)

"ڈر کر بچ جانا"۔ اس کا پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی شرک سے بچے، دوسرا یہ کہ کبائر سے بچے، تیسرا یہ کہ صغائر سے بھی بچے، چوتھا درجہ یہ ہے کہ شبہات سے بچے، یہ اعلیٰ درجہ ہے، اس سے بھی اعلیٰ ایک اور درجہ ہے جو جامع ترمذی کی ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے: لَا یَبْلُغُ الْعَبْدُ حَقِیْقَةَ التَّقْوٰی حَتّٰی یَدَعَ مَالَا بَأْسَ بِهٖ حَذَرًا مِّمَّا بِهٖ بَاسٌ یعنی کوئی شخص اس وقت تک متقی نہیں ہو سکتا جب تک کہ بعض مباح کو بھی ترک نہ کرے، اس ڈر سے کہ کہیں حرام میں نہ پڑ جائے اور یہ مفضی الی الحرام نہ ہو جائے — تو تقویٰ کے بھی مراتب نکل آئے،

قولہ الحلال بیّن والحرام بیّن الخ یعنی حرام و حلال واضح اور صاف ہیں، روٹی کھانا، پانی پینا وغیرہ حلال ہیں بلاشبہہ اور خمر و لحم خنزیر بلاشک حرام ہیں — ان دونوں کے درمیان مشتبہات ہیں۔ اس لفظ کے مختلف نسخے ہیں، ایک "مشبّہات" تشبیہ باب تفعیل سے، دوسرا "مشتبہات" اشتباہ باب افتعال سے، مسند دارمی کی ایک روایت میں "متشابہات" تشابہ باب تفاعل سے آیا ہے، تینوں کے معنیٰ قریب قریب ہیں۔ "مُشَبَّهَات": جو چیزیں ملتبس کردی گئی ہوں قَالَ تَعَالٰی: وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (۱) (سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی نزاہت میں یہودیوں کی بکواس کا جواب دیا گیا ہے کہ نہ انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا اور نہ سولی دی لیکن شبہہ میں ڈال دیا گیا انکو (۲)) اور اشتباہ مشتبہ ہونے کو کہتے ہیں، اور تشابہ کے معنیٰ ہیں دو چیزوں کا ہمشکل ہونا، حاصل ایک ہی ہے، شبہہ جب لگے گا جب امتیاز نہ ہو سکے اور دھوکہ لگ جائے۔ اس میں علماء نے کلام کیا ہے کہ شبہہ میں پڑ جانا کس وجہ سے ہوتا ہے اور اس کا مصداق کیا ہے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں چار پانچ قول نقل کئے ہیں، ان میں سے جتنی بات زیادہ قابل قبول ہے

---

(۱) نساء: ۱۵۷ (۲) جامع تقریر

. . . .

میں اسی کو نقل کرتا ہوں، اصل یہ ہے کہ اشتباہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا منشا کبھی تعارض ادلہ ہوتا ہے، مثلاً ایک حدیث سے کوئی شے حلال اور دوسری سے وہی حرام معلوم ہوتی ہو تو اب کیا کہیں گے؟ حلال یا حرام؟ اس وقت مجتہد کا کام یہ ہے کہ نہ حلال کہیں نہ حرام، مگر ایسا کم ہوتا ہے اور تمام مجتہدین کو یہ صورت پیش نہیں آتی، اس لئے فرمایا "لا یعلمھا کثیر من الناس" جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے، یہ نہیں کہا کہ کوئی نہیں جانتا۔

اور کبھی اشتباہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک مجتہد فیصلہ کر دیتا ہے کہ حلال ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ حرام ہے اور ان میں سے کسی کو شبہ نہیں ہوتا، ایسی صورت میں ہم کیا کریں؟ ظاہر ہے کہ ایسے وقت میں ہمیں اختلاف سے بچنا چاہئے، بشرطیکہ اختلاف وقیع ہو اور اس صورت میں ایسی چیز کو ہمیں ترک کر دینا چاہیے اسلئے کہ اگر حرام ہے تو اس کے کرنے سے وقوع فی الحرام ہوگا، لہٰذا اسے چھوڑ دینا چاہیے اور اگر حلال ہے تو اسکے نہ کرنے سے کوئی نقصان نہیں اس لئے اسے بھی چھوڑ دینا چاہیے۔ ایک تیسری شکل بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اختلاف نہ تو علماء میں ہے، نہ ادلہ میں بلکہ تحقیق مناط میں اشتباہ ہو جائے یعنی یہ معلوم نہ ہو سکے کہ کس چیز کو کس حیثیت سے اس جزئی میں داخل کریں جیسے دار الحرب اور دار الاسلام ہونے کے بارے میں اختلاف ہو، یا مثلاً یہ مسئلہ آگیا کہ کسی نے کسی کی جیب کاٹی اور مال لے گیا تو اسے سارق قرار دیں گے یا نہیں؟ یعنی کہ اس پر سرقہ کی تعریف صادق آئے گی یا نہیں؟ اسی کو تحقیق مناط کہتے ہیں[1] تو کبھی تحقیق مناط میں اختلاف ہو جاتا ہے، معلوم ہوا کہ جب شے مشتبہ بن جاتی ہے ——

ایک اور چیز بھی ہے اور وہ یہ کہ شریعت نے اسے درمیان میں رکھا ہے، نہ حلال صریح کہا نہ حرام صریح، اصطلاح فقہاء میں جسے مکروہ کہتے ہیں، تو اس مکروہ پر بھی شبہہ کا اطلاق ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ ذوالشبہتین ہے، من وجہ حلال، من وجہ حرام —— اب میں سب کو جمع کر رہا ہوں، ان تین کے اعتبار سے تین لفظ مناسب ہیں۔ جب ادلہ میں تعارض ہو تو مشبہ کا لفظ درست ہے کیونکہ دلیل نے شبہہ میں ڈال دیا —— اور جب مجتہدین میں اختلاف ہو تو لفظ مشتبہات مناسب ہے کیونکہ اب ہم شبہہ میں پڑ جاتے ہیں، ادلہ شبہہ نہیں ڈالتے —— اور تیسری چیز یعنی مکروہ میں تشابہ کا لفظ مناسب ہے کیونکہ یہ ذوالشبہتین ہے، نہ پورا حرام نہ پورا حلال۔

زین الدین ابن المنیر کے شیوخ طریقت میں سے ایک بزرگ شیخ ابو القاسم قباری ہیں، یہ طریقت کے امام اور عارف تھے، ابن المنیر نے ان کے مناقب میں ایک کتاب لکھی ہے، اس کتاب میں یہ حدیث بھی آگئی ہے، تو اس کے متعلق ابن المنیر نے اپنے شیخ کا مقولہ نقل کیا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ "وما بینھما مشتبہات" سے مراد یہاں کراہت ہے کیونکہ وہ ذوالشبہتین ہے —— گویا شریعت نے خود تین مرتبے رکھے ہیں اور پہلے

---

(۱) مقدمۂ فتح الملہم ص۵۹ میں ہے کہ اصولیین کے نزدیک تحقیق مناط یہ ہے کہ کسی وصف کے علتِ حکم ہونے پر تو اتفاق ہو مگر کسی جزئیہ میں اس علت کا وجود خفی ہو اور اجتہاد کرنا پڑے کہ وہ موجود ہے یا نہیں، اسی کو تحقیق مناط کہتے ہیں جیسے یہ کہ نباش پر سارق کی تعریف صادق آتی ہے یا نہیں؟ (مرتب)

فَمَنِ اتَّقَى الْمُشْتَبِهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ كَرَاعٍ

پھر جو کوئی شبہہ کی چیزوں سے بچا اس نے اپنے دین اور عزت کو بچالیا اور جو کوئی ان شبہہ کی چیزوں میں پڑگیا اس کی مثال

يَرْعَى حَوْلَ الْحِمَى يُوشِكُ أَنْ يُوَاقِعَهُ أَلَا وَإِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى أَلَا إِنَّ حِمَى اللهِ

اس چرواہے کی سی ہے جو (شاہی) رمنہ کے آس پاس (اپنے جانوروں کو) چرائے وہ قریب ہے کہ رمنہ کے اندر گھس جائے، سن لو ہر

فِي أَرْضِهِ مَحَارِمُهُ أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ

بادشاہ کا ایک رمنہ ہوتا ہے، سن لو اللہ کا رمنہ اس کی زمین میں حرام چیزیں ہیں، سن لو بدن میں ایک (گوشت کا) لوتھڑا ہے،

كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ

جب وہ درست ہوگا سارا بدن درست ہوگا اور جہاں وہ بگڑا سارا بدن بگڑ گیا، سن لو وہ لوتھڑا (آدمی کا) دل ہے۔

دو معنوں میں صرف دو درجے تھے، تیسرا ہمارے دلائل کے اشتباہ سے پیدا ہوگیا تھا، تو اب مشتبہات سے بچنے کا مطلب یہ ہوا کہ جو مکروہ سے بچا، تو استبرأ لدینه وعرضه (اپنے دین اور عرض کے لئے استبراء کیا) اس کی تائید صحیح ابن حبان کی حدیث سے ہوتی ہے جسے حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ سند مسلم کی ہے اگرچہ متن مسلم کا نہیں، اس کے الفاظ یہ ہیں: اجعلوا بینکم وبین الحرام سترۃً من الحلال[1] یعنی ایک روک حلال کی قائم کرلو، مطلب یہ کہ اگر سارے حلال کاموں کو کرلیا کرے تو بیچ میں ستره نہیں رہتا، آگے فرماتے ہیں: من فعل ذٰلک فقد استبرأ لدینه و عرضه، اس سے معلوم ہوا کہ کچھ حلال چیزوں کو بھی چھوڑ دینا چاہئے، قاری فرماتے ہیں کہ بندہ اور حرام کے درمیان مکروہ ایک عقبہ (گھاٹی) ہے، جو حلال سے چل کر اس گھاٹی میں آئے گا تو حرام میں جا پڑے گا، پھر کہتے ہیں کہ مباح ایک عقبہ ہے بندے اور مکروہ کے درمیان، یعنی اگر سارے حلال کو اختیار کرے گا تو اندیشہ ہے کہ کہیں مکروہ کی گھاٹی میں نہ پہونچ جائے، معلوم ہوا کہ حلال کی بھی ایک حد ہے اور مکروہ کی بھی ایک حد ہے — اب ابن حبان کی حدیث ”حلال کو ستره بنالو“ کا مطلب واضح ہوگیا۔

قولہ استبرأ لدینه وعرضه اس نے اپنے دین اور آبرو کو بچالیا، دین کو بچایا تو یوں ہوا کہ حرام کا مرتکب نہ ہوا اور آبرو کی حفاظت یوں ہوئی کہ مشتبہ کام نہ کرنے کی وجہ سے لوگوں کے طعن اور ان کی انگشت نمائی سے محفوظ رہا — فرض کیجئے کہ ایک شخص کسی اجنبی عورت کے ساتھ ہو تو گو خیال فاسد نہ ہو مگر لوگ طعن کریں گے اور آبرو پر حرف آئے گا۔

---

(۲) فتح الباری ج ۱ ص ۱۱۸

. . . .

حمیٰ اس جگہ کو کہتے ہیں جسے بادشاہ اپنے خاص مواشی کے لئے گھیر لیتے تھے، کوئی دوسرا شخص اس میں نہیں چرا سکتا تھا ــــ امام شافعی کے یہاں یہ مسئلہ ہے(۱) اور خلفائے راشدین سے ثابت ہے کہ ربذہ میں چھاؤنی تھی اور حمیٰ بنائی گئی تھی جن میں تیس ہزار گھوڑے رہتے تھے ــــ اور اب باڑہ بنا دیتے ہیں یا تار وغیرہ لگا دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ جو کوئی باڑہ پر اپنے جانور چرائے گا تو بہت ممکن ہے کہ غفلت میں جانور اندر گھس جائے تو یقیناً اس کی سزا ملے گی، اسی لئے فرمایا کہ قریب بھی مت جاؤ تاکہ محفوظ رہو ــــ اسی طرح فرماتے ہیں کہ اللہ کے محرمات کی بھی حد بندی ہے، اس کے قریب جو کوئی چرائے گا تو اندیشہ ہے کہ حمیٰ میں پڑ جائے گا اور وہ چیزیں مشتبہات ہیں، تو محارم حمیٰ ہیں اور قریب کی چیزیں مشتبہات ہیں ــــ یہ نہایت بہترین تشبیہ ہے۔

قولہ ان فی الجسد مضغۃً ، یہ مزید فائدہ بتلاتے ہیں اور ایک ایسی حقیقت پر مطلع کرتے ہیں کہ اگر کوئی اس پر عامل ہو تو مشتبہات سے بچ سکتا ہے ــــ حقیقت تقویٰ بیان کرتے ہیں کہ جب تک اللہ کے ڈر سے دل متاثر نہ ہو اس وقت تک کچھ فائدہ نہیں ہوتا، یہ مضغۃ (قلب) اگر ٹھیک ہے تو سارا جسم ٹھیک ہے اور اگر وہ فاسد ہے تو جسم بھی فاسد ــــ یہ تو روحانی حیثیت سے فرما رہے ہیں، ویسے طبی حیثیت سے بھی حیات موقوف ہے حرکت قلب پر، حرکت قلب بند ہوتے ہی حیات ختم ہو جاتی ہے، یہاں مراد نبی علیہ السلام یہ ہے کہ دل میں تقویٰ وخوف وخشیت الٰہی موجود ہے تو وہ مشتبہات سے بچ جائے گا ورنہ اگر دل ہی کی مشین خراب ہے تو پھر مشتبہات سے کیا بچ سکتا ہے، اس لئے فرماتے ہیں کہ مشین درست کرلو تو سب کام درست ہو جائے گا۔

فائدہ: علامہ ابن قیم نے کتاب الروح میں ایک مفید بحث کی ہے، اس کا ایک حصہ سناتا ہوں، انھوں نے کہا ہے کہ نفس اور روح ایک ہی چیز ہے مگر کچھ افعال کا فرق ہے، بعض افعال کے اعتبار سے روح اور بعض افعال کے لحاظ سے اسی کو نفس کہتے ہیں کیونکہ اس میں نفائس ہوتے ہیں، یا سانس چونکہ مظہر حیات ہے اس لئے نفس کہتے ہیں، یا یہ کہ حیات کے لحاظ سے روح ہے اور موت کے اعتبار سے نفس کہتے ہیں۔

رہا قلب تو وہ اس جسم صنوبری کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک لطیفہ ہے جو اس جسم کے اندر ہے جیسے کہ دماغ میں تمام حواس ہوتے ہیں، حالانکہ جسم میں وہ نظر نہیں آتے، حکماء نے دماغ کے حصے کر کے بتلا دیا کہ دماغ کے اس حصہ میں حس مشترک ہے، یہاں خیال ہے، یہاں حافظہ ہے اور یہاں وہم۔ لیکن ظاہر میں محض جسم ہی ہے ــــ اسی طرح قلب کا معاملہ ہے کہ وہ تمام جسم کا بادشاہ ہے، اسی کے

---

(۱) امام ابوحنیفہؒ کی فقہ میں یہ مسئلہ نہیں ہے ۱۲ منہ

باب ٤٠ اَدَاءُ الْخُمُسِ مِنَ الْاِيْمَانِ

لوٹ کے مال میں سے پانچواں حصہ دینا ایمان میں داخل ہے۔

۵۱ — حَدَّثَنَا عَلِیُّ بْنُ الْجَعْدِ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعْبَةُ عَنْ اَبِیْ جَمْرَةَ قَالَ

ہم سے بیان کیا علی ابن جعد نے، کہا ہم کو خبر دی شعبہ نے، انھوں نے ابو جمرہ سے، کہا میں ابن عباس

كُنْتُ اَقْعُدُ مَعَ ابْنِ عَبَّاسٍ فَيُجْلِسُنِیْ عَلٰی سَرِيْرِهٖ فَقَالَ اَقِمْ عِنْدِیْ حَتّٰی اَجْعَلَ

کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا، وہ مجھ کو خاص اپنے تخت پر بٹھاتے، ایک بار کہنے لگے تو میرے پاس رہ جا میں اپنے مال میں تیرا حصہ

لَكَ سَهْمًا مِّنْ مَّالِیْ فَاَقَمْتُ مَعَهٗ شَهْرَيْنِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ وَفْدَ عَبْدِ الْقَيْسِ لَمَّا

لگادوں گا، تو میں دو مہینہ تک ان کے پاس رہا، پھر کہنے لگے عبد القیس کے بھیجے ہوئے لوگ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

اَتَوُا النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ الْقَوْمُ اَوْ مَنِ الْوَفْدُ قَالُوْا رَبِيْعَةُ،

کے پاس آئے تو آپ نے فرمایا یہ کون لوگ ہیں، یا کون بھیجے ہوئے ہیں؟ انھوں نے کہا ربیعہ کے لوگ ہیں!

قَالَ مَرْحَبًا بِالْقَوْمِ اَوْ بِالْوَفْدِ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا نَدَامٰی فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا

آپ نے فرمایا مرحبا ان لوگوں کو یا ان بھیجے ہوئے لوگوں کو، نہ ذلیل ہوئے نہ شرمندہ۔ وہ کہنے لگے یا رسول اللہ ہم

لَا نَسْتَطِيْعُ اَنْ نَّاْتِيَكَ اِلَّا فِی الشَّهْرِ الْحَرَامِ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ هٰذَا الْحَیُّ مِنْ

آپ کے پاس نہیں آسکتے لیکن ادب والے مہینہ میں، کیونکہ ہمارے اور آپ کے درمیان کفار مضر کا

كُفَّارِ مُضَرَ

قبیلہ ہے

حکم سے سارے جسم کے سارے کام انجام پاتے ہیں، وہی عقل کا محل بھی ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک عقل ایک قوت ادراکی کا نام ہے، اس میں اختلاف ہے کہ اس کا محل کیا ہے، امام شافعیؒ قلب کو محل عقل قرار دیتے ہیں، جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا، قرآن کریم سے بھی اسی کی تائید نکلتی ہے، فرمایا گیا: انّ فی ذٰلك لذكرٰی لمن كان لهٗ قلبٌ او القی السمع وهو شهيدٌ[1] نیز دوسری جگہ فرمایا: افلم يسيروا فی الارض فتكون لهم قلوب يعقلون بها[2] دونوں

---

(۱) ق : ۳۷ (۲) الحج : ۴۶

فَمُرْنَا بِاَمْرٍ فَصْلٍ نُخْبِرْبِهٖ مَنْ وَرَاءَنَا وَنَدْخُلْ بِهِ الْجَنَّةَ وَسَأَلُوْهُ عَنِ

تو ہم کو خلاصہ ایک ایسی بات بتلا دیجئے کہ جس کی خبر (اپنے) ان لوگوں کو کر دیں جو یہاں نہیں آئے ، اور اس پر عمل کر کے ہم

الْاَشْرِبَةِ فَاَمَرَهُمْ بِاَرْبَعٍ وَنَهَاهُمْ عَنْ اَرْبَعٍ ، اَمَرَهُمْ بِالْاِيْمَانِ بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ

بہشت میں جائیں ، اور انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باسنوں کو بھی پوچھا ، آپ نے چار باتوں کا ان کو حکم دیا اور چار

باتوں سے منع کیا ، ان کو یہ حکم دیا کہ اکیلے (سچے) خدا پر ایمان لاؤ

آیتوں سے عقل کا محل قلب معلوم ہوتا ہے ، حکمار کہتے ہیں کہ عقل دماغ میں ہے نہ کہ قلب میں ، ہاں اخلاق بیشک قلب سے متعلق ہیں ، یہی امام صاحب سے منقول ہے ، کہاں تک صحیح ہے واللہ اعلم ۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اصل منبع قلب ہے لیکن چونکہ قلب و دماغ کا قریبی اتصال ہے اس لئے پتہ نہیں چلتا ، اس کی مثال بجلی کے بٹن کی سی ہے کہ بٹن دبایا اور روشنی ہوگئی ، ایسے ہی بٹن تو قلب ہے اور دماغ میں اس کی بتیاں ہیں ، اس تقریر پر قرآن میں بھی تاویل کی ضرورت نہیں ہوتی اور حکمار کا اختلاف بھی نہیں ہوتا ، فن تشریح میں ثابت کیا ہے کہ ادراکات کا تعلق دماغ سے ہے تو شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جنبش قلب میں ہوتی ہے اور تصویر دماغ میں بنتی ہے اور چونکہ قریبی اتصال ہے اس لئے پتہ نہیں چلتا جیسے بٹن کے دبانے اور روشنی کے ہونے میں کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا ، غرض اصل قلب ہی ثابت ہوا اور اسی کی صلاح پر تمام بدن کا صلاح اور اسی کے بگاڑ پر تمام بدن کا بگاڑ ہوتا ہے ، اس لئے مومن کا کام یہ ہے کہ وہ اس کی فکر پوری طرح کرے تو محارم سے بچ جائے گا اور تقویٰ بھی حاصل ہوگا ۔

باب ۴۰ اداء الخمس من الایمان

حدیث ۵۱ . ابو جمرہ تابعی ہیں ، ان کا نام نصر ابن عمران ہے جو قبیلہ ضبیعہ سے ہیں ، ضبیعہ عبدالقیس کی ایک شاخ ہے اور اسی وجہ سے غالباً ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان کی قوم کے متعلق حدیث سنائی ۔

قولہ **قال کنت اقعد مع ابن عباس یجلسنی علی سریرہ فقال اقم عندی الخ** بعض میں ایک سال کا ذکر ہے تخت پر بٹھلانے اور کچھ دینے کا وعدہ کرنے میں یہ حکمت تھی کہ یہ ترجمان تھے اور فارسی زبان جانتے تھے ، یہ بصرہ میں رہتے تھے اور بصرہ چونکہ ایران سے متصل ہے اس لئے یہ فارسی داں بھی تھے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کو فارسی نہیں آتی تھی اس لئے ان کو اپنے پاس بٹھاتے تھے تاکہ ترجمانی کر سکیں اور اسی خدمت کی ابن عباس انھیں اجرت دیتے تھے ۔ اس سے یہ مسئلہ بھی نکالا کہ اجرت علی التعلیم جائز ہے ، حالانکہ یہ غلط ہے حقیقت یہ تھی کہ ایک موقع پر ابن عباس رضؓ ان سے کسی بات پر بہت خوش ہوئے تھے ، اس وقت اس خوشی میں دینے کو کہا تھا ____ واقعہ یہ تھا کہ ابو جمرہ حج کو جا رہے تھے ، انھوں نے تمتع کا احرام باندھا ، بعض لوگوں نے اعتراض کیا تو انھوں نے ابن عباسؓ سے مسئلہ

. . . .

پوچھا، ان کا مسلک خود تمتع کا تھا اس لئے ان کو بھی بتا دیا اور وہ مطمئن ہو کر تمتع کے احرام سے روانہ ہو گئے، ایک دن انھوں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے اے ابو جمرہ! تیرا حج وعمرہ مقبول ہو گیا، انھوں نے لوٹ کر یہ خواب ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بیان کیا تو ابن عباس رضی اللہ عنہ کو اس سے بہت خوشی ہوئی اور اپنے مسلک کی صحت کا یقین بڑھ گیا، اس خوشی میں انھوں نے دینے کا وعدہ کیا تھا ـــ اس سے واضح ہو گیا کہ تعلیم کی اجرت نہ تھی ـــ غرض یہ ابن عباسؓ کے پاس ٹھہر گئے، ایک دن ایک بوڑھی عورت نے نبیذ کا مسئلہ پوچھا، ابن عباسؓ نے اس کا جواب دیا تو ابو جمرہ کو یہ سوال وجواب سن کر خیال آیا کہ میں بھی جرّہ میں نبیذ بناتا ہوں اور گو اس میں سکر نہیں ہوتا مگر کسی مجلس میں دیر تک بیٹھنے سے بہکی بہکی باتوں کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، انھوں نے اپنا یہ خیال ابن عباسؓ سے ظاہر کیا، اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے وفد عبد القیس کی یہ حدیث سنائی (یہ قبیلہ عبد القیس بحرین میں آباد تھا اور درمیان میں قبیلہ مضر اور دوسرے قبیلے آباد تھے جن سے ان کی جنگ رہتی تھی عام اوقات میں حاضری کا موقع نہ تھا، صرف اشہر حرم میں آسکتے تھے، بحرین میں اسلام منقذ ابن حیانؓ کی معرفت پہونچا، منقذ کپڑے کی تجارت کرتے تھے، مدینہ تک ان کا کاروبار پھیلا ہوا تھا [ایک مرتبہ کہیں بیٹھے ہوئے تھے کہ اسی دوران] نبی علیہ السلام ان کے پاس سے گذرے، منقذ اُن کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے، تو آپؐ نے ان کے اور ان کی قوم کے حالات دریافت فرمائے اور بحرین کے رؤسا کے حالات ان کے نام لے کر پوچھے، اس سے منقذ بہت متاثر ہوئے اور مسلمان ہو گئے، مگر اپنے وطن پہونچ کر اپنا اسلام ظاہر نہیں کیا، نماز خفیہ گھر میں پڑھ لیتے تھے، بیوی کو اس چیز سے شبہہ ہوا، انھوں نے اپنے باپ منذر ابن عائذ ملقب بہ اشج سے تذکرہ کیا کہ اب کی جب سے یہ مدینہ سے آئے ہیں ان ان اوقات میں ہاتھ منھ پیر دھوتے ہیں اور قبلہ رو ہو کر کبھی جھکتے ہیں کبھی سر زمین پر رکھتے ہیں، خسر نے داماد سے پوچھا کہ تم یہ کیا نئی بات کرتے ہو؟ تو انھوں نے سب ماجرا کہہ سنایا اور یہ بھی کہہ دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمھارا حال بھی پوچھتے تھے، یہ سن کر یہ بھی مسلمان ہو گئے، اب منقذ ومنذر دونوں نے تبلیغ شروع کی اور سنہ ۶ھ میں بارہ اشخاص کا وفد حاضر خدمت ہوا اور سنہ ۸ھ میں چالیس آدمیوں کا یہ وفد آیا جس کو حضورؐ نے مرحبا کہا[1])

قولہ قال مرحبًا بالقوم او بالوفد غالب گمان یہ ہے کہ شک کرنے والے شعبہ ہیں، کذا قالہ الحافظ، یہ عبد القیس ایک بڑے قبیلہ ربیعہ کی ایک شاخ ہے، دراصل ربیعہ، مضر، انمار، ایاد چار بھائی تھے، باپ نے میراث میں ایک ایک چیز چاروں کو تقسیم کی تھی، ربیعہ کو خیل (گھوڑے) دئے تھے، اس لئے انھیں ربیعۃ الخیل کہتے ہیں، مضر کو سونا دیا تھا اسلئے

(۱) اضافہ از جامع تقریر۔

قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَا الْاِیْمَانُ بِاللّٰہِ وَحْدَہٗ ؟ قَالُوا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ، قَالَ شَھَادَۃُ

آپ نے فرمایا تم جانتے ہو اکیلے (سچے خدا) پر ایمان لانا کیا ہے ؟ انھوں نے کہا (ہم کیا جانیں) اللہ اور اس کا رسول خوب جانتا ہے، آپ نے فرمایا

اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَاِقَامُ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءُ الزَّکٰوۃِ وَصِیَامُ رَمَضَانَ

اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد اس کے رسول ہیں۔ اور نماز ٹھیک کرنا اور زکوٰۃ دینا اور رمضان کے روزے رکھنا

انھیں مضر الحمرا کہا جانے لگا، مضر ہی کی اولاد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ انمار کو درا ہم اور زمین ملی تھی اور ایاد کو ابلق گھوڑے اور بیل گائے ملے تھے، عبد القیس ربیعہ کی شاخ تھی اور مدینہ سے مشرق میں آباد تھی۔

عینیؒ نے اس قصہ کو بہت مفصل لکھا ہے، اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ لوگ مسلمان ہونے کے بعد زیارت کی غرض سے حاضر ہوئے تھے (اس وفد کے سردار وہی اشج تھے جن کا ذکر حضورؐ نے ان کے داماد منقذ ابن حیان سے کیا تھا، حاضر مدینہ ہونے پر سب لوگ سواریوں سے کود کود کر شدت اشتیاق میں حضورؐ کی خدمت میں پہونچ گئے، مگر یہ نہ گئے بلکہ اتر کر پہلے سامان کو یکجا اور محفوظ کیا، پھر غسل کیا، کپڑے بدلے اور متانت اور وقار کے ساتھ دربار میں حاضر ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس رویہ کو پسند فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جو خدا کو بہت پیاری اور محبوب ہیں، ایک حلم و بردباری یعنی غصہ سے مغلوب نہ ہونا اور دوسری اناۃ یعنی کاموں میں بے صبری اور جلد بازی نہ کرنا، بلکہ ہر کام کو متانت اور وقار کے ساتھ اطمینان سے انجام دینا)[1]۔

قولہ غَیْرَ خَزَایَا وَلَا نَدَامٰی نہ مغلوب ہو کر آئے تھے کہ رسوا ہوں، نہ لڑکر کہ نادم ہوں۔

نَدَامٰی جمع نَدْمَان کی ہے، مگر وہ یہاں مناسب اور برمحل نہیں، کیونکہ ندمان، شرابی کے مصاحب یا مطلقاً مصاحب کو کہتے ہیں، اگر نادم کی جمع کہیں تو اس کی جمع نَدَامٰی نہیں آتی، اس لئے علماء نے یہ کہا ہے کہ نَدَامٰی جمع نادم ہی کی ہے مگر علی سبیل الاتباع ـــ خَزَایَا کے مقابلہ میں نَدَامٰی کہہ دیا جیسے "اَلْعَشَایَا وَالْغَدَایَا" کہا جاتا ہے، تو باوجودیکہ غَدَاۃ کی جمع غَدَوَات آتی ہے لیکن عَشَایَا کے مقابلہ میں سجع کیلئے غَدَایَا کہہ دیا، ایسے ہی یہاں بھی

قولہ اِلَّا فِی الشَّھْرِ الْحَرَامِ شہر حرام سے اشہر حرم مراد لئے جائیں یا خاص رجب ؟ کیونکہ مضر والے رجب کا خاص احترام کرتے تھے، اسی لئے احادیث میں "رَجَبُ مُضَرَ" آتا ہے۔

بِاَمْرٍ فَصْلٍ میں فصل بمعنی فاصل یا بمعنی مفصول دونوں ممکن ہیں۔

---

(۱) اضافہ از جامع تقریر بحوالہ معارف الحدیث جلد دوم

وَاَنْ تُعْطُوْا مِنَ الْمَغْنَمِ الْخُمُسَ وَنَهَاهُمْ عَنْ اَرْبَعٍ، عَنِ الْحَنْتَمِ وَالدُّبَّاءِ وَالنَّقِيْرِ

اور (کافروں سے) جو لوٹ ملے اس کا پانچواں حصہ داخل کرنا اور چار برتنوں سے ان کو منع کیا، سبز لاکھی مرتبان اور کدو کے تونبے

وَالْمُزَفَّتِ وَرُبَّمَا قَالَ وَالْمُقَيَّرِ وَقَالَ احْفَظُوْهُنَّ وَاَخْبِرُوْا بِهِنَّ مَنْ وَّرَائَكُمْ

اور کریدے ہوئے لکڑی کے برتن اور مزفت یا مقیر (یعنی روغنی برتن) سے، اور فرمایا ان باتوں کو یاد رکھو اور جو لوگ تمہارے پیچھے (اپنے ملک میں) ہیں ان کو بھی بتلا دو

قولہ وسالوہ عن الاشربۃ، ظروف شراب کے بارے میں خاص طور پر سوال کیا، آگے اس کا جواب بھی آتا ہے ـــ آپ نے انھیں چار باتوں کا حکم دیا اور چار ہی باتوں سے روکا۔

قولہ امرھم بالایمان وحدہ، آپ نے انھیں حکم دیا ایمان باللہ وحدہ کا ـــ پھر پوچھا:

اتدرون ما الایمان باللہ وحدہ؟ جانتے بھی ہو کہ صرف اکیلے اللہ پر ایمان کا کیا مطلب ہے؟ ـــ انھوں نے عرض کیا:

اللہ ورسولہ اعلم اللہ اور اس کے رسول زیادہ اچھا جانتے ہیں (ہم کیا جانیں) تب آپ نے فرمایا

شہادۃ ان لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ الخ بخاری نے تمام چیزوں کو تفصیل ایمان قرار دیا کہ سب ایمان باللہ کی تفسیر ہے، اب ترجمہ بخاری کہ اداء الخمس من الایمان ثابت ہوگیا، حالانکہ یہ بالکل خلاف ظاہر ہے اور روایات میں صراحت ہے کہ آپ نے شہادۃ ان لا الہ الا اللہ کہا وعقد واحدۃ اس عقد سے معلوم ہوا کہ یہ چار میں کی صرف ایک ہے، تین باقی رہیں، اور اگر آخر تک ایک ہی کی تفسیر ہے تو بقیہ اشیاء ثلثہ کہاں ہیں ـــ بیضاوی نے شرح مصابیح میں کہا ہے کہ راوی نے بقیہ تین چیزیں بھول کر یا اختصار کے طور پر حذف کردیں، ورنہ آپ نے سب بیان کی تھیں، مگر یہ بالکل خلاف قیاس ہے کہ تمام راوی بھول گئے ہوں۔

علاوہ بریں جب سارے اعمال ایمان باللہ ہی میں داخل ہوگئے جیسا کہ تمہارا مذہب ہے تو پھر اب رہی کیا چیز کہ تم کہتے ہو کہ تین اور ہیں۔ یہ تکلف بارد ہے صحیح بات یہ ہے کہ یہیں چاروں باتیں بیان کی ہیں اور وہ یہی ہیں، شہادۃ، اقامۃ صلوٰۃ، ایتاء زکوٰۃ، صیام رمضان۔ اب رہی بات وان تعطوا کی، تو درحقیقت وہ زیادۃ (فائدہ زائدہ) ہے، کوئی چار روپئے دیکر پانچواں روپیہ بھی دے دے تو کیا وعدہ خلاف ہوگا، چونکہ یہ بات ان کے حسب حال تھی، وہ ہر وقت جہاد کرتے تھے اور اس میں غنائم بھی آتے تھے اس لئے اس کا بھی ذکر کر دیا یا یوں کہا جائے کہ چار میں ادائے خمس داخل ہے اور ابتداء میں شہادۃ کا ذکر تبرکاً ہے، وہ شمار میں نہیں ہے۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا: وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ

بابٌ [۴۱] ماجاء اَنَّ الاَعمالَ بِالنِّيَّةِ وَالحِسبَةِ وَلِكُلِّ امرِءٍ مانَوَى

اس بات کا بیان کہ عمل بغیر نیت اور خلوص کے صحیح نہیں ہوتے ، اور ہر آدمی کو وہی ملے گا جو نیت کرے ، تو

فَدَخَلَ فِيهِ الاِيمانُ وَالوُضوءُ وَالصَّلٰوةُ وَالزَّكٰوةُ وَالحَجُّ وَالصَّومُ وَالاَحكامُ

عمل میں ایمان اور وضو اور نماز اور زکوٰۃ اور حج اور روزہ اور سارے معاملات (جیسے بیع وشراء ، نکاح وطلاق وغیرہ) آگئے

وَقالَ تَعالٰى : (قُل كُلٌّ يَّعمَلُ عَلٰى شاكِلَتِهِ) عَلٰى نِيَّتِهِ نَفَقَةُ الرَّجُلِ عَلٰى اَهلِهِ

اور اللہ نے (سورۂ بنی اسرائیل میں) فرمایا : اے پیغمبر کہدو ہر کوئی اپنے طریق یعنی اپنی نیت پر عمل کرتا ہے ، اور (اسی وجہ سے)

يَحتَسِبُها صَدَقَةٌ وَقالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ وَلٰكِن جِهادٌ وَّنِيَّةٌ

آدمی اگر ثواب کے لئے خدا کا حکم سمجھ کر اپنے گھر والوں پر خرچ کرے تو صدقہ کا ثواب ملتا ہے (اور جب مکہ فتح ہوگیا) تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : (اب ہجرت نہیں رہی) لیکن جہاد اور نیت باقی ہے .

شَيءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهُ[1] الآیۃ ، اس میں اللہ کا ذکر تبرکا ہے .

اس موقع پر حج کا ذکر نہیں ہے ، ظاہر ہے کہ فرض ہو چکا تھا ، مگر ابو جمرہ کی حدیث میں ذکر نہیں ، ابو جمرہ کے علاوہ عکرمہ رضؓ اور سعید ابن المسیب رضؓ نے بھی ابن عباس رضؓ سے روایت کی ہے ، وہاں حج کا ذکر بھی ہے ، یہ دونوں روایتیں فتح الباری میں ہیں ، اس کا بھی امکان ہے کہ کسی خاص سبب سے چھوڑ دیا اور اس کا بھی امکان ہے کہ قصداً اختصار کر دیا .

قولہ ونهاهم عن اربع . حنتم : شراب کا گھڑا ، سبو . اکثر یہ سبز رنگ کا ہوتا تھا اس لئے اس کی تفسیر میں الجرة الخضراء کہدیا .

دُبّاء : تومڑا . کدو کا گودا نکال کر اس کے چھلکے کو خشک کر لیتے تھے اور اس میں شراب بناتے تھے ، چونکہ اس میں مسامات نہیں ہوتے ، اس لئے جوش جلد آتا تھا .

نقیر : کھجور کی جڑ کو کھود کر پیالہ سا بناتے تھے .

مزفت یا مقیّر : مزفت ، زفت سے ہے اور مقیّر قار سے . اور قار کو قیر بھی کہتے ہیں ، عموماً اس کا ترجمہ رال کرتے ہیں ، یہ کسی درخت کا عصارہ ہے جو ایران میں ہوتا ہے اور لکھا ہے کہ اسی سے جہازوں اور کشتیوں میں پالش کی جاتی ہے .

---

(۱) انفال : ۴۱

۵۲ ـ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مَسْلَمَةَ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ يَحْيٰى بْنِ

ہم سے بیان کیا عبد اللہ ابن مسلمہ نے کہا خبر دی ہم کو امام مالک نے ' انھوں نے یحیٰی ابن سعید سے ' انھوں نے

سَعِيْدٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اِبْرَاهِيْمَ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنِ ابْنِ وَقَّاصٍ عَنْ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ

محمد ابن ابراہیم سے ' انھوں نے علقمہ سے انھوں نے ابن وقاص سے ' انھوں نے حضرت عمر سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ وَلِكُلِّ امْرِءٍ مَا نَوٰى فَمَنْ

فرمایا : عمل نیت ہی سے صحیح ہوتے ہیں (یا نیت ہی سے ان میں ثواب ملتا ہے) اور ہر آدمی کو وہی ملے گا جو نیت کرے

كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ

پھر جو کوئی اپنا دیس اللہ اور اس کے رسول کے لئے چھوڑے گا اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوگی اور جو کوئی دنیا

لِدُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوِ امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ

کمانے کے لئے یا کسی عورت کو بیاہنے کے لئے دیس چھوڑے گا تو اس کی ہجرت انھی کاموں کے لئے ہوگی ۔

علامہ انور شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ غلط ہے ، بلکہ یہ زمین سے نکلتی ہے اور مٹی کے تیل کے نیچے سے نکالتے ہیں جیسے تارکول اسی طرح کی کوئی چیز ہے ، بہر حال اس سے برتن پر روغن کرتے تھے تاکہ غلیان جلد ہو ۔

باب[۴۱] ماجاء ان الاعمال بالنیّۃ والحسبۃ الخ

الحسبۃ یعنی احتساب و اخلاص کے ساتھ اللہ کے واسطے کسی کام کا کرنا ۔

قولہ فدخل فیہ الایمان الخ یہ بخاری اپنی طرف سے کہہ رہے ہیں کہ کوئی عبادت ، کوئی قربت وسائل سے ہو یا مقاصد سے نیز کوئی عمل ایمان سے خارج نہیں ، لہٰذا نیت ہونی چاہئے ، وضو میں نیت کی بحث گذر چکی ہے کہ پانی بالطبع طاہر ہے اس میں نیت کی ضرورت نہیں ، جیسے غسل ثوب وغیرہ میں نیت کی ضرورت نہیں ، حالانکہ وہ بھی عمل ہے تو عموم انما الاعمال میں وہ بھی داخل ہے ۔ اس اعتراض کا جواب مخالفین یہی دیتے ہیں کہ چونکہ وہ بالطبع مطہر ہے اس لئے نیت کی ضرورت نہیں ، ہم کہتے ہیں اسی طرح یہاں وضو میں چونکہ پانی بالطبع مطہر ہے اس لئے نیت کی ضرورت نہیں ۔ رہا تیمم ، تو چونکہ مٹی بالطبع طاہر و مطہر نہیں اس لئے نیت کی ضرورت ہے ۔ البحر الرائق میں ہے کہ وضو عبادت جب بنے گا جب نیت ہو ' تو معلوم ہوا کہ مطہر تو بغیر نیت کے بن جائے گا لیکن عبادت نیت ہی سے بنے گا ۔ الاشباہ والنظائر میں اس پر مبسوط بحث کی گئی ہے کہ احناف کے ہاں کن کن مواقع میں نیت ضروری ہے اور کہاں کہاں نہیں ۔ ۲۱

قولہ قال اللہ تعالیٰ قل کلّ یعمل علی شاکلتہ ، علی نیّتہ ۔ شاکلتہ کی تفسیر حسن بصری سے منقول ہے ' دیگر

۵۳ ـ حَدَّثَنَا حَجَّاجُ بْنُ مِنْهَالٍ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ اَخْبَرَنِیْ

ہم سے حجاج ابن منہال نے بیان کیا، کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا، کہا مجھ کو عدی ابن ثابت نے خبر

عَدِیُّ بْنُ ثَابِتٍ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ يَزِيْدَ عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِیِّ

دی، کہا میں نے عبداللہ ابن یزید سے سنا، انھوں نے ابومسعود سے، انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپ نے

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَنْفَقَ الرَّجُلُ عَلٰى اَهْلِهٖ يَحْتَسِبُهَا فَهِیَ لَهٗ صَدَقَةٌ

فرمایا: جب کوئی اپنے گھر والوں پر ثواب کی نیت سے (اللہ کا حکم سمجھ کر) خرچ کرے تو صدقہ کا ثواب پائے گا۔

۵۴ ـ حَدَّثَنَا الْحَكَمُ بْنُ نَافِعٍ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِیِّ قَالَ

ہم سے ابوالیمان حکم ابن نافع نے بیان کیا کہا ہم کو شعیب نے خبر دی، انھوں نے زہری سے

حَدَّثَنِیْ عَامِرُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ اَنَّهٗ اَخْبَرَهٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ

کہا مجھ سے بیان کیا عامر ابن سعد نے، انھوں نے سعد ابن ابی وقاص سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِیْ بِهَا وَجْهَ اللّٰهِ اِلَّا اُجِرْتَ

تو جو کچھ خرچ کرے اور اس سے تیری نیت اللہ کی رضامندی کی ہو تو تجھ کو اس کا ثواب ملے گا،

عَلَيْهَا حَتّٰى مَا تَجْعَلُ فِیْ فَمِ امْرَاَتِكَ

یہاں تک کہ اس پر بھی جو تو اپنی جورو کے منھ میں ڈالے؛

علماء نے کہا ہے کہ "شاکلتہ" سے بواطن امور مراد ہیں، یعنی جو اس کے دل میں، وہی ظاہر ہوتا ہے۔ الاناء یترشح بما فیہ۔

قولہ نفقۃ الرجل علی اھلہ یحتسبھا صدقۃ"۔ یہ ایک حدیث کے الفاظ ہیں۔ یعنی اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا بھی ایک قسم کا صدقہ ہے۔

ولکن جہاد ونیّۃ، یہ دوسری حدیث کا ٹکڑا ہے، جب مکہ فتح ہوگیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لاھجرۃ بعد الفتح ولکن جہاد ونیّۃ، یعنی اگر جہاد نہ ہو تو یہ نیت رکھے کہ جب بھی خلیفہ بلائے گا تو حاضر وشریک ہوگا ــــ امام بخاری کی غرض یہ ہے کہ نیت کے مراتب ہیں، جس درجہ کی نیت ہوگی ویسا ہی ثواب ہوگا۔

حدیث ۵۳ فھی لہ صدقۃ، بلکہ اس سے بڑھ کر وہ حدیث ہے جس میں فرمایا گیا فی بضع احدکم صدقۃ سوال کیا گیا کہ اگر ایک شخص اپنی شہوت مٹاتا ہے اسے بھی اجر ملے گا؟ فرمایا ہاں، اگر حرام میں رکھتا تو اسے سزا ملتی، تو حلال میں اجر

بابُ ۴۲ قَوْلِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ لِلّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِہِمْ وَقَوْلِہٖ تَعَالٰی (اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ دین کیا ہے؟ سچے دل سے اللہ کی فرماں برداری اور اس کے پیغمبر اور مسلمان حاکموں کی اور تمام مسلمانوں کی خیر خواہی' اور اللہ تعالیٰ نے (سورۂ توبہ میں) فرمایا: جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی میں

۵۵ـــ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا یَحْیٰی عَنْ اِسْمٰعِیْلَ قَالَ حَدَّثَنِیْ قَیْسُ ابْنُ اَبِیْ حَازِمٍ عَنْ جَرِیْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ الْبَجَلِیِّ قَالَ بَایَعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی اِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ وَالنُّصْحِ لِکُلِّ مُسْلِمٍ

ہم سے مسدد نے بیان کیا، کہا ہم سے یحییٰ ابن سعید قطان نے بیان کیا، انھوں نے اسمٰعیل سے، کہا مجھ سے قیس ابن ابی حازم نے بیان کیا، انھوں نے جریر ابن عبداللہ بجلی سے سنا، انھوں نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے بیعت کی ان باتوں پر کہ نماز درستی کے ساتھ ادا کروں گا اور زکوٰۃ دیا کروں گا اور ہر مسلمان کا خیر خواہ رہوں گا۔

بھی ملے گا۔

حدیث ۵۴ . حضرت سعد نے یہ اس وقت فرمایا جب وفات کا وقت قریب تھا جب وہ بیمار ہوئے تو حضورؐ ان کی عیادت کو تشریف لے گئے تھے، اس وقت حضرت سعد نے عرض کیا کہ میرا یہ حال ہے آپ کچھ نصیحت فرما دیجئے تاکہ میں وصیت کر جاؤں، ان کا گمان یہ تھا کہ شاید آخری وقت ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کچھ فرمائیں تو وصیت کر جاؤں تاکہ آخرت میں میرے کام آئے، اس وقت آپ نے فرمایا: ابھی تم مروگے نہیں، ابھی بہت کماؤگے اور بہت خرچ کروگے البتہ اگر نیت اچھی کروگے تو اس صدقہ کا ثواب ملے گا۔

بابُ ۴۲ قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم الدین النصیحۃ الخ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ دین نصیحت ہی ہے، یہ ترجمہ اس لئے کیا گیا ہے قاعدہ یہ ہے کہ جب مبتدا اور خبر دونوں معرف باللام ہوں تو حصر کا افادہ ہوتا ہے اور یہاں دونوں معرف باللام ہیں اس لئے انحصار ہوگا اور مطلب یہ ہوگا کہ دین صرف نصیحت ہی ہے کوئی اور چیز نہیں۔ مگر نصیحت کے بھی مراتب قرار دئے ہیں، ایک اللہ کے لئے، دوسرا اللہ کے رسولؐ کے لئے، تیسرا ائمہ مسلمین کے لئے، چوتھا عامۃ الناس کے لئے، یہ چار مراتب یہاں بیان فرمائے گئے۔

لغت میں نصیحت کا لفظ دو طرح استعمال ہوتا ہے، ایک خالص کرنے اور صاف کرنے کے معنی میں، جیسے نَصَحْتُ العَسَلَ میں نے شہد کو صاف اور خالص کر دیا، دوسرے استعمال میں وہ سینے کے معنی میں آتا ہے جیسے نصحتُ الثیاب، میں نے

۵۶ــ حَدَّثَنَا اَبُو النُّعْمَانِ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُو عَوَانَةَ عَنْ زِيَادِ بْنِ عِلَاقَةَ

ہم سے ابو النعمان نے بیان کیا، کہا ہم سے ابو عوانہ نے بیان کیا، انھوں نے زیاد ابن علاقہ سے، کہا

قَالَ سَمِعْتُ جَرِيرَ ابْنَ عَبْدِ اللّٰهِ يَوْمَ مَاتَ الْمُغِيرَةُ بْنُ شُعْبَةَ قَامَ فَحَمِدَ

میں نے جریر ابن عبداللہ سے سنا، جس دن مغیرہ ابن شعبہ (کوفہ کے حاکم) مرگئے تو وہ خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے

اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ وَقَالَ عَلَيْكُمْ بِاتِّقَاءِ اللّٰهِ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَالْوَقَارِ

اور اللہ کی تعریف کی اور خوبی بیان کی اور کہا تم کو اللہ کا ڈر رکھنا چاہیے اس کا کوئی ساجھی نہیں، اور تحمل اور

وَالسَّكِينَةِ حَتّٰى يَاْتِيَكُمْ اَمِيرٌ فَاِنَّمَا يَاْتِيكُمُ الْاٰنَ ثُمَّ قَالَ اسْتَعْفُوا لِاَمِيرِكُمْ،

اطمینان سے رہنا چاہیے اس وقت تک کہ کوئی دوسرا حاکم تمھارے اوپر آئے وہ اب آتا ہے، پھر یہ کہا کہ اپنے

فَاِنَّهُ كَانَ يُحِبُّ الْعَفْوَ ثُمَّ قَالَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّي اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

(مرے ہوئے) حاکم کے لئے مغفرت کی دعا مانگو، کیونکہ وہ (مغیرہؓ) بھی معافی کو پسند کرتا تھا، پھر کہا: اس کے بعد تم کو معلوم ہو کہ میں

وَسَلَّمَ قُلْتُ اُبَايِعُكَ عَلَى الْاِسْلَامِ فَشَرَطَ عَلَيَّ وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ فَبَايَعْتُهُ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور میں نے عرض کیا میں آپ سے اسلام پر بیعت کرتا ہوں، آپ نے اسلام کی شرط مجھ پر کرلی اور ہر ایک

عَلٰى هٰذَا وَرَبِّ هٰذَا الْمَسْجِدِ اِنِّي لَنَاصِحٌ لَكُمْ ثُمَّ اسْتَغْفَرَ وَنَزَلَ .

مسلمان کی خیر خواہی کی۔ میں نے اس شرط پر آپ سے بیعت کرلی، اس مسجد کے مالک کی قسم میں تمہارا خیر خواہ ہوں، پھر استغفار کیا اور (منبر سے) اترے

کپڑے سی دئے، ان دونوں معانی کو سامنے رکھ کر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نصیحت میں اول چیز تو صفائی اور خلوص ضروری ہے اور دوسری چیز یہ ہے کہ تفریق نہ ہو بلکہ جمع کرنا اور ٹوٹے ہوئے کو جوڑنا ہو۔ دونوں کا حاصل خیر خواہی سے پیش آنا اور خلوص کا معاملہ کرنا۔

حدیث کا ترجمہ اب یہ ہوا کہ دین نام ہے خیر خواہی کرنے اور خلوص سے پیش آنے کا، آگے تفصیل ہے کہ اللہ کے ساتھ خلوص ہو، یعنی اللہ کو ایک جاننا، اسے تمام کمالات کے ساتھ متصف ماننا، سارے رذائل ونقائص سے اس کو منزہ سمجھنا، مالک الملک، مقتدر اعلیٰ ماننا، ان خوبیوں کے سامنے جھکنا اور اس کے احکام کو پوری خوش دلی سے بجالانا اور ساری زندگی عبدیت اور غلامی کی زندگی بنالینا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خلوص یہ ہے کہ ان پر ایمان لانا، ان کی تصدیق کرنا، ان کے کہنے پر عمل کرنا، جو طریق زندگی وہ تجویز فرمادیں پوری دلجمعی سے بلا ادنیٰ تردد کے حق سمجھ کر قبول کرلینا اور عملاً ان کا پابند ہونا اور پابند رہنا

قولہ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ ائمہ سے مراد یا تو خلفاء ہیں یا امراء، امراء کی اطاعت حدود شریعت کے اندر رہ کر، فتنوں کو دبانا،

. . . .

اصلاح کرنا اور ان کی غلطیوں پر نرمی اور آہستگی کے ساتھ متنبہ کرنا وغیرہ ان کے ساتھ خلوص ہے ــــــ اور ائمہ سے مراد خلفاء اور ائمۂ دین ہیں تو ان کے ساتھ خلوص یہ ہے کہ ان کی تعلیم کی اشاعت کرے، ان کی عزت و تکریم کرے، ان کی تعلیمات سے فائدہ اٹھائے، لوگوں کو ان کی عزت کرنے پر برانگیختہ کرے، وغیرہ۔

قولہٗ وَلِعَامَّتِهِم، ہر ایک کی خیر خواہی کرنا "یحب لاخیه ما یحب لنفسه"۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ہر طرح ان کی بھلائی اور خیر خواہی کرے۔ اس خیر خواہی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان کو دین سکھائے اور دینی زندگی ان میں عام کرنے کی پوری کوشش کرے۔

اس حدیث کے متعلق [علماء نے] لکھا ہے کہ اگر کوئی دوسری حدیث نہ ہو تب بھی لوگوں کی ہدایت اور ان کی ساری زندگی کو ایمانی زندگی بنانے کے لئے یہی ایک حدیث کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے فائدہ اٹھانے کی توفیق مجھ کو بھی نصیب فرمائے، اور امت کے سارے طبقات کو بھی۔ آمین

حدیث ۵۶۔ قولہٗ یوم مات المغیرۃ ابن شعبۃ الخ، یہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت زیرک اور اعلیٰ درجہ کے مدبر صحابی تھے، سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور سے اہم خدمات پر مامور تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنے زمانہ میں کوفہ کا گورنر بنایا تھا، بہت ہی اعلیٰ تدبر سے خدمت انجام دی، جب ان کا انتقال ہونے لگا تو حضرت جریر ابن عبداللہ بجلیؓ کو بلا کر نصیحت فرمائی ــــ حضرت جریر ابن عبداللہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرمانے سے چھ ماہ قبل مسلمان ہوئے تھے، یہ بہت ہی خوبصورت تھے، یوسف هذه الامة ان کا لقب تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں دیکھتے تو تبسم فرماتے۔ مگر اسلام لانے کے بعد مزاج میں بہت تغیر ہو گیا تھا، لباس فاخرہ اتر گیا اور موٹا کمبل استعمال فرمانے لگے جس میں بٹن کی جگہ کانٹا لگا ہوتا تھا۔

قولہٗ حتی یاتیکم امیر فانما یاتیکم الآن۔ جب حضرت مغیرہؓ کا انتقال ہو گیا تو حضرت جریرؓ نے منبر پر چڑھ کر وعظ بیان کیا، شاید انھیں خطرہ ہوا ہو کہ مفسدین کچھ شورش نہ مچائیں، اس لئے خیر خواہی امت کے لئے انھیں نصیحتیں فرمائیں۔

بعضوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ حضرت جریرؓ خود اپنی امارت کا اعلان کر رہے ہیں اور بعض لوگوں نے یہ لکھا ہے کہ حضرت مغیرہؓ نے ان کو اپنا قائم مقام بنا دیا تھا، لیکن یہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں، اس لئے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے زیاد کو امیر بنا کر کوفہ بھیج دیا تھا ــــ اور اس لئے بھی کہ حضرت جریرؓ خود سے امیر نہ بن سکتے تھے اور نہ حضرت مغیرہ انھیں بنا سکتے تھے، ان کو اس کا حق نہیں تھا

. . . .

البتہ یہاں اس کا احتمال ہے کہ حضرت مغیرہ نے تدبر سے کام لیتے ہوئے یہ فرمایا ہو کہ امت کو خیر خواہی سے سمجھاتے رہنا، اس وقت تک کہ کوئی امیر مقرر ہو کر آجائے، چنانچہ انھوں نے یہ کام بحسن وخوبی انجام دیا اور کوئی شورش پیدا نہیں ہونے پائی اور اس کا صاف اظہار کیا کہ چونکہ نبی علیہ السلام نے مجھ سے بیعت لیتے وقت شرط لگادی تھی کہ ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا اس لئے میں امت کی خیر خواہی میں یہ نصائح کر رہا ہوں۔

وقار کے معنی متانت کے ہیں اور سکینۃ سے مراد چین وسکون اور امن ہے۔

قولہ کان یحبّ العفو اس جملہ سے یہ سمجھایا کہ جزا جنس عمل سے ہوتی ہے۔

قولہ والنصح لکلّ مُسلمٍ سے یہ غرض بتلائی کہ میری ذاتی کوئی غرض نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت کے وقت وَالنّصح لکلّ مُسلِم کی شرط لگائی تھی، اس لئے لوجہ اللہ یہ نصیحتیں کر رہا ہوں۔

وربّ ھٰذا المسجد، بعض روایات میں "ربّ المسجد الحرام" آیا ہے، اس لئے یہاں بھی وہی مراد ہے۔

(امام بخاری نے ترجمۃ الباب میں الدّین النصیحۃ رکھا کیونکہ یہ حدیث ان کی شرط پر پوری نہ تھی اس لئے اسے ترجمہ میں لائے اور آیت قرآنی سے ان کی تاکید کردی، اور دوسری حدیث جس میں النّصح لکلّ مسلم کے الفاظ ہیں، ان کی شرط کے موافق تھی اسلئے اس کو متن میں رکھا[1])

الحمد للہ کتاب الایمان ختم ہوئی

---

(۱) جامع تقریر

کتاب العلم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب ۴۳ فَضْلِ الْعِلْمِ وَ قَوْلِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ (یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ

علم کی فضیلت، اور اللہ تعالیٰ نے (سورۂ مجادلہ میں) فرمایا: جو تم میں ایماندار ہیں اور جن کو علم ملا

اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ط وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ)

اللہ ان کے درجے بلند کرے گا، اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے

وَقَوْلِہٖ (رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا)

اور (سورۂ طٰہٰ میں) فرمایا: پروردگار مجھے اور زیادہ علم دے

باب ۴۳ فضل العلم

امام بخاری نے اپنی کتاب کی ابتداء "باب بدء الوحی" سے فرمائی اور اس میں وحی کی عظمت اور اس کی صداقت وحقانیت کو واضح فرمایا، کیونکہ تمام امور واحکام کا منبع اور سارے علوم ومعارف کا سرچشمہ صرف وحی ہے، اس کے بعد ایمان کے ابواب لائے، کیونکہ ایمان ہی اصل اور بنیاد ہے، جب ایمان ہی درست نہیں تو اعمال کا کوئی وزن اور اس کی کوئی قدر اللہ کے یہاں نہیں۔ اور جب ایمان لاچکا تو اب ایمان لانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور غیر مرضیات کو معلوم کرنے کی فکر ہوگی، اور ظاہر ہے کہ یہ علم ہی کے ذریعہ حاصل ہوگا، تو علم سے غرض یہ ہوگی کہ مرضیات الٰہی معلوم ہوں، لہٰذا کتاب العلم کے عنوان کے تحت اس علم کے فضائل اور اس کے حقوق وآداب بتلائے تاکہ من وجہٍ اس سے مناسبت ہوجائے، اسی بنا پر فضل علم کا باب پہلے لائے۔

اس باب میں پہلے دو آیتیں ذکر کیں جن سے علم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، پہلی آیت سورۂ مجادلہ کی ہے، اس آیت میں

باب ٤٤ مَنْ سُئِلَ عِلْماً وَهُوَ مُشْتَغِلٌ فِي حَدِيْثِهِ فَأَتَمَّ الْحَدِيْثَ

جس شخص سے علم کی کوئی بات پوچھی جائے اور وہ دوسری بات کر رہا ہو پھر اپنی بات پوری کر کے

ثُمَّ أَجَابَ السَّائِلَ

پوچھنے والے کا جواب دے

٥٧ ـــ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سِنَانٍ قَالَ ثَنَا فُلَيْحٌ ح قَالَ وَحَدَّثَنِي

ہم سے بیان کیا محمد ابن سنان نے، کہا ہم سے بیان کیا فلیح نے۔ دوسری سند۔ اور مجھ سے بیان کیا

إِبْرَاهِيْمُ ابْنُ الْمُنْذِرِ قَالَ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فُلَيْحٍ قَالَ ثَنَا أَبِي قَالَ حَدَّثَنِي هِلَالُ

ابراہیم ابن منذر نے، کہا ہم سے بیان کیا محمد ابن فلیح نے، کہا ہم سے بیان کیا میرے باپ فلیح نے، کہا مجھ سے

بْنُ عَلِيٍّ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ بَيْنَمَا النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

بیان کیا ہلال ابن علی نے، انھوں نے عطاء ابن یسار سے، انھوں نے ابوہریرہؓ سے، کہا ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں

فِي مَجْلِسٍ يُحَدِّثُ الْقَوْمَ جَاءَهُ أَعْرَابِيٌّ فَقَالَ مَتَى السَّاعَةُ ؟

میں بیٹھے ہوئے ان سے باتیں کر رہے تھے، اتنے میں ایک گنوار آپ کے پاس آیا اور پوچھنے لگا قیامت کب آئے گی؟

پہلے کچھ آداب مجلس بیان ہو رہے ہیں، ارشاد فرمایا یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا إِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللهُ لَکُمْ وَإِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا ـ (۱) اس آیت میں دو چیزیں بتلائیں، اول یہ کہ کھل کر بیٹھو، یعنی اس طرح بیٹھو کہ دوسروں کے لئے جگہ نکل آئے، اور جب جگہ کھل دو گے تو اللہ تم پر فراخی اور کشادگی پیدا کر دے گا (جزاء جنس عمل سے ہے (۲)) اور جب کہا جائے کہ کھڑے ہو جاؤ تو کھڑے ہو جاؤ، یہاں اگرچہ پیغمبر علیہ السلام کا ذکر ہے مگر مراد یہ ہے کہ صدر جب اٹھنے کا حکم دے تو اٹھ جاؤ اور دوسروں کے لئے جگہ چھوڑ دو، اس کی جزا کیا ہے؟ یَرْفَعِ اللهُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ط اللہ تم میں سے مومنین کے اور اہل علم کے درجات بلند کرے گا ــــ اس سے دو چیزیں ثابت ہوئیں، ایک ایمان، دوسرا علم، معلوم ہوا کہ مومن کے درجات غیر مومن سے اور عالم کے غیر عالم سے زیادہ ہیں اور غالباً دو چیزیں اس لئے بتلائیں کہ یہ ادب وہی شخص ملحوظ رکھ سکتا ہے جس کے دل میں ایمان ہو اور ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اونچا فرمائے گا اور آخرت میں بھی۔ تو بخاری کا مقصود اثبات فضل علم ثابت ہو گیا اور گویا انھوں نے اس پر بھی متنبہ کر دیا کہ ایمان کے

---

(۱) مجادلہ : ۱۱ (۲) منہ

فَمَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحَدِّثُ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ سَمِعَ مَا قَالَ

آپ اپنی بات میں مصروف رہے (اور گنوار کا جواب نہ دیا) بعضے لوگ (جو اس مجلس میں حاضر تھے) کہنے لگے آپ نے گنوار کی بات

فَكَرِهَ مَا قَالَ وَقَالَ بَعْضُهُمْ لَمْ يَسْمَعْ حَتّٰى إِذَا قَضٰى حَدِيْثَهُ قَالَ أَيْنَ أُرَاهُ السَّائِلُ

سنی مگر پسند نہ کی، اور بعضے کہنے لگے نہیں! آپ نے اس کی بات سنی ہی نہیں، جب آپ اپنی باتیں پوری کر چکے

عَنِ السَّاعَةِ قَالَ هَا أَنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ فَإِذَا ضُيِّعَتِ الْأَمَانَةُ فَانْتَظِرِ

تو میں سمجھتا ہوں یوں فرمایا: وہ قیامت کو پوچھنے والا کہاں گیا؟ اس گنوار نے کہا میں حاضر ہوں یا رسول اللہ، آپ نے فرمایا:

السَّاعَةَ فَقَالَ كَيْفَ إِضَاعَتُهَا قَالَ إِذَا وُسِّدَ الْأَمْرُ إِلٰى غَيْرِ أَهْلِهِ

تو (سن لے) جب امانت (ایمانداری دنیا سے) اٹھ جائے تو قیامت کا منتظر رہ، اس نے کہا ایمانداری کیونکر اٹھ جائے گی؟ آپ نے فرمایا

فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ

جب کام نالائق کو دیا جائے تو قیامت کا منتظر رہ۔

بعد علم کا بیان کیوں لائے اس لئے کہ جس طرح آیت میں ایمان مقدم اور علم موخر ہے اسی طرح یہاں بھی کیا گیا، نیز اس طرف بھی اشارہ ہے کہ علم کے بھی درجات ہیں اور واللّٰہ بما تعملون خبیر سے اشارہ مقصود ہے کہ علم بے عمل بیکار ہے، یا یہ کہ اللہ خبردار ہے کہ کون کس درجہ کا علم رکھتا ہے اور کس مرتبہ کا شخص ہے، اسی کے اعتبار سے ہم بھی رفع درجات کریں گے۔

دوسری آیت اس بات پر صراحۃً دال ہے کہ علم بڑھنے کی چیز ہے اور اللہ سے زیادۃ کی طلب اسی وقت ہوگی جب اس میں کوئی نفع ہو، یہاں امام بخاری کوئی حدیث نہیں لائے، شاید شرط کے مطابق کوئی حدیث انھیں نہیں ملی ہوگی۔ لکھا ہے کہ امام نے تراجم پہلے لکھے تھے، بعد کو تراجم کے مناسب حدیثیں درج کیں، یہاں کوئی حدیث نہیں ملی اس لئے کوئی حدیث مذکور نہیں ہے، اور میرے خیال میں اگر یہ بات تمرین کے لئے ہے تو پھر صحیح مسلم کی یہ حدیث منطبق ہوسکتی ہے: مَن سلك طريقًا يلتمس فيه علمًا سهّل الله به طريقًا الى الجنّة۔

باب ۴۴ من سئل علمًا وهو مشتغل الخ

حدیث ۵۷ ۔ آپ گفتگو فرما رہے تھے کہ ایک اعرابی نے سوال کر دیا، آپ نے التفات نہیں فرمایا، بعض لوگوں نے کہا ہے کہ حضورؐ نے سوال سن لیا تھا مگر اس وقت سائل کا سوال کرنا پسند نہ آیا، اس لئے جواب نہیں دیا اور بعض لوگوں نے سمجھا کہ حضورؐ نے سنا ہی نہیں ـــ مگر یہ دونوں خیال صحیح نہیں بلکہ ایک دوسری ہی وجہ تھی، وہ یہ کہ آپ گفتگو میں مصروف تھے، جب بات ختم کر چکے تو آپ نے

بَابُ ۴۵ مَنْ رَفَعَ صَوْتَهٗ بِالْعِلْمِ

جس نے علم کی بات پکار کر کہی ۔

۵۸ ـــ حَدَّثَنَا اَبُو النُّعْمَانِ قَالَ ثَنَا اَبُوْ عَوَانَةَ عَنْ اَبِیْ بِشْرٍ عَنْ یُوْسُفَ بْنِ مَاهَكَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ تَخَلَّفَ عَنَّا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ سَفْرَةٍ سَافَرْنَاهَا فَاَدْرَکَنَا وَقَدْ اَرْهَقَتْنَا الصَّلٰوةُ وَنَحْنُ نَتَوَضَّأُ فَجَعَلْنَا نَمْسَحُ عَلٰی اَرْجُلِنَا فَنَادٰی بِاَعْلٰی صَوْتِهٖ وَیْلٌ لِّلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ مَرَّتَیْنِ اَوْ ثَلٰثًا۔

ہم سے بیان کیا ابو نعمان نے کہا ہم سے بیان کیا ابو عوانہ نے انھوں نے ابو بشر سے انھوں نے یوسف ابن ماہک سے انھوں نے عبد اللہ ابن عمرو سے کہا ایک سفر میں جو ہم نے کیا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے پیچھے رہ گئے (وہ سفر کہ سے مدینہ کا تھا) پھر آپ ہم سے اس وقت ملے جب (عصر کی) نماز کا وقت آن پہونچا تھا ہم (جلدی جلدی) وضو کر رہے تھے پاؤں کو (خوب دھونے کے بدل) یوں ہی سا دھو رہے تھے، آپ نے (یہ حال دیکھ کر) بلند آواز سے پکارا: دیکھو ایڑیوں کی خرابی دوزخ سے ہونے والی ہے۔ دو بار یا تین بار یہ فرمایا۔

فرمایا: اَیْنَ اُرَاہُ[1] السَّائِلُ؟ جواب میں عرض کیا میں ہوں تو آپ نے فرمایا: اذا ضیعت الامانۃ فانتظر الساعۃ یعنی قیامت کی علامت یہ ہے کہ جب امانتیں ضائع کر دی جائیں، مطلب یہ ہے کہ لوگ جن پر اعتماد کریں اور انھیں امین سمجھیں وہ امین ثابت نہ ہوں، تو اس وقت قیامت کا انتظار کرو۔ اس نے پھر سوال کر دیا کہ [امانت کی] اضاعت کیونکر ہوگی؟ یہ سوال اس ماحول کے مطابق تھا اس لئے کہ اس وقت کسی کو اس کا وہم بھی نہیں گذرتا تھا کہ امانت ضائع کر دی جائے گی اور امین خائن بن جائے گا۔ اس لئے دوبارہ پوچھا، حضور یہ کیسے ہوگا؟ آپ نے جواب میں فرمایا اس طرح معاملہ ہونے لگے گا کہ جو لوگ اہل نہ ہوں گے ان کے ذمہ کام سپرد کر دئے جائیں گے، اور جو نا اہل ہوں گے وہ عہدہ دار بن جائیں گے، تو مراد اضاعت امانت سے یہ ہوئی کہ نا اہلوں کے ہاتھ کام آپڑیں گے اور وہ اس کو امانت کے ساتھ انجام نہ دے سکیں گے۔ چنانچہ آج کل یہی ہو رہا ہے، کوئی اہل کو نہیں دیکھتا بلکہ اغراض و سفارشات پر دار و مدار رہ گیا ہے۔ یہ بھی سمجھ لو کہ "اہل" ہر شعبہ کے اعتبار سے علحدہ علحدہ ہوتا ہے، مثلاً محدث صرف وہ نہیں ہے جس کی تقریر عمدہ ہو، بلکہ حدیث کا اہل وہ شخص ہے جس میں دیانت اور علم دونوں ہوں، درحقیقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم عالم اور متعلم دونوں کو علم کا ادب بتلا رہے ہیں ـــ یہاں

---

(۱) قول الراوی ۱۲ منہ

بابٌ ٤٦ قَوْلِ الْمُحَدِّثِ حَدَّثَنَا وَاَخْبَرَنَا وَاَنْبَأَنَا وَقَالَ لَنَا الْحُمَيْدِيُّ

محدث کا یوں کہنا ہم سے بیان کیا اور ہم کو خبر دی اور ہم کو بتلایا، اور امام حمیدی نے ہم سے

كَانَ عِنْدَ ابْنِ عُيَيْنَةَ حَدَّثَنَا وَاَخْبَرَنَا وَاَنْبَأَنَا وَسَمِعْتُ وَاحِدًا۔

کہا کہ سفیان ابن عُیینہ کے نزدیک ہم سے بیان کیا اور ہم کو خبر دی اور ہم کو بتلایا اور میں نے سنا، ان سب لفظوں کا ایک ہی مطلب تھا۔

اس سلسلہ کی دو۲ باتیں بتلائیں، اول یہ کہ متعلم بیچ میں بات نہ کاٹے، جب عالم کی بات ختم ہو جائے تب سوال کرے۔ دوم یہ کہ اگر متعلم نے سوال کر ہی دیا تو اب جواب مفوض الی رای العالم ہے، اگر اپنی بات جاری رکھے اور اس کا جواب نہ دے تو یہ کبر کی علامت نہ ہوگی، ہاں اگر مصلحت دینی ہو کہ فوراً جواب دینا مناسب ہے تو دینا چاہئے، چنانچہ ایسا ہوا بھی ہے کہ حضورؐ سے عین خطبہ میں سوال ہوا اور آپ نے اسی وقت جواب دیا، تو یہ مفوض الی رای العالم ہوگا کہ جیسا مناسب ہو ویسا کرے، ایک صورت یہ بھی ہے کہ جواب بالکل نہ دے جب سائل جواب کا تحمل نہ کر سکتا ہو، یا یہ کہ فتنہ کا اندیشہ ہو، ایسے وقت میں مناسب یہ ہے کہ اسے تسلی دیدے کہ یہ تمہارے لئے مناسب نہیں، یہاں سائل غالباً قیامت کے وقت کا سوال کر رہا تھا مگر یہ اس کے مناسب نہ تھا اس لئے آپ نے اس کی علامت بیان فرمادی۔

بابٌ ٤٥ من رفع صوته بالعلم

امام بخاری یہ ترجمہ اس لئے لائے کہ بظاہر رفع صوت شور مچانا ہے اور علم دین وراثت نبوی ہے لہٰذا یہ شور اس کے خلاف ہے اسی کا جواب دیتے ہیں کہ یہ رفع صوت اور شور شغب اس میں داخل نہیں [جس کو قرآن میں ممنوع قرار دیا گیا ہے] کیونکہ حضورؐ نے بعض مواقع پر رفع صوت سے تبلیغ فرمائی ہے۔

حدیث ۵۸۔ قولہٗ قد ارهقنا الصلوٰة۔ نماز نے ہمیں پالیا تھا، یا ہم نے اسے پالیا تھا، مطلب یہ کہ وقت نماز آگیا تھا۔

قولہٗ نمسح علیٰ ارجلنا۔ یعنی جلدی جلدی دھو رہے تھے گویا کہ مسح کر رہے تھے؛ اور کنایہ ہے تعجیل سے۔

قولہٗ فنادیٰ باعلیٰ صوتہ۔ اس سے مدعا ثابت ہوگیا کہ علم کی بات اگر پکار کر کہی جائے تو خلاف ادب نہیں، اور اسکی حاجت یا تو اس لئے ہوتی ہے کہ آواز پہونچتی نہیں، یا یہ کہ رسوخ فی القلب مقصود ہوتا ہے اس لئے زور سے بات کہی جاتی ہے تاکہ قلب میں راسخ ہو جائے، بہرحال یہ صورتیں جائز ہیں۔

قولہٗ ویل للاعقاب من النار۔ ویل اور ویح دونوں ہم معنی ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ اگر مستحق ہلاکت ہے تو لفظ ویل بولتے ہیں اور اگر مستحق ہلاکت نہیں تو لفظ ویح کا استعمال ہوتا ہے، ایک ضعیف حدیث میں ہے کہ ویل

. . . .

دوزخ میں ایک وادی ہے۔

اس حدیث میں لفظ "تمسح" آیا ہے اس لئے روافض پیروں کے مسح کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر خفین پہنے ہوئے ہو تو البتہ مسح جائز نہیں۔ روافض نے یہ عجیب الٹی بات کہدی کہ جہاں غسل ہے وہاں مسح کیلئے کہتے ہیں اور جہاں مسح ہے وہاں غسل کو کہتے ہیں۔

باب ۴۶ قول المحدث حدثنا واخبرنا وانبأنا الخ

علم کے متعلق چند ضروری باتیں بتلا رہے ہیں کہ محدث کا "حدثنا" "اخبرنا" "انبأنا" "سمعت" اور "عن" کہنا ایک ہی معنی رکھتا ہے یا کچھ فرق ہے؟ لغت کے اعتبار سے اس میں چنداں فرق نہیں، قدماء محدثین کے نزدیک اس میں کوئی تنگی اور کوئی فرق نہیں تھا، اکثر وہ لوگ ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کرتے تھے، متاخرین کے یہاں البتہ ضیق پیدا ہوگیا، کیونکہ انھوں نے اصطلاحیں قائم کرلیں —— یہ دراصل استاذ سے تحمل حدیث کے مختلف طریقے ہیں، ایک طریقہ تو یہ ہے جو اس وقت یہاں ہو رہا ہے، اگر کسی کو یوں حدیث حاصل ہو کہ تلمیذ نے پڑھکر سنائی اور استاذ نے تقریر کردی (یعنی نعم کہدیا) تو اس کو قراءۃ علی الشیخ کہیں گے۔ اور ایک یہ ہے کہ استاذ خود پڑھے اور تلامذہ سامع ہوں، تو اسے "قراءۃ الشیخ" کہتے ہیں، اب دونوں صورتوں میں روایت کرنے کے وقت کیا کہیں؟ ایک ہی لفظ کہیں یا علیحدہ علیحدہ؟ امام بخاری کہتے ہیں کہ ہر دو صورت میں "حدثنا" "اخبرنا" "انبأنا" سب کہہ سکتے ہیں، اس میں کوئی فرق نہیں، یہی قدماء محدثین سے حتیٰ کہ ائمہ اربعہ سے بھی منقول ہے کہ سب تساوی ہیں۔

امام مسلم اس میں فرق کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ "حدثنا" شیخ کے پڑھنے پر کہیں گے؛ اور اگر تلمیذ نے پڑھا تو "اخبرنا" کہیں گے۔ امام مسلم ان دونوں فروق کی رعایت بہت کرتے ہیں، چنانچہ کبھی صرف اسی کی وجہ سے تحویل کر دیتے ہیں۔

متاخرین کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں جب کہ شیخ نے پڑھا ہو نہ تلمیذ نے بلکہ صرف اجازت دی ہو کہ فلاں حدیث یا فلاں کتاب کی اجازت دیتا ہوں تو اس وقت "انبأنا" کہیں گے —— اور اگر "مناولۃ" ہے، یعنی یہ کہ شیخ نے کتاب دے دی کہ اسے سناؤ، یا سن کر سکوت کیا، تو ایسی صورت میں "ناولنی" کہا جائے گا مگر اس صورت میں شافہۃ شرط ہے، اگر مشافہۃ نہیں ہے بلکہ اس نے کتاب بھیج دی تو اسے "مکاتبۃ" کہیں گے —— اسی طرح مصنف کی کوئی کتاب ہمیں مل گئی نہ انہوں نے ہمیں دی تھی نہ اجازت تھی نہ لکھی تھی، مگر پھر بھی ہم اسے روایت کرنے لگیں تو اسے "وجادۃ" کہیں گے —— آگے پھر اختلاف ہے کہ اخبار اور تحدیث میں اقویٰ کون ہے یعنی شیخ کا سنانا اقویٰ ہے یا شیخ کا سننا اور تلمیذ کا پڑھنا؟ اس کے متعلق امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے دو قول ہیں، ایک یہ کہ

وَقَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ الصَّادِقُ

اور ابن مسعود نے کہا ہم سے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ سچے تھے اور جو آپ سے کہا گیا وہ بھی

الْمَصْدُوْقُ وَقَالَ شَقِيْقٌ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

سچ تھا اور شقیق نے عبداللہ ابن مسعود سے نقل کیا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی، اور

كَلِمَةً كَذَا وَقَالَ حُذَيْفَةُ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيْثَيْنِ

حذیفہ نے کہا ہم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو حدیثیں بیان کیں اور ابو العالیہ نے روایت کیا

وَقَالَ اَبُو الْعَالِيَةِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْمَا يَرْوِيْ

ابن عباس سے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ نے اپنے پروردگار سے، اور انس نے

عَنْ رَبِّهٖ وَقَالَ اَنَسٌ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْوِيْهِ عَنْ رَبِّهٖ، وَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی آپ نے اپنے پروردگار سے، اور ابو ہریرہ نے آنحضرت

قَالَ اَبُوْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْوِيْهِ عَنْ رَبِّكُمْ

صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی، کہا کہ آپ اس کو تمہارے مالک سے روایت کرتے ہیں جو

تَبَارَكَ وَتَعَالٰى

برکت والا اور بلند ہے

دونوں تساوی ہیں، دوسرا یہ کہ سماع من الشیخ سے قراءۃ علی الشیخ افضل ہے، کیونکہ جب شاگرد خود سنائے گا تو چونکہ وہ اپنے لئے کرتا ہے اس لئے خوب احتیاط کرے گا اور اگر شیخ پڑھے گا تو اس قدر اعتناء نہ کرے گا، بہتر فیصلہ وہ ہے جو حافظ [ابن حجر] نے فتح الباری میں اور دیگر تصنیفات میں بھی تحریر فرمایا ہے کہ احوال مختلف ہیں، کہیں تحدیث اقویٰ ہوگی، کہیں اخبار۔ جہاں پر جو مامون عن الغلط ہو وہاں وہی اقویٰ ہوگا لہٰذا فیصلہ یک طرفہ نہیں ہونا چاہئے ــــ بخاری دونوں کو ایک کہتے ہیں۔

قولہ قال ابن مسعود الخ، امام بخاری اس کے نظائر پیش کر رہے ہیں کہ ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کرتے ہیں، دیکھئے کہیں "حدّثنا" کہیں "اخبرنا" کہیں "انبأنا" کہیں "سمعت" اور کہیں "عن" ہے، لہٰذا سب برابر ہیں۔

حدیث قدسی وہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام تصریحًا یہ فرمائیں کہ یہ اللہ نے کہا اور وہ قرآن کے علاوہ ہو، اگر تصریح نہ ہو تو وہ حدیث قدسی نہیں ہوگی اگرچہ اللہ ہی کی طرف سے ہو، فرمایا: "اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی" وحی تو سب ہی ہے مگر حدیث قدسی اسی وقت ہوگی جب خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں

۵۹ ـ حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ قَالَ حَدَّثَنَا إِسْمٰعِيلُ بْنُ جَعْفَرٍ عَنْ

ہم سے قتیبہ ابن سعید نے بیان کیا کہا ہم سے اسمٰعیل ابن جعفر نے بیان کیا، انھوں نے عبد اللہ ابن

عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ

دینار سے انھوں نے عبداللہ ابن عمر سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا درختوں میں ایک درخت ایسا ہے

مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا وَإِنَّهَا مَثَلُ الْمُسْلِمِ فَحَدِّثُونِي مَا هِيَ فَوَقَعَ النَّاسُ

جس کے پتے نہیں جھڑتے، اور مسلمان کی مثال وہی درخت ہے، تو مجھ سے بیان کرو وہ کون سا درخت ہے؟

فِي شَجَرِ الْبَوَادِي، قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ وَقَعَ فِي نَفْسِي أَنَّهَا النَّخْلَةُ فَاسْتَحْيَيْتُ ثُمَّ

یہ سنکر لوگوں کا خیال جنگل کے درختوں کی طرف دوڑا۔ عبداللہ نے کہا میرے دل میں خیال آیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے

قَالُوا حَدِّثْنَا مَا هِيَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ، قَالَ هِيَ النَّخْلَةُ.

مگر شرم سے کہہ نہ سکا، آخر صحابہ نے حضور سے پوچھا آپ ہی بیان فرما دیجئے یا رسول اللہ وہ کون سا درخت ہے؟ آپ نے فرمایا وہ کھجور کا درخت ہے

کہ اللہ نے کہا۔

حدیث ۵۹ : قولہٗ فحدّثونی الخ بعض کے نزدیک ترجمہ سے مناسبت اسی لفظ "حدّثونی" سے ہے۔ آگے ہے: "ثم قالوا حدّثنا" اِدھر سے بھی "حدّثنا" کہا گیا اور اُدھر سے بھی "حدّثونی" فرمایا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ شاگرد سنائے تو بھی تحدیث ہے اور استاد سنائے تب بھی تحدیث ہے، اس میں کچھ فرق نہیں ہے، حافظ نے لفظ "حدّثونی" کو ترجمہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ لفظ مختلف طور پر آیا ہے، کہیں "حدّثونی" کہیں "اخبرونی" اور کہیں "انبؤنی"۔ تو معلوم ہوا کہ سب ایک ہیں، واللہ اعلم۔

حاصل حدیث یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امتحان لیا کہ ایک درخت ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے اور وہ مثل مسلم کے ہے، تشبیہ کس چیز میں ہے، اس کا یہاں ذکر نہیں۔

قولہٗ فوقع الناس الخ یعنی فکریں جنگل کے درختوں میں جا پڑیں کہ کون سا درخت ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود ہو سکے۔

قولہٗ فاستحییت : میں شرمایا، شرم کی وجہ وہ ہے جو وہاں سے اٹھ کر آنے کے بعد حضرت عمر سے انھوں نے خود بتائی ہے کہ مجھے اس بات پر شرم آئی کہ یہاں مجلس میں اتنے بڑے بڑے لوگ موجود ہیں، میں کس طرح ان پر سبقت کروں، سیدنا عمر رضؓ

باب ٤٧ طرح الامام المسئلة على اصحابه ليختبر ما عندهم من العلم

استاذ اپنے شاگردوں کا علم آزمانے کے لئے کوئی سوال کرے، اس کا بیان۔

٦٠ — حدثنا خالد بن مخلد قال ثنا سليمان بن بلال قال ثنا

ہم سے بیان کیا خالد ابن مخلد نے، کہا ہم سے بیان کیا سلیمان ابن بلال نے، کہا ہم سے

عبد الله بن دينار عن ابن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم قال ان من

بیان کیا عبداللہ ابن دینار نے انھوں نے عبداللہ ابن عمر سے، انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپ نے

الشجر شجرة لا يسقط ورقها وانها مثل المسلم، حدثوني ما هي ؟

فرمایا درختوں میں ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے اور مسلمان کی وہی مثال ہے، مجھ سے بیان کرو وہ کون سا درخت ہے؟

نے فرمایا اگر تو اس وقت کہہ دیتا تو میرے لئے "حمر النعم" سے زیادہ بہتر ہوتا، کیونکہ جب آپ سنتے تو تصویب فرماتے اور برکت کی دعا فرماتے اس سے ہمارے اور ہمارے خاندان کے لئے خوشی کا عمدہ موقع ہوتا کیونکہ کسی اور کا ذہن ادھر نہیں منتقل ہوا — چنانچہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے فرمایا کہ وہ کھجور ہے۔

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ مسلم سے مشابہت کس طرح ہے، بعضوں نے لکھا ہے کہ کھجور کا اوپر کا حصہ کٹ جاتا ہے تو وہ خشک ہو جاتا ہے اور آدمی کا حال بھی یہی ہے کہ سر کٹ جائے تو وہ ختم ہو جاتا ہے، اسی بات میں حضورؐ نے اس کو آدمی سے تشبیہ دی — بعضوں نے لکھا ہے کہ تابیر نخل و تلقیح میں تشبیہ ہے کہ نر و مادہ کا ہونا اور محبت ہونا اور میلان ہونا، یہ مرد و عورت کا خاصہ ہے، اور یہی سب باتیں کھجور میں بھی پائی جاتی ہیں — اور ایک ضعیف روایت کسی نے پیش کی ہے کہ آدم علیہ السلام کے بنانے کے بعد کچھ مٹی بچ رہی تھی اس سے کھجور کی تخلیق ہوئی، اس لئے یہ انسان کی پھوپھی ہے اور یہی وجہ مشابہت ہے۔ مگر حافظ نے لکھا ہے کہ یہ روایت ساقط الاعتبار ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر اس روایت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی بات نہیں بنتی کیونکہ حضورؐ نے مثل مسلم فرمایا ہے، مثل آدمی نہیں فرمایا، اور ان تمام صورتوں میں یہی نکلتا ہے کہ مشابہت آدمی سے ہے، تو اصل سوال حل نہیں ہوا کہ مثل مسلم کیوں کہا، وجہ شبہ وہ بتلاؤ جو مسلم اور کھجور میں مشترک ہو۔ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ جس طرح کھجور کے ہر ہر جزء سے انتفاع کیا جاتا ہے، ایسے ہی مسلم کا حال ہے کہ ہر حال میں نفع پہونچاتا ہے، کوئی حال اس کا بیکار نہیں، حتی کہ اگر کانٹا لگے تب بھی اسے ثواب ملتا ہے، اپنے علم سے، زبان سے، ہاتھ پاؤں سے مر کر، زندہ رہ کر، غرض ہر طرح سے نفع پہونچاتا ہے، اگر کہا جائے کہ ایسے اور بھی درخت ہیں تو ہم کہیں گے ہوں گے، ہمارا کیا نقصان، ہم تو وجہ شبہ صرف اس میں دیکھتے ہیں کہ جس چیز سے تشبیہ دی اس میں کیا کیا صورتیں ہیں اور انطباق کیسے ہے؟ چونکہ عرب میں یہ چیز بالکل

قَالَ فَوَقَعَ النَّاسُ فِی شَجَرِ الْبَوَادِی، قَالَ عَبْدُ اللّٰہِ فَوَقَعَ فِی نَفْسِی اَنَّھَا النَّخْلَۃُ

یہ سنکر لوگ جنگل کے درختوں میں پڑے (ان کا خیال ادھر گیا) عبداللہ نے کہا میرے دل میں آیا کہ وہ کھجور کا

فَاسْتَحْیَیْتُ، ثُمَّ قَالُوا حَدِّثْنَا یَارَسُولَ اللّٰہِ مَا ھِیَ؟ قَالَ ھِیَ النَّخْلَۃُ

درخت ہے لیکن (بزرگ لوگ بیٹھے تھے) مجھ کو شرم آئی، آخر صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ آپ ہی فرمائیے! آپ نے فرمایا: کھجور کا درخت ہے۔

واضح تھی اس لئے اسی کو بیان کردیا، تو تشبیہ برکت اور فیض میں ہے ــــ بعض روایات میں ہے کہ جس طرح کھجور کا کوئی پتہ گرتا نہیں اسی طرح مسلم کی دعا رضائع نہیں ہوتی، یا تو اجر ملے گا یا دعا رپوری ہوگی۔

باب طرح الامام المسئلة علی اصحابه الخ

پچھلے باب میں حدیث گذرچکی ہے، یہاں بخاری اس غرض سے یہ حدیث لائے ہیں کہ استاذ کبھی کبھی شاگردوں کے علم اور تیقظ اور توجہ کا امتحان لیتا رہے، تاکہ شاگرد ہمہ وقت متوجہ اور ہوشیار رہے۔ غافل نہ ہونے پائے کہ استاذ کے فیوض سے محروم رہ جائے۔

حدیث ۶۰: یہاں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے سوال کیا اور ساتھ ہی اتنا پتہ بھی دیدیا کہ ذہن ادھر منتقل ہوسکے مگر کسی کا ذہن ادھر منتقل نہ ہوا، صرف عبداللہ ابن عمرؓ کا ذہن ادھر گیا مگر وہ بڑوں کے سامنے بولنے کی جسارت نہ کرسکے، ان کا ذہن کیوں منتقل ہوگیا، اس کی وجہ اس وقت یہ ہوگئی کہ حضورؐ کے پاس اس وقت جُمار لایا گیا تھا، جُمار اس سفید گودے کو کہتے ہیں جو کھجور کے اندر سے نکلتا ہے اور کھایا جاتا ہے، اس وقت یہ جُمار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں تھا، اس لئے ان کا ذہن ادھر منتقل ہوگیا۔

دوسری بعض روایتوں میں یہ ہے کہ آپؐ نے اسی وقت یہ آیت تلاوت فرمائی: اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ o تُؤْتِیْ اُکُلَھَا کُلَّ حِیْنٍ۔[1] اسمیں کلمہ طیبہ کی مثال ہے نہ کہ مسلم کی مگر مسلم ہی تو کلمہ پڑھتا ہے، تو اب "مثل المسلم" کا مطلب یہ ہوا کہ "مثل کلمة المسلم" یا "مثل دین المسلم"۔ قرآن نے جس کی مثال بیان کی وہ کیا ہے؟ وہ نخلہ ہے، تو اب ایک دوسری وجہ شبہ پیدا ہوگئی کہ اس کی جڑ زمین میں اور شاخیں آسمان پر تُؤْتِیْ اُکُلَھَا کُلَّ حِیْنٍ الآیۃ۔ ہر موسم میں پھل لاتا ہے یا یہ کہ ہر وقت

---

(۱) ابراہیم: ۲۴

باب ٤٨ القراءة والعرض على المحدث ورأى الحسن والثوري

شاگرد استاذ کے سامنے پڑھے اور اس کو سنائے، اس کا بیان، اور امام حسن بصری اور

ومالك القراءة جائزة واحتج بعضهم في القراءة على العالم بحديث

سفیان ثوری اور مالک نے شاگرد کے پڑھنے کو جائز رکھا ہے، اور بعضوں نے استاذ کے سامنے پڑھنے کی دلیل ضمام ابن ثعلبہ رض

ضمام بن ثعلبة انه قال للنبي صلى الله عليه وسلم آلله امرك ان

کی حدیث سے لی ہے، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم لوگ نماز

نصلي الصلوة قال نعم، فهذه قراءة على النبي صلى الله عليه وسلم،

پڑھا کریں؟ آپ نے فرمایا: ہاں، تو یہ (گویا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھنا ہی ٹھہرا، ضمام نے (پھر

اخبر ضمام قومه بذلك فاجازوه، واحتج مالك بالصك يقرأ على القوم

جاکر) اپنی قوم سے یہ بیان کیا تو انھوں نے اس کو جائز رکھا۔ اور امام مالک نے دستاویز سے دلیل لی جو پڑھ کر لوگوں کو

فيقولون اشهدنا فلان ويقرأ على المقرئ فيقول القارئ اقرأني فلان.

سنائی جاتی ہے، وہ کہتے ہیں: ہم کو فلاں شخص نے اس دستاویز پر گواہ کیا، اور پڑھنے والا پڑھ کر استاذ کو سناتا ہے پھر کہتا ہے: مجھ کو فلاں نے پڑھایا

خوب پھل لاتا ہے اور لوگ منتفع ہوتے ہیں، تو مثال یہ ہوئی کہ مسلم کے دین سے، علم سے، کلمات سے، لوگ ویسے ہی منتفع ہوتے ہیں، جیسے کہ نخلہ سے، اب دو قرینے یکجا ہو گئے کہ اسی وقت جمار آیا اور اسی وقت آیت بھی تلاوت فرمائی اور اسی وقت آپ نے سوال بھی فرمایا، ان قرائن سے ابن عمر سمجھ گئے مگر شرم سے کہہ نہ سکے۔

باب ٤٨ القراءة والعرض على المحدث الخ

اس کو مستقلاً علٰحدہ اس لئے لائے کہ اس کا حجت ہونا دلیل سے معلوم ہو جائے، حسن بصری، سفیان ثوری اور امام مالک کے نزدیک قراۃ علی الشیخ جائز ہے، امام مالک سے کوئی کہتا کہ آپ خود سنائیے تو خفا ہوتے اور کہتے کہ قرآن اگر کوئی پڑھ کر سنائے تو تم تصدیق کر دیتے ہو، پھر حدیث میں کیوں تصدیق نہیں کرتے۔ کبھی کبھی خود بھی سناتے تھے، چنانچہ امام محمد کو پانچ سو احادیث سنائیں اور یہ ان کی خصوصیات سے ہے۔ اور کسی کے لئے امام مالک نے یہ گوارہ نہیں کیا۔

قولہ آلله امرك ان نصلي الصلوة، قال نعم. تو دیکھو یہ قراۃ علی العالم ہے۔ واحتج بعضهم میں بعضهم سے

۶۱ـــ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ ثنا مُحَمَّدُ بْنُ الْحَسَنِ الْوَاسِطِیُّ

ہم نے محمد ابن سلام بیکندی نے بیان کیا، کہا ہم سے محمد ابن حسن واسطی نے بیان کیا، انھوں نے

عَنْ عَوْفٍ عَنِ الْحَسَنِ قَالَ لَا بَأْسَ بِالْقِرَاءَةِ عَلَى الْعَالِمِ وَحَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللّٰهِ

عوف سے، انھوں نے امام حسن بصری سے، انھوں نے کہا عالم کے سامنے پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں، اور

بْنُ مُوسٰى عَنْ سُفْيَانَ قَالَ إِذَا قُرِأَ عَلَى الْمُحَدِّثِ فَلَا بَأْسَ أَنْ يَقُولَ حَدَّثَنِيْ

ہم سے عبیداللہ ابن موسیٰ نے بیان کیا، انھوں نے سفیان ثوری سے سنا، وہ کہتے تھے، جب کوئی شخص محدث کو

قَالَ وَسَمِعْتُ أَبَا عَاصِمٍ يَقُولُ عَنْ مَالِكٍ وَسُفْيَانَ الْقِرَاءَةُ عَلَى الْعَالِمِ وَقِرَاءَتُهٗ

حدیث پڑھ کر سنائے تو کچھ قباحت نہیں اگر یوں کہے کہ اس نے مجھ سے بیان کیا۔ اور میں نے ابو عاصم سے سنا وہ امام مالک

سَوَاءٌ

اور سفیان ثوری کا قول بیان کرتے تھے کہ عالم کو پڑھ کر سنانا اور عالم کا شاگردوں کے سامنے پڑھنا دونوں برابر ہیں۔

۶۲ـــ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ سَعِيدٍ

ہم سے عبداللہ ابن یوسف نے بیان کیا، کہا ہم سے لیث نے بیان کیا، انھوں نے

هُوَ الْمَقْبُرِيُّ عَنْ شَرِيكِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِي نَمِرٍ أَنَّهٗ سَمِعَ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَقُولُ

سعید مقبری سے، انھوں نے شریک ابن عبداللہ ابن ابی نمر سے، انھوں نے انس ابن مالک سے سنا ایک بار ہم

بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوسٌ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ دَخَلَ رَجُلٌ عَلٰى جَمَلٍ

مسجد میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے تھے، اتنے میں ایک شخص اونٹ پر سوار آیا اور اونٹ کو مسجد میں بٹھا کر باندھ

فَأَنَاخَهٗ فِي الْمَسْجِدِ ثُمَّ عَقَلَهٗ ثُمَّ قَالَ لَهُمْ أَيُّكُمْ مُحَمَّدٌ وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ

دیا، پھر پوچھنے لگا (بھائیو) محمدؐ کون ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت لوگوں میں تکیہ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَّكِئٌ بَيْنَ ظَهْرَانَيْهِمْ

لگائے بیٹھے تھے۔

مراد کون ہیں؟ بین السطور میں لکھا ہے کہ یہ حمیدی ہیں، اور حمیدی نے اس کو نوادر میں لکھا ہے۔

حافظ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ میں مقدمہ میں لکھ چکا تھا کہ حمیدی مراد ہیں مگر اب مجھے معلوم ہوا کہ ابو سعید حداد مراد ہیں،

فقلنا هذا الرجلُ الابيضُ المتّكئُ فقال له الرّجلُ يا ابنَ عبدِ المطّلب ! فقال

ہم نے کہا محمدؐ یہ سفید رنگ کے شخص ہیں جو تکیہ لگائے بیٹھے ہیں ۔ تب وہ آپ سے کہنے لگا : عبد المطلب کے بیٹے ! آپ نے

لهُ النّبيّ صلّى الله عليهِ وسلّمَ قد اجبتُك فقال الرّجلُ انّي سائلُك

اس سے فرمایا : (کہہ) میں سن رہا ہوں ، وہ کہنے لگا : میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں اور سختی سے پوچھوں گا

فمشدّدٌ عليكَ في المسئلةِ فلا تجد عليّ في نفسِك ، فقال سل عمّا بدا لك

تو آپ اپنے دل میں برا نہ مانئے گا ، آپ نے فرمایا (نہیں) جو تیرا جی چاہے پوچھ ۔ تب اس نے کہا میں

فقال اسألك بربّك وربِّ من قبلك. آللّه ارسلك الى النّاسِ كلّهم ؟

آپ کو آپ کے مالک اور اگلے لوگوں کے مالک کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا اللہ نے آپ کو (دنیا کے)

فقال اللّهمّ نعم ، فقال انشدك باللهِ آللّه امرك ان تصلّي الصّلوات الخمس

سب لوگوں کی طرف بھیجا ہے ؟ آپ نے فرمایا : ہاں ، یا میرے اللہ ۔ تب اس نے کہا : میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں ، کیا

في اليومِ واللّيلةِ ؟ قال اللّهمّ نعم ، قال انشدك باللهِ آللّه امرك ان تصوم

اللہ نے آپ کو رات دن میں پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا ہے ؟ آپ نے فرمایا : ہاں ! یا میرے اللہ ۔ پھر کہنے لگا : میں آپ کو قسم

هذا الشّهرَ من السّنةِ ؟ قال اللّهمّ نعم ، قال انشدك باللهِ آللّه امرك

دیتا ہوں کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ سال بھر میں اس مہینہ میں (یعنی رمضان میں) روزے رکھو ؟ آپ نے فرمایا : ہاں ! یا میرے اللہ ۔

ان تأخذ هذهِ الصّدقةَ من اغنيائنا فتقسمها على فقرائنا ؟

پھر کہنے لگا میں آپ کو قسم دیتا ہوں کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم میں جو مالدار لوگ ہیں ان سے زکوٰۃ لے کر ہمارے محتاجوں

کو بانٹ دو ؟

پھر بیہقی کی کتاب معرفۃ السنن والآثار سے یہ نقل پیش کی کہ بخاری خود کہتے ہیں کہ ابو سعید مراد ہیں ۔

قولہ آللّه امرك ان تصلّي الصّلوة ؟ قال نعم ! دیکھو یہ قراءۃ علی العالم ہے ۔

قولہ اخبر ضمام قومه بذلك فاجازوه ، یعنی قبلوه ، تو اگر حجت نہ ہوتا تو کیوں قبول کرتے ، معلوم ہوا کہ یہ مقبول ہے

قولہ بالصّك ، دستاویز جو لکھی ہوئی ہوں جن پر مہریں اور دستخط ہوں ، اگر پڑھ کر سنائی جائیں قوم کو ، یعنی شاہدین کو ، تو قوم

کہتی ہے اَشهدنا فلان ، یہی قراءۃ علی العالم کا حاصل ہے ۔

فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ نَعَمْ، فَقَالَ الرَّجُلُ اٰمَنْتُ بِمَا جِئْتَ بِهٖ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، میرے اللہ! تب وہ شخص کہنے لگا جو حکم آپ (اللہ کے پاس سے) لائے ہیں، میں
وَاَنَا رَسُوْلُ مَنْ وَرَائِیْ مِنْ قَوْمِیْ وَاَنَا ضِمَامُ بْنُ ثَعْلَبَةَ اَخُوْ بَنِیْ سَعْدِ بْنِ بَكْرٍ.
ان پر ایمان لایا اور میں اپنی قوم کے لوگوں کا جو یہاں نہیں آئے، بھیجا ہوا ہوں: میرا نام ضمام ابن ثعلبہ ہے بنی سعد ابن بکر کے خاندان سے۔
رَوَاهُ مُوْسٰی وَعَلِیُّ بْنُ عَبْدِ الْحَمِيْدِ عَنْ سُلَيْمَانَ عَنْ ثَابِتٍ عَنْ اَنَسٍ
اس حدیث کو (لیث کی طرح) موسیٰ اور علی ابن عبد الحمید نے سلیمان سے روایت کیا، انھوں نے ثابت سے، انھوں
عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهٰذَا
نے انس سے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی مضمون

قولہ ویقرأ علی المقری، مقری: قرآن کی تعلیم دینے والا۔ یہاں بھی مقری کی تصدیق کے بعد قاری کہے گا: اقرأنی فلان (یعنی فلاں نے مجھے پڑھایا) اور اس پر اعتماد کیا جائے گا۔

سواء، یعنی دونوں حجت ہیں۔

حدیث ۶۲:

قولہ فاناخه فی المسجد، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ کو مسجد میں بٹھا دیا تھا، اس سے امام مالک نے استدلال کیا کہ ماکول اللحم کے ارواث وابوال طاہر ہیں، ورنہ اس صورت حال کو حضورؐ کیوں برقرار رکھتے، میں کہتا ہوں کہ حضورؐ کا معاملہ مسجد کے ساتھ یہ تھا کہ اگر کوئی مسجد میں تھوک دیتا تو حضور حک فرماتے اور زعفران ملتے، جب تھوک کے باب میں یہ معمول تھا تو ارواث وابوال کو اگر پاک بھی فرض کر لو تو اس کو حضور کیونکر پسند فرما سکتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ یہ استدلال صحیح نہیں، کیونکہ یہی یقینی نہیں کہ مسجد میں بٹھایا، چنانچہ دوسری روایات میں تصریح ہے کہ مسجد کے قریب بٹھلایا، پھر مسجد میں داخل ہوئے، اسی بنا پر وہاں یہ لفظ ہے ثُمَّ دَخَلَ (پھر داخل ہوئے) لفظ ثُمَّ بتلاتا ہے کہ پہلے باہر بٹھا دیا پھر مسجد میں آئے۔

قولہ بَیْنَ ظَهْرَانَیْهِمْ، ظہر کا تثنیہ ظہران ہے، پھر ظہران کو مفرد کے حکم میں قرار دے کر دوبارہ تثنیہ کی علامت اس کے ساتھ لگا دی اور ایسا بطور شیوع ہوتا ہے، اور یہ لفظ اس وقت بولتے ہیں جب مجمع کثیر ہو اور ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے ہوں۔

قولہ هذا الرجل الابیض، مراد خالص بیاض نہیں، بلکہ "بیاض مشوب بحمرۃ" مراد ہے، جیسے گلاب، چونکہ اس میں سفیدی غالب ہوتی ہے اس لئے بیاض سے تعبیر کر دیا۔

۶۳ـــ حَدَّثَنَا مُوْسیٰ بْنُ اِسْمٰعِیْلَ قَالَ ثنا سُلَیْمَانُ بْنُ الْمُغِیْرَۃِ قَالَ ثنا

ہم سے بیان کیا موسیٰ ابن اسمٰعیل نے، کہا ہم سے بیان کیا سلیمان ابن مغیرہ نے، کہا ہم سے

ثَابِتٌ عَنْ اَنَسٍ قَالَ نُہِیْنَا فِی الْقُرْاٰنِ اَنْ نَّسْأَلَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَکَانَ

ثابت نے بیان کیا، انھوں نے انسؓ سے، وہ کہتے تھے، ہم کو تو قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کرنا منع ہوا تھا، اور

یُعْجِبُنَا اَنْ یَّجِیْئَ الرَّجُلُ مِنْ اَہْلِ الْبَادِیَۃِ الْعَاقِلُ فَیَسْأَلَہٗ وَنَحْنُ نَسْمَعُ فَجَاءَ

ہم یہ بہت پسند کرتے تھے کہ کوئی شخص دیہات سے آئے (جس کو اس ممانعت کی خبر نہ ہو) وہ آپ سے سوالات کرے ہم سنیں، آخر

رَجُلٌ مِّنْ اَہْلِ الْبَادِیَۃِ فَقَالَ اَتَانَا رَسُوْلُكَ فَاَخْبَرَنَا اَنَّكَ تَزْعُمُ اَنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ

دیہات والوں میں سے ایک شخص آن ہی پہونچا اور کہنے لگا آپ کا ایلچی ہمارے پاس پہونچا، اس نے یہ بیان کیا، آپ کہتے ہیں کہ اللہ نے

اَرْسَلَكَ، قَالَ صَدَقَ، فَقَالَ مَنْ خَلَقَ السَّمَاءَ؟ قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ، قَالَ

آپ کو بھیجا ہے؟ آپ نے فرمایا: سچ کہا، پھر کہنے لگا اچھا آسمان کس نے بنایا ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ نے، کہنے لگا زمین کس نے

فَمَنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالْجِبَالَ؟ قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ، قَالَ فَمَنْ جَعَلَ فِیْہَا الْمَنَافِعَ

بنائی اور پہاڑ کس نے بنائے؟ آپ نے فرمایا: اللہ نے، کہنے بھلا پہاڑوں میں فائدے کی چیزیں کس نے بنائیں؟

قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ، قَالَ فَبِالَّذِیْ خَلَقَ السَّمَاءَ وَخَلَقَ الْاَرْضَ وَنَصَبَ الْجِبَالَ

آپ نے فرمایا: اللہ نے، تب اس نے کہا: قسم اس (خدا) کی جس نے آسمان کو بنایا اور زمین کو بنایا اور پہاڑوں کو کھڑا کیا،

قولہ یا ابن عبد المطّلب۔ شاید یہ بھی اس کی طرف اشارہ ہو کہ عبد المطلب نے کہا تھا کہ یہ نبی ہوگا، علاوہ ازیں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین میں فرمایا تھا ؎

انا النبیّ لا کذب ٭ انا ابن عبد المطّلب

تو یہ بھی دراصل تعظیم کے لئے تھا۔

قولہ قد اجبتك، فرماتے ہیں کہ جواب میں دے چکا، یعنی میں بالکل تیار ہوں، گویا کہ جواب دے چکا۔ جیسا سوال تھا ویسا ہی جواب دیا، یہ کمال بلاغت ہے۔

قولہ فمشدّد علیك، سختی سے مراد یہ ہے کہ وہ سوالات آپ کی شان کے خلاف ہوں گے، یہ کمال فطانت ہے کہ [پہلے معذرت خواہی اختیار کرتے ہوئے ناگواری کے خوف سے] آگے کے لئے روک لگادی۔

وَجَعَلَ فِيهَا الْمَنَافِعَ آللّٰهُ أَرْسَلَكَ ؟ قَالَ نَعَمْ ، قَالَ زَعَمَ رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا

اور ان میں فائدے کی چیزیں بنائیں ، کیا اللہ نے آپ کو بھیجا ہے ؟ آپ نے فرمایا : ہاں ! پھر اس نے کہا : آپ کے ایلچی نے کہا ہم پر

خَمْسَ صَلَوَاتٍ وَزَكٰوةً فِي أَمْوَالِنَا ؟ قَالَ صَدَقَ ، قَالَ بِالَّذِي أَرْسَلَكَ آللّٰهُ

پانچ نمازیں ہیں اور اپنے مالوں کی زکوٰۃ دینا ہے ؟ آپ نے فرمایا : اس نے سچ کہا ۔ تب وہ کہنے لگا : تو قسم اس کی جس نے

أَمَرَكَ بِهٰذَا ؟ قَالَ نَعَمْ ، قَالَ وَزَعَمَ رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا صَوْمَ شَهْرٍ فِي سَنَتِنَا

آپ کو بھیجا ہے کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے ؟ آپ نے فرمایا : ہاں ! پھر اس نے کہا : آپ کا ایلچی کہتا ہے کہ ہم پر سال بھر

قَالَ صَدَقَ ، قَالَ فَبِالَّذِي أَرْسَلَكَ آللّٰهُ أَمَرَكَ بِهٰذَا ؟ قَالَ نَعَمْ ، قَالَ وَزَعَمَ

میں ایک مہینے کے روزے ہیں ؟ آپ نے فرمایا : سچ کہتا ہے ۔ تب وہ کہنے لگا : قسم اس کی جس نے آپ کو بھیجا ہے کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم

رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا حَجَّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ؟ قَالَ صَدَقَ

دیا ہے ؟ آپ نے فرمایا : ہاں ۔ تب وہ کہنے لگا : آپ کے ایلچی نے یہ بھی کہا کہ ہم پر حج ہے یعنی اس پر جو وہاں تک پہونچنے کا راستہ پا سکے ؟

آپ نے فرمایا : سچ کہا !

قولہ فلا تجد علیّ فی نفسك ، یہ ماخوذ ہے موجدۃ سے ، جس کے معنی غصہ کے ہیں ، وجد یجد کے مصادر بہت ہیں اور ماضی مضارع ایک ہیں ، کبھی "وجود" بمعنی موجود ہونا ، کبھی "وجدان" آتا ہے جبکہ گم شدہ یا کوئی مطلوب مل جائے ، کبھی "وجد" آتا ہے جبکہ محبت میں دلگیر ہو ، کبھی "موجدۃ" آتا ہے غصہ ہونے کے معنی میں ، تو جہاں جو معنی مناسب ہو وہی لئے جاتے ہیں ، یہاں مناسب یہ ہے کہ غضب اور غصہ کے معنی مراد لئے جائیں ۔

قولہ اللّٰهم ، یہ مزید تاکید کے لئے ہے ۔

قولہ امنت (میں ایمان لاچکا) یہ ترجمہ اس لئے کیا کہ اکثر کے نزدیک یہ پہلے اسلام لاچکے تھے ، پھر مزید پختگی کیلئے آئے تھے ۔

قولہ وانا ضمام بن ثعلبۃ اخو بنی سعد بن بکر : بخاری کہتے ہیں کہ یہ پہلے ایمان لاچکے تھے اور وفد میں شامل ہو کر آئے تھے ، بنو سعد کا یہ خاندان قبیلہ ہوازن کی ایک شاخ ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کے ہاں قیام کے دوران پرورش پائی تھی

قولہ رواہ موسیٰ : یہ تعلیقاً بیان کرتے ہیں کہ انس کی حدیث ثابت بنانی کے طریق سے بھی ہے ، آگے پوری سند لاتے ہیں ۔

قَالَ فَبِالَّذِی اَرْسَلَکَ آللّٰهُ اَمَرَکَ بِهٰذَا؟ قَالَ نَعَمْ، قَالَ فَوَالَّذِی

تب وہ کہنے لگا: قسم اس کی جس نے آپ کو بھیجا ہے، کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، تب اس نے کہا

بَعَثَکَ بِالْحَقِّ لَا اَزِیْدُ عَلَیْهِنَّ شَیْئًا وَّلَا اَنْقُصُ، فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ

قسم اس (خدا) کی جس نے آپ کو سچائی کے ساتھ بھیجا میں نہ ان کاموں پر کچھ بڑھاؤں گا نہ ان میں کمی کروں گا، یہ سن کر آنحضرت

وَسَلَّمَ اِنْ صَدَقَ لَیَدْخُلَنَّ الْجَنَّةَ.

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یہ سچ بولتا ہے تو ضرور جنت میں جائے گا۔

بَابُ ۴۹ مَا یُذْکَرُ فِی الْمُنَاوَلَةِ وَکِتَابِ اَهْلِ الْعِلْمِ بِالْعِلْمِ اِلَی

مناولہ کا بیان اور عالموں کی علم کی باتوں کو لکھ کر دوسرے شہروں میں بھیجنے کا بیان

الْبُلْدَانِ وَقَالَ اَنَسٌ نَسَخَ عُثْمَانُ الْمَصَاحِفَ فَبَعَثَ بِهَا اِلَی الْاٰفَاقِ

انسؓ نے کہا: حضرت عثمان نے مصحف لکھوائے اور ملکوں میں بھیجوائے۔

حدیث ۶۳ ، قولہ نُهِیْنَا ، یہ وہ نہی ہے جو قرآن میں ہے: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَاءَ[1]

مقصود دراصل یہ تھا کہ بے ضرورت سوال مت کرو، مگر چونکہ صحابہ میں خوف غالب تھا اس لئے ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم کوئی بات پوچھیں اور وہ درست نہ ہو تو مشکل پڑے اس لئے یہ چاہا کرتے تھے کہ کوئی باہر کا آدمی ایسا آجائے جو سمجھ دار بھی ہو اور بات بھی ڈھنگ کی پوچھے تو ہم کو فائدہ پہونچ جائے۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے کوئی وافد اتنا عاقل اور سمجھدار نہیں دیکھا کہ اتنے مختصر طریقے سے تمام ضروری اور اہم باتیں دریافت کرلیں اور آپ نے بھی نہایت خندہ پیشانی سے اطمینان بخش جوابات مرحمت فرمائے، حدیث میں کئی جگہ "زَعَمَ" یا "تَزْعَمُ" آیا ہے۔ سیبویہ نے بہت جگہ "زعم" کو "قال" کے قائم مقام کہا ہے، یہاں بھی "قال" کے معنی ہیں۔

قولہ جَعَلَ فِیْهَا الْمَنَافِعَ: پہاڑوں میں مختلف قسم کی منفعت بخش چیزیں پائی جاتی ہیں، مثلاً پھل، جڑی بوٹیاں اور جانور وغیرہ، بڑی چیز یہ ہے کہ وہاں جو برف گرتی ہے وہ پگھل کر دریاؤں کی شکل میں بہتی ہے جن کے ذریعہ تمام دنیا کی آبپاشی ہوتی ہے اور جن سے اہل دنیا سیراب ہوتے ہیں، تو پہاڑوں میں بہت سی نفع کی چیزیں ہیں۔

---

(۱) مائدہ: ۱۰۱

وَرَاٰی عَبْدُاللّٰہِ ابْنُ عُمَرَ وَیَحْیٰی بْنُ سَعِیْدٍ وَّمَالِكٌ ذٰلِكَ جَائِزًا وَاحْتَجَّ بَعْضُ

اور عبداللہ بن عمر اور یحیٰی ابن سعید انصاری اور امام مالک نے اس کو جائز رکھا ہے (یعنی بمناولہ کو) اور حجاز کے بعض عالموں نے مناولہ کیلئے

اَهْلِ الْحِجَازِ فِی الْمُنَاوَلَةِ بِحَدِیْثِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَیْثُ كَتَبَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے دلیل لی کہ آپ نے فوج کے ایک سردار کو ایک خط لکھدیا اور فرمایا کہ اسکو

لِاَمِیْرِ السَّرِیَّةِ كِتَابًا وَّقَالَ لَا تَقْرَاْهُ حَتّٰی تَبْلُغَ مَكَانَ كَذَا وَكَذَا، فَلَمَّا بَلَغَ ذٰلِكَ

(کھول کر) پڑھنا نہیں جب تک تو فلاں مقام تک نہ پہونچ لے، جب وہ اس مقام پر پہونچا تو لوگوں کو

الْمَكَانَ قَرَأَهٗ عَلَی النَّاسِ وَاَخْبَرَهُمْ بِاَمْرِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

اس نے وہ خط پڑھ کر سنایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ان کو بتلایا۔

باب[۴۹] مایذکر فی المناولۃ الخ

مناولۃ: استاد کوئی لکھی ہوئی چیز مشافہۃً دیدے اور کہے کہ میں اجازت دیتا ہوں تو اس کو بیان کر

قولہ وکتاب اھل العلم: یہ مکاتبت ہے، یعنی لکھ کر کہیں بھیج دینا۔

قولہ نسخ عثمان المصاحف: اس سے استدلال کیا کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کی نقلیں بھیجی تھیں اور لوگوں نے اسے قبول کرلیا تھا، یہ پانچ نقول تھیں اور بعضوں نے سات بھی بتائی ہیں۔

ورأی عبد اللہ بن عمر: بظاہر مشہور صحابی اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے مراد ہیں مگر بعضوں نے لکھا ہے کہ عبداللہ ابن عمر العمری مراد ہیں کیونکہ ان کا نام یحیٰی ابن سعید کے ساتھ لے رہے ہیں، مگر ظاہر یہی ہے کہ صحابی ہی مراد ہیں۔

قولہ بعض اھل الحجاز: اس سے مراد حُمیدی ہیں، انھوں نے نوادر میں اس سے استدلال کیا ہے۔

قولہ لامیر السریۃ: یہ عبداللہ ابن جحش رضی اللہ عنہ ہیں، جو ام المومنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے بھائی ہیں۔

قولہ واخبرھم بامر النبی صلی اللہ علیہ وسلم: سیر کی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سریّہ قریش کی خبریں لینے گیا تھا اور بدر کے واقعہ سے پہلے گیا تھا، جب نوشتہ پڑھا گیا تو اس میں لکھا تھا کہ خبریں فراہم کرنا مگر کسی سے تعرض نہ کرنا، اور یہ بھی تھا کہ کسی کو مجبور نہ کرنا جو چاہے جائے، جو نہ چاہے نہ جائے۔ اس اعلان کے بعد دو آدمی تو لوٹ آئے، باقی سب آدمی ساتھ گئے۔ امام بخاری کا مقصود پورا ہوگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب دی اور فرمایا کہ فلاں منزل پر جاکر پڑھنا ــــــ جو دو آدمی لوٹ آئے تھے ان کا لوٹ آنا اس لئے نہ تھا کہ جان کا خطرہ تھا، بلکہ اس لئے کہ انھوں نے ضرورت نہ سمجھی اور اجازت مل ہی گئی تھی اس لئے کوئی قابل اعتراض بات بھی نہ تھی (واللہ اعلم)

٦٤ــ حَدَّثَنَا اِسْمٰعِیْلُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ حَدَّثَنِیْ اِبْرَاهِیْمُ بْنُ سَعْدٍ

ہم سے اسمٰعیل ابن عبد اللہ نے بیان کیا، کہا مجھ سے ابراہیم ابن سعد نے بیان کیا، انھوں نے صالح

عَنْ صَالِحٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَیْدِ اللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ

سے، انھوں نے ابن شہاب سے، انھوں نے عبید اللہ ابن عتبہ ابن مسعود سے، ان سے عبد اللہ ابن عباس نے

بْنَ عَبَّاسٍ اَخْبَرَهٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ بِکِتَابِهٖ رَجُلًا

بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط لکھ کر ایک شخص (عبد اللہ ابن حذافہؓ) کو دیا اور ان سے فرمایا کہ

وَاَمَرَهٗ اَنْ یَّدْفَعَهٗ اِلٰی عَظِیْمِ الْبَحْرَیْنِ فَدَفَعَهٗ عَظِیْمُ الْبَحْرَیْنِ اِلٰی کِسْرٰی[1]

وہ اس خط کو بحرین کے حاکم (منذر ابن ساوی) کو دیں۔ بحرین کے حاکم نے وہ خط کسریٰ (پرویز) کو بھیج دیا، اس نے

فَلَمَّا قَرَاَهٗ مَزَّقَهٗ فَحَسِبْتُ اَنَّ ابْنَ الْمُسَیِّبِ قَالَ فَدَعَا عَلَیْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ

اسے پڑھ کر پھاڑ ڈالا، ابن شہاب نے کہا: میں سمجھتا ہوں ابن مسیب نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایران والوں

وَسَلَّمَ اَنْ یُّمَزَّقُوْا کُلَّ مُمَزَّقٍ.

پر بددعا کی خدا کرے وہ بھی بالکل پھاڑ ڈالے جائیں۔

٦٥ــ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مُقَاتِلٍ اَبُو الْحَسَنِ قَالَ ثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ قَالَ

ہم سے بیان کیا محمد ابن مقاتل نے جن کی کنیت ابوالحسن ہے، کہا ہم سے بیان کیا عبد اللہ

اَخْبَرَنَا شُعْبَةُ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ کَتَبَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ

ابن مبارک نے، کہا ہم کو خبر دی شعبہ نے، انھوں نے قتادہ سے، انھوں نے انس ابن مالک سے کہا کہ آنحضرت

وَسَلَّمَ کِتَابًا اَوْ اَرَادَ اَنْ یَّکْتُبَ

صلی اللہ علیہ وسلم نے (عجم یا روم کے بادشاہ کو) ایک خط لکھا یا لکھنے کا قصد کیا۔

حدیث ۶۴، ۶۵. قولہ فبعث بکتابہ رجلاً: یہ رجل عبد اللہ ابن حذافہ سہمی تھے، بحرین کا علاقہ اس وقت کسریٰ کے ماتحت تھا، یہ کسریٰ وہی ہے جو خسرو پرویز کے نام سے مشہور ہے، یہ انوشیرواں کا پوتا تھا۔

قولہ فحسبت: یہ قول زہری کا ہے۔

قولہ فدعا علیھم: یعنی آپ نے بددعا فرمائی کہ جیسے انھوں نے میرے خط کو پھاڑا ہے، ایسے ہی اسے اللہ تعالیٰ

فَقِيلَ لَهُ اَنَّهُمْ لَا يَقْرَأُونَ كِتَابًا اِلَّا مَخْتُومًا فَاتَّخَذَ خَاتَمًا مِنْ فِضَّةٍ نَقْشُهُ

لوگوں نے آپ سے عرض کیا: وہ لوگ (عجم کے یا روم کے) وہی خط پڑھتے ہیں جس پر مہر لگی ہو، تو آپ نے چاندی کی ایک

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ كَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی بَيَاضِهٖ فِیْ يَدِهٖ فَقُلْتُ لِقَتَادَةَ مَنْ قَالَ

انگوٹھی بنوائی، اس پر یہ کھدا تھا "محمد رسول اللہ" انسؓ نے کہا: گویا میں اس انگوٹھی کی سفیدی آپ کے ہاتھ میں دیکھ رہا ہوں

نَقْشُهٗ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؟ قَالَ اَنَسٌ !

شعبہ نے کہا: میں نے قتادہ سے پوچھا: اس پر محمد رسول اللہ کھدا تھا، یہ کس نے کہا؟ انھوں نے کہا انس نے۔

بَابٌ مَنْ قَعَدَ حَيْثُ يَنْتَهِیْ بِهِ الْمَجْلِسُ وَمَنْ رَاٰی فُرْجَةً

اس شخص کا بیان جو مجلس کے اخیر میں (جہاں جگہ ہو) بیٹھے اور جو حلقہ میں

فِی الْحَلْقَةِ فَجَلَسَ فِيْهَا .

کھلی جگہ پاکر اس میں بیٹھ جائے۔

۶۶ ــ حَدَّثَنَا اِسْمٰعِيْلُ قَالَ حَدَّثَنِیْ مَالِكٌ عَنْ اِسْحَاقَ بْنِ

ہم سے اسماعیل نے بیان کیا کہا مجھ سے امام مالک نے بیان کیا، انھوں نے اسحاق

عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِیْ طَلْحَةَ اَنَّ اَبَا مُرَّةَ مَوْلٰی عَقِيْلِ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ

ابن عبداللہ ابن ابی طلحہ سے، ان کو ابومرہ عقیل ابن ابی طالب کے غلام نے خبر دی، انھوں نے

اَخْبَرَهٗ عَنْ اَبِیْ وَاقِدٍ اللَّيْثِیِّ

ابو واقد لیثی سے سنا

اس کی حکومت کو پارہ پارہ کردے۔ یہ دعا، قبول ہوئی اور خلیفۂ دوم سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اہل اسلام نے اسکی دھجیاں بکھیردیں۔ سلطنت بھی گئی اور خود اس کا حال بھی برا ہوا، اس کی بیوی پر جس کا نام شیریں تھا اس کا لڑکا عاشق ہوگیا اور اس پر قبضہ کرنے کے لئے باپ کو ہلاک کرڈالا، عورت (شیریں) کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے زہر کھالیا اور مرگئی، بیٹے نے قوت کی کوئی دوا کھائی تھی اس میں سمیت تھی اس کی وجہ سے وہ بھی مرگیا۔ ذوات واشخاص پر تو یہ تباہی آئی اور ملک پر جو آفت آئی وہ سب کو معلوم ہے کہ نام ونشان تک مٹ گیا۔ قیصر روم کا تو پھر بھی کچھ حصہ اور نام باقی رہ گیا، حضورؐ نے روم کے متعلق فرمایا ہے انها ذوات القرون، یعنی وہ سینگوں والے ہیں، آسانی سے قبضہ میں نہیں آتے، چونکہ اس نے تعظیم کی تھی اس لئے اس کی اتنی حالت باقی رہی

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَیْنَمَا ھُوَ جَالِسٌ فِی الْمَسْجِدِ وَالنَّاسُ مَعَہٗ

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار مسجد میں بیٹھے تھے اور لوگ آپ کے ساتھ (بیٹھے) تھے، اتنے میں تین آدمی

اِذْ اَقْبَلَ ثَلٰثَۃُ نَفَرٍ فَاَقْبَلَ اثْنَانِ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَذَھَبَ

(باہر سے) آئے، دو تو ان میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آگئے (آپ کا کلام سننے کو) اور

وَاحِدٌ قَالَ فَوَقَفَا عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَمَّا اَحَدُھُمَا

ایک چل دیا، ابو واقد نے کہا: پھر وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آن کر ٹھہرے، ان میں سے ایک نے

فَرَاٰی فُرْجَۃً فِی الْحَلْقَۃِ فَجَلَسَ فِیْھَا وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَجَلَسَ خَلْفَھُمْ وَاَمَّا الثَّالِثُ

تو تھوڑی سی خالی جگہ حلقہ میں دیکھی وہاں بیٹھ گیا اور دوسرا لوگوں کے پیچھے بیٹھا اور تیسرا تو پیٹھ موڑ کر چل دیا،

فَاَدْبَرَ ذَاھِبًا، فَلَمَّا فَرَغَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلَا اُخْبِرُکُمْ عَنِ

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (وعظ سے) فارغ ہوئے تو فرمایا: کیا میں تم کو تین آدمیوں کا حال نہ بتلاؤں،

النَّفَرِ الثَّلٰثَۃِ اَمَّا اَحَدُھُمْ فَاَوٰی اِلَی اللّٰہِ فَاٰوَاہُ اللّٰہُ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَاسْتَحْیٰی[1]

ایک نے تو ان میں سے اللہ کی پناہ لی، اللہ نے اسے جگہ دے دی، دوسرے نے (اندر گھسنے میں

فَاسْتَحْیَی اللّٰہُ مِنْہُ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَاَعْرَضَ فَاَعْرَضَ اللّٰہُ عَنْہُ.

لوگوں سے) شرم کی، اللہ نے بھی اس سے شرم کی، اور یہ تیسرے نے منہ پھیر لیا، اللہ نے بھی اس سے منہ پھیر لیا۔

بخاری کا مقصود حاصل ہوگیا اور مناولۃ و مکاتبۃ دونوں کا ثبوت ہوگیا، عبد اللہ ابن جحش کو مکتوب دیا تو مناولۃ ثابت ہوئی اور کسریٰ کے پاس مکتوب بھیجا تو اس سے مکاتبۃ ثابت ہوئی۔

باب[۵] من قعد حیث ینتھی بہ المجلس الخ

فَرجۃ اور فُرجۃ دونوں طرح سے ہے مگر فصیح فَرجۃ بالفتح ہے، یعنی اگر فرجہ ہے تو اندر بیٹھنا خلاف ادب نہیں۔

حدیث ٦٦ : قولہ فوقفا علی رسول اللّٰہ . یعنی علی مجلس رسول اللّٰہ یا عند رسول اللّٰہ

قولہ الا اخبرکم الخ یعنی ان تین کے ساتھ اللہ کا جو معاملہ ہوا تمھیں بتا دوں۔

قولہ فاوی الی اللّٰہ یعنی اس نے خیر کی طرف رغبت کی، اس لئے اللہ نے بھی اس کو اپنی رحمت کی آغوش میں لے لیا۔

قولہ فاستحیی : یعنی جب اس نے شرم کی تو اللہ نے بھی اس سے شرم کی کہ اس کو محروم رکھے۔

بَاب [۱] قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰى مِنْ سَامِعٍ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس کو (میرا کلام) پہونچایا جائے وہ اس سے زیادہ یاد رکھنے والا ہوتا ہے جس نے مجھ سے سنا۔

۶۷ ـ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا بِشْرٌ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ عَوْنٍ عَنِ ابْنِ سِيْرِيْنَ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِيْ بَكْرَةَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ ذَكَرَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَعَدَ عَلٰى بَعِيْرِهٖ وَاَمْسَكَ اِنْسَانٌ بِخِطَامِهٖ اَوْ بِزِمَامِهٖ قَالَ اَيُّ يَوْمٍ هٰذَا فَسَكَتْنَا حَتّٰى ظَنَنَّا اَنَّهٗ سَيُسَمِّيْهِ سِوٰى اسْمِهٖ، قَالَ اَلَيْسَ يَوْمُ النَّحْرِ؟ قُلْنَا بَلٰى، قَالَ فَاَيُّ شَهْرٍ هٰذَا؟ فَسَكَتْنَا حَتّٰى ظَنَنَّا اَنَّهٗ سَيُسَمِّيْهِ بِغَيْرِ اسْمِهٖ قَالَ اَلَيْسَ بِذِي الْحِجَّةِ؟ قُلْنَا بَلٰى، قَالَ فَاِنَّ دِمَاءَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ بَيْنَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِيْ شَهْرِكُمْ هٰذَا فِيْ بَلَدِكُمْ هٰذَا

ہم سے بیان کیا مسدد نے، کہا ہم سے بیان کیا بشر نے، کہا ہم سے بیان کیا ابن عون نے، انھوں نے ابن سیرین سے، انھوں نے عبد الرحمٰن ابن ابی بکرہ سے، انھوں نے اپنے باپ ابو بکرہ سے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا، آپ اونٹ پر بیٹھے تھے (منیٰ میں دسویں ذی الحجہ کو) اور ایک آدمی اونٹ کی نکیل یا اس کی باگ تھامے تھا، آپ نے (لوگوں سے) فرمایا: یہ کون سا دن ہے؟ ہم لوگ چپ ہو رہے، یہاں تک کہ ہم سمجھے کہ آپ اس دن کا کچھ اور نام رکھیں گے، پھر آپ نے فرمایا کیا یہ یوم النحر نہیں ہے؟ ہم نے کہا: کیوں نہیں! یوم النحر ہے، آپ نے فرمایا یہ کون سا مہینہ ہے؟ ہم چپ رہے یہاں تک کہ ہم سمجھے آپ اس مہینہ کا جو نام ہے اس کے سوا کوئی اور نام رکھیں گے، آپ نے فرمایا کیا یہ ذی الحجہ کا مہینہ نہیں ہے؟ ہم نے عرض کیا: کیوں نہیں! یہ ذی الحجہ کا مہینہ ہے، آپ نے فرمایا تو تمھارے خون اور تمھارے مال اور تمھاری آبروئیں ایک دوسرے پر اس طرح سے حرام ہیں جیسے تمھارے اس دن کی حرمت اس مہینہ میں، اس شہر میں۔

قولہ فاعرض الخ: اعراض سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ منافق ہی ہو کیونکہ پتہ نہیں یہ کون تھا۔ حافظ نے لکھا ہے کہ میں اب تک مطلع نہیں ہو سکا کہ یہ تین شخص کون تھے۔

باب [۱] قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم رب مبلغ اوعی من سامع

اس میں بتلاتے ہیں کہ اگر عالم سے کچھ سنے تو چاہئے کہ دوسروں کو پہونچا دے، کیونکہ کبھی وہ اس قدر محفوظ نہیں رکھتا جتنا کہ دوسرا

لِيُبَلِّغَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَإِنَّ الشَّاهِدَ عَسَى أَنْ يُبَلِّغَ مَنْ هُوَ أَوْعَى لَهُ مِنْهُ ۔
جو یہاں حاضر ہے وہ اس کو خبر کردے جو غائب ہے، کیونکہ جو حاضر ہے شاید وہ ایسے شخص کو خبر کردے جو اس بات کو اس سے زیادہ یاد رکھے۔

بَابٌ الْعِلْمُ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ لِقَوْلِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ (فَاعْلَمْ أَنَّهُ

علم مقدم ہے قول اور عمل پر، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (سورہ محمد میں) فرمایا : تو جان رکھ کہ اللہ کے سوا

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ) فَبَدَأَ بِالْعِلْمِ، وَأَنَّ الْعُلَمَاءَ هُمْ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ وَرَّثُوا الْعِلْمَ
کوئی سچا معبود نہیں، اللہ نے علم کو پہلے بیان کیا، اور (حدیث میں ہے) کہ عالم لوگ وہی پیغمبروں کے وارث ہیں، پیغمبروں نے

مَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ وَمَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَطْلُبُ بِهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللهُ لَهُ
علم کا ترکہ چھوڑا، پھر جس نے علم حاصل کیا اس نے پورا حصہ (اس ترکہ کا) لیا اور (حدیث میں ہے) جو کوئی علم حاصل کرنے کیلئے

طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ
راستہ چلے تو اللہ اس کے لئے بہشت کا راستہ آسان کر دے گا ـــــــــــ

سننے والا محفوظ رکھ سکتا ہے، تو صحابہؓ کو حکم دے رہے ہیں کہ جس نے سنا ہے وہ دوسروں کو پہونچائے کیونکہ دوسرا کبھی زیادہ محفوظ رکھنے والا ہوتا ہے

قولہ اَوْعیٰ : یہ وعی سے ہے جس کے معنیٰ ہیں محفوظ رکھنا، اس کی دو صورتیں ہیں : ایک تو یہ کہ الفاظ محفوظ رکھے، اور دوسری یہ کہ فہم میں اس سے احفظ واجود ہو، میرے خیال میں اسے عام ہی رکھنا چاہئے" دونوں میں سے خواہ کسی طرح سے ہو۔

حدیث ۶۷ قولہ بخطامہ اوبزمامہ : خطام اور زمام دو لفظ آئے، حافظ ابن حجر کہتے ہیں دونوں ایک ہیں، مگر بعض لوگوں نے کہا کہ بڑی رسی خطام اور چھوٹی زمام ہے، یہاں بہر حال نکیل مراد ہے، نکیل اس لئے پکڑے ہوئے تھے کہ اونٹ کے چلنے کی وجہ سے بیان میں پریشانی نہ ہو، یہ زمام کے پکڑنے والے یہی ابو بکرہ تھے، وقیل بلال۔

قولہ فسکتنا : بعض روایات میں ہے کہ "اللہ ورسولہ اعلم" کہا۔ اللہ اور اس کا رسول زیادہ واقف ہے، ان دونوں روایتوں میں تضاد نہیں ہے اس لئے کہ "اللہ ورسولہ اعلم" کہنا درحقیقت تادب و تفویض اور اصل جواب سے سکوت ہی ہے اس سے صحابہؓ کا ادب معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر خیال رکھتے تھے، حالانکہ چیز بالکل ظاہر تھی، ہر شخص مبادرت کرسکتا تھا مگر نہیں کیا۔

قولہ کحرمة یومکم هذا الخ چونکہ عرب کے نزدیک یہ دن اور مہینہ اور بلد محترم تھے اور ان کا احترام مرکوز فی القلب تھا اس لئے اس سے مشابہت دے کر بتلایا کہ ایسی ہی حرمت ان اشیاء کی بھی ہونی چاہئے۔

. . . .

قولہ فان الشاهد عسیٰ ان يبلغ من هو اوعیٰ له منه : اس کا ترجمہ جس کا کہ بعض نے احفظ، بعض نے افہم ترجمہ کیا ہے میں نے عام رکھا کہ حفاظت فہم و حفظ دونوں سے ہوتی ہے، الفاظ یاد کرلئے تب بھی حفظ ہے اور مضامین و مطالب ذہن نشین کرلئے تب بھی حفظ ہے

باب [۵۲] العلم قبل القول والعمل الخ

یہ بتلاتے ہیں کہ علم قول و عمل سے مقدم ہے اور تمام اعمال واقوال مبنی ہیں علم پر، اگر علم صحیح ہے تو سب درست اور اگر علم صحیح نہیں تو عمل بھی خراب۔ امام غزالیؒ نے اس کی مثال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک شخص جارہا ہے اور دور سے ایک چلنے والے کو دیکھ کر سمجھا کہ یہ گھوڑا یا گدھا یا بیل ہے، تو وہ بے خوف چلا جائے گا کیونکہ یہ اس کے علم کے موافق ہے، اور اگر اسے شیر سمجھا تو الٹے پاؤں بھاگے گا، اگرچہ اس کا علم غلط ہو مگر اپنے علم کے مطابق حرکات پیدا ہوں گے، اصل یہ ہے کہ علم سے رغبت یا رہبت پیدا ہوتی ہے، اور جب رغبت یا رہبت پیدا ہوتی ہے تو حرکت پیدا ہوتی ہے، اور جب حرکت پیدا ہوتی ہے تو اعمال جوارح کا صدور شروع ہوجاتا ہے، یا یوں کہو کہ کسی جگہ حلوا رکھا ہے تو اس کی طرف پہلے رغبت ہوگی، پھر اس طرف ہاتھ بڑھے گا، پھر کھائے گا تو اس وقت تمام حرکات موافق علم کے ہوئیں، اور اگر معلوم ہوجائے کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے تو ہرگز ہاتھ نہ بڑھے گا۔ تو معلوم ہوا کہ اصل چیز علم صحیح ہے اور اسی پر تمام حرکات کا دارومدار ہے اور اعمال کی صحت اور اسکا سقم موقوف ہے علم کے صحیح یا سقیم ہونے پر۔

امام بخاری آیت لائے اور اس جملہ کو لاکر بتلادیا کہ تمام آیت تلاوت کرکے مطلب نکالو، پوری آیت یہ ہے: فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ[1] خوب جان رکھو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بخشش چاہو اپنے گناہوں کی اور ایمان والے مردوں اور عورتوں کی۔ تو استغفار خواہ قلب سے ہو یا زبان سے، اسی وقت ہوگا جب علم صحیح ہو، جب علم صحیح نہیں تو عمل بھی درست نہیں اسے یاد رکھو کہ میں کہہ رہا ہوں کہ اگر علم صحیح و قوی ہے تو عمل بھی صحیح و قوی ہے، اگر علم صحیح نہیں تو عمل بھی باطل ہوگا اور اگر علم قوی نہیں تو عمل میں ضعف ہوگا۔

اب جو یہ فرمارہے ہیں: اِنَّ العلماءَ هم ورثة الانبياء علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں، یہ کیوں کہہ رہے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبوت صفات علمیہ اور کمالات علمیہ سے ہے نہ کہ عملیہ سے، کیونکہ نبی کہتے ہیں خبر دینے والے کو، تو پہلے نبی علم حاصل کرتا ہے پھر خبر دیتا ہے، تو نبوۃ من حیث ہو نبوۃ صفت علمی ہے اور جب علم ہے تو اس کے مطابق عمل بھی ہوگا، لہٰذا بلا شبہ علماء ہی ورثۂ انبیاء ہوسکتے ہیں، " العلماء ورثة الانبياء " حدیث ہے، اور جو مشہور ہے " علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل " سو ان لفظوں کے ساتھ ثابت نہیں، البتہ ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: اِنَّ

---

(۱) محمد : ۱۹

وَقَالَ (اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا) وَقَالَ (وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ)

اور اللہ نے فرمایا (سورۂ فاطر میں) خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو عالم ہیں ، اور فرمایا (سورہ عنکبوت میں) ان مثالوں کو وہی سمجھتے

وَقَالَ (وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ) وَقَالَ هَلْ

ہیں جو علم والے ہیں ، اور فرمایا (سورہ ملک میں) وہ دوزخی کہیں گے اگر ہم پیغمبروں کی بات سنتے یا عقل رکھتے ہوتے تو (آج) دوزخیوں میں نہ

يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ،

ہوتے ، اور (سورۂ زمر میں) فرمایا (اے پیغمبر کہہ دے) کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں برابر ہیں ؟ .

الانبیاء لم یورثو دینارًا ولا درھمًا بل ورثوا العلم ' یقیناً انبیاء نے دراہم ودنانیر کا وارث نہیں بنایا بلکہ علم کا وارث بنایا ہے ' مگر جس علم کا علماء کو وارث بنایا ہے وہ ایسا علم ہے جو صحیح بھی ہو اور قوی بھی ، جس سے عمل خود بہ خود ناشی وصادر ہو اور اگر کوئی تمام کتابیں رٹ لے مگر عمل نہیں ہے تو شریعت کی زبان میں وہ علم اس پر وبال ہے ، اسی کو فرمایا والقراٰن حجۃ لک او علیک ، تو علم وہ ہے جس سے خشیت اور تقویٰ پیدا ہو ، اور جب خشیت ہوگی تو عمل بھی اس کے مطابق ضرور ہوگا ، چنانچہ آگے فرماتے ہیں :

من سلک طریقًا یطلب بہ علمًا الخ ' یہ مسلم کی حدیث ہے مگر کچھ تھوڑا سا فرق ہے .

بعض روایات ابن عبد البر نے اپنی کتاب " جامع بیان العلم " میں درج کی ہیں اور بتلایا ہے کہ جو واقعی علم دین کا طالب ہو اور اسی میں وہ مر جائے تو وہ شہید ہوگا بشرطیکہ نیت صحیح ہو اور علم بھی صحیح وقوی ہو حتیٰ کہ شہداء کا خون اور کتابت کی سیاہی دونوں یکساں ہیں .

قولہ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء ' یہ کلمہ حصر کا ہے ، ترجمہ یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف جاننے والے ہی ڈرتے ہیں اللہ سے ، یعنی وہ جن کے دل میں منقش ہو چکا ہے اور اللہ تعالیٰ کی خشیت اور خوف اس پر غالب ہے وہ علماء ہی ہیں ، علم والوں میں سب سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ، تو خشیت اور تقویٰ کے مراتب بھی انھیں پر ختم ہیں ، جیسا کہ آپ نے خود فرمایا : انا اخشاکم وفی بعض الروایات انا اتقاکم .

قولہ وما یعقلھا الا العالمون ' "ھا" کی ضمیر راجع ہے امثال کی طرف ، یعنی جو امثال اللہ بیان فرماتا ہے اسے اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں .

قولہ قالوا لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحاب السعیر ' انھوں نے کہا کاش ہم سنتے یا سمجھتے تو آج اہل جہنم میں نہ ہوتے _ یہی دو صورتیں ہیں کہ یا تو خود سمجھتا ہو یا پھر اگر خود نہیں سمجھتا تو دوسروں کی سنے اور سن کر صحیح راہ اختیار کرے ، انھوں نے ان دونوں باتوں میں سے کسی کو اختیار نہیں کیا اس لئے تباہی سامنے آئی اور خود وہ اس کے معترف بھی ہوئے کہ قصوروار ہم ہی ہیں ، قرآن نے

وَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُّفَقِّہْہُ فِی الدِّیْنِ

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ جس کی بھلائی چاہتا ہے اس کو دین کی سمجھ دیتا ہے، اور فرمایا: علم

وَاِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ

سیکھنے ہی سے آتا ہے۔

ارشاد فرمایا: "فاعترفوا بذنبهم فسحقًا لاصحاب السّعير" انھوں نے اپنے گناہ کا اقرار کیا تو اب اس تباہی اور لعنت کے مستحق ہو گئے جو بدعملی اور انکار رسول پر مرتب ہوا کرتی ہے، بخاری علیہ الرحمۃ نے اس آیت سے یہ نکالا کہ مدار نجات سماع اور سمجھ پر ہے۔

قولہ: هل يستوى الذين يعلمون والذين لايعلمون، کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں؟ مساوی طرفین سے نہیں، یعنی فضیلت میں بھی ساوی نہیں اور ذمہ داری میں بھی مساوی نہیں، جاننے والے کی ذمہ داری بھی بڑی ہے اور ماخوذ بھی سختی سے ہوگا، حدیث شریف میں ہے کہ سب سے پہلے علماء ہی سے باز پرس ہوگی۔

ابن عبدالبر نے اپنی کتاب "جامع بیان العلم" میں ابن درید کے چند شعر نقل کئے ہیں، تم بھی سنو، اس نے کہا:

اَهْلًا وَسَهْلًا بِالَّذِيْنَ اُحِبُّهُمْ ... وَاَوَدُّهُمْ فِى اللّٰهِ ذِى الْاٰلَاءِ

ان لوگوں کے لئے خوش آمدید ہے جن سے میں محبت رکھتا ہوں ... انھیں میں اللہ کے لئے محبوب رکھتا ہوں جو صاحب انعام واکرام ہے

اَهْلًا لِقَوْمٍ صَالِحِيْنَ ذَوِى التُّقٰى ... غُرِّ الْوُجُوْهِ وَزَيْنِ كُلِّ مَلَاءٍ

ان صاحب تقوی اور صالح لوگوں کے لئے خوش آمدید، ... جن کے چہرے روشن ہیں اور جن سے ہر مجلس کی زینت ہے

يَسْعَوْنَ فِى طَلَبِ الْحَدِيْثِ بِعِفَّةٍ ... وَتَوَقُّرٍ وَسَكِيْنَةٍ وَحَيَاءٍ

وہ لوگ عفت و وقار اور سکینت و حیا کے ساتھ ... طلب حدیث کی سعی کرتے ہیں

لَهُمُ الْمَهَابَةُ وَالْجَلَالَةُ وَالنُّهٰى ... وَفَضَائِلُ جَلَّتْ عَنِ الْاِحْصَاءِ

وہ لوگ باہیبت وجلال اور صاحب عقل ہیں ... اور ان کے فضائل شمار سے بالاتر ہیں

وَمِدَادُ مَا تَجْرِىْ بِهٖ اَقْلَامُهُمْ ... اَزْكٰى وَاَفْضَلُ مِنْ دَمِ الشُّهَدَاءِ

اور ان کے قلم میں جو سیاہی جاری ہے ... وہ خون شہداء سے بھی زیادہ پاکیزہ اور افضل ہے

يَا طَالِبِىْ عِلْمِ النَّبِىِّ مُحَمَّدٍ ... مَا اَنْتُمْ وَسِوَاكُمْ بِسَوَاءِ

اے نبی امی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کے طلبگارو! ... تم اور تمہارے سوا دوسری قومیں برابر نہیں

وَقَالَ اَبُوْذَرٍّ لَوْ وَضَعْتُمُ الصَّمْصَامَةَ عَلٰی هٰذِهٖ وَاَشَارَ اِلٰی قَفَاهُ ثُمَّ ظَنَنْتُ اَنِّیْ

اور ابوذر نے کہا اگر تم تلوار یہاں رکھ دو اور اشارہ کیا انھوں نے اپنی گردن کی طرف، اُس وقت بھی میں سمجھوں کہ (میری گردن مارنے

اُنْفِذُ کَلِمَةً سَمِعْتُهَا مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ اَنْ تُجِیْزُوْا عَلَیَّ لَاَنْفَذْتُهَا

سے پہلے) میں ایک ہی وہ بات سنا سکتا ہوں جو آنحضرت سے میں نے سنی ہے تو البتہ میں اس کو سنا دوں اور آنحضرت

وَقَوْلِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ،

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حاضر کو چاہئے کہ غائب کو (میرا کلام) پہونچا دے۔

اس میں شبہ نہیں کہ کوئی شخص اگر پڑھ کر فن حدیث میں لگا ہوا ہے بشرطیکہ اس کا عمل شرائط کے موافق بھی ہو تو وہ غازی اور مجاہد سے بڑھ کر ہے وَفَّقَنَا اللّٰهُ وَاِیَّاکُمْ۔

قولہ یُفَقِّهْهُ فِی الدِّیْنِ، یعنی اللہ تعالیٰ اسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ دین کے احکام کو اور آفات نفوس کو سمجھنے لگتا ہے، میرے خیال میں تفقہ فی الدین کا نام حکمت ہے کیونکہ قرآن پاک میں فرمایا گیا: وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا" یہاں آیت میں حکمت کو خیر کہا گیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ خیر عظیم دینا چاہتا ہے، تو تفقہ فی الدین عطا فرماتا ہے، دونوں کے ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حکمت تفقہ فی الدین کا نام ہے جسے یہ دولت نصیب ہوجائے وہ بڑا ہی خوش نصیب ہے۔

قولہ اِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ، یہ بھی حدیث ہے[1] یعنی علم سیکھنے سے آتا ہے اور اس کی خاطر جانکاہی اور مشقت اور در بدر کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں تب آتا ہے، غرور، شیخی، کبر، شرم سے حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح آرام طلبی اور لاپرواہی سے نہیں آتا،

قولہ قَالَ اَبُوْذَرٍّ الخ اس کا قصہ یہ ہے کہ سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ کی تفسیر اختلاف پیدا ہو کر جھگڑے کی صورت اختیار کر گئی، سیدنا ابوذر کا فتویٰ تھا کہ مال جمع کرنا بالکل جائز نہیں، اس لئے بیت المال میں بھی کچھ نہ رکھا جائے، اس باب میں امراء سے جھگڑتے تھے اور کہتے تھے کہ مال ہرگز جمع نہ کرنا چاہئے اور اسی آیت سے استدلال کرتے تھے، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور دیگر تمام اکابر صحابہ آیت کا مصداق یہ نہیں سمجھتے تھے، اور نہ بیت المال میں جمع کرنا شرعاً غلط سمجھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ بیت المال تو

---

(۱) فضل الباری میں اس کو مؤلف کا کلام قرار دیا گیا ہے، حالانکہ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے "فلا یغتر بقول من جعله من کلام البخاری"۔ فتح الباری ص ۱۱۸ ج ۱ (مرتب)

وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ حُلَمَاءَ عُلَمَاءَ فُقَهَاءَ، وَيُقَالُ الرَّبَّانِيُّ

اور ابن عباس نے کہا تم ربّانی بن جاؤ، یعنی حلیم بردبار، عالم، سمجھدار، بعضوں نے کہا ربانی وہ ہے جو لوگوں کو بڑی باتیں

الَّذِي يُرَبِّي النَّاسَ بِصِغَارِ الْعِلْمِ قَبْلَ كِبَارِهِ،

سکھانے سے پہلے چھوٹی چھوٹی باتیں ان کو سکھاکر تربیت کرے۔

اسی لئے ہے کہ وہاں مال جمع کیا جائے اور جب جب اس کی ضرورت پیش آئے، مصالح امت پر خرچ کیا جائے، جب یہ معاملہ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ تک پہونچا تو انھوں نے مناسب سمجھا کہ مطلقاً نہیں بلکہ خاص اسی مسئلہ میں ابوذر رضی اللہ عنہ کو فتوی دینے سے روک دیا جائے اس لئے کہ اس فتوے سے امت میں انتشار پیدا ہونے کا شدید خطرہ تھا، چنانچہ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس خاص مسئلہ میں انھیں فتوی دینے سے روک دیا تھا۔

پھر جب حضرت ابوذر حج کو تشریف لے گئے تو مقام منیٰ میں لوگوں نے ان سے مسائل پوچھنا شروع کئے، یہ ان کے جوابات دے رہے تھے تو کسی نے کہدیا کہ آپ کو تو فتوی دینے سے روکا گیا ہے اور آپ فتویٰ دے رہے ہیں، چونکہ اس کا اعتراض غلط تھا اس لئے حضرت ابوذر نے بگڑ کر جواب دیا کہ اگر میری گردن پر شمشیر براں بھی رکھ دی جائے اور مجھے موقع ملے تو میں قبل اس کے کہ تلوار میری گردن پر چلے میں حدیث نبی ضرور سنادوں گا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ایک خاص مسئلہ میں جو ان کی اجتہادی رائے تھی انھیں منع کیا گیا تھا اور یہ معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا تھا اس لئے انھیں بتانے کا حق تھا اور کسی کو روکنے کا حق نہیں تھا، اس لئے حضرت ابوذر کا جواب بھی تلخ تھا۔

دشمنان عثمان نے اس واقعہ کو بہت زیادہ اچھالا اور ابوذر کو مقابل کرنا چاہا لیکن وہ بہرحال صحابی تھے اور اطاعت امیر کو واجب سمجھتے تھے، اس لئے اس مسئلہ میں اطاعت امیر کا حق ادا کیا اور حدیث بتانے میں حدیث کا حق ادا کیا۔

قولہ کونوا ربانیین حلماء علماء فقہاء، ربّانی اصل میں رب کی طرف منسوب ہے، الف اور نون مزید مبالغہ کے لئے زیادہ کردیتے ہیں، یعنی اللہ والے بن جاؤ، اور یہ اس وقت ہوگا جب کہ یہ چیزیں جمع ہوں: حکمت، علم، تفقہ۔ علم: جاننا۔ تفقہ: گہرائی کو سمجھنا، یعنی علم بھی ہو اور تفقہ بھی ہو، حکمت کے معنی ہیں ہر چیز کو اس کے موضع اور محل میں رکھنا، بے موقع کلام سے بچنا اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوتوں کا صحیح استعمال کرنا، مثلاً اللہ نے قوت سماع مرحمت فرمائی، اسے اگر فلمی گانے سننے میں صرف کرے تو یہ بے موقع صرف کرنا ہوگا، کسی کو بہترین قباء عطا فرمائی وہ اس سے کھانا پکانے لگے اور لکڑیاں جو کھانا پکانے کے لئے تھیں، انھیں سوٹ کیس میں چن کر رکھے، تو ظاہر ہے کہ ایسے آدمی کو سب احمق کہیں گے، اس لئے کہ ان چیزوں کا استعمال اس نے بے موقع کیا،

. . . .

غرض حکمت ایک نور بصیرت ہے جس کے ذریعہ سے ہر چیز کو اپنے موقع پر رکھنے کا شعور حاصل ہوتا ہے اور بے موقع استعمال سے بچنا آسان ہوجاتا ہے، حکمت کی یہ تعریف سب سے بہتر ہے، سارے معانی اس میں آجاتے ہیں۔

بعض مفسرین (ابن کثیر وغیرہ) نے حکمت سے سنت مراد لی ہے، وہ بھی درست ہے، سنت کا کام ہی ہے تبیین کرنا اور ہر چیز کا موقع بتانا، مثلاً جب یہ آیت نازل ہوئی فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (۱) تو آپؐ نے فرمایا: اِجْعَلُوهَا فِي رُكُوعِكُمْ، اور جب یہ آیت آئی سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى (۲) تو آپؐ نے فرمایا: اِجْعَلُوهَا فِي سُجُودِكُمْ سو ہر آیت کا محل، اس کا محل، اس کا موضوع بتانا، سب حکمت ہے، مگر حکمت اسی میں منحصر نہیں ہے بلکہ اور بھی حکمت ہے، حکمت کا مادہ ح ك م ہے، لغت میں اس کے معنی اصلاح کی غرض سے روکنے کے ہیں، اہل عرب بولتے ہیں: حَكَمْتُ الدَّابَّةَ میں نے جانور کو لگام لگائی، لگام ہی کے ذریعہ گھوڑے کو روکتے اور قابو میں رکھتے ہیں، یہی معنی روکنے کے یہاں بھی ہیں، حکمت گویا عقل کی لگام ہے، عقل کو روکتی ہے تاکہ وہ بے قابو ہوکر کام نہ کرے، اللہ تعالیٰ کو حکیم اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کا کوئی کام بے محل اور خلاف وضع اور خلاف مصلحت نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ عبداللہ ابن عباس نے بتلایا کہ ربانی بنو جس کے لئے یہ تین صفتیں درکار ہیں: حکمت، علم، فقہ۔ جو ان کا حامل ہوگا وہ ربانی ہوگا۔

قولہ وَيُقَالُ الرَّبَّانِيُّ الَّذِي يُرَبِّي النَّاسَ الخ میرے نزدیک یہ بھی پہلی ہی تفسیر میں داخل ہے، انھوں نے رب کو لغوی معنی میں لیا، یعنی مربّی (جو تربیت کرے) اور تربیت کہتے ہیں کسی چیز کو اپنی استعداد کے مطابق بتدریج اس کی حد کمال کو پہونچانا، جس کے وہ لائق ہے، جیسے بچہ کی تربیت اس کے مرتبہ اور عمر کے لحاظ سے، اسی طرح عالم ربانی وہ ہے جو لوگوں کی تربیت کرے اس طرح کہ پہلے چھوٹے علوم بتائے پھر بڑے، اس کا مآل بھی یہی ہے کہ موقع پر رکھے، حکیم یہ دیکھتا ہے کہ کہاں تک اسے فائدہ پہونچ سکتا ہے، نہ یہ کہ اپنے علوم کے اعتبار سے ادق تقریر کرے، تو پہلے عادت ڈالتے ہیں، جیسے بچوں کو پہلے قواعد بغدادی پڑھاتے ہیں پھر بتدریج ترقی کراتے ہیں، اسی طرح پہلے فروع بتاتے ہیں، پھر اسرار ودقائق میرے خیال میں یہ تفسیر حکماء کی تفسیر کے تحت میں آگئی، ابن عباس کی تفسیر بہت جامع ہے۔

---

(۱) واقعہ: ۷۴ (۲) اعلیٰ: ۱

باب[۵۳] ماکان النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم یتخوّلہم بالموعظۃ والعلم کی لاینفروا.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو موقع اور وقت دیکھ کر سمجھاتے اور علم کی باتیں بتلاتے اسلئے کہ ان کو نفرت نہ ہو جائے۔

۶۸۔ حدّثنا محمّد بن یوسف قال انا سفیان عن الاعمش عن ابی وائل عن ابن مسعود قال کان النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم یتخوّلنا بالموعظۃ فی الایّام کراھۃ السّآمۃ علینا.

ہم سے بیان کیا محمد ابن یوسف نے، کہا ہم کو سفیان نے خبر دی، انھوں نے اعمش سے، انھوں نے ابو وائل سے، انھوں نے ابن مسعود سے، کہا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنوں میں نصیحت کرنے کے لئے وقت اور موقع کی رعایت فرماتے، آپ اس کو برا سمجھتے کہ ہم اکتا جائیں۔

۶۹۔ حدّثنا محمّد بن بشّار قال ثنا یحیی بن سعید قال ثنا شعبۃ قال حدّثنی ابو التیّاح عن انس عن النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم قال یسّروا ولا تعسّروا وبشّروا ولا تنفّروا.

ہم سے محمد ابن بشار نے بیان کیا، کہا ہم سے یحییٰ ابن سعید نے بیان کیا، کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا، کہا مجھ سے ابو التیاح نے بیان کیا، کہا انھوں نے انس سے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے فرمایا (لوگوں پر) آسانی کرو، سختی نہ کرو اور خوشی کی بات سناؤ، نفرت نہ دلاؤ۔

---

(۵۳) **باب** ماکان النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم یتخوّلہم بالموعظۃ الخ

تخوّل کے معنی دیکھ بھال کرنا اور نگرانی کرنا اصلاح کے لئے۔ مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن اوقات میں دیکھتے کہ نصیحت کا وقت مناسب ہے اس وقت بیان فرماتے، یعنی نشاط اور شوق کے وقت بیان فرماتے۔

حدیث ۶۸ : سآمۃ : اکتا جانا، ملول ہونا۔ بڑے سے بڑا عالم بھی اگر روزانہ وعظ کہے تو لوگ اکتا کر بددل ہو جائیں گے۔

حدیث ۶۹ : قولہ یسّروا۔ یعنی اس طرح سمجھاؤ کہ دین کو مشکل نہ سمجھ لیں، بلکہ بتدریج انھیں دین کی طرف بلاؤ۔

. . . .

تاکہ وہ اس طرف رغبت کریں اور ان میں دین سیکھنے کا شوق پیدا ہو اور پھر عملی زندگی میں سدھار آئے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ مداہنت کرے یا خوف کی وجہ سے باطل اشیاء بیان کرنے لگے، اگر کسی کو دیکھو کہ رسوم و بدعات میں منہمک ہے تو اسے آہستہ آہستہ سمجھاؤ تاکہ وہ یہ سمجھ سکے کہ مجھ سے یہ کیسے ہو سکتا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کو سمجھایا تھا کہ پہلے اہل یمن کو کلمۂ شہادت کی تبلیغ کرنا، اگر اسے مان لیں تو نماز کا حکم کرنا، اسے بھی مان لیں تو زکوٰۃ کو کہنا، یہ اسی حکمت کی بنا پر تھا۔

بزرگوں نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا ہے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہم کا ایک مرید تھا، وہ کسی دیہات کا رہنے والا تھا، حضرت کی خدمت میں آیا اور بے تکلفی سے کہا کہ حضرت تم مجھ کو مرید کرلو، حضرت نے پوچھا: تم مرید ہوگے؟ دیہاتی نے کہا ہاں! حضرت نے بیعت کا جو قاعدہ ہے اس کے مطابق چوری سے توبہ کرائی اور زنا وغیرہ سے منع کیا، تو آخر میں اس نے کہا: بس یہی! میں نے نہ تو کبھی چوری کی، نہ زنا کیا، اس کا تو ذکر کر دیا مگر اپھیم (افیون) کا کچھ ذکر نہیں کیا جو میں کھاتا ہوں، حضرت نے حکمت سے کام لیا، دریافت فرمایا، کتنی کھاتا ہے؟ اس نے افیون نکال کر ایک خوراک ہاتھ میں رکھ دی، آپ نے کچھ مقدار کم کرکے دے دی، کہ اتنی کھا لیا کر، وہ چلا گیا اور خوش ہوگیا کہ اجازت مل گئی ۔۔ دیکھنے والا سمجھے گا کہ حضرت نے افیون کھانے کی اجازت دے دی حالانکہ وہ شرعاً حرام ہے، مگر وہ حکیم تھے اس لئے حکمت سے کام لیا، اس وقت تو وہ چلا گیا اور دو چار دن افیون کھاتا بھی رہا، مگر چند ہی دنوں کے بعد اس میں داعیہ پیدا ہوا کہ اگر یہ اچھی چیز تھی تو حضرت جی نے مقدار کیوں کم کی اور اگر بری چیز تھی تو تھوڑی بھی بری اور زیادہ بھی بری، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جی نے میری رعایت سے اجازت دے دی ہے، یہ سوچ کر اس نے عہد کیا کہ اب میں بالکل ہی نہ کھاؤں گا، مگر چونکہ مدتوں کی عادت تھی اس لئے اس کے چھوڑنے سے دست آنے شروع ہو گئے، ڈاکٹروں نے کہا کہ اس کا علاج بس افیون ہی ہے، اس نے کہا مرنا منظور ہے مگر افیون کھانا منظور نہیں، خدا کی شان! پھر بغیر افیون کھائے اچھا ہوگیا، کئی برسوں کے بعد جب حضرت کی خدمت میں آیا تو زور سے کہا: حضرت جی! السلام علیکم، اور مصافحہ کے ساتھ دو روپے پیش کئے، حضرت نے صرف اس کی دلشکنی کی خاطر لے کر روپے رکھ لئے، دیہاتی بولا: تم نے پوچھا نہیں یہ روپے کیسے ہیں؟ حضرت نے فرمایا، بتلاؤ کیسے ہیں؟ کہنے لگا اپھیم کے ہیں، میں نے اپھیم (افیون) چھوڑ دی اور یہ روپے اسی کے بچا کر رکھے ہیں ۔۔ دیکھئے حکمت اسی طرح ہوتی ہے اور حکیم اسی کو کہتے ہیں جو استعداد دیکھے پھر جیسی سہار ہو ویسی ہی دوا تجویز کرے۔

حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عورتوں سے بیعت لی تو آپ نے یہ بھی فرمایا کہ نوحہ نہ کرنا، ایک عورت (ام عطیہؓ) نے اسی مجلس میں کہا اِلَّا لِبَنِیْ فُلَانٍ، اس کی وجہ بھی اس نے بتائی کہ ہم پر قرضہ باقی ہے اس لئے ہم اسے ضرور اتاریں گے

باب ۵۴ مَنْ جَعَلَ لِاَهْلِ الْعِلْمِ اَيَّامًا مَعْلُوْمَةً ۔

جو شخص علم سیکھنے والوں کے لئے کچھ دن مقرر کر دے ۔

۷۰ ۔ حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ اَبِیْ شَيْبَةَ قَالَ حَدَّثَنَا جَرِيْرٌ عَنْ مَنْصُوْرٍ

ہم سے عثمان ابن ابی شیبہ نے بیان کیا، کہا ہم سے جریر نے بیان کیا، انھوں نے منصور سے

عَنْ اَبِیْ وَائِلٍ قَالَ كَانَ عَبْدُ اللّٰهِ يُذَكِّرُ النَّاسَ فِیْ كُلِّ خَمِيْسٍ فَقَالَ لَهٗ رَجُلٌ

انھوں نے ابو وائل سے کہا: عبد اللہ ابن مسعودؓ ہر جمعرات کو لوگوں کو وعظ سناتے تھے، ایک شخص نے ان سے کہا

يَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ لَوَدِدْتُ اَنَّكَ ذَكَّرْتَنَا كُلَّ يَوْمٍ قَالَ اَمَا اِنَّهٗ يَمْنَعُنِیْ مِنْ

اے ابو عبد الرحمٰن میری آرزو یہ ہے کہ آپ ہر روز ہم کو وعظ سنایا کریں، انھوں نے کہا (یہ کچھ مشکل نہیں) مگر میں اس لئے

ذٰلِكَ اَنِّیْ اَكْرَهُ اَنْ اُمِلَّكُمْ وَاِنِّیْ اَتَخَوَّلُكُمْ بِالْمَوْعِظَةِ كَمَا كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

ایسا نہیں کرتا کہ تم کو اکتا دینا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا، اور میں (تمھاری خوشی کا) موقع اور وقت دیکھ کر تم کو نصیحت کرتا ہوں جیسے

يَتَخَوَّلُنَا بِهَا مَخَافَةَ السَّاٰمَةِ عَلَيْنَا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارا وقت اور موقع دیکھ کر ہم کو نصیحت فرماتے تھے، آپ کو بھی ڈر تھا کہیں ہم اکتا نہ جائیں

صحیح مسلم میں ہے: عَنْ اُمِّ عَطِيَّةَ قَالَتْ لَمَّا نَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ: يُبَايِعْنَكَ عَلٰى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا.... وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ (۱) قَالَتْ كَانَ مِنْهُ النِّيَاحَةُ، قَالَتْ فَقُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِلَّا اٰلَ فُلَانٍ فَاِنَّهُمْ كَانُوْا اَسْعَدُوْنِیْ فِی الْجَاهِلِيَّةِ فَلَابُدَّ لِیْ مِنْ اَنْ اُسْعِدَهُمْ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِلَّا اٰلَ فُلَانٍ (۲) اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے محسوس فرمایا کہ اس وقت انھیں کچھ ڈھیل دینا ہی تقاضائے حکمت ہے، اس لئے آپ نے ڈھیل دے دی، یہ کام ہے حکیم کا۔

(۵۴) باب من جعل لاهل العلم الخ

اس سے پہلے باب میں تخوّل کا ذکر آچکا ہے اور تخول انتظام کو چاہتا ہے، اس لئے اس باب میں دوسرا ترجمہ رکھا کہ اگر معلم مصلحت کی بنا پر کسی جگہ کچھ تعیین اوقات و ایام مناسب سمجھے تو وہ کر دے، اسے بدعت نہیں کہیں گے، ہاں اگر کسی تعیین کو دین کا کام اور ثواب کا سبب

---

(۱) ممتحنہ : ۱۲ (۲) مسلم ص ۳۰۴ ج ۱

. . . .

سمجھ لے تو یہ بدعت ہے جیسے تیجہ وغیرہ کو سبب ثواب سمجھتے ہیں، بدعت وہ ہے کہ کسی ایسی چیز کو جس کا وجود نہ تو سنت میں ہو، نہ صحابہ میں اور نہ ائمہ دین کے زمانے میں، مگر اس کو ثواب کا سبب سمجھ کر کیا جائے، رسوم شادی وغیرہ کو کوئی دین سمجھ کر یا ان میں ثواب تصور کر کے نہیں کرتا اسی طرح غمی کے امور اور اس کی رسوم ہیں، ہاں اگر کوئی انھیں ثواب کا کام سمجھ کر کرنے لگے تو بدعت کہا جائے گا، یہی فرق ہے بدعات و رسوم میں، اسے یاد رکھو کہ جس کی اصل موجود نہ ہو، نہ شارع کے ہاں، نہ صحابہ وائمہ مجتہدین کے ہاں اور اسے ثواب اور دین سمجھ کر کیا جائے تو بدعت ہے، ورنہ وہ بدعت نہیں، چاہے اس کا نام رسم رکھو یا کچھ اور ۔ اتنا اور سمجھ لو کہ دین کا موقوف علیہ دین ہے، اگرچہ حضورؐ سے ثابت نہ ہو، اس کو ایک مثال سے سمجھو کہ کسی حکیم نے تمھیں نسخے میں لکھا کہ خمیرہ گاؤزباں جواہر والا فلاں دواخانہ سے لے کر کھایا کرو، تم دواخانہ پہونچے، دواخانہ والے نے کہا: خمیرہ نہیں ہے، اب اگر تم خود اس کے نسخہ کے مطابق سارے اجزاء فراہم کر کے خمیرہ تیار کرلو تو کیا یہ حکیم کے حکم کے خلاف ہے؟ ہرگز نہیں؛ کیونکہ جب حصول صحت اس کے بغیر ممکن نہیں تو اسے کرنا ہی پڑے گا، ہاں اگر اجزاء بدل دیے یا کمیت میں فرق کر دیا تو بیشک خلاف حکم ہوگا، اسی طرح اس کو سمجھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "طلبُ العلمِ فریضةٌ علیٰ کلِ مسلم" علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر (مرد ہو یا عورت) فرض ہے، تو سب لوگ کیسے طلب کریں؟ کیا یہ بغیر کتب اور بغیر مدارس کے ممکن ہے؟ ہرگز نہیں! تو یہ کتب اور یہ مدارس دین کے موقوف علیہ ہوئے اس لیے یہ بدعت نہ ہوں گے، گو حضورؐ سے ان کا ثبوت نہ ہو ۔ صحابہ کے قویٰ بہت عمدہ تھے، صحبت نبوی سے ان کے قلوب منور تھے اس لیے انھیں ضرورت نہ تھی، مگر اب امور بہ بدون انکے (کتب و مدارس کے) حاصل نہیں ہو سکتا اس لیے یہ بھی ماموربہ میں داخل ہے، ہاں اگر اس کے اجزاء گھٹائیں یا کیفیات یا کمیات یا تعداد میں تصرف کریں تو یہ بدعت ہوگا، کیونکہ اس کا وجود شریعت میں نہیں ہے، نہ شریعت کا کوئی حکم اس پر موقوف ہے، اور اسی کو بدعت کہتے ہیں، بشرطیکہ اس کو دین سمجھ کر اختیار کریں ۔ ہم نے بدعت کی تعریف میں جو شرطیں بیان کی ہیں وہ اس حدیث سے ماخوذ ہیں: "مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ" ۔ دین میں احداث اسی وقت ہوگا جب اسے دین سمجھے ۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غیر دین کو دین سمجھنا بدعت ہے اور جب کوئی بدعت کسی جماعت کا شعار بن جائے تو پھر اسے نیک نیتی کے ساتھ بھی نہ کرنا چاہیے۔

امام بخاری کا مقصد تو صرف ۔ اتنا تھا کہ تعلیم کے لیے تعین خلاف دین نہیں ہے اور نہ یہ بدعت ہے وہ پورا ہوگیا ۔

. . .

باب ۵۵ مَن يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيرًا يُّفَقِّهْهُ فِى الدِّينِ

اللہ جس کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے اس کو دین کی سمجھ دیتا ہے۔

۷۱ ـ حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ عُفَيْرٍ قَالَ ثَنَا ابْنُ وَهْبٍ عَنْ يُونُسَ عَنْ

ہم سے بیان کیا سعید ابن عفیر نے، کہا ہم سے بیان کیا ابن وہب نے، انھوں نے یونس سے، انھوں نے

ابْنِ شِهَابٍ قَالَ قَالَ حُمَيْدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ سَمِعْتُ مُعَاوِيَةَ خَطِيبًا

ابن شہاب سے، کہا کہ حمید ابن عبد الرحمن نے ان سے نقل کیا کہ میں نے معاویہ سے خطبہ میں سنا، وہ کہتے تھے:

يَقُولُ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا

میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرماتے تھے اللہ کو جس کی بھلائی منظور ہوتی ہے اس کو دین کی سمجھ

يُّفَقِّهْهُ فِى الدِّينِ وَاِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَّاللّٰهُ يُعْطِى وَلَنْ تَزَالَ هٰذِهِ الْاُمَّةُ

عطا فرماتا ہے، اور میں تو بانٹنے والا ہوں، دینے والا اللہ ہے، اور یہ (اسلام کی) جماعت ہمیشہ اللہ کے حکم پر

قَائِمَةً عَلٰى اَمْرِ اللّٰهِ لَا يَضُرُّهُمْ مَّنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَاْتِىَ اَمْرُ اللّٰهِ۔

قائم رہے گی، دشمنوں سے اس کو کوئی نقصان نہ پہونچے گا یہاں تک کہ اللہ کا حکم (قیامت) آجائے۔

باب ۵۵ من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین

سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ممبر پر یہ حدیث سنائی جس سے علم کی فضیلت اور تفقہ فی الدین کی عظمت معلوم ہوتی ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جس کو تفقہ فی الدین حاصل ہو جائے وہ بڑا ہی خوش نصیب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے خیر عظیم کا فیصلہ فرما دیا، یہ محض عطائے خداوندی ہے جو انتہائی قابل قدر اور لائق شکر ہے۔

قولہ انما انا قاسم واللہ یعطی۔ معطی عرف میں مالک کو کہتے ہیں اور قاسم بانٹنے والے کو، مراد یہ ہے کہ اصل مالک تو اللہ ہے، میں تو صرف تقسیم کرنے والا ہوں، یعنی نعمتہائے خداوندی میرے ذریعہ سے بندوں کو ملتی ہیں۔ عرف اسلئے کہا کہ اگر صورت کے اعتبار سے کہا جائے تو حضور دونوں ہیں، معطی بھی اور قاسم بھی اور اگر حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معطی اور قاسم دونوں اللہ ہی ہے، اس لئے اب فرق کیسے درست ہوگا، لہٰذا یہ عرف ہی پر مبنی ہوگا اور مطلب یہ ہوگا کہ مخلوق کو جو کچھ بھی ملتا ہے اور اس میں تفقہ فی الدین بھی داخل ہے۔ وہ اللہ ہی کا عطیہ ہے۔ البتہ اس کی تقسیم میری معرفت ہوتی ہے۔ ہر قسم کی نعمتیں اور ہر قسم کے اعلیٰ مراتب و مناصب اور ولایت و صدیقیت، حتیٰ کہ نبوت و رسالت سب آپ ہی کے واسطے سے مخلوق کو ملتی ہے۔ براہ راست کسی کو کچھ

بابٌ۵۶ الفَهمِ فی العِلمِ

علم کے لئے عقل کی ضرورت

۷۲۔ حَدَّثنا عَلِیُّ بنُ عَبدِ اللّٰہِ قَالَ ثنا سُفیَانُ قَالَ قَالَ لِی ابنُ اَبِی نَجیحٍ

ہم سے علی ابن عبد اللہ (مدینی) نے بیان کیا، کہا ہم سے سفیان نے بیان کیا، انھوں نے کہا مجھ سے ابن ابی نجیح نے

عَن مُجَاھِدٍ قَالَ صَحِبتُ ابنَ عُمَرَ اِلَی المَدِینَۃِ فَلَم اَسمَعہُ یُحَدِّثُ عَن رَسُولِ اللّٰہِ

کہا، انھوں نے مجاہد سے، انھوں نے کہا میں عبد اللہ ابن عمر کے ساتھ رہا مدینے تک، میں نے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ اِلَّا حَدِیثًا وَاحِدًا قَالَ کُنَّا عِندَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ

حدیث بیان کرتے نہیں سنا مگر صرف ایک حدیث، انھوں نے کہا: ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ

نہیں ملتا، اور یہ فیض قیامت تک جاری رہے گا اس لئے اس کے لینے والے بھی لامحالہ قیامت تک رہیں گے، اسی کا بیان لَن تَزَالَ ھٰذِہٖ الاُمَّۃُ میں ہے، مراد امت کا ایک طائفہ ہے، جیسا کہ دوسری جگہ تصریح ہے، اس میں اختلاف ہوا ہے کہ وہ کون سی جماعت ہے جس کے بارے میں حضورؐ فرما رہے ہیں، ہر فن والا اپنی طرف کھینچتا ہے، مجاہدین اپنے لئے، محدثین اپنے لئے، مفسرین وفقہا اپنے لئے، غرض ہر فن والے نے اس کا مصداق اپنے کو بتایا ہے، امام بخاری محدثین کو بتاتے ہیں، امام احمد بن حنبل اہل السنۃ والجماعۃ کو کہتے ہیں، مگر حق یہ ہے کہ الفاظ حدیث زیادہ تر مجاہدین پر صادق آتے ہیں، کیونکہ دوسری حدیث میں یقاتلون علی الحق ہے (حق کی خاطر قتال کرتے رہیں گے) اور کسی ملامت گر کا ان پر کوئی اثر نہ ہوگا البتہ اگر قتال سے عام مراد لیا جائے تو بیشک علماء بھی اس میں آجائیں گے اور خدا کا شکر ہے کہ ہر زمانہ میں کوئی نہ کوئی جماعت کسی نہ کسی جگہ ضرور رہی ہے جو اس کی مصداق ہوتی ہے، امام احمد نے جو اہل السنۃ کو اس کا مصداق قرار دیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قتال کرنے والے اہل السنۃ ہی ہونگے۔

قولہ حَتّٰی یَاتِیَ اَمرُ اللّٰہِ: بعض روایتوں میں "حَتّٰی تَقُومَ السَّاعَۃُ" آیا ہے، اس سے مراد قرب قیامت ہے۔ اس وقت ایک ہوا یمن کی طرف سے چلے گی اور جملہ مومنین کی روح قبض کرلے گی، پھر اس وقت کوئی مومن نہ رہے گا، اور اس کے بعد قیامت آجائے گی۔

(۵۶) باب الفہم فی العلم

قولہ اِلَّا حَدِیثًا وَاحِدًا، اس سے معلوم ہوا کہ اکثار نہ کرتے تھے، روایت کرنے میں محتاط تھے، بہت سے صحابہ احتیاط کرتے تھے اور احادیث کم بیان کرتے تھے، لیکن حدیث کی کتابوں میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے جو بہت سی روایتیں موجود ہیں، ممکن ہے وہ اس بنا پر ہوں کہ وہ از خود تو کم بیان کرتے رہے ہوں، مگر جب لوگ پوچھتے تو بیان فرماتے ہوں ۔۔۔ اور ظاہر ہے کہ وہ صحابی رسول تھے، اور

فَأُتِیَ بِجُمَّارٍ فَقَالَ اِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَۃً مَثَلُھَا کَمَثَلِ الْمُسْلِمِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَقُوْلَ

اتنے میں کوئی کھجور کا گابھ لایا، آپؐ نے فرمایا: درختوں میں ایک درخت ایسا ہے کہ وہ مسلمان کی مثال ہے، میرے دل میں آیا کہدوں

ھِیَ النَّخْلَۃُ فَاِذَا اَنَا اَصْغَرُ الْقَوْمِ فَسَکَتُّ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھِیَ النَّخْلَۃُ

وہ کھجور کا درخت ہے، پھر میں نے دیکھا کہ سب لوگوں میں میں ہی کمسن تھا، بزرگوں کو دیکھ کر میں (شرم سے) چپ رہا، آخر آپؐ نے خود ہی فرمادیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے

بَاب ۵۷ الْاِغْتِبَاطِ فِی الْعِلْمِ وَالْحِکْمَۃِ وَقَالَ عُمَرُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ

علم اور دانائی کی باتوں میں رشک کرنا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم بزرگ بننے سے پہلے

تَفَقَّھُوْا قَبْلَ اَنْ تُسَوَّدُوْا قَالَ اَبُوْعَبْدِاللّٰہِ وَبَعْدَ اَنْ تُسَوَّدُوْا وَقَدْ تَعَلَّمَ

دین کا علم حاصل کرلو، امام بخاری نے فرمایا کہ بزرگ بننے کے بعد بھی حاصل کرو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

اَصْحَابُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَعْدَ کِبَرِ سِنِّھِمْ۔

صحابہ نے بڑھاپے میں علم حاصل کیا ہے

اتباع سنت کا انھیں بڑا اہتمام تھا، حتیٰ کہ جب سفر کرتے تو اس کا پورا خیال رکھتے تھے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کیا تھا، بالکل اسی طرح یہ بھی کریں، اس لحاظ سے بہت سے حضرات ان سے مختلف باتیں پوچھتے ہوں گے تاکہ ان کے ذریعہ حکم نبوی معلوم ہوجائے اور یہ بھی چھپاتے نہ تھے، جب ضرورت سمجھتے بیان فرماتے، اس طرح اچھا خاصا مجموعہ ہوگیا۔

حدیث ۷۲: حدیث گذر چکی ہے، یہاں بخاری اس کو مکرر اس لئے لائے ہیں کہ بتائیں علم میں فہم درکار ہے، دیکھو ابن عمر نے فہم سے کام لیا، کیونکہ اولاً تو سفر میں خواہ مخواہ کی گفتگو نہیں کی، ثانیاً بڑوں کا اس قدر ادب کیا کہ ایک بات ذہن میں آئی مگر چونکہ دوسرے بڑے لوگ بھی بیٹھے تھے، اس لئے ان کے مقابلہ میں اپنا علم ظاہر نہیں کیا، خود ہی فرمایا کہ مجھے شرم آئی کہ یہ معمر حضرات تشریف فرما ہیں میں چھوٹا ہوکر بولنے لگوں، یہ مناسب نہیں۔ بڑا عمدہ سبق دیا۔

(۵۷) باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ

اغتباط: ریس کرنا، رشک کرنا، ایک حسد ہے اس میں تمنا ہوتی ہے کہ محسود سے یہ نعمت زائل ہوجائے، اور غبطۃ میں اپنے لئے خیر کی طلب ہوتی ہے، دوسرے کے زوال نعمت کی تمنا نہیں ہوتی، اسی بناپر محمود اشیاء میں غبطہ جائز ہے، اسی کو قرآن کریم میں فرمایا:

۷۳ - حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ حَدَّثَنَا اِسْمٰعِيْلُ

ہم سے حمیدی نے بیان کیا، کہا ہم سے سفیان نے بیان کیا، کہا ہم سے بیان کیا اسمٰعیل ابن ابی خالد نے،

بْنُ اَبِیْ خَالِدٍ عَلٰی غَیْرِ مَا حَدَّثَنَاهُ الزُّهْرِیُّ قَالَ سَمِعْتُ قَیْسَ بْنَ اَبِیْ حَازِمٍ

زہری نے جو ہم سے بیان کیا اس سے الگ طور پر کہا میں نے قیس ابن ابی حازم سے سنا، کہا میں نے عبداللہ بن مسعود سے

قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

سنا، کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو (آدمیوں کی) خصلتوں پر کوئی رشک کرے تو ہو سکتا ہے، ایک تو

لَاحَسَدَ اِلَّا فِی اثْنَتَیْنِ رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَسُلِّطَ عَلٰی هَلَکَتِهٖ فِی الْحَقِّ

اس پر جس کو اللہ نے دولت دی، وہ اس کو نیک کاموں میں خرچ کرتا ہے، دوسرے اس پر جس کو اللہ نے

وَرَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْحِکْمَةَ فَهُوَ یَقْضِیْ بِهَا وَیُعَلِّمُهَا.

قرآن و حدیث کا علم دیا وہ اس کے موافق فیصلہ کرتا ہے اور لوگوں کو سکھاتا ہے۔

وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۱) اور اس چیز کے حاصل کرنے میں بازی لے جانے کے خواہشمند بازی لے جانے کی کوشش کریں یہاں تنافس سے غبطہ ہی مراد ہے۔

قولہ تَفَقَّهُوْا قَبْلَ اَنْ تُسَوَّدُوْا: تسوّدوا صیغہ مجہول کا ہے، یعنی سیادت کے لئے پہلے تیاری کرو اور اس کے لئے دین کی سمجھ حاصل کرو، تاکہ سیادت کے اہل بن سکو، ورنہ اگر بلا سمجھ اور علم کے سردار بن گئے تو لوگوں کو اور خراب ہی کروگے اور ان کے اخلاق کی درستی نہ ہو سکے گی اس کے برعکس جو شخص پہلے سے تیار ہوگا اور اپنے میں اس کی اہلیت پیدا کرے گا تو وہ سردار بن کر امت کیلئے خیر کا باعث ہوگا، اس کے اچھے اخلاق اور علم و حکمت سے امت کو فائدہ پہونچے گا، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس قول میں یہ حکمت بھی ہے کہ سردار بننے سے پہلے سیکھنا آسان ہے اور اس وقت سیکھنے اور علم حاصل کرنے میں حیا مانع نہ ہوگی، ورنہ جب بڑا ہو جائے گا تو پھر کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے میں حیا مانع ہوگی اور تحصیل علم سے محروم رہ جائے گا۔

امام بخاری نے آگے کا جملہ وَبَعْدَ اَنْ تُسَوَّدُوْا بڑھا کر اس کی مزید تکمیل فرمادی کہ سیادت کے بعد بھی دین کی سمجھ حاصل کرو، یعنی یہ نہ سمجھنا کہ اب ضرورت نہیں رہی، ضرورت اب بھی ہے، گو صحیح وقت قبل سیادت ہی ہے لیکن استغنا کسی وقت بھی نہیں۔

---

(۱) مطففین: ۲۶

باب[۵۸] ما ذُکِرَ فِی ذَهَابِ مُوسیٰ فِی الْبَحْرِ اِلَی الْخَضِرِ وَقَوْلِهٖ تَبَارَکَ وَتَعَالیٰ : (هَلْ اَتَّبِعُکَ عَلیٰ اَنْ تُعَلِّمَنِیْ) الاٰیۃ ۔

حضرت موسیٰ کا سمندر کے کنارے حضرت خضر کی تلاش میں جانا اور اللہ تعالیٰ کا (سورۂ کہف میں) حضرت موسیٰ کا یہ قول نقل کرنا : کیا میں تمہارے ساتھ رہوں ..... (آخر آیت تک)

۷۴ ۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عُزَیْرِ الزُّهْرِیُّ قَالَ حَدَّثَنَا یَعْقُوبُ بْنُ اِبْرَاهِیْمَ

ہم سے محمد ابن عزیر زہری نے بیان کیا، کہا ہم سے یعقوب ابن ابراہیم نے بیان کیا

آگے بعد ان تسودوا کا شاہد بھی پیش کر دیا کہ اصحاب نبی علیہ السلام کبرسنی میں بھی علم سیکھتے تھے، اس کا ثمرہ یہ ہے کہ علم اسی کو آتا ہے جو بڑے چھوٹے کا لحاظ نہ کرے بلکہ چھوٹے بڑے ہر ایک سے فائدہ حاصل کرے اور اس میں بالکل شرم نہ کرے اور تازندگی اپنے علم میں برابر اضافہ کرتا رہے ۔

حدیث ۷۳ : قولہ علی غیر ما حدثناہ الزہری ، یعنی یہ حدیث اسمٰعیل کی ہے اور یہی حدیث زہری سے بھی ہے مگر دونوں میں کچھ فرق ہے جو آگے لائیں گے ۔

قولہ لاحسد الا فی اثنتین یعنی حسد کرنے کے قابل یہ دو چیزیں ہیں ، بعض لوگوں نے یہ مطلب بیان کیا کہ حسد کسی چیز میں جائز نہیں اگر کسی چیز میں جائز ہوتا تو یہ دو چیزیں ہیں کہ ان میں جائز ہوتا ، مگر یہ معنی مراد لینا تکلف سے خالی نہیں ، صحیح معنی یہ ہیں کہ حسد سے غبطہ مراد ہے ، باب لائے تھے اغتباط کا اور حدیث لائے حسد کی ، اس سے اشارہ کر دیا کہ اس میں حسد کے مشہور معنی مراد نہیں ، بلکہ غبطہ مراد ہے

قولہ رجل یعنی اس رجل کی خصلت ، کیونکہ اثنتین مونث لائے ہیں ، اثنین نہیں کہا ، اس لئے رجل کی خصلت مراد ہوگی ۔

قولہ نسلطہ علی ہلکتہ فی الحق ، ہلاک سے مراد فنا کرنا ، یعنی وہ اپنا مال اللہ کی اطاعت میں فنا کرتا ہے اور حق کے معاملہ میں بے دریغ خرچ کرتا ہے ۔

قولہ اتاہ اللہ الحکمۃ فھو یقضی بھا ویعلمھا ، یہاں لفظ حکمۃ آیا ہے اور بعض روایت میں لفظ قرآن آیا ہے دونوں کے جمع کرنے سے معلوم ہوا کہ فہم قرآن مراد ہے ، یعنی جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کا فہم عطا فرمایا ہو فھو یقضی بھا و یعلمھا ، یعنی اپنے معاملہ میں اور اسی طرح دوسروں کے معاملہ میں بھی اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے ، تو تین باتیں ہوئیں ، علم ، عمل اور تعلیم ، ایسے شخص کو عالم ملکوت میں "کبیر" کہا جاتا ہے ۔

اس معنی کو یوں ترجیح حاصل ہے کہ باب فضائل القرآن میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے جو حدیث لائیں گے

قَالَ ثنا اَبِى عَنْ صَالِحٍ يَعْنِى ابْنَ كَيْسَانَ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ حَدَّثَهُ اَنَّ عُبَيْدَ اللّٰهِ

کہا ہم سے میرے باپ نے، انھوں نے صالح ابن کیسان سے بیان کیا، انھوں نے ابن شہاب سے، ان سے عبیداللہ بن عبداللہ

بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ اَخْبَرَهُ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهُ تَمَارٰى هُوَ وَالْحُرُّ بْنُ قَيْسِ ابْنِ حِصْنِ

نے کہا، انھوں نے عبداللہ ابن عباس سے روایت کیا، ان سے اور حر بن قیس ابن حصن سے جھگڑا ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام

الْفَزَارِىُّ فِىْ صَاحِبِ مُوْسٰى، قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ هُوَ خَضِرٌ فَمَرَّبِهِمَا اُبَىُّ بْنُ كَعْبٍ

کس کے پاس گئے تھے۔ ابن عباس نے کہا: خضر کے پاس گئے تھے، اتنے میں ابی ابن کعب ان کے پاس سے گذرے

اس میں یہ الفاظ زیادہ ہیں " یالیتنی اوتیت مثل ما اوتی فلان " اے کاش مجھ کو بھی ویسا ہی دیا جاتا جیسا کہ فلاں کو دیا گیا، فعملت مثل ما عمل فلان " تو میں بھی ویسا ہی عمل کرتا جیسا کہ فلاں نے عمل کیا۔ یہاں پر بصراحت یہ بات واضح ہوگئی کہ غبطہ مراد ہے

(۵۸) باب ماذکر فی ذهاب موسیٰ فی البحر الی الخضر الخ

مقصود بخاری یہاں کیا ہے؟ ترجمہ میں ایک جزوی چیز ہے کہ موسیٰ علیہ السلام طلب علم میں گئے اور حضرت خضر سے ملاقات کی، لیکن ملاقات کی غرض کیا ہے، اسی کو اللہ نے اس قصہ میں فرمایا، هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا [1] (کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں کہ جو علم مفید آپ کو سکھلایا گیا ہے اس میں سے آپ مجھے بھی سکھادیں) معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طلب علم کے لئے دریا کا سفر کیا، تو امام بخاری کہتے ہیں کہ علم طلب کرنا چاہئے، اگرچہ دریا کا سفر بھی کرنا پڑے، دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے شخص حضرت خضرؑ کے پاس علم کی طلب میں گئے جو یقیناً موسیٰ علیہ السلام سے افضل نہ تھے۔ یہاں اشکال یہ ہے کہ بظاہر فی البحر کے لفظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے پہلے دریا کا سفر کیا پھر بعد میں حضرت خضر سے ملاقات ہوئی، حالانکہ واقعہ یوں نہیں ہے، بلکہ پہلے خشکی کا سفر ہوا اس کے بعد حضرت خضر سے ملاقات ہوئی اور پھر حضرت خضر کی معیت میں دریا کا سفر ہوا، اس لئے اس میں مختلف تاویل کی گئی، بعض نے کہا کہ مضاف محذوف ہے اور عبارت یوں ہے: فی ساحل البحر یعنی دریا کے کنارے کنارے۔ بعض نے کہا کہ الیٰ معنی میں مع کے ہے یعنی مع الخضر تو وہ سفر مراد ہوگا جو بعد لقاء خضر کے بمعیت خضر ہوا۔ کسی نے کہا الی مقصد الخضر مراد ہے، یعنی سفر کرنا اس مقصد کی طرف جہاں خضر جارہے تھے۔ بہرحال تاویل کرنی پڑے گی، خواہ کوئی سی تاویل ہو، ورنہ بظاہر واقعہ کے خلاف ہے۔

قولہ تمارٰی ھو والحر بن قیس الخ حضرت ابن عباس اور حر ابن قیس کے درمیان اس بات پر جھگڑا ہوا کہ فوجدا عبدا

---

(۱) کہف: ۶۶

فَدَعَاهُ ابْنُ عَبَّاسٍ فَقَالَ اِنِّیْ تَمَارَیْتُ اَنَا وَصَاحِبِیْ هٰذَا فِیْ صَاحِبِ مُوْسٰی

ابن عباس نے ان کو بلایا اور کہا: مجھ میں اور میرے دوست (حر ابن قیس) میں یہ جھگڑا ہے کہ موسیٰ کس کے پاس گئے تھے، اور

الَّذِیْ سَأَلَ مُوْسٰی السَّبِیْلَ اِلٰی لُقِیِّهٖ هَلْ سَمِعْتَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

کس سے ملنے کا انھوں نے راستہ پوچھا تھا، کیا تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں کچھ سنا ہے؟ انھوں نے

یَذْکُرُ شَأْنَهٗ؟ قَالَ نَعَمْ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ بَیْنَمَا مُوْسٰی

کہا ہاں! سنا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے ایک بار موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی ایک جماعت میں بیٹھے ہوئے تھے

فِیْ مَلَاٍ مِّنْ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ اِذْ جَآءَهٗ رَجُلٌ فَقَالَ هَلْ تَعْلَمُ اَحَدًا اَعْلَمَ مِنْكَ؟

اتنے میں ایک شخص آیا اور ان سے پوچھا تم کسی ایسے شخص کو جانتے ہو جو تم سے بھی زیادہ علم رکھتا ہو؟ موسیٰ نے کہا

قَالَ مُوْسٰی لَا! فَاَوْحَی اللّٰهُ اِلٰی مُوْسٰی بَلٰی عَبْدُنَا خَضِرٌ فَسَأَلَ مُوْسٰی السَّبِیْلَ اِلَیْهِ

نہیں! میں تو نہیں جانتا۔ تب اللہ نے ان کو وحی بھیجی کہ ہمارا ایک بندہ ہے خضر جو تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ موسیٰ نے عرض کیا:
میں اس تک کیونکر پہنچوں؟

مِنْ عِبَادِنَا میں جس بندہ کا ذکر ہے وہ بندہ کون ہے جس کی طرف موسیٰ علیہ السلام نے سفر کیا تھا، ابن عباس فرماتے ہیں کہ وہ خضرؑ ہیں۔ حر ابن قیس کا قول کہیں نظر سے نہیں گذرا۔ یہ بات یاد رکھو کہ یہ بحث صاحب موسیٰ کے بارے میں ہوئی کہ موسیٰ علیہ السلام جن بندے کے پاس گئے تھے وہ حضرت خضر تھے یا کوئی اور۔

امام بخاری آگے ایک اور باب میں یہی حدیث لائیں گے، اس میں نوف بکالی اور سعید ابن جبیر کے مابین جھگڑا مذکور ہے' یہ دونوں حضرات تابعی ہیں، ان میں اس بات پر جھگڑا تھا کہ حضرت خضر کے پاس جو موسیٰ گئے تھے وہ مشہور نبی موسیٰ علیہ السلام تھے یا کوئی اور، تھے جن کا نام بھی موسیٰ تھا؟ تو ان دونوں میں فرق ہے۔

قولہ فَقَالَ هَلْ تَعْلَمُ الخ مفسرین لکھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس وقت عجیب عجیب علوم و مضامین بیان فرمائے، ان مضامین کو سن کر ایک شخص سوال کر بیٹھا کہ دنیا میں کوئی آپ سے بھی بڑا اور زیادہ علم رکھنے والا ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں کسی کو نہیں پاتا، اور یہ درست بھی تھا کہ اس وقت وہ یقیناً سب سے بڑھ کر اسرار شریعت اور احکام و علل کے عالم تھے اور ان سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی صفات و شئون کا جاننے والا کوئی نہ تھا، مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے اس لفظ کا نکلنا بارگاہ خداوندی میں پسند نہ آیا، اسی پر گرفت ہوگئی، کہ تم نے ایسا کیوں کہا؟ حق تعالیٰ نے فرمایا: تم جو یہ کہتے ہو کہ کوئی نہیں ہے، مگر ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ایک بندہ خضر ہے جو تم سے زیادہ عالم ہے، موسیٰ عنے

فَجَعَلَ اللّٰہُ لَہُ الْحُوْتَ اٰیَۃً وَقِیْلَ لَہُ اِذَا فَقَدْتَ الْحُوْتَ فَارْجِعْ فَاِنَّکَ سَتَلْقَاہُ

اللہ نے ایک مچھلی ان کے لئے نشانی مقرر کردی اور فرمایا: جب یہ مچھلی کھو جائے تو لوٹ چل تو اس سے مل جائے گا۔ غرض حضرت

فَکَانَ یَتَّبِعُ اَثَرَ الْحُوْتِ فِی الْبَحْرِ فَقَالَ لِمُوْسٰی فَتَاہُ اَرَاَیْتَ اِذْ اَوَیْنَا اِلَی الصَّخْرَۃِ

موسیٰ سمندر کے کنارے کنارے اس مچھلی کے نشان پر روانہ ہوئے۔ ان کے خادم (یوشع) نے ان سے کہا جب ہم صخرہ کے

فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ وَمَا اَنْسٰنِیْہُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْکُرَہٗ قَالَ ذٰلِکَ مَا کُنَّا

پاس ٹھہرے تھے تو میں مچھلی کا قصہ بیان کرنا بھول گیا۔ اور شیطان ہی نے مجھ کو بھلا دیا کہ میں آپ سے اس کا ذکر کرتا،

نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلٰۤی اٰثَارِھِمَا قَصَصًا فَوَجَدَا خَضِرًا فَکَانَ مِنْ شَاْنِھِمْ مَا قَصَّ

حضرت موسیٰ نے کہا: ہم تو اسی جگہ کی تلاش میں تھے، پھر دونوں کھوج لیتے لیتے اپنے پیروں کے نشان پر لوٹے

اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْ کِتَابِہٖ

وہاں خضر سے ملاقات ہوئی، پھر وہی قصہ گذرا جو اللہ نے اپنی کتاب میں بیان کیا۔

عرض کیا: آپ مجھے اس کا راستہ بتلائیے تاکہ میں اس سے علم حاصل کروں۔ موسیٰ علیہ السلام کو کوئی دعویٰ تو نہیں تھا، صرف بیان واقعہ کے طور پر یہ جواب دے دیا تھا مگر وہ پسند نہیں آیا، کیونکہ صورت دعویٰ ہی کی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر پتہ تو بتلا دیا مگر مبہم۔ اس سے تنبیہ مقصود تھی کہ تمھیں اتنا بھی علم نہیں، البتہ اتنا نشان بتلا دیا کہ مچھلی بھون کر زنبیل میں رکھ لو، جہاں یہ مچھلی گم ہو جائے بس وہیں وہ بندہ ملے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ایک خادم یوشع بن نون کو بھی جو اس وقت تو خادم تھے مگر بعد میں نبی ہو گئے، اپنے ساتھ لیا اور مچھلی بھون کر زنبیل میں رکھ لی اور چل دئے، مگر کس عزم سے چلے۔ اس کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے: لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤی اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا[1] میں برابر چلتا رہوں گا تا آنکہ دو دریاؤں کے سنگم پر پہونچ جاؤں، یا یوں ہی سالہا سال تک چلتا رہوں، یعنی چاہے کتنا ہی طویل زمانہ گذر جائے مگر پہونچوں گا ضرور۔

امام بخاری کہتے ہیں کہ یہی طالب علم کی شان ہونی چاہئے۔ مفسرین لکھتے ہیں اور حدیث کے بعض الفاظ بھی اس پر دال ہیں کہ وہاں ایک پتھر پڑا تھا جس کے نیچے آب حیات کا چشمہ تھا، اسے حدیث میں عین الحیاۃ کہا گیا ہے، مگر یہ حدیث مرفوع نہیں ہے بلکہ مدرج ہے۔ اسی پتھر پر موسیٰ علیہ السلام سر رکھ کر سو رہے، حضرت یوشع ابن نون بیٹھے ہوئے تھے کہ چشمہ کا کچھ پانی زنبیل میں پہونچ گیا اور مچھلی

---

(۱) کہف: ۶۰

. . . .

زندہ ہوکر دریا میں جا پڑی اور جدھر جدھر وہ گذری ایک طاقچہ اور سرنگ سا بناتی چلی گئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بیدار ہوئے تو چل دئے اور یوشع علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مچھلی کے زندہ ہوکر دریا میں چلے جانے کا حال بتانا بھول گئے، بعض چیزیں قدرت کی طرف سے عبرت اور تنبیہ کے لئے ہوتی ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت یوشع علیہ السلام سے کہا تھا کہ دیکھو مچھلی کی حفاظت کرنا، ان کے منہ سے نکل گیا تھا کہ یہ کون سی بڑی بات ہے، اللہ نے اس پر تنبیہ فرمائی کہ بات بھاری تو نہ تھی مگر تم اسے از خود پورا نہ کرسکے۔

موسیٰ علیہ السلام کو اب تک بھوک نہ لگی تھی، اب بھوک کا احساس پیدا ہوا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو انھیں لوٹانا مقصود تھا، اس کے کھانے کی خواہش پیدا کردی گئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یوشع سے فرمایا: لاؤ بھائی کچھ کھائیں، تب انھیں یاد آیا اور اس وقت کہا: فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ وَمَآ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ [۱] (ارے میں تو مچھلی کا قصہ آپ سے بتانا بھول ہی گیا، اور شیطان ہی نے مجھے بھلا دیا کہ میں آپ سے ذکر کرتا) ـــــ غرض موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: لوٹ چلو وہیں مقصود ہے، چنانچہ لوٹے، اور جب اس مقام پر پہونچے تو دیکھا کہ مرد خدا لیٹا ہوا ہے بعض کتابوں میں ہے کہ پانی میں چادر اوڑھے ہوئے لیٹے تھے، موسیٰ علیہ السلام نے سلام کیا، انھوں نے سلام کے جواب کے بعد کہا: کون؟ کہا: موسیٰ ابن عمران۔ پھر جو واقعہ گذرا وہ مفصل آگے آئے گا، یہاں اتنی بات یاد رکھو کہ حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق کہ وہ نبی تھے یا رسول؟ تو میرا رجحان یہ ہے کہ وہ نبی تھے، نبوت فی ما بین النبی و بین اللہ ہوتی ہے اور رسالت میں تبلیغ ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ پہلی شریعت کے عامل ہوں گے اور اسی کی طرف لوگوں کو بلایا ہوگا، وہ جزئیات تکوینیہ کے عالم تھے اور موسیٰ علیہ السلام کلیات تشریعیہ کے، اسی بنا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام صبر نہ کرسکے اور جلد ہی مفارقت ہوگئی ـــــ جس طرح مجتہد عام کو خاص، اور مطلق کو مقید کرلیتے ہیں، اسی طرح انبیاء علیہم السلام بھی خدا کے اختیار دینے سے عام کو خاص اور مطلق کو مقید کرلیتے ہیں، حضرت خضر نے بچہ کو قتل کردیا تو یہ ضابطہ نہیں تھا، مگر ان پر یہ جزئی منکشف کردی گئی کہ یہ بچہ آگے چل کر فساد پھیلائے گا اور ماں باپ کے ایمان کے لئے خطرہ بنے گا، اس لئے اسے قتل کردینا ہی مناسب ہے، اس لئے حضرت خضر نے عام ضابطہ سے اسے خاص کرلیا، اس استثناء کا انھیں حق تھا، کیونکہ یہ عام ضابطہ کے پابند نہیں تھے، جس طرح رسول کو استثناء و تقیید کا حق ہے۔ اسی طرح غیر رسول کو بھی اگر کچھ جزئیات کا اختیار دے دیا جائے تو کچھ بعید نہیں، اسی بنا پر وہ اپنے کشف کے مطابق خلاف ضابط کرسکتے ہیں، مگر یہ استثناء نبی کے لئے ہے نہ کہ ولی کے لئے، بعض جہاں کہہ دیتے ہیں کہ نبی بھی ولی کا محتاج ہے، یہ بالکل غلط اور سراسر جہل ہے۔

---

(۱) کہف: ۶۳

بَابٌ ۵۹ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا (ابن عباس کے لئے) یہ دعا کرنا، یا اللہ اس کو قرآن کا علم دے!

۷۵۔ حَدَّثَنَا اَبُوْمَعْمَرٍ قَالَ ثنا عَبْدُ الْوَارِثِ قَالَ ثنا خَالِدٌ عَنْ عِكْرِمَةَ

ہم سے ابومعمر نے بیان کیا، کہا ہم سے عبد الوارث نے بیان کیا، کہا ہم سے خالد نے بیان کیا، انھوں نے عکرمہ؟

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ ضَمَّنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ

انھوں نے ابن عباس سے، کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو (اپنے سینے سے) چمٹایا اور دعا فرمائی: یا اللہ اس کو

اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ

قرآن سکھلا دے!

بَابٌ ۶۰ مَتٰى يَصِحُّ سِمَاعُ الصَّغِيْرِ

لڑکا کس عمر کا حدیث سن سکتا ہے؟

۷۶۔ حَدَّثَنَا اِسْمٰعِيْلُ قَالَ حَدَّثَنِيْ مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ

ہم سے اسماعیل نے بیان کیا، کہا مجھ سے امام مالک نے بیان کیا، انھوں نے ابن شہاب سے، انھوں نے

بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَقْبَلْتُ رَاكِبًا عَلٰى

عبید اللہ ابن عبد اللہ ابن عتبہ سے، انھوں نے عبد اللہ ابن عباس سے کہ میں ایک مادیان گدھی پر سوار ہو کر آیا اور ان دنوں

حِمَارٍ اَتَانٍ وَاَنَا يَوْمَئِذٍ قَدْ نَاهَزْتُ الْاِحْتِلَامَ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

میں جوانی کے قریب تھا (لیکن جوان نہیں ہوا تھا) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں نماز پڑھ رہے تھے،

---

(۵۹) باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللھم علمہ الکتاب

معلوم ہوا کہ علم کی دعا مانگنی چاہئے۔ یہ مبارک چیز ہے۔ بعض روایت میں حکمۃ کا لفظ آیا ہے اور بعض میں کتاب کا، اور بعض میں "فقهه فی الدین وعلمه التاویل" ہے۔ یعنی اے اللہ اسے دین کی سمجھ اور علم تفسیر عطا فرما۔ چنانچہ آج جس قدر تفسیریں ہیں وہ اس کی (تفسیر ابن عباس کی) محتاج ہیں اور سب سے بڑھ کر انھیں کی تفسیر ہے۔ اللہ نے انھیں اس درجہ تفقہ عطا فرمایا کہ فقہ شافعی کا تمام تر مدار انھیں پر ہے۔ ۲۵

احادیث میں دعا فرمانے کا قصہ بھی آیا ہے کہ آپ ایک بار خلاء کے لئے تشریف لے گئے تو ابن عباس نے آپ کے استنجاء کے لئے پانی

يُصَلِّي بِمِنًى إِلَى غَيْرِ جِدَارٍ فَمَرَرْتُ بَيْنَ يَدَيْ بَعْضِ الصَّفِّ وَأَرْسَلْتُ الْأَتَانَ

آپ کے سامنے آڑ نہ تھی، میں تھوڑی صف کے آگے سے گذر گیا اور مادیان کو چھوڑ دیا، وہ چرتی رہی اور میں صف میں شریک

تَرْتَعُ وَدَخَلْتُ فِي الصَّفِّ فَلَمْ يُنْكِرْ ذٰلِكَ عَلَيَّ

ہوگیا، مجھ پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

۷۷۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوسُفَ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو مُسْهِرٍ قَالَ حَدَّثَنِي

ہم سے محمد ابن یوسف نے بیان کیا، کہا ہم سے ابو مسہر نے بیان کیا، کہا مجھ سے محمد ابن حرب نے

مُحَمَّدُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ حَدَّثَنِي الزُّبَيْدِيُّ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ مَحْمُودِ بْنِ الرَّبِيعِ

بیان کیا، کہا مجھ سے زبیدی نے بیان کیا، انھوں نے زہری سے، انھوں نے محمود ابن الربیع سے،

قَالَ عَقَلْتُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَجَّةً مَجَّهَا فِي وَجْهِي وَأَنَا ابْنُ

انھوں نے کہا مجھ کو (اب تک) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ کلی یاد ہے جو آپ نے ایک ڈول سے لے کر

خَمْسِ سِنِينَ مِنْ دَلْوٍ.

میرے منھ پر ماری تھی، اس وقت میں پانچ برس کا تھا

رکھ دیا۔ آپ نے پوچھا: کس نے پانی رکھا ہے؟ ان کی خالہ ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ ابن عباس نے، اس وقت آپ نے انھیں سینے سے لگایا اور دعا فرمائی —— واقعہ گرچہ مختص ہے مگر یہ دعا دوسروں کے لئے بھی جائز ہے۔

(۶۰) باب مَتَى يَصِحُّ سَمَاعُ الصَّغِيرِ

جہاں پر اصول حدیث میں ادا و تحمل کے شروط ہیں، وہاں یہ بھی ہے کہ کس عمر میں ادا و تحمل ہو سکتا ہے۔ ادا: کسی کو دینا —— تحمل: خود اٹھانا۔

حدیث: ۷۶ قولہ: ناھزتُ، یعنی میں قریب بہ بلوغ تھا —— یہ قصہ منیٰ کا ہے، جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بلاسترہ کے نماز پڑھ رہے تھے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ میں سامنے سے گذرا۔

فَلَمْ يُنْكِرْ ذٰلِكَ عَلَيَّ۔ یعنی نمازیوں میں سے کسی نے مجھ پر اعتراض نہیں کیا۔ اس سے ابن عباس کا مقصود ان لوگوں کی تردید ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ کلب و حمار اور مرأۃ کا مرور قاطع صلوٰۃ ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ لَا يَقْطَعُ أَحَدُ الصَّلٰوةَ إِلَّا الْمَرْأَةُ وَالْكَلْبُ وَالْحِمَارُ۔ اسی کا جواب دے رہے ہیں کہ اگر ممنوع ہوتا تو حضورؐ منع فرماتے۔

. . . .

روایت کا مدلول تو صرف اس قدر ہے کہ جدار نہ تھی، مطلقاً سترہ کی نفی اس سے نہیں ہوتی ــــــ تو بعض نے کہا، مطلقاً سترہ نہ تھا، امام شافعیؒ سے یہی منقول ہے، اور حافظ نے مسند بزار سے نقل کیا ہے: **لیس شیئ لیسترہ**، کوئی چیز سترہ کی نہ تھی۔ دوسری چیز یہ پیش کی کہ ابن عباس ردکر رہے ہیں قائلین قطع کا، وہ تو اسی وقت قاطع کہتے ہیں جب سترہ نہ ہو اور اگر سترہ ہو تو بالاجماع قطع نہیں، لہٰذا اگر سترہ تھا تو پھر رد کیسے ہوتا، ابن عباس کی غرض تو اسی وقت حاصل ہوگی جب مطلقاً سترہ کی نفی کی جائے ــــــ یہاں ابن اثیر نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ ابن عباس نے لطیف پیرایہ میں قائلین قطع صلوٰۃ کی تردید کی ہے اور یہ بتلایا ہے کہ **حمار**، اتان تھی، تو جب انثیٰ حمار قاطع نہیں تو انثیٰ رجل کیسے قاطع ہوگی۔

حدیث: ۷۷، قولہ **وانا ابن خمس سنین**: یہ محمود ابن الربیع صغار صحابہ میں ہیں، خود کہتے ہیں، مجھے اب تک وہ واقعہ یاد ہے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ پر کلی کی تھی، اس وقت میری عمر پانچ برس تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل (کلی کرنا) مانوس کرنے کے لئے فرمایا، اس کو ملاعبت کہتے ہیں (۱) اس سے والدین بھی خوش ہوتے ہیں اور بچہ کو بھی اُنس ہوتا ہے۔

معلوم ہوا کہ پانچ سال کی عمر کی روایت مقبول ہوتی ہے ــ اصول فقہ واصول حدیث میں اس باب میں اختلاف ہے کہ کس عمر کی روایت مقبول قرار پائے گی ــ بعضوں نے پانچ سال کہا ہے اور بعضوں نے سات سال کیونکہ اسی عمر میں نماز کا حکم دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ یہ عمر معتد بہ ہے، بعضوں نے چار سال کافی سمجھا ہے، کیونکہ بعض روایات میں شک کے ساتھ چار یا پانچ سال مذکور ہے، لہٰذا چار بھی کافی ہیں، مگر یاد رہے کہ بہتر بات وہ ہے جو ابن ہمام نے تحریر الاصول میں لکھی ہے اور جس کو حافظ نے بھی تسلیم کیا ہے کہ یہ تفاوت واقعات کی نوعیت اور بچے کی قوتوں اور طبائع کے اعتبار سے ہوتا ہے، نہ ہر بچہ کی ہر بات مردود ہے اور نہ ہر بچے کی ہر بات مقبول، بعض صغیر بچے بہت ذہین ہوتے ہیں ــ مثلاً مولانا جامی کہتے ہیں کہ میں دو سال کا تھا کہ میرے والد نے تفتازانی کے شاگرد حیدرہ کے سامنے مجھے ڈال دیا تھا ــ لہٰذا اس سلسلہ میں کوئی قاعدہ اور ضابطہ نہیں متعین کیا جا سکتا اور نہ کوئی تحدید ہی کی جا سکتی ہے، بس صرف بچہ کی قوتوں اور واقعات کی نوعیت کا اعتبار ہوگا، مثلاً کوئی بچہ کہے کہ مجھے یاد ہے کہ جب میں پانچ برس کا تھا اس وقت یہ مکان بنا تھا تو اسے قبول کر لینے میں کچھ حرج نہیں۔ لیکن اگر یہ کہے کہ میں پانچ برس کا تھا اس وقت

---

(۱) کما قالہ البغوی ۱۲ منہ

بَابُ [61] الْخُرُوجِ فِي طَلَبِ الْعِلْمِ وَرَحَلَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللهِ مَسِيرَةَ

علم حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا اور جابر ابن عبد اللہ نے ایک حدیث عبداللہ ابن انیس سے

شَهْرٍ إِلَى عَبْدِ اللهِ بْنِ أُنَيْسٍ فِي حَدِيثٍ وَاحِدٍ.

سننے کے لئے ایک مہینہ کا سفر کیا۔

۷۸۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْقَاسِمِ خَالِدُ بْنُ خَلِيٍّ قَاضِي حِمْصَ قَالَ ثَنَا مُحَمَّدُ

ہم سے بیان کیا ابو القاسم خالد ابن خلی قاضی حمصؒ نے، کہا ہم سے بیان کیا محمد ابن حرب نے

بْنُ حَرْبٍ قَالَ الْأَوْزَاعِيُّ أَخْبَرَنَا الزُّهْرِيُّ عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ

کہا اوزاعی نے ہم کو خبر دی زہری نے۔ انھوں نے عبید اللہ ابن عبد اللہ ابن عتبہ ابن مسعود سے

عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُودٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ تَمَارَى هُوَ وَالْحُرُّ بْنُ قَيْسِ بْنِ حِصْنٍ الْفَزَارِيُّ

انھوں نے ابن عباسؓ سے کہ انھوں نے اور حر ابن قیس ابن حصن فزاری نے موسیٰ کے رفیق میں

فِي صَاحِبِ مُوسَى فَمَرَّ بِهِمَا أُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ فَدَعَاهُ ابْنُ عَبَّاسٍ فَقَالَ إِنِّي

جھگڑا کیا، پھر ان دونوں پر سے ابی ابن کعب گذرے تو ابن عباس نے ان کو بلایا اور کہا مجھ میں اور

تَمَارَيْتُ أَنَا وَصَاحِبِي هَذَا فِي صَاحِبِ مُوسَى الَّذِي سَأَلَ السَّبِيلَ إِلَى لُقِيِّهِ

میرے اس دوست میں جھگڑا ہوا کہ موسیٰ کا وہ رفیق کون تھا جس سے موسیٰ نے ملنا چاہا تھا؟ کیا تم نے

هَلْ سَمِعْتَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ شَأْنَهُ؟ فَقَالَ أُبَيٌّ نَعَمْ!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں کچھ سنا ہے؟ آپؐ اس کا حال بیان کرتے تھے؟ ابیؓ نے

سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ شَأْنَهُ يَقُولُ بَيْنَمَا مُوسَى فِي مَلَأٍ

کہا: ہاں! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ قصہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے، آپ فرماتے تھے ایک بار موسیٰؑ

میں نے فلاں عالم کی تقریر سنی تھی، جو مجھے بالکل محفوظ ہے، تو بے شک اس کے قبول کرنے میں تردد ہوگا، معلوم ہوا کہ واقعات کی نوعیت سے بھی قبول و عدم قبول میں فرق ہوتا ہے۔

(۶۱) باب الخروج فی طلب العلم

سابقہ باب میں یہ حدیث آچکی ہے، مگر اس میں مراد یہ تھی کہ دریا کا سفر خطرناک ہے، لیکن علم کے لئے خطرناک سفر بھی کرنا چاہئے

مِنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ اِذْ جَاءَهٗ رَجُلٌ فَقَالَ هَلْ تَعْلَمُ اَحَدًا اَعْلَمَ مِنْكَ ؟ قَالَ مُوْسٰی

بنی اسرائیل کے لوگوں میں بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہنے لگا: تم کسی ایسے شخص کو

لَا، فَاَوْحَی اللّٰهُ اِلٰی مُوْسٰی بَلٰی عَبْدُنَا خَضِرٌ، فَسَأَلَ السَّبِیْلَ اِلٰی لُقِیِّهٖ فَجَعَلَ اللّٰهُ

جانتے ہو جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہو؟ موسیٰؑ نے کہا: نہیں! پھر اللہ نے ان کو وحی بھیجی کہ تم سے زیادہ علم ہمارے

لَهُ الْحُوْتَ اٰیَةً وَقِیْلَ لَهٗ اِذَا فَقَدْتَ الْحُوْتَ فَارْجِعْ فَاِنَّكَ سَتَلْقَاهُ، فَكَانَ

ایک بندے کو ہے، جس کا نام خضر ہے، موسیٰؑ نے اس سے ملنے کا رستہ چاہا، اللہ نے مچھلی کو ان کے لئے نشانی بنا دی اور ان سے

مُوْسٰی یَتَّبِعُ اَثَرَ الْحُوْتِ فِی الْبَحْرِ فَقَالَ فَتٰی مُوْسٰی لِمُوْسٰی اَرَأَیْتَ اِذْ اَوَیْنَا

کہہ دیا گیا کہ جب مچھلی کھو جائے تو لوٹ آ، تو اس بندے کو ملے گا۔ موسیٰ اسی مچھلی کے نشان پر سمندر کے کنارے کنارے جا رہے تھے

اِلَی الصَّخْرَةِ فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ وَمَا اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ

موسیٰؑ کے خادم یوشعؑ نے ان سے کہا: تم نے دیکھا جب ہم صخرہ کے پاس ٹھہرے تو مچھلی کا قصہ کہنا میں بھول گیا اور شیطان ہی نے مجھ کو بھلا دیا، میں (تم سے) اس کا ذکر نہ کر سکا۔

اسی لئے وہاں "فی البحر" کی قید لگا دی تھی اور یہاں مطلقاً طلب علم کا ذکر ہے کہ گھر میں رہ کر علم نہیں ملتا بلکہ باہر نکلنا پڑتا ہے اس لئے "بالعلم" کی قید لگائی، چنانچہ جابر ابن عبد اللہ نے جو مشہور صحابی ہیں ایک حدیث سننے کے لئے جو انھیں بالواسطہ پہونچ چکی تھی، اس حدیث کے راوی عبد اللہ ابن اُنیس صحابی کے پاس ایک ماہ کا سفر کیا تاکہ سند عالی ہو جائے، حضرت جابرؓ نے جب ان کے مکان پر پہونچ کر آواز دی تو عبد اللہ نے پوچھا کون؟ جواب دیا: جابر! پھر پوچھا: کیا آپ جابر ابن عبد اللہ ہیں؟ حضرت جابر نے فرمایا: ہاں! یہ سن کر عبد اللہ ابن اُنیس دوڑ کر چپٹ گئے اور پوچھا: کیسے آئے؟ جواب دیا: ایک حدیث سننے کے لئے جو آپ نے براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے اور مجھے بواسطہ پہونچی ہے، اس لئے میں نے چاہا کہ براہ راست آپ سے سنوں، تب انھوں نے وہ حدیث سنائی، امام بخاری نے اسے یہاں نہیں بیان کیا بلکہ کتاب التوحید(۱) میں اس حدیث کا ایک ٹکڑا لائے ہیں اور وہ یہ ہے: **فیناديهم بصوت يسمعه من بعد**

---

(۱) مولانا وحید الزماں صاحب نے ترجمہ بخاری کے حاشیہ میں یوں ذکر فرمایا ہے: اس حدیث کا ذکر خود امام بخاری نے کتاب التوحید میں کیا اور امام احمد اور ابو یعلیٰ اور مؤلف نے ادب مفرد میں اس کو موصولاً نکالا، کہ اللہ قیامت کے دن لوگوں کو ننگے بدن حشر کرے گا، پھر آواز سے ان کو پکارے گا، اور امام ذہبی نے کہا: اللہ کے کلام میں آواز ہونا کئی حدیثوں سے ثابت ہے، اور میں نے ان سب کو علیحدہ ایک رسالہ میں جمع کیا ہے، انتہی۔ (جامع تقریر)

قَالَ مُوسٰى ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلٰى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا فَوَجَدَا خَضِرًا فَكَانَ مِنْ

موسیٰ نے کہا: ہمارا تو یہی مقصد تھا جس کی تلاش میں تھے، آخر دونوں کھوج لگاتے ہوئے اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے لوٹے، پھر دونوں نے

شَأْنِهِمَا مَا قَصَّ اللّٰهُ فِي كِتَابِهٖ

خضر کو پالیا، اور وہی حال ہوا جو اللہ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا

كما يسمعه من قرب انا الملك انا الديان[1]. پوری حدیث دیگر کتب میں مذکور ہے۔

معلوم ہوا کہ متقدمین نے کس قدر محنتیں اور مشقتیں برداشت کی ہیں اور یہ تو حدیث نبوی ہے، اسے جس قدر بھی محنت اور کوشش سے حاصل کیا جائے بہتر ہے، ورنہ لوگوں نے تو اور فنون کے حصول میں بھی بڑی بڑی مشقتیں برداشت کی ہیں، میر سید شریف جرجانی نے شرح مطالع پڑھی، تو شوق ہوا کہ اسے اس کے مصنف سے پڑھنا چاہیے، بس چل دئے اور اس کے مصنف علامہ قطب الدین رازی کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ اس وقت اس قدر ضعیف ہو چکے تھے کہ بھوں کو اٹھا کر دیکھا اور پوچھا: تم کون ہو؟ انھوں نے عرض کیا: میں سید شریف جرجانی ہوں، میں شرح مطالع اگرچہ پڑھ چکا ہوں مگر صرف اس تمنا میں کہ آپ سے اس کو پڑھوں، آیا ہوں، جواب دیا کہ میں بالکل ضعیف ہو چکا ہوں، تم جوان ہو، مجھے تمھاری تسکین نہ ہو سکے گی، ہاں میرا ایک شاگرد روم میں ہے، اس کا نام مبارک شاہ ہے، تم اس کے پاس چلے جاؤ، اس کا پڑھانا گویا میرا ہی پڑھانا ہے، یہ وہاں پہونچے اور سارا قصہ بیان کیا، مبارک شاہ علامہ قطب الدین کے غلام تھے، علامہ نے ان کی عمدہ پرورش کی تھی اور اچھی طرح پڑھایا تھا، حتیٰ کہ وہ ہر فن میں فاضل و ماہر ہو گئے تھے اور خوب درس دیتے تھے، لوگ اکثر انھیں مبارک شاہ منطقی کے نام سے پکارتے تھے، جب میر سید شریف سے پوری بات سن لی تو فرمایا کہ ہمارے ہاں داخلہ کی ایک شرط ہے، اور وہ یہ کہ میں ایک اشرفی یومیہ ایک سبق کے لئے لیتا ہوں، میر صاحب روزانہ ایک اشرفی کہاں سے لاتے۔ کہتے ہیں کہ میں نے بہت کچھ سوچنے کے بعد ان سے عرض کیا کہ روزانہ کی شرط تو نہیں ہے، جب میرے پاس ایک اشرفی ہو جایا کرے گی، ایک سبق پڑھ لیا کروں گا، فرمایا: منظور ہے، میر صاحب میں سچی طلب تھی، فیصلہ کیا کہ جھولی ڈال کر بھیک مانگوں گا، جب ایک اشرفی ہو جایا کرے گی، ایک سبق پڑھ لیا کروں گا، میر صاحب نے تو فیصلہ کیا مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا، اس لئے ابھی میر صاحب کو بھیک مانگنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ایک رئیس کو اسکا علم ہو گیا کہ ایک سید ہے اور وہ اس طرح پڑھنا چاہتا ہے، چنانچہ اس نے انھیں بلایا اور کہا کہ میں تم کو ایک اشرفی یومیہ دیا کروں گا، تم سبق پڑھنا شروع کر دو، میر صاحب کی مانگی مراد پوری ہوئی اور پڑھنا شروع کر دیا، ایک ہفتہ گذرا تھا کہ استاذ نے بلا کر کہا: میاں ہمیں اشرفی کی کچھ پرواہ نہیں ہمارا مدعا تو تمھیں جانچنا اور تمھاری طلب کا امتحان لینا تھا، وہ ہو چکا، اب تم پڑھو اور اپنی اشرفیاں اپنے پاس رکھو، مگر اگلی صف میں بیٹھنے کی اجازت نہیں

---

(۱) بخاری: باب قوله" ولا تنفع الشفاعة عنده الا لمن اذن له "

بَابُ ٦٢ فَضْلِ مَنْ عَلِمَ وَعَلَّمَ

عالم کی اور علم سکھانے والے کی فضیلت

۷۹ـــ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ قَالَ حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ اُسَامَةَ عَنْ بُرَيْدِ

ہم سے محمد (ابن) علاء نے بیان کیا، کہا ہم سے حماد ابن اسامہ نے بیان کیا، انھوں نے برید ابن عبداللہ

بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنْ اَبِي بُرْدَةَ عَنْ اَبِي مُوْسٰى عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَثَلُ مَا

انھوں نے ابو بردہ سے، انھوں نے ابو موسیٰ سے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپ نے فرمایا: اللہ نے

بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهٖ مِنَ الْهُدٰى وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ الْكَثِيْرِ اَصَابَ اَرْضًا فَكَانَ

جو ہدایت اور علم کی باتیں مجھ کو دے کر بھیجیں ان کی مثال زوردار مینھ کی سی ہے، جو زمین پر برسا تو بعضی زمین

مِنْهَا نَقِيَّةٌ قَبِلَتِ الْمَاءَ فَاَنْبَتَتِ الْكَلَأَ وَالْعُشْبَ الْكَثِيْرَ وَكَانَتْ مِنْهَا اَجَادِبُ

عمدہ تھی جس نے پانی چوس لیا اور اس نے سبزی اور گھاس خوب اگائی، اور بعضی سخت تھی (پتھریلی) اس نے

اَمْسَكَتِ الْمَاءَ فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا وَسَقَوْا وَزَرَعُوْا وَاَصَابَ مِنْهَا

پانی تھام لیا، اللہ نے اس سے لوگوں کو فائدہ دیا، پیا اور (جانوروں کو) پلایا اور کھیتی میں دیا، اور بعضی ایسی زمین پر

طَائِفَةً اُخْرٰى اِنَّمَا هِيَ قِيْعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَاءً وَلَا تُنْبِتُ كَلَأً فَذٰلِكَ

یہ مینھ برسا جو صاف چٹیل تھی، نہ تو پانی کو اس نے تھاما اور نہ اس نے گھاس اگائی (اور پانی اس پر سے بہہ کر نکل گیا) یہی

نہ بولنے کی، بس سماعت کرو، یہ اس پر بھی راضی ہوگئے اور سماعت کرنے لگے اور پیچھے ہی بیٹھتے تھے، لیکن آخر سید شریف تھے، تفتازانی کو شکست دی تھی، درمیان درس میں جوش اٹھتا تھا، شکوک وشبہات لگتے تھے، مگر بولنے کی اجازت نہ تھی، اس لئے خاموش رہنا پڑتا تھا، البتہ جب اپنے حجرہ میں جاتے تو دیوار کو مخاطب کرتے اور کہتے، صاحب کتاب نے یوں کہا اور استاذ نے یوں کہا اور میں یوں کہتا ہوں، ایک مرتبہ استاد طلبہ کا حال معلوم کرنے کے لئے گشت میں نکلے، جب ان کے حجرے کے پاس پہونچے تو یہ تقریر کر رہے تھے، استاد آواز سن کر کھڑے ہو گئے اور جب انھوں نے کہا: واقول كذا تو پوری توجہ اور غور سے سنا، بات بہت عمدہ تھی، پسند آئی اور بہت خوش ہوئے، صبح کو دریافت کیا کہ فلاں حجرہ میں کون رہتا ہے؟ بتلایا گیا کہ سید شریف رہتے ہیں، بلایا اور فرمایا: تم اگلی صف میں بیٹھا کرو اور خوب جی کھول کر پوچھو، پھر ان کا جو رتبہ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔

میں کہتا ہوں ایک معمولی سی کتاب شرح مطالع کے لئے اتنی مشقتیں برداشت کیں، پھر اگر حدیث ہوی کے لئے اس سے بہت زیادہ

مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِي دِينِ اللهِ وَنَفَعَهُ بِمَا بَعَثَنِيَ اللهُ بِهِ فَعَلِمَ وَعَلَّمَ، وَمَثَلُ مَنْ

اس شخص کی مثال ہے جس نے خدا کے دین میں سمجھ پیدا کی اور اللہ نے جو مجھ کو دے کر بھیجا ہے اس سے اس کو فائدہ ہوا، تو اس نے

لَمْ يَرْفَعْ بِذَلِكَ رَأْسًا وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللهِ الَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ

خود سیکھا اور دوسروں کو سکھایا، اور اس شخص کی جس نے اس پر سر ہی نہیں اٹھایا اور اللہ کی ہدایت جو میں دے کر بھیجا گیا، نہ مانی۔

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: قَالَ إِسْحَاقُ عَنْ أَبِي أُسَامَةَ وَكَانَ مِنْهَا طَائِفَةٌ قَيَّلَتِ

امام بخاری نے کہا: اسحاق نے 'ابو اسامہ سے اس حدیث کو روایت کیا، اس میں یوں ہے: بعض زمین نے

الْمَاءَ، قَاعٌ: يَعْلُوهُ الْمَاءُ، وَالصَّفْصَفُ: الْمُسْتَوِي مِنَ الْأَرْضِ

پانی پی لیا (اس حدیث میں قیعان جمع ہے قاع کی) یعنی وہ زمین جس پر پانی چڑھ جائے (ٹھہرے نہیں) اور (قرآن میں جو قاعاً صفصفاً ہے تو) صفصف کہتے ہیں ہموار زمین کو۔

مشقت برداشت کی جائے تو کیا بعید ہے۔

(۶۲) بَابُ فَضْلِ مَنْ عَلِمَ وَعَلَّمَ

مناسبت ترجمہ سے یہ ہے کہ فرماتے ہیں کہ جس نے خود سیکھا یا سکھایا اس کا فضل بہت بڑا ہے۔

حدیث ۷۹: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال دے کر فرمایا کہ کچھ زمین صاف ستھری ہوتی ہے، وہاں پانی گرتا ہے تو زمین میں سبزہ اگتا ہے، اس سے آدمی اور جانور مستفید و منتفع ہوتے ہیں، تو یہ زمین خود بھی زندہ ہوئی اور اس نے دوسروں کی زندگی کا سامان بھی کیا، زمین کی حیات اور زندگی یہی ہے کہ اس میں سبزہ اُگے، قال تعالیٰ: وَيُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا[1]

دوسری زمین وہ ہوتی ہے جو پانی کو روک لیتی ہے، وہ سبزہ نہیں اگاتی لہٰذا زمین تو زندہ نہ ہوئی لیکن [اس کا پانی] دوسروں کی زندگی کا سبب بن گیا۔

تیسری وہ زمین ہے جس میں نہ پانی رکتا ہے نہ پیداوار ہوتی ہے، تو یہ نہ خود زندہ ہوئی اور نہ دوسروں کی زندگی کا سبب بنی، کتنی عجیب مثال بیان فرمائی ہے، یہ صرف نبی ہی کی شان ہے۔

میرے نزدیک مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان اس طرح انطباق دیا جا سکتا ہے کہ ایک شخص عالم بھی ہے اور عامل اور معلم بھی

---

(۱) روم: ۳۰

باب ٦٣ رَفعِ العِلمِ وَظُهُورِ الجَهلِ وَقَالَ رَبِيعَةُ لَا يَنبَغِي لِاَحَدٍ

(دنیا سے) علم اٹھ جانے اور جہالت پھیلنے کا بیان اور ربیعہ نے کہا جس کو (دین کا) تھوڑا سا بھی علم ہو وہ

عِندَہٗ شَیءٌ مِنَ العِلمِ اَن یُّضَیِّعَ نَفسَہٗ ۔

اپنے تئیں بے کار نہ کردے ۔

تو زمین کی پہلی قسم شل ہے کہ خود سیکھا اور عمل کرکے نفع اٹھایا اور دوسروں کو بھی سکھا کر نفع پہونچایا ۔ اور دوسری زمین کی مثال اس شخص پر منطبق ہوتی ہے جو عالم تو ہے لیکن عمل کی توفیق نہیں، یعنی دوسروں کو فائدہ پہونچاتا ہے لیکن عمل نہ کرکے خود اس نفع سے محروم ہے ، یہ اور بات ہے کہ کوئی اس سے پڑھے اور اس کے لئے دعا کرے ، اس طرح اس سے کچھ فائدہ حاصل ہو جائے ۔ مقصد یہ ہے کہ اپنی ذات سے اپنے لئے کچھ نفع نہ ہو ۔ تیسرا شخص وہ ہے کہ اس میں نہ قابلیت حفظ علم کی ہے اور نہ خود منتفع ہونے کی صلاحیت ، تو ایسا علم وبال ہے ، یہ زمین کی تیسری قسم کی مثال ہوئی ، انطباق کی یہ شکل میرے نزدیک بہتر ہے ، دوسرے حضرات نے اور طرح بھی تقریر کی ہے ۔

نَقِیَّۃٌ کے معنی ہیں صاف ، بعض روایتوں میں طَیِّبَۃٌ ہے ، یعنی ستھری ۔ کَلَأٌ : گھاس جو خشک ہو یا سبز ۔ عُشبٌ : تر گھاس ، سبزہ ، تو اب ترجمہ یہ ہوا : اگائی گھاس اور سبزہ ۔ اَجَادِبُ : سخت زمینیں ۔ جَدَبٌ : سخت زمین ، بعض روایات میں اَخَاذَاتٌ ہے ، اَخَاذَۃٌ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی بھر جائے ۔ قِیعَانٌ جمع ہے قَاعٌ کی ، چٹیل میدان ، جہاں نہ پانی ٹھہرے ، نہ گھاس اُگے ۔ فَذٰلِکَ یعنی اس مجموعہ کی مثال ہے ۔

قولہ لَمْ یَرْفَعْ بِذٰلِکَ رَاْسًا : سر نہیں اٹھایا ، توجہ نہیں کی ۔ یہاں دو ہی کا ذکر آیا ، گر عَلِمَ وَ عَلَّمَ میں دو صورتیں ہیں لہٰذا تحلیل کرکے تیسری قسم نکالی جائے گی ۔

قولہ قَیَّلَتْ ، تصحیفِ راوی ہے اور اگر اسی کو رکھیں تو معنی بھی تکلّف سے بنیں گے ، بعض نے لکھا ہے کہ اس کے معنی بھی روکنے کے ہیں ، مگر حافظ نے کہا ہے کہ تصحیف ہے ۔

بخاری کی عادت ہے کہ مشکل الفاظ کو بھی حل کر دیتے ہیں اور قرآن میں جو اس کے مناسب لفظ آتا ہے اس کی بھی تفسیر کر دیتے ہیں ، چنانچہ قَاعٌ کی تفسیر کی تو ساتھ ساتھ صَفصَفٌ کی تفسیر بھی کر دی ، حالانکہ یہاں یہ لفظ نہ تھا ، گر قرآن میں قَاعًا صَفصَفًا آیا ، اس لئے یہاں اس کی بھی تفسیر کر دی ۔

(٦٣) بَاب رَفعُ العِلمِ وَظُهُورِ الجَهلِ

اس باب میں رفع علم کا بیان ہے ، مطلب یہ ہے کہ قبل رفع ، علم حاصل کرلو ۔ دوسرے یہ بتلایا کہ رفع علم علامت قیامت ہے ۔

۸۰ ۔ حَدَّثَنَا عِمْرَانُ بْنُ مَيْسَرَةَ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ عَنْ أَبِي التَّيَّاحِ

ہم سے عمران ابن میسرہ نے بیان کیا، کہا ہم سے عبد الوارث نے بیان کیا، انھوں نے ابو التیاح سے،

عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ

انھوں نے انسؓ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کی نشانیوں میں یہ بھی ہے کہ (دین کا) علم

يُرْفَعَ الْعِلْمُ وَيَثْبُتَ الْجَهْلُ وَتُشْرَبَ الْخَمْرُ وَيَظْهَرَ الزِّنَا ۔

اٹھ جائے گا اور جہالت جم جائے گی اور شراب (کثرت سے) پی جائے گی اور زنا علانیہ ہوگا۔

تو اس کا موجود رہنا قیام عالم کا سبب و موجب برکت اور بقاء دنیا کی علامت ہے اور جب علم اٹھ جائے اور جہالت کا غلبہ ہو جائے تو سمجھو قیامت کی ایک علامت ظاہر ہو گئی، معلوم ہوا کہ جہل اچھی چیز نہیں۔

قولہ وَقَالَ رَبِيعَةُ الخ ربیعہ سے ربیعۃ الرائی مراد ہیں اور یہ لفظ برا مستعمل نہیں ہوتا تھا بلکہ جن پر تفقہ اور شان استنباط غالب ہوتی تھی اور شغل حدیث[1] مغلوب ہوتا تھا اسے صاحب الرائے کہتے تھے، چنانچہ ربیعہ کا لقب اسی بنا پر پڑ گیا تھا، تو درحقیقت یہ چیز بری نہیں، کیونکہ ہمیشہ سے دو فرقے چلے آ رہے ہیں، ایک وہ جن پر فقہ غالب تھی اور دوسرا وہ جن پر روایت غالب تھی، صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں بھی دو گروہ تھے، ایک پر تفقہ غالب تھا، دوسرے پر روایت۔ اس تشریح سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اصحاب الرای کو تارک سنت کے معنی میں لیتے ہیں وہ درست نہیں۔

قولہ لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ عِنْدَهُ شَيْءٌ مِنَ الْعِلْمِ أَنْ يُضَيِّعَ نَفْسَهُ : جس کو دین کا تھوڑا سا بھی علم ہو وہ اپنے نہیں بیکار نہ کر دے اس جملہ کے دو معنی لئے گئے ہیں، بعض کہتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کو علم کا کچھ حصہ بھی ملا اسے چاہئے کہ وہ گوشہ میں نہ بیٹھے، بلکہ تذکیر کرے، اضاعت نہ کرے، بلکہ اذاعت کرے، دراصل علم ہے ہی اس لئے کہ اس کی اشاعت ہو اور اسے پھیلایا جائے۔

بعضوں نے کہا کہ علم کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنانا اور در بدر ذلیل و خوار پھرنا یہ علم کا ضائع کرنا ہے، اس لئے اس سے روکا گیا تاکہ علم کا وقار باقی رہے۔

میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ نااہلوں کے ساتھ پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہنا بھی علم کا ضائع کرنا ہے۔

حدیث ۸۰ : قولہ أَنْ يُرْفَعَ الْعِلْمُ، سنن نسائی کے بعض نسخوں میں يَفْشُو الْعِلْمُ ہے، اس میں لوگوں کو تردد ہوا ہے

---

(۱) یعنی شغل روایت (جامع تقریر)

۸۱ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ قَتَادَةَ
ہم سے مسدد نے بیان کیا کہا ہم سے یحیٰی ابن سعید نے بیان کیا۔ انھوں نے شعبہ سے، انھوں نے قتادہ سے،

عَنْ أَنَسٍ قَالَ لَأُحَدِّثَنَّكُمْ حَدِيثًا لَا يُحَدِّثُكُمْ أَحَدٌ بَعْدِي، سَمِعْتُ رَسُولَ
انھوں نے انس سے، انھوں نے کہا: میں تم کو ایک حدیث سناتا ہوں جو میرے بعد تم کو کوئی نہ سنائے گا، میں نے حضورؐ سے

اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ يَقِلَّ الْعِلْمُ وَيَظْهَرَ
سنا آپ فرماتے تھے کہ قیامت کی نشانیوں میں یہ ہے کہ دین کا علم گھٹ جانا اور جہالت پھیل جانا اور زنا علانیہ ہونا

الْجَهْلُ وَيَظْهَرَ الزِّنَا وَتَكْثُرَ النِّسَاءُ وَيَقِلَّ الرِّجَالُ حَتَّى يَكُونَ لِخَمْسِينَ امْرَأَةً
اور عورتوں کی کثرت، مردوں کی قلت، یہاں تک کہ پچاس عورتوں کا کام چلانے والا

الْقَيِّمُ الْوَاحِدُ
ایک مرد ہوگا

مگر استاذ (حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ) فرماتے تھے کہ یہ دونوں بھی علامات ہیں قیامت کی، چنانچہ دیکھو آج کل علم کس قدر پھیل رہا ہے بہترین بہترین کتابیں پچاس پچاس جلدوں میں چھپ چھپ کر آ رہی ہیں اور رفع علم بھی ہے کہ صحیح معنی میں جو عالم ہیں وہ اٹھ رہے ہیں اور کم ہوتے جا رہے ہیں۔

ابن ماجہ کی بعض روایات میں ہے کہ قرآن کے حروف اٹھا لئے جائیں گے، مگر یہ بالکل آخر میں ہوگا۔ جس وقت زمین و آسمان کو توڑنا مقصود ہوگا تو پہلے قرآن کے حروف اٹھا لیے جائیں گے۔

قولہ وَيَظْهَرَ الزِّنَا، چنانچہ [آج اس کا ظہور] بھی ہو رہا ہے اور حدیث میں جو يَتَهَارَجُونَ كَتَهَارُجِ الْحُمُرِ آیا ہے یورپ آج بالکل اسی کا مصداق بن رہا ہے۔

حدیث ۸۱ : قولہ وَيَقِلَّ الْعِلْمُ، یہاں يَقِلَّ ہے، اس سے پہلے والی حدیث میں "يُرْفَعُ" تھا، مطلب یہ کہ آہستہ آہستہ کم ہوتا جائے گا اور پھر بالکل رفع ہو جائے گا۔

قولہ وتکثر النساء، یعنی عورتوں کی کثرت ہوگی، یہاں حافظ کو اشکال ہوا کہ یہ کیسے ہوگا؟ مگر جنگ عظیم کے بعد جو مردم شماری ہوئی تو سب نے تسلیم کر لیا کہ مردوں کی قلت اور عورتوں کی کثرت ہو رہی ہے اور اب تو یہ مشاہدہ میں آ چکا ہے کہ اکثر گھروں میں لڑکیاں زائد ہیں اور مرد کم ہیں، معلوم ہوا کہ پیدا وار ہی لڑکیوں کی زیادہ ہوگی اور مرد کم پیدا ہوں گے۔ پھر لڑائی وغیرہ میں ضائع بھی مرد ہی

بَابُ ٦٤ فَضْلِ الْعِلْمِ

علم کی فضیلت

۸۲ ـ حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ عُفَيْرٍ قَالَ حَدَّثَنِي اللَّيْثُ قَالَ حَدَّثَنِي عُقَيْلٌ

ہم سے سعید ابن عفیر نے بیان کیا، کہا مجھ سے لیث نے بیان کیا، کہا مجھ سے عقیل نے بیان کیا، انھوں نے

عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ حَمْزَةَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ ابْنَ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ

ابن شہاب سے، انھوں نے حمزہ ابن عبد اللہ ابن عمر سے کہ عبد اللہ ابن عمر نے کہا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ بَيْنَمَا أَنَا نَائِمٌ أُتِيتُ بِقَدَحِ لَبَنٍ فَشَرِبْتُ حَتَّى إِنِّي لَأَرَى

سنا، آپ فرماتے تھے ایک بار میں سو رہا تھا، میرے سامنے دودھ کا پیالہ لایا گیا، میں نے پی لیا (اتنا جھک کر پیا کہ)

الرِّيَّ يَخْرُجُ فِي أَظْفَارِي ثُمَّ أَعْطَيْتُ فَضْلِي عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ. قَالُوا فَمَا أَوَّلْتَهُ

میرے ناخونوں پر تازگی (طراوت) دکھائی دینے لگی، پھر میں نے اپنا بچا ہوا (جوٹھا دودھ) عمر کو دے دیا۔ لوگوں نے

يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ الْعِلْمَ.

عرض کیا یا رسول اللہ اس کی تعبیر کیا ہے؟ فرمایا: علم

زیادہ ہوں گے۔(۱)

قولہ القَيِّم: نگہبان، خبر لینے والا۔ یعنی مرد اتنے کم ہو جائیں گے کہ ایک ایک مرد (صالح) پچاس پچاس عورتوں کی خبر گیری کرے گا اور ان کے مصالح پورے کرے گا، یہ مطلب نہیں کہ ایک ایک مرد کی پچاس پچاس بیویاں ہوں گی، بلکہ نگراں مراد ہے کہ بہت بہت سی عورتوں کی خبر گیری کرنے والا ایک ایک مرد ہوگا۔ واللہ اعلم۔

بعضوں نے کہا کہ ممکن ہے اشارہ اس طرف ہو کہ بےحیائی پھیل جائے گی اور لوگ پچاس پچاس عورتوں سے بیگمات کے طور پر تعلق رکھیں گے، چار کی قید باقی نہ رہے گی۔ مگر اس میں ایک اشکال یہ ہے کہ بعض روایات میں قَیِّم کے ساتھ صالح کی قید لگی ہوئی ہے۔(۲)

(۶۴) باب فضل العلم

پہلے یہ باب لا چکے ہیں، بظاہر یہ تکرار معلوم ہوتی ہے، مگر امام بخاری کی نظر بہت دقیق ہے، حافظ کہتے ہیں کہ اس سے امام بخاری کے

---

(۱) شاید اسی بنا پر شریعت نے ایک مرد کو چار تک عورتوں کے رکھنے کی اجازت دی تاکہ عورتوں کی کھپت ہوتی رہے، واللہ اعلم بالصواب (جامع)

(۲) اس سے ظاہر ہوتا ہے بیگمات رکھنا مراد نہیں ہے، اس لئے کہ کوئی صالح مرد مومن چار سے زیادہ نہیں رکھ سکتا، تو پھر دوسری ہی کوئی توجیہ کرنی پڑے گی (جامع)

بَابُ ۶۵ الْفُتْيَا وَهُوَ وَاقِفٌ عَلَى ظَهْرِ الدَّابَّةِ اَوْ غَيْرِهَا

جانور وغیرہ پر سوار ہو کر دین کا مسئلہ بتانا۔

۸۳ ۔ حَدَّثَنَا اِسْمٰعِيْلُ قَالَ حَدَّثَنِيْ مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عِيْسَى

ہم سے اسمٰعیل نے بیان کیا، کہا مجھ سے امام مالک نے بیان کیا، انھوں نے ابن شہاب سے، انھوں نے

بْنِ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

عیسیٰ ابن طلحہ ابن عبید اللہ سے، انھوں نے عبد اللہ ابن عمرو (ابن) العاص سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع میں

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَفَ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ بِمِنًى لِلنَّاسِ يَسْأَلُوْنَهُ

منیٰ میں ٹھہرے، اس لئے کہ لوگ آپ سے (دین کے مسئلے) پوچھیں۔

شفوف نظر کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ حدیث سے مراد ظاہر ہو جائے گی، وہاں فضیلت علماء مراد تھی اور یہاں فضل بمعنی زائد چیز کے ہیں جیسا کہ فضل طہور المرأۃ میں مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب خود عالم سیراب ہو جائے تو دوسروں کو بھی فیض پہونچائے اور بچا ہوا دوسروں کو بھی دو، اس بقیہ ہونے میں بھی فضل ہے۔

حدیث ۸۲، قَدَح: لکڑی کا پیالہ۔ رِيّ: تازگی، طراوت، تری!

قولہ ثُمَّ اَعْطَيْتُ فَضْلِيْ۔ یہ فضل آگیا، یعنی حضرت عمر کو بچا ہوا دیا، معلوم ہوتا ہے کوئی خاص علم جو ضمیمہ ہے علوم نبوت کا، وہ دیا گیا، اسی لئے فرمایا کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے، معلوم ہوا کہ نبوت کے ملکات اور اس کی استعداد ان میں ہے اور مُحَدَّث تو ہیں ہی، مُحَدَّث وہ ہے کہ اللہ اس سے باتیں کرے، یہ مرتبہ الہام سے اوپر اور نبوت کے نیچے ہے، فضل علم دینا کنایہ ہے دوسروں کو سیراب کرنے سے۔ مثلاً تراویح کے باب میں اس فضل علم کا ظہور ہوا جو آنحضرت سے ان کو ملا تھا کہ حضور نے تراویح ادا کی اور جماعت بھی کی مگر اس کا بہت اہتمام نہیں تھا، حضرت عمر نے اس کی تکمیل بھی کی اور اہتمام بھی کیا۔

(۶۵) باب الفتیا وھو واقف علی ظہر الدابۃ او غیرھا

اس باب کا مقصد اور غرض یہ ہے کہ ایک شخص جانور پر سوار ہے اس وقت کوئی اس سے مسئلہ پوچھے تو جواب دے یا نہ دے یعنی اس سے کہیں علم کی بے توقیری تو نہیں ہوتی، تو کہتے ہیں کہ بضرورت جواب دے سکتا ہے اور یہ ثابت بھی ہے، بعض ائمہ کا معمول یہ تھا کہ سواری کھڑے ہوئے حدیث بیان نہیں کرتے تھے، چنانچہ امام مالک خاص شان اور وقار سے بیٹھ کر حدیث سناتے تھے، بلکہ روزانہ غسل کرتے، صاف کپڑے پہنتے اور خوشبو لگاتے پھر وقار سے بیٹھ کر حدیث بیان کرتے۔

. . . .

اس وقت طالبعلمی کے زمانہ کا ایک واقعہ یاد آگیا، امام مالک رحمہ اللہ کے حالات پر میرے ایک ندوی دوست کا مضمون رسالہ الندوۃ میں شائع ہوا تھا، اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ قاضی امام ابویوسف رحمہ اللہ کے ساتھ ہارون رشید مدینہ منورہ گئے تو امام مالکؒ کی خدمت میں بھی حاضری دی، ہارون رشید امام کا بہت احترام کرتا تھا اور اس کے دل میں امام کی بہت عزت تھی، قاضی ابویوسف اس کے ہاں قاضی القضاۃ تھے۔[1] امام مالک سے قاضی ابویوسف نے ایک سوال کیا، امام صاحب نے سکوت فرمایا، دوبارہ سوال کیا، پھر امام صاحب خاموش رہے، ہارون رشید کو یہ بات گراں گذری، وہ سمجھے کہ امام مالک نے ابویوسف کو کچھ سمجھا نہیں، اس لئے انھوں نے کہا کہ امام صاحب آپ جانتے ہیں، قاضی ابویوسف ہیں، اس کے بعد انھوں نے اپنے مضمون میں [امام مالکؒ کا جواب] نقل کیا کہ امام مالک نے کہا: إِذَا جَلَسْنَا لِلْبُغَاةِ فَاسْتَفْتِنَا اور اس کا ترجمہ یہ کیا کہ 'جب ہم ہوا پرستوں کے لئے بیٹھیں اس وقت ہم سے دریافت کرنا، اور آگے اس کی تشریح یہ کی کہ امام نے ابویوسف پر طعن کیا کہ یہ ہوا پرست ہیں، کیونکہ انھوں نے عہدۂ قضا قبول کر لیا تھا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں ندوہ جانا ہوا اور وہاں ان صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جن کا مضمون تھا، دوران گفتگو میں انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ دیوبند میں تاریخ بینی کا سلسلہ کم ہے۔[2] طالب علمی کا دور تھا اس لئے اسی زبان میں میں نے بھی جواب دیا کہ 'تاریخ بینی بیشک کم ہے مگر تاریخ دانی زیادہ ہے، انھوں نے فرمایا کہ بینی اور دانی میں کیا فرق ہے؟ میں نے کہا: ہم دیکھتے کم ہیں اور سمجھتے زیادہ ہیں، پوچھا: کوئی اس پر شاہد؟ میں نے کہا: یہی مضمون جو آپ نے امام مالک کے حالات میں لکھا ہے، کیا یہ امام مالک کی شان علمی کے مناسب ہے کہ وہ امام ابویوسف جیسے بلند پایہ شخص کو ہوا پرست کہیں؟ اس سے صرف امام ابویوسف ہی کی نہیں بلکہ امام مالک کی بھی تنقیص ہوتی ہے کہ انھوں نے اتنے بڑے شخص کو ہوا پرست کہا، کہنے لگے: الفاظ موجود ہیں، میں نے کہا: الفاظ تو ہیں مگر جو معنی بیان کئے گئے وہ صحیح نہیں بلکہ اس کے معنی یہاں طالب کے ہیں، جیسے قرآن میں فرمایا: ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ[3] باغی کو باغی اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ طالب ہوتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ امام مالک کی عام عادت تھی کہ جب تک مجمع نہ ہوتا سناتے نہ تھے، اس لئے امام نے یہ کہا کہ جس وقت طالبین کا مجمع ہوگا اور ہم اسی کام کے لئے بیٹھیں گے تب اس کا جواب دیں گے، اور اس میں نہ امام صاحب کی تنقیص تھی نہ ابویوسف کی، مگر جب باغی کا ترجمہ ہوا پرست کیا جائے گا تو معنی بدل جائیں گے اور دونوں اماموں کی تنقیص لازم آئے گی، تو یہ فرق ہے "بینی" اور "دانی" میں، طالب علمی کا یہ واقعہ میں نے سنا دیا، اس سے خدانخواستہ کسی کی تنقیص مقصود نہیں ہے

---

(۱) سب سے پہلے قاضی القضاۃ امام ابویوسف ؒ ہی ہیں، منہ — (۲) ندوہ کے خاص مضامین میں زبان اور تاریخ نمایاں مقام رکھتے ہیں، منہ — (۳) کہف:

فَجَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ لَمْ اَشْعُرْ فَحَلَقْتُ قَبْلَ اَنْ اَذْبَحَ قَالَ اذْبَحْ وَلَا حَرَجَ ،
پھر ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا مجھ کو خیال نہیں رہا میں نے قربانی سے پہلے سر منڈا لیا، آپ نے فرمایا: اب قربانی
فَجَاءَ اٰخَرُ فَقَالَ لَمْ اَشْعُرْ فَنَحَرْتُ قَبْلَ اَنْ اَرْمِيَ قَالَ ارْمِ وَلَا حَرَجَ . فَمَا
کرلے، کوئی مضائقہ نہیں، پھر ایک اور شخص آیا اور کہنے لگا مجھ کو خیال نہیں رہا میں نے کنکریاں مارنے سے پہلے قربانی کرلی
سُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ شَيْءٍ قُدِّمَ وَلَا اُخِّرَ اِلَّا قَالَ افْعَلْ وَلَا حَرَجَ
آپ نے فرمایا: اب کنکریاں مارلے، کچھ مضائقہ نہیں، عبد اللہ ابن عمر نے کہا تو (اس دن) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے
جو پوچھا گیا، کوئی بات کسی نے آگے کرلی یا پیچھے کردی تو آپ نے یہی فرمایا: اب کرلے کچھ مضائقہ نہیں

باب ٦٦ مَنْ اَجَابَ الْفُتْيَا بِاِشَارَةِ الْيَدِ وَالرَّأْسِ

جس نے ہاتھ یا سر کے اشارے سے مسئلہ کا جواب دیا

٨٤ ـ حَدَّثَنَا مُوْسَى بْنُ اِسْمٰعِيْلَ قَالَ حَدَّثَنَا وُهَيْبٌ قَالَ ثَنَا اَيُّوْبُ
ہم سے بیان کیا موسیٰ ابن اسمٰعیل نے، کہا ہم سے بیان کیا وہیب نے، کہا ہم سے بیان کیا
عَنْ عِكْرِمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ فِيْ حَجَّتِهٖ فَقَالَ
ایوب نے، انھوں نے عکرمہ سے، انھوں نے ابن عباس سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حج میں پوچھا گیا، ایک شخص نے کہا:
ذَبَحْتُ قَبْلَ اَنْ اَرْمِيَ قَالَ فَاَوْمَأَ بِيَدِهٖ قَالَ وَلَا حَرَجَ . وَقَالَ حَلَقْتُ
میں نے کنکریاں مارنے سے پہلے ذبح کیا، آپ نے ہاتھ سے اشارہ کیا، کچھ حرج نہیں، اور ایک شخص نے کہا: میں نے قربانی کرنے سے پہلے

حدیث: ۸۳ ۔ یہاں مختلف سائل ہیں جنھوں نے ترتیب بدل جانے پر سوال کیا اور آپ نے سب سے یہی فرمایا: اِفْعَلْ وَلَا حَرَجَ، اب کرلے، کچھ حرج نہیں، نحر، رمی اور حلق کا مسئلہ یہ ہے کہ اول رمی ہے پھر نحر، اس کے بعد حلق، مگر یہاں ترتیب بدل گئی تھی، تو چونکہ نادانستہ تھی، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جاؤ کچھ گناہ نہیں، اب اس طرح کرو یعنی مقدم و موخر جو کچھ ہوگیا، ہوگیا، مگر کرو، ترک نہ ہو، یہاں لَا حَرَجَ کا مطلب یہ ہے کہ گناہ نہیں، اگرچہ ان چیزوں میں ترتیب واجب ہے مگر انھیں معذور قرار دیا گیا اس لئے گناہ کی نفی کی گئی، رہا یہ کہ دم لازم آئے گا یا نہیں؟ تو یہ دوسرا مسئلہ ہے، اس کا یہاں ذکر نہیں، کتاب الحج میں مستقلاً یہ مسئلہ آئے گا وہیں اس کے متعلق کچھ کہوں گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

باب ٦٦ من اجاب الفتیا باشارۃ الید والرأس

یعنی کسی مسئلہ کا جواب سر یا ہاتھ کے اشارے سے دے سکتا ہے یا نہیں، مقصود یہ ہے کہ اس سے بظاہر لاپرواہی معلوم ہوتی ہے اسلئے

قَبْلَ اَنْ اَذْبَحَ فَاَوْمَأَ بِيَدِهٖ وَلَاحَرَجَ

سر منڈا لیا، آپ نے ہاتھ سے اشارہ فرمایا، کچھ حرج نہیں

٨٥ ـ حَدَّثَنَا الْمَكِّيُّ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ اَنَا حَنْظَلَةُ عَنْ سَالِمٍ قَالَ سَمِعْتُ

ہم سے مکی ابن ابراہیم نے بیان کیا، کہا ہم کو حنظلہ نے خبر دی، انھوں نے سالم سے، کہا میں نے

اَبَاهُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُقْبَضُ الْعِلْمُ وَيَظْهَرُ الْجَهْلُ وَالْفِتَنُ

ابو ہریرہ سے سنا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپ نے فرمایا (دین کا علم) اٹھ جائے گا اور جہالت پھیل جائیگی

وَيَكْثُرُ الْهَرْجُ قِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْهَرْجُ؟ فَقَالَ هٰكَذَا بِيَدِهٖ فَحَرَّفَهَا

اور (طرح طرح کے) فساد پھیلیں گے اور ہرج بہت ہوگا، عرض کیا: یارسول اللہ ہرج کیا ہے؟ آپ نے ہاتھ کو ترچھا

كَاَنَّهٗ يُرِيْدُ الْقَتْلَ

ہلاکر فرمایا، جیسے قتل آپ نے مراد لیا۔

٨٦ ـ حَدَّثَنَا مُوْسٰى بْنُ اِسْمٰعِيْلَ قَالَ ثَنَا وُهَيْبٌ قَالَ ثَنَا هِشَامٌ عَنْ

ہم سے موسیٰ ابن اسمٰعیل نے بیان کیا، کہا ہم سے وہیب نے بیان کیا، کہا ہم سے ہشام نے

فَاطِمَةَ عَنْ اَسْمَاءَ قَالَتْ اَتَيْتُ عَائِشَةَ وَهِيَ تُصَلِّيْ فَقُلْتُ مَا شَأْنُ النَّاسِ؟ فَاَشَارَتْ

بیان کیا، انھوں نے فاطمہ سے، انھوں نے اسماء سے، انھوں نے کہا میں حضرت عائشہ کے پاس آئی، وہ نماز پڑھ رہی تھیں

اِلَى السَّمَاءِ فَاِذَا النَّاسُ قِيَامٌ فَقَالَتْ سُبْحَانَ اللّٰهِ قُلْتُ اٰيَةٌ فَاَشَارَتْ بِرَأْسِهَا

میں نے کہا: لوگوں کو کیا ہوا (وہ پریشان کیوں ہیں؟) انھوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، دیکھا تو لوگ کھڑے ہیں حضرت

اَيْ نَعَمْ فَقُمْتُ حَتّٰى عَلَانِي الْغَشْيُ فَجَعَلْتُ اَصُبُّ عَلٰى رَأْسِي الْمَاءَ فَحَمِدَ اللّٰهَ

عائشہ نے کہا: سبحان اللہ! میں نے کہا: کیا کوئی (عذاب یا قیامت کی) نشانی ہے؟ انھوں نے سر ہلاکر کہا: ہاں! تب میں بھی (نماز میں)

النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ

کھڑی ہوگئی، یہاں تک کہ مجھ کو غش آنے لگا، میں اپنے سر پر پانی ڈالنے لگی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی تعریف کی اور خوبی بیان کی

امام بخاری یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ایسا کرنا بضرورت جائز ہے۔

حدیث: ٨٤، یہاں لفظ ایماء آیا ہے۔ بخاری نے اس سے استدلال کیا ہے۔

ثُمَّ قَالَ مَا مِنْ شَيْءٍ لَمْ أَكُنْ أُرِيتُهُ إِلَّا رَأَيْتُهُ فِي مَقَامِي هٰذَا حَتَّى الْجَنَّةَ وَالنَّارَ

پھر فرمایا: جو چیزیں ایسی تھیں جو مجھ کو دکھائی نہیں جا سکتی تھیں ان سب کو میں نے (آج) اس جگہ سے دیکھ لیا۔ یہاں تک کہ بہشت

فَأُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّكُمْ تُفْتَنُونَ فِي قُبُورِكُمْ مِثْلَ أَوْ قَرِيبَ لَا أَدْرِي أَيَّ ذٰلِكَ قَالَتْ أَسْمَاءُ

اور دوزخ کو بھی، پھر مجھ پر وحی بھیجی گئی کہ تم لوگ اپنی قبروں میں اس طرح یا اس کے قریب آزمائے جاؤ گے (فاطمہ کو یاد نہیں

مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَّالِ يُقَالُ مَا عِلْمُكَ بِهٰذَا الرَّجُلِ فَأَمَّا الْمُؤْمِنُ أَوِ الْمُوقِنُ

کہ اسماء نے کون سا کلمہ کہا) جیسے مسیح دجال سے آزمائے جاؤ گے (تم سے) کہا جائے گا: اس شخص کے باب میں کیا اعتقاد رکھتے تھے؟

لَا أَدْرِي أَيَّهُمَا قَالَتْ أَسْمَاءُ فَيَقُولُ هُوَ مُحَمَّدٌ هُوَ رَسُولُ اللّٰهِ جَاءَنَا بِالْبَيِّنَاتِ

(یعنی آنحضرت کے باب میں) ایمان دار یا یقین رکھنے والا (معلوم نہیں اسماء نے کون سا لفظ کہا) کہے گا وہ محمد ہیں، اللہ کے بھیجے ہوئے

وَالْهُدٰى فَأَجَبْنَاهُ وَاتَّبَعْنَاهُ هُوَ مُحَمَّدٌ ثَلٰثًا

ہمارے پاس کھلی نشانیاں اور ہدایت لے کر آئے، ہم نے ان کا کہنا مان لیا اور ان کی راہ پر چلے، وہ محمد ہیں، تین بار ایسا ہی کہے گا۔

حدیث: ۸۵، الھرج یعنی قتل کرنا۔

حدیث: ۸۶، قولہ أتیتُ عائشةَ، یہ کسوف کا واقعہ ہے، ازواج مطہرات اپنے حجروں سے حضورؐ کی اقتدا کر رہی تھیں اور حضور مع الجماعۃ مسجد میں تھے۔

قولہ فأشارت۔ یعنی حضرت صدیقہؓ نے اسماءؓ کے سوال کے جواب میں آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

قولہ أصبُّ علیٰ رأسی الخ یعنی نماز ہی میں یہ عمل کیا۔

قولہ لم أکن أُریتُه، یعنی اس مقام سے وہ سارے فتنے جو دنیا یا آخرت میں پیش آنے والے تھے سب ظاہر کر دیے گئے، بعض روایات میں ہے کہ قبلہ کی دیوار میں متمثل کر دیے گئے، گویا عالم مثال کو سامنے کر دیا گیا۔ بلاتشبیہ جیسے آج کل سینما کے پردہ پر تصاویر متمثل نظر آتی ہیں، تشبیہ مقصود نہیں، سمجھانے کے لئے محض مثال ہے، حضورؐ نے سب کچھ حتیٰ کہ جنت و دوزخ کو بھی دیکھ لیا، یہاں یہ سوال کرنا جنت و دوزخ کہاں ہیں؟ درست نہیں، کیونکہ یہ وجود کی دوسری نوع ہے، ایک عالم کے اعتبار سے این و متیٰ کا سوال ہو سکتا ہے۔ مثلاً کوئی پوچھے کہ یہ دیوار کس طرف ہے؟ تو کہا جا سکتا ہے کہ شمال یا جنوب میں ہے، کیونکہ اس کا تعلق ہمارے عالم سے ہے اور اس کا وجود خارجی ہے
لیکن اس وجود کی نوعیت علیحدہ ہے، وہاں کے متعلق کیسے این و متیٰ کا سوال ہو سکتا ہے؟ ۲۶

علامہ ابن قیم نے لکھا ہے کہ دار تین ہیں: دار دنیا، دار برزخ، دار آخرت اور ہر ایک کے نوامیس و قوانین اور حالات

فَيُقَالُ نَمْ صَالِحًا قَدْ عَلِمْنَا إِنْ كُنْتَ لَمُوْقِنًا بِهٖ وَأَمَّا الْمُنَافِقُ أَوِ الْمُرْتَابُ لَا أَدْرِيْ

پھر اس سے کہا جائے گا تو مزے سے سوجا، ہم تو (پہلے ہی) جان چکے تھے کہ تو ان پر یقین رکھتا ہے، اور منافق یا شک کرنے والا

أَيَّ ذٰلِكَ قَالَتْ أَسْمَاءُ فَيَقُوْلُ لَا أَدْرِيْ سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ شَيْئًا فَقُلْتُهٗ۔

(نہیں معلوم اسماء نے کون سا لفظ کہا ان دونوں میں سے) یوں کہے گا: میں کچھ نہیں جانتا (میں نے تو دنیا میں کچھ غور ہی نہیں کیا) لوگوں کو جو کہتے سنا میں بھی کہنے لگا۔

جدا ہیں، ایک عالم میں دوسرے عالم کا سوال ہی بیجا ہے، مثلاً ہم عالم حیوانات میں جاکر کہیں کہ انسان کا عالم ایسا ایسا ہے اور وہاں یہ یہ ہے تو کیا کوئی حیوان سمجھ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! تو جو قانون وہاں ہے یہاں نہیں، معلوم ہوا کہ ہر دار کے نوامیس و قوانین علیحدہ ہیں، دور کیوں جاتے ہو دیکھو یورپ کے بڑے بڑے محققین روح کے متعلق کہتے ہیں کہ روح کے جو قوانین اب تک جس قدر ہم پر منکشف ہوئے وہ ان سے بہت کم ہیں جو ہمیں ابھی نامعلوم ہیں، کوئی شخص خواب دیکھے تو تم اس سے پوچھو کہ جو مکان تم نے خواب میں دیکھا ہے وہ کس طرف ہے اور کس شہر میں ہے، تو کیا وہ بتا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! اسی طرح یہاں رہ کر کوئی نہیں بتا سکتا کہ جنت، دوزخ کہاں ہیں، حالانکہ وہ واقعۃً اس وقت بھی موجود ہیں ایسا نہیں ہے کہ پہلے یہ عالم ہے، پھر عالم مثال آئے گا، پھر عالم آخرت، بلکہ سب اسی وقت موجود ہیں، مگر ہماری نظریں دیکھ نہیں سکتیں، جب حجاب اٹھ جائے گا سب منکشف ہوجائے گا، جیسا کہ نبی علیہ السلام کے لئے حجاب اٹھ گیا، تو سب نظر آگیا، جنت بھی اور دوزخ بھی۔

قولہ بِهٰذَا الرَّجُلِ، اشارہ کیسے ہوگا؟ تو یہ بھی ممکن ہے کہ مشار الیہ سامنے ہوں، اس طرح کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ پر رہیں اور پردہ اٹھا دیا جائے اور وہ دیکھ لے۔ اور ہو سکتا ہے کہ عالم مثال میں یہ صورت ہو، مگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ صفات بیان کئے جائیں گے کہ ایسے ایسے شخص جو تمہارے پاس ایسی ایسی چیزیں لائے تھے ان کے متعلق تمہارا کیا قول ہے؟

قولہ نَمْ صَالِحًا، اچھی طرح آرام کر۔ ہم نے نَمْ کا ترجمہ "سوجا" نہیں کیا، اس وجہ سے کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کو بھی کسی نہ کسی کام میں لگا دیتے ہیں۔ بعض تلاوت کرتے ہیں، بعض نمازیں پڑھتے ہیں، مکلف نہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اب ان پر ضروری نہیں رہا، مگر وہ یہ از خود بطور التذاذ کرتے ہیں، حاجی صاحب فرماتے تھے کہ اللہ ایک بار جنت میں پہونچا دے تو ہم کہیں گے کہ ہمیں اب کسی اور چیز کی ضرورت نہیں، بس ایک مصلّے بھر جگہ دے دی جائے، ہمیشہ نماز پڑھتے رہیں، تو یہ اس لئے نہیں کہ وہ مکلف ہیں، بلکہ اس لئے کہ انھیں لذت اسی میں ملتی ہے اور وہ اس میں خوش ہوتے ہیں، وہاں علم کی ترقی اکتساب سے نہ ہوگی۔

یہاں کافر مجاہر کا ذکر نہیں ہے۔ مگر بعض روایات میں تصریح ہے، شرح عقیدۂ سفارینی حنبلی میں سلف کے اقوال نقل کئے ہیں ہمیں لکھا ہے کہ کافر سے بھی سوال ہوگا، یہ کتاب کتب ابن تیمیہ وابن القیم کا خلاصہ ہے۔

بَاب ٦٧ تَحْرِيْضِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفْدَ عَبْدِ الْقَيْسِ عَلٰى اَنْ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عبد القیس کے لوگوں کو اس بات کی ترغیب دینا کہ ایمان اور علم کی باتیں یاد

يَحْفَظُوا الْاِيْمَانَ وَالْعِلْمَ وَيُخْبِرُوْا مَنْ وَّرَاءَهُمْ وَقَالَ مَالِكُ بْنُ الْحُوَيْرِثِ قَالَ لَنَا

کریں، اور جو لوگ ان کے پیچھے (اپنے ملک میں) ہیں، ان کو خبر کردیں، اور مالک ابن حویرث نے کہا ہم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِرْجِعُوْا اِلٰى اَهْلِيْكُمْ فَعَلِّمُوْهُمْ

فرمایا ہے: اپنے گھروالوں کے پاس لوٹ جاؤ، ان کو دین کی باتیں سکھاؤ

۸۷ ـ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ حَدَّثَنَا غُنْدَرٌ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ

ہم سے محمد ابن بشار نے بیان کیا، کہا ہم سے غندر (محمد ابن جعفر) نے بیان کیا، کہا ہم سے شعبہ نے،

اَبِيْ جَمْرَةَ قَالَ كُنْتُ اُتَرْجِمُ بَيْنَ ابْنِ عَبَّاسٍ وَبَيْنَ النَّاسِ فَقَالَ اِنَّ وَفْدَ عَبْدِ الْقَيْسِ

بیان کیا، انھوں نے ابو جمرہ سے، کہا میں عبد اللہ ابن عباس اور (بصرہ کے) لوگوں کے بیچ میں مترجم تھا، عبد اللہ

اَتَوُا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَنِ الْوَفْدُ؟ اَوْ مَنِ الْقَوْمُ؟ قَالُوْا رَبِيْعَةُ قَالَ

ابن عباس نے کہا عبد القیس کے بھیجے ہوئے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، آپ نے فرمایا: یہ کس کے بھیجے ہوئے

مَرْحَبًا بِالْقَوْمِ اَوْ بِالْوَفْدِ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا نَدَامٰى. قَالُوْا اِنَّا نَاْتِيْكَ مِنْ شُقَّةٍ بَعِيْدَةٍ

لوگ ہیں؟ یا کون لوگ ہیں؟ انھوں نے کہا ہم ربیعہ والے ہیں، آپ نے فرمایا: مرحبا ان لوگوں کو یا ان بھیجے ہوئے لوگوں کو، نہ

وَبَيْنَنَا وَبَيْنَكَ هٰذَا الْحَيُّ مِنْ كُفَّارِ مُضَرَ وَلَا نَسْتَطِيْعُ اَنْ نَاْتِيَكَ اِلَّا فِيْ شَهْرٍ حَرَامٍ

ذلیل ہوئے نہ شرمندہ ہوئے، وہ کہنے لگے: ہم آپ کے پاس دور کا سفر کرکے آئے ہیں اور ہمارے آپ کے بیچ میں مضر کے کافروں کا یہ

فَمُرْنَا بِاَمْرٍ نُخْبِرْ بِهٖ مَنْ وَّرَاءَنَا نَدْخُلْ بِهِ الْجَنَّةَ،

قبیلہ آڑے ہے اور ہم سوا ادب کے مہینے کے اور دنوں میں آپ کے پاس نہیں آسکتے، اس لئے ہم کو ایک ایسی (عمدہ) بات بتلا دیجئے جس کی خبر ہم

اپنے پیچھے والوں کو کردیں اور اس کی وجہ سے ہم بہشت میں جائیں

---

(٦٧) باب تحریض النبی صلی اللہ علیہ وسلم الخ

دین کی اور علم کی باتوں کے محفوظ رکھنے کو بتلاتے ہیں کہ یہ محبوب چیز ہے نیز سیکھ کر اپنے ہم وطنوں کو سکھانا بھی چاہیے اور تبلیغ بھی کرنا چاہیے اور یہی بات آپ نے مالک ابن حویرث سے فرمائی تھی [حاصل یہ ہے کہ] علم کو مخفی نہ رکھنا چاہیے، بلکہ اسے پھیلانا چاہیے۔

فَاَمَرَهُمْ بِاَرْبَعٍ وَنَهَاهُمْ عَنْ اَرْبَعٍ . اَمَرَهُمْ بِالْاِيْمَانِ بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ . قَالَ هَلْ

آپ نے ان کو چار باتوں کا حکم کیا اور چار باتوں سے منع کیا، ان کو حکم کیا خدائے واحد (اکیلے خدا) پر ایمان لانے کا، فرمایا: تم جانتے ہو

تَدْرُوْنَ مَا الْاِيْمَانُ بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ . قَالَ شَهَادَةُ اَنْ

خدائے واحد پر ایمان لانا کس کو کہتے ہیں، انھوں نے کہا اللہ اور اس کا رسول خوب جانتا ہے، آپ نے فرمایا: یوں گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَاِقَامُ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءُ الزَّكٰوةِ وَصَوْمُ رَمَضَانَ

سچا معبود نہیں ہے اور محمد اس کے بھیجے ہوئے ہیں، اور نماز کو درستی سے ادا کرنا اور زکوٰۃ دینا اور رمضان کے روزے رکھنا اور لوٹ

وَتُعْطُوا الْخُمُسَ مِنَ الْمَغْنَمِ وَنَهَاهُمْ عَنِ الدُّبَّاءِ وَالْحَنْتَمِ وَالْمُزَفَّتِ قَالَ شُعْبَةُ

کے مال سے پانچواں حصہ داخل کرنا، اور ان کو منع کیا کدو کے تونبے اور سبز لاکھی برتن اور روغنی برتن سے، شعبہ نے کہا

وَرُبَّمَا قَالَ النَّقِيْرِ وَرُبَّمَا قَالَ الْمُقَيَّرِ قَالَ احْفَظُوْهُ وَاَخْبِرُوْهُ مَنْ وَّرَائَكُمْ

ابو جمرہ نے کبھی تو کہا: اور کریدے ہوئے لکڑی کے برتن سے اور کبھی کہا مزفت کے بدلے مقیر، آپ نے فرمایا اس کو یاد کرلو اور اپنے پیچھے والوں کو اس کی خبر دو

قولہ شُقّۃ، جس کا طے کرنا شاق ہو، مشقت سے طے ہو، یعنی مسافت بعیدہ ہے، **اخبروہ من ورائکم** میں ترجمہ ہے باب کا یعنی دوسروں کو جو ان کے پیچھے وطن میں رہ گئے ہیں انھیں خبر کردیں۔

قولہ ربما قال النقیر، یعنی راوی نے کبھی کبھی اس کو چوتھی چیز بتایا ہے، یوں کہا کہ منع کیا چار چیزوں سے (۱) **الدُّبّاء**: کدو کا تونبا (۲) **الحنتم**: سبز لاکھی برتن (۳) **المزفت**: روغنی برتن (۴) **النقیر**: لکڑی کرید کر بنایا ہوا برتن، اور کبھی بجائے مزفت کے مقیر کہا، یعنی روغن ملا ہوا برتن۔

یہ بات یاد رکھو کہ ابن عباس نے سوال کے جواب میں یہ حدیث سنائی، اس صنیع سے سمجھ میں یہ آتا ہے کہ وہ اسے منسوخ نہ سمجھتے تھے کیونکہ بعد میں (یعنی حضورؐ کی وفات کے بعد) بیان کر رہے ہیں اور فتوی دے رہے ہیں۔ مگر صحیح مسلم کے آخر میں تصریح ہے کہ **کنت نهيتكم عن الانتباذ .... ولا تشربوا مسكرا** الخ تو نسخ صراحۃً موجود ہے جس سے معلوم ہوا کہ حلت و حرمت میں ظروف کو دخل نہیں ہے۔

علماء نے اس میں کلام کیا ہے کہ نہی تو منسوخ ہے مگر نہی کا منشا کیا تھا؟ تو بعض نے یہ منشا بتلایا کہ یہ برتن نذکرنہ بنیں شراب کے لئے کیونکہ عموماً انھیں ظروف میں شراب بناتے تھے، اب جب شراب حرام کردی گئی اور ظروف سامنے موجود ہوں گے تو اس کی یاد تازہ ہوجائے گی، اس لئے ان برتنوں کا استعمال بھی ممنوع قرار دے دیا، پھر جب دلوں میں شراب کی نفرت بیٹھ گئی اور انس بھی جاتا رہا تو ان ظروف کے استعمال کی اجازت مل گئی جو اصل حکم تھا، یہ تقریر اس نسخ کے مناسب ہے اور بعضوں نے کہا کہ اس کا منشا یہ ہے کہ ان برتنوں میں نبیذ جو بنائی جاتی ہے تو بہت جلد اشتداد

بابُ الرِّحلَةِ فِی المَسئَلَةِ النَّازِلَةِ۔ [٦٨]

کوئی مسئلہ جو پیش آیا ہو اس کے لئے سفر کرنا۔

۸۸ ۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بنُ مُقَاتِلٍ اَبُوالحَسَنِ قَالَ اَخبَرَنَا عَبدُ اللهِ قَالَ

ہم سے محمد ابن مقاتل ابو الحسن نے بیان کیا، کہا ہم کو عبد اللہ ابن مبارک نے خبر دی، کہا ہم کو عمر

اَنَا عُمَرُ بنُ سَعِیدِ بنِ اَبِی حُسَینٍ قَالَ حَدَّثَنِی عَبدُ اللهِ ابنُ اَبِی مُلَیکَۃَ عَن عُقبَۃَ

بن سعید نے خبر دی، کہا مجھ سے عبد اللہ ابن ابی ملیکہ نے بیان کیا، انھوں نے عقبہ ابن حارث سے سنا، انھوں نے

بنِ الحَارِثِ اَنَّہٗ تَزَوَّجَ ابنَۃً لِاَبِی اِھَابِ بنِ عَزِیزٍ فَاَتَتہُ امرَاَۃٌ فَقَالَت اِنِّی

ابو اہاب ابن عزیز کی بیٹی (غنیہ) سے نکاح کیا، پھر ایک عورت آئی (اس کا نام نہیں معلوم) کہنے لگی کہ میں نے تو عقبہ

قَد اَرضَعتُ عُقبَۃَ وَالَّتِی تَزَوَّجَ بِھَا قَالَ لَھَا عُقبَۃُ مَا اَعلَمُ اَنَّکِ قَد اَرضَعتِنِی

اور اس کی دلہن (غنیہ) کو دودھ پلایا ہے، عقبہ نے کہا کہ میں تو نہیں سمجھتا کہ تو نے مجھ کو دودھ پلایا ہو، نہ تو نے مجھ سے

وَلَا اَخبَرتِنِی فَرَکِبَ اِلٰی رَسُولِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ فَسَاَلَہٗ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ

کبھی بیان کیا، پھر عقبہ سفر کر کے (اپنے ملک سے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مدینہ کو چلے اور آپ سے پوچھا، آپ نے فرمایا

صَلَّی اللهُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ کَیفَ وَقَد قِیلَ

تو اس عورت سے کیونکر (صحبت کرے گا) جب ایسی بات کہی گئی (کہ وہ تیری بہن ہے)

پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اٹھنے لگتی ہے، اس لئے احتیاط کرنے کو کہا کہ مبادا کوئی اس میں نبیذ بنائے اور اس میں اشتداد پیدا ہو جائے جس کا اسے شعور نہ ہو اور استعمال کرلے تو بے شعوری سہی مسکر کا استعمال ہو جائے گا، اس وجہ سے ان ظروف کا استعمال کرنا ہی منع فرمادیا، مگر اس میں اشکال ہے کہ یہ منشا تو آخر تک موجود ہے، پھر نسخ کیوں ہوا، برخلاف پہلی تقریر کے کہ وہ منشا نسخ کے مناسب ہے۔

تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ ان میں سکر جلد آتا ہے اور ابتداء میں مسکر پینے کی عادت تھی اس لئے ادھر سے احتیاط کم ہوگی اور ادھر سکر جلد آئے گا، اس لئے منع فرمادیا [پھر جب عادت چھوٹ گئی تو اجازت دے دی، کہ اب وہ خود ہی احتیاط برت لیں گے، اس تقریر سے اشکال تو دور ہو گیا] مگر بہر حال پہلی تقریر منشا نسخ کے زیادہ مناسب ہے۔ الحاصل چونکہ حدیث مسلم میں نسخ کا ذکر صراحۃً موجود ہے، لہٰذا کہیں گے کہ یہ حدیث ابن عباس کو نہیں پہونچی۔

(٦٨) **باب** الخ: پہلا باب طلب علم کے لئے سفر کرنے کا تھا اور دوسرا دریا میں سفر کا تھا اور یہ ایک تیسری چیز ہے کہ

فَفَارَقَهَا عُقْبَةُ وَنَكَحَتْ زَوْجًا غَيْرَهُ.

آخر عقبہ نے اس کو چھوڑ دیا، اس نے دوسرے سے نکاح کر لیا.

ایک تو مطلق علم کے لیے سفر ہے اور ایک کسی خاص جزئیہ کے لیے سفر کرنا، جسے استفتاء کہتے ہیں، تو یہ بھی طلب علم ہے، لیکن جزئی اور پہلے کلی طلب علم کا ذکر تھا ۸

حدیث : ۸۸ . قولہ عقبۃ بن الحارث . یہ کہتے ہیں کہ میں نے غُنَیّہ سے نکاح کیا اور بعد نکاح مجھ سے ایک عورت نے کہا کہ میں نے عقبہ کو بھی دودھ پلایا ہے اور تمہاری منکوحہ غنیہ کو بھی، یعنی تم دونوں رضاعی بھائی بہن ہو، تمہارا نکاح کیسے درست ہوگا؟ عقبہ نے کہا میں تو اس کا کوئی علم نہیں تھا کہ تو نے ہم دونوں کو دودھ پلایا ہے، نہ ہی تو نے قبل نکاح ہم کو کوئی اطلاع دی.

یہ جواب تو انھوں نے دے دیا مگر اپنے اطمینان کی غرض سے دربار نبوی میں حاضری دی، اور معلوم کیا کہ کیا اس حالت میں ایک عورت کا قول معتبر ہو سکتا ہے؟ یا نہیں!

قولہ کَیْفَ وَقَدْ قِیْلَ . یعنی آپ نے یہ سن کر کہ دودھ پلانے والی عورت خود کہتی ہے کہ اس نے ان دونوں کو دودھ پلایا ہے، فرمایا کہ پھر کیونکر تم دونوں اکٹھے رہ سکتے ہو؟ جب کہ کہدیا گیا جو کچھ کہہ دیا گیا، یعنی [رضاعت کی بات کہی جا چکی]

قولہ فَفَارَقَهَا . یعنی عقبہ نے اس عورت کو چھوڑ دیا [علٰحدگی اختیار کر لی] اب جدائی کی کیا صورت پیش آئی؟ خود طلاق دیدی؟ یا رسول علیہ السلام نے تفریق کرادی؟ دونوں احتمال ہیں. تفریق کا مفصل حال آگے آئے گا. یہاں تو اتنا بتانا ہے کہ طلاق سے بھی مفارقت ہو جاتی ہے اور حاکم کی تفریق سے بھی.

مسئلہ کا مختصر بیان یہ ہے کہ اگر مرضعہ تنہا شہادت دے کہ میں نے اس لڑکے اور لڑکی کو مدت رضاعت میں دودھ پلایا ہے تو تنہا مرضعہ کی یہ شہادت امام احمد ابن حنبل کے نزدیک کافی ہے. مزید شہادت کی حاجت نہیں. اور جمہور کہتے ہیں کہ کافی نہیں، بلکہ نصاب شہادت کا پایا جانا ضروری ہے، دو مرد ہیں، یا ایک مرد دو عورتیں. قال اللہ تعالیٰ : فَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ، فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ.[1] حنفیہ کا اور بعض دیگر ائمہ کا یہی مسلک ہے. یہ حدیث بظاہر امام احمد کے لیے مفید ہے اور حجت ہے، یعنی یہ کہ صرف مرضعہ کی شہادت کافی ہے. اس کے جواب میں ابن ہمام نے لکھا ہے کہ یہ حدیث محمول ہے تورّع اور تنزہ پر، یعنی شریعت گو حرمت کو ثابت نہیں کرتی، لیکن چونکہ شبہہ پڑ گیا ہے، جو ثبوت کے لیے اگرچہ کافی نہیں ہے، مگر پڑھ چکے ہو: اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ الخ اس لیے حضور نے فرمادیا: کَیْفَ وَقَدْ قِیْلَ . اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ اب شاید [آپس میں] صفائی بھی نہ رہے. اس لیے تورّعًا آپ نے حکم دیا، اور تفریق

---

(۱) بقرہ : ۲۸۲

بَابُ ۶۹ التَّنَاوُبِ فِی الْعِلْمِ

علم حاصل کرنے کے لئے باری مقرر کرنا

۸۹ ۔ حَدَّثَنَا اَبُو الْیَمَانِ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعَیْبٌ عَنِ الزُّهْرِیِّ ح قَالَ وَقَالَ

ہم سے ابو الیمان نے بیان کیا، کہا ہم کو شعیب نے خبر دی، انھوں نے زہری سے۔ دوسری سند:

ابْنُ وَهْبٍ اَنَا یُوْنُسُ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَیْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِیْ ثَوْرٍ عَنْ

امام بخاری نے کہا۔ ابن وہب نے کہا: ہم کو یونس نے خبر دی، انھوں نے ابن شہاب سے، انھوں نے عبید اللہ بن عبد اللہ

عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ کُنْتُ اَنَا وَجَارٌ لِّیْ مِنَ الْاَنْصَارِ

ابن ابی ثور سے، انھوں نے عبد اللہ ابن عباس سے، انھوں نے حضرت عمر سے، انھوں نے کہا: میں اور میرا ایک انصاری

فِیْ بَنِیْ اُمَیَّةَ بْنِ زَیْدٍ وَّهِیَ مِنْ عَوَالِی الْمَدِیْنَةِ وَکُنَّا نَتَنَاوَبُ النُّزُوْلَ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ

پڑوسی دونوں بنی امیہ بن زید کے گاؤں میں جو مدینہ کے (پورب کی طرف) بلند گاؤں میں سے ہے، رہا کرتے تھے، اور

صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَنْزِلُ یَوْمًا وَّاَنْزِلُ یَوْمًا ۔

ہم اور وہ دونوں باری باری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (مدینہ میں) اترا کرتے۔ ایک روز وہ اترتا اور ایک روز میں اترتا

ہوگئی۔ یہ شیخ ابن ہمام نے جواب دیا۔ بخاری بھی آگے چل کر کتاب البیوع میں اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ لیکن خیر الدین رملی استاد صاحب الدر المختار سے حاشیہ البحر الرائق میں منقول ہے کہ ہمارا (احناف کا) جو مسلک ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ قضاءً حرمت ثابت نہیں ہوتی، دیانۃً ہو جاتی ہے قضاء اور دیانۃ کے مراتب کا تعین بہت مشکل ہے۔ اقوال فقہاء اس باب میں مضطرب ہیں، جو لوگ اب تک یہ سمجھے ہوتے ہیں کہ فی ما بینہ وبین اللہ تو حرمت ہوگئی، لیکن لوگوں کے تعلقات اور معاملات کے اعتبار سے حرمت کا حکم نہیں، یہ ٹھیک نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جبتک معاملہ محکمۂ عدالت میں نہیں آیا، اس وقت تک دیانۃً ہے، خواہ تمام دنیا میں شہرت ہو جائے۔ اس صورت میں اگر ایک عورت یہ کہے، تو مفتی یہی فتویٰ دے گا کہ تم دونوں علیحدہ ہو جاؤ، لیکن قاضی اس کا پابند نہیں، تو مفتی فتوی دے گا وہ فتوی دیانۃً ہوگا، مگر قاضی کے ہاں سوال ہوگا کہ دو گواہ لاؤ! اب اگر [گواہ نہ لاسکے اور] قاضی نے فیصلہ کر دیا کہ جاؤ ساتھ رہو تو اسے شریعت میں سفاح نہ کہیں گے۔ پس اب دیانت کا مطلب یہ ہوا کہ ایسے وقت میں ترک کر دینا بہتر ہے۔ یہ تعبیر ابن ہمام کے قول سے اچھی ہے، اگرچہ مال دونوں کا ایک ہے، تو جب مفتی کا قول لازم نہیں ہے، نہ وہ تفریق کرا سکتا ہے تو وہ محض تورّعاً ہوگا۔ بخلاف قول قاضی کے کہ وہ تفریق کرا سکتا ہے۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ حضورؐ نے جو کَیْفَ وَقَدْ قِیْلَ فرمایا، تو یہ بحیثیت قاضی کے فرمایا تھا اور یہ حکم قضا تھا یا مشورہ اور فتویٰ کے اعتبار سے تھا؟ ۔۔

فَإِذَا نَزَلْتُ جِئْتُهُ بِخَبَرِ ذٰلِكَ الْيَوْمِ مِنَ الْوَحْيِ وَغَيْرِهِ وَإِذَا نَزَلَ فَعَلَ مِثْلَ ذٰلِكَ

جس دن میں اترتا تو اس دن کی ساری خبریں، وحی وغیرہ جو آپ پر اترتی اس کو بتلا دیتا اور جس دن وہ اترتا تو وہ بھی ایسا ہی کرتا،

فَنَزَلَ صَاحِبِي الْأَنْصَارِيُّ يَوْمَ نَوْبَتِهِ فَضَرَبَ بَابِي ضَرْبًا شَدِيدًا فَقَالَ أَثَمَّ هُوَ؟

ایک دن ایسا ہوا کہ میرا ساتھی انصاری اپنی باری کے دن اترا تھا، اس نے (وہاں سے آن کر) میرا دروازہ زور سے کھٹکایا، اور

فَفَزِعْتُ فَخَرَجْتُ إِلَيْهِ فَقَالَ حَدَثَ أَمْرٌ عَظِيمٌ. فَدَخَلْتُ عَلَى حَفْصَةَ فَإِذَا هِيَ

کہنے لگا: عمر ہیں؟ میں گھبرا کر باہر نکل آیا، وہ کہنے لگا: (آج تو) بڑا سانحہ ہوا (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو

تَبْكِي، فَقُلْتُ أَطَلَّقَكُنَّ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَتْ لَا أَدْرِي

طلاق دے دیا) یہ سن کر میں (اپنی بیٹی) حفصہ کے پاس گیا اور وہ رو رہی تھی، میں نے کہا: کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تم لوگوں کو طلاق دے دی؟ اس نے کہا میں نہیں جانتی

دونوں ہی احتمال ہیں۔ تو اب دونوں فریق کے لئے گنجائش رہی، کسی ایک کے ساتھ مخصوص نہ رہا، کیونکہ آپ کے دونوں منصب تھے، مگر یہیں نہیں ہے کہ آپ نے عورت کو طلب فرمایا ہو، اگر قضاء فرماتے تو عورت کو بلانا اور شہادت لینا ضروری تھا، اور وہ ہوا نہیں، تو یہ اس بات کا مرجح ہے کہ منصب افتاء کے اعتبار سے فتوی دیا تھا۔

(۶۹) باب التناوب فی العلم

حدیث ۸۹ : ابن شہاب وہی زہری ہیں، یہ حدیث بہت طویل ہے، آگے مفصل آئے گی۔ اس میں جس امر عظیم کا ذکر ہے وہ ایلاء کا واقعہ ہے، امام بخاری نے باب کا عنوان یہ رکھا ہے کہ علم کو نوبت بہ نوبت حاصل کرنا یعنی دو طالب علم [طلب علم میں] اس طرح شریک ہو جائیں [اور سمجھوتہ کرلیں] کہ ایک دن ایک جاکر استاد سے سن لیا کرے اور دوسرے دن دوسرا سن لیا کرے، تو معلوم ہوا کہ اگر کسی ضرورت سے تناوب کرلیا جائے تو اس میں کچھ حرج نہیں ہے، یہ صورت بھی ہو سکتی ہے اور یہ حدیث اس کی دلیل ہے۔

قولہ بنی امیۃ بن زید۔ یہ ایک قبیلہ ہے عوالی مدینہ میں، مدینہ کے شرقی جانب کو عوالی اور جو مغرب کی جانب نشیب میں ہے، اسے سوافل کہتے ہیں، کبھی عوالی کے مقابل کو سوافل کہدیا جاتا ہے، عوالی گاؤں ہے [ذرا فاصلہ پر] روزانہ وہاں سے آنے میں حرج تھا اور کسب ضروریات میں [روز روز آنا جانا خلل انداز ہوتا تھا] اس لئے عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنے پڑوسی سے یہ طے کرلیا کہ ایک دن تم جاؤ ایک دن ہم۔ اس سے یہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ خبر واحد قابل احتجاج ہے۔ خصوصاً جب خبر واحد فرد ہو اور غریب بھی اگر خبر واحد حجت نہ ہوتی تو ایسا سمجھوتہ کیوں ہوتا اور کیوں یہ قبول کرتے۔ اور اگر قبول نہ کرتے تو فائدہ کیا تھا، لہٰذا معلوم ہوا کہ ہر عادل کی

ثُمَّ دَخَلْتُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ وَاَنَا قَائِمٌ اَطَلَّقْتَ

پھر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا، بیٹھے کھڑے ہی کھڑے (پہلے ہی) عرض کیا: کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دیا؟

نِسَاءَكَ؟ قَالَ لَا! فَقُلْتُ اللّٰهُ اَكْبَرُ

آپ نے فرمایا: نہیں، تو میں نے کہا: اللہ اکبر!

روایت اگرچہ وہ فرد ہو اور غریب ہو، قابل احتجاج ہے۔

قولہ فَقَالَ اَثَمَّ هُوَ: پوچھا وہ یہاں ہیں یا نہیں؟

قولہ فدخلت الخ، یہ مختصر ہے، ورنہ مطول روایت میں ہے کہ عمر رضی اللہ نے کہا: اجاء الغسانی: کیا غسانی آگئے، چونکہ اس وقت شہرت ہو رہی تھی کہ غسانی (جو انصار مدینہ کے ہم جد اور عیسائی تھے) مدینہ پر چڑھائی کرنے والے ہیں، اسلئے عمرؓ کا ذہن فورًا ادھر گیا کہ شاید انھوں نے حملہ کر دیا ہو ـ انصاری نے جواب میں کہا نہیں! اس سے بھی بڑھ کر حادثہ پیش آیا یعنی حضور نے ازواج کو طلاق دے دی، معلوم ہوا کہ طلاق ازواج حملۂ غسانی سے بھی بڑھ کر ہے، ان صحابی کو بات کی پوری تحقیق نہ تھی حضورؐ ایک مشربہ (بالاخانہ) میں تشریف فرما تھے، منافقین نے طلاق کی بات مشہور کر دی تھی، کہیں سے انھوں نے بھی سن لیا اور یہی آکر نقل کر دیا۔

حضرت عمر سب سے پہلے حضرت حفصہؓ کے ہاں پہونچے، کیونکہ یہ بیٹی تھیں اور ان کی فکر حضرت عمر کو اس لئے تھی کہ [اگر یہ بات سچ ہوئی تو] یہ بڑی محرومی تھی، چنانچہ انھوں نے فرمایا: قد خابت حفصة [حضرت عمرؓ جب حفصہؓ کے پاس] پہونچے تو ان کو روتے ہوئے دیکھ کر [حضرت عمرؓ پہلے تو] گھبرائے، مگر جب انھوں نے لا ادری کہا تو کچھ پریشانی میں کمی ہوئی۔

یہ بھی آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت حفصہؓ سے فرمایا: تمھیں دھوکہ نہ ہو کہ حضورؐ جس طرح عائشہ کو محبوب رکھتے ہیں، تم کو بھی رکھیں گے، آخر تم کس بات پر جھگڑتی ہو؟ کیا نفقہ پر؟ خبردار! اب جس چیز کی ضرورت ہو مجھ سے کہنا، حضور سے ہرگز نہ کہنا۔ پھر یہاں سے حضور اقدس کی خدمت میں پہونچے اور تین بار اذن طلب کیا، تب حاضری کی اجازت ملی، اوپر گئے تو کمرہ کی حالت دیکھی کہ سامان کچھ بھی نہیں، بہت متاسف ہوئے، اس لئے بھی کہ سامان کچھ نہ تھا اور اس لئے بھی کہ آپ کو ازواج کی طرف سے خصوصًا حفصہ کی طرف سے دکھ پہونچا سب سے پہلا سوال کیا: اَطَلَّقْتَ نِسَاءَكَ؟ کیا حضور نے اپنی ازواج کو طلاق دے دی؟ آپ نے فرمایا: نہیں! کہا اللہ اکبر، [یہ اللہ اکبر کہنا یا تو] فرح و سرور سے تھا یا تعجب کی راہ سے۔ عمر کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ آپ میرا قصہ سنیں تو تعجب کریں گے، ہم جب تک مکہ میں تھے تو عورتوں پر غالب تھے [اور عورتیں دبی ہوئی تھیں] اور یہاں آکر انصار مدینہ کی عورتوں کو دیکھ کر ہماری عورتوں کا بھی

بَابُ الْغَضَبِ فِی الْمَوْعِظَةِ وَالتَّعْلِیْمِ اِذَا رَأَی مَا یَکْرَہُ

وعظ کہنے یا پڑھانے میں کوئی بری بات دیکھے تو غصہ کرنا

۹۰ ـ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ کَثِیْرٍ قَالَ اَخْبَرَنِیْ سُفْیَانُ عَنْ اَبِیْ خَالِدٍ عَنْ

ہم سے محمد ابن کثیر نے بیان کیا، کہا خبر دی ہم کو سفیان ثوری نے، انھوں نے اسماعیل بن ابی خالد سے

قَیْسِ بْنِ اَبِیْ حَازِمٍ عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ قَالَ رَجُلٌ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ

انھوں نے قیس بن ابی حازم سے، انھوں نے ابومسعود انصاری سے، انھوں نے کہا ایک شخص (حزم ابن کعب) نے عرض کیا

لَا اَکَادُ اُدْرِکُ الصَّلٰوۃَ مِمَّا یُطَوِّلُ بِنَا فُلَانٌ

یارسول اللہ مجھے تو (جماعت سے) نماز پڑھنا مشکل ہو گیا ہے، فلاں صاحب (معاذ ابن جبل) نماز (بہت) لمبی پڑھتے ہیں

رنگ بدل گیا، ایک دن میں نے اپنی بیوی کو کسی بات پر جھڑکا تو اس نے کہا کہ تم مجھے کیوں جھڑکتے ہو، کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر ہو، ازواج مطہرات تو حضور سے حقوق طلب کرتی ہیں اور تم جھڑکتے ہو [حضرت عمرؓ کہتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے] عرض کیا کہ حضرت! میں حفصہ کے پاس گیا اور حفصہ سے یہ کہا۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اس سے حضورؐ کے چہرے پر فرح ومسرّت کے آثار پائے گئے، پھر میں نے کہا کہ دعا کیجیے کہ اللہ آپ کی امت پر توسیع کرے، یہ ادب کے خلاف تھا کہ کہتے کہ اپنے لئے دعا کیجیے، یہ کمبخت کفار مزے اڑا رہے ہیں اور اہل اسلام تنگی میں ہیں، یہ جملہ آپ کو پسند نہ آیا، آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا: **انی شك انت یا ابن الخطاب ھؤلاء قوم عجلت لھم طیباتھم فی الحیوۃ الدنیا ولاخلاق لھم فی الاٰخرۃ** ۔ اس کے بعد آیات تخییر نازل ہوئیں، **یاایھا النبی قل لازواجك** الی **اجرًا عظیمًا** ۔ آپ نے آیتوں پر عمل کیا اور ازواج کو اختیار دیا، تمام ازواج نے بالاتفاق کہا کہ ہم کو دار آخرت مقصود ہے ۔ مقصد اس حدیث کو لانے سے تناوب ثابت کرنا ہے جو ابتداء حدیث میں مذکور ہے ۔

(۷۰) بَاب الغضب فی الموعظۃ الخ

اس ترجمہ سے یہ افادہ مقصود ہے کہ اگر استاذ غصہ ہو جائے تو کچھ مضائقہ نہیں، چونکہ بظاہر غصہ کرنے اور خفگی سے حظ نفس معلوم ہوتا ہے اس لئے بتلاتے ہیں کہ حضور جو حظ نفس سے خالی تھے وہ غصہ ہوتے تھے، اور یہ اس وقت ہوتا تھا جب کوئی شاگرد اپنی فطرت سلیمہ اور طبیعت سے کام نہ لیتا تھا اور الٹے پلٹے سوال کرتا تو ایسے موقع پر خفا ہوتے ۔ یہاں بھی حضرت معاذ[1] ابن جبل کو اپنی فطرت سلیمہ سے کام لیکر

---

(۱) حضرت معاذ کا نام ظاہر کی بنا پر لیا گیا ہے۔ ۱۲ مرتب۔

فَمَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي مَوْعِظَةٍ اَشَدَّ غَضَبًا مِنْ يَوْمَئِذٍ فَقَالَ

ابومسعود نے کہا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی وعظ میں اس دن سے زیادہ غصہ میں نہیں دیکھا، آپ نے فرمایا: لوگو! تم

اِيُّهَا النَّاسُ اِنَّكُمْ مُنَفِّرُوْنَ فَمَنْ صَلّٰى بِالنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ فَاِنَّ فِيْهِمُ الْمَرِيْضَ

نفرت دلانے لگے، دیکھو جو کوئی نماز پڑھائے وہ ہلکی نماز پڑھے، کیونکہ ان میں کوئی بیمار ہوتا ہے، کوئی ناتوان اور

الضَّعِيْفَ وَذَا الْحَاجَةِ

کوئی کام والا

نماز کو زیادہ طویل نہ کرنا چاہئے تھا مگر انھوں نے توجہ نہیں کی اس لئے محبوب آقا نے غصہ فرمایا، اب اگر کسی اور استاذ کو بھی اسی طرح کی بات پر غصہ آجائے تو کوئی قابل گرفت بات نہیں۔

قولہ لا اکاد ادرک الصلوٰۃ، یعنی قریب نہیں ہے کہ میں شریک ہوسکوں کیونکہ میں کام کاجی آدمی ہوں، کام کرتے کرتے تھک جاتا ہوں اور اتنی طویل قرأت برداشت نہیں ہوتی۔

قولہ فلان علامہ عثمانی نے فرمایا کہ فلاں[1] سے معاذ ابن جبل مراد نہیں ہیں بلکہ ابی[2] ابن کعب ہیں، ھٰکذا قالہ الحافظ

قولہ فی موعظۃ اشد غضبا الخ اس سے ترجمہ ثابت ہوگیا۔

قولہ انکم منفرون یعنی من الدین، کیونکہ نماز بھی دین سے ہے اور تم نے اس سے نفرت دلائی تو یہ دین سے نفرت دلانا ہوا، اور یہ بات مومن کی شان کے خلاف ہے۔

قولہ فلیخفف، تخفیف سے مراد یہ ہے کہ جن جن نمازوں میں جو سُوَر مسنون ہیں ان میں سے جو چھوٹی ہوں ان کو پڑھے اور احیاناً طویل بھی پڑھ لے، تو تطویل منہی عنہ میں داخل نہیں ہے، عادت نبوی یہ تھی کہ نماز فجر میں تطویل فرماتے اور اکثر طوال مفصل پڑھتے اور اوساط و قصار دیگر نمازوں میں پڑھتے تھے، یہ شخص جنھوں نے حضور سے شکایت کی بظاہر حاجت والے معلوم ہوتے ہیں، اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے قصے میں تو سائل یقیناً حاجت والا تھا اور یہاں یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ سائل ذوالحاجۃ تھا۔

---

(۱) یہاں بظاہر حضرت معاذ ابن جبل مراد ہیں، جیساکہ ترجمہ مولانا وحید الزماں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ۱۲ جامع۔

(۲) جامع تقریر نے حزم ابن کعب لکھا ہے، جو خود ان کا سہو ہے۔ فتح الباری ص ۱۳۶ ج ۲ ملاحظہ کیجئے ۱۲ مرتب۔

۹۱ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ عَامِرٍ الْعَقَدِیُّ قَالَ

ہم سے بیان کیا عبد اللہ ابن محمد نے، کہا ہم سے بیان کیا ابو عامر عقدی نے، کہا، ہم سے سلیمان ابن بلال مدینی نے

ثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ بِلَالٍ الْمَدِيْنِيُّ عَنْ رَبِيْعَةَ بْنِ اَبِیْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ يَزِيْدَ مَوْلٰی

بیان کیا، انھوں نے ربیعہ ابن ابی عبد الرحمن سے، انھوں نے یزید سے جو منبعث کے غلام تھے، انھوں نے زید ابن

الْمُنْبَعِثِ عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الْجُهَنِیِّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَاَلَهٗ

خالد جہنی سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص (عمیر یا بلال یا جارود) نے پڑی ہوئی چیز کو پوچھا، آپ نے

رَجُلٌ عَنِ اللُّقَطَةِ فَقَالَ اعْرِفْ وِكَاءَهَا اَوْ قَالَ وِعَاءَهَا وَعِفَاصَهَا ثُمَّ عَرِّفْهَا

فرمایا اس کا بندھن یا ظرف اور اس کی تھیلی پہچان رکھ پھر ایک برس تک لوگوں سے پوچھتا رہ۔ پھر اپنے کام میں لا

سَنَةً ثُمَّ اسْتَمْتِعْ بِهَا فَاِنْ جَاءَ رَبُّهَا فَاَدِّهَا اِلَيْهِ قَالَ فَضَالَّةُ الْاِبِلِ فَغَضِبَ

پھر اگر (ایک سال کے بعد بھی) اس کا مالک آجائے تو اس کو ادا کر، اس نے کہا گم ہوا اونٹ اگر ملے؛ یہ سن کر آپ اتنا غصہ ہوئے کہ

قولہ سألہ رجل عن اللقطة، ایک شخص نے لُقطہ یعنی گری پڑی چیز کو پوچھا کہ اٹھالے یا نہیں؟ اگر اٹھالے تو کیا کرے؟ کتنے دنوں تک مالک کی تلاش میں امانۃً رکھے رہے؟ آپ نے فرمایا: اس کی وکاء کو (وکاء: باندھنے کا تسمہ) اور وعاء (یعنی برتن) کو اور عفاص (عفاص: وہ کپڑا یا چمڑا وغیرہ جو اوپر منڈھ دیتے ہیں) کو پہچان لے (اور محفوظ رکھ) یعنی خوب دیکھ لو کہ کیا مال اور کتنا ہے۔ وہ ظرف جس میں مال ہے وہ کیسا ہے، چمڑے کا ہے یا کسی دھات کا؟ یا کپڑا؟ اس پر ڈھکن یا ڈاٹ کس چیز کی ہے؟ غرض خوب دیکھ بھال کر نیک نیتی سے محفوظ کرلو، پھر ایک سال تک مجمعوں میں اور لوگوں میں اعلان کرتے رہو۔ اگر مالک مل جائے تو دے دو ورنہ پھر خرچ کرسکتے ہو۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر ملتقط غنی ہے تو خرچ کی اجازت نہیں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ حاکم اجازت دے دے تو استعمال کرلے، رہا مسئلہ ایک سال تک تعریف (واعلان) کرنے کا، تو اس میں فقہاء مختلف ہیں، بعض ایک سال کہتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ جب تک آنے کی امید ہو۔ بعض نے کہا دس درم سے کم میں ایک سال اور زیادہ ہو تو پھر کچھ تحدید کی ہے۔ استاذ نے فرمایا کہ رائے مبتلی بہ کو دخل ہے اور مال کے اعتبار سے تحدید کی جائے گی، جیسا مال ہوگا اسی قدر [اس کی مالیت کے مناسبت سے] تعریف کی جائے گی، تو درحقیقت حیثیت مال کی دیکھی جائے گی۔

قولہ فضالّۃ الابل۔ یعنی اگر اونٹ جنگل میں پھرتا ہو اور کوئی پکڑ لائے تو؟ اس پر آپ کو غصہ آگیا، کیونکہ بے سمجھی کا سوال تھا۔ یہ اس وقت اور اس زمانہ کی بات تھی، ورنہ آج کل فقہاء کہتے ہیں کہ اس کو بھی پکڑ لائے، کیونکہ ضائع کا

حَتّٰی احْمَرَّتْ وَجْنَتَاہُ، اَوْ قَالَ احْمَرَّ وَجْھُہٗ فَقَالَ مَالَكَ وَلَھَا مَعَھَا سِقَاءُ ھَا

آپ کے دونوں گال سرخ ہو گئے، یا آپ کا منھ سرخ ہو گیا، آپ نے فرمایا: تجھے اونٹ سے کیا واسطہ، وہ تو اپنی مشک اور اپنا

وَحِذَاءُ ھَا تَرِدُ الْمَاءَ وَتَرْعَی الشَّجَرَ فَذَرْھَا حَتّٰی یَلْقَاھَا رَبُّھَا قَالَ فَضَالَّۃُ

موزہ ساتھ رکھتا ہے، وہ خود پانی پر جا کر پانی پی لیتا ہے اور درخت کے پتے چر لیتا ہے، اس کو چھوڑا رہنے دے جب تک اس کا

الْغَنَمِ؟ قَالَ لَكَ اَوْ لِاَخِیْكَ اَوْ لِلذِّئْبِ

مالک آئے، اس نے کہا: گمی ہوئی بکری؟ آپ نے فرمایا: وہ تو تیرا حصہ ہے یا تیرے بھائی (اس کے مالک) کا حصہ یا بھیڑیے کا۔

۹۲۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ اُسَامَۃَ عَنْ بُرَیْدٍ عَنْ

ہم سے محمد ابن علا نے بیان کیا، کہا ہم سے ابو اسامہ نے بیان کیا، انھوں نے بُرید سے، انھوں نے

اَبِیْ بُرْدَۃَ عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ سُئِلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ اَشْیَاءَ کَرِھَھَا

ابو بردہ سے، انھوں نے ابو موسیٰ اشعری سے، کہا کہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی باتیں پوچھیں کہ آپ کو برا معلوم ہوا

احتمال قوی ہے اور اس وقت یہ صورت نہ تھی، اس لئے سرکار کو غصہ آیا، منشا حضور کا یہ تھا کہ اونٹ کے لئے کسی چیز کا خوف نہیں، کھانے پینے میں وہ اس کا محتاج نہیں کہ کوئی پہونچائے تو کھا پی سکے ورنہ نہیں، بلکہ وہ خود ہی کھا پی سکتا ہے۔

حِذَاءٌ یعنی اس کے جوتے اس کے ساتھ ہیں، یعنی اسے جوتوں کی ضرورت نہیں بلکہ اس کے پاؤں ہی اس کے جوتے ہیں

قولہٗ فَضَالَّۃُ الْغَنَمِ۔ یعنی اگر بکری جنگل میں مل جائے اور مالک کا پتہ نہ ہو تو اس کو پکڑ کر گھر لا سکتا ہے؟ یا اونٹ کی طرح اس کا بھی حکم ہے؟ یہ سوال چونکہ ڈھنگ کا تھا اس لئے آپ نے مسئلہ سمجھایا اور اس پر غصہ نہیں فرمایا بلکہ اس کا حکم بتلایا کیونکہ بکری میں احتمال ہے ضیاع کا اور وہ کھانے پینے میں چرواہے کی محتاج ہے۔

لِاَخِیْكَ، صاحب مال یا کوئی مسلم۔

لِلذِّئْبِ، اشارہ کیا کہ ضیاع کا احتمال ہے، اس لئے اس کی حفاظت کر لینی چاہیے۔

بخاری کا ترجمہ ثابت ہو گیا کہ موعظت میں غصہ بھی ہو سکتا ہے۔

حدیث ۹۲۔ قولہٗ سُئِلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ اَشْیَاءَ: ایسی باتوں کو پوچھا جو آپ کو پسند نہیں آئیں، قرآن میں منع کیا گیا ہے کہ خواہ مخواہ سوال نہ کرو، مگر بعض لوگ تعنت اور استہزاء سے سوال کرتے تھے، وہ بھی اس میں داخل ہے، اور بعض محض لاابالی پن سے، اس لئے ناگواری کا اظہار فرمایا گیا۔

فَلَمَّا اُكْثِرَ عَلَيْهِ غَضِبَ ثُمَّ قَالَ لِلنَّاسِ سَلُوْنِيْ عَمَّا شِئْتُمْ فَقَالَ رَجُلٌ مَنْ اَبِیْ؟ قَالَ

جب بہت پوچھا پاچھی کی تو آپ کو غصہ آگیا، آپ نے فرمایا: (اچھا یوں ہی سہی) اب جو چاہو پوچھتے جاؤ! ایک شخص (عبداللہ بن حذافہ)

اَبُوْكَ حُذَافَةُ فَقَامَ اٰخَرُ فَقَالَ مَنْ اَبِیْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ اَبُوْكَ سَالِمٌ

نے پوچھا کہ میرا باپ کون ہے؟ فرمایا: تیرا باپ حذافہ ہے، پھر دوسرا کھڑا ہوا (سعد ابن سالم) کہنے لگا: یارسول اللہ! میرا باپ

مَوْلٰى شَيْبَةَ فَلَمَّا رَاٰى عُمَرُ مَا فِیْ وَجْهِهٖ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا نَتُوْبُ اِلَى

کون ہے؟ آپ نے فرمایا: تیرا باپ سالم ہے شیبہ کا غلام، جب حضرت عمر نے آپ کے چہرۂ مبارک کے غصہ کو دیکھا تو کہنے لگے

اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ۔

ہم یا رسول اللہ اللہ عزوجل کی بارگاہ میں توبہ کرتے ہیں

بَابٌ[۷۱] مَنْ بَرَكَ عَلٰى رُكْبَتَيْهِ عِنْدَ الْاِمَامِ اَوِ الْمُحَدِّثِ

امام یا محدث کے سامنے دوزانو (ادب سے) بیٹھنا۔

۹۳۔ حَدَّثَنَا اَبُو الْيَمَانِ قَالَ اَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِیِّ قَالَ اَخْبَرَنِیْ

ہم سے ابو الیمان نے بیان کیا، کہا ہم کو شعیب نے خبر دی، انھوں نے زہری سے، کہا مجھ کو انس

اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ فَقَامَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ حُذَافَةَ

ابن مالک نے خبر دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر برآمد ہوئے تو عبد اللہ ابن حذافہ کھڑے ہوئے۔

قولہ سَلُوْنِیْ عَمَّا شِئْتُمْ، جو چاہو پوچھو! یہ غصے سے فرمایا، کبھی انشراح یا خوشی سے یہ صورت پیش آتی تھی، وہاں ناگواری نہ ہوتی تھی۔

قولہ فَقَالَ رَجُلٌ مَنْ اَبِیْ؟ یہ سائل عبد اللہ ابن حذافہ ہیں۔

قولہ اَبُوْكَ حُذَافَةُ۔ یعنی جس طرف منسوب تھے، اس کی صحت کی صراحت فرمادی۔

قولہ فَقَامَ اٰخَرُ۔ دوسرے نے یہی سوال کیا، روایت میں ہے کہ جب یہ دوسرا سائل گھر گیا تو ماں نے کہا کہ تو مجھے رسوا کرنے کے لئے گیا تھا، کیونکہ جاہلیت کے زمانہ میں فجور وزنا کثرت سے تھا توکہیں حضور کسی اور کا نام بتا دیتے تو کیا ہوتا؟ میری رسوائی ہوتی یا نہیں؟ جواب دیا کہ اگر حضور کسی اور کو بتلاتے تو میں تو اسی کو باپ کہتا، خواہ کچھ ہوتا۔ یہ سوال تعنت سے نہ تھا بلکہ ناسمجھی کی بنا پر تھا اسکو عمر سمجھ گئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! ہم توبہ کرتے ہیں۔

فَقَالَ مَنْ أَبِي؟ قَالَ أَبُوكَ حُذَافَةُ ثُمَّ أَكْثَرَ أَنْ يَقُولَ سَلُونِي فَبَرَكَ عُمَرُ عَلَى

اور پوچھنے لگے: میرا باپ کون ہے؟ آپ نے فرمایا: تیرا باپ حذافہ ہے، پھر بار بار فرمانے لگے: پوچھو! پوچھو! آخر حضرت عمرؓ

رُكْبَتَيْهِ فَقَالَ رَضِينَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

(یہ حال دیکھ کر) دوزانو ہو بیٹھے اور کہنے لگے: ہم اللہ کے رب ہونے سے اور اسلام کے دین ہونے سے اور حضرت محمدؐ

نَبِيًّا، ثَلٰثًا، فَسَكَتَ

کے نبی ہونے سے خوش ہیں۔ تین بار یہ کہا اس وقت آپ چپ ہو رہے

بَابٌ ٧٢ مَنْ أَعَادَ الْحَدِيثَ ثَلٰثًا لِيُفْهَمَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

ایک بات کو خوب سمجھانے کو تین تین بار کہنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک حدیث میں) فرمایا

وَسَلَّمَ أَلَا وَقَوْلُ الزُّورِ، فَمَا زَالَ يُكَرِّرُهَا، وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ

سن لو اور جھوٹ بولنا، اور کئی بار اس کو فرماتے رہے، اور ابن عمر نے روایت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ بَلَّغْتُ ثَلٰثًا

فرمایا: کیا میں نے تم کو (اللہ کا پیغام) پہونچا دیا؟

٩٤ ـ حَدَّثَنَا عَبْدَةُ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الصَّمَدِ قَالَ ثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ

ہم سے عبدہ نے بیان کیا، کہا ہم سے عبد الصمد نے بیان کیا، کہا ہم سے عبد اللہ ابن

---

(٧١) باب من برك على ركبتيه الخ

یعنی ادب بتلاتے ہیں کہ شاگرد کی شان سے ہے کہ دوزانو بیٹھے۔

حدیث ٩٣، قولہ رضينا بالله ربًّا الخ. بعض روایات میں ہے: وبالقرآن اماماً، ہم قرآن کو امام بنانے سے خوش ہیں۔

(٧٢) باب من اعاد الحديث ثلثا الخ

نبی علیہ السلام کی عادت مبارکہ تھی کہ جب کوئی بات سمجھانی ہوتی اور آپ کا یہ ظن ہوتا کہ ایک بار بات کہنے سے قلب میں راسخ نہیں ہوئی تو آپ تین بار اس کا اعادہ فرماتے تاکہ خوب سمجھ میں آجائے، یہ تکرار ہمیشہ نہ ہوتی بلکہ بضرورت ہوتی۔

قولہ الا وقول الزور، سمجھ لو اور جھوٹ بولنا۔ جھوٹ کی مذمت میں اس کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے بار بار دہرایا۔ بعض

الْمُثَنّٰی قَالَ ثَنَا ثُمَامَةُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَنَسٍ عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ

المثنّٰی نے بیان کیا، کہا ہم سے ثمامہ ابن عبداللہ ابن انس نے بیان کیا، انھوں نے انس سے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ اِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ اَعَادَهَا ثَلٰثًا حَتّٰی تُفْهَمَ عَنْهُ

کہ آپ جب کوئی بات فرماتے تو تین بار فرماتے، تاکہ لوگ ان کو خوب سمجھ لیں، اور جب کسی قوم کے پاس تشریف لے جاتے، ان کو سلام

وَاِذَا اَتٰی عَلٰی قَوْمٍ فَسَلَّمَ عَلَیْهِمْ سَلَّمَ عَلَیْهِمْ ثَلٰثًا

کرتے تو تین بار سلام کرتے۔

۹۵۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ ثَنَا اَبُوْ عَوَانَةَ عَنْ اَبِیْ بِشْرٍ عَنْ یُوْسُفَ بْنِ

ہم سے مسدد نے بیان کیا، کہا ہم سے ابوعوانہ نے بیان کیا، انھوں نے ابوبشر سے، انھوں نے

مَاهَكَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو، قَالَ تَخَلَّفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ سَفَرٍ

یوسف ابن ماہک سے، انھوں نے عبداللہ ابن عمرو سے کہ ایک سفر میں جو ہم نے کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے پیچھے

سَافَرْنَاهُ فَاَدْرَكَنَا وَقَدْ اَرْهَقَتْنَا الصَّلٰوةُ صَلٰوةُ الْعَصْرِ وَنَحْنُ نَتَوَضَّاُ فَجَعَلْنَا نَمْسَحُ

رہ گئے تھے، پھر آپ ہم سے اس وقت ملے جب عصر کی نماز کا وقت آن پہونچا تھا، یا تنگ ہوگیا تھا اور ہم وضو کر رہے تھے،

عَلٰی اَرْجُلِنَا فَنَادٰی بِاَعْلٰی صَوْتِهٖ وَیْلٌ لِّلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ مَرَّتَیْنِ اَوْ ثَلٰثًا

اپنے پاؤں پر (ہلکے دھوکر) گویا مسح کر رہے تھے، آپ نے بلند آواز سے پکارا: دوزخ سے ایڑیوں کی خرابی ہونے والی ہے، دوبار

یا تین بار یوں بھی فرمایا۔

روایات میں ہے کہ آپ نے اتنی بار دہرایا کہ ہم کہنے لگے لیتہ سکت۔ تو کبھی کبھی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے اس قدر تکرار ہوتا تھا کہ مخاطب [تمنا کرنے لگتا کہ کاش آپ اتنی مشقت نہ اٹھاتے اور خاموش ہوجاتے]

حدیث ۹۴، قولہ فَسَلَّمَ عَلَیْهِمْ ثَلٰثًا، یہ دوسرا مسئلہ ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ ایک بار سلام کافی ہے۔ حضورؐ تین بار سلام وہاں کرتے جہاں کبھی کسی کے مکان پر تشریف لے جاتے اور سلام استیذان فرماتے جس کے الفاظ یہ ہوتے: السَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَاَدْخُلُ (اسلام علیکم کیا میں اندر آجاؤں) اور داخل ہونے کے بعد پھر سلام کرتے، یہ سلام تحیۃ ہوتا اور تیسرا سلام واپسی پر رخصت ہونے کا ہوتا، اسے سلام تودیع کہتے ہیں۔ اکثر نے یہی معنی تین سلام کے لئے ہیں اور کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ صرف استیذان کے لئے [تین بار سلام کرتے یعنی اگر ایک بار میں جواب نہ ملتا تو دوبارہ سہ بارہ سلام کرتے۔

بَاب ۷۳ تَعْلِيْمِ الرَّجُلِ اَمَتَهٗ وَاَهْلَهٗ

اپنی لونڈی اور گھر والوں کو (دین کا علم) سکھانا۔

۹۶۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ هُوَابْنُ سَلَامٍ قَالَ اَنَا الْمُحَارِبِيُّ نَا صَالِحُ بْنُ

ہم سے محمد ابن سلام نے بیان کیا، کہا ہم سے عبدالرحمان محاربی نے کہا، ہم سے صالح ابن حیان نے

حَيَّانَ قَالَ قَالَ عَامِرُالشَّعْبِيُّ حَدَّثَنِيْ اَبُوْبُرْدَةَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

کہا، عامر شعبی نے کہا مجھ سے ابو بردہ نے بیان کیا، انھوں نے اپنے باپ ابوموسیٰ اشعری سے، کہا آنحضرت

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةٌ لَهُمْ اَجْرَانِ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اٰمَنَ بِنَبِيِّهٖ وَاٰمَنَ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین آدمیوں کو دوہرا ثواب ملے گا، ایک تو اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) میں سے وہ شخص

بِمُحَمَّدٍ وَالْعَبْدُ الْمَمْلُوْكُ اِذَا اَدّٰى حَقَّ اللّٰهِ وَحَقَّ مَوَالِيْهِ وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهٗ

جو اپنے پیغمبر پر ایمان لایا اور پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا، دوسرے وہ غلام جو اللہ کا حق ادا کرے اور اپنے مالکوں کا بھی

اَمَةٌ يَطَاُهَا فَاَدَّبَهَا فَاَحْسَنَ تَاْدِيْبَهَا وَعَلَّمَهَا فَاَحْسَنَ تَعْلِيْمَهَا ثُمَّ اَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا

تیسرے وہ شخص جس کے پاس ایک لونڈی ہو وہ اس سے صحبت کرتا ہو پھر اس کو اچھی طرح ادب سکھائے اور اچھی طرح

فَلَهٗ اَجْرَانِ ثُمَّ قَالَ عَامِرٌ اَعْطَيْنَاكَهَا بِغَيْرِ شَيْءٍ قَدْ كَانَ يُرْكَبُ فِيْمَا دُوْنَهَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ

تعلیم کرے اور آزاد کرکے اس سے نکاح کرلے تو اس کو دوہرا ثواب ملے گا، عامر شعبی نے صالح سے کہا ہم نے یہ حدیث تم کو مفت شادی، ایک زمانہ وہ تھا کہ لوگ اس سے کم حدیث کے لئے مدینہ تک سوار ہوکر جاتے

اس کے بعد بھی اگر اذن نہ ملتا تو واپس آجاتے۔ جیسا کہ ابوموسیٰ اشعری کا واقعہ حضرت عمرؓ کے ساتھ پیش آیا۔ میرے خیال میں یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ اذن دخول [کے بعد][1] زیادہ سے زیادہ تین بار سلام ہو، شاہ صاحب فرماتے تھے کہ اگر مسلّم علیہم کی جماعت کبیرہ ہو تو اس میں تین بار۔ اول ابتدا میں، دوم وسط میں، سوم آخر میں سلام کرنا مناسب ہے۔

حدیث ۹۵۔ اس سے پہلے باب میں حدیث کو رفع صوت ثابت کرنے کے لئے لائے تھے اور یہاں باعتبار تکرار کے [یعنی اگلے باب میں رفع صوت کا جواز اور اس باب میں تکرار واعادہ کا جواز ثابت کرنے کے لئے لائے ہیں]

(۷۳) باب تعلیم الرجل امته واهله

حدیث ۹۶۔ اس حدیث کا پہلا جزو اہم ہے۔ شعبی تابعی ہیں۔

---

(۱) جامع تقریر نے اذن دخول کے لئے "کہا" مگر صحیح نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ اذن دخول کے لئے تین بار کا ذکر تو پہلے کرچکے ہیں۔ ۱۲ (مرتب)

. . . .

قولہ ثلثۃ لھم اجران [تین آدمیوں کو دوہرا ثواب ملے گا] ایک ان میں سے کتابی ہے، جو اپنے نبی پر ایمان لانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا، قرآن کریم میں اس کا ذکر دو جگہ ہے:

(۱) سورہ قصص رکوع ۶ پارہ ۲۰ میں فرمایا: اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِہٖ ھُمْ بِہٖ یُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا یُتْلٰی عَلَیْھِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِہٖٓ اِنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا کُنَّا مِنْ قَبْلِہٖ مُسْلِمِیْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَھُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا [یعنی] جن کو دی ہے ہم نے کتاب اس سے پہلے وہ اس پر یقین کرتے ہیں اور جب ان پر تلاوت کی جاتی ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، یہی ٹھیک ہمارے رب کا بھیجا ہوا، ہم ہیں اس سے پہلے کے حکم بردار۔ وہ لوگ پائیں گے اپنا ثواب دُہرا اس بات پر کہ وہ قائم رہے۔

(۲) سورۂ حدید، رکوع ۴، پارہ ۲۷ میں ارشاد باری ہے: وَرَھْبَانِیَّۃَ ابْتَدَعُوْھَا مَا کَتَبْنٰھَا عَلَیْھِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰہِ فَمَا رَعَوْھَا حَقَّ رِعَایَتِھَا فَاٰتَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْھُمْ اَجْرَھُمْ وَکَثِیْرٌ مِّنْھُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِہٖ یُؤْتِکُمْ کِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِہٖ [یعنی] اور ایک ترک کرنا دنیا کا، جو انھوں نے نئی بات نکالی تھی، ہم نے نہیں لکھا تھا یہ ان پر مگر کیا چاہئے کو اللہ کی رضامندی، پھر نہ نباہا جیسا چاہئے تھا نباہنا، پھر دیا ہم نے ان میں جو ایماندار تھے ان کا بدلہ اور بہت ان میں نافرمان ہیں، اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ سے اور یقین لاؤ اس کے رسول پر، دے گا تم کو دو حصے اپنی رحمت سے۔

دوسرا وہ عبد مملوک ہے جو اپنے مولیٰ کا حق ادا کرنے کے ساتھ اللہ کا بھی حق ادا کرے، اس کو بھی دوہرا اجر ملے گا۔

تیسرا وہ آدمی ہے جس نے اپنی باندی کو تمیزدار بنایا اور اسے علم بھی سکھایا، پھر آزاد کر کے خود ہی نکاح بھی کرلیا، اس کو بھی دوہرا اجر ملے گا۔ پہلے دونوں میں دو دو چیزیں تھیں اور تیسرے میں کئی چیزیں ہیں: تعلیم، تادیب، اعتاق، تزوج۔ تو اعتاق تک ایک سلسلہ ہے اور اعتاق کا مابعد ایک سلسلہ ہے اور وہ صرف تزوج ہے، یعنی اولاً پہلے سلسلہ کی ہر طرح تکمیل کی، اس کے بعد اس سے نکاح کر کے تمام حقوق زوجیت ادا کئے اور اس طرح دوسرے سلسلہ کی تکمیل کی وَلَھُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْھِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ[۱]۔

شعبی نے اَعْطَیْنٰکَھَا میں کس کو مخاطب بنایا ہے؟ روایت میں یہاں اختصار ہے، مسلم میں ہے کہ ایک شخص خراسان کا آیا تھا اور اس نے سوال کیا تھا کہ اگر کوئی اپنی لونڈی کو آزاد کر کے نکاح کرلے تو اس کو لوگ کالراکب بدنتہ کہتے ہیں [یعنی ایسا آدمی جو اپنے قربانی کے جانور پر سواری کرے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ] ایک کام قربت کا کیا کہ تعلیم و تادیب کے بعد آزاد کردیا لیکن اس کو پھر اپنے ہی

---

(۱) بقرہ: ۲۲۸

کام میں لے آیا کہ خود ہی نکاح کرلیا، تو جس طرح رکوب علی البدنۃ (قربانی کے اونٹ پر سواری) بلا عذر برا کام ہے، ایسا ہی یہ نکاح ہے؟ شعبی نے جواب میں کہا کہ ہرگز براکام نہیں ہے، بلکہ اس میں دوہرا اجر ہے۔ اس کے بعد شعبی کہتے ہیں، اَعْطَیْنَاکَھَا الخ یعنی مفت میں گھر بیٹھے [تم کو یہ حدیث کی دولت] دیدی ورنہ اس سے پہلے لوگ اس سے کم کے لئے مدینہ تک کا سفر کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی قدر کرنا اور یاد رکھنا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی عالی مضمون یا دقیق علمی نکتہ بتایا جائے اور اس پر کچھ احسان بھی جتلا دیا جائے تو یہ کبر نہیں ہے اور یہ جائز ہے بشرطیکہ نیت صالح ہو۔ اتنا اور سمجھتے چلو کہ یہ دو اجر کس بات کے ہیں؟ کیا یہ دو عملوں میں سے ہر ایک کا ایک اجر ہے یا ہر عمل پر دوہرا اجر ملے گا؟ مثلاً ایک غلام جو مولیٰ کی خدمت کرتا ہے تو اس پر ایک اجر، اور اللہ کے حقوق کی رعایت کرتا ہے تو اس پر دوسرا اجر، یعنی اس طرح دو اجر ہیں یا یہ کہ جتنے کام کرے گا سب کا دوہرا ملے گا: مولیٰ کی خدمت کا بھی دوہرا اور اللہ کے حقوق کی رعایت کا بھی دوہرا؟ بہ برکت ان حسنات و ایمان کے۔ اسی طرح کتابی کے حق میں سمجھو! ـــ تو دونوں قول ہیں، مگر اکثر یہ کہتے ہیں کہ چونکہ دو جزو ہر ایک میں ہیں اس لئے ہر جزو پر ایک اجر ملے گا [لیکن اس پر] اشکال ہوا کہ پھر اس میں کتابی وغیرہ کی کیا خصوصیت رہی، جو آدمی نیکی کے دو کام کرے گا اس کو دو اجر ملیں گے [مثلاً] حج کرنے والا نماز پڑھے گا تو اس کو دوہرا اجر ملے گا، ایک نماز کا، دوسرا حج کا، تو پھر حدیث پاک میں ثلٰثۃ ہی کیوں فرمایا؟ آخر انھیں تین کی کیا تخصیص ہوئی؟ ـــ شارحین نے کہا وجہ تخصیص یہ [ہے کہ تقاضائے حال یہی ہوگا] اور موقعہ انھیں تین کے ذکر کا ہوگا یا کوئی اور داعیہ ہوگا، اس کا حاصل یہ ہوا کہ تین ہی میں انحصار نہیں ہے، اور یہی صحیح ہے۔

قرآن میں ازواج مطہرات کے سلسلہ میں فرمایا: وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ (۱)۔ تم میں جو بی بی بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں گی اور نیک عمل کریں گی ہم ان کو ان کا اجر دونا عطا فرمائیں گے۔

اور بھی اس کی نظائر ہیں، حافظ ابن حجر عسقلانی صاحب فتح الباری نے بیس سے زیادہ نظائر پیش کئے ہیں

اب وہ چیز سمجھو جس میں شراح پریشان ہوئے ہیں اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق [اشکال کا] حل نکالا ہے، اشکال یہ ہے کہ اہل کتاب سے کیا مراد ہے؟ آیا اہل کتاب سے یہود اور نصاریٰ دونوں مراد ہیں اور کتاب سے توراۃ و انجیل دونوں؟ یا اہل کتاب سے کوئی ایک [یہودی یا نصرانی] اور کتاب سے بھی کوئی ایک [توریت یا انجیل] مراد ہے؟ بعضوں نے کہا، دونوں مراد نہیں ہو سکتے، وجہ اس کی یہ کہ یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا اور ان کو دجال کہا، معاذ اللہ منہ، کتب سابقہ میں مسیح دجال سے ڈرایا گیا ہے اور مسیح عیسیٰ کی خوشخبری دی گئی ہے

(۱) احزاب: ۳۱

ان یہود نے اس کے بالکل برعکس کر دیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح دجال قرار دیا اور دجال کو مسیح بشر پر، اور جب دجال نکلے گا تو وہ اس کے ساتھ ہوں گے ایسی صورت میں انکار عیسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے شرعاً ان کا ایمان معتبر نہیں بلکہ وہ عند اللہ حبط ہو چکا، پس جب وہ ایمان معتبر نہ رہا تو ایک ہی ایمان باقی رہا اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ہے، اور یہاں دو چیزیں ہونی ضروری تھیں۔ اس لئے یہود مراد نہیں ہو سکتے اسی بنا پر بعضوں نے عاجز آکر کہہ دیا کہ اہل کتاب سے یہاں صرف نصاریٰ مراد ہیں اور کتاب سے مراد صرف انجیل ہے۔ ایسا کہنے سے وہ شبہہ تو جاتا رہا لیکن اب اس سے بڑھ کر ایک اشکال سامنے آگیا اور وہ یہ کہ اس حدیث کا ماخذ قرآن کریم کی آیت أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ[1] ہے، اور ان آیات کے بارے میں تمام اکابر مفسرین نے مثلاً طبری، طبرانی اور ابن کثیر جو خود محدث بھی ہیں، روایات کو پرکھ کر کہا کہ عبد اللہ ابن سلام اور ان کے رفقاء کے حق میں نازل ہوئیں جو یہودی اور احبار میں سے تھے۔

اب اگر تم حدیث کو نصاریٰ کے ساتھ خاص بھی کر لو تو آیت میں کیا کرو گے؟ وہاں تو اولاً یہود ہی مراد ہیں، نصاریٰ اگر مراد ہوں بھی تو ثانیاً مراد ہوں گے۔ یہ سوال حافظ وغیرہ نے اٹھایا ہے اور اس کا جواب بھی دیا ہے مگر ٹھیک نہیں سمجھا کیونکہ حافظ کا کلام کچھ منضبط اور منقح نہیں ہے اس لئے اس سے تشفی نہیں ہوتی۔ علاوہ بریں نصاریٰ کو مراد لینے پر ایک اشکال اور بھی وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ ہم مان لیتے ہیں کہ نصاریٰ مراد ہیں مگر ہم پوچھتے ہیں کہ جو نصاریٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے ان میں سے کیا چند لوگ بھی ایسے تھے جو [اسلام سے پہلے] صحیح نصرانیت پر قائم رہے ہوں؟ جمہور نصاریٰ تو ابنیت مسیح کے عقیدے پر تھے اور یہ کفر صریح ہے تو کیا ابنیت مسیح کے معتقد کو مومن بالمسیح کہہ سکتے ہیں؟ اگر نہیں کہہ سکتے تو پھر نصاریٰ کا بھی دو نبیوں پر ایمان کہاں متحقق ہوا، ایک ہی ایمان تو رہا، پھر دو اجر کس بات پر ملیں گے؟ [اس صورت میں] جس طرح یہود منکر عیسیٰ ہو کر حدیث کے تحت نہیں آتے، اسی طرح نصاریٰ ابنیت مسیح کے عقیدے کی وجہ سے حدیث کے تحت نہیں آتے، کلاهما سواء۔ ان کو دو اجر ملنا تو درکنار ان کو تو معذب ہونا چاہئے، افسوس اس پر کسی نے توجہ نہیں کی، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہود کے نہ ماننے سے نصاریٰ کا نہ ماننا کچھ کم نہیں۔

یہ ہے اشکال کی تقریر، اب میں پہلے حافظ کا کلام جو کچھ سمجھ سکا ہوں اسے نقل کرتا ہوں، بعد کو وہ تقریر کروں گا جو اس مسئلہ کی بہتر تقریر ہوگی۔ [لیکن پہلے چند باتیں سمجھ لو]

پہلی چیز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب باستثناء ابراہیم علیہ السلام (وفی روایۃ نوح علیہ السلام بھی) اپنی اپنی

---

(۱) قصص: ۵۴

. . . .

قوم کی طرف مبعوث ہوئے، ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ ان کی بعثت عام تھی، یہ منصوص تو کہیں نہیں، لیکن علماء کہتے ہیں، واللہ اعلم ـــــ [ایسی ہی ایک] روایت نوح علیہ السلام کے بارے میں بھی ہے واللہ اعلم ـــــ باقی انبیاء علیہم السلام کی دعوت عام نہ تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت عام تھی تمام اہل عالم کے لئے ـــــ ایک بات تو یہ ہوئی۔

دوسری بات یہ یاد رکھنے کی ہے کہ جس قوم میں جو نبی آیا ہو اس قوم کے ذمہ اس نبی پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کی شریعت میں داخل ہونا ضروری ہے، لیکن اور دوسری قومیں جن کی طرف بعثت نہیں ہوئی اگر انہیں دعوت پہونچ جائے تو بعدِ بلوغ دعوت نبی کی تصدیق کرنا اور اس کی شریعت کو قبول کرنا لازم ہے یا نہیں؟ اس میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن وہ کلام بہت منتشر ہے۔

شاہ صاحب نے اس کو بہت اچھی طرح منضبط کیا ہے اور فرمایا ہے کہ تقی الدین نے لکھا ہے کہ توحید کی دعوت عام ہے اور سب کو اس کا قبول کرنا لازم ہے اور جو قبول نہ کرے گا وہ ہالک ہوگا، لیکن دعوت شرائع کا قبول کرنا لازم نہیں، اگر کوئی کسی دوسری شریعت سماوی کے تحت ہو تو اس پر لازم نہیں کہ اس دعوت شرائع کو قبول کرے، خلاصہ یہ کہ مبعوث علیہم کو تو سب باتیں تسلیم کرنی ہوں گی اور مدعوین کو صرف نبی کی تصدیق کرنا اور توحید کا ماننا لازم ہوگا۔ دخول فی ہذہ الشریعۃ لازم نہ ہوگا بشرطیکہ کوئی شریعت حقہ رکھتے ہوں، اور اگر کوئی شریعت نہ رکھتے ہوں تو اس شریعت کا ماننا بھی توحید کے ساتھ لازم ہوگا۔ یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ عیسیٰ علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے جیسا کہ قرآن نے فرمایا: وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ (۱) دوسری جگہ فرمایا: يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم (۲) پس ان بنی اسرائیل پر تو لازم تھا کہ کل احکام اور تمام شریعت کو جو عیسیٰ علیہ السلام لائے تھے قبول کریں، مگر دیگر ممالک یا اقوام مثلاً ہندوستان یا یورپ والوں کو دعوت نہیں پہونچی تو کوئی سوال ہی نہیں اور اگر دعوت پہونچی تو توحید کا قبول کرنا لازم، لیکن شریعت کا قبول کرنا لازم نہیں، جیسے ہم ہیں کہ تصدیق کرتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کی مگر ان کی شریعت کا التزام نہیں کرتے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے اطراف عالم میں اپنے حواریوں کو بھیجا تھا، چین، اٹلی قسطنطنیہ بھی اپنے حواری بھیجے تھے اور انگریزوں نے تحقیق کی ہے کہ مدراس میں بھی دو حواری عیسیٰ علیہ السلام کے پہونچے تھے۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ملوک کو خطوط لکھے تو یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ میں انہیں اسی طرح بھیجتا ہوں جس طرح مسیح علیہ السلام نے اپنے حواری بھیجے تھے، تو بنی اسرائیل پر مسیح علیہ السلام کی تمام جزئی و کلی کا تسلیم کرنا لازم تھا اور مدعوین پر صرف

---

(۱) آل عمران: ۴۹ ـ (۲) صف: ۶

. . . .

توحید کا اقرار اور پیغمبر کا اقرار ضروری تھا بشرطیکہ [پہلے سے کسی] شریعت حقہ پر ہوں ، ورنہ ان پر بھی بنی اسرائیل کی ہی طرح سب کا قبول کرنا لازم ہوگا۔

شاہ صاحب نے اسی طرح [مسئلہ کو منقح] مرتب کیا ہے اگرچہ بعض اور علماء نے اسے تسلیم نہیں کیا ہے۔

اب آگے چلئے ! اصل قصہ حضرت عبداللہ ابن سلام وغیرہ کا ہے، یہ عبداللہ ابن سلام سیدنا یوسف علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، ان کے اجداد کسی زمانہ میں شام میں رہتے تھے، جب بخت نصر نے حملہ کیا اور بہتوں کو پکڑ کر لے گیا تو ان کے اجداد شام سے بھاگ کر مدینہ طیبہ پہونچے اور انھیں یہاں رہتے صدیاں گذر گئیں تو اب یہ مثل بنی اسرائیل کے نہ رہے، تھے تو وہ نسل اسرائیل ہی سے مگر مرورِ زمانہ اور بعد وطن کے باعث وہ ان سے کٹ گئے تھے اور وہ ان لوگوں کے مثل ہوگئے تھے جن کی طرف عیسیٰ علیہ السلام مبعوث نہیں ہوئے تھے، یہ بالکل اجنبی سے ہوگئے تھے، لہٰذا مبعوث علیہم میں داخل نہ رہے۔ اب ہم کہتے ہیں کہ ممکن ہے عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے سواری مدینہ طیبہ بھی بھیجے ہوں اور انھوں نے تصدیق کی ہو، کیونکہ وفاء الوفاء میں لکھا ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک پتھر پایا گیا تھا جس میں لکھا تھا: اَنَا رَسُوْلُ رَسُوْلِ اللّٰہِ عِیْسیٰ. طبری نے بھی اسے لیا ہے مگر اس میں ہے: اَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ، ایک رسول حذف ہوگیا ہے، اور وفاء الوفاء میں پورا ہے؛ قادیانی اسی کو لے اڑا کہ دیکھو اس سے معلوم ہوا کہ مسیح مر چکے، تو آنا ثابت ہے مگر دخول فی المدینۃ ثابت نہیں، اور جب وقت پہونچ چکی تو بہت ممکن ہے انھوں نے تصدیق بھی کی ہو، مگر چونکہ وہ شریعت حقہ موسویہ پر قائم تھے اس لئے ان پر قبول شریعت عیسویہ لازم نہیں رہی، کیونکہ وہ اب مثل اجنبی کے ہوگئے، اب صرف تصدیق مسیح و اقرار توحید ان کے ذمہ ہے، اس لئے وہ رہے تو یہودی ہی، مگر تصدیق کی عیسیٰ علیہ السلام کی، تو اب ان کا ایمان موسیٰ علیہ السلام پر معتبر و معتد بہ و مقبول ہے، بشرطیکہ تحریف نہ کی ہو، ان کے احوال سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کی ضرور تصدیق کی ہوگی کیونکہ انھوں نے صرف حضور کے چہرہ کو دیکھ کر کہا تھا: هٰذَا الْوَجْهُ لَيْسَ بِوَجْهِ كَذَّابٍ، یہ چہرہ جھوٹے کا چہرہ ہر گز نہیں. تو ایسے شخص کے حق میں ہمارا حسن ظن یہی ہے کہ ضرور تصدیق کی ہوگی اور کہیں انکار ثابت نہیں۔ ایک روایت آئی ہے لیکن وہ ثابت نہیں۔

حاصل یہ کہ آیۃ کا مصداق عبداللہ ابن سلام ہیں کیونکہ ان کا ایمان موسیٰ علیہ السلام پر معتبر ہے، مگر پھر بھی یہ اشکال باقی ہے اس لئے کہ اگرچہ ایک ابن سلام مومن تھے مگر عام یہود تو اس میں نہیں آسکتے۔ اسی طرح نصاریٰ اصل دین پر قائم نہیں رہے تھے، سب نے تحریف پر چلنا شروع کر دیا تھا۔ ایسے ہی یہود محرّف دین پر چلتے تھے، کہتے تھے: اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَاءُ۔(1) (اللہ فقیر ہے

---

(1) آل عمران : ۱۸۱

اور ہم غنی ہیں) نیز کہا: يَدُ اللهِ مَغْلُولَةٌ ۔[۱] (اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں) پھر ایسے کتابیوں کو دوہرا اجر کس چیز کا ملے گا؟

طیبی نے کہا: ان کا ایمان اگرچہ نافع اور معتبر نہیں لیکن حضور پر ایمان کی برکت سے اللہ نے انھیں یہ اجر دے دیا، جیسے مسلم کے وہ اچھے کام جو حالت کفر میں کئے تھے وہ محسوب ہو جاتے ہیں، اسی طرح یہ اسلام کو نافع نہ تھا مگر بہ برکت نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم وہ بھی معتبر ہو گیا اور راز اس کا یہ ہے کہ جو حضور پر ایمان لاتا ہے وہ موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر بھی صحیح ایمان لاتا ہے، اس لئے اب اس کے ایمان سابق کی بھی تصحیح ہو گئی۔

مگر سچی بات یہ ہے کہ ان سب تقریروں میں تکلفات بہت ہیں اور ہمیں اس سے تشفی نہیں ہوتی۔ اب میں وہ تقریر کرتا ہوں جس کا وعدہ کیا تھا: —— میرے نزدیک نہ ضرورت تخصیص کی ہے اور نہ کسی کو نکالنے کی، نہ یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کا ایمان معتبر تھا، بلکہ اس کو یوں ہی ظاہر پر رکھو، مگر اشکال کا حل سننے سے پہلے ایک مقدمہ سمجھ لو، وہ یہ کہ کسی مامور بہ کے ساتھ قوی موانع وعوائق لگے ہوئے ہوں جو اس کی ادائیگی کی راہ میں حائل ہوں اور ایک صاحب ہمت آدمی ان موانع کی پروا کئے بغیر اپنے عزم پر جا رہے، اور مامور بہ کو پوری طرح بجالائے تو ظاہر ہے کہ ایسا آدمی بہت زیادہ ستائش کا مستحق ہے [اور اس مامور بہ پر عمل کرنا نہایت اہم بات ہے] اور اگر معاملہ اجر کا آجائے تو یقیناً [ایسا آدمی] اجر عظیم کا مستحق ہوگا، مثلاً ایک فارغ آدمی نماز پڑھتا ہے تو وہ حق واجب اس طرح ادا کرتا ہے کہ اسے ادائیگی کے مواقع حاصل ہیں، ایسی صورت میں یہ بڑا کمال نہیں ہے، لیکن اس کے مقابل میں ایک وہ ہے کہ تمام دنیا کی فکریں اس کو لاحق ہیں اور وہ خون پسینہ ایک کرکے روزی کماتا ہے اور جب نماز کا وقت آتا ہے تو یہ تمام موانع کے ہوتے ہوئے حکم بجالانے کو مستعد ہوتا ہے اور نماز کی پوری پابندی کرتا ہے، تو یہ بلاشبہہ اس پہلے فارغ آدمی کے مقابلہ میں زیادہ تعریف کا مستحق ہے، اب اگر ان دونوں کے اجر میں مالک حقیقی فرق کرے اور اس دوسرے کو زیادہ [اجر] مرحمت فرمائے تو کسی طرح خلاف عقل نہیں، بلکہ عین مقتضائے عقل ہے۔

یا مثلاً ایک امیر و خوش حال کا روزہ ہے اور [ایک] غریب محنتی کسان کا، کہ امیر کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں، اس لئے کہ وہ خوش حال ہے مطمئن ہے، مشقت نہیں کرنی پڑتی، برخلاف اس محنتی کسان کے، کہ اس کے لئے بہت سے موانع ہیں، پس اگر وہ ان موانع پر غالب آتا ہے اور پوری محنت کے ساتھ مظاہرۂ عبدیت کرکے روزہ رکھتا ہے تو بیشک یہ زیادہ اجر کا مستحق ہوگا، نظیر اس کی وہ حدیث ہے جس میں اس تلاوت قرآن کرنے والے کا ذکر ہے جو تتلاتا ہے [یا جو رک رک کر پڑھتا ہے] اور پڑھنے میں [اس کو] بہت مشقت ہوتی ہے

(۱) مائدہ: ۶۴

گردہ ہے کہ لگا ہوا ہے، خوب محنت سے بنا کر پڑھنے کی کوشش کرتا ہے (یقرأ ویتتعتع) تو اس کے لئے دوہرا اجر ہے، فرمایا: فلہ اجران
ایک ظاہر بیں کو اس کے عمل میں اور صاف صاف بلا تعب و مشقت پڑھنے والے کے عمل میں کوئی فرق محسوس نہ ہوتا ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ اس
معذور تتلانے والے اور مشقت کے ساتھ پڑھنے میں اور اس صاف زبان والے کے پڑھنے میں فرق ہے، سب مانتے ہیں کہ چونکہ اسے مشقت
زیادہ ہوتی ہے اور یہ محنت کر کے اس پر غالب آتا ہے تو اس کو یقیناً دوہرا اجر ملنا ہی چاہئے۔ کوئی بھی عقل والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ دونوں برابر ہیں

اس مقدمے کے بعد سمجھو کہ حدیث میں تین چیزیں بتلائی ہیں۔ اول اَلعَبدُ المَملوکُ اِذَا اَدّٰی حَقَّ اللّٰہِ وَحَقَّ
مَوَالِیہِ۔ ایک غلام کو ایک طرف یہ فکر لاحق ہے کہ اپنے آقا کا حکم بجالائے اور دوسری طرف یہ بھی فکر ہے کہ اپنے اصلی مالک کا حکم بجالائے،
اور وہ ان دونوں کو نباہتا ہے اور مشقت برداشت کرتا ہے، ظاہر ہے اس میں تعب زیادہ ہے اور اس کی محنت و مشقت اس آزاد
شخص سے کہیں زیادہ ہے جو ہر طرح راحت میں ہے، اس کو صرف ایک ہی حق ادا کرنا ہے اور وہ اللہ کا حق ہے، مگر عبد مملوک کو ڈبل حق ادا کرنا ہے
اس لئے وہ زیادہ اجر کا مستحق ہے، یہاں دو چیزیں ہیں، ایک حق مولیٰ اور ایک حق اللہ، تو یہاں مانع موجود ہے، مگر اس نے ہمت کی اور
دونوں کے حقوق ادا کئے تو اسے دوگنا ملنا ہی چاہئے، اب یہ بات صاف ہو گئی کہ جو حق موانع اور مزاحمتوں کے باوجود ادا کیا جائے اور موانع کا
مقابلہ کیا جائے، بس اس میں دوہرا اجر ہے، لہٰذا اس لفظ کو مخصوص کر دو اور نہ بالکل عام کر دو، بلکہ یوں کہو کہ جہاں موانع ہوں پھر بھی وہ اسے
ادا کرے اور کوتاہی نہ ہونے دے وہاں دوہرا اجر ہے۔

دوسرا جزء حدیث کا یہ ہے: وَرَجُلٌ کَانَت عِندَہُ اَمَۃٌ الخ باندی زیر دست ہے، مجبور ہے مگر اس نے
[اس کے ساتھ] احسان کیا اور تعلیم و تربیت سے اس کو آراستہ کیا، مہذب بنایا اور پھر بجائے اس کے کہ مقید رکھتا آزاد کر دیا، آزاد جو کرتا ہے
وہ اجر حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے — آزاد کرنے کے بعد یہ چیز عار سمجھی جاتی تھی کہ آزاد کر کے خود ہی نکاح کر لے، کیونکہ بظاہر پھر قید میں
لا رہا ہے اور اس میں حظ نفس بھی ہے، یہ کام تو کیا تھا ثواب و عبادت کے لئے، پھر حظ نفس حاصل کر رہا ہے، اسی خیال کی بنا پر خراسانی
نے [شعبی سے وہ بات کہی تھی] اور عبد اللہ ابن مسعود سے باسناد صحیح ثابت ہے کہ انھوں نے اس کو کالراکب بدنتہ کہا ہے، نیز انس
ابن مالک اور کئی صحابہ سے بھی یہ منقول ہے اور وہ لوگ اسے برا سمجھتے تھے، شاید انھیں یہ حدیث نہیں پہونچی تھی، وہ لوگ کہتے تھے کہ حدیث
میں ہے العائد فی ھبتہ کالعائد فی قیئہ (ہبہ کر کے لوٹانے والا ایسا ہے جیسے کوئی قے کر کے اسے چاٹے) تو یہ ان کی نگاہ میں
معیوب فعل تھا کہ آزاد کر کے کوئی نکاح کر لے، یہ ایک بڑا مانع تھا کہ سوسائٹی میں بری نظر سے دیکھا جائے گا، مگر اس نے کچھ پرواہ نہیں کی،
برادری اور قوم کی طعنہ زنی سے بے نیاز ہو کر اس پر مزید یہ احسان کیا کہ موانع کے باوجود اس سے نکاح کر لیا، ایک پہلا احسان تو یہ کیا کہ

پڑھایا لکھایا، پھر آزاد کیا، اور دوسرا احسان یہ کیا کہ شرف زوجیت بخشا، تو یہ احسان بالائے احسان ہے، یہ بات نہیں ہے کہ اس کو مقید کر دیا وہ ثواب برابر کی ہوگئی: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ[1] (اور عورتوں کا بھی حق ہے (مردوں پر) جیسا کہ مردوں کا ان پہ حق ہے دستور کے موافق) تو اب دوگنا اجر یوں ملے گا کہ ایسا کرنے میں لوگ اس کو برا کہیں گے، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسی بدعت کو چھوڑے اور اہل بدعت اس پر ملامت کریں مگر وہ آدمی ملامت کی پرواہ کئے بغیر اس بدعت کو چھوڑے ہی رکھے اور لَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ[2] کا مصداق بن جائے، تو کیا وہ مزید ثواب کا مستحق نہ ہوگا۔

یہ مقدمہ ذہن میں رکھ کر اب اصل مسئلہ سنئے: میں کہتا ہوں کہ جو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا وہ اسے حق سمجھتا ہے اور حق سمجھ کر ایمان لایا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے بھی موسیٰؑ اور ان کی شریعت کی تصدیق کی، قرآن نے کہا: إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ج يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ ج فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا ط وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ[3] (ہم نے توراۃ اتاری جس میں ہدایت اور روشنی ہے، اس پر حکم کرتے تھے پیغمبر جو حکم بردار تھے اللہ کے اور حکم کرتے تھے درویش اور عالم، اس واسطے کہ وہ نگہبان ٹھہرائے گئے تھے اللہ کی کتاب پر اور وہ اس کی خبر گیری پر مقرر تھے، سو تم نہ ڈرو لوگوں سے اور مجھ سے ڈرو اور مت خریدو میری آیتوں پر مول تھوڑا، اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے اتارا سو وہی لوگ کافر ہیں)

جب توراۃ کی جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی ہر طرح تصدیق و تائید ہوگئی تو جو اس پر ایمان لایا اس کی تصدیق و تائید بھی قرآن سے ہوگئی، پھر اس کے لئے یہ ماننا کتنا مشکل ہے کہ جب تک نبی آخر الزمان پر ایمان نہ لائے گا اس وقت تک اس کی نجات نہ ہوگی، بلکہ وہ مخلد فی النار ہوگا، اس سے یہ کہا جائے تو ان الفاظ کو سن کر اس پر کتنا شاق گذرے گا اور سوچے گا کہ اس کی شریعت اور اس کا نبی نجات دلانے کے لئے کافی نہیں ہے؟ انسانی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اسے اپنی اور اپنے نبی کی اہانت سمجھے گا کہ اس کا نبی اور اس کی شریعت نجات دلانے کے لئے کافی نہ ہو، اس لئے جو موسیٰ علیہ السلام یا عیسیٰ علیہ السلام کو مانتا ہے مع قطع النظر عن صحتہ اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام اور تورات و انجیل کی تصدیق فرما رہے ہیں، تو اب اس پر کیا گذرے گی جب اس سے کہا جائے کہ یہ سب کچھ بھی

---

(۱) بقرہ : ۲۲۸ (۲) مائدہ : ۵۴ (۳) مائدہ : ۴۴

. . . .

مگر تجھے نجات نہ ملے گی جب تک کہ تو ان نبی آخر الزماں پر ایمان نہ لائے، یہ بات یقیناً اس پر بہت شاق گذرے گی، مگر اس نے ہمت سے کام لیکر طبیعت کے تقاضے کے خلاف حضورؐ کو مان لیا اور ان پر ایمان لایا، اس لیے کہ وہ بشارات سن چکا تھا، پھر اس نے کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں کی اور سچے دل سے حضورؐ پر ایمان لایا تو اسے دوہرا اجر ملے گا دو کاموں پر نہیں صرف ایک ہی کام پر دوہرا اجر ہے ــــ میں کہتا ہوں کہ اگر یہود و نصاریٰ کے یہاں تحریف نہ ہوئی ہو [اور غیر محرف شریعت پر ہی ان کا ایمان ہو] تب بھی ان کا ایمان کافی نہیں، تاوقتیکہ حضورؐ پر ایمان نہ ہو، تو چونکہ ایک امر مطلوب کے ساتھ ایک مانع قوی موجود ہے جو روک رہا ہے اور ہٹا رہا ہے اور وہ شخص سب پر غالب آکر امر مطلوب کو ادا کرتا ہے تو ضرور دوہرے اجر کا مستحق ہے۔

اور یہ فطری چیز ہے کہ آدمی اپنے نبی اور پیر کو سب سے اعلیٰ و ارفع سمجھتا ہے، چنانچہ میں اپنی دلی بات کہتا ہوں کہ میں نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی تو اب کوئی کتنا ہی بڑا کیوں نہ آجائے ہرگز اس کی طرف توجہ نہیں ہو سکتی خصوصاً جب کہ وہ شیخ الہند کی بہت سی تعریفیں بھی کردے، تو ایسے ہی یہاں یہ فطری بات تھی [کہ موسیٰؑ و عیسیٰؑ پر ایمان لانے کے بعد دوسرے نبی پر ایمان لانا شاق ہو] مگر اس مومن نے مستقل مزاجی اختیار کرلی اور وساوس کی پرواہ نہ کی، تو اسے دوہرا اجر ہے۔

قرآن پاک کے الفاظ ہیں: يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا. یعنی جمے رہے، نفس کو روکے رکھا، لوم وطعن کی پرواہ نہ کی، وساوس شیطانیہ پر غالب رہے اس لئے دو اجر ہیں۔

تو اب یہ کہنا درست نہیں کہ ایک اجر اپنے نبی پر ایمان لانے کا اور دوسرا ایمان بالنبی الامی کا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایمان بالنبی الامی ہی پر دو اجر ہیں کہ باوجود موانع کے موانع پر غالب آکر حضورؐ پر ایمان لے آیا، اس میں کسی کی تخصیص نہیں، نہ یہود کی، نہ نصاریٰ کی، نہ توراۃ کی نہ انجیل کی۔

اب یہاں پر تھوڑا سا کلام شیخ اکبر کا جو آیت سے متعلق ہے پیش کرتا ہوں ؎

تمتع زہر گوشۂ یافتم ✿ زہر خرمنے خوشۂ یافتم

شیخ اکبر کہتے ہیں کہ جو کسی پیغمبر پر ایمان لایا ہے اس پر لازم ہے کہ حضور پر بھی ایمان اجمالی لائے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے بھی بشارت دی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام اور تمام انبیاء نے بھی، تو اجمالاً حضور پر ایمان لازم ہے، جو شخص عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا وہ اس بات پر بھی ایمان لائے گا کہ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ اَحْمَدُ ط[1] (میں اپنے بعد ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں

---

(۱) صف : ۶

جن کا نام احمد ہے، صلی اللہ علیہ وسلم) تو جو کسی ایک نبی پر ایمان رکھتا ہے اس کے دو ایمان ہیں، ایک تفصیلی جو اس کا اپنے پیغمبر پہ ہے، اور ایک اجمالی وہ جو منطوی ہے تفصیلی میں، قرآن میں ہے: وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا [1] (اور یاد کرو جب ہم نے نبیوں سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب و حکمت دوں پھر تمھارے پاس رسول امی آئے جو تمھارے پاس والی کتاب کی تصدیق کر رہا ہو تو تم اس پر ضرور ضرور ایمان لانا اور ضرور ضرور ان کی مدد کرنا، کیا تم نے اقرار کر لیا اور تم نے میرا عہد قبول کر لیا؟ انھوں نے کہا ہم نے اقرار کر لیا)

آگے وعید ہے: فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ [2] (جو کوئی بھی اس کے بعد روگردانی کرے گا تو وہی فاسق ہوگا) ـــــ تو جس کے حق میں سارے نبیوں سے اور امتوں سے اقرار لیا گیا ہے اس اقرار پر تو سب کا ایمان ضرور ہی ہوگا، لہٰذا اجمالاً نبی امی پر ایمان ضروری ہوا، اب جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے سارے انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کی: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ [3] (رسول اس پر ایمان لائے جو ان پر ان کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا اور ایمان والے بھی ایمان لائے، سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، ہم رسولوں میں سے کسی ایک کی بھی تفریق نہیں کرتے)

تو حضور پر جو ایمان لایا وہ تفصیلی ایمان ہوا اور اس کے ضمن میں اجمالاً تمام انبیاء علیہم السلام پر بھی ایمان لانا ہوا اس لئے کہ وہ سب انبیاء مبشر تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصدِّق ـــــ اس کے بعد سنو کہ شیخ اکبر کہتے ہیں کہ یہ کتابی جو حضور پر ایمان لایا اس کا ہر ایک ایمان دو ایمانوں پر مشتمل ہے، پہلے اپنے نبی پر ایمان لایا تو یہ تفصیلاً اپنے نبی پر اور اجمالاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ہوا اور جب حضور پر ایمان لایا تو یہ تفصیلاً حضور پر ہوا اور اجمالاً تمام انبیاء پر، اب پڑھو: اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ [4] یعنی وہ کہتے ہیں کہ ہم تو پہلے ہی سے مطیع ہیں، تو ان کا ایمان دو ایمانوں پر مشتمل ہے، اس لئے فرمایا: اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ [5] اب یہ نکتہ بھی معلوم ہو گیا کہ مَرَّتَيْنِ کیوں کہا؟ اَجْرَيْنِ کیوں نہ کہا؟ اس لئے کہ ان کا ایمان دو بار تھا، حدیث میں چونکہ الفاظ میں کچھ فرق ہے اس لئے یہ توجیہ حدیث پر چسپاں نہیں۔

---

(۱) آل عمران: ۸۱ (۲) آل عمران: ۸۲ (۳) بقرہ: ۲۸۵ (۴) قصص: ۵۲، ۵۳ (۵) قصص: ۵۴

باب ۷۴ عِظَةِ الْاِمَامِ النِّسَاءَ وَتَعْلِيْمِهِنَّ

امام کا عورتوں کو نصیحت کرنا، ان کو (دین) کی باتیں سکھانا۔

۹۷ - حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ عَنْ اَيُّوْبَ قَالَ سَمِعْتُ

ہم سے سلیمان ابن حرب نے بیان کیا، کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا، انھوں نے ایوب سے،

عَطَاءَ بْنَ اَبِيْ رَبَاحٍ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ قَالَ اَشْهَدُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

کہا میں نے عطار ابن ابی رباح سے سنا، کہا میں نے ابن عباس سے سنا، انھوں نے کہا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر

اَوْ قَالَ عَطَاءٌ اَشْهَدُ عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ وَمَعَهُ

گواہی دیتا ہوں، یا عطار نے کہا میں ابن عباس پر گواہی دیتا ہوں (راوی کو شک ہے) کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

بِلَالٌ فَظَنَّ اَنَّهُ لَمْ يُسْمِعِ النِّسَاءَ فَوَعَظَهُنَّ وَاَمَرَهُنَّ بِالصَّدَقَةِ فَجَعَلَتِ الْمَرْاَةُ تُلْقِيْ

(مردوں کی صف سے) نکلے اور آپ کے ساتھ بلال تھے، آپ کا خیال ہوا کہ عورتوں تک میری آواز نہیں پہونچی، پھر

الْقُرْطَ وَالْخَاتَمَ وَبِلَالٌ يَاْخُذُ فِيْ طَرَفِ ثَوْبِهِ وَقَالَ اِسْمٰعِيْلُ عَنْ اَيُّوْبَ عَنْ

آپ نے عورتوں کو نصیحت کی اور ان کو خیرات کرنے کا حکم دیا، کوئی عورت اپنی بالی پھینکنے لگی، کوئی انگوٹھی، اور

عَطَاءٍ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ اَشْهَدُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

بلال نے اپنے کپڑے کے کونے میں (یہ خیرات) لینا شروع کی، اس حدیث کو اسمٰعیل بن عتبہ نے ایوب سے روایت کیا، انھوں نے عطار سے کہ ابن عباس نے یوں کہا کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر گواہی دیتا ہوں (اس میں شک نہیں ہے)

---

(۷۴) باب عظة الامام النساء وتعليمهن

ترجمہ یہ رکھا کہ امام عورتوں کو تعلیم دے تو ممنوع نہیں، یعنی خاص طور پر عورتوں کے لئے مجلس وعظ منعقد کی جائے، تو یہ بھی ثابت ہے اور ہونا چاہیے۔

حدیث: ۹۷، قولہ اشھد الخ اشھد میں شک ہے کہ عطار نے کہا اشھد علی ابن عباس یا ابن عباس نے کہا اشھد علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، بعض روایات میں ہے کہ دونوں نے کہا اور اشھد کا لفظ دونوں جگہ موجود ہے۔

باب ۷۵ الحرص علی الحدیث

حدیث کے لئے حرص کرنا

۹۸ ـ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِیْزِ بْنُ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ حَدَّثَنِیْ سُلَیْمَانُ عَنْ
ہم سے عبدالعزیز ابن عبد اللہ نے بیان کیا، کہا مجھ سے سلیمان نے بیان کیا، انھوں نے عمرو ابن ابی عمرو کے
عَمْرِو بْنِ اَبِیْ عَمْرٍو عَنْ سَعِیْدِ بْنِ اَبِیْ سَعِیْدِ الْمَقْبُرِیِّ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّہٗ قَالَ
انھوں نے سعید ابن ابوسعید مقبری سے، انھوں نے ابوہریرہ سے، انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! قیامت کے دن
قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مَنْ اَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِكَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ
آپ کی شفاعت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہوگا (کس کی قسمت میں یہ نعمت ہوگی؟) آپ نے فرمایا: ابوہریرہ: میں جانتا تھا
صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَقَدْ ظَنَنْتُ یَا اَبَا ھُرَیْرَۃَ اَنْ لَّا یَسْأَلُنِیْ عَنْ ھٰذَا الْحَدِیْثِ اَحَدٌ
کہ تجھ سے پہلے کوئی یہ بات مجھ سے نہیں پوچھے گا۔ کیونکہ میں دیکھتا ہوں تجھے حدیث سننے کی کیسی حرص ہے (اب سن لے)
اَوَّلُ مِنْكَ لِمَا رَأَیْتُ مِنْ حِرْصِكَ عَلَی الْحَدِیْثِ اَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ
سب سے زیادہ میری شفاعت کا نصیب ہونا اس شخص کے لئے ہوگا جس نے اپنے دل سے یا اپنے جی کے خلوص کے ساتھ
مَنْ قَالَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ خَالِصًا مِّنْ قَلْبِہٖ اَوْ نَفْسِہٖ
لا الٰہ الا اللہ کہا ہو۔

قولہ خرج معہ بلال فظن انہ لم یسمع النساء فوعظھن وامرھن بالصدقۃ۔ خَرَجَ کا مطلب یہ ہے کہ عید کی نماز پڑھ کر نکلے اور، چونکہ عورتیں پیچھے تھیں اس لئے انھوں نے نہیں سنا، اس لئے آپ ان کے پاس گئے اور وعظ ونصیحت کی، صدقہ کا حکم اس لئے دیا کہ کفرانِ عشیر وغیرہ بہت کرتی ہیں کما فی الحدیث۔ اس لئے عذاب سے بچانے کے لئے یہ حکم دیا، کیونکہ الصدقۃ تطفئ غضب الرب (صدقہ رب کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ وَعَظَھُنَّ سے وعظ اور اَمَرَھُنَّ سے تعلیم احکام مراد ہے۔ قُرط: بالی یا بندیاں وغیرہ جو کان کی لو میں پہنی جائیں۔

(۷۵) باب الحرص علی الحدیث

حدیث: ۹۸ ـ قولہ من اسعد الناس یعنی [آپ کی شفاعت کا سب سے زیادہ اہل کون ہے؟[1]]

---

(۱) یہاں جامع تقریر صحیح طور پر حضرت استاذ کے الفاظ کا مفہوم ادا نہیں کرسکے۔

باب ٧٦ كيف يُقبضُ العِلمُ وكتب عُمرُ بن عبدِ العزيزِ إلى أبي بكرِ بنِ حزمٍ انظُر

علم کیونکر اٹھ جائے گا؟ اور عمر ابن عبد العزیز (خلیفہ) نے ابوبکر ابن حزم (مدینہ کے قاضی) کو

ما كان من حديثِ رسولِ اللهِ صلَّى اللهُ عليهِ وسلَّمَ فاكتُبهُ فإنّي خفتُ دُرُوسَ

لکھا: دیکھو! جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں تم کو ملیں ان کو لکھ لو۔ میں ڈرتا ہوں (کہیں دین کا) علم مٹ

العِلمِ وذهابَ العُلماءِ ولا تقبلْ إلّا حديثَ النّبيّ صلَّى اللهُ عليهِ وسلَّمَ وليُفشُوا العِلمَ

نہ جائے اور عالم چل بسیں اور یہ خیال رکھو وہی حدیث ماننا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہو (نہ اور کسی کا قول

وليجلسُوا حتّى يُعلَّمَ من لا يعلمُ فإنّ العِلمَ لا يهلِكُ حتّى يكونَ سِرًّا

یا فعل) اور عالموں کو علم پھیلانا چاہیے، تعلیم کے لئے بیٹھنا چاہیئے، کہ جس کو علم نہیں وہ علم حاصل کرلے، اس لئے کہ علم جہاں پوشیدہ رہا، بس مٹ گیا۔

قولہ من قال لا الٰہ الا اللہ۔ مراد یہ ہے کہ جو موحد خالص ہے اور شرک سے بالکل خالی ہے وہ اسعد ہے، بعض روایات میں ہے کہ اسعد النّاس بشفاعتی وہ ہیں جو مرتکب کبائر ہیں، جیساکہ فرمایا شفاعتی لاھل الکبائر من امتی۔ میری شفاعت میری امت کے مرتکب کبیرہ لوگوں کے لئے ہوگی، یہاں عمل کا ذکر نہیں ہے، تو یوں کہا جائے گا کہ فرق مراتب ملحوظ ہوگا، جس کے اندر جتنی چیزیں ہوں گی اسی کے اعتبار سے آپ شفاعت فرمائیں گے [شفاعتیں کئی ایک ہیں] ایک شفاعت ہول محشر سے [نجات کے لئے]، ایک قبل دخول نار کے، اور ایک بعد دخول کے ہوگی۔ مسلم شریف میں ہے کہ بعض ایسے ہوں گے جن کے پاس عمل بالکل نہ ہوگا، اور اللہ تعالیٰ صرف اپنے دست قدرت سے انھیں دوزخ سے نکالیں گے اور اس میں تصریح ہے کہ وہ قائلین لا الٰہ الا اللہ ہوں گے، ظاہر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بغیر شفاعت نبوی کے نجات پاجائیں گے، مگر یاد رہے کہ وہ بھی نکالے جائیں گے شفاعت نبوی ہی سے۔ کیونکہ تصریح ہے کہ حضورؐ عرض کریں گے کہ اے اللہ کوئی نہیں رہا سوائے ان لوگوں کے جو لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہیں، اس پر اللہ فرمائے گا کہ اب انھیں میں نکالوں گا بہرحال وہ نکالے جائیں گے شفاعت نبوی ہی سے، اگرچہ ان کو اللہ تعالیٰ اپنے ید قدرت سے نکالے گا۔

(٧٦) باب کیف یقبض العلم الخ

[امام بخاری علم اٹھائے جانے کی کیفیت بتانا چاہتے ہیں کہ] علم کیسے اٹھایا جائے گا؟ ایک صورت تو یہ ہے کہ سینوں سے علم نکال لیا جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ کتابوں سے حروف مٹا دئے جائیں، تو یہ دونوں صورتیں نہ ہوں گی، بلکہ اس کی تیسری صورت ہوگی اور وہ یہ کہ علماء اٹھالئے جائیں گے۔

۹۹ ۔ حَدَّثَنَا الْعَلَاءُ بْنُ عَبْدِ الْجَبَّارِ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ مُسْلِمٍ عَنْ

ہم سے علاء ابن عبد الجبار نے بیان کیا، کہا ہم سے عبد العزیز ابن مسلم نے بیان کیا، انھوں نے

عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ بِذٰلِكَ يَعْنِي حَدِيثَ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ إِلَى قَوْلِهِ ذَهَابَ الْعُلَمَاءِ

عبد اللہ ابن دینار سے، انھوں نے عمر ابن عبد العزیز کا یہ قول بیان کیا یہاں تک " اور عالم چل بسیں "۔

۱۰۰ ۔ حَدَّثَنَا إِسْمٰعِيلُ بْنُ أَبِي أُوَيْسٍ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ

ہم سے اسمٰعیل ابن اویس نے بیان کیا، کہا مجھ سے امام مالک نے بیان کیا، انھوں نے ہشام ابن عروہ سے

بْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ

انھوں نے اپنے باپ سے، انھوں نے عبد اللہ ابن عمرو ابن العاص سے۔ کہا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ

آپ فرماتے تھے، اللہ (دین کا) علم بندوں سے چھین کر نہیں اٹھائے گا بلکہ عالموں کو اٹھا کر علم کو

الْعِبَادِ وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ

اٹھالے گا

ابوبکر ابن محمد ابن عمرو ابن حزم والی مدینہ تھے اور چونکہ مدینہ گہوارہ تھا علوم نبویہ کا، اس لئے انھیں لکھا کہ حضورؐ کی جس قدر احادیث ملیں ان سب کو لکھوا لو۔ یہ ۹۹ھ کا واقعہ ہے۔

قولہ فانی خفت دروس العلم، یعنی میں اندیشہ کرتا ہوں کہ علم مندرس نہ ہو جائے اور علماء اٹھ نہ جائیں، تو آگے کو سلسلہ چلنا مشکل ہو جائے گا، چنانچہ اس اولیت کا شرف عمر ابن عبد العزیز کو ملا، بعض روایات میں ہے کہ علاوہ ابوبکر کے اور حکام کو بھی لکھا، چنانچہ بصرہ، کوفہ، شام، خراسان، رے میں جو اہل علم تھے سب نے حدیثیں جمع کیں، ابن جریج نے مکہ میں حماد ابن سلمہ نے بصرہ میں، امام مالک نے مدینہ میں حدیثیں مدوّن کیں، مگر سب سے پہلے قوم کو جو کتاب ملی وہ زہری کی کتاب تھی (پورا واقعہ تدوین حدیث کی بحث میں گذر چکا)

کتابت سے روکنے کے [جو بعض اقوال منقول ہیں] اس کی حقیقت اتنی ہے کہ جو حفظ کر سکتے تھے [ان کو اجازت نہ تھی اسلئے کہ] انھیں کتابت کی ضرورت نہ تھی۔

اور بعضوں نے کہا کہ جن کی کتابت پر [عدم مہارت یا کما حقہ ضبط نہ کر سکنے کی بنا پر] اعتماد نہ تھا، ان کو منع فرمایا، اور جن پر اعتماد تھا جیسے عبد اللہ ابن عمرو ابن العاص، ان کو اجازت تھی، بہرحال کتابت حدیث ثابت ہے، امت کا اس پر عمل رہا ہے، بلکہ بعض

حَتّٰی اِذَا لَمْ یُبْقِ عَالِمٌ اتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُسًا جُهَّالًا فَسُئِلُوْا
جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار (پیشوا) بنالیں گے۔ ان سے مسئلہ پوچھیں گے، وہ بے علم
فَاَفْتَوْا بِغَیْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا۔
فتویٰ دیں گے، آپ بھی گمراہ ہوں گے اور (دوسروں کو بھی) گمراہ کریں گے۔

قَالَ الْفِرَبْرِیُّ نَا عَبَّاسٌ قَالَ ثَنَا قُتَیْبَةُ قَالَ حَدَّثَنَا جَرِیْرٌ عَنْ هِشَامٍ نَحْوَهٗ.
فربری نے کہا: ہم سے عباس نے بیان کیا، کہا ہم سے قتیبہ نے کہا ہم سے جریر نے انھوں نے ہشام سے مانند اس کے۔

باب ۷۷ هَلْ یُجْعَلُ لِلنِّسَاءِ یَوْمًا عَلٰی حِدَةٍ؟
کیا امام عورتوں کی تعلیم کے لئے کوئی علیحدہ دن مقرر کر سکتا ہے؟

۱۰۱ ـ حَدَّثَنَا اٰدَمُ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ قَالَ حَدَّثَنِی ابْنُ الْاَصْبَهَانِیِّ قَالَ
ہم سے آدم نے بیان کیا، کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا، کہا مجھ سے عبدالرحمان ابن عبداللہ اصبہانی نے
سَمِعْتُ اَبَا صَالِحٍ ذَكْوَانَ یُحَدِّثُ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ النِّسَاءُ لِلنَّبِیِّ
کہا میں نے ابو صالح ذکوان سے سنا، وہ ابو سعید خدری سے روایت کرتے تھے، عورتوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا
صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ غَلَبَنَا عَلَیْنَا الرِّجَالُ فَاجْعَلْ لَنَا یَوْمًا مِّنْ نَّفْسِكَ فَوَعَدَهُنَّ یَوْمًا
مرد آپ کے پاس آتے ہیں، ہم پر غالب ہوئے تو آپ اپنی طرف سے (خاص) ہمارے لئے ایک دن مقرر کر دیجئے۔ آپ نے ان سے ایک دن

جگہ واجب ہے۔

ایک روایت ابن وہب کی ہے[1] کہ انھوں نے اپنی یادداشت لکھ کر رکھی تھی اور لوگوں کو دکھلایا بھی تھا، اور تدریب الراوی میں ہے کہ انس ابن مالک نے بھی اپنی مکتوبہ اشیاء دکھلائیں۔

قولہ لَا تَقْبَلْ اِلَّا حَدِیْثَ النَّبِیِّ الخ۔ یعنی کسی کی رائے نہ ہو بلکہ جو ہو وہ حدیث ہی ہو۔

قولہ حَتّٰی یَكُوْنَ سِرًّا۔ یعنی جب علم کو راز بنالیں گے اور چھپا کر رکھ لیں گے، تو یہ تضییع علم ہے [اس سے] یہ نہ سمجھنا [چاہئے] کہ کوئی چیز چھپائی بھی نہ جائے، ہر چیز کا اخفاء ممنوع نہیں، بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ مخاطب کس قسم کا ہے، اس کے فہم کے مطابق کلام کیا جائے۔

---

(۱) شاید یہاں جامع سے کچھ سہو ہوا ہے ۱۲۔

لَقِيَهُنَّ فِيهِ فَوَعَظَهُنَّ وَأَمَرَهُنَّ فَكَانَ فِيمَا قَالَ لَهُنَّ مَا مِنْكُنَّ امْرَأَةٌ تُقَدِّمُ ثَلَاثَةً

ملنے کا وعدہ فرمایا، اس دن کو نصیحت کی اور شرع کے احکام بتلائے، ان باتوں میں جو آپ نے فرمائیں یہ بھی تھی کہ جو عورت

مِنْ وَلَدِهَا إِلَّا كَانَ لَهَا حِجَابًا مِنَ النَّارِ فَقَالَتِ امْرَأَةٌ وَاثْنَيْنِ؟ فَقَالَ وَاثْنَيْنِ،

اپنے تین بچے آگے بھیجے تو وہ (آخرت میں) اس کے دوزخ سے آڑ بن جائیں گے، ایک عورت نے عرض کیا اگر دو بھیجے؟ آپ نے فرمایا: اور دو بھی!

۱۰۲۔ حَدَّثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ ثَنَا غُنْدَرٌ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ

مجھ سے محمد ابن بشار نے بیان کیا، کہا ہم سے غندر نے بیان کیا، کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا، انھوں نے

بْنِ الْأَصْبَهَانِيِّ عَنْ ذَكْوَانَ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهٰذَا

عبد الرحمان ابن اصبہانی سے، انھوں نے ذکوان سے، انھوں نے ابو سعید سے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی

وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ الْأَصْبَهَانِيِّ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا حَازِمٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ

حدیث اور شعبہ نے اس کو روایت کیا عبد الرحمان ابن اصبہانی سے، انھوں نے کہا میں نے سنا ابو حازم سے، انھوں نے

ثَلَاثَةً لَمْ يَبْلُغُوا الْحِنْثَ

ابوہریرہ سے اس روایت میں یوں ہے، آپ نے فرمایا: "تین بچے جو جوان نہ ہوئے ہوں"۔

قولہ قَالَ الْفِرَبْرِيُّ، فربری امام بخاری کے شاگرد ہیں، ان کی عادت ہے کہ جب [باب کے مناسب] کوئی حدیث علاوہ بخاری کے کسی اور سے ملتی ہے تو اسے بھی نقل کر دیتے ہیں۔

(۷۷) باب هل يجعل للنساء يومًا على حدة

حدیث: ۱۰۱، قَالَتِ امْرَأَةٌ وَاثْنَيْنِ؟ یہ عطف تلقینی ہے، یعنی سائل کسی مذکور شے پر ایک غیر مذکور کو عطف کر کے اس لئے بولے کہ متکلم بھی اس کو مذکور پر عطف کر دے، بعض روایتوں میں صرف ایک کا ذکر آیا ہے اور بعض میں اس کے ساتھ "لم يبلغ الحنث" کی قید بھی لگی ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نابالغ مرے تو یہی حجاب من النار ہوگا۔ باقی رہا یہ شبہہ کہ جوان کا صدمہ زیادہ ہوتا ہے، تو یہ یاد رہے کہ وہاں اس کا کفارہ بھی ہے اور امید کی جاتی ہے[1]، مگر یہاں مسئلہ شفاعت کا ہے کہ بچوں سے والدین کو خاص قسم کا تعلق ہوتا ہے ان سے امیدیں وابستہ ہوتی ہیں اور اب تک ان سے عقوق بھی سرزد نہیں ہوا ہے، حدیث میں ہے کہ بچے جب دیکھیں گے کہ ہمارے والدین

---

(۱) جواب واضح نہیں ہے، شاید یہ مطلب ہے کہ وہ شدید صدمہ مصیبت زدہ کے گناہوں کا کفارہ بنے گا اور اسکے موجب مغفرت بننے کی بہت کچھ امید ہے، مگر یہاں شفاعت کا ذکر ہے اور اس کی صلاحیت معصوم بچوں میں ہی زیادہ ہے ۱۲ (مرتب)

باب ٧٨ مَن سَمِعَ شَيئًا فَلَم يَفهَمهُ فَرَاجَعَهُ حَتّٰى يَعرِفَهُ

کوئی شخص ایک بات سنے اور نہ سمجھے تو دوبارہ پوچھے سمجھنے کے لئے۔

۱۰۳ ـ حَدَّثَنَا سَعِيدُ بنُ اَبِي مَريَمَ قَالَ اَنَا نَافِعُ بنُ عُمَرَ قَالَ حَدَّثَنِي

ہم سے سعید ابن ابی مریم نے بیان کیا، کہا ہم کو نافع نے خبردی، کہا مجھ سے ابن ابی ملیکہ نے بیان کیا، انھوں نے

ابنُ اَبِي مُلَيكَةَ اَنَّ عَائِشَةَ زَوجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ كَانَت لَا تَسمَعُ شَيئًا

حضرت عائشہؓ سے۔ ان کی عادت تھی جس بات کو سنتیں اور نہ سمجھتیں تو خوب سمجھنے تک اس کو دوبارہ پوچھتیں اور (ایسا ہوا کہ ایک بار)

لَا تَعرِفُهُ اِلَّا رَاجَعَت فِيهِ حَتّٰى تَعرِفَهُ وَاَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ قَالَ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (قیامت کے دن) جس شخص سے حساب لیا جائے گا وہ عذاب میں

مَن حُوسِبَ عُذِّبَ قَالَت عَائِشَةُ فَقُلتُ اَوَلَيسَ يَقُولُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فَسَوفَ

پڑے گا، تو حضرت عائشہؓ نے کہا: اللہ تعالیٰ تو (سورۂ انشقت میں) فرماتا ہے: اس کا حساب آسانی سے

يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا،

لیا جائے گا؛

دوزخ میں جارہے ہیں تو وہ مچل جائیں گے کہ ہم ہرگز نہ جانے دیں گے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اچھا اے جھگڑالو بچے! انھیں جنت میں لے جا۔ تو وہ ان کو لے کر جنت میں جائے گا

(٧٨) باب من سمع شيئًا الخ

یعنی ایک شخص جو بات نہ سمجھا ہو اسے پوچھ لے۔ ہاں ازراہ تعنت سوال نہ ہو ورنہ وہ محروم رہے گا، بات یہ ہے کہ علم حاصل کرنے کیلئے بھی ہنر چاہئے، وقت کی رعایت، استاذ کی حالت، سب کا لحاظ رکھنا چاہئے۔ حضرت شیخ الہند اپنا قصہ سناتے تھے کہ ایک بار ہدایہ اخیرین میں ایک مسئلہ آیا جو مجھ سے حل نہ ہوا اور شفا نہ ہوئی، اتفاقاً گنگوہ جانا ہوا (دیوبند سے گنگوہ بائیس کوس ہے) تو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے اس کو پوچھا، حضرت نے اس کی تقریر فرمادی، میں نے سنا تو غور سے مگر سمجھ میں تقریر نہ آئی، اس لئے پھر پوچھا، آپ نے پھر تقریر فرمادی، اس کے بعد پھر پوچھا تو کچھ آثار خفگی کے نظر آئے، میں نے کہا: بس ٹھیک ہے حضرت! اور اٹھ کر چلا آیا اور راستہ بھر سوچتا آیا، ندی پر (راستہ میں ندی پڑتی ہے) پہونچ کر دفعۃً سمجھ میں آگیا۔ تو علم میں تادب کی ضرورت ہے۔

حدیث: ۱۰۳۔ حدیث میں یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ حال تھا کہ جب کوئی بات حضورؐ فرماتے

قَالَتْ فَقَالَ إِنَّمَا ذٰلِكَ الْعَرْضُ وَلٰكِنْ مَنْ نُوقِشَ الْحِسَابَ يَهْلِكُ.

آپ نے فرمایا: (یہ حساب نہیں ہے) اس سے مراد تو اعمال کا بتلا دینا ہے، لیکن جس سے کھینچ تان کر حساب لیا جائے گا وہ تباہ ہوگا۔

بَاب ۷۹ لِيُبَلِّغِ الْعِلْمَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ. قَالَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

جو شخص سامنے موجود ہو وہ علم کی بات اس کو پہونچا دے جو غائب ہو، اس کو ابن عباس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا۔

۱۰۴۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ قَالَ حَدَّثَنِي سَعِيدٌ هُوَ

ہم سے عبد اللہ ابن یوسف تینسی نے بیان کیا، کہا ہم سے لیث ابن سعد نے بیان کیا، کہا مجھ سے سعید مقبری نے بیان کیا

ابْنُ أَبِي سَعِيدٍ عَنْ أَبِي شُرَيْحٍ أَنَّهُ قَالَ لِعَمْرِو بْنِ سَعِيدٍ وَهُوَ يَبْعَثُ الْبُعُوثَ إِلَى مَكَّةَ

انھوں نے ابو شریح سے (جو صحابی تھے) انھوں نے عمرو ابن سعید سے کہا (جو یزید کی طرف سے مدینہ کا حاکم تھا) وہ مکہ پر فوجیں بھیج رہا تھا،

ائْذَنْ لِي أَيُّهَا الْأَمِيرُ أُحَدِّثْكَ قَوْلًا قَامَ بِهِ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْغَدَ مِنْ

اے امیر! مجھ کو اجازت دے میں تجھ کو ایک حدیث سناؤں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دوسرے روز ارشاد فرمائی، میرے کانوں

يَوْمِ الْفَتْحِ سَمِعَتْهُ أُذُنَايَ وَوَعَاهُ قَلْبِي وَأَبْصَرَتْهُ عَيْنَايَ حِينَ تَكَلَّمَ بِهِ حَمِدَ

نے اس کو سنا اور دل نے اسے یاد رکھا اور میری دونوں آنکھوں نے ان کو دیکھا جب آپ نے یہ حدیث سنائی آپ نے اللہ کی تعریف کی

اللّٰهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ إِنَّ مَكَّةَ حَرَّمَهَا اللّٰهُ وَلَمْ يُحَرِّمْهَا النَّاسُ فَلَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ يُؤْمِنُ

اور خوبی بیان کی، پھر فرمایا کہ مکہ کو اللہ نے حرام کیا ہے، لوگوں نے حرام نہیں کیا (اس کا ادب یہ حکم الٰہی ہے) تو جو کوئی اللہ اور پچھلے دن،

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يَسْفِكَ بِهَا دَمًا وَلَا يَعْضِدَ بِهَا شَجَرَةً

(قیامت) پر ایمان رکھتا ہو، اس کو وہاں خون بہانا درست نہیں اور نہ وہاں کوئی درخت کاٹنا۔

اور اچھی طرح ان کی سمجھ میں نہ آتا تو فوراً سوال کرتیں، چنانچہ جب آپ نے فرمایا: مَنْ حُوسِبَ عُذِّبَ یعنی جس سے حساب کیا گیا اسے عذاب دیا گیا، تو فوراً سوال کیا گیا کہ قرآن میں ہے فسوف یحاسب حساباً یسیراً، یعنی عنقریب حساب آسان لیا جائے گا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب دیا: ذٰلِكَ الْعَرْضُ، یعنی حدیث میں جس حساب کا ذکر ہے وہ اور ہے اور آیت میں اور۔ آیت میں جس حساب کا ذکر ہے وہ درحقیقت عرض ہے۔

ایک حساب تو یہ ہے کہ اسے پیش کر دیا جائے، اس وقت کھود کرید اور کاوش نہیں ہوتی، اور ایک مطالبہ اور مناقشہ ہے کہ یہ کیوں ہے یہ کیا ہے؟؟ تو یہ حساب سخت ہے، یعنی جس کی کھود کرید کی گئی اور جانچ کی گئی تو وہ ہلاک ہونے والا ہے۔

فَإِنْ اَحَدٌ تَرَخَّصَ لِقِتَالِ رَسُوْلِ اللّٰہِ فِیْھَا فَقُوْلُوْا اِنَّ اللّٰہَ قَدْ اَذِنَ لِرَسُوْلِہٖ وَلَمْ یَأْذَنْ لَکُمْ

اگر (میرے بعد) کوئی ایسا کرنے کی یہ دلیل لے کہ اللہ کے رسول وہاں لڑے ؟ تو تم یہ کہو کہ اللہ نے تو (فتح مکہ کے دن) اپنے رسول کو (خاص)

وَاِنَّمَا اَذِنَ لِیْ فِیْھَا سَاعَۃً مِّنْ نَّھَارٍ ثُمَّ عَادَتْ حُرْمَتُھَا الْیَوْمَ کَحُرْمَتِھَا بِالْاَمْسِ وَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ

اجازت دی تھی، تم کو اجازت نہیں دی، اور مجھ کو بھی صرف ایک گھڑی دن کے لئے اجازت دی تھی، پھر اس کی حرمت آج ویسی ہی ہوگئی جیسے

الْغَائِبَ . فَقِیْلَ لِاَبِیْ شُرَیْحٍ مَا قَالَ عَمْرٌو قَالَ اَنَا اَعْلَمُ مِنْکَ یَا اَبَا شُرَیْحٍ لَا تُعِیْذُ عَاصِیًا

کل تھی، اور جو شخص یہاں حاضر ہو وہ اس کی خبر اس کو کر دے جو غائب ہے، لوگوں نے ابو شریح سے پوچھا: عمرو نے اس کا کیا جواب دیا؟ ابو شریح

وَلَا فَارًّا بِدَمٍ وَلَا فَارًّا بِخُرْبَۃٍ .

نے کہا: عمرو نے یہ جواب دیا کہ میں تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہوں، کہ گنہگار کو پناہ نہیں دیتا اور نہ اس کو جو خون یا چوری کر کے بھاگے۔

---

(۷۹) باب لیبلغ العلم الخ

حدیث ۱۰۴ . ابو شریح صحابی ہیں اور عمرو ابن سعید، یزید کے عہد حکومت میں مدینہ کا والی تھا، قصہ یہ ہوا تھا کہ امیر معاویہ رضؓ نے جب یزید کو خلیفہ بنایا تو حضرت حسین اور عبد اللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے بیعت سے انکار کر دیا، حضرت حسین کا حال تو معلوم و مشہور ہی ہے، ابن زبیر مدینہ سے مکہ کو چلے گئے کہ وہ حرم ہے، وہاں امن میں رہیں گے، چنانچہ انھیں عائذ اللہ کہتے تھے، یزید نے ان کے اقتدار کو باطل کرنے کے لئے چڑھائی کی تیاری کی اور [عمرو ابن] سعید[1] کو حکم بھیجا کہ [ابن الزبیر سے جنگ کے لئے] لشکر روانہ کرو [اس موقع پر] ابو شریح نے ایک کلمۂ حق کہنا چاہا اور فرمایا: ائذن لی ایھا الامیر، اے امیر مجھے کچھ کہنے کی اجازت دیجئے، یہ نہایت ادب اور تہذیب کا خطاب تھا۔

قولہ سمعتہ اذنای الخ یعنی اچھی طرح میں نے محفوظ رکھا ہے۔

قولہ حرمھا اللہ ولم یحرمھا الناس . یعنی اللہ نے اس کو حرم بنایا ہے، بندوں کا بنایا ہوا نہیں ہے، جیسا کہ آج کل یورپ میں بنا لیتے ہیں، مثلاً سوئٹزرلینڈ کہ وہاں کسی کو سزا نہیں دی جا سکتی۔

قولہ وانما اذن لی فیھا ساعۃ . بعض روایات میں ہے کہ طلوع آفتاب سے عصر تک یہ ساعت تھی، تو اس سے قلیل مدت مراد ہے[2]

قولہ امس یعنی فتح مکہ کا امس (فتح مکہ سے پہلے کا دن)۔

قولہ ولیبلغ الشاھد الغائب . تو ابو شریح نے حق ادا کر دیا، یہی ترجمہ تھا باب کا۔

---

(۱) یہ [عمرو بن] سعید تابعی ہیں لیکن ان کے افعال اچھے نہیں تھے، ۱۲ منہ (۲) خط کشیدہ عبارت کا مفہوم واضح نہیں ہے، ۱۲ مرتب۔

۱۰۵ ۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عَبْدِ الْوَهَّابِ قَالَ ثَنَا حَمَّادٌ عَنْ اَيُّوبَ عَنْ مُحَمَّدٍ

ہم سے عبداللہ ابن عبدالوہاب نے بیان کیا، کہا ہم سے حماد نے بیان کیا، انھوں نے محمد ابن سیرین سے، انھوں نے

عَنْ اِبْنِ اَبِي بَكْرَةَ ذَكَرَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَاِنَّ دِمَاءَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ ـ قَالَ مُحَمَّدٌ

ابو بکرہ سے، اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا کہ آپؐ نے فرمایا، تمھارے خون اور تمھارے مال ـ اور ابن سیرین نے کہا میں سمجھتا ہوں

وَاَحْسِبُهُ قَالَ ـ وَاَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِي شَهْرِكُمْ هٰذَا ،

یہ بھی کہا ـ اور تمھاری عزتیں (آبروئیں) ایک دوسرے پر حرام ہیں، جیسی اس دن (یوم النحر) کی حرمت ہے اس مہینہ میں، سن رکھو،

اَلَا لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ مِنْكُمُ الْغَائِبَ ، وَكَانَ مُحَمَّدٌ يَقُوْلُ صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

جو شخص حاضر ہے وہ غائب کو پہونچا دے، ابن سیرین نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا سچ ہوا (جو لوگ اس وقت حاضر تھے

وَسَلَّمَ ، كَانَ ذٰلِكَ اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ مَرَّتَيْنِ ،

انھوں نے جو غائب تھے ان کو یہ حدیث پہونچا دی) اور آنحضرتؐ نے فرمایا، سن رکھو میں نے یہ حکم تم کو پہونچا دیا، دوبار فرمایا۔

قولہ انا اعلم یعنی زیادہ جانتا ہوں، حالانکہ وہ جھوٹا ہے، وہ کیا جانتا، یہ صحابی، وہ تابعی، یہ تو صرف ٹالنے کی وجہ سے کہا، صحابی نے بالکل صحیح سمجھا تھا، اس نے ان کی بات کاٹنی چاہی۔

قولہ لا تعیذ عاصیا یعنی عاصی، باغی، جانی، سارق وغیرہ کو حرم پناہ نہیں دیتا، بلکہ وہیں حرم میں سزا دی جائے گی، میں کہتا ہوں کہ اس سے قطع نظر کیجئے کہ مسئلہ کیا ہے، اس سے یہی پوچھا جائے کہ باغی و عاصی کون ہے؟ کیا ابن زبیر؟ ہرگز نہیں! ابن زبیر عاصی نہیں بلکہ تم عاصی ہو کہ باوجود فسق و فجور کے تم نے لوگوں کی گردنوں میں اپنی حکومت کا قلادہ ڈالا، باقی رہا مسئلہ تو شوافع کے ہاں وہیں حرم میں سزا دی جائے گی، اور حنفیہ کہتے ہیں وہاں قتل نہ کریں گے، ہاں اسے اس طرح تنگ کریں گے کہ وہ حرم چھوڑ دے، اور جب حرم سے باہر آئے تو سزا دی جائے، ہاں مادون النفس میں البتہ حرم ہی میں حدود جاری ہوں گی، اور اگر کسی نے حرم میں کسی کو قتل کیا تو اس سے وہیں قصاص لیں گے، بشرطیکہ حد بغاوت تک پہونچ گیا ہو، اور اگر نکال سکتے ہوں تو نکال کر قتل کریں گے، اور اتفاق کی بات ہے کہ ابو شریح کی حدیث ہمارے (حنفیہ کے) موافق ہے اور عمرو ابن سعید کا مسلک شوافع کا ہے۔

حدیث ۱۰۵، قولہ عن محمد عن ابی بکرۃ، یہ بظاہر صحیح نہیں بلکہ عن محمد عن ابن ابی بکرۃ[1] ہے۔

---

(۱) فتح الباری کے حاشیہ پر "عن محمد عن ابن ابی بکرۃ عن ابی بکرۃ" ہے ابن حجر نے کہا کہ مستملی اور کشمیہنی کی روایت اسی طرح ہے اور باقی راویوں کے نسخوں میں عن ابن ابی بکرۃ رہ گیا ہے، جس کی وجہ سے سند منقطع ہوگئی ہے۔ ۱۲ مرتب۔

باب ٨٠ اِثْمِ مَنْ كَذَبَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھے وہ کیسا گنہگار ہے۔

۶ ۔ حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ الْجَعْدِ قَالَ اَنَا شُعْبَةُ قَالَ اَخْبَرَنِي مَنْصُوْرٌ قَالَ سَمِعْتُ

ہم سے علی ابن جعد نے بیان کیا، کہا ہم کو شعبہ نے خبر دی، کہا مجھ کو منصور بن معتمر نے خبر دی، کہا، میں نے

رِبْعِيَّ بْنَ حِرَاشٍ يَقُوْلُ سَمِعْتُ عَلِيًّا يَقُوْلُ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَكْذِبُوْا عَلَيَّ

ربعی ابن حراش سے سنا، وہ کہتے تھے: میں نے حضرت علیؓ سے سنا، کہتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (دیکھو) مجھ پر جھوٹ

فَاِنَّهُ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَلِجِ النَّارَ

نہ باندھنا کیونکہ جو شخص مجھ پر جھوٹ باندھے گا وہ دوزخ میں جائے گا۔

قولہ کان ذلک ای وقع ذلک۔ یعنی آپ نے تبلیغ کا حکم دیا تھا، لوگوں نے ویسا ہی کیا کہ اسی طرح پہونچا دیا

(۸۰) باب اثم من کذب علی النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم

حضورؐ پر جھوٹ بولنا اور تہمت لگانا یا کسی قول یا فعل کی نسبت حضورؐ کی طرف کرنا جو حضورؐ نے نہیں فرمایا یا نہیں کیا، اشد کبائر سے ہے حتیٰ کہ ابو محمد جوینی امام الحرمین کے والد اور ابن المنیرؒ وغیرہ نے یہاں تک کہدیا کہ وہ کافر ہو جائے گا، مگر جمہور کہتے ہیں کہ وہ کافر نہیں ہوگا البتہ اشد کبیرہ کا مرتکب ہوگا، بعض صوفیہ نے بہت تساہل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر ترغیب و ترہیب کے لئے حدیث وضع کرلے تو اس بارے میں وعید نہیں ہے بلکہ جائز ہے، مگر یہ بات بالکل غلط اور مہمل ہے، کذب علی النبی بہر حال ممنوع ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ کذب علی النبی نہیں ہے بلکہ للنبی ہے، حالانکہ یہ بھی علی النبی ہے کیونکہ جھوٹ منسوب کیا نبی کی طرف، البتہ صوفیائے محققین اور جمہور نے بالاتفاق اس کو ممنوع قرار دیا ہے [اور ترغیب و ترہیب کے لئے بھی حدیث وضع کرنے کو حرام کہا ہے]

مفسرین اکثر ضعیف حدیثیں لے لیتے ہیں، اور بعض تو اسرائیلیات اور موضوعات کو بھی لے لیتے ہیں، لیکن احتیاط لازم ہے، موضوعات کی تو مطلقاً گنجائش ہی نہیں، اسرائیلیات میں بھی تحقیق کرنا چاہئے اور ضعاف کی فضائل اعمال میں تو گنجائش ہے مگر اور جگہ نہیں۔

نقل احادیث کے باب میں کس کا اعتبار کیا جائے گا اور کس کی نقل مقبول ہوگی؟ تو اول درجہ میں اصحاب الحدیث یعنی محدثین ہیں دوسرے درجہ میں ائمہ اہل فقہ اور تیسرے درجہ میں قدمائے اہل لغت جن کو غریب الحدیث سے لگاؤ رہا ہے جیسے امام ابو عبید مگر اسے بھی بے کھٹکے بیان نہیں کر سکتے، جیسا کہ محدثین کی تخریج (تحقیق) کو بے کھٹکے بیان کر سکتے ہیں، ملا علی قاری بھی تساہل کر جاتے ہیں اس لئے یہاں بھی احتیاط کرنی ہوگی۔

۱۰۷ ۔ حَدَّثَنَا اَبُو الْوَلِيدِ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ عَنْ جَامِعِ بْنِ شَدَّادٍ عَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ

ہم سے ابو الولید نے بیان کیا، کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا، انھوں نے جامع ابن شداد سے، انھوں نے عامر

ابْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ اَبِيْهِ قُلْتُ لِلزُّبَيْرِ اِنِّيْ لَا اَسْمَعُكَ تُحَدِّثُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

ابن عبد اللہ ابن زبیر سے، انھوں نے اپنے باپ عبد اللہ ابن زبیر سے، انھوں نے (اپنے باپ) حضرت زبیرؓ سے کہا: میں تم کو آنحضرت

كَمَا يُحَدِّثُ فُلَانٌ وَفُلَانٌ قَالَ اَمَا اِنِّيْ لَمْ اُفَارِقْهُ وَلٰكِنْ سَمِعْتُهُ يَقُوْلُ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ

صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں فلاں فلاں شخصوں کی طرح بیان کرتے نہیں سنتا، انھوں نے کہا: میں آنحضرتؐ سے جدا نہیں رہا کہ آپ کی حدیثیں

فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ

میں نے نہ سنی ہوں، لیکن میں نے سنا آپ فرماتے تھے: جو کوئی مجھ پر جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے

۱۰۸ ۔ حَدَّثَنَا اَبُوْ مَعْمَرٍ قَالَ ثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ عَنْ عَبْدِ الْعَزِيْزِ قَالَ اَنَسٌ

ہم سے ابو معمر نے بیان کیا، کہا ہم سے عبد الوارث نے بیان کیا، انھوں نے عبد العزیز سے، انھوں نے کہا:

اِنَّهٗ لَيَمْنَعُنِيْ اَنْ اُحَدِّثَكُمْ حَدِيْثًا كَثِيْرًا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ تَعَمَّدَ

انس نے کہا جو تم میں بہت سی حدیثیں بیان کرتا اس کی وجہ یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کوئی جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ

عَلَيَّ كَذِبًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ ۔

باندھے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے

حدیث ۱۰۷ ۔ قولہ فلان و فلان، ابن ماجہ میں ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں سے مراد عبد اللہ ابن مسعود ہیں، دوسرے فلاں کا حال معلوم نہیں۔

قولہ اما انی لم افارقہ ۔ یعنی میں صحبت نبوی میں برابر رہا ہوں ۔ اور بعض روایات میں ہے کہ پہلے اپنے تعلقات خاندانی بیان کئے، پھر کہا کہ حضورؐ کی صحبت میں میں بھی رہا ہوں لیکن چونکہ میں حضورؐ سے من کذب علیّ الخ سن چکا ہوں اسلئے میں احتیاط برتتا ہوں، اگر میں اکثار کروں گا تو احتیاط برتنا مشکل ہوگا ۔ اکثار میں رطب و یابس سب آجاتی ہیں اور بلا ارادہ غلط چیزیں منھ سے نکل جاتی ہیں اور ان کے نزدیک خطأً بھی غلط چیز نکلنا ممنوع ہوگا، غرض یہ کہ کہیں احتیاط نہ ہوسکے اور میں غلطی سے بیان کردوں۔

حدیث ۱۰۸ ۔ قال انس، انس رضی اللہ عنہ مکثرین حدیث میں سے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ میں کثیر حدیثیں بیان نہیں کرتا، تو اس کا جواب بعض نے یہ دیا کہ اس سے زیادہ ذخیرہ ان کے پاس رہا ہوگا، مگر صحیح جواب یہ ہے (ان شاء اللہ) کہ وہ اپنی طرف سے بیان نہ کرتے تھے مگر عمر لمبی پائی تھی

۱۰۹۔ حَدَّثَنَا الْمَكِّيُّ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ حَدَّثَنَا يَزِيدُ بْنُ أَبِي عُبَيْدٍ عَنْ سَلَمَةَ هُوَ ابْنُ

ہم سے مکی ابن ابراہیم نے بیان کیا، کہا ہم سے یزید ابن ابو عبید نے، انھوں نے سلمہ ابن اکوع سے، انھوں نے

الْأَكْوَعِ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مَنْ يَقُلْ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْ فَلْيَتَبَوَّأْ

کہا میں نے سنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے، فرماتے تھے: جو کوئی مجھ پر وہ بات لگائے جو میں نے نہیں کہی، وہ اپنا ٹھکانا

مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

دوزخ میں بنالے۔

۱۱۰۔ حَدَّثَنَا مُوسَى قَالَ ثَنَا أَبُو عَوَانَةَ عَنْ أَبِي حَصِينٍ عَنْ أَبِي صَالِحٍ عَنْ

ہم سے موسیٰ ابن اسماعیل نے بیان کیا، کہا ہم سے ابو عوانہ نے بیان کیا، انھوں نے ابو حصین سے، انھوں نے

أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَسَمَّوْا بِاسْمِي وَلَا تَكْتَنُوا بِكُنْيَتِي وَمَنْ

ابو صالح سے، انھوں نے ابو ہریرہؓ سے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپؐ نے فرمایا: میرے نام پر نام رکھو (محمد اور احمد

رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ فِي صُورَتِي وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا

نام رکھو) اور میری کنیت (ابو القاسم) نہ رکھو اور یہ سمجھ لو) جس نے خواب میں مجھ کو دیکھا اس نے بلاشبہ مجھ ہی کو دیکھا، کیونکہ شیطان

فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

میری صورت نہیں بن سکتا اور جو جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنائے

اور لوگ کثرت سے سوال کرتے تھے، مجبوراً ان کو جواب دینا پڑتا تھا، اکثر صحابہ دنیا سے جا چکے تھے، صرف دو ایک باقی رہ گئے تھے، اس وجہ سے ان کی بیان کردہ حدیثوں کا ذخیرہ بہت ہوگیا۔

قولہٗ سلمۃ ھو ابن الاکوع، یہ ھو ابن الاکوع بخاری کی تفسیر ہے۔

حدیث ۱۱۰۔ قولہٗ لا تکتنوا بکنیتی، یہ اس لئے فرمایا کہ ایک مقام پر آپ تشریف لے جا رہے تھے، کسی نے کہا: یا ابا القاسم اے ابو القاسم! آپؐ نے مڑ کر دیکھا، اس نے کہا لم اعنک یعنی میں آپ کو نہیں بلا رہا، اس پر آپ نے فرمایا: لا تکتنوا بکنیتی، میری کنیت نہ رکھو، اس میں اشتباہ ہوتا ہے، نام کی اجازت اس لئے دی کہ لوگ بکثرت یا تو کنیت سے پکارتے تھے یا یا رسول اللہ کہتے تھے، اس میں اشتباہ کم تھا یا بالکل نہ تھا ۔ چونکہ یہ علت اب معدوم ہوگئی اس لئے اب علماء کہتے ہیں کہ جائز ہے، اور بعض نے کہا کہ اگرچہ جائز ہے مگر بہتر یہ ہے کہ کنیت نہ رکھے۔

قولہٗ ومن رآنی فی المنام فقد رآنی، اور جس نے مجھ کو خواب میں دیکھا اس نے مجھ ہی کو دیکھا، کوئی دوسری چیز نہیں دیکھی،

. . . .

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شیطان متمثل ہوکر آتا ہے کبھی) قوت خیالیہ میں جو اشیاء ہوتی ہیں، قوت مصورہ انہیں سامنے کھڑا کر دیتی ہے، تو آپؐ فرماتے ہیں کہ میری صورت میں متمثل ہوکر شیطان نہیں آسکتا، اسے یہ قدرت نہیں۔

اس کی بحث کتاب الرؤیا میں حافظ نے بہت طویل لکھی ہے، اس کا خلاصہ بیان کرتا ہوں تاکہ دھوکا نہ لگے، پہلی چیز یہ ہے کہ یہاں الفاظ مختلف آئے ہیں، بعض میں فقد رانی آیا ہے، بعض میں فسیرانی اور بعض میں فکانہ قد رانی، گویا کہ اس نے مجھ کو دیکھا، بعض میں ہے کانہ قد رانی فی الیقظۃ، بعض میں ہے قد رانی فی الیقظۃ ہے، اس لئے معنی میں علماء کا اختلاف ہوا ہے کہ کیا مراد ہے؟ بعض نے کہا: جس نے حضورؐ کو خواب میں دیکھا تو وہ حضورؐ کو ضرور دیکھے گا، کہاں دیکھے گا؟ تو بعضوں نے کہا قیامت میں، اس پر شبہہ ہوا کہ پھر تخصیص کیا رہی، قیامت میں تو سب ہی دیکھیں گے، مومن کیا، کافر بھی؟ تو جواب دیتے ہیں کہ رویہ مخصوصہ مراد ہے، یعنی خاص التفات، الطاف وعنایات کے ساتھ، بعض نے کہا کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ جس نے مجھے خواب میں [اس وقت دیکھا جب میں بقید حیات ہوں] تو وہ مجھ کو ضرور دیکھے گا یعنی اسے صحبتِ نبوی حاصل ہوگی اور حاضرِ خدمت ہوگا اور اگر انتقال کے بعد دیکھا تو ممکن ہے یہ مراد ہو کہ میرے مزار کی زیارت کرے گا کیونکہ اس کو بھی زیارۃ النبیؐ کہتے ہیں، اور یہ اس وقت ہے جب روایت میں فسیرانی آیا ہو، مگر اکثر روایات میں فقد رانی ہے، تو اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ جس نے مجھ کو خواب میں دیکھا اس نے ٹھیک ٹھیک مجھ ہی کو دیکھا، یعنی یہ ایسا یقینی دیکھنا ہے جیسا کہ بیداری میں مجھے دیکھنا، چنانچہ بعض روایات میں ہے: مَن رانی فقد رأی الحق یعنی ٹھیک ٹھیک دیکھا، بعض وحدۃ الوجود والے فقد رانی الحق کا یہ معنی لیتے ہیں کہ اللہ کو دیکھ لیا، لیکن اگر وحدۃ الوجود ہی پر رکھا جائے تو پھر حضورؐ ہی کی کیا تخصیص ہے، سب کا دیکھنا اللہ کا دیکھنا ہے۔ یہاں ایک بڑا اہم سوال یہ ہے کہ آیا خواب میں زیارت کرنا اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ حیات میں دیکھنا، تو جس زی وحالت میں دیکھے اور جو حضورؐ کی زبان سے سنے اس سے کیا احکام ثابت ہوں گے، لوگ اس سے گمراہ ہوں گے، چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی نے بہت سے خواب چھاپے ہیں، تو حدیث کے نہ سمجھنے سے عجیب فتنہ ہوگیا، کہ کفر وایمان کا سوال پیدا ہوگیا، بعض صوفیہ کو خواب پر اس قدر وثوق ہوتا ہے کہ حدیث اور شریعت کی پرواہ ہی نہیں کرتے، اس لئے ضرورت ہے کہ اصل مسئلہ منقح کردیا جائے، تاکہ مطلب بھی واضح ہوجائے اور گمراہی بھی نہ پھیلنے پائے، یاد رکھو ایک چیز یہاں متفق علیہ ہے اور ایک چیز مختلف فیہ، اختلاف اس میں ہے کہ حضورؐ کو دیکھنا ہر حالت میں دیکھنے کو عام ہے یا کسی حالت کے ساتھ خاص ہے؟ کسی خاص لباس میں دیکھنا اور خاص اپنی صورت میں دیکھنا جو آپ کی تھی اس پر دیکھنا معتبر ہے یا عام ہے، خواہ حلیہ مبارکہ کے موافق ہو یا مخالف؟ تو من رانی کس وقت سمجھا جائے گا، بعض کہتے ہیں کہ اگر بیس یا اکیس بال کا سفید ہونا حدیث سے معلوم ہوتا ہے اور اس نے ایک کم یا ایک زیادہ دیکھا تو پھر اس نے حضورؐ کو نہیں دیکھا، رویت وہی معتبر ہے جو حلیہ کے موافق ہو، جو شمائل میں صحابہ نے بیان کیا ہے پھر تفصیل ہے کہ اگر پیری کی حالت میں دیکھا تو پیری کا حلیہ معتبر ہے اور اگر جوانی کی حالت میں دیکھا تو جوانی کا حلیہ، اور بچپن میں بچپن کا حلیہ معتبر ہوگا

. . . .

قاضی عیاض وغیرہ کے کلام سے یہی مفہوم ہوتا ہے، اور ہمارے اکابر میں سے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ میں اختلاف رہا ہے شاہ رفیع الدینؒ کا یہی مسلک تھا کہ ٹھیک اپنی زی پر ہونا چاہئے، شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے تھے کہ عام ہے کسی بھی حالت میں ہو، حضور ہی ہوں گے(۱)

ابن حجرؒ نے مازری مالکی شارح مسلم کا قول نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر اصلی حلیہ میں دیکھا، تب تو کلام نہیں کہ آپؐ ہی کو دیکھا، غیر کو نہیں، لیکن اگر دوسری زی و ہیئت اور حلیہ میں دیکھا تو اس وقت رویت شخص وذات کی تو رویۃ حقیقیہ ہے، واقعی آپؐ کی ذات کو دیکھا اور تغیر اوصاف یہ رویۃ متخیلہ ہے، اصلی نہیں، مثلاً فرض کیجئے کوئی عیب دیکھا اور یقین ہے کہ حضورؐ کو دیکھ رہا ہوں تو ذات تو آپ ہی کی ہوگی مگر اوصاف کا تغیر قوت متخیلہ کا غلبہ ہے اور متخیلہ کا دخل کچھ منافی نہیں فقدِ رائی کے، اس کو معبرین نے بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی برائی یا بھلائی آپ کے ساتھ دیکھی اور وہ چیز آپ کی زندگی میں آپ کے ساتھ نہ تھی تو حضورؐ کی مثال اس وقت آئینہ کی سی ہے، یعنی خود اس دیکھنے والے میں جو قصور ہے، وہ نظر آرہا ہے، وہ دیکھ تو رہا ہے پیغمبرؐ کو، مگر نظر آرہا ہے اپنا حال، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لباس وغیرہ خلاف شریعت ہوتا ہے اس وقت تعبیر میں اختلاف ہوتا ہے، چنانچہ مولانا عبدالعلی صاحبؒ نے خواب میں دیکھا کہ میں نماز آباد اسٹیشن پر ہوں اور حضورؐ کو دیکھا کہ تشریف لارہے ہیں، اور کوٹ پتلون پہنے ہوئے ہیں، یہ گھبرائے کیونکہ معبرین نے لکھا ہے کہ رائی کے نقصان پر دال ہے، گھبرا کر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو لکھا —

حضرت مولانا کو تعبیر کا خاص ملکہ تھا، جواب میں لکھا کہ یہ ایک اور چیز کی طرف اشارہ ہے، یہ دکھلایا گیا ہے کہ آج کل دین پر نصاریٰ کا غلبہ ہے، دین حضورؐ کی ذات ہے اور لباس نصاریٰ کا ہے، تو تمہارا اس میں قصور نہیں بلکہ نصاریٰ کے غلبہ کی خاص چیز دکھلائی گئی ہے، تو یہ صفات کی رویت متخیلہ ہے

اس کے علاوہ ایک اور چیز قابل لحاظ ہے، وہ یہ کہ جو باتیں بصراحت حدیث میں مذکور ہیں وہ تو بے تامل مسلم ہیں، لیکن جو باتیں حدیث سے خارج ہیں ان میں ہم کلام کرسکتے ہیں، لہٰذا جو کہتا ہے کہ حضورؐ نے یہ فرمایا ہے، اس کے پاس کیا دلیل ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ شیطان میری صورت پر متمثل نہیں ہوسکتا، لیکن یہ نہیں فرمایا ہے کہ آواز بھی پیدا نہیں کرسکتا، اور انکار بھی نہیں کرسکتا، یہ کیوں جائز نہیں ہے کہ اس وقت تلبیس کرے اور کہے اپنی آواز سے اور سننے والا سمجھے کہ حضور فرمارہے ہیں، لہٰذا اسماع کا اعتبار نہیں ہوسکتا — یہاں تک ایک جزو ہوا جو اختلافی تھا، دوسرا جزو جو اتفاقی ہے اب اسے سنو:—

باتفاق فریقین یہ مسئلہ ہے کہ حضورؐ نے جو خواب میں فرمایا اور اس نے سنا تو یہ سماع حجت نہیں جب تک کتاب وسنت کے موافق نہ ہو، چنانچہ شیخ علی متقی صاحب کنز العمال (جو بہت بڑے ولی بھی ہیں) جب یہ مدینہ میں تھے تو ایک شخص نے آکر خواب بیان کیا کہ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا ہے: اشرب الخمر، شراب پی، سب نے کہا ہماری سمجھ میں نہیں آتا، شیخ نے فرمایا: بے شک دیکھا ہوگا، لیکن آپ نے لا تشرب الخمر، شراب مت پی، فرمایا ہوگا اور تو نے اشرب الخمر (شراب پی) سنا یا سمجھا ہوگا، پھر اس سے پوچھا: تو شراب تو نہیں پیتا؟ کہا: پیتا ہوں، کہا: تو پھر حضورؐ نے کیوں ترغیب دی

(۱) شاہ عبدالعزیز صاحب شاہ رفیع الدین صاحب کے بڑے بھائی ہیں۔ ۱۲ منہ

. . . .

اس کی کیا ضرورت تھی ۔

اس کی بہترین تعبیر فتح المغیث میں سخاوی نے دی ہے، جہاں رواۃ کے شرائط بیان کئے ہیں کہ راوی کب معتبر ہوگا [اور اس کی روایت کب معتبر ہوگی] کہتے ہیں کہ راوی اگر مغفل ہے، یا شیخ کے کلام کے ساتھ اعتنا نہیں کرتا تو اس کی روایت معتبر نہیں، جب مغفل کی روایت بسبب عدم مبالاۃ کے معتبر نہیں تو غافل نائم کی روایت پر کس طرح اعتبار کیا جا سکتا ہے' جب بیداری میں مغفل کا اعتبار نہیں، تو جو غفلت میں ڈوبا ہوا ہے اس کا سماع کیسے معتبر ہو سکتا ہے؟ لہٰذا اگر ایک لاکھ آدمیوں نے بھی مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق خواب میں دیکھا ہو اور وہ سچے بھی ہوں تو خواب کی جو گفتگو وہ نقل کرتے ہوں وہ ہرگز قابل اعتبار نہیں، ہاں رویت ذات معتبر ہے، اور بدلے ہوئے اوصاف اور بدلی ہوئی ہیئت کا اعتبار نہیں اور اسی لئے کلام پر وثوق نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ جب صفات میں تغیر ہو سکتا ہے تو کلام میں اور سماع میں بطریق اولی ہو سکتا ہے۔ اور جو خاص کرتے ہیں ان کے مسلک کے لحاظ سے تو کچھ کلام ہی نہیں، بہرحال دونوں قول پر یہ قول مردود ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھو کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ اصلی صورت میں رویت ہونا چاہئے، ظاہر حدیث انھیں کی تائید میں ہے: فان الشیطن لا یتمثل الخ یعنی مثل نہیں بن سکتا، لیکن دوسروں کی صورت میں تو آ سکتا ہے، تو میں مراد حدیث کی تعیین نہیں کر رہا ہوں، بلکہ کہتا ہوں کہ ظاہر حدیث حضرت شاہ رفیع الدین کا مؤید ہے۔

اور امام المعبرین محمد ابن سیرین[1] سے باسناد صحیح منقول ہے کہ جب کوئی کہتا ہے کہ میں نے حضورؐ کو دیکھا ہے' تو فرماتے صِفه لی یعنی بیان کرو کس طرح دیکھا ہے، اگر مطابق پاتے تو تائید فرماتے، ورنہ تسلیم نہ کرتے، اس سے بھی تائید ہوتی ہے مخصوص کرنے والوں کی۔

اس کے بعد اس میں بھی اختلاف ہے کہ رائی (دیکھنے والا) بالمثال دیکھتا ہے یا شخص کریم کی بجسدہ الکریم رویت ہوتی ہے؟ میرے نزدیک اس میں کوئی اشکال نہیں کہ بجسدہ الشریف دیکھے، اس طرح کہ حجاب اٹھ جائیں، لیکن خواب میں یہ دیکھنے والا صحابی نہ ہوگا، کیونکہ صحابی بننے کے لئے یہ شرط ہے کہ حالتِ حیاتِ نبوی میں رویت ہوئی ہو۔

امام غزالی اور امام سیوطی نے لکھا ہے کہ مثال میں ہوتا ہے [یعنی مثال کی رویت ہوتی ہے] اور چونکہ مثال کاشف ہے، اس لئے یہی کہا جائے گا کہ حضورؐ ہی کو دیکھا۔ مولانا فضل حق خیرآبادی نے خواب میں حضورؐ کو دیکھا کہ گھر میں تشریف لائے گئے شاہی لباس میں۔ شاہ [ولی اللہ] صاحب کے خاندان میں خواب کہلا بھیجا اور تعبیر چاہی، تو یہ جواب ملا کہ فوراً مکان خالی کردو، قاصد جواب لے کر پہونچا تو انھوں نے گھر خالی کردیا

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد فن تعبیر میں ان سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ ۱۲ منہ

بابُ[81] كِتَابَةِ العِلْمِ

علم کی باتیں لکھنا

۱۱۱ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ انا وَكِيعٌ عَنْ سُفْيَٰنَ عَنْ مُطَرِّفٍ عَنِ
ہم سے محمد ابن سلام بیکندی نے بیان کیا، کہا ہم کو وکیع ابن جراح نے خبر دی، انھوں نے سفیان ثوری سے سنا انھوں نے
الشَّعْبِيِّ عَنْ أَبِي جُحَيْفَةَ قَالَ قُلْتُ لِعَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ هَلْ عِنْدَكُمْ كِتَابٌ، قَالَ لَا إِلَّا
مطرف سے، انھوں نے شعبی سے، انھوں نے ابو جحیفہ سے، کہا میں نے حضرت علیؓ سے پوچھا: کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے؟ انھوں نے کہا:
كِتَابُ اللهِ أَوْ فَهْمًا أُعْطِيَهُ رَجُلٌ مُسْلِمٌ أَوْ مَا فِي هٰذِهِ الصَّحِيفَةِ، قَالَ قُلْتُ وَمَا فِي
کوئی نہیں، مگر اللہ کی کتاب (قرآن شریف) یا سمجھ جو مسلمان کو دی جاتی ہے (اللہ کی طرف سے ملتی ہے) یا جو اس ورق میں لکھا ہوا ہے، ابو جحیفہ نے کہا:
هٰذِهِ الصَّحِيفَةِ؟ قَالَ الْعَقْلُ وَفَكَاكُ الْأَسِيرِ وَلَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ.
میں نے پوچھا اس ورق میں کیا لکھا ہوا ہے، حضرت علیؓ نے کہا: دیت کا بیان اور قیدیوں کے چھڑانے کا اور یہ حکم کہ مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہ کریں۔

مکان خالی کرنا تھا کہ سارا گھر اسی وقت گر گیا، اس تعبیر پر سب متحیر ہوئے، لوگوں نے پوچھا کہ خواب کو اس تعبیر سے کیا مناسبت تھی؟ جواب میں فرمایا کہ قرآن میں ہے: إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا[1] بادشاہ جب کسی بستی میں (عنوة) داخل ہوتے ہیں تو اسے خراب کر دیتے ہیں، یہ شاہی لباس میں آنا اس طرف اشارہ تھا، اس سے میں نے سمجھ لیا۔

معلوم ہوا کہ ہیئت بدل کر آنے میں بھی کوئی خاص حکمت ہوتی ہے، اس لئے خواب میں مختلف تعبیریں ہوتی ہیں۔

ابن ابی جمرہ ایک بہت بڑے عارف باللہ بزرگ ہیں، انھوں نے بخاری کا حاشیہ لکھا ہے "بہجۃ النفوس" اس کا نام ہے، حافظ اکثر ان کا کلام نقل کرتے ہیں، وہ اور دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ جب منام میں دیکھنے والا حضورؐ ہی کو دیکھتا ہے تو یقظہ میں جو بحالت کشف دیکھتے ہیں، اس کے بارے میں بھی کہیں گے کہ حضورؐ ہی کو دیکھا، ایسے معاملات میں ابن تیمیہ کا قول معتبر نہیں بلکہ صوفیہ محققین کا قول معتبر ہے لکل فن رجال۔ روح المعانی میں علامہ آلوسیؒ نے اس پر بہت عمدہ بحث کی ہے کہ رویت یقظہ میں بھی ہو سکتی ہے۔

(۸۱) باب كِتَابَةِ العِلْمِ

حدیث ۱۱۱، حضرت علیؓ کی نسبت بہت شروع سے شیعوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ حضورؐ کوئی خاص نوشتہ ان کو دے گئے ہیں، اس لئے

---

(۱) النمل : ۳۴

۱۱۲ - حَدَّثَنَا اَبُوْنُعَيْمٍ الْفَضْلُ بْنُ دُكَيْنٍ قَالَ ثَنَا شَيْبَانُ عَنْ يَحْيَى عَنْ اَبِى سَلَمَةَ

ہم سے ابونعیم فضل ابن دکین نے بیان کیا، کہا، ہم سے شیبان نے بیان کیا، انھوں نے یحیٰی ابن ابی کثیر سے، انھوں نے

عَنْ اَبِى هُرَيْرَةَ اَنَّ خُزَاعَةَ قَتَلُوْا رَجُلًا مِّنْ بَنِى لَيْثٍ عَامَ فَتْحِ مَكَّةَ بِقَتِيْلٍ مِّنْهُمْ قَتَلُوْهُ

ابوسلمہ سے، انھوں نے ابوہریرہ سے کہ خزاعہ والوں نے (جو ایک قبیلہ ہے) بنی لیث (قبیلے) کے ایک شخص کو اس سال مار ڈالا جس سال

فَاُخْبِرَ بِذٰلِكَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَكِبَ رَاحِلَتَهٗ فَخَطَبَ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ

کہ فتح ہوا، اپنے ایک خون کے بدلے جو بنی لیث نے ان کا کیا تھا، اس کی خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی، آپ اپنی اونٹنی پر

حَبَسَ عَنْ مَكَّةَ الْقَتْلَ اَوِ الْفِيْلَ . قَالَ مُحَمَّدٌ وَاجْعَلُوْهُ عَلَى الشَّكِّ كَذَا قَالَ اَبُوْنُعَيْمٍ

سوار ہوئے اور خطبہ پڑھا، پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مکہ سے قتل یا فیل (ہاتھیوں) کو روک دیا، امام بخاری نے کہا: اس لفظ کو

الْقَتْلَ اَوِ الْفِيْلَ وَغَيْرُهٗ يَقُوْلُ الْفِيْلَ .

شک ہی کے ساتھ رکھو، ابونعیم نے یوں ہی کہا قتل یا فیل، اور ابونعیم کے سوا اور لوگوں نے فیل کہا ہے (شک نہیں کی)۔

ان سے سوالات ہوئے، حضرت علیؓ نے ان کا جواب دیا کہ کتاب تو کوئی نہیں سوائے کتاب اللہ کے، ہاں! اللہ نے ایک فہم ہم کو دی ہے اس سے ہم مسائل نکال لیتے ہیں، ہاں ایک مختصر سا نوشتہ ہے جو تلوار کی میان میں رکھا ہوا ہے، پوچھا گیا کہ اس میں کیا لکھا ہے؟ فرمایا: العقل، یعنی دیت کے مسائل، اور بعض روایات میں ہے: فضائل الصدقۃ و فکاک الاسیر، قیدی کو قید سے چھڑانا۔

معلوم ہوا کہ روافض نے جو مشہور کر رکھا تھا وہ صحیح نہیں تھا (۱)

قولہ ولا یقتل مسلم بکافر. اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ کافر کے بدلے مسلم قتل کیا جائے گا یا نہیں، ائمہ ثلاثہ، امام شافعی، امام مالک، امام احمد ابن حنبل کہتے ہیں کہ اگر ذمی کو یا معاہد مستأمن کو قتل کر دیا تو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا، اور امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ قتل کیا جائے گا، ترمذی کی حدیث ہے: لھم ما لنا وعلیھم ما علینا. یعنی معاہدے سے ان کی تمام چیزیں محفوظ ہوگئی ہیں اور جب ہم قصاص میں قتل نہ کریں گے تو ذمی یا معاہد کے

---

(۱) واہ چونکہ یہ تقیہ کے قائل ہیں، کہہ دیں گے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تقیہ کر لیا اور انکار کر دیا، ورنہ حقیقت وہی ہے جو ہم نے کہی۔ ۱۲ (جامع تقریر)

وَسُلِّطَ عَلَيْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اَلَا وَاِنَّهَا لَمْ تَحِلَّ لِاَحَدٍ قَبْلِيْ

اور اللہ کے رسول اور مسلمان ان پر غالب آگئے (یعنی مکہ کے کافروں پر) سن رکھو! کہ مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہیں ہوا، نہ میرے بعد کسی کے لئے حلال

وَلَا تَحِلُّ لِاَحَدٍ بَعْدِيْ اَلَا وَاِنَّهَا حَلَّتْ لِيْ سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ اَلَا وَاِنَّهَا سَاعَتِيْ هٰذِهٖ حَرَامٌ

ہوگا، سن رکھو! میرے لئے بھی وہ ایک گھڑی دن کی حلال ہوا، سن رکھو! کہ اس وقت حرام ہے، وہاں کے کانٹے نہ کاٹے جائیں، اور

لَا يُخْتَلٰى شَوْكُهَا وَلَا يُعْضَدُ شَجَرُهَا وَلَا تُلْتَقَطُ سَاقِطَتُهَا اِلَّا لِمُنْشِدٍ، فَمَنْ قُتِلَ فَهُوَ بِخَيْرِ

وہاں کے درخت نہ قطع کئے جائیں، اور وہاں کی پڑی ہوئی چیز نہ اٹھائی جائے، مگر جو پہونچانا چاہے (وہ اٹھا سکتا ہے) پس جس کا کوئی عزیز

النَّظَرَيْنِ اِمَّا اَنْ يُعْقَلَ وَاِمَّا اَنْ يُّقَادَ اَهْلُ الْقَتِيْلِ، فَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ الْيَمَنِ

مارا جائے اس کو دو میں سے ایک کا اختیار ہے، یا تو دیت لے اور یا قصاص (قاتل مقتول کے وارثوں کے حوالہ کیا جائے) اتنے میں یمن والوں میں سے

دم کی حفاظت نہ کرسکیں گے، ذمی کا خون و مال ویسا ہی محفوظ ہے جیسے مسلم کا، حنفیہ نے کہا کہ کافر سے یہاں کافر حربی مراد ہے آگے ان شاء اللہ پوری تحقیق آئے گی،

حدیث ۱۱۲ : صلح حدیبیہ میں جو معاہدہ ہوا تھا اس میں خزاعہ کا قبیلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیف ہوگیا تھا اور بنولیث کفار کے حلیف بن گئے تھے اور یہ معاہدہ ہوگیا تھا کہ کوئی کسی پر حملہ نہیں کرے گا مگر بنولیث نے غدر کیا اور خزاعہ کے ایک شخص کا قتل کردیا، خزاعہ نے ایک وفد حضورؐ کی خدمت میں بھیجا، روایات میں آیا ہے کہ حضورؐ اس وقت وضو فرما رہے تھے اور ابھی یہ وفد پہونچا نہیں تھا کہ حضورؐ نے فرمایا: مدد کی جائے گی اے بنی خزاعہ! عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا: آپ کس سے کہہ رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: بنولیث نے بدعہدی کی ہے اس کی شکایت لے کر ایک وفد آرہا ہے (گویا کہ درمیان کے پردے ہٹا دئے گئے تھے اور آپ دیکھ رہے تھے، فتح مکہ کا یہی سبب ہوا تھا، بعد فتح مکہ اس کا اعلان عام ہوگیا۔

اس کے بعد بنوخزاعہ نے موقع پاکر بنی لیث کے ایک شخص کو انتقام میں قتل کردیا، اس وقت آپ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ حَبَسَ عَنْ مَّكَّةَ الْقَتْلَ اَوِ الْفِيْلَ، یعنی قتل کو روک دیا یا اصحاب فیل کو روک دیا، یعنی کوئی حرم میں قتل کا ارتکاب نہیں کرسکتا۔

قولہ وسلط علیهم، یعنی اصحاب فیل کامیاب نہ ہوسکے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کامیاب ہوگئے۔

قولہ ولا یعضد شجرها، اس میں تفصیل ہے کہ وہ جنس نبت سے [یعنی آدمیوں کی لگائی ہوئی کھیتی یا بویا ہوا پودا یا پھول] نہ ہو، بلکہ خودرو ہو اور گھاس کھدی ہوئی نہ ہو اور اذخر مستثنیٰ ہے۔

قولہ ولا تلتقط ساقطتها الا لمنشد، اور حرم کی گری پڑی چیز نہ اٹھائی جائے، سوائے اس کے جس کو پہونچانا چاہے، چونکہ تلاش میں غفلت کا مظنہ ہے اس لئے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کردیا، حج کے زمانہ میں لوگ دور دور کے ہوتے ہیں، کوئی کیسے احتیاط کرسکتا ہے اور کیسے تعریف ہوسکتی ہے اس لئے اس کا گمان تھا کہ آدمی سمجھے کہ کہاں تلاش کرتے پھریں، لاؤ استعمال کرلیں، اس لئے منع فرمادیا۔

قولہ فمن قتل الخ، ای فمن قتل لہ قتیل۔ یقاد، قود سے ہے جس کے معنی قصاص کے ہیں، بعض روایت میں ہے اِمَّا اَنْ يُّقْتَلَ

فَقَالَ اكْتُبْ لِي يَا رَسُولَ اللّٰهِ فَقَالَ اكْتُبُوا لِأَبِي فُلَانٍ فَقَالَ رَجُلٌ مِّنْ قُرَيْشٍ إِلَّا الْإِذْخِرَ يَا

ایک شخص (ابو شاہ) آیا، اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! (آپ نے جو باتیں بیان فرمائیں وہ) مجھ کو لکھ دیجئے، آپ نے فرمایا لوگوں سے اچھا اس کو لکھ دو، قریش کے

رَسُولَ اللّٰهِ فَإِنَّا نَجْعَلُهُ فِي بُيُوتِنَا وَقُبُورِنَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَّا الْإِذْخِرَ إِلَّا الْإِذْخِرَ

ایک شخص (حضرت عباس) نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اذخر کاٹنے کی اجازت دیجئے، ہم اس کو گھروں اور قبروں میں لگاتے ہیں، آپ نے فرمایا: اچھا اذخر، اچھا اذخر (وہ کاٹ سکتے ہو)

۱۱۳۔ حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ ثَنَا سُفْيَانُ قَالَ ثَنَا عَمْرٌو قَالَ أَخْبَرَنِي وَهْبُ بْنُ

ہم سے علی بن عبد اللہ نے بیان کیا، کہا ہم سے سفیان نے بیان کیا، کہا ہم سے عمرو نے بیان کیا، کہا مجھ کو وہب بن منبہ نے خبر دی، انھوں نے اپنے بھائی

مُنَبِّهٍ عَنْ أَخِيهِ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُولُ مَا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

(ہمام بن منبہ) سے، کہا میں نے ابوہریرہ سے سنا فرماتے تھے: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں مجھ سے زیادہ حدیث کا روایت کرنے والا کوئی نہیں، البتہ

أَحَدٌ أَكْثَرَ حَدِيثًا عَنْهُ مِنِّي إِلَّا مَا كَانَ مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو فَإِنَّهُ كَانَ يَكْتُبُ وَلَا أَكْتُبُ

عبد اللہ بن عمرو نے بہت سی حدیثیں روایت کی ہیں، کیونکہ وہ لکھتے تھے اور میں لکھتا ہی نہ تھا، وہب بن منبہ کے ساتھ اس حدیث کو معمر نے بھی ہمام سے روایت کیا

تَابَعَهُ مَعْمَرٌ عَنْ هَمَّامٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ

انھوں نے ابوہریرہ سے

۱۱۴۔ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سُلَيْمَانَ قَالَ حَدَّثَنِي ابْنُ وَهْبٍ قَالَ أَخْبَرَنِي يُونُسُ عَنِ ابْنِ

ہم سے یحییٰ بن سلیمان نے بیان کیا، کہا مجھ سے وہب نے بیان کیا، کہا مجھ کو یونس نے خبر دی، انھوں نے ابن شہاب سے، انھوں نے عبید اللہ

شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا اشْتَدَّ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَعُهُ

بن عبد اللہ سے، انھوں نے ابن عباس سے، کہا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت بیمار ہوئے، تو آپ نے اپنی بیماری کی سختی میں

واما ان یقاد (یا قتل کیا جائے یا قصاص لیا جائے)، تو اب یہ پہلے کے برعکس ہوگیا۔

مراد یہ ہے کہ دونوں میں وہ مختار ہے، چاہے دیت لے چاہے قصاص۔ اس کے بعد اس معاملہ میں آپ نے اپنے پاس سے دیت (خوں بہا) دی۔ طحاوی نے اسے بہت تفصیل سے لکھا ہے کہ ذمی بھی اگر قتل کیا جائے تو کبھی قصاص یا دیت آئے گی، لیکن اس استدلال میں کلام ہے، ثابت کرنا کہ خزاعی مسلم تھا اور لیثی ذمی تھا مشکل ہے۔

قولہ اکتبوا لابی فلان۔ یہاں سے کتابت کا جواز بھی نکل آیا، اور یہی ترجمہ تھا۔

قولہ الا الاذخر۔ یہ ایک گھاس ہے جو بہت کام آتی تھی چھتوں کو اس سے پاٹ دیتے تھے۔ جیسے ہمارے یہاں پھوس اور سرکنڈے وغیرہ کی چھت پاٹ دیتے ہیں، اور قبور کے خلل کو بھرتے تھے۔

قَالَ ائْتُونِي بِكِتَابٍ أَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَا تَضِلُّوا بَعْدَهُ قَالَ عُمَرُ إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

فرمایا: لکھنے کا سامان لاؤ! میں تمہارے لئے ایک کتاب لکھوادوں، جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو، حضرت عمرؓ نے کہا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بیماری کی سختی ہے اور ہمارے پاس

غَلَبَهُ الْوَجَعُ وَعِنْدَنَا كِتَابُ اللهِ حَسْبُنَا فَاخْتَلَفُوا وَكَثُرَ اللَّغَطُ قَالَ قُومُوا عَنِّي وَلَا يَنْبَغِي

اللہ کی کتاب موجود ہے، وہ ہم کو بس کرتی ہے، لوگوں نے اختلاف شروع کیا اور غل مچ گیا، آپ نے فرمایا: چلو، اٹھو، میرے پاس لڑنے جھگڑنے کا کیا کام، ابن عباسؓ نے

عِنْدِي التَّنَازُعُ فَخَرَجَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَقُولُ إِنَّ الرَّزِيَّةَ كُلَّ الرَّزِيَّةِ مَا حَالَ بَيْنَ رَسُولِ

جب یہ حدیث روایت کی) تو یوں کہتے ہوئے نکلے: ہائے مصیبت وائے مصیبت جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کتاب نہ لکھوانے دی۔

اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبَيْنَ كِتَابِهِ

حدیث ۱۱۳: تابعہ معمر یعنی وہب بن منبہ کا متابع معمر ہے، وہاں اخیہ کہا تھا اور یہاں نام لے لیا۔

حدیث ۱۱۴: قولہ ائتونی بکتاب الخ یہ وفات شریف سے چار روز قبل یوم الخمیس (پنجشنبہ) کا قصہ ہے، آپ کو اس وقت بہت تکلیف تھی اور اسی حالت میں آپ نے فرمایا: قلم کاغذ دوات لاؤ، میں تمہیں لکھوادوں تاکہ تم بہکو نہیں حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس وقت حضور پر وجع (درد) غالب ہے، اس لئے ہمیں چاہیے کہ اس وقت تکلیف نہ دیں جیسا کہ شفیق استاذ حالت مرض میں شاگرد سے کہے کہ کتاب لاؤ میں پڑھاتا ہوں اور شاگرد عرض کرے کہ اس وقت رہنے دیجیے۔

قولہ عندنا کتاب اللہ حسبنا، خود قرآن کہتا ہے: ما فرطنا فی الکتاب من شیء[1] تو اجمالی احکام کتاب اللہ میں موجود ہیں اور تفاصیل احادیث میں

قولہ فاختلفوا، یہ اختلاف ایسا ہی ہے جیسا کہ لا یصلین احد العصر الا فی بنی قریظۃ (تم میں سے کوئی بھی عصر کی نماز نہ پڑھے لیکن بنی قریظہ میں) کی مراد سمجھنے میں ہوا تھا، اس موقع پر صحابہ میں دو گروہ ہوگئے تھے اسی طرح یہاں بھی دو خیال کے لوگ ہوگئے، ایک خیال کے لوگوں نے کہا لاؤ، دوسرے خیال کے لوگوں نے کہا اس وقت تکلیف نہ دو ——— فتح الباری میں مسند احمد سے نقل ہے کہ حضرت علیؓ کو حکم دیا تھا، اور مناسب بھی یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ اہل بیت نبوی سے تھے شیعوں نے خوب پروپیگنڈا کیا اور حضرت عمرؓ کو ہدف ملامت بنایا اور افسوس ہے کہ کچھ اہل سنت بھی ان کے ہتے چڑھ گئے، ان لوگوں نے نا سمجھی سے یہ کہدیا کہ حضرت عمرؓ نے روک دیا، حالانکہ یہ ہرگز صحیح نہیں، اس لئے کہ حکم تو حضرت علیؓ کو دیا تھا، تو وہ کیوں رک گئے؟ اور اگر حضرت علیؓ اس وقت بھی مغلوب تھے تو کس بنا پر ان کو اسد اللہ کہتے ہو، جب حضورؐ کے مقابلہ میں عمرؓ کا کہنا ٹال نہ سکے، اگر مسند احمد کی روایت نہ بھی ہوتی تو بھی اہل بیت کو تعمیل کرنی ہی چاہئے تھی، اس تقدیر پر یہ سب خطاوار ٹھہرتے ہیں، پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اگر وہ کوئی دین کی ضروری چیز ہوتی تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز نہ رکتے، بلکہ عمر رضی اللہ عنہ کو ڈانٹ دیتے اور کاغذ منگواکر ضرور لکھوادیتے، مگر آپؐ نے ایسا نہیں کیا، معلوم ہوا کہ حضور کی نگاہ میں حضرت عمرؓ کی رائے پسندیدہ تھی اس لئے آپؐ نے اسے قبول فرمالیا، اگر لکھی جاتی تو ممکن تھا کچھ سہولت ہوجاتی مگر اس کی اتنی اہمیت خود حضورؐ کی نگاہ میں نہ تھی۔ نیز اگر ضروری بھی تھی تو تنہا حضرت عمرؓ ہی کیوں ذمہ دار قرار دیے جائیں سارے صحابہ مع خاندان نبوت کے سب ہی قصور وار قرار پائیں گے، اس لئے ہم از روئے انصاف و دیانت کسی کو قصور وار نہیں سمجھتے، صرف رائے کا اختلاف ہوا، حضورؐ نے عمر رضی اللہ عنہ کی رائے قبول فرمالی اور بات ختم ہوگئی، اہل بیت نے بھی اسے اہم نہیں سمجھا ورنہ کئی دن آپ حیات رہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

---

(۱) الانعام ۳۸۔

بَابُ الْعِلْمِ وَالْعِظَةِ بِاللَّيْلِ (رات کے وقت تعلیم اور وعظ)

١١٥۔ حَدَّثَنَا صَدَقَةُ قَالَ أَخْبَرَنَا ابْنُ عُيَيْنَةَ عَنْ مَعْمَرٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ هِنْدٍ عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ

ہم سے صدقہ بن فضل نے بیان کیا کہا ہم کو سفیان بن عیینہ نے خبر دی، انھوں نے معمر سے انھوں نے زہری سے انھوں نے ہند بنت حارث سے، انھوں نے

ح وَعَمْرٍو وَيَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنِ امْرَأَةٍ عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتِ اسْتَيْقَظَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

ام سلمہ سے ۔ دوسری سند سے اور سفیان ابن عیینہ نے اس کو عمرو بن دینار اور یحیی ابن سعید سے روایت کیا انھوں نے زہری سے، انھوں نے ایک عورت سے انھوں نے

وَسَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ فَقَالَ سُبْحَانَ اللَّهِ مَاذَا أُنْزِلَ اللَّيْلَةَ مِنَ الْفِتَنِ وَمَاذَا فُتِحَ مِنَ الْخَزَائِنِ أَيْقِظُوا

ام سلمہ سے، کہا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات (نیند سے) جاگے تو فرمایا: سبحان اللہ! آج رات کو (آسمان سے دنیا میں) کیا کیا فتنے اترے (عذاب) اور کیا کیا (رحمت کے)

صَوَاحِبَ الْحُجَرِ فَرُبَّ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٍ فِي الْآخِرَةِ۔

خزانے کھلے (اے لوگو) ان حجروں والیوں (بیبیوں کو) عبادت کے لئے جگاؤ، بہت سی عورتیں دنیا میں پہنے اوڑھے ہیں، آخرت میں ننگی ہوں گی۔

یا دوسرے گھر کے کی فرد نے حضرت عباس یا ابن عباس نے دوسرے وقت کیوں نہ کا غذ پیش کیا، عمر فاروق ہر وقت تھوڑے ہی حاضر رہتے تھے اور یہ حضرات تو ہر وقت رہتے تھے معلوم ہوا کہ ان کی نگاہ میں بھی اس کی اہمیت نہ تھی، بعد میں رافضیوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بدنام کرنے کے لئے ایک حربہ بنالیا اور یہ کہدیا کہ آپ حضرت علی کی خلافت کے لئے لکھوانا چاہتے تھے، حالانکہ کچھ لوگ اس کے بھی قائل ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لئے لکھواتے اگر یہی قیاس سے کام لیا جائے کہ خلافت کے متعلق لکھواتے تو صحیح مسلم کی جو حدیث ہے ممکن ہے وہی مراد ہو، حدیث یہ ہے کہ آپ نے عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ بلا اپنے بھائی اور ابوبکر کو تاکہ میں لکھ دوں، ابوبکر کے سوا کسی اور کے لئے اللہ انکار کرتا ہے (یعنی کسی اور کی خلافت تسلیم نہیں کرتا) اسی طرح ایمان دار لوگ بھی لاؤ خلافت نامہ لکھ دوں تاکہ تمنا کرنے والے تمنا نہ کریں الخ اس قرینہ سے تو ہم یہی کہیں گے کہ ابوبکر کے لئے لکھتے۔

قولہ فخرج ابن عباس الخ سطح سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس وقت موجود تھے، مگر یہ درست نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعد وفات نبوی جس مکان میں حدیث بیان کر رہے تھے، وہاں سے یہ کہتے ہوئے نکلے کہ بہت بڑا حادثہ ہے جو حائل ہو گیا اور لکھنے نہ دیا۔

بَابُ الْعِلْمِ وَالْعِظَةِ بِاللَّيْلِ

یعنی رات کے وقت علم اور وعظ کی باتیں بتلانا، چونکہ عشاء کے بعد سمر کی ممانعت ہے اس لئے ممکن ہے کہیں اس سے دھوکہ نہ ہو [کہ علم کی بات بھی نہیں کی جاسکتی] اسی کو بتلاتے ہیں کہ [علم کی بات کرنا بعد عشاء بھی] درست ہے۔

حدیث ١١٥ : قولہ ماذا انزل اللیلۃ الخ یعنی آپ پر کشوف ہوا کہ آگے فتنے آنے والے ہیں، قضا و قدر میں جو طے ہوا تھا اسے دکھلا دیا گیا۔

قولہ ماذا فتح من الخزائن ایقظوا صواحب الحجر الخ خزائن سے رحمت کے خزانے یا قیصر و کسریٰ کے خزانے مراد ہیں، آگے فرمایا: ایقظوا صواحب الحجر یعنی حجرے والیوں کو جگا دو، تاکہ رجوع الی اللہ اور توبہ و تضرع کرلیں، یہ وقت اجابت کا ہے۔

قولہ فرب کاسیۃ الخ بہت سی عورتیں ہیں کہ یہاں بظاہر ان کا حال اچھا ہے اور آخرت میں تباہ حال ہوں گی ۔ یہ بطور وعظ ہے کہ یہاں سب کچھ اور وہاں

بَابُ السَّمَرِ بِالْعِلْمِ

(باب) رات کو علم کی باتیں کرنا

۱۱۶ - حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ عُفَيْرٍ قَالَ حَدَّثَنِي اللَّيْثُ قَالَ حَدَّثَنِي

ہم سے سعید بن عفیر نے بیان کیا، کہا مجھ سے لیث نے بیان کیا۔ کہا مجھ سے عبدالرحمٰن

عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ خَالِدِ بْنِ مُسَافِرٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَالِمٍ وَأَبِي

بن خالد بن مسافر نے انھوں نے ابن شہاب سے انھوں نے سالم بن عبداللہ اور ابوبکر

بَكْرِ بْنِ سُلَيْمَانَ بْنِ أَبِي حَثْمَةَ أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ قَالَ صَلَّى لَنَا النَّبِيُّ

ابن سلیمان ابن ابی حثمہ سے انھوں نے کہا عبداللہ بن عمر نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِشَاءَ فِي آخِرِ حَيَاتِهِ فَلَمَّا سَلَّمَ قَامَ فَقَالَ أَرَأَيْتَكُمْ

نے اپنی آخری عمر میں ہم کو عشاء کی نماز پڑھائی، جب سلام پھیرا تو کھڑے ہوئے اور فرمایا

لَيْلَتَكُمْ هٰذِهِ فَإِنَّ رَأْسَ مِائَةِ سَنَةٍ مِّنْهَا لَا يَبْقٰى مِمَّنْ هُوَ عَلٰى ظَهْرِ الْأَرْضِ

کیا تم نے اس رات کو دیکھا (اسے یاد رکھنا) اب سے سو برس کے بعد جتنے لوگ اسوقت زمین پر ہیں

أَحَدٌ۔

ان میں سے کوئی نہیں رہے گا۔

با کل بے سروسامان معلوم ہوا کہ رات کو دعظ ہو سکتا ہے اور یہی ترجمہ تھا۔

(۸۳) بَابُ السَّمَرِ بِالْعِلْمِ

حدیث نمبر ۱۱۶ قولہ :۔ فان راس مائۃ سنۃ منہا لا یبقی ممن ہو علی ظہر الارض احد

یعنی آج کی رات سے سو سال تک اور اسکے اندر اندر سب لوگ، جو اس وقت موجود ہیں فنا ہوجائیں گے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ یہ واقعہ وفات سے ایک ماہ قبل کا ہے، لہذا سنہ ۱۱۰ھ تک سب کو ختم ہو جانا چاہیئے اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اس رات میں جو لوگ موجود ہیں ان میں سے کوئی نہ ہوگا، چنانچہ یہ پیشین گوئی پوری ہوئی، اسے ساعۃ وسطیٰ کہتے ہیں، یعنی ایک قرن کی قیامت، اور ساعۃ صغریٰ من مات فقد قامت قیامتہ (جو مرگیا اس کی قیامت آگئی) اور ساعۃ کبریٰ، کل عالم کا فنا ہو جانا،

۱۱۷۔ حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ قَالَ ثَنَا الْحَكَمُ قَالَ سَمِعْتُ سَعِيْدَ
ہم سے آدم نے بیان کیا کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا کہا ہم سے حکم نے بیان کیا کہا میں نے سعید

بْنَ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بِتُّ فِي بَيْتِ خَالَتِي مَيْمُوْنَةَ بِنْتِ الْحَارِثِ
بن جبیر سے سنا انھوں نے ابن عباس سے کہا میں ایک رات کو اپنی خالہ میمونہؓ بنت حارث کے پاس سو یا

زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
جو بی بی تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی، اور اس رات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی انھیں

عِنْدَهَا فِي لَيْلَتِهَا فَصَلَّى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِشَاءَ ثُمَّ جَاءَ إِلَى
کے پاس تھے (انکی باری تھی) آپ نے عشاء کی نماز پڑھی پھر (مسجدؐ) گھر آئے اور چار رکعتیں

مَنْزِلِهِ فَصَلَّى أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ ثُمَّ نَامَ ثُمَّ قَامَ ثُمَّ قَالَ نَامَ الْغُلَيِّمُ أَوْ كَلِمَةً
پڑھیں پھر سو رہے پھر بیدار ہو کر اٹھے، اور فرمایا بچہ کیا سو گیا، یا کچھ ایسا ہی فرمایا پھر (نماز کیلئے)

اس سو سال کے بعد کسی کے زندہ باقی نہ رہنے پر سوال پیدا ہوا کہ خضر بھی زندہ ہیں یا نہیں۔ بہت سے عالم صوفیہ زندہ مانتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم ان سے ملاقاتیں کرتے ہیں، تو اب ہم کس کس کو جھٹلائیں اسلئے اس حدیث سے انھیں مستثنیٰ کرتے ہیں، کہ ممکن ہے کہ وہ اس وقت زمین پر نہ ہوں اور حضورؐ نے علی ظہر الارض فرمایا ہے، تو خضرؑ اس سے نکل گئے یا حدیث کا یہ مطلب ہے کہ جو روئے زمین پر نظر آتے ہیں حضورؐ نے انکے بارے میں فرمایا ہے باقی جو مغیب ہیں انکا یہاں ذکر نہیں ہے، اور خضرؑ مغیب ہیں، لہذا انکا بیان نہیں ہے۔ خضر کا مستجاب الدعوات ہونا نصوص سے ثابت نہیں ہوتا۔

امام بخاری انھیں زندہ نہیں مانتے جیساکہ آگے آئے گا اور جمہور صوفیہ کا قول یہ ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ حافظ نے قرطبی سے نقل کیا ہے کہ اس پر اتفاق ہے کہ وہ رسول نہیں ہیں مگر دوسرے مقام پر تین چار قول نقل کر دئے ہیں۔ نبیؑ۔ رسولؑ۔ ولیؑ۔ ملکؑ،

حدیث ۱۱۷ **قوله**: فصلی اربع رکعات بعض نے کہا کہ یہ بعد عشاء کی سنتیں ہیں، وتر سے پہلے کی رکعات نہیں ہیں، اسکی مفصل بحث باب الوتر میں آئیگی،

قوله: فجعلنی عن یمینہ بخاری نے اس حدیث سے تین مسئلے نکالے کہ اصل موقف یمین ہے،

نُشْبُهُهَا ثُمَّ قَامَ فَقُمْتُ عَنْ يَسَارِهٖ فَجَعَلَنِیْ عَنْ يَمِيْنِهٖ فَصَلّٰی خَمْسَ

کھڑے ہوئے میں بھی (جاگا اور) آپ کی بائیں طرف کھڑا ہوا۔ آپ نے مجھ کو اپنی داہنی طرف کر لیا اور پانچ رکعتیں

رَكَعَاتٍ ثُمَّ صَلّٰی رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ نَامَ حَتّٰی سَمِعْتُ غَطِيْطَهٗ اَوْخَطِيْطَهٗ ثُمَّ

پڑھیں۔ پھر دو رکعتیں (فجر کی سنتیں) پڑھیں پھر آپ سو گئے یہاں تک کہ میں نے آپ کے خراٹے کی آواز

خَرَجَ اِلَی الصَّلٰوةِ

سنی پھر (صبح کی) نماز کے لئے بر آمد ہوئے

مگر جائز تینوں ہیں۔ یمین۔ یسار۔ خلف،

قولہ فصلی خمس رکعات یہ روایت مختصر ہے، مطول میں ثابت ہے کہ تیرہ رکعات پڑھیں، غطیط۔ خراٹے، خطیط کم درجہ کے خراٹے۔ یہاں بظاہر حدیث کو ترجمۃ الباب سے کچھ مناسبت نہیں، بعض نے کہا (کرمانی وغیرہ نے) کہ نام الغلیم سمر ہے [اور اسی سے سمر فی العلم کے جواز پر استدلال ہے] حالانکہ اسے سمر نہیں کہا جاتا، سمر اصل لغت میں چاند کی چاندنی کو کہتے ہیں [پھر چاندنی رات میں افسانہ گوئی کو سمر کہنے لگے] سمر میں کلام معتدبہ ہونا چاہیئے، اور وہ قبل نوم ہوتا ہے، اور یہاں بعد نوم ہے، اسلئے مناسبت ظاہر نہیں۔ مگر بخاری دراصل امتحان کیا کرتے ہیں کہ طالب علم کہاں تک تتبع کرتا ہے۔ انھوں نے تو مگدر ڈال دیئے ہیں۔ ابن حجر نے کہا ہماری سمجھ میں حدیث کو باب سے یہ مناسبت ہے کہ بخاری یہی حدیث کتاب التفسیر میں بھی لائے ہیں، وہاں پر ہے فتحدث مع اهله ساعة (اپنی بیوی محترمہ سے کچھ دیر بات کی) ثم نام (پھر سو گئے) اب ترجمہ نکل آیا، تو گویا بخاری اشارہ کر رہے ہیں کہ اسے تلاش کرو، کہیں نہ کہیں ضرور ملے گا۔ یہ ابن حجر ہی کا کام ہے کہ تتبع کر کے نکال لیا۔ ورنہ بعضوں نے تو کہدیا کہ کوئی مناسبت نہیں، اور اس سے السمر فی العلم اس طرح نکلے گا کہ تحدث مع الاهل امر مباح ہے پس جب امر مباح میں سمر جائز ہوا، تو سمر فی العلم بطریق اولیٰ درست ہوگا۔ اسطرح حدیث سے ترجمۃ الباب کا ثبوت ہوگیا

بَابُ حِفْظِ الْعِلْمِ ۸۴

باب علم کو یاد رکھنا

۱۱۸ - حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ حَدَّثَنِیْ مَالِكٌ عَنِ

ہم سے بیان کیا عبدالعزیز بن عبداللہ نے کہا مجھ سے امام مالک نے بیان کیا انھوں نے

ابْنِ شِهَابٍ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ إِنَّ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ

ابن شہاب سے انھوں نے اعرج سے انھوں نے ابو ہریرہ سے کہا لوگ کہتے ہیں کہ ابو ہریرہ نے بہت حدیثیں

أَكْثَرَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ وَلَوْلَا آيَتَانِ فِیْ كِتَابِ اللهِ مَا حَدَّثْتُ حَدِيْثًا ثُمَّ يَتْلُوْ

بیان کیں اور بات یہ ہے کہ اگر اللہ کی کتاب میں یہ دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں کوئی حدیث بیان نہ کرتا، پھر (سورۂ بقرہ کی)

إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدٰى إِلٰى قَوْلِهِ الرَّحِيْمُ

یہ آیت پڑھتے جو لوگ چھپاتے ہیں ان کھلی ہوئی نشانیوں اور ہدایت کی باتوں کو جو ہم نے اتاریں (اخیر تک یعنی

إِنَّ إِخْوَانَنَا مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ كَانَ يَشْغَلُهُمُ الصَّفْقُ بِالْأَسْوَاقِ وَإِنَّ

انا التواب الرحیم تک) ہمارے بھائی مہاجرین تو بازاروں میں خرید و فروخت میں پھنسے رہتے اور ہمارے انصاری بھائی

إِخْوَانَنَا مِنَ الْأَنْصَارِ كَانَ يَشْغَلُهُمُ الْعَمَلُ فِیْ أَمْوَالِهِمْ وَإِنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ

اپنی کھیتی باڑی کے کام میں لگے رہتے، اور ابو ہریرہ (نہ کوئی پیشہ کرتا تھا نہ سوداگری) وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے آنحضرت

كَانَ يَلْزَمُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشِبَعِ بَطْنِهِ وَيَحْضُرُ

صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جما رہتا اور ایسے موقعوں پر حاضر رہتا جہاں یہ لوگ حاضر نہ رہتے، اور وہ باتیں

مَا لَا يَحْضُرُوْنَ وَيَحْفَظُ مَا لَا يَحْفَظُوْنَ،

یاد رکھتا جو وہ لوگ یاد نہ رکھتے،

---

(۸۴) بَابُ حِفْظِ الْعِلْمِ

(حدیث ۱۱۸) **قوله:-** اِنَّ النَّاسَ الخ معلوم ہوتا ہے کہ [حقیقت سے ناواقف لوگ] ابو ہریرہ پر شروع ہی سے اعتراض کرتے آئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کل تین سال تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے

۱۱۹۔ حَدَّثَنَا اَبُوْ مُصْعَبٍ اَحْمَدُ بْنُ اَبِیْ بَکْرٍ قَالَ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ اِبْرَاهِیْمَ بْنِ دِیْنَارٍ عَنِ ابْنِ اَبِیْ ذِئْبٍ عَنْ سَعِیْدِنِ الْمَقْبُرِیِّ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ اَسْمَعُ مِنْكَ حَدِیْثًا کَثِیْرًا اَنْسَاهُ قَالَ اُبْسُطْ رِدَاءَكَ فَبَسَطْتُّهُ فَغَرَفَ بِیَدَیْهِ ثُمَّ قَالَ ضُمَّهُ فَضَمَمْتُهُ فَمَا نَسِیْتُ شَیْئًا بَعْدُ۔

ہم سے ابو مصعب احمد بن ابی بکر نے بیان کیا کہا ہم سے محمد بن ابراہیم ابن دینار نے بیان کیا انھوں نے محمد بن ابی ذئب سے انھوں نے سعید مقبری سے انھوں نے ابو ہریرہ سے کہا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں آپ سے بہت باتیں سنتا ہوں انکو بھول جاتا ہوں آپ نے فرمایا اپنی چادر بچھا، میں نے بچھائی آپ نے اپنے دونوں ہاتھ سے ایک لپ لے کر اس میں ڈال دیا پھر فرمایا اسکو لپیٹ لے (یا اپنے سینے سے لگالے) میں نے لپیٹ لیا (یا اپنے سینے سے لگالیا) اسکے بعد میں کوئی چیز نہ بھولا

۱۲۰۔ حَدَّثَنَا اِبْرَاهِیْمُ بْنُ الْمُنْذِرِ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ اَبِیْ فُدَیْكٍ بِهٰذَا اَوْ قَالَ فَغَرَفَ بِیَدِهٖ فِیْهِ۔

ہم سے ابراہیم بن منذر نے بیان کیا، کہا ہم سے ابن ابی فدیک نے یہی حدیث بیان کی اس روایت میں یہ ہے کہ آپنے ہاتھ سے چلو لیکر اسمیں ڈال دیا۔

اور اتنی زیادہ حدیثیں نقل کرتے ہیں، اس کا جواب خود ابو ہریرہؓ یہ دیتے ہیں کہ کتمانِ علم حرام ہے اور مجھ پر احادیث کا بیان کرنا واجب ہے، کَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی :۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْهُدٰی الآیۃ، یہ آیت اسی لئے پڑھی کہ کتمان درست نہیں۔ پھر خود ہی [کثرت روایت] کی وجہ بھی بتادی کہ ہمارے بھائی مہاجرین وانصار اپنے اپنے مشاغل میں مصروف رہتے تھے، ان کو حضور کے پاس حاضری کا وقت کم ملتا تھا، اور میرا حال یہ تھا کہ میں ہر وقت حضور ہی کے ساتھ چمٹا رہتا تھا، میرے پاس کوئی دوسرا کوئی مشغلہ یا دھندا تھا ہی نہیں، اس لئے میں پوری فراغت سے ہر بات سنتا تھا۔

(حدیث ۱۱۹) اسکے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دوسری خصوصی عنایت بھی مجھ پر یہ تھی کہ آپ نے اپنے دست مبارک سے میری چادر میں کچھ ڈال دیا تھا، ہاتھ بظاہر خالی تھا مگر اس میں علم کے خزانے تھے،

۱۲۱—حَدَّثَنَا اِسْمٰعِیْلُ قَالَ حَدَّثَنِیْ اَخِیْ عَنِ ابْنِ اَبِیْ ذِئْبٍ

ہم سے اسمٰعیل بن ابی اویس نے بیان کیا کہا مجھ سے میرے بھائی (عبدالحمید نے) بیان کیا انھوں نے ابن

عَنْ سَعِیْدِ نِ الْمَقْبُرِیِّ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ حَفِظْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ

ابی ذئب سے انھوں نے سعید مقبری سے انھوں نے ابوہریرہ سے کہا میں نے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے (علم کے)

عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وِعَائَیْنِ فَاَمَّا اَحَدُھُمَا فَبَثَثْتُہٗ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُہٗ

دو تھیلے سیکھے، یعنی دو طرح کے علم حاصل کئے ایک کو میں نے (لوگوں میں) پھیلا دیا اور دوسرے کو اگر میں پھیلادوں

قُطِعَ ھٰذَا الْبُلْعُوْمُ

تو میرا بلعوم کاٹ ڈالا جائے،

قَالَ اَبُوْعَبْدِ اللّٰہِ اَلْبُلْعُوْمُ مَجْرَی الطَّعَامِ،

امام بخاری نے کہا بلعوم (نرخرا) وہ ہے جس سے کھانا اترتا ہے،

بَابٌ الْاِنْصَاتُ لِلْعُلَمَاءِ۔

(باب) عالموں کی بات سننے کیلئے خاموش رہنا،

۱۲۲- حَدَّثَنَا حَجَّاجٌ قَالَ ثَنَا شُعْبَۃُ قَالَ اَخْبَرَنِیْ عَلِیُّ بْنُ مُدْرِكٍ

ہم سے حجاج نے بیان کیا کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا کہا خبر دی مجھ کو علی بن مدرک نے انھوں نے

اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسکے بعد سے حضور کی کوئی بات بھولتا نہ تھا، اسلئے میرے پاس ذخیرہ حدیث بہت تھا، اور چھپانا منع تھا اسلئے میں نے سب ہی کچھ امت کو پہونچا دیا۔

(حدیث ۱۲۱) **قولہ**:۔ حفظت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعائین یعنی اتنا علم کہ اگر اسکو کسی ظرف میں بھرا جائے تو بڑے بڑے دو برتن بھر جائیں دو برتن بایں طور کہ ایک ظاہر سے تعلق رکھتا تھا اور دوسرا اسرار دین سے۔

قولہ:۔ قطع ھذا البلعوم صوفیہ اس سے وحدۃ الوجود وغیرہ مراد لیتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں، کیونکہ روایات میں تصریح ہے کہ یہ اسماء منافقین اور فتن وغیرہ تھے جو حضور نے انھیں بتائے تھے، چونکہ انکا تعلق تبلیغ سے نہ تھا اسلئے انھیں بیان نہیں کیا۔ یہ محدثین کی تصریح ہے،

باب الانصات للعلماء

یعنی جب علماء کچھ بیان کریں تو لوگوں کو [چپ ہو جانا چاہئے اور خاموشی سے سننا چاہیئے]

عَنْ اَبِیْ زُرْعَةَ عَنْ جَرِیْرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَہٗ

ابوزرعہ سے انھوں نے جریر سے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں ان سے فرمایا لوگوں کو خاموش کر

فِیْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ اسْتَنْصِتِ النَّاسَ فَقَالَ لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ کُفَّارًا

(جب جریر نے خاموش کردیا) تو آپنے فرمایا (لوگو) میرے بعد ایک دوسرے کی گردنیں مار کر

یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ،

کافر نہ بن جانا،

بَابُ ۸۶ مَا یُسْتَحَبُّ لِلْعَالِمِ اِذَا سُئِلَ اَیُّ النَّاسِ اَعْلَمُ فَیَکِلُ الْعِلْمَ اِلَی اللّٰہِ تعالیٰ

باب - جب عالم سے یہ پوچھا جائے کہ سب لوگوں میں بڑا عالم کون ہے تو اسکو یوں کہنا چاہیئے کہ

اللہ کو معلوم ہے۔

۱۲۳- حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْمُسْنَدِیُّ قَالَ ثَنَا سُفْیٰنُ

ہم سے عبداللہ بن محمد مسندی نے بیان کیا کہا ہم سے سفیان نے بیان کیا کہا ہم سے

قَالَ ثَنَا عَمْرٌو قَالَ اَخْبَرَنِیْ سَعِیْدُ بْنُ جُبَیْرٍ قَالَ قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ

عمرو بن دینار نے بیان کیا کہا مجھ کو سعید بن جبیر نے خبر دی کہا میں نے ابن عباس سے کہا کہ نوف بکالی کہتا ہے کہ

(حدیث ۱۲۲) **قولہ**:- قال لہ فی حجۃ الوداع استنصت الناس آپ نے جریر بن عبداللہ سے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا۔ لوگوں کو چپ کراؤ اور جب وہ چپ ہوکر آپ کی طرف متوجہ ہوگئے تو فرمایا لا ترجعوا الخ یہ خطبہ بہت طویل ہے مگر بخاری کئی بابوں میں اس کا کوئی کوئی جزو لائے ہیں، کہیں یکجا پورا نہیں لائے، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمان کا قتل فعل کفار اور خصلت کفار ہے۔

بعض روایات میں لفظ ضُلَّالًا آیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قتل مسلم سے وہ خارج از اسلام نہیں ہوتا اسی بنا پر قتالہ کفر کی تاویل کرتے ہیں۔

(۸۶) **باب ما یستحب للعالم الخ**

قولہ:- اِذَا سُئِلَ الخ یعنی اگرچہ سب سے بڑا عالم ہو، جب اس سے سوال کیا جائے کہ ای الناس اعلم [سب سے بڑا عالم کون ہے، یا سب سے زیادہ علم کس کو ہے] تو اسکو کہنا چاہیئے اللہ اعلم کیونکہ اسکو تمام دنیا کا کیا علم؟ اسطرح علماء کو تواضع کی تعلیم دی کہ کوئی اپنے علم پر دعویٰ نہ کرے

(حدیث ۱۲۳) **قولہ**:- المسندی چونکہ ان کی عادت تھی کہ احادیث مسندہ کو تلاش کرتے تھے اس لئے

اِنَّ نوفًا البكالي يزعم اَنَّ موسٰى ليس موسٰى بني اسرائيل

وہ موسیٰؑ (جو خضر کے ساتھ گئے تھے) بنی اسرائیل کے موسیٰ نہیں ہیں بلکہ دوسرے موسیٰ (بن میشا) ہیں

اِنَّمَا هُوَ موسٰى اٰخَرُ فَقَالَ كَذَبَ عَدُوُّ اللهِ حَدَّثَنَا اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ

انھوں نے کہا جھوٹا ہے اللہ کا دشمن ہم سے ابی بن کعب نے بیان انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَامَ مُوْسَى النَّبِيُّ خَطِيْبًا فِيْ

سنا آپ نے فرمایا موسیٰ نبیؑ بنی اسرائیل میں خطبہ پڑھنے کو کھڑے ہوئے، لوگوں نے ان سے پوچھا

بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ فَسُئِلَ اَيُّ النَّاسِ اَعْلَمُ فَقَالَ اَنَا اَعْلَمُ فَعَتَبَ اللهُ

سب لوگوں میں بڑا عالم کون ہے موسیٰ نے کہا میں بڑا عالم ہوں، اللہ نے ان پر عتاب فرمایا

عَزَّ وَجَلَّ عَلَيْهِ اِذْ لَمْ يَرُدَّ الْعِلْمَ اِلَيْهِ فَاَوْحَى اللهُ اِلَيْهِ اِنَّ عَبْدًا مِّنْ

کیوں کہ انھوں نے یوں نہیں کہا، اللہ کو معلوم ہے پھر اللہ نے انھیں وحی بھیجی کہ میرا ایک بندہ

عِبَادِيْ بِمَجْمَعِ الْبَحْرَيْنِ هُوَ اَعْلَمُ مِنْكَ قَالَ يَا رَبِّ وَكَيْفَ بِهٖ فَقِيْلَ لَهٗ

ہے وہاں جہاں دو دریا (فارس اور روم کے سمندر) ملتے ہیں۔ وہ تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ موسیٰ نے عرض کیا

انھیں مسندی کہنے لگے۔ سفیان سے یہاں ثوری مراد ہیں۔ ابن عیینہ نہیں، [فتح الباری میں ہے کہ ابن عیینہ مراد ہیں]۔

قولہ:۔ نوفا البکالی یہ دمشق کے رہنے والے تابعی اور بہت بڑے عالم تھے، پہلے یہودی تھے، کعب احبار کے طبقے کے ہیں سعید بھی تابعی ہیں، اور ابن عباس کے تلمیذ ہیں، بحث یہ چھڑ گئی تھی کہ حضرت خضر کے واقعہ میں جن موسیٰ کا ذکر ہے وہ کون ہیں؟ موسیٰ بن عمران علیہ السلام، یا موسیٰ بن میشا؟

قولہ:۔ کذب عدو اللہ نوف مسلم و عالم تھے، لوگوں نے انھیں بڑے طبقہ سے شمار کیا ہے۔ پھر عدو اللہ کیوں کہا؟ تو بعض نے کہا کہ ممکن ہے ابن عباس کو ان کے ایمان میں شبہ رہا ہو، مگر یہ درست نہیں بلکہ یہ ایسا ہی ہے جیسے محاورات میں کسی سخت غلطی پر زجر کیلئے بڑا چھوٹے کو سخت کلمہ کہدیتا ہے۔ ایسا ہی ابن عباس نے کہدیا۔

قولہ:۔ فعتب یعنی کچھ عتاب ہوا۔ انبیاء علیہم السلام سے مواخذہ لفظی بھی ہو جاتا ہے، اللہ کو یہ عنوان پسند نہ آیا اسلئے عتاب فرمایا گیا، جیساکہ داؤد علیہ السلام کے لئے بھی قرآن میں آیا ہے۔

قولہ:۔ مجمع البحرین۔ اس میں بہت سے اقوال ہیں۔ شاہ صاحب (علامہ انور شاہ) سے مذاکرہ ہوا تو فرمایا

احْمِلْ حُوتًا فِي مِكْتَلٍ فَإِذَا فَقَدتَّهُ فَهُوَ ثَمَّ فَانْطَلَقَ وَانْطَلَقَ

پروردگار میں اس تک کیسے پہونچوں، حکم ہوا کہ ایک مچھلی زنبیل میں رکھ لے جہاں وہ مچھلی گم ہوجائے وہیں وہ

مَعَهُ بِفَتَاهُ يُوشَعَ بْنِ نُونٍ وَحَمَلَا حُوتًا فِي مِكْتَلٍ حَتَّى كَانَا عِنْدَ الصَّخْرَةِ

ملے گا، پھر موسیٰ علیہ السلام چلے اور ان کے ساتھ انکے خادم یوشع بن نون بھی تھے، اور دونوں نے ایک مچھلی زنبیل میں

وَضَعَا رُؤُسَهُمَا فَنَامَا فَانْسَلَّ الْحُوتُ مِنَ الْمِكْتَلِ فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ

رکھ لی جب دونوں صخرہ کے پاس پہونچے تو اپنے سر (زمین پر) رکھ کر سوگئے۔ مچھلی زنبیل سے نکل بھاگی اور دریا میں اپنے

سَرَبًا وَكَانَ لِمُوسَى وَفَتَاهُ عَجَبًا فَانْطَلَقَا بِقِيَّةَ لَيْلَتِهِمَا وَيَوْمِهِمَا فَلَمَّا

راستہ لیا، اور موسیٰؑ اور ان کے خادم کو تعجب ہوا، خیر وہ دونوں ایک رات دن میں جتنا باقی رہا تھا اس میں چلتے رہے

أَصْبَحَ قَالَ مُوسَى لِفَتَاهُ آتِنَا غَدَاءَنَا لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَذَا نَصَبًا

جب صبح ہوئی تو موسیٰؑ نے اپنے خادم سے کہا ہمارا ناشتہ لاؤ ہم تو اس سفر سے تھک گئے، اور موسیٰؑ کو تھکان نے چھوڑا

وَلَمْ يَجِدْ مُوسَى مَسًّا مِنَ النَّصَبِ حَتَّى جَاوَزَ الْمَكَانَ الَّذِي أُمِرَ بِهِ

بھی نہیں مگر جب اس جگہ سے آگے بڑھ گئے جہاں تک ان کو جانے کا حکم ہوا تھا اس وقت ان کے خادم نے کہا تم نے

فَقَالَ لَهُ فَتَاهُ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ قَالَ مُوسَى

نہیں دیکھا جب ہم صخرہ کے پاس پہونچے تھے تو (مچھلی نکل بھاگی) میں اس کا ذکر کرنا بھول گیا موسیٰ نے کہا ہم تو اسی کی

ذَلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلَى آثَارِهِمَا قَصَصًا فَلَمَّا انْتَهَيَا إِلَى الصَّخْرَةِ

تلاش میں تھے آخر وہ دونوں کھوج میں لگاتے ہوئے اپنے پاؤں کے نشانوں پر لوٹے جب اس صخرہ کے پاس پہونچے

کہ خلیج فارس جو کراچی سے بصرہ تک چلی گئی ہے اور آگے بھی گئی ہے تو جہاں خلیج فارس میں نہر فرات گرتی ہے وہ مجمع البحرین ہے،

قولہ :- ھو اعلم منك، ای من وجہ، کیونکہ ان کو جزئیاتِ تکوینیہ کا علم تھا اور موسیٰ کو کلیاتِ تشریعیہ کا، اور ظاہر ہے کہ کلیاتِ تشریعیہ کا علم افضل ہے، لہٰذا افضل تو یقیناً موسیٰ ہی تھے، مگر چونکہ ان کے منہ سے ایک ایسا لفظ نکل گیا تھا جس سے دعوی مترشح ہوتا تھا، اسلئے زجراً یہ فرمایا گیا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ اور یوشع دونوں حضرات سو گئے تھے، لیکن بعض روایات میں ہے کہ حضرت موسیٰ دیکھ رہے تھے، لہٰذا ماننا پڑے گا کہ اس وقت وہ جاگ رہے تھے، اگرچہ پہلے سو رہے ہوں۔ سرباً سرنگ

قولہ وکان لموسیٰ وفتاہ عجبا، راوی نے اسکو مقدم کر دیا ہے ورنہ یہ مؤخر ہے، مسبجیٰ :- ای مغطّی،

إِذَا رَجُلٌ مُسَجًّى بِثَوْبٍ أَوْ قَالَ تَسَجَّى بِثَوْبِهِ فَسَلَّمَ مُوسَىٰ فَقَالَ الْخَضِرُ
دیکھا تو ایک شخص (سورہا) ہے کپڑا لپیٹے ہوئے یا کپڑا لپیٹے ہے، موسیٰؑ نے (اس کو سلام کیا، خضر جاگ اٹھے (انھوں
وَأَنَّى بِأَرْضِكَ السَّلَامُ فَقَالَ أَنَا مُوسَىٰ، فَقَالَ مُوسَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ؟
نے) کہا تیرے ملک میں سلام کہاں سے آیا؟ موسیٰؑ نے کہا میں موسیٰ ہوں، خضر نے کہا بنی اسرائیل کے موسیٰ؟
قَالَ نَعَمْ، قَالَ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَنِي مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا، قَالَ إِنَّكَ
انھوں نے کہا ہاں، (پھر) کہا کیا میں تمہارے ساتھ رہ سکتا ہوں اس شرط پر کہ تم کو جو علم کی باتیں سکھائی گئی ہیں
لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا، يَا مُوسَىٰ إِنِّي عَلَىٰ عِلْمٍ مِنْ عِلْمِ اللَّهِ عَلَّمَنِيهِ
وہ مجھ کو سکھلاؤ، خضر نے کہا تم سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا، موسیٰ بات یہ ہے کہ اللہ نے ایک (قسم کا) علم مجھ کو
لَا تَعْلَمُهُ أَنْتَ، وَأَنْتَ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَّمَكَهُ اللَّهُ لَا أَعْلَمُهُ، قَالَ سَتَجِدُنِي
دیا ہے جو تم کو نہیں ہے، اور تم کو ایک (قسم کا) علم دیا ہے جو مجھ کو نہیں ہے، موسیٰؑ نے کہا اگر خدا چاہے تو ضرور مجھ کو صبر کرنے والا
إِنْ شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا فَانْطَلَقَا يَمْشِيَانِ عَلَىٰ
پاؤگے اور میں کسی کام میں تمہاری نافرمانی نہیں کرنے کا، آخر دونوں سمندر کے کنارے کنارے روانہ ہوئے ان کے پاس
سَاحِلِ الْبَحْرِ لَيْسَ لَهُمَا سَفِينَةٌ فَمَرَّتْ بِهِمَا سَفِينَةٌ فَكَلَّمُوهُمْ
کشتی نہ تھی (کہ سمندر پار جائیں) اتنے میں ایک کشتی ادھر سے گذری، انھوں نے کشتی والوں سے کہا ہمکو سوار کرلو،
أَنْ يَحْمِلُوهُمَا فَعُرِفَ الْخَضِرُ فَحَمَلُوهُمَا بِغَيْرِ نَوْلٍ فَجَاءَ عُصْفُورٌ
خضر کو انھوں نے پہچان لیا اور موسیٰ اور خضر کو بے کرایہ سوار کرلیا، اتنے میں ایک چڑیا آئی اور کشتی کے کنارے بیٹھ کر

قوله وانی بارضك السلام، یہ کفار کا ملک ہوگا، یا سلام کے علاوہ کوئی اور آداب تحیۃ کے ہوں گے، اس سے معلوم ہوا کہ خضر کو اس کا علم نہ تھا، باوجودیکہ جزئیات تکوینیہ کے عالم تھے، تو معلوم ہوا کہ علم کسی کا محیط نہیں،

قوله انك لن تستطيع الخ، حضرت خضر یا تو فراست سے سمجھے کہ نباہ مشکل ہے، یا اس وجہ سے کہ یہ عالم ہیں شریعت کے اور انھیں کلیات کا علم ہے، میں جزئی علم کے مطابق عمل کروں گا، اور وہ کلیات کے مطابق، لہٰذا وہ اعتراض کریں گے اور معاملہ نبھ نہ سکے گا۔

قوله ان شاء الله صابرا الخ، موسیٰ علیہ السلام نبی تھے، ان کو شاید یہ خیال بھی نہ تھا کہ خضر جیسا شخص ایسے منکرات کا مرتکب ہوگا، اسلئے وعدہ کرلیا، مگر جب منکرات دیکھے تو شانِ نبوت کے تقاضے سے اعتراض کیا،

قوله فحملوهما الخ، معلوم ہوتا ہے کہ یوشع کی معیت یہیں تک رہی، بعد کو مفارقت ہوگئی کیونکہ آگے کہیں ان کا ذکر نہیں آتا،

فَوَقَعَ عَلٰی حَرْفِ السَّفِیْنَةِ فَنَقَرَ نَقْرَةً اَوْ نَقْرَتَیْنِ فِی الْبَحْرِ فَقَالَ

اس نے ایک یا دو چونچیں سمندر میں ماریں، خضر نے کہا موسیٰ! میرے اور تمہارے علم دونوں نے اللہ کے علم میں سے اتنا

الْخَضِرُ یَا مُوْسٰی مَا نَقَصَ عِلْمِیْ وَعِلْمُكَ مِنْ عِلْمِ اللّٰهِ تَعَالٰی اِلَّا كَنَقْرَةِ

لیا ہے جیسے اس چڑیا کی چونچ نے سمندر میں سے، اسکے بعد خضر کشتی کے تختوں میں سے ایک تختہ کی طرف چلے اور اسکو اکھیڑ ڈالا،

هٰذِهِ الْعُصْفُوْرِ فِی الْبَحْرِ فَعَمَدَ الْخَضِرُ اِلٰی لَوْحٍ مِنْ اَلْوَاحِ السَّفِیْنَةِ

حضرت موسیٰ کہنے لگے ان لوگوں نے تو ہم کو بے کرایہ سوار کیا اور تم نے یہ کام کیا کہ ان کی کشتی میں چھید کر دیا،

فَنَزَعَهٗ فَقَالَ مُوْسٰی قَوْمٌ حَمَلُوْنَا بِغَیْرِ نَوْلٍ عَمَدْتَّ اِلٰی سَفِیْنَتِهِمْ

کشتی والوں کو ڈبانا چاہا، خضر نے کہا میں نہیں کہہ چکا تھا کہ تم سے میرے ساتھ صبر نہیں ہونے کا،

فَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا

موسیٰؑ نے کہا بھول چوک پر میری گرفت نہ کرو اور میرے کام کو مشکل میں نہ پھنساؤ،

قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِیْتُ وَلَا تُرْهِقْنِیْ مِنْ اَمْرِیْ عُسْرًا

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ پہلا اعتراض تو موسیٰؑ کے بھولے ہی سے تھا

قولہ :- ما نقص الخ یہ مطلب نہیں کہ اللہ کے علم میں سے اتنا کم ہوگیا، یہ تو دنیا کے اہل میں بھی نہیں ہوتا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسے اس تری کی کوئی حقیقت نہیں سمندر کے پانی کے مقابلے میں، اسی طرح انسانی علم کی کوئی حقیقت نہیں اللہ کے علم کے مقابلہ میں، یہ بھی محض مثال ہے، ورنہ علم الٰہی غیر متناہی ہے، اور یہاں دونوں متناہی ہیں، اس میں صرف من وجہٍ مناسبت ہے ورنہ غیر متناہی کو متناہی سے کوئی نسبت نہیں، مگر اس سے بہتر کوئی مثال نہ تھی، اس لئے اسے بیان کیا گیا۔

قولہ فعمد الخضر الی لوح من الواح السفینۃ فنزعہ، مفسرین لکھتے ہیں، کہ جب ساحل کے قریب کشتی پہونچی اس وقت تختہ نکالا۔

قولہ فقال موسیٰ قوم حملونا بغیر نول الخ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ آپنے دو کام کئے ایک کسر سفینہ، کہ اس سے مالک سفینہ کا نقصان ہوا، حالانکہ وہ محسن تھے، دوسرے غرق راکبین، کہ وہ بے قصور ہیں، یہ دونوں کام غلط ہوئے موسیٰ علیہ السلام کی نگاہ میں۔

قولہ قال لا تؤاخذنی، یہ سوال دراصل نسیان کی وجہ سے تھا، اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے معذرت کی، اور حضرت خضر نے بھی اسے قبول کرلیا، اور آگے چلے۔

قَالَ فَكَانَتِ الْاُوْلٰى مِنْ مُّوْسٰى نِسْيَانًا فَانْطَلَقَا فَاِذَا غُلَامٌ يَّلْعَبُ
خیر پھر دونوں چلے۔ ایک لڑکا لڑکوں میں کھیل رہا تھا، خضر نے کیا کیا کہ اوپر سے اس کا
مَعَ الْغِلْمَانِ فَاَخَذَ الْخَضِرُ بِرَاْسِهٖ مِنْ اَعْلَاهُ فَاقْتَلَعَ رَاْسَهٗ بِيَدِهٖ
سر تھاما اور اپنے ہاتھ سے اس کا سر اوکھیڑ لیا، موسیٰؑ نے کہا،
فَقَالَ مُوْسٰى اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ
تو نے ایک معصوم جان کا ناحق خون کیا، خضر نے کہا میں نے تم سے نہیں
اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا، قَالَ ابْنُ عُيَيْنَةَ وَهٰذَا اَوْكَدُ،
کہا تھا کہ تم سے میرے ساتھ صبر نہیں ہونے کا، ابن عیینہ نے کہا یہ پہلے کلام سے زیادہ سخت ہے،
فَانْطَلَقَا حَتّٰى اِذَا اَتَيَا اَهْلَ قَرْيَةٍ اِسْتَطْعَمَا اَهْلَهَا فَاَبَوْا
خیر پھر دونوں چلے، چلتے چلتے ایک گاؤں والوں کے پاس پہونچے اُن سے کھانا مانگا، انھوں نے کھانا کھلانے سے انکار کیا،

قوله فاذا غلام الخ، غلام کا اطلاق جوان بالغ پر بھی ہوتا ہے، موسیٰ علیہ السلام نے معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غلام کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، تو اس کا اطلاق نابالغ میں منحصر نہیں ہے، اب یہ امر کہ یہ غلام بالغ تھا یا نابالغ، تو قرآن و حدیث میں کچھ تصریح نہیں، ہاں آثار و اقوال ہیں کہ وہ نابالغ تھا،

قوله زكية، یعنی بے جرم، اور بچہ اگر قتل بھی کردے تو اس پر قصاص نہیں، اور یہاں تو اس نے کوئی قصور بھی نہیں کیا تھا، اسی کو موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا، بغیر نفس۔

قوله الم اقل لك الخ، یہاں لك بڑھا کر تاکید کردی۔

قوله جدارا يريد الخ، یعنی پرانے زمانے کی عظیم الشان دیوار اسقدر جھک گئی تھی کہ گرنے کے قریب ہوگئی تھی۔

قوله قال الخضر الخ، یہاں قال بمعنی اشار ہے، یعنی حضرت خضر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے سیدھا کردیا، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا عجیب بات ہے، جس نے احسان کیا اور بلا کرایہ کے بٹھالیا، اسکی تو کشتی توڑدی اور نقصان پہونچایا، اور جنھوں نے انتہائی بے مروتی سے کھانا تک کھلانے سے انکار کردیا، ان کے ساتھ احسان و کرم کا یہ معاملہ!

استطعما اهلها میں مفسرین کو یہ اشکال پیش آیا ہے کہ لفظ اهل کو مکرر کیوں لایا گیا، استطعماهم کہنا چاہیئے تھا، زمخشری وغیرہ نے بہت کچھ لکھا ہے اور نکتے بیان کئے ہیں، مگر میں کہتا ہوں کہ اس پر غور کرو کہ کلام کی غرض کیا ہے۔

أَنْ يُضَيِّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَنْ يَنْقَضَّ قَالَ الْخَضِرُ

پھر دونوں نے دیکھا اس گاؤں میں ایک دیوار ہے جو گرانا چاہتی ہے حضرت خضر نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا

بِيَدِهِ فَأَقَامَهُ فَقَالَ لَهُ مُوسَى لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا،

اور دیوار کو سیدھا کر دیا، حضرت موسیٰؑ نے کہا تم چاہتے تو اس کی مزدوری (اس گاؤں والوں سے) لے سکتے تھے،

قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ، قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حضرت خضر نے کہا بس مجھ میں تم میں جدائی کی گھڑی آپہونچی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ موسیٰ پر رحم کرے

يَرْحَمُ اللّٰهُ مُوسَى لَوَدِدْنَا لَوْ صَبَرَ حَتَّى يُقَصَّ عَلَيْنَا مِنْ أَمْرِهِمَا

ہم تو یہ چاہتے تھے کاش موسیٰؑ صبر کرتے تو ان کے اور حالات بھی ہم سے بیان کئے جاتے

قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ يُوسُفَ ثَنَا بِهِ عَلِيُّ بْنُ خَشْرَمٍ قَالَ سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ بِطُولِهِ

محمد بن یوسف نے کہا ہم سے اس حدیث کو علی بن خشرم نے بیان کیا کہا ہم کو سفیان بن عیینہ نے خبر دی، یعنی لمبی حدیث

میں کہتا ہوں کہ مقصود بد اخلاقی اور بخل کی مذمت کرنا ہے [اسکے بعد سنو کہ] ایک تو کسی بستی سے محض گذرنا ہے، اور ایک بستی والوں کے پاس جانا ہے، اگر کوئی بطور مرور [کسی بستی سے] گذر جائے، تو کہیں گے کہ فلاں شخص قریہ میں آیا، یا قریہ سے گذرا، یہ نہ کہیں کہ قریہ والوں کے پاس گیا، کیونکہ یہ مرور و عبور ہے، اتیان باہلہ نہیں ہے، اہل عرف کے نزدیک،

دوسری چیز یہ ہے کہ اگر مسافر اہل قریہ کے پاس گیا تو بستی میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ جو وہاں کے اہل اور باشندے ہیں، دوسرے وہ جو ہیں تو بستی ہی میں، مگر خود مسافرت کی حالت میں ہیں اہل نہیں، جیسے ہم یہاں ڈابھیل میں رہتے ہیں، اگر کوئی ہمارے پاس آئے اور ہم کہیں کہ ہم خود مسافر ہیں، تو ہمارا عذر مقبول ہوگا، لیکن اس بستی کے اصل باشندے یہ جواب دیں تو ان کا عذر قبول نہ ہوگا،

اب سمجھو کہ قرآن انھیں دو باتوں کو بتاتا ہے کہ موسیٰ اور خضر علیہما السلام اہل قریہ کے پاس گئے تھے، قریہ سے صرف مرور و عبور نہ تھا بلکہ بالقصد اتیان الی اہل القریہ تھا، ایک بات تو یہ ہوئی، دوسری بات یہ ہے کہ اہل قریہ میں سے بھی انکے پاس گئے، جو خود مستقل وہاں کے باشندے تھے، مسافرت کی حالت میں نہ تھے، ان سے کھانا طلب کیا تھا، اور انھوں نے کیا، تو اب پوری تقبیح و مذمت، اور سوء اخلاقی کا بیان ہوگیا، حاصل یہ کہ پہلے اَهْلَ سے عام، اور دوسرے اَهْلَ سے خاص وہاں کے باشندے مراد ہیں، جن سے سوال کیا، مگر انھوں نے انکار کیا، تو ان کی کمال بے مروتی ظاہر ہوگئی اس بنا پر موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ ایسے بد اخلاقوں کے ساتھ یہ سلوک؟

بَابُ مَنْ سَأَلَ وَهُوَ قَائِمٌ عَالِمًا جَالِسًا

(باب) ایک عالم سے جو بیٹھا ہو کھڑے کھڑے سوال کرے۔

۱۲۴ — حَدَّثَنَا عُثْمَانُ قَالَ ثَنَا جَرِيْرٌ عَنْ مَنْصُوْرٍ عَنْ أَبِي وَائِلٍ

ہم سے عثمان بن ابی شیبہ نے بیان کیا کہا ہم سے جریر نے بیان کیا انھوں نے منصور سے انھوں نے ابو وائل

عَنْ أَبِي مُوْسٰى قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

سے انھوں نے ابو موسیٰ سے انھوں نے کہا ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور پوچھنے لگا یا رسول اللہ!

فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْقِتَالُ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ فَإِنَّ أَحَدَنَا يُقَاتِلُ

کون سا لڑنا ہے؟ کیونکہ ہم میں سے کوئی غصے کی وجہ سے لڑتا ہے اور کوئی (شخصی یا قومی یا ملکی)

غَضَبًا وَّيُقَاتِلُ حَمِيَّةً، فَرَفَعَ إِلَيْهِ رَأْسَهُ قَالَ وَمَا رَفَعَ إِلَيْهِ رَأْسَهُ

حمیت (غیرت) کی وجہ سے، آپ نے اسکی طرف سر اٹھایا اسلئے کہ (آپ بیٹھے تھے) اور وہ کھڑا تھا آپنے فرمایا

إِلَّا أَنَّهُ قَائِمًا فَقَالَ مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ

جو کوئی اسلئے لڑے کہ اللہ کا بول بالا ہو تو وہ لڑنا اللہ کی راہ میں ہے۔

بَابُ السُّؤَالِ وَالْفُتْيَا عِنْدَ رَمْيِ الْجِمَارِ

(باب) کنکریاں مارتے وقت مسئلہ پوچھنا اور جواب دینا

۱۲۵ — حَدَّثَنَا أَبُوْ نُعَيْمٍ قَالَ ثَنَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ أَبِي سَلَمَةَ

ہم سے ابو نعیم نے بیان کیا کہا ہم سے عبد العزیز بن ابی سلمہ نے انھوں نے

قولہ یرحم اللہ موسیٰ لوددنا الخ، یعنی اگر موسیٰ علیہ السلام کچھ صبر کرتے تو اور بہت سے عجائبات معلوم ہوتے، حضرت خضر کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ وہ نبی ہیں، اور اللہ نے انھیں تخصیص و تقیید کا اختیار دیا تھا، اس لئے اگر اس مصلحت نے کہ اسکے ماں باپ فساد سے بچ جائیں۔ لڑکے کو قتل کر دیا، تو کسی اعتراض کی گنجائش نہیں، کلیات تشریعیہ میں خلاف کرنے کا حق نہیں ہے، ہاں جزئیات تکوینیہ میں کسی کشف سے کیا جا سکتا ہے۔ قرآن پاک کی اس آیت وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ أَمْرِيْ[۱] میں امر ہے، جو نبی کو ہوتا ہے ولی کو نہیں، اس لئے کسی ولی کے لئے جزئیات تکوینیہ میں یہ اختیار ثابت کرنا ہرگز درست نہیں، کما فعلہ الجہال۔

[۱] کہف:۔ ۸۲

عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ عِيسَى بْنِ طَلْحَةَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ
زہری سے، انھوں نے عیسیٰ بن طلحہ سے انھوں عبد اللہ بن عمرو سے انھوں نے کہا میں نے
رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَ الْجَمْرَةِ وَهُوَ يُسْأَلُ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جمرہ عقبہ کے پاس دیکھا آپ سے لوگ مسئلے پوچھ رہے تھے
فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللّٰهِ نَحَرْتُ قَبْلَ أَنْ أَرْمِيَ فَقَالَ ارْمِ وَلَا حَرَجَ
ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے کنکریاں مارنے سے پہلے (بھولے سے) قربانی کردی، آپ نے فرمایا
قَالَ آخَرُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ حَلَقْتُ قَبْلَ أَنْ أَنْحَرَ قَالَ انْحَرْ وَلَا حَرَجَ
اب کنکریاں کچھ حرج نہیں، دوسرے نے کہا یا رسول اللہ میں نے قربانی کرنے سے پہلے سر منڈا لیا (بھولے سے)
فَمَا سُئِلَ عَنْ شَيْءٍ قُدِّمَ وَلَا أُخِّرَ إِلَّا قَالَ افْعَلْ وَلَا حَرَجَ
آپ نے فرمایا اب قربانی کرلے کچھ حرج نہیں، پھر آپ سے اس دن جو چیز پوچھی گئی کہ وہ آگے ہوئی یا پیچھے، آپ نے یہی فرمایا اب کرلے کچھ حرج نہیں

---

(۸۷) بَابُ مَنْ سَأَلَ وَهُوَ قَائِمٌ الخ

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعاجم کی طرح کا فعل ہے، اور یہ ممنوع ہے، تو اس کا جواب دیتے ہیں، کہ یہ بضرورت جائز ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا، کہ اس سے علم کی بے قدری نہیں ہوتی

(۸۸) بَابُ السُّؤَالِ وَالْفُتْيَا عِنْدَ رَمْيِ الْجِمَارِ

رمی جمار طاعت و عبادت ہے، تو ایسے وقت میں سوال کرنا درست ہے یا نہیں، تو کہتے ہیں کہ جائز ہے، بشرطیکہ طاعت استغراق کی نہ ہو، جیسے کہ صلوٰۃ، کہ یہاں ناجائز ہے،

قوله:- قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَ الْجَمْرَةِ
چونکہ قریب کھڑے تھے، اس لئے استدلال کردیا، اگرچہ خاص رمی جمار نہیں فرمارہے تھے،

باب قولِ اللهِ تعالى وما أُوتيتم من العلمِ إلّا قليلًا (٨٩)

باب، اللہ کا (سورۂ بنی اسرائیل میں فرمانا) اور تم کو تھوڑا ہی سا علم دیا گیا،

۱۲۶ — حدَّثنا قيسُ بنُ حفصٍ قال ثنا عبدُ الواحدِ قال
ہم سے قیس بن حفص نے بیان کیا کہا ہم سے عبدالواحد نے بیان کیا کہا ہم سے اعمش

ثنا الأعمشُ سليمانُ بنُ مهرانَ عن إبراهيمَ عن علقمةَ عن
نے بیان کیا جن کا نام سلیمان بن مہران ہے، انھوں نے ابراہیم سے انھوں نے علقمہ سے انھوں نے

عبدِ اللهِ قال بينا أنا أمشي مع النبيّ صلّى الله عليه وسلّم في خربِ
عبداللہ بن مسعود سے کہا ایک بار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کے کھنڈروں (یا کھیتیوں)

المدينةِ وهو يتوكّأ على عسيبٍ معه فمرّ بنفرٍ من اليهودِ
میں چل رہا تھا آپ کھجور کی چھڑی پر جو آپ کے پاس تھی ٹیکا لگاتے جاتے تھے، راہ میں چند یہودیوں پر سے

فقال بعضهم لبعضٍ سلوه عن الروحِ، فقال بعضهم لا تسألوه
آپ گذرے، انھوں نے آپس میں کہا ان سے روح کو پوچھو، اُن میں بعضوں نے کہا مت پوچھو ایسا نہ ہو وہ ایسی بات

لا يجيءُ فيه بشيءٍ تكرهونه فقال بعضهم لنسألنّه، فقام رجلٌ
کہیں جو تم کو بُری معلوم ہو بعضوں نے کہا ہم تو ضرور پوچھیں گے، آخر ان میں ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا ابوالقاسم

---

(۸۹) باب قولِ اللهِ تعالى وما أُوتيتم من العلمِ إلّا قليلًا

حدیث ۱۲۶، بعض روایات میں ہے کہ حضور بیت المدراس میں تشریف لے گئے، اور وہاں یہ سوال جواب ہوئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ **خرب**:۔ ویرانہ۔ **عسیب** چھڑی۔

قل الرّوح الخ اس بات میں اختلاف ہے کہ اس آیت میں کیا اس مسئلہ میں غور کرنے سے بالکل روک دیا گیا ہے، یا کسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، صوفیہ کہتے ہیں کہ اشارہ کیا گیا ہے، اور علماء کہتے ہیں کہ روک دیا گیا ہے کہ تم اسے سمجھ نہیں سکتے، اور اسکی حقیقت معلوم کرنے کی ضرورت نہیں، لہذا اس بحث میں پڑنا درست نہیں، میں نے اپنے رسالہ الرّوح فی القرآن میں بتلایا ہے، کہ آیات میں اشارات موجود ہیں، اسی رسالہ میں میں نے یہ بھی بتلایا ہے کہ امر و خلق میں کیا فرق ہے، فانظر هناك۔

مِنهُم فقال یا ابا القاسم ما الرُّوحُ ؟ فسكت فقلتُ انّه یُوحیٰ الیهِ فقمتُ
روح کیا چیز ہے ؟ یہ سن کر آپ چپ ہو رہے، میں سمجھ گیا کہ آپ پر وحی آرہی ہے اور کھڑا ہو گیا، جب وحی کی حالت
فلمّا انجلی عنهُ فقال: ویسئلونك عن الرُّوح، قُل الرُّوحُ من امرِ ربّی وما
جاتی رہی تو آپ نے (سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیت) پڑھی، یعنی اے پیغمبر تجھ سے روح کو پوچھتے ہیں، کہدے روح میرے
اُوتُوا من العلمِ الّا قلیلا۔
مالک کا حکم ہے، اور ان لوگوں کو تھوڑا ہی علم ملا ہے۔

قال الاعمش هی کذا فی قرائتنا: "وما اُوتُوا"
اعمش نے کہا ہم نے اس آیت کو یونہی پڑھا ہے "وما اُوتُوا"

باب ۹۰ من ترك بعض الاختیار مخافة ان یقصر فهم بعض النّاس
باب، بعضے اچھی بات اس ڈر سے چھوڑ دینا کہیں ناسمجھ لوگ اس کو نہ سمجھیں اور اس کے نہ کرنے سے بڑھ کر کسی
فیقعوا فی اشدّ منه
گناہ میں نہ پڑ جائیں۔

۱۲۷ - حدّثنا عبید اللهِ بن موسیٰ عن اسرائیل عن ابی اسحٰق عن
ہم سے عبید اللہ بن موسیٰ نے بیان کیا انھوں نے اسرائیل سے انھوں نے ابو اسحاق سے انھوں نے اسود سے

---

(۹۰) باب من ترك بعض الاختیار الخ
بظاہر اس باب کا تعلق کتاب العلم سے نہیں ہے، مگر حقیقتاً گہرا تعلق ہے۔ ترجمہ تو یہ ہے کہ کوئی کام جو مختار و پسندیدہ ہو اس ڈر سے اس کو نہ کرے کہ بعض نافہم سمجھنے سے قاصر رہیں گے اور پھر اس سے بڑے فتنے میں مبتلا ہو جائیں گے۔

حدیث ۱۲۷، اس کے لئے یہ حدیث لائے کہ حضور فرماتے ہیں کہ اگر قریش نئے نئے مسلم نہ ہوتے تو میں کعبہ کو ابراہیم کی بنا کے مطابق بناتا، قریش نے بنا کعبہ میں چند کوتاہیاں کی تھیں، اول یہ کہ حطیم کو خارج کر دیا تھا، دوسرے یہ کہ دروازہ ایک کر دیا تھا، تیسرے یہ کہ کرسی بہت اونچی کر دی تھی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ حطیم کو داخل کر دیا جائے، اور دروازے دو ہوں، ایک دخول کا دوسرا خروج کا، اور کرسی نیچی کر دی جائے، مگر آپ نے ایسا کیا نہیں، کیونکہ خوف تھا کہ کہیں لوگ عظیم غلطی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

الْاَسْوَدِ قَالَ قَالَ لِیْ اِبْنُ الزُّبَیْرِ کَانَتْ عَائِشَةُ تُسِرُّ اِلَیْكَ کَثِیْرًا فَمَا حَدَّثَتْكَ

کہ عبداللہ بن زبیرؓ نے مجھ سے کہا حضرت عائشہؓ چپکے چپکے تم سے بہت باتیں کیا کرتی تھیں تو کعبہ کے باب میں بھی انھوں نے

فِی الْکَعْبَةِ قُلْتُ قَالَتْ لِیْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَا عَائِشَةُ

کچھ تم سے کہا تھا، میں نے کہا انھوں نے یہ کہا تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا عائشہ اگر تیری قوم

لَوْلَا اَنَّ قَوْمَكِ حَدِیْثٌ عَهْدُهُمْ قَالَ اِبْنُ الزُّبَیْرِ بِکُفْرٍ لَنَقَضْتُ

(قریش کے لوگ) نو مسلم نہ ہوتے - ابن زبیرؓ نے کہا یعنی کفر کا زمانہ ابھی گذرا نہ ہوتا - تو میں کعبہ کو توڑ کر اس

الْکَعْبَةَ فَجَعَلْتُ لَهَا بَابَیْنِ بَابًا تَدْخُلُ النَّاسُ وَبَابًا یَخْرُجُوْنَ مِنْهُ

میں دو دروازے لگاتا ایک دروازہ میں سے لوگ اندر جاتے اور ایک دروازہ میں سے باہر نکلتے، پھر

فَفَعَلَهُ ابْنُ الزُّبَیْرِ

ابن زبیرؓ نے (اپنی حکومت کے زمانہ میں) ایسا ہی کیا

… کو کتاب العلم سے یہ مناسبت ہے کہ بخاری تنبیہ کر رہے ہیں کہ عالم کو حکیم بھی ہونا چاہیئے اور اصلاح کے وقت لوگوں کے حالات پر نظر رکھنا چاہیئے کہ کہیں چھوٹی بات کی اصلاح سے کسی بڑی برائی میں نہ پڑ جائیں۔

قولہ الاسود: یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے شاگرد ہیں، اور ابن زبیرؓ صحابی ہیں، تو صحابی تابعی سے سوال کر رہے ہیں،

قولہ فما حدثتك الخ: یہاں حدیث مختصر ہے، بعض روایات میں ہے کہ ابن زبیرؓ نے کہا کہ مجھے بھی حدیث سنائی ہے۔ اور تمہیں بھی، مگر مجھے پوری محفوظ نہیں لہذا تم سناؤ اور جہاں تم بھولو گے میں لقمہ دوں گا، پھر ایسا ہی ہوا،

قولہ حدیث عهدهم، یہاں حدیث عهدهم بالاضافہ ہے، مگر زیادہ شروح میں حدیثٌ بالتنوین ہے، یہاں تک اسود نے سنایا پھر یاد نہ رہا تو ابن زبیر نے کہا بالکفر،

قولہ ففعلہ ابن الزبیر یعنی ابن زبیر نے عمل کر کے دکھلا دیا، مگر عبدالملک بن مروان نے اسے قائم نہ رہنے دیا، حجاج اس کا نائب تھا، اور یہی امیر لشکر بھی تھا، اس نے جب مکہ مکرمہ پر چڑھائی کی، اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو جو اس وقت امیر مکہ تھے، شہید کر دیا۔ اس کے بعد حجاج نے عبدالملک کو حضرت ابن زبیر کی شہادت کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا کہ کعبہ کی اس وقت یہ صورت ہے، اسے باقی رہنے دیا جائے یا توڑ کر پہلے جیسا بنا دیا جائے۔ عبدالملک نے اس کے جواب میں لکھا کہ ہمیں ابن زبیرؓ کی عمارت کی ضرورت نہیں ہے لہذا

باب: مَنْ خَصَّ بِالْعِلْمِ قَوْمًا دُوْنَ قَوْمٍ كَرَاهَةَ اَنْ لَّا يَفْهَمُوْا وَقَالَ

باب بعضے علم کی باتیں کچھ لوگوں کو بتانا کچھ لوگوں کو اس خیال سے کہ انکی سمجھ میں نہ آئے گی نہ بتانا۔ اور حضرت علی

عَلِيٌّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُوْنَ اَتُحِبُّوْنَ اَنْ يُّكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ

رضی اللہ عنہ نے کہا (لوگوں سے) دین کی وہی باتیں کہو جو وہ سمجھیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کا رسول جھٹلایا جائے

۱۲۸۔ حَدَّثَنَا بِهٖ عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ مُوْسٰى عَنْ مَعْرُوْفٍ عَنْ اَبِي

ہم سے اس قول کو عبید اللہ بن موسیٰ نے بیان کیا انھوں نے معروف سے انھوں نے ابو الطفیل سے انھوں نے

الطُّفَيْلِ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے۔

۱۲۹:۔ حَدَّثَنَا اِسْحٰقُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ اَنَا مُعَاذُ بْنُ هِشَامٍ

ہم سے اسحٰق بن ابراہیم نے بیان کیا کہا ہم کو معاذ بن ہشام نے خبر دی کہا مجھ سے میرے باپ نے

قَالَ حَدَّثَنِيْ اَبِيْ عَنْ قَتَادَةَ قَالَ ثَنَا اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ اَنَّ النَّبِيَّ

بیان کیا انھوں نے قتادہ سے کہا۔ ہم سے انس بن مالک رض نے بیان کیا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمُعَاذٌ رَدِيْفُهٗ عَلَى الرَّحْلِ قَالَ يَا مُعَاذُ

معاذ سے فرمایا جب معاذ رض آپ کی خواصی میں سواری پر بیٹھے تھے۔ اے معاذ!

اسے توڑ دو۔ چنانچہ عمارت جو منشار نبوی کے عین مطابق تھی، توڑ کر اسے سابق حالت پر لے آیا گیا۔ پھر ہارون رشید نے اپنے زمانے میں اس کو تبدیل کرنا چاہا مگر امام مالک رحمہ اللہ نے اسے روک دیا۔

(۹۱) باب من خص بالعلم قومًا دون قوم الخ

یعنی استاد کچھ علوم وحقائق بعض طلبہ کے سامنے بیان کرے اور بعض سے پوشیدہ رکھے، اس خیال سے کہ یہ نہ سمجھیں گے تو یہ عین حکمت کا مقتضا ہے کیونکہ اگر عوام کے سامنے ذات وصفات کے مسائل بیان کئے جائیں تو ظاہر ہے کہ وہ کیا سمجھیں گے۔

قولہ اتحبون ان یکذب۔ یعنی جب ان کی عقل میں نہ آئے گا تو وہ اسے غلط سمجھیں گے اور اس غلط فہمی کا سبب تم بنو گے لہذا احتیاط کرنا چاہیے۔

امام احمد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ جن احادیث سے خروج علی السلطان کا جذبہ یا جرأۃ علی العاصی

بْنَ جَبَلٍ قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ قَالَ يَا مُعَاذُ

انھوں نے عرض کیا حاضر ہوں یا رسول اللہ حاضر۔ آپ نے فرمایا یا معاذ!

قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ قَالَ يَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّيْكَ

انھوں نے عرض کیا حاضر ہوں یا رسول اللہ حاضر، آپ نے فرمایا معاذ! انھوں نے عرض کیا

يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ ثَلٰثًا قَالَ مَا مِنْ اَحَدٍ يَّشْهَدُ اَنْ

حاضر ہوں یا رسول اللہ حاضر۔ تین بار۔ (آپ نے معاذ کو پکارا پھر) فرمایا جو کوئی سچے دل سے یہ گواہی دے

لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ صِدْقًا مِّنْ قَلْبِهٖ

کہ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بھیجے ہوئے ہیں۔ تو اللہ اسکو

اِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا اُخْبِرُ بِهٖ

دوزخ پر حرام کر دے گا۔ معاذ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا میں لوگوں کو اس کی خبر کردوں

النَّاسَ فَيَسْتَبْشِرُوْنَ قَالَ اِذًا يَّتَّكِلُوْا وَاَخْبَرَ بِهَا مُعَاذٌ عِنْدَ

وہ خوش ہو جائیں گے۔ آپ نے فرمایا ایسا کرے گا تو انکو بھروسہ ہو جائیگا۔ اور معاذ نے مرتے وقت گنہگار

مَوْتِهٖ تَاَثُّمًا:

ہونے کے ڈر سے یہ لوگوں کو بیان کر دیا۔

پیدا ہو ان کو عوام کے سامنے نہ بیان کرنا چاہیے۔ اور امام مالکؒ نے کہا ایسی احادیث جو صفات کے مسائل پر مشتمل ہوں انکا ذکر عوام کے سامنے نہ کرو۔ جیسے اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ وغیرہ۔ اس کے علاوہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث گذر چکی ہے جس میں انھوں نے بعض علوم کے متعلق فرمایا کہ فلو بثثتہ لقطع ھٰذا البلعوم۔ اسی طرح حسن بصریؒ بھی ایسی چیزیں بیان کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت انس بن مالکؓ نے عرنیین کی حدیث مثلاً حجاج کے سامنے بیان کی تو انھیں (حسن بصریؒ کو) برا لگا کیونکہ وہ خود سفاک تھا اور اس سے اس کی جرأت بڑھتی۔

حافظؒ نے لکھا ہے کہ اس کا ضابطہ یہ ہے کہ جس حدیث کا ظاہر کسی بدعت کی تقویت کرتا ہو یا معصیت پر جرأت دلاتا ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد وہ نہ ہو تو ایسی حدیث کو ایسے لوگوں میں جو نہ سمجھتا ہو یا نہ سمجھ سکتا ہو نہ بیان کرنا چاہیے ــــ تو اب سمجھو کہ اگر عوام کے سامنے اس قسم کی چیزیں بیان کریں گے تو وہ غلطی میں مبتلا ہو جائیں گے

۱۳۰۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا مُعْتَمِرٌ قَالَ سَمِعْتُ
ہم سے مسدد نے بیان کیا کہا ہم سے معتمر نے بیان کیا کہا میں نے اپنے باپ سے
اَبِیْ قَالَ سَمِعْتُ اَنَسًا قَالَ ذُكِرَ لِیْ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ
سنا کہا میں نے انس رضؓ سے سنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضؓ سے فرمایا
وَسَلَّمَ قَالَ لِمُعَاذٍ مَنْ لَقِیَ اللّٰهَ لَا یُشْرِكُ بِهٖ شَیْئًا دَخَلَ
جو شخص اللہ سے ملے وہ (دنیا میں) شرک نہ کرتا ہو تو وہ بہشت میں
الْجَنَّةَ قَالَ اَلَا اُبَشِّرُ بِهِ النَّاسَ قَالَ لَا اِنِّیْ اَخَافُ اَنْ یَّتَّكِلُوْا
جائے گا۔ معاذ رضؓ نے عرض کیا کیا میں لوگوں کو یہ خوشخبری نہ دوں؟ آپ نے فرمایا نہیں، میں ڈرتا ہوں کہیں وہ بھروسہ نہ کر بیٹھیں۔

لہذا احتیاط کرنا چاہیے اور نہ بیان کرنا چاہیے۔ وعظ، تلقین، تذکیر، درس، عام مجالس سب میں لحاظ رکھنا چاہیے کہ کہیں لوگوں کو دھوکہ نہ ہو اور وہ غلطی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ مثلاً متشابہات کا ذکر جیسے حدیث میں ہے کہ دوزخ جب گرم ہوگی تو اللہ اپنا قدم رکھے گا۔ عوام کے سامنے اسے بیان کیا جائے تو وہ اسے کیا سمجھ پائیں گے اس لئے اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

حدیث ۱۲۸۔ قولہ عن معروف، یعنی ابن خربوذ، یہ ثلاثیات بخاری سے ہے۔ ثلاثی وہ ہے جس میں تیسرا راوی صحابی ہو یہاں [تیسرے راوی] ابو الطفیل صحابی ہیں جو حضرت علیؓ سے روایت کر رہے ہیں۔

حدیث ۱۲۹۔ قولہ لبیك یا رسول اللّٰہ وسعدیك ثلثاً تین بار اہتمام شان کیلئے فرمایا۔

قولہ مامن احد یشھد اس کی بہترین تاویل ہے جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ سے شیخ الہندؒ نے نقل کی ہے۔ کہ جیسے طب کے اندر دو قسم کی کتابیں ہیں، ایک وہ جنمیں مفردات کے خواص و تاثیرات، حرارت و برودت رطوبت و یبوست کا ذکر ہے، دوسری وہ جن میں مرکب نسخوں کے مزاج بتلائے جاتے ہیں جنھیں قرابادین کہتے ہیں۔ مثلاً ایک نسخہ میں بیس دوائیں ہیں تو کسر و انکسار کے بعد ان بیس دواؤں کا جو مجموعی مزاج بنتا ہے اس کا بیان ہوتا ہے۔ بعینہ اسی طرح عمل کی دو صورتیں ہیں، ایک مفردات دوسری مرکبات۔ انبیاء علیہم السلام مفردات کا حال بیان کرتے ہیں اور مرکبات کا حال قیامت میں کھلے گا۔ مثلاً فرمایا من قال لا الٰہ الا اللّٰہ تو اس میں کلمہ کی تاثیر بیان فرمائی کہ اس کا قائل جنت میں جائے گا دوزخ میں نہ جائے گا اور فرمایا لا یدخل الجنۃ قتات یا فرمایا من ادعی غیر ابیہ وانتمی الی غیر موالیہ فعلیہ لعنۃ اللّٰہ والملٰئکۃ والناس اجمعین تو ان کی تاثیرات یہی ہیں کہ جنت میں نہ جائے یا لعنت کا

بَابُ الْحَيَاءِ فِي الْعِلْمِ وَقَالَ مُجَاهِدٌ لَا يَتَعَلَّمُ الْعِلْمَ مُسْتَحْيٍ وَلَا مُتَكَبِّرٌ

باب، علم میں شرم کیسا ہے۔ اور مجاہد نے کہا جو شخص شرم کرے یا مغرور ہو اس کو علم نہیں آنے کا۔

وَقَالَتْ عَائِشَةُ نِعْمَ النِّسَاءُ نِسَاءُ الْأَنْصَارِ لَمْ يَمْنَعْهُنَّ الْحَيَاءُ

اور حضرت عائشہ نے کہا، انصار کی عورتیں بھی کیا اچھی عورتیں ہیں ان کو شرم نے دین کی سمجھ حاصل کرنے

أَنْ يَتَفَقَّهْنَ فِي الدِّينِ۔

سے نہیں روکا۔

۱۳۱۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ أَخْبَرَنَا أَبُو مُعَاوِيَةَ

ہم سے محمد بن سلام بیکندی نے بیان کیا، کہا ہم کو ابو معاویہ نے خبر دی

قَالَ حَدَّثَنَا هِشَامٌ عَنْ أَبِيهِ عَنْ زَيْنَبَ بِنْتِ أُمِّ سَلَمَةَ عَنْ

کہا ہم سے ہشام بن عروہ نے بیان کیا انھوں نے اپنے باپ عروہ سے انھوں نے زینب سے جو بیٹی تھیں ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کی انھوں نے

أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ جَاءَتْ أُمُّ سُلَيْمٍ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

ام سلمہؓ سے۔ انھوں نے کہا، ام سُلیم (انس کی ماں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں

وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ

اور پوچھنے لگیں یا رسول اللہ! اللہ حق بات سے شرم نہیں کرتا۔

مستحق ہو اور کلمہ کی تاثیر یہ ہے کہ جنت میں جائے۔ اب ایک شخص کے اندر یہ سب باتیں ہیں تو اب کسر و انکسار سے کیا مزاج پیدا ہوا یہ آخرت میں کھلے گا۔ اگرچہ کہیں کہیں بتلا بھی دیا ہے لیکن عام طور پر مفردات کی خصوصیات بتلاتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ دونوں درست ہیں۔ مرکب کی تاثیر کا حال آخرت میں معلوم ہوگا اور وہ یہ کہ جو غالب رہے گا وہ کھینچ لے جائیگا۔ مثلاً شفاعت سے کلمہ اسے جنت میں کھینچ لے جائیگا۔ یا آگ میں میل کچیل جلا دیا جائے گا پھر کلمہ کندن کر کے جنت میں کھینچ لائے گا۔ تو اب یہ تاویل نہیں بلکہ مدلول ہے یہ استاذ (حضرت شیخ الہندؒ) سے منقول ہے۔ مگر اسکو ابن رجبؒ نے بھی مجملاً لکھا ہے۔

[ایک مثال سے اس کو یوں سمجھو کہ پانی بارد بالطبع ہے اگر اس کو آگ پر رکھ کر اس قدر گرم کر لیا جائے کہ وہ آگ کا کام کرنے لگے تو اسے حار کہیں گے لیکن اب بھی برودت طبعی جو جذر طبیعت میں رکھی ہے وہ موجود ہے مگر مستور ہو گئی ہے۔ جیسا کہ متنبی نے کہا ہے ؎

فَهَلْ عَلَى الْمَرْأَةِ مِنْ غُسْلٍ إِذَا احْتَلَمَتْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ

کیا عورت کو اگر احتلام ہو تو اس کو غسل کرنا چاہیے ؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا رَأَتِ الْمَاءَ فَغَطَّتْ أُمُّ سَلَمَةَ تَعْنِي وَجْهَهَا

البتہ وہ (جاگ کر) پانی دیکھے۔ یہ سن کر ام سلمہؓ نے اپنا منہ (شرم سے) ڈھانک لیا

وَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَوَ تَحْتَلِمُ الْمَرْأَةُ ؟ قَالَ نَعَمْ تَرِبَتْ

اور عرض کیا، یا رسول اللہ ! کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے ؟ آپ نے فرمایا ہاں تیرے ہاتھ کو

يَمِينُكِ فَبِمَ يُشْبِهُهَا وَلَدُهَا۔

مٹی لگے، پھر بچہ کی صورت ماں سے کیوں ملتی ہے۔

۱۳۲۔ حَدَّثَنَا إِسْمٰعِيلُ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ

ہم سے اسمٰعیل بن ابی اویس نے بیان کیا کہا مجھ سے امام مالکؒ نے انھوں نے عبداللہ بن دینار

بْنِ دِينَارٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

سے انھوں نے عبداللہ بن عمرؓ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا وَهِيَ مَثَلُ

درختوں میں ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے۔ مسلمان کی وہی مثال ہے

الْمُسْلِمِ حَدِّثُونِي مَا هِيَ ؟ فَوَقَعَ النَّاسُ فِي شَجَرِ الْبَادِيَةِ

مجھ سے کہو وہ کون سا درخت ہے ؟ یہ سنکر لوگوں کا خیال جنگل کے درختوں کی طرف دوڑا

وَوَقَعَ فِي نَفْسِي أَنَّهَا النَّخْلَةُ، قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ فَاسْتَحْيَيْتُ

اور میرے دل میں آیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔ عبداللہ نے کہا لیکن مجھ کو شرم آئی (میں کہہ نہ سکا)

قَالُوا يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَخْبِرْنَا بِهَا، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

آخر لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ ہی بتلائیے وہ کونسا درخت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

وَسَلَّمَ هِيَ النَّخْلَةُ، قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ فَحَدَّثْتُ أَبِي بِمَا وَقَعَ فِي

فرمایا وہ کھجور کا درخت ہے عبداللہ نے کہا پھر میں نے اپنے باپ (حضرت عمرؓ) سے بیان کیا جو میرے

نَفْسِي فَقَالَ لَأَنْ تَكُونَ قُلْتَهَا أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ يَكُونَ لِي كَذَا وَكَذَا،

دل میں آیا تھا۔ انھوں نے کہا اگر تو (اس وقت) کہہ دیتا تو مجھ کو اتنا اتنا مال ملنے سے بھی زیادہ خوشی ہوتی۔

بابٌ مَنِ اسْتَحْيَى فَأَمَرَ غَيْرَهُ بِالسُّؤَالِ ۹۳

باب جو کوئی شرم سے آپ نہ پوچھے دوسرے شخص سے پوچھنے کو کہے۔

۱۳۲- حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ دَاوُدَ

ہم سے مسدد نے بیان کیا کہا ہم سے عبد اللہ بن داؤد نے بیان کیا

عَنِ الْأَعْمَشِ عَنْ مُنْذِرٍ الثَّوْرِيِّ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ

انھوں نے اعمش سے انھوں نے منذر ثوری سے انھوں نے محمد بن حنفیہ سے

الْحَنَفِيَّةِ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ كُنْتُ رَجُلًا

انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے انھوں نے کہا میری مذی بہت نکلا کرتی

مَذَّاءً فَأَمَرْتُ الْمِقْدَادَ أَنْ يَسْأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

تھی۔ میں نے مقداد سے کہا تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا مسئلہ پوچھو

وَسَلَّمَ فَسَأَلَهُ فَقَالَ فِيهِ الْوُضُوءُ۔

انھوں نے پوچھا آپ نے فرمایا مذی سے وضو کرنا چاہیئے۔

عذل العواذل حول قلبی التائہ وھوی الاحبۃ منہ فی سودائہ

ملامت کرنیوالوں کی ملامت میرے پریشان دل کے گرد ہے اور محبوب کی محبت سویدائے قلب کے اندر ہے

ایسا ہی یہاں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہی گرم پانی آگ پر ڈال دیا جائے تو آگ کو بجھا دیگا۔ اگر اس کے اندر برودت نہ تھی تو کیوں انطفا ہوا۔ معلوم ہوا کہ برودت اسکی ذاتی ہے جو گرم ہونے کی حالت میں بھی موجود تھی۔ اسی طرح مومن کیلئے کلمہ ایک ذاتی چیز ہے جو قلب میں مستور ہے اور عوارض نے گھیر لیا ہے۔ جب عوارض مندفع ہو گئے شفاعت سے یا کلمہ سے یا مغفرت سے یا دوزخ میں جلنے سے، کسی طرح بھی عوارض دور ہوئے تو ذاتی چیز کا ظہور ہو گیا بخلاف کافر کے کہ اس میں نجاست ہے اور وہ ذات میں ہے کسی صابون سے کٹنے والی نہیں، اور معاصی اوپر کی نجاسات ہیں کلمہ اندر مستور ہے، عوارض کے اندفاع سے وہ لوٹ آئیگا اور جنت میں لے جائے گا۔

(۹۲) باب الحیاء فی العلم

قولہ، مستکبر، یعنی متکبر کو بھی علم نہیں آتا کیونکہ کبر اظہار احتیاج سے مانع ہے اور علم احتیاج سے آتا ہے۔ جب تک

باب ۹۴ ذِکْرِ الْعِلْمِ وَالْفُتْیَا فِی الْمَسْجِدِ

باب، مسجد میں علم کی باتیں کرنا اور فتوے دینا۔

۱۳۴ - حَدَّثَنَا قُتَیْبَةُ بْنُ سَعِیْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّیْثُ بْنُ سَعْدٍ

ہم سے قتیبہ بن سعید نے بیان کیا، کہا ہم سے لیث بن سعد نے بیان کیا

قَالَ حَدَّثَنَا نَافِعٌ مَوْلٰی عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ

کہا ہم سے نافع نے جو غلام تھے عبد اللہ بن عمرؓ کے انھوں نے عبداللہ بن عمرؓ سے، کہ

عُمَرَ اَنَّ رَجُلًا قَامَ فِی الْمَسْجِدِ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مِنْ اَیْنَ تَاْمُرُنَا

ایک شخص مسجد (نبوی) میں کھڑا ہوا، کہنے لگا یا رسول اللہ! آپ کیا حکم دیتے ہیں، ہم

اَنْ نُّهِلَّ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُهِلُّ اَهْلُ الْمَدِیْنَةِ

(حج کا) احرام کہاں سے باندھیں؟ آپ نے فرمایا، مدینہ والے ذوالحلیفہ سے احرام باندھیں

مِنْ ذِی الْحُلَیْفَةِ وَیُهِلُّ اَهْلُ الشَّامِ مِنَ الْجُحْفَةِ وَیُهِلُّ اَهْلُ نَجْدٍ

اور شام والے جحفہ سے احرام باندھیں اور نجد والے قرن سے۔

احتیاج ظاہر نہ کیا جائے گا اس وقت تک علم نہیں آئے گا۔

حدیث ۱۳۲ - قولہ لان تکون قلتها احب الی من ان یکون لی کذا وکذا یعنی ایسی حیا نہ کرنی چاہئے کہ اس کی وجہ سے مزید رفع درجات سے محرومی ہو جائے۔ اس سے حیا عرفی مراد ہے۔

(۹۳) باب من استحیی فامر غیرہ بالسؤال

یہ پہلے ترجمہ کی تلافی ہے کہ کبھی کبھی حیا مانع ہوتی ہے اور یہ جائز بھی ہے بشرطیکہ مطلب فوت نہ ہو۔

حدیث ۱۳۳ - اس کے لئے یہ حدیث لائے کہ حضرت علیؓ نے حضرت مقداد سے معلوم کرایا تھا۔

(۹۴) باب ذکر العلم والفتیا فی المسجد

چونکہ حدیث میں آیا ہے کہ مساجد ذکر اللہ کے لئے ہیں اور وہاں شور و شغب ناجائز ہے، اور علم میں بھی کبھی کبھی شور و شغب ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے بشرطیکہ علم دین ہو۔ فلسفہ وغیرہ کی تعلیم نہیں۔ صرف ونحو کو بتاویل داخل کرلیں گے۔

مِنْ قَرْنٍ وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ وَيَزْعُمُونَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ

ابن عمر رضہ نے کہا لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَيُهِلُّ اَهْلُ الْيَمَنِ مِنْ

یہ بھی فرمایا کہ اور یمن والے یلملم سے احرام باندھیں،

يَلَمْلَمَ، وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يَقُوْلُ لَمْ اَفْقَهْ هٰذِهٖ مِنْ

اور ابن عمر رضہ کہتے تھے میں نے یہ بات (کہ یمن والے یلملم سے احرام باندھیں)

رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صاف نہیں سنی۔

بَابُ مَنْ اَجَابَ السَّائِلَ بِاَكْثَرَ مِمَّا سَاَلَهٗ

باب پوچھنے والے نے جتنا پوچھا اس سے زیادہ جواب دینا

۱۳۵ـ حَدَّثَنَا اٰدَمُ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ اَبِيْ ذِئْبٍ عَنْ

ہم سے آدم ابن ابی ایاس نے بیان کیا کہا ہم سے ابن ابی ذئب نے، انھوں نے نافع

نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

سے انھوں نے ابن عمر رضہ سے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

ح وَعَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ سَالِمٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

دوسری سند، اور ابن ابی ذئب نے اس کو زہری سے بھی روایت کیا انھوں نے سالم سے انھوں نے ابن عمر رضہ سے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

اَنَّ رَجُلًا سَاَلَهٗ مَا يَلْبَسُ الْمُحْرِمُ فَقَالَ لَا يَلْبَسُ

ایک شخص نے آپ سے پوچھا جو شخص احرام باندھے ہو وہ کیا پہنے آپ نے فرمایا، قمیص

الْقَمِيْصَ وَلَا الْعِمَامَةَ وَلَا السَّرَاوِيْلَ وَلَا الْبُرْنُسَ

نہ پہنے نہ عمامہ نہ پائجامہ نہ ٹوپی

وَلَا ثَوْبًا مَسَّهُ الْوَرْسُ اَوِ الزَّعْفَرَانُ فَاِنْ لَمْ يَجِدِ النَّعْلَيْنِ

نہ وہ کپڑا جس میں ورس یا زعفران لگی ہو، پھر اگر (پہننے کو) جوتیاں (چپل)

فَلْيَلْبِسِ الْخُفَّيْنِ وَلْيَقْطَعْهُمَا حَتّٰى يَكُوْنَا تَحْتَ الْكَعْبَيْنِ ۔
نہ ملیں تو موزے ٹخنوں کے نیچے تک کاٹ کر پہن لے ۔

---

(۹۵) بَابُ مَنْ اَجَابَ السَّائِلَ بِاَكْثَرَ مِمَّا سَأَلَهٗ

یعنی سائل کے سوال سے زیادہ بیان کرے ۔ پہلے باب میں گذرا تھا کہ بعض اشیاء کو روک لے اور یہاں اس کے برعکس باب لائے، تو بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ صورت بھی جائز ہے ۔ حالات کا تقاضا ہو تو نہ بیان کرے اور مصلحت ہو تو زیادہ بھی بتلا دے ۔

حدیث ۱۳۵ ۔ قولہ مایلبس المحرم ؟ سوال صرف پہننے کا تھا، کہ محرم کیا کیا پہنے، جواب دیا کہ یہ یہ نہ پہنو، قمیص، عمامہ، سراویل، برنس وغیرہ ۔ باقی پہن سکتے ہو ۔ اگر پہننے کا ذکر فرماتے تو احصار نہ فرماتے بہ کچھ اشیاء ہی بیان فرماتے تو تنگی رہتی اس لئے ان اشیاء کا ذکر فرمادیا جو ممنوع تھیں بقیہ جائز ہوگئیں یہ عین حکمت ہے ۔

قولہ الکعبین، یہاں وسط قدم کی ہڈی مراد ہے اور امام محمدؒ سے جو مروی ہے کہ کعبین سے بیچ کی ہڈی مراد ہے وہ صرف اسی مقام پر ہے ۔ وضو میں کعبین سے یہ بیچ کی ہڈی مراد نہیں بلکہ ٹخنے مراد ہیں ۔

کتابُ العلم تمام شُد

والحمدُللهِ الّذی بنعمته تتمّ الصّالحات